عالمی شہرت یافتہ سائنسدان

عبدالسلام

عبدالحمید چودھری

سوانح

عالمی شہرت یافتہ سائنسدان

عبدالسلام

مرتبہ: عبدالحمید چودھری

اپنے والدین کے نام

جن کی مخلصانہ دعاؤں اور مشفقانہ
کاوشوں نے ہمیں دینی و دنیاوی
علوم کی روشنی سے منور کیا

عبدالحمید چوہدری 19 ستمبر 1933ء کو جھنگ شہر میں پیدا ہوئے۔ آپ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے سات بھائیوں میں سے عمر کے اعتبار سے تیسرے نمبر پر تھے۔ مگر قربت میں باقی بھائیوں سے آپ ڈاکٹر صاحب کے بہت قریب تھے۔ ملتان سے 1953 میں بی ایس سی کرنے کے بعد اپنے بھائی جان کے پاس انگلینڈ چلے گئے جہاں پر انہوں نے بیکر پرکنز سے دو سال کی ٹیکنیکل ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد کچھ عرصہ بطور سیلز مین ملازمت کی اس کے بعد آپ نے 1962ء میں ایک سال تک سویڈن میں الفالاوال میں ڈیری پلانٹس کی مشینری بنانے کی تربیت حاصل کی اور اس کے بعد تا وفات آپ نے پاکستان میں ڈیری ٹیکنولوجسٹ کے طور پر شہرت حاصل کی۔ سویڈن کی کمپنی الفالاوال اور برطانوی کمپنی اے پی وی کی ملازمت اور پھر تادم وفات ڈنمارک کی مشہور عالم کمپنی نائیرو کے پاکستان کے نمائندہ کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے تھے۔ آپ نے ہر ممکن کوشش کر کے اپنے بھائی کے تمام حالات ایک جگہ اکٹھے کئے جو کہ ان کی دلی خواہش تھی اور اسی کوشش کے نتیجہ میں 1997ء میں یہ کتاب تحریر کی اور مسودہ کی تکمیل کے بعد 17-11-1998 کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

شجرہ نسب

حضرت سعد بڈھن ← میاں لعل ← میاں حیات ← میاں حضر ← میاں درگاہی ← میاں رشید
میاں حاجی
دائم
میاں عبدالکریم
حامان
ممنان
رمضان
میاں سلطان
حیات
میاں غلام محمدؒ
میاں احمد بخش
(لاولد)
میاں گل محمدؒ
چوہدری غلام حسین
چوہدری محمد حسین
عبدالشکور
ناصر احمد
(جوانی میں فوت ہو گئے)
غلام محمد اقبال
نورالدین جہانگیر
فضل الرحمن اسلم
ظفراللہ
سیف اللہ
فخراللہ
انوار اقبال
ناصر سرفراز
عبدالحی
عبدالعزیز
عبدالباسط
حفیظ الدین
منیر مسعود
شاہد محمود
ریاض الدین
اعجاز الدین
فیاض الدین
احمد طارق
احمد لقمان
طلحہ شاہد
صہیب رشید
حنان ریاض
ہمایوں فیاض
حماد فیاض
جہانزیب مسعود
عثمان مسعود
احسان اعجاز
فرحان اعجاز
ڈاکٹر عبدالسلام
عبدالسمیع
عبدالحمید
عبدالماجد
عبدالقادر
عبدالرشید
عبدالوہاب
احمد سلام
عمر سلام
قاسم عبدالسلام
اسامہ سلام
خالد اقبال
حامد اقبال
احمد جمال
احمد بلال
سعد
گل حسین
(بچپن میں وفات پائی)
عبدالقدوس
عبدالصبور
عبدالودود
عبدالحسیب
عبدالصمد
عبدالاعلی
عبدالودود
عبدالمقیت
عبدالجبار رضوان
عبدالرؤف ریحان
عبدالولی عرفان

فہرست

فہرست

Printed by : Naweed Ahmad
Published by: Ahmad Salam, 8, Campion Road, SW15 6NW. London.

پیش لفظ

بھائی جان کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لکھا جا رہا ہے اور لکھا جاتا رہے گا کیونکہ وہ ایک منفرد اور نافع الناس وجود تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر آئی احمد نے ان کے بارے میں لکھا:

''انسان کی عظمت کا معیاری پیمانہ وسیع القلبی ہے۔ کوئی کتنا ہی قد آور کیوں نہ ہو اگر اس کا دِل تنگ اور درد سے خالی ہو تو وہ بونا ہے۔ بڑا وہ ہے جس کا دل بے درد دیوار ہو۔ تنہا آگے بڑھنا آسان ہے مگر اپنے ساتھ مفلوجوں کی فوج لے کر آگے بڑھنا مشکل۔ اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو عبدالسلام عظیم ترین ہیں۔ سائنس کی تاریخ میں کوئی فرد ایسا نظر نہیں آتا جس کے دل میں اپنوں میں سائنس کو فروغ دینے کی تڑپ ہو، جو عبدالسلام کے دل میں ہے۔ پاکستان کے جس سائنسی ماحول نے جنوری 1954ء میں ان کو اپنے وطن عزیز کو چھوڑنے پر مجبور کیا تھا وہ اسے بھولے نہیں۔ ذاتی کامیابیوں اور اعزازت کی بارشوں میں بھی انہوں نے تیسری دنیا خصوصاً عالم اسلام کے اس سائنسی ماحول کو یاد رکھا جس میں نہ جانے کتنے عبدالسلام پیدا ہونے سے پہلے مرجاتے ہیں۔ تیسری دنیا میں سائنس کو فروغ دینے اور وہاں ایک سائنسی ماحول پیدا کرنے کے لئے وہ مستقل بے قرار رہے۔ اس بے قراری کو بالاخر انٹرنیشنل سینٹر فار تھیورٹیکل فزکس کی شکل میں سکون ملا۔ یہ مرکز جو آئی سی ٹی پی (اب اس سینٹر کا نام ''عبدالسلام آئی سی ٹی پی'' رکھ دیا گیا ہے۔) کے نام سے مشہور ہے 1964ء میں اطالیہ کے شہر ٹریسٹ میں قائم ہوا۔ یہ عبدالسلام کا تیسری دنیا کی سائنس پر وہ عظیم احسان ہے۔ جسے نسل در نسل یاد کیا جاتا رہے گا۔ یہ مرکز عبدالسلام کے عزم محکم، جہد مسلسل اور جذبہ صادق کا نادر نمونہ ہے۔

یہاں مشرق مغرب سے ہاتھ ملاتا ہے، گورا کالے کو خوش آمدید کہتا ہے اور اشتراکیت سرمایہ داری کے ساتھ مل کر کام کرتی ہے۔ تنہا اس مرکز کا قیام ہی عبدالسلام کا وہ کارنامہ ہے جس پر ایک اور نوبیل انعام ان پر نچھاور کیا جا سکتا ہے۔ عبدالسلام کی شخصیت بڑی ہی پیاری اور دلاویز ہے۔ سامنے ہوں تو بے اختیار عقیدت سے آنکھیں جھک جاتی ہیں۔''

(''تہذیب الاخلاق'' جولائی 1984ء)

بھائی جان کے بارے میں دانشوروں، صحافیوں، سائنس دانوں، دوستوں، رفقاء، اساتذہ اور شاگردوں نے لکھا۔ ایسے لوگوں نے بھی ان سے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کیا جو شاید زندگی میں ان سے کبھی ملے بھی نہیں ہوں گے۔ مجھے ایک عرصہ تک ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، اس لئے میں نے تمام واقعات اور حالات جو میں جانتا ہوں کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ دوسروں کو بھی ان کی داستان حیات میں شامل کروں۔

میں نہ تو مصنف ہوں اور نہ کسی شہرت کا طالب، بلکہ فریضہ اور ضرورت کے پیش نظر بارش کے پہلے قطرے کی طرح جرأت رندانہ سے کام لے رہا ہوں۔ اس کاوش کو حرف آخر تو نہیں کہہ سکتا البتہ مستقبل کے سوانح نگار اور مؤرخ کے لئے نشان راہ کا کام ضرور دے گی۔

میری علمی بے بیضابطگی آڑے آ رہی ہے۔ اصحاب فن پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ سوانح عمری لکھنا کتنا کٹھن کام ہے، جسے لکھتے وقت کن کن تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے خیالات کی پگڈنڈیاں کس طرح مشکلات سے دوچار ہو کر تلاش کرنا پڑتی ہیں، با ایں ہمہ میری کوشش یہی رہی ہے کہ نہ تو حقائق مسخ ہونے پائیں اور نہ ہی کوئی پہلو تشنہ تکمیل رہ جائے۔

ستمبر 1994ء میں دائیں بازو اور ٹانگ پر فالج کے بعد اگرچہ میری صحت برقرار نہیں رہی پھر بھی اس خدائے رحیم و کریم کا بے حد احسان ہے کہ بھائی جان کی زندگی کے بارے میں جو کچھ اکٹھا کر سکا وہ آپ کے سامنے ہے۔ اگر اس کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ کو محسوس ہو کہ کئی باتوں کا آپ کو اب پتہ چلا ہے تو میں سمجھوں گا کہ میری یہ کوشش غارت نہیں گئی!

اس کتاب کو مرتب کرنے میں مجھے مندرجہ ذیل دوستوں، احباب اور عزیزوں کا تعاون حاصل رہا، جس کے لئے میں ان سب کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

لفٹیننٹ کرنل جی ایم اقبال (ر) (میرے تایا زاد بھائی اور بھائی جان کے برادر نسبتی) مولانا دوست محمد شاہد (مورخ احمدیت)، پروفیسر ایم رحمان وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ڈاکٹر جے ڈف امریکہ، پروفیسر پرویز ہود بھائی، شہزاد احمد، پروفیسر ایچ۔ ایس ورک گورو نانک دیو یونیورسٹی امرتسر، مرزا وسیم احمد، منیر احمد خان سابق چیئرمین پاکستان ایٹمی توانائی کمشن، میرے بھائی محمد عبدالماجد وی آنا (آسٹریا) اور محمد عبدالرشید لندن، چوہدری منیر مسعود ایم۔ایس۔سی لاہور (بھتیجا) ملک مظفر احمد خان ایم۔ایس۔سی کراچی (بھانجہ) پروفیسر ویرا سورو (M.A Virasoro) ڈائریکٹر "عبدالسلام سینٹر فار تھیورٹیکل فزکس اور مسز گیٹی (Mrs. Gatti) (بھائی جان کی سیکرٹری رہی ہیں) ٹریسٹ اٹلی۔

آخر میں اپنے بیٹے عزیزم چوہدری خالد اقبال کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جو مجھے لاہور کی مختلف لائبریریوں میں لے کر جاتا رہا اور جس کے تعاون کے بغیر اس کتاب کو مرتب کرنا ممکن نہ تھا۔

عبدالحمید چوہدری

19 اگست 1998ء

← تحدیث نعمت مصنفہ چوہدری محمد ظفر اللہ خان۔ ڈھاکہ بے نیولنٹ ایسوسی ایشن ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) بنگلہ دیش
تاریخ احمدیت (مختلف جلدیں) مرتبہ مولانا دوست محمد شاہد صاحب ربوہ
← رفقاء احمد جلد یازدہم مولف ملک صلاح الدین
ناشر احمدیہ بک ڈپو دارالرحمت مشرقی ربوہ ماخوذ ص 250-281۔
← "تہذیب الاخلاق" مسلم یونیورسٹی علی گڑھ انڈیا۔
← الفضل ربوہ، الفضل انٹرنیشنل لندن، نوائے وقت، جنگ، دی نیشن، پاکستان ٹائمز روزنامہ پاکستان، ماہنامہ خالد، ملت، کراچی، سٹار
← The Nucleus Vol 33 Nos 1-2 (1996)
A Quarterly Scientific Journal of Pakistan Atomic Energy Commission of Pakistan.
AL - NAHAL - MAJLIS ANSARULLAH USA
Fall 97
The Eagle Magazine St John,s College, Cam Bridge.
← ڈاکٹر عبدالسلام کی ویڈیو ریکاڈنگ 7 دسمبر 1987ء لاہور۔

دیباچہ

(دوست محمد شاہد مورخ احمدیت کے قلم سے)

یہ حقیقت ہے کہ مغربی دنیا کی موجودہ محیر العقول ترقی اور زبردست اکتشافات بالواسطہ طور پر سپین اور بغداد کے مسلم سائنسدانوں اور ان کی ایجادات کی رہن منت ہے چنانچہ ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر ایم اے ایل ایل ڈی (1811-1882ء) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب THE HISTORY OF CONFLICT BETWEEN RELIGION AND SCIENCE میں تسلیم کیا ہے کہ یورپ کا پہلا میڈیکل کالج عربوں نے سانو (اٹلی) میں قائم کیا اور یورپ میں پہلی رصدگاہ اموی بادشاہوں کی سرپرستی میں بمقام اشبیلیہ (سپین) قائم ہوئی ۔ اسی طرح برنارڈ لیوس نے اپنی تالیف The Muslim Discovery of Europe میں واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ سولہویں سترھویں صدی یورپ میں علمی وفکری فروغ ارتقاء کی صدی تھی جس میں یورپ کی یونیورسٹیوں میں عربی ادب وفنون کے مطالعہ کی زبردست تحریک شروع ہوگئی تھی۔

اسی طرح مشہود عالم فرانسیسی محقق ڈاکٹر گستاولی بان ممبر آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور گریٹ برٹن اور آئرلینڈ نے ''تمدن عرب'' صفحہ 721 پر یہ تاریخی حقیقت بے نقاب کردی ہے کہ

''عربوں کے تسلط اخلاقی نے یورپ کی ان اقوام وحشی کو جنہوں نے رومیوں کی سلطنت کو تہ وبالا کردیا انسان بنایا ان کے علمی اور دماغی تسلط نے یورپ کے علوم وفنون اور ادب وفلسفہ کا جس سے وہ بالکل ناواقف تھا دروازہ کھول دیا اور چھ صدی تک یہی عرب ہمارے استاد اور ہمیں تمدن سکھانے والے رہے۔''

(صفحہ 721 مترجم شمس العلماء وسید علی بلگرامی ناشر مقبول اکیڈمی لاہور طبع اول مئی 1936 حیدرآباد دکن)

انیسویں صدی میں جبکہ مسلم امہ مغربی اقوام کے عالمی اقتدار اور تسلط کے نتیجہ میں مرد بیمار کی صورت میں سائنسی علوم اور امن کے جدید انکشافات سے لرزہ براندام ہو رہی تھی بانی سلسلہ احمدیہ (1835-1908) نے مسلمانان عالم کو خوشخبری دی کہ

''اب زمانہ اسلام کی روحانی تلوار کا ہے جیسا کہ وہ پہلے کسی وقت اپنی ظاہری دکھلا چکا ہو۔ یہ پیشگوئی یاد رکھو کہ عنقریب اس لڑائی میں بھی دشمن ذلت کے ساتھ پسپا ہوگا اور اسلام فتح پائیگا۔ حال کے علوم جدیدہ کیسے ہی زور آور حملے کریں۔ کیسے ہی نئے نئے ہتھیاروں کے ساتھ چڑھ چڑھ کر آویں مگر انجام کار ان کے لئے ہزیمت ہے۔ میں شکر نعمت کے طور پر کہتا ہوں کہ اسلام کی اعلیٰ طاقتوں کا مجھ کو علم دیا گیا ہے۔ جس علم کی رو سے میں کہتا سکتا ہوں کہ اسلام

نہ صرف فلسفہ جدیدہ کے حملے سے اپنے تئیں بچائے گا بلکہ حال کے علوم مخالفہ کو جہالتیں ثابت کر دے گا۔ اسلام کی سلطنت کو ان چڑھائیوں سے کچھ بھی اندیشہ نہیں ہے جو فلسفہ اور طبعی کی طرف سے ہو رہے ہیں۔ اس کے اقبال کے دن نزدیک ہیں۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ آسمان پر اسکی فتح کے نشان نمودار ہیں۔ یہ اقبال روحانی ہے اور فتح بھی روحانی۔ تا باطل علم کی مخالفانہ طاقتوں کو اس کی الٰہی طاقت ایسا ضعیف کر دیوے کہ کالعدم کر دیوے۔''

(آئینہ کمالات اسلام صفحہ 254,255 اشاعت اول فروری 1893ء)

خدا کے مامور کی اس پیشگوئی کا پہلا شاندار عملی ظہور نوبل انعام یافتہ اور عالمی شہرت کے حامل سائنسدان پروفیسر ڈاکٹر ابو احمد محمد عبدالسلام صاحب (1926-1996) کے مبارک وجود کی صورت میں ہوا جن کی یگانہ روزگار شخصیت کی سوانح اور سائنسی کارناموں کے روح پرور اور معلومات افروز تذکرہ آپ کے پیارے بھائی چوہدری عبدالحمید صاحبؒ کے قلم سے معزز قارئین آئیندہ صفحات میں ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

اگرچہ اس بطل جلیل پر متعدد کتب منظر عام پر آچکی ہیں اور انشاءاللہ یہ سلسلہ آئیندہ بھی جاری رہے گا مگر زیر نظر تالیف کی یہ منفرد خصوصیت آسمان کے ستاروں کی طرح جگمگاتی رہے گی کہ اس کے موئف پر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب مرحوم کے سگے بھائی تھے۔ جنہوں نے آپ کا ہمیشہ قریب سے مطالعہ کیا اور پھر نہایت باریک بینی سے اپنے مشاھدات وتاثرات کو آئیندہ نسلوں کے لئے ریکارڈ کر دیا جو اپنی ذات میں ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔

میں دنیا بھر کے احمدی نوجوانوں سے درخواست کروں گا کہ وہ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے سیدنا حضرت مصلح موعود کے درج ذیل فرمان مبارک کو ضرور ہر لحظہ پیش نظر رکھیں اس سے ان میں ایک نیا ولولہ، نیا جذبہ اور نیا جوش پیدا ہوگا۔ اور وہ بھی مستقبل میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی طرح اپنی خداداد صلاحیتوں اور استعدادوں سے سائنس اور مذہب کو ہم آہنگ ثابت کر کے پوری دنیا کے لئے سلامتی اور امن کے سفیر بن جاہیں گے اور بالآخر اٹیم کی بے پناہ اور ہلاکت آفریں قوتیں پوری انسانیت کی خدمت، بقا اور ترقی کے لئے مخصوص ہو جائیں گی اور آج کی دکھی انسائیت امن و آشتی کی اس عالمگیر ارضی جنت کا منظر دیکھنے میں کامیاب ہو جائے گی جس کا وعدہ رحمۃ للعالمین خاتم النبین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''یضع الحرب'' کے حقیت افروز الفاظ میں چودہ سوسال سے دے رکھا ہے۔

زمین سے ظلمت شرک ایک دم میں ہوگی دور
ہوا جو جلوہ نما لا الہ الا اللہ
ہزاروں بلکہ ہیں لاکھوں علاج روحانی
مگر ہے روح شفا لا الہ الا اللہ

(کلام محمود)

اب سیدنا حضرت مصلح موعود کا ارشاد مبارک سنیئے حضور نے اپنی چشم بصیرت سے مستقبل کا نظارہ کرتے ہوئے قوت ویقین سے لبریز الفاظ میں وصیت فرمائی کہ

صیح معنوں میں احمدی وہی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ احمدیت کے دنیا میں غالب آ جانے کے معنے یہ ہیں کہ یورپ امریکہ، جاپان، چین غرضیکہ دینا کے ہر ملک کے بڑے بڑے مئورخ۔ فلاسفر، سائنسدان لائے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ تمہارے شاگرد ہیں ان کو پڑھاؤ اور پھر اس کے لئے تیاری کرتے ہیں۔''

(الفضل ۱۴۔ اپریل ۱۹۴۳ء صہ ۳)

بطحا کی وادیوں سے جو نکلا تھا آفتاب
بڑھتا رہے وہ نور نبوت خدا کرے

قائم ہو پھر سے حکم محمد جہان میں
ضائع نہ ہو تمہاری یہ محنت خدا کرے

(المصلح الموعودؓ)

واخر دعولنا ان الحمد للہ رب العالمین

چین کے وزیراعظم چوئن لائی کے ساتھ

ڈاکٹر صاحب یونائیٹڈ نیشن کے سیکریٹری جنرل پیراز دی کوائر کے ساتھ

سویڈن کے بادشاہ آپ کو فزکس کا نوبل انعام دیتے ہوئے

سند نوبل انعام

1

جھنگ

مقامی زبان میں جھنگ درختوں یا جھاڑیوں کے جھنڈ کو کہتے ہیں۔

جغرافیائی پس منظر

ضلع جھنگ کا عرض بلد "16 َ 16 ° 31 اور طول البلد "45 ' 21 َ ° 72 ہے۔ اس ضلع کے شمال میں اضلاع گوجرانوالہ اور سرگودھا' جنوب میں اضلاع ملتان و مظفر گڑھ' مشرق میں ضلع فیصل آباد (سابقہ لائل پور) اور مغرب میں اضلاع میانوالی و مظفر گڑھ کا کچھ علاقہ ہے۔

رقبہ : اس ضلع کا رقبہ 3720 مربع میل (3809 مربع کلومیٹر) ہے۔

سطح : اس ضلع کی زمین کہیں میدانی کہیں اونچی نیچی ہے۔ چنیوٹ اور ربوہ کے اردگرد پہاڑیاں ہیں جو تقریباً چھ سے نو سو فٹ اونچی ہیں۔

زمین : اس ضلع کا بہت سا حصہ ویران تھا۔ جہاں صرف کریل اور جنڈ کے درخت پائے جاتے تھے۔ اسی لئے اس علاقہ کو بار کہتے تھے۔ جنڈ کا درخت ہندوؤں کے نزدیک بڑا متبرک تصور کیا جاتا ہے وہ اس کی پوجا کرتے ہیں۔ اس ضلع کی زمین کو چار قسموں میں تقسیم کیا گیا تھا:

بار' اُتار' ہٹھار اور تھل

ہٹھار کی زمین دریاؤں کے قریب ہونے کی وجہ سے زیادہ زرخیز ہے۔ بار اور ہٹھار کے درمیان کی زمین کو اکثر کنوؤں سے اور اب ٹیوب ویل سے سیراب کیا جاتا ہے۔ بار کی زمین کو نہروں سے سیراب کیا جاتا ہے۔ بلکہ اب تو سارے ضلع میں نہری جال بچھا ہے۔ اس ضلع میں تھل بھی ہے۔ (ریتلا علاقہ) جہاں صرف بارش پر گزارہ ہوتا ہے۔

پانی : اس ضلع میں اکثر مقامات پر زیر زمین پانی میٹھا ہے جبکہ بعض جگہوں پر زیر زمین پانی پینے کے قابل نہیں۔

دریا : اس ضلع سے دو بڑے دریا گزرتے ہیں۔ جہلم اور چناب۔

دریائے جہلم کشمیر کے پہاڑوں میں چشمہ ویرناک سے نکل کر شمال کی طرف سے اس ضلع میں داخل ہوتا ہے اور تریموں کے مقام پر دریائے چناب میں مل جاتا ہے۔

دریائے چناب بھی کشمیر کے پہاڑوں سے نکل کر سرگودھا اور گوجرانوالہ کے اضلاع کو حد فاصل بناتا ہوا اس ضلع میں داخل ہوتا ہے اور جھنگ سے بارہ میل نیچے تریموں کے مقام پر دریائے جہلم سے مل جاتا ہے اور

پنتالیس میل بہہ کر ضلع سے باہر نکل جاتا ہے۔ دریائے جہلم اور دریائے چناب آپس میں ملنے کے بعد دریائے چناب کہلاتا ہے۔ دریائے چناب کا اصل نام "چندر بھاگا" تھا اور دریائے جہلم کا پرانا نام "وشتا" تھا۔ پنجابی میں اسے "بہت" کہا جاتا تھا۔

قومیں : جب یہ ضلع آباد ہوا تھا تو اس میں دو قومیں بہت زیادہ آباد تھیں۔ ہندو اور مسلمان۔ ہندوؤں میں کھتری، اروڑے، برہمن، راجپوت اور مسلمانوں میں سید، مغل، پٹھان، سیال، بلوچ، چدھڑ، ارائیں، سپرا، راجپوت اور رجپہ یہاں آباد تھے۔ تقسیم ہند کے بعد ہندو یہاں سے نقل مکانی کر گئے تھے۔

ضلع جھنگ میں تین تحصیلیں ہیں: جھنگ، چنیوٹ اور شور کوٹ۔

تحصیل جھنگ : اس میں پانچ سو سے زیادہ گاؤں اور قصبے ہیں۔ اس تحصیل کا ہیڈ کوارٹر مگھیانہ ہے جو جھنگ شہر سے تقریباً دو میل کے فاصلہ پر ہے۔

تحصیل چنیوٹ : اس تحصیل کا ہیڈ کوارٹر چنیوٹ ہے۔ یہ تحصیل تقریباً چار سو پچاس گاؤں اور قصبوں پر مشتمل ہے۔ اگرچہ اس کی آبادکاری کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم ایک اندازہ کے مطابق یہ 325 قبل مسیح آباد تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ایک شہزادی جس کا نام چندن تھا جو ماچھی خان سردار کی بہن تھی اور اکثر مردانہ لباس پہن کر شکار کے لئے نکل جایا کرتی تھی نے جب یہ علاقہ دیکھا، جس میں دریا، پہاڑیاں اور میدانی علاقہ تھا تو اس نے حکم دیا کہ وہاں ایک بستی آباد کی جائے۔ اس بستی کا نام "چندن وٹ" رکھا گیا یعنی چندن کا گھر جو بعد میں چنیوٹ کہلایا۔

شاہ جہاں کے عہد میں جب نواب سعداللہ خان اس علاقہ کا گورنر تھا تو چنیوٹ نے خاصی ترقی کی تھی۔ اس نے وہاں شاہی مسجد تعمیر کرائی تھی۔ جب درانی خاندان نے ہندوستان پر حملے کئے تو اس وقت چنیوٹ کو خاصا نقصان پہنچا تھا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں سیالوں اور بھنگی سرداروں جن کا سربراہ مان سنگھ تھا کی چپقلش سے بھی اسے نقصان پہنچا تھا۔ انگریزوں کے قبضہ سے پہلے 1848ء میں نرائن سنگھ کی قیادت میں بھی اسے نقصان اٹھانا پڑا تھا۔

چنیوٹ سے چند میل دریا چناب کے اس پار صدیوں سے بنجر زمین پر جماعت احمدیہ نے 1948ء میں ایک شہر آباد کیا جس کا نام ربوہ ہے۔ کلام الٰہی میں ربوہ کا لفظ اونچے علاقہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام و حضرت مریم نے جس علاقہ کی طرف ہجرت کی تھی، اس علاقہ کے لئے ربوہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔)

ربوہ چنیوٹ سے سرگودھا جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ اس شہر کا رقبہ گیارہ ہزار چونتیس ایکٹر ہے۔ اگرچہ دریا چناب ربوہ کے بہت قریب سے گزرتا ہے لیکن دریا میں اونچے سے اونچے سیلابوں سے بھی یہ شہر محفوظ رہا ہے کیونکہ یہ دریا کی سطح سے کافی بلندی پر واقع ہے۔

ربوہ میں ایک سو بائیس بستر کا ایک ہسپتال ہے' جس کا نام فضل عمر ہسپتال ہے۔ اس ہسپتال میں جدید اور بہترین سہولتیں دستیاب ہیں اور اس میں بلا امتیاز مذہب و ملت ہر ایک کا علاج معالجہ کیا جاتا ہے۔
ربوہ میں جماعت احمدیہ کا ایک ادارہ جسے جامعہ احمدیہ کہا جاتا ہے میں دینی تعلیم کا سات سالہ کورس کرایا جاتا ہے' جسے پاس کرنے کے بعد "شاہد" کی سند دی جاتی ہے۔ اس ادارہ کے فارغ التحصیل اندرون و بیرون ملک دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ہائی اسکول اور ڈگری کالج بھی ہیں۔ اس شہر میں سینما گھر اور تھیٹر نہیں ہیں۔
تحصیل شورکوٹ : یہ جھنگ مگھیانہ کے جنوب میں واقع ہے۔ غالب خیال ہے کہ سکندر اعظم نے اس علاقہ کو فتح کیا تھا۔ یہاں مٹی کا ایک بہت بڑا ٹیلہ ہے' جس کی تاریخ سے آج تک پردہ نہیں اٹھ سکا۔ شورکوٹ شہر سے بارہ میل دور ریلوے اسٹیشن ہے جو ریلوے کا ایک بڑا جنکشن ہے۔ وہاں سے ملتان' جھنگ' لاہور براستہ ٹانڈلیانوالہ اور فیصل آباد کو ریل گاڑیاں جاتی ہیں۔ اس کے نزدیک پاکستان ایئر فورس کا ایک بہت بڑا ہوائی اڈہ بھی ہے۔

تاریخی پس منظر

جھنگ کا علاقہ سیال قوم نے آباد کیا تھا۔ اس لئے یہ جھنگ سیال بھی کہلاتا ہے۔ سیال قوم دراصل راجپوتوں کی ایک شاخ ہے جو تیرہویں صدی میں اسلام میں داخل ہوئی تھی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اس قوم نے پنجاب کے ان علاقوں کی طرف رخ کیا جو امیر تیمور کے دہلی پر حملے کی وجہ سے غیر آباد ہو گئے تھے۔

سیال قوم کے ایک سردار مل خان نے 1462ء میں جھنگ کو آباد کیا تھا۔ لیکن دریا چناب اس شہر کو بہا کر لے گیا اور یہ علاقہ ایک مرتبہ پھر ویران اور غیر آباد ہو گیا تھا۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں 1686ء میں ایک ہندو سنیاسی باوا لال ناتھ نے جھنگ کو دوبارہ آباد کیا تھا۔ باوا لال ناتھ نے یہاں ایک مندر تعمیر کرایا جو اب بھی موجود ہے اور جھنگ شہر کے وسط میں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جھنگ شہر اس مندر کے اردگرد آباد کیا گیا۔ اس مندر کی دیواریں چھوٹی سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی ہیں اور وہ بہت بلند و بالا ہیں۔ ہمارے گھر سے یہ مندر قریباً ایک کلو میٹر کے فاصلہ پر ہے۔ اس مندر کا بڑا پنڈت باوا لال ناتھ کی اولاد سے ہوتا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے 1805ء میں جھنگ پر حملہ کیا تھا اور اسے اپنی ریاست میں شامل کر لیا تھا۔ 1849ء میں جھنگ انگریزوں کی عملداری میں آ گیا تھا۔

مگھیانہ

جھنگ شہر سے دو میل کے فاصلے پر اس بستی کو سیال قوم کے ایک سردار میگھا سیال نے آباد کیا تھا۔

اسی سردار کے نام سے اسے مگھیانہ کہتے ہیں۔ یہیں ضلع جھنگ کے انتظامیہ کے دفاتر' تحصیل ہیڈ کواٹر' سول ہسپتال' خزانہ' جیل اور کمپنی باغ تعمیر کئے گئے۔ 1867ء میں یہاں دونوں شہروں یعنی جھنگ شہر اور مگھیانہ کی میونسپل کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ نیا شہر ہونے کی وجہ سے رفتہ رفتہ مگھیانہ جھنگ شہر سے سبقت لے گیا۔

1947ء میں تقسیم ہند کے بعد ہندو یہاں سے نقل مکانی کر گئے تھے۔ جبکہ پانی پت وغیرہ سے آنے والوں کو یہاں آباد کیا گیا تھا۔

جھنگ کی چند نامور ہستیاں

سرزمین جھنگ کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کے خمیر سے جن نامور ہستیوں نے جنم لیا ان میں:

1 نواب سعد اللہ خان' وزیر اعظم شاہ جہاں۔

2 نواب وزیر خان حاکم پنجاب۔

3 مفتی محمد یوسف' قاضی القضاء عہد شاہ جہاں۔

4 سلطان حیدر علی والئی میسور

5 سلطان فتح علی ٹیپو شہید والی میسور اور

6 بیسویں صدی کے عظیم سائنسدان نوبل انعام یافتہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کے اسماء گرامی سرفہرست ہیں۔

اول الذکر تینوں چنیوٹ کے باسی تھے۔ سلطان حیدر علی کے جد امجد' حضرت شیخ بہلول' حضرت شاہ حسین لاہور کے سلسلہ قادریہ میں مرشد تھے۔ وہ جھنگ کے رہنے والے تھے' وہ راجپوتوں کی ایک گوت سپرا سے تھے جبکہ جپہ انہیں اپنے خاندان میں سے سمجھتے تھے۔ (چنیوٹ اور جھنگ میں سپرا اور جپہ وغیرہ ذاتیں راجپوتوں کی تھیں۔) ان کا انتقال 1039ھ میں ہوا تھا۔

مورخین نے حیدر علی کے جد امجد شیخ بہلول کو پنجاب کا صوفی بزرگ بتایا اور یہ لکھا کہ وہ اپنے دو بچوں کے ساتھ پنجاب سے گلبرگہ گئے تھے۔ پروفیسر نریندر کرشن سہنا' استاد تاریخ کلکتہ یونیورسٹی اپنی کتاب "حیدر علی" میں صفحہ 4 پر لکھتے ہیں کہ "اس بات میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ حیدر علی کے والدین اور افراد خاندان پنجاب کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔"

کرنل بونگ چیف کمشنر میسور نے حیدر علی اور فتح علی شہید کے موضوع پر اپنی کتاب میں بہلول کو پنجاب کا صوفی بزرگ بتایا' جبکہ کرنل ولکنس انگریزی فوج کے کمانڈر نے اپنی کتاب میں بہلول کو شمال مغربی پنجاب کا لکھا ہے۔ پنجاب کے شمال مغربی اضلاع میں صرف جھنگ ایسا ضلع ہے جس کے باشندوں نے صدیوں پہلے دعویٰ کیا تھا کہ حضرت بہلول کا تعلق ان کے ضلع سے تھا جبکہ شمال مغربی پنجاب کے کسی اور ضلع میں اس عہد کے شیخ بہلول کا مزار نہیں ملتا۔

حیدر علی اور فتح علی ٹیپو شہید کے موضوع پر کم و بیش 29 کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ان کتابوں کے مؤلفین میں کرنل بونگ چیف کمشنر میسور، پروفیسر سہنا، میر حسین علی کرمانی وزیر دربار فتح علی ٹیپو شہید، کرنل و لکنس، انگریزی فوج کے کمانڈر، محمود بنگلوری ایسے لوگ شامل ہیں جنھوں نے اپنے مشاہدات اور اس وقت کے حالات کے تحت تاریخ میسور کے ان دونوں مجاہدوں کے تذکرے محفوظ کئے ہیں۔

حیدر آباد دکن، برار، میسور اور ارکاٹ کے نوابوں کا تعلق، نواب سعد اللہ خان وزیر اعظم شاہ جہاں سے تھا۔ نوابان دکن اصل میں نواب سعد اللہ خان کی مادینہ اولاد ہیں۔ (محمد صالح نے اپنی کتاب "حیات صالح" میں نواب سعد اللہ خان کی نرینہ اور مادینہ اولاد کی تفصیل دی ہے) یہ کتاب آج کی نہیں صدیوں پہلے نواب سعد اللہ خان کے حالات پر لکھی گئی تھی۔ نواب سعد اللہ خان کی بیوی چنیوٹ کے چبہ خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور اس کے بطن سے ہونے والی اولاد مادینہ نوابان دکن کی ثانوی جد شمار ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حیدر علی کے والد اور چچا کو نواب ارکاٹ اور دربار میسور میں ملازمتیں ملیں۔ بہادری کے علاوہ جھنگ سے تعلق بھی اُن کو آگے لانے میں کام آیا۔

شیخ بہلول کے دونوں لڑکے محمد علی اور ولی محمد گلبرگہ چلے گئے تھے۔ شیخ محمد علی نے خواجہ محمد حسین بندہ نواز گیسو دراز کے خادم خانقاہ حسن بخت کی صاحبزادی زینت بیگم عرف مجیدہ بیگم سے نکاح کیا۔ اس بیوی کے بطن سے چار لڑکے ہوئے۔ شیخ فتح محمد وغیرہ۔ یہی فتح محمد والی میسور حیدر علی کے والد تھے۔

حیدر علی کی پہلی بیوی فالج میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئی۔ دوسری شادی انہوں نے والی ارکاٹ نواب سعادت علی کی بھتیجی فاطمہ عرف فخر النساء سے کی۔ فاطمہ نواب سعد اللہ خان کی اولاد مادینہ سے تھی اور اس کے ننہال چندپشت قبل خاندان چبہ سے تھے۔ اس مجاہدہ خاتون کے بطن سے سلطان فتح علی ٹیپو شہید 1163ھ میں پیدا ہوئے۔

(مرتبہ از: "تاریخ جھنگ" مصنفہ بلال زبیری ص 309۔312۔315 شائع کردہ جھنگ ادبی اکیڈیمی، اعوان منزل جھنگ صدر)

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کی تحقیق کے مطابق سلطان حیدر علی والی میسور کا تعلق جھنگ سے تھا۔ یہ بات میجر مبارک علی مرحوم جن کا تعلق شاہ جیونہ (جھنگ) سے تھا، نے 1960ء میں مجھے بتائی تھی۔

میجر مبارک علی ہمارے ابا جان کے دوستوں میں سے تھے اور علامہ ڈاکٹر محمد اقبال سے ان کا دوستانہ تھا۔ وہ سر مراتب علی کے داماد تھے۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام نوبیل انعام یافتہ کے جد امجد کا تعلق بھی جھنگ سے تھا۔ ہمارے دادا کی سکونت جھنگ شہر میں تھی۔

جھنگ سے فیصل آباد جانے والی سڑک پر مگھیانہ سے چند میل کے فاصلہ پر برلب سڑک پنجاب کی مشہور لوک داستان "ہیر رانجھا" کی ہیروئن ہیر کا مقبرہ ہے۔ وہاں ہر سال میلہ لگتا ہے۔

2

ہمارے آباؤ اجداد

اَبِ امجد

ہمارے اَبِ امجد ایک ہندو راجپوت خاندان کے شہزادہ تھے۔ ان کا نام بڈھن تھا جو ایک دعائیہ نام ہے کہ لمبی عمر پانے والا۔ پاک سیرت ہونے کی وجہ سے حق شناسی کا مادہ اُن میں بہت زیادہ تھا۔

حضرت بہاؤ الدین ذکریا رحمتہ اللہ علیہ جو قرآن حکیم کی نورانی تعلیم کی وساطت سے حق بیان کرتے تھے اور جو کچھ بھی کہتے درد دل سے کہتے تھے اور محبت کی نظر سے ہر دل کو اپنا بنا لیتے تھے۔ ان کی تبلیغ نے ہمارے اَبِ امجد کے دل کی گہرائیوں تک اثر کیا اور وہ مسلمان ہو گئے' پھر کیا تھا انہوں نے تخت کو چھوڑ اور اپنے آقا کے ساتھ سچی لو لگالی اور باقی عمر ساتھ نہیں چھوڑا' حتیٰ کہ حضرت بہاؤ الدین ذکریا رحمتہ اللہ علیہ کے فلک بُوس مقبرہ واقعہ پرانا قلعہ ملتان کے اندر قربت نصیب ہوئی' جہاں وہ حضرت مخدوم سعد بڈھن کے نام سے مدفون ہیں۔

درد دل سے دعائیں کرنا ان کا شیوہ تھا۔ یہ ان کی دعاؤں کی برکت ہے کہ ان کی اولاد ہمیشہ قرآن حکیم کی خادم رہی اور دنیاوی حیثیت میں بھی کسی سے کم نہ تھی۔

حضرت سعد بڈھن کی اولاد علاقہ جھنگ کی طرف حضرت بہاؤ الدین ذکریا کا اسلامی پیغام پہنچانے پر تعینات ہوئی۔ اس وقت ہمارے خاندان کے بزرگ کو "خلیفہ" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ چنانچہ ہمارے پردادا میاں قادر بخش صاحب اور ہمارے دادا میاں گل محمد صاحب اس منصب پر فائز رہے۔ یہ سلسلہ اس وقت ختم ہوا جب ہمارے تایا چودھری غلام حسین صاحب اور والد چودھری محمد حسین صاحب نے جماعت احمدیہ میں شمولیت اختیار کرلی تھی۔

دادا

آپ کا نام میاں گل محمدؒ تھا۔ پیشہ کے اعتبار سے وہ طبیب تھے۔ غریب اور نادار مریضوں کو وہ مفت دوا دیا کرتے تھے۔ وہ قرآن مجید کے بڑے اچھے عالم تھے۔ روزانہ فجر کی نماز کے بعد اپنے دو منزلہ مکان کی اوپر کی چھت پر قرآن مجید کی بلند آواز میں تلاوت کرتے تھے اور ساتھ ہی بلند آواز سے ترجمہ پڑھتے تھے۔

دادی

آپ کا نام بھاگ بھری تھا۔ وہ بہت خدا یاد خاتون تھیں۔ کوشش سے وہ ہمیشہ باوضو رہتی تھیں۔ پچھلی رات نفل پڑھتیں اور بلند آواز سے اپنے تینوں بچوں کا نام لے لے کر دعائیں کرتیں، وہ کہا کرتیں: ”غلام حسین، محمد حسین، جنت بی بی ایمان والے ہو، تاریاں جتنے ودھو، رَج رَج کھاؤ۔ جھنگ باغ ہوئے (یعنی خدا تمہیں گھنے باغ کی طرح بڑھائے) دے کے نہ پچھتاؤ۔ لونڈی جھونڈی تہاڈے تلیاں ہیٹھ ہووے۔ اللہ تعالیٰ دی رحمت دا سایہ تہاڈے سرتے ہووے۔“ وہ اپنی اولاد کو یہ بھی تلقین کرتی تھیں: ”موہن والے نہ بننا موپینداؤں وچوں ہونا۔“ ان دعاؤں سے پہلے وہ ”دعا سریانی“ پڑھا کرتیں، جس کے ابتدائی شعر یہ ہیں:

اللہ باقی عالم فانی حضرت جیسے یار حقانی
چھوڑ گئے فرقان نشانی چھوڑن دنیا داری
میرے من دے دیئے جلا توں مینوں نبی رسول ملا توں
سن یار خدایا میری

وہ اپنی اولاد کو نماز ادا کرنے کی تاکید کرتی تھیں۔ ہمارے تایا حضرت چودھری غلام حسین صاحب بتایا کرتے تھے کہ فجر کی نماز کے لئے والدہ صاحبہ انہیں جگایا کرتیں۔ اگر وہ جاگنے میں سستی کرتے تھے تو وہ ان کی چارپائی ایک طرف سے اُٹھا کر انہیں فرش پر گرا دیتیں جس پر وہ شرمندہ ہو کر فوراً مسجد چلے جایا کرتے تھے۔ حضرت تایا جان فرمایا کرتے تھے کہ ”میری ماں دل کی تگڑی ہے یعنی اس معاملہ میں بہت سخت گیر ہے ذرا پروا نہیں کرتی۔“ اس بات کا اثر یہ ہوا کہ عبادت کی ادائیگی میں انہوں نے باقاعدگی اختیار کرلی۔

ہمارے نانا جان

آپ کا نام نبی بخش تھا۔ آپ فیض اللہ چک تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور (ہندوستان) میں قریباً 1868ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حکیم کریم بخش صاحب محکمہ انہار میں ملازم تھے۔ سکول میں داخلہ لینے سے پہلے انہوں نے کلام الٰہی حفظ کیا تھا۔ انہوں نے منڈی کرال ضلع امرتسر کے اسکول سے تعلیم حاصل کی تھی۔

آپ کے تایا میاں قادر بخش بٹالہ میں ملازم تھے۔ وہ سرکاری کام سے اکثر قادیان جایا کرتے تھے اور وہاں حضرت مرزا غلام احمد صاحب سے اکثر ملتے، اکثر کھانا انہی کے ہاں کھاتے تھے۔ وہ حضرت مرزا غلام احمد صاحب کے اوصاف حمیدہ سے بے حد متاثر تھے۔ چنانچہ جب کبھی وہ اپنے گھر فیض اللہ چک جاتے تو

وہاں ان کے اخلاق حسنہ کا ذکر بہت اخلاص اور محبت سے کرتے تھے۔ ایسے رفتہ رفتہ ہمارے نانا جان کے دل میں حضرت مرزا غلام احمد صاحب کے لئے عشق پیدا ہو گیا اور ان کی زیارت کی خواہش دل میں مچلنے لگی۔ یہ 1878ء یا 1879ء کی بات ہے' اس وقت ہمارے نانا جان کی عمر قریباً چودہ پندرہ سال تھی۔ چنانچہ اپنے شوق کی تکمیل کے لئے وہ قادیان تشریف لے گئے اور ایک رات وہاں ٹھہرے۔ حضرت مرزا غلام احمد صاحب سے اس ابتدائی ملاقات کے بعد ان کے دل میں ایک تڑپ سی رہنے لگی اور جب تک وہ حضرت مرزا صاحب کی زیارت نہ کر لیتے انہیں چین نہیں آتا تھا۔ کیونکہ انہوں نے حضرت مرزا صاحب کے اوصاف حمیدہ اس سے کہیں بڑھ کر پائے جو انہوں نے اپنے تایا سے سنے تھے۔ چونکہ ان کا گاؤں قادیان سے چند میل کے فاصلہ پر تھا' اس لئے وہ کثرت سے قادیان جانے لگے' بلکہ اکثر کئی کئی راتیں وہاں رہتے۔ اس زمانے میں بیت مبارک کے شمال کی طرف جو چوبارہ جس کا نام بیت الفکر ہے میں ایک چوبی تخت پر بیٹھ کر کھانا کھاتے جو خود حضرت مرزا غلام احمد صاحب اندر سے لاتے اور اپنے دست مبارک سے مہمانوں کے آگے رکھتے تھے۔ بعد میں خود بھی شامل ہو جاتے۔ یوں آپ ان معدودے چند خوش قسمت احباب میں سے تھے' جنہیں حضرت مرزا غلام احمد صاحب کے دعویٰ سے قریباً دس گیارہ سال قبل ان کی خدمت میں بار بار حاضر ہونے اور فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ جب کبھی سردی کے موسم میں آپ قادیان جاتے تو اسی بیت الفکر میں رکھے چوبی تخت پر رات کو سو جاتے۔ ان دنوں بیت الفکر میں سونے والے تین حضرات ہی ہوتے تھے' یعنی حضرت مرزا غلام احمد صاحب' حضرت حافظ حامد علی صاحب اور ہمارے نانا جان۔

جماعت احمدیہ کا قیام 23 مارچ 1889ء کو عمل میں آیا۔ (عجیب اتفاق ہے کہ قرار داد پاکستان بھی 23 مارچ (1940ء) کو منظور کی گئی تھی اور اب یوم پاکستان 23 مارچ کے دن ہی منایا جاتا ہے) ہمارے نانا جان نے 10 مارچ 1890ء کو بیعت کر کے جماعت احمدیہ میں شامل ہونے کا شرف حاصل کیا تھا۔ اس طرح انہیں بانی سلسلہ احمدیہ کے اولین رفقاء میں شامل ہونے کی سعادت ملی۔ بیعت کرنے والوں میں آپ کا نام ایک سو اکیاسی نمبر پر درج ہے۔

پیشہ کے لحاظ سے ہمارے نانا پٹواری تھے۔ اپنی ملازمت کے دوران وہ ضلع امرتسر میں چنڈیالہ اور ضلع منٹگمری (موجودہ ساہیوال) میں سوبھارام' ملکہ ہانس سنتوکھ داس اور بصیر پور وغیرہ میں متعین رہے۔ آپ کے اخلاق حسنہ کے باعث مسلم کیا اور غیر مسلم کیا سب آپ کو بزرگ باپ جیسا شفیق اور بہی خواہ سمجھتے تھے اور اپنے ذاتی' خاندانی اور دیگر تنازعات کا فیصلہ آپ سے کراتے تھے۔ حتیٰ کہ نمبردار جو گاؤں کی اہم ترین شخصیت ہوتا ہے کو بھی اس وجہ سے آپ کے دروازہ پر اپنی مجلس لگانا پڑتی جس میں اس نے فیصلے کرنے ہوتے۔ آپ خداداد دانشمندی سے معاملات کی تہ تک فوراً پہنچ جاتے اور بالعموم آپ کی رائے ہی قبول کی جاتی۔ ان امور کی وجہ سے لوگ آپ کی خدمت پر بخوشی کمربستہ رہتے۔ افسر بھی آپ کا احترام کرتے اور اکثر امور میں آپ کا مشورہ قبول کرتے۔

آپ رسومات اور تکلفات سے بالا تھے اور مذہب کے معاملہ میں بڑے باغیرت تھے۔ عبادت اور ذکر الٰہی میں منہمک رہتے۔ اکثر ”تیرا فضل تیرا رحم“ ورد زبان رہتا۔ آپ اول درجہ کے مہمان نواز تھے اور آپ کی طبیعت میں منکسر المزاجی بہت تھی۔

آپ 29۔1928ء میں ملازمت سے ریٹائر ہوئے، جس کے بعد انہوں نے قادیان میں رہائش اختیار کر لی۔ 1936ء میں انہیں ریڑھ کی ہڈی کا تپ دق ہوا اور قریباً چھ سال صاحب فراش رہنے کے بعد 23 مارچ 1942ء کو آپ نے وفات پائی۔

(ماخوز رفقائے احمد، جلد سیز دہم، مرتبہ ملک صلاح الدین، ص 250۔280)

ہمارے والد

ہمارے اباجان کا نام محمد حسین تھا، وہ 2 ستمبر 1891ء بمطابق 27 محرم 1309 ہجری کو جھنگ شہر میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم ایم۔بی مڈل اسکول جھنگ شہر میں پائی اور میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول جھنگ سے پاس کیا۔ چونکہ ان دنوں جھنگ میں کوئی کالج نہیں تھا اس لئے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے وہ لاہور چلے گئے۔ وہاں انہوں نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا۔

قبولیت احمدیت

اسلامیہ کالج میں پڑھائی کے دوران وہ جماعت احمدیہ میں داخل ہوئے۔ اپنی ذاتی ڈائری میں اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے انہوں نے لکھا کہ ”میں اسلامیہ کالج لاہور میں کالج بلڈنگ کے اوپر ایک ڈارمیٹری میں رہتا تھا۔ ہم آٹھ کس تھے۔ ایک روز میاں پیر بخش پٹرنگ ریٹائرڈ پوسٹ ماسٹر سکنہ بھاٹی دروازہ لاہور اپنے تبلیغی دورہ پر ہمارے پاس آئے اور کہا کہ ”میں نے مرزائیوں کے خلاف ایک انجمن بنائی ہے، جس کا نام تائید اسلام رکھا ہے، آپ اس کے ممبر بن جائیں۔ ماہوار چندہ چار آنے ہے۔ ہم مرزا صاحب کا پاکھنڈ توڑ کر رکھ دیں گے۔“ میں نے کہا کہ ”اگر وہ شخص سچا ہو تو ہم کدھر جائیں گے؟“ اس نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ میں ممبر نہ بنا اور کہا کہ ”فیصلہ خداوند کریم سے دریافت کریں۔ میں نے دلیل دی کہ ریلوے اسٹیشن لاہور کا راستہ اگر کسی نابکار شخص سے بھی دریافت کریں تو وہ بھی غلط نہ بتائے گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رحیم و کریم خدا سے سیدھا راستہ طلب کریں اور وہ نہ بتائے۔“ چنانچہ میں نے اس دن سے ”ہمیں سیدھا رستہ دکھا“ کا ورد اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے شروع کر دیا اور چالیس روز تک کیا۔ ایک رات میں نے خواب دیکھا کہ ”جھنگ شہر میں ہمارے پرانے (مراد آبائی... ناقل) مکان میں ایک بزرگ تشریف فرما ہیں۔ عمویم حاجی اللہ داد خان انسپکٹر پولیس سامنے کھڑے ہیں اور مجھے بتاتے ہیں کہ یہ وہی بزرگ ہیں جن کی آپ تلاش میں تھے۔ میں نے ان بزرگ کی معیت میں کھانا کھایا۔ اس کے بعد وہ مگھیانہ کی طرف چل پڑے۔ ساتھ ہی اشارہ ہوا کہ یہ قادیان والے ہیں۔ اس کے بعد میں موقع پا کر

قادیان گیا۔ سہ پہر کے وقت وہاں پہنچا۔ مجھے بتایا گیا کہ مولوی نور الدین صاحب (امام اول) اپنے مطب میں تشریف لا رہے ہیں۔ میں ان کے مکان کے اندر گیا۔ قریباً تیس آدمی ان کے انتظار میں بیٹھے تھے' مجھے آخری جگہ بیٹھنے کا موقع ملا۔ تھوڑی دیر بعد امام اول تشریف لائے۔ آپ کو مفتی محمدؑ صادق صاحب اور مرزا خدا بخش صاحب نے سہارا دیا ہوا تھا۔ آپ نے سیدھے میری طرف آنے کی تکلیف کی اور مجھ سے ایسے طریقہ سے پوچھا جیسے وہ پہلے جانتے تھے اور کہا کہ کیا آپ آ گئے ہیں؟ میں نے بھی پہچان لیا۔ آپ نے پوچھا: "کیا بیعت کرنا چاہتے ہیں؟" میں چپ ہو گیا۔ آخر آپ نے فرمایا کہ میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھو اور جو میں کہتا جاؤں تم بھی کہتے جاؤ۔ جس وقت کوئی لفظ طبیعت کے موافق نہ ہو ہاتھ اٹھا لینا۔ میں نے دل میں کہا کہ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ سب حاضرین میرے ساتھ الفاظ دوہرانے میں شامل ہوئے اور میری بیعت ختم ہوئی۔ میں نے اجازت طلب کی تو آپ نے فرمایا کہ مجھے جلدی ملنا (اٹھارہ روز بعد آپ وفات پا گئے۔) دوسرے روز لاہور میں مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ پڑی۔ چونکہ مجھے کہا گیا تھا کہ ہمیشہ سچ بولنا۔ میں سچ ہی بولتا رہا' آخر مخالفین نے احمدیت پر میرے ایمان کو مضبوط کر دیا۔ اللہ انہیں اچھا اجر دے۔"

سپرنٹنڈنٹ احمدیہ ہوسٹل لاہور

لاہور میں قیام کے دوران حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب امام الثانی جماعت احمدیہ نے ازراہ شفقت ابا جان کو احمدیہ ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ مقرر فرمایا' یہ عہدہ اعزازی تھا۔

ہوسٹل کے ساکنین میں سے اکثر لڑکے بعد میں سلسلہ احمدیہ کے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔ چند ایک نام درج ذیل ہیں:

ملک غلام فرید صاحب ایم-اے' مرزا عبدالحق صاحب' شیخ احمد دین صاحب' شیخ محمد احمد مظہر صاحب' صوفی غلام محمد صاحب' صوفی محمد ابراہیم صاحب' شیخ بشیر احمد صاحب' ڈاکٹر میجر شاہ نواز صاحب' نوابزادہ عبداللہ خان صاحب' خلیفہ تقی الدین صاحب' سید حافظ عزیز اللہ شاہ صاحب' سید حافظ محمود اللہ شاہ صاحب' شیخ عطا اللہ راولپنڈی۔

جھنگ واپسی

بدقسمتی سے آپ بی-اے کی ڈگری حاصل نہ کر سکے۔ چنانچہ مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے وہ جھنگ واپس چلے گئے۔ وہاں کچھ عرصہ بے روزگار رہنے کے بعد 1920ء میں انہوں نے گورنمنٹ ہائی سکول جھنگ میں بطور ٹیچر ملازمت اختیار کر لی۔ اس بارے میں ابا جان نے اپنی ڈائری میں تحریر کیا کہ "مجھے 11+55 روپے ماہور تنخواہ ملی۔ پہلی تنخواہ میں نے بہن اور بھتیجی کو دے دی اور دوسری سے بیت (اللہ کے گھر) کا فرش لگوایا۔ جب پانچ ماہ گزرے تو حکم آیا کہ 66 روپے لینے والوں کا گریڈ 80 روپے ہو گیا

ہے۔ مجھے پچھلے عرصہ کا حساب 70 روپے نقد دیا گیا' گویا خدا تعالیٰ نے جو روپیہ میں نے اس کے گھر پر لگایا تھا' نقد واپس کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے' یہ توکل کے فوائد میں سے ایک فائدہ ہے۔"

گورنمنٹ ہائی اسکول جھنگ میں کچھ عرصہ ملازمت کرنے کے بعد انہیں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز ضلع جھنگ کے دفتر میں ایک مستقل ملازمت مل گئی۔ کچھ عرصہ بعد اسی دفتر میں انہیں ہیڈ کلرک کے عہدہ پر ترقی دے دی گئی۔

ان کی حسن کارکردگی کی وجہ سے چند سال بعد انہیں ترقی دے کر بحیثیت ہیڈ کلرک انسپکٹر آف سیکولز ملتان ڈویژن تعینات کیا گیا۔ اس وقت ملتان متحدہ پنجاب کا سب سے بڑا ڈویژن تھا۔ اس میں مندرجہ ذیل اضلاع تھے:

ملتان' لائلپور (موجودہ فیصل آباد)' جھنگ' منٹگمری (موجودہ ساہیوال)' مظفر گڑھ اور ڈیرہ غازی خان۔

اِن اضلاع میں واقع تمام ہائی سکولوں کے اساتذہ کی تبدیلی اور تعیناتی و دیگر انتظامی امور ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز کے دائرہ کار میں تھے۔ علاوہ ازیں تمام اضلاع کے ڈسٹرکٹ انسپکٹر و اسسٹنٹ انسپکٹر آف سکولز' ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز کے ماتحت ہوا کرتے تھے۔ اس لئے ڈویژنل ہیڈ کلرک کا عہدہ بہت اہمیت کا حامل تھا۔ اکثر استاد اپنی تبدیلی رکوانے یا کسی اچھی جگہ پر جانے کے لئے ہیڈ کلرک کو رشوت دینے کے لئے تیار ہوتے تھے۔ لیکن اباجان نے تمام عمر ایمانداری اور دیانت داری سے کام کیا۔ انہوں نے نہ کسی کی کبھی حق تلفی کی اور نہ ہی کسی کا ناجائز کام کیا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ کئی مرتبہ استاد موسم کے لحاظ سے آم اور کھجور کے ٹوکرے ہمارے گھر لاتے تھے۔ لیکن ہمیں سختی سے ایسی چیزیں لینے سے منع کیا ہوا تھا۔

ملتان میں اپنی نئی ذمہ داری کا چارج انہوں نے 2 جنوری 1941ء کو لیا تھا۔ (انگریزوں کے دور میں یکم جنوری کو چھٹی ہوا کرتی تھی) بھائی جان اس وقت فرسٹ ایئر کے طالب علم تھے۔ چنانچہ ابا جان نے فیصلہ کیا کہ جب تک "سلام" ایف۔اے کا امتحان پاس نہیں کر لیتا وہ اپنے بچوں کو ملتان نہیں لے جائیں گے۔ ان کے خیال میں ایسا کرنے سے سلام کی پڑھائی میں ہرج ہوگا۔ چنانچہ تقریباً ڈیڑھ برس انہوں نے ملتان میں اکیلے رہ کر گزارا۔ اس عرصہ میں وہ ہر ہفتے کی شام کو جھنگ آتے اور سوموار کی صبح ملتان واپس جاتے۔ (جھنگ بذریعہ ریل ملتان سے تقریباً ایک سو پانچ میل کے فاصلہ پر ہے) اس قربانی کا صلہ اللہ تعالیٰ نے یوں دیا کہ بھائی جان انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں صوبہ پنجاب میں اول آئے۔

اپریل 1942ء میں بھائی جان کے ایف۔اے کا امتحان دینے کے بعد ابا جان ہمیں ملتان لے گئے۔ ہم وہاں 1954ء تک رہے۔

سرکاری ملازمین کی کارکردگی کے بارے میں محکمہ کا سربراہ سالانہ خفیہ رپورٹ جسے اے۔سی۔آر (Annual Confidential Report) کہا جاتا ہے' لکھتا ہے: ملازمین کی ترقی کا زیادہ تر انحصار اسی

رپورٹ پر ہوتا ہے۔ اباجان کی یہ رپورٹ ہر سال بہت اچھی ہوتی تھی، جس میں اکثر یہ لکھا ہوتا تھا کہ "بہترین کام اور اعلیٰ چال چلن (Excellent work and sterling character)۔"

1951ء میں اباجان ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ ملازمت کے دوران انہوں نے فرض شناسی اور لگن سے کام کیا۔ وہ اپنے افسران بالا اور ماتحت عملہ سے ہمیشہ خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز نے انہیں مندرجہ ذیل سند دی تھی:

نظامت تعلیمات قسمت ملتان

اتحاد، یقین، تنظیم

سند حسن خدمات

جناب چوہدری محمد حسین صاحب سابق ہیڈ کلرک دفتر انسپکٹر آف سکولز کو بسلسلہ دفتری نظام و قابل قدر خدمات کے اعتراف میں عطا کی گئی۔

دستخط

شبیر بخاری

"ناظم تعلیمات قسمت ملتان"

ریٹائرمنٹ کے بعد آپ کی پنشن مبلغ ایک سو پانچ روپے تھی۔ (کمیوٹ کرانے کے بعد) آپ اکثر کہا کرتے تھے کہ "یہ میری والدہ کی دعا کا نتیجہ تھا۔ میں جب بچہ تھا تو میری والدہ دعا کیا کرتیں کہ شالا (خدا کرے) محمد حسین دی تنخواہ سو روپے ہوئے۔" اس زمانہ میں سو روپے ایک بہت بڑی رقم ہوتی تھی۔

ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد آپ نے کچھ عرصہ ایک جگہ پرائیویٹ ملازمت کی لیکن آپ کا مزاج مختلف تھا، اس لئے اسے چھوڑ دیا۔ بالآخر 1954ء میں آپ ملتان سے اپنے آبائی وطن جھنگ شہر منتقل ہو گئے۔

ملتان میں ملازمت کے دوران آپ کو جماعت احمدیہ کی خدمت کی توفیق ملتی رہی۔ آپ جماعت کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ 1947ء سے 1954ء آپ جماعت ہائے احمدیہ ضلع ملتان کے منتخب امیر رہے۔

تربیت اولاد

جب ہم بچے تھے تو رات سونے سے پہلے ہمیں اکثر چھوٹی چھوٹی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ جن میں اخلاقی پہلو ہوتے۔ اس کے علاوہ ہر بچے کی تعلیم کا جائزہ بھی لیا کرتے اور جہاں کسی کمی کو محسوس کرتے، اُسے دور کرنے کی سعی فرماتے تھے۔

آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث "اپنی اولاد کی عزت کرو۔" پر عمل فرماتے ہوئے اپنے بچوں کو تم یا توں کہنے کی بجائے "تسیں" کہہ کر مخاطب ہوتے تھے۔

دوستوں کے انتخاب میں ہمیں یہ حدیث مبارکہ سنایا کرتے۔ ترجمہ: "آدمی اپنے دوست کی عادات و اطوار کو اختیار کرتا ہے' اس لئے دوست اختیار کرتے وقت اچھی طرح دیکھ بھال کرلیا کرو کہ کس شخص سے دوستی کر رہے ہو۔" مشکوۃ۔ یہی بات ہمیں اس مثال سے بھی سمجھایا کرتے کہ اگر سفید رنگ اور سرخ رنگ کے بیلوں کو ایک ساتھ ایک ہی کھونٹے پر باندھا جائے تو ان کے رنگ تو تبدیل نہیں ہوں گے' البتہ کچھ عرصہ بعد وہ ایک دوسرے کی خصلتیں ضرور اختیار کرلیں گے۔ پھر فارسی کا یہ شعر بھی ہمیں اکثر سنایا کرتے تھے:

دُور شو از اختلاط یار بد — یار بد بدتر بود ازمار بد
مار بد گر تو زند برجان زند — یار بد گر تو زند برجان وبر ایمان زند

ترجمہ: "برے دوست کی دوستی سے دُور رہو کیونکہ اس سے دوستی سانپ کے ڈسنے سے بھی بری ہوتی ہے۔ اگر سانپ تجھے ڈس لے تو صرف تیری جان ہی جائے گی' جبکہ برے دوست سے دوستی نہ صرف تیری جان لے لے گی بلکہ تیرا ایمان بھی جاتا رہے گا۔"

ہمیں عربی کے مندرجہ ذیل اشعار یاد کرایا کرتے تھے:

بِقَدْرِ الْکَدِّ تنْقَسِمُ الْمَحَالِي — فَمَنْ طَلَبَ العَلَلا سِحرِ اللّيَالِي
تَذِيْذُ العِزَّ ثُمَّ تَنَامُ لَيْلاً — يَغُوْصُ البَحرَ مَنْ طَلَبَ اللآلِي
وَمَنْ طَلَبَ الْعُلى مِن غَير كد — اضَاعَ العُمْرَ فِيْ طَلَبَ الْمَحَال

ترجمہ: تکلیفوں کی برداشت کے اندازوں پر مرتبے تقسیم ہوتے ہیں' جو بزرگی کا طلب گار ہے وہ راتوں کو جاگتا ہے۔ تو اے مخاطب! چاہتا تو عزت ہے مگر راتوں کو سوتے گزارتا ہے۔ یاد رکھ! کہ سمندر میں غوطہ وہی لگاتا ہے جو لعلوں کا طلب گار ہوتا ہے۔ جس نے بغیر محنت کے بزرگی کی خواہش کی اس نے بے محال شے کے حصول میں اپنی زندگی کو ضائع کر دیا۔"

عربی کے انہیں اشعار کے متبادل ہمیں انگریزی کے مندرجہ شعر سنایا کرتے تھے۔

HEIGHTS BY GREAT MEN REACHED AND KEPT
WERE NOT ATTAINED BY SUDDEN FLIGHT
BUT THEY WHILE THEIR COMPANIONS SLEPT
WERE TOILING UPWARDS IN THE NIGHT

بچپن میں ہمیں اس بات کی تلقین فرمایا کرتے تھے کہ مغرب کی عبادت سے پہلے ہم گھر واپس آ جایا کریں۔ فرمایا کرتے تھے کہ جو بچے مغرب کے بعد اپنے گھر سے باہر رہتے ہیں' ان پر شیطان قبضہ کر لیتا ہے۔ اس بات نے ہمارے دلوں میں ایک ایسا ڈر اور خوف پیدا کر رکھا تھا کہ ہماری یہ کوشش ہوتی تھی کہ مغرب سے پہلے گھر واپس پہنچ جائیں۔ اب ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ تربیت کا یہ کیسا مؤثر انداز تھا۔

ہمیں یہ بات بھی ذہن نشین کرائی جاتی کہ "اپنی چیزیں اِدھر اُدھر نہ رکھا کرو بلکہ ہر ایک چیز کے لئے جگہ مقرر کریں اور پھر ہر چیز کو اس کی مقرر کردہ جگہ پر رکھا کریں۔" یہی بات انگریزی میں یوں بیان فرماتے تھے:

Have a place for every thing and keep every thing in its proper place.

میں نے اپنی زندگی میں اس نصیحت پر عمل کر کے بہت فائدہ اٹھایا۔

مندرجہ بالا باتوں کے علاوہ ہماری تربیت کے لئے چھوٹی چھوٹی باتیں اور احادیث سنایا کرتے تھے' جن کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ ہم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے پیروکار بنیں اور ہمارے اخلاق اچھے ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کو والہانہ عشق تھا۔ اپنی ڈائری میں ایک مقام پر آپ نے تحریر فرمایا کہ "میں نے ایک حدیث پڑھی کہ حضرت جبرائیل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ جو شخص تیرا نام نامی سنے اور درود شریف نہ پڑھے اُس کا ناک خاک آلودہ ہو۔ چونکہ میرے نام کا پہلا حصہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی سے شروع ہوتا ہے' میرے دل میں ڈر آ گیا کہ مجھ پر بھی دستخط کرتے وقت ہمیشہ درود شریف پڑھنا فرض ہے۔ مجھے منصبی طور پر دن میں بے شمار بار دستخط کرنے پڑتے تھے۔ میں نے ہر بار درود شریف پڑھنا اپنے لئے لازمی قرار دے دیا۔ ہندو' سکھ اور مسلمان حیران ہوتے تھے کہ یہ کیا پڑھتا رہتا ہے۔"

ذکر الٰہی اور دعا

ذکر الٰہی آپ کی روح کی غذا تھی اور آپ اس کثرت کے ساتھ کرتے تھے کہ ہر آن دعاؤں میں مصروف رہنا آپ کی فطرت ثانیہ بن چکا تھا۔ اس حقیقت پر کہ دعا بجائے خود قوت و طاقت کا ایک زبردست خزانہ ہے اور یہ غیر ممکن کو بھی ممکن میں بدل دیتی ہے۔ آپ کو ایسا پختہ ایمان حاصل تھا کہ آپ حق الیقین کے مرتبہ پر پہنچے ہوئے تھے۔ خود دعائیں کرنے سے کبھی نہ تھکتے نہ ماندہ ہوتے تھے۔ بلکہ دوسروں کو بھی دعائیں کرنے کی تلقین کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے۔ سب سے اہم' سب سے بڑی اور سب سے عظیم قبولیت و نصرت جو آپ کو عطا ہوئی وہ اس خدائی وعدہ کا آپ کے حق میں پورا ہونا تھا کہ:

ترجمہ: ”وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے‘ پھروہ مستقل مزاجی سے اس عقیدہ پر قائم ہو گئے۔ اُن پر فرشتے اُتریں گے‘ یہ کہتے ہوئے کہ ڈرو نہیں اور کسی پچھلی غلطی کا غم نہ کرو اور اُس (دینوی و اُخروی) جنت کے ملنے سے خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم دنیا میں بھی تمہارے دوست ہیں اور آخرت میں بھی اور اس (دینوی و اُخروی جنت) میں جو کچھ تمہارے جی چاہیں گے تم کو ملے گا اور جو کچھ تم مانگو گے وہ اس میں تم کو دیا جائے گا۔ یہ بخشنے والے اور بے انتہا کرم کرنے والے خدا کی طرف سے مہمانی کے طور پر ہو گا۔“

(حٰم السجدہ 31-32)

آپ کے حق میں اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ اس کے فضل خاص کے نتیجے میں پورا ہوا اور بڑی شان کے ساتھ پورا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے نزول ملائکہ کے ذریعے آپ کو رویا و کشوف کی نعمت سے نوازا اور اپنی خاص الخاص بشارتوں کا مورد بنا کر وہ کچھ اس دنیا میں بھی عطا کیا جو آپ نے اپنے خدا سے مانگا یا آپ کے دل نے چاہا۔

ماخوذ: (سوانح محمد حسین‘ ص 269-270)

آپ عبادت اول وقت پر ادا کرتے۔ رات جلد سو جاتے تا پچھلی رات کی عبادت کے لئے وقت پر بیدار ہو سکیں۔ گھر میں فجر‘ مغرب اور عشاء کی عبادات باجماعت ادا کرنے کا التزام فرماتے تھے۔ فجر کی عبادت کے بعد کلام الٰہی باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ اس کے بعد حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کا مندرجہ ذیل شعر بہت باقاعدگی سے اونچی آواز میں پڑھتے تھے:

اہل وقار ہویں فخر دیار ہوویں
با برگ و بار ہوویں اک سے ہزار ہوویں

خطوط نویسی

جماعت احمدیہ کے ائمہ‘ بزرگان‘ دوست اور عزیز و اقارب کو بہت باقاعدگی سے خط لکھتے تھے اور وصول ہونے والے خطوط کا جواب فوراً دیا کرتے تھے۔

بھائی جان کو بھی باقاعدگی سے خط لکھتے اور وہ بھی اسی باقاعدگی سے آپ کے خطوط کا جواب دیتے تھے۔ اپنے خطوط میں بھائی جان کو یوں مخاطب فرماتے: ”عزیز از جان سلمہ المنان بصرہ‘ والا حسان“ اور بھائی جان اباجان کو یوں مخاطب فرماتے تھے: ”قبلہ و کعبہ دام ظلکم“

انگلستان کا سفر اور قیام لندن

بھائی جان کی بہت خواہش تھی کہ پیرانہ سالی میں وہ اپنے والدین کی خدمت کریں۔ چنانچہ اپریل 1959ء میں بھائی جان آپ کو اور والدہ صاحبہ کو اپنے ساتھ لندن لے گئے۔ بھائی جان نے لندن کے پٹنی

کے علاقہ میں مکان خریدا تھا جو بیت الفضل لندن سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس علاقہ میں مکان خریدنے کی وجہ یہی تھی کہ ابا جان کو بیت الفضل میں آنے جانے میں دقت نہ ہو۔

لندن میں آپ نے قریباً چار سال قیام کیا۔ اس دوران انہوں نے ایک سو سے زائد لیکچر اور تقاریر کیں جو زیادہ تر بچوں اور نوجوانوں کی دینی تربیت کے لئے تھیں۔

انگلستان سے واپسی

دسمبر 1962ء کے آخری ہفتہ میں آپ براستہ سعودی عرب پاکستان واپس آئے۔ وہاں آپ نے عمرہ کیا اور مدینہ المنورۃ کی زیارت بھی کی۔ اس سفر میں محترمہ والدہ صاحبہ' بھائی جان اور چھوٹا بھائی محمد عبدالماجد ان کے ہمراہ تھے۔ اس سفر سے آپ بہت خوش تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دیرینہ خواہش پوری فرمائی۔

لندن سے واپسی کے بعد آپ زیادہ عرصہ کراچی میں میرے پاس یا عزیز محمد عبدالماجد کے پاس رہے۔ وقفے وقفے کے بعد آپ شیخوپورہ اور ملتان میں بھی قیام کے لئے جاتے رہے۔ وہاں میرے بڑے بھائی محمد عبدالسمیع اور ہمشیرگان باجی مسعودہ بیگم اور باجی حمیدہ بیگم اور ہمارا چھوٹا بھائی ڈاکٹر محمد عبدالقادر رہتے تھے۔

کراچی میں قیام کے دوران آپ نے متعدد دینی لیکچر دیئے۔

آخری بیماری اور وفات

23 مارچ 1969ء کو آپ بذریعہ ہوائی جہاز ملتان تشریف لے گئے۔ وہاں آپ کو بندش پیشاب کے علاوہ اچانک دل کی تکلیف ہو گئی' جب علاج معالجہ کے باوجود آفاقہ نہ ہوا تو 3 اپریل کو میں ڈاکٹر حامد شفقت (جو کراچی میں ان کے معالج تھے) کو ملتان لے گیا۔ انہوں نے معائنہ کرنے کے بعد علاج کے لئے کراچی چلنے کا مشورہ دیا۔ اس وقت آپ پر نیم بے ہوشی طاری تھی۔ ڈاکٹر آئی-ایچ عثمانی چیئرمین پاکستان ایٹمی توانائی کمشن کی کوششوں سے 4 اپریل کو ہوائی جہاز میں نشستوں کا بندوبست ہوا اور آپ کو جہاز میں لیٹا کر کراچی لے جایا گیا۔ سفر کے دوران اپنے بازوؤں کو دھونے کی کوشش کرتے' جیسے وضو کرنا چاہتے ہوں۔

کراچی پہنچ کر آپ کو جناح ہسپتال کے وی-آئی-پی کمرے میں رکھا گیا اور ڈاکٹر حامد شفقت اور ڈاکٹر ذکی حسن نے آپ کا علاج شروع کر دیا۔

جیسے ہی ابا جان کی طبیعت خراب ہوئی' اسی وقت بھائی جان کو لندن اطلاع دی گئی' لیکن وہ اس وقت نیویارک میں تھے۔ اس بارے میں مزید تفصیل کے لئے بھائی جان کے اس خط کی نقل دی جاتی ہے جو انہوں نے شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی کو لکھا تھا۔ (پانی پتی صاحب نے ابا جان کی ڈائریوں سے سوانح محمد حسین مرتب کی تھی۔)

"ابا جان کو ذیابیطس 1959ء سے تھی۔ (بھائی جان کو یہاں غلطی لگی ہے یا صحیح نہیں لکھا گیا۔ ابا جان کو ذیابیطس 1951ء سے تھی۔ مرتب/ناقل) دل کی تکلیف 1966ء میں شروع ہوئی۔ اس کے بعد سے وہ ہمیشہ لکھتے رہے کہ "میں مسافر ہوں۔" لیکن ہمت اس قدر بلند تھی کہ ہمیشہ ڈاکٹروں کے مشورہ کے خلاف جہاں کوئی دینی یا جماعتی تقریب ہوتی وہاں باوجود بیماری کے پہنچ جاتے۔ مثلاً درس کلام الٰہی کے دوران کئی کئی گھنٹے بیٹھے رہتے۔ تربیتی اور تبلیغی جلسوں میں التزام سے جاتے اور غشی طاری ہونے کے باوجود وہاں سارے وقت موجود رہتے۔ اس طرح اپنی بیماری کا لحاظ کئے بغیر وہ اپنی طاقت کو پوری طرح صرف کرتے۔ ظاہر ہے ایسی تقریبات کے بعد ان کی بیماری بڑھ جاتی۔

حضرت والد صاحب کی آخری بیماری کے وقت میں نیویارک میں تھا' جہاں یونائیٹڈ نیشن میں شامل ہونے کے لئے گیا ہوا تھا۔ اس اثناء میں مجھے لندن سے فون آیا کہ ابا جان کراچی میں بیمار ہیں' جس پر میں نے نیویارک سے کراچی فون کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلہ میں وائٹ ہاؤس کی امداد لی۔ اُن کا خاص سرکٹ ہوتا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ کراچی میں گھنٹی بج رہی ہے لیکن آپریٹر اٹھاتا نہیں۔ بہرکیف میں نے اپنی میٹنگ وہیں چھوڑی اور سیدھا نیویارک سے کراچی پہنچا۔ اس وقت عزیز حمید اباجان کو ملتان سے کراچی لا رہا تھا۔ ان پر غشی اور غنودگی طاری تھی لیکن جہاز سے ایمبولینس میں اترے تو مجھے چوما۔ ہسپتال میں تین دن رہے' آخری رات میں ان سے ساڑھے نو بجے کے قریب رخصت ہُوا۔ اُس وقت ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ روبصحت ہو رہے ہیں' لیکن یہ آخری پلٹا تھا۔ رات کے تین بجے نیند میں ہی دل کا حملہ ہوا اور اپنے مولا سے جا ملے۔

جس التزام سے ابا جان عبادت کے لئے اس آخری بیماری میں اپنے خشک ہاتھوں سے بار بار تیمم کرتے۔ آستین کھول کر بازو دھونے کی کوشش کرتے' اس کی یاد بار بار آتی ہے۔ اللہ پاک ان پر اپنا خاص الخاص فضل کرے۔

آخری بیماری میں ڈاکٹروں نے ڈرپ لگایا ہوا تھا۔ اُس سے بہت تکلیف تھی' چوبیس گھنٹے سوئی لگی ہوئی ہے اور بازو اوپر سلنگ میں لگا ہوا ہے۔ اب سوچتا ہوں کہ انہیں کس قدر تکلیف ہوتی ہوگی۔ ہم سے وہ بار بار اسے نکالنے کے لئے کہتے تھے۔ آپ نے ایک بار فرمایا تھا کہ وہ فرشتہ تھا۔ ان کے کردار کی یہ کیفیت جس قدر اس آخری بیماری میں اُجاگر ہوئی اس کا بیان نہیں کر سکتا۔

"عبدالسلام"

(سوانح محمد حسین' ص 229-230)

تدفین

آپ نے 7 اپریل بروز دو شنبہ 1969ء کو 3 بجے علی الصبح جناح ہسپتال کراچی میں رحلت فرمائی۔ کراچی میں کثیر تعداد میں احباب نے میرے گھر پر جنازہ پڑھا اور ان کی آخری زیارت کی۔ اسی روز آپ کا جسد خاکی کراچی سے بذریعہ ہوائی جہاز لائلپور (موجودہ فیصل آباد) اور وہاں سے بذریعہ ایمبولینس ربوہ تدفین کے لئے لے جایا گیا۔

ربوہ میں آپ کا جنازہ حضرت مرزا ناصر احمد صاحب امام الثالث جماعت احمدیہ نے پڑھایا اور انہوں نے ازراہ شفقت آپ کے تابوت کو خاصی دور تک کندھا دیا۔

آپ کی دینی خدمات کی وجہ سے حضرت امام الثالث نے آپ کے جسد خاکی کو بہشتی مقبرہ میں مبشرین کے قطعہ خاص میں سپرد خاک کرنے کی اجازت رحمت فرمائی۔

والدہ

ہماری والدہ ماجدہ کا نام ہاجرہ بیگم تھا۔ وہ 1903ء میں فیض اللہ چک تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور (انڈیا) میں پیدا ہوئیں تھیں۔ آپ کے والد کا نام حضرت حافظ نبی بخش تھا، جن کے حالات زندگی پیش کئے جا چکے ہیں۔

آپ کے دو بھائی اور پانچ بہنیں تھیں۔ آپ کے بڑے بھائی محترم حکیم فضل الرحمٰن صاحب نے اپنی زندگی دین کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ اُنہیں گولڈ کوسٹ (غانا) اور نائیجیریا میں بطور مشینری انچارج جماعت احمدیہ تقریباً 25 سال خدمت کرنے کی توفیق ملی۔ آپ کے چھوٹے بھائی محترم ملک حبیب الرحمٰن صاحب شعبہ تعلیم سے منسلک تھے اور ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے تھے۔

آپ کی شادی ہمارے ابا جان سے 1925ء میں ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سات بیٹے اور ایک بیٹی عطا کی۔ سب سے بڑے بیٹے محترم ڈاکٹر عبدالسلام تھے۔

چونکہ ہمارے نانا جان حافظ قرآن کریم تھے، اس لئے والدہ صاحبہ کو کلام الٰہی کا بیشتر حصہ حفظ تھا۔ اپنے لیکچر تیار کرنے کے سلسلہ میں جب کبھی حضرت ابا جان کو کسی حوالہ کی ضرورت پڑتی تھی تو آپ سپارہ کا نمبر اور سورۃ کا نام بتا دیا کرتیں تھیں۔ انہوں نے اپنے بچوں کو کلام الٰہی پڑھایا تھا۔ اس کے علاوہ اپنے محلّہ کے بچوں اور بچیوں کو بھی کلام الٰہی پڑھایا کرتیں تھیں۔

آپ نے اپنے بچوں کی تربیت پر خاص طور پر توجہ دی تھی۔ اُن کی تربیت کا رنگ اتنا گہرا اور سبق آموز ہوا کرتا تھا کہ ہم سب بہن بھائی اپنے آپ کو اُسی رنگ میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آپ نے اپنے بچوں کو کبھی بھی بدنی سزا نہ دی تھی۔ اگر کبھی کوئی بچہ کچھ زیادہ ہی شرارت کرتا تھا تو اُسے صرف اتنا کہتیں کہ "تمہارے ابا کو بتاؤں گی۔" اگرچہ ابا جان نے بھی کبھی کسی بچہ کو بدنی سزا نہیں دی تھی لیکن اُن کا رعب اور دبدبہ اتنا تھا جس کی وجہ سے ہم بچے اپنی شرارتوں سے بعض آجاتے تھے۔

آپ شب بیدار تھیں اور عبادات نہایت خضوع و خشوع سے اول وقت پر ادا کرتی تھیں۔ فجر کی عبادت کے بعد تلاوت کرنے کے بعد گھر کا کام شروع کرتیں تھی۔ گھر کا سارا کام وہ خود اپنے ہاتھوں سے کرتی تھیں۔

سچے خواب اللہ تعالیٰ اُنہیں پہلے ہی دکھا دیتا تھا' لیکن اُنہوں نے اس پر کبھی ناز نہیں کیا۔ محترم بھائی جان ڈاکٹر عبدالسلام نے میٹرک کا امتحان ابھی نہیں دیا تھا کہ اُنہوں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب امام الثانی جماعت احمدیہ سے اپنے بیٹے کے لئے کلاہ پر پگڑی بندھوائی ہے اور اُن کی خدمت میں گاجر کا مربہ پیش کر رہی ہیں۔ چنانچہ اُنہوں نے جھنگ سے قادیان کا لمبا سفر کیا۔ حضرت امام الثانی جماعت احمدیہ کے لئے اپنے ہاتھوں سے تیار کردہ گاجر کا مربہ لے گئیں اور اپنے بیٹے کے لئے کلاہ پر پگڑی بندھوا آئیں۔

ہر ملنے والا ہمیشہ اُن کا مداح رہا۔ غریب کا درد' سادگی' ہمدردی' غمگساری' رشتہ داروں' ہمسایوں سے شفقت کا سلوک آپ کا خاصا فطرت تھا۔ ہم نے اُنہیں کسی کی غیبت یا کسی کے ساتھ ناراض ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ خلاف طبیعت کوئی بات سنتیں تو درگزر کرتیں۔ فرمایا کرتیں تھیں کہ بات کو لمبا نہ کرنے میں خیر ہوتی ہے۔ اپنی ساتوں بہوؤں کے ساتھ مادر مہربان کی طرح سلوک کرتیں تھیں اور انہیں اس بات کا کبھی احساس تک نہ ہونے دیتیں کہ وہ اُن کی ساس ہیں۔ اس وجہ سے وہ بھی آپ پر اپنی جانیں نثار کرتیں تھیں اور ان کی خدمت پر کمربستہ رہتیں تھیں۔

علالت' وفات' تدفین

اپریل 1969ء میں حضرت ابا جان کی وفات کے بعد محترمی بھائی جان اُنہیں اپنے ساتھ لندن لے گئے تھے۔ وہاں قریباً سات سال قیام کرنے کے بعد دسمبر 1976ء میں پاکستان واپس تشریف لائیں اور وقفے وقفے کے بعد اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کے پاس مظفر گڑھ' کراچی اور ملتان رہتی رہیں۔ چند دن میرے پاس بھلوال ضلع سرگودھا میں بھی رہیں۔ ستمبر 1977ء میں مکرمی بھائی جان ایک بار پھر اُنہیں لندن لے گئے۔ علیل تو رہتی ہی تھیں' لیکن لندن جانے کے بعد اُن کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ اُنہیں ہائی بلڈ پریشر تھا' جس کے علاوہ کچھ دیگر معارض بھی ہو گئے۔ چنانچہ اُنہیں لندن کے ایک ہسپتال میں داخل کرایا گیا لیکن ان کی صحت روز بروز گرتی چلی گئی' آخر الٰہی تقدیر پوری ہوئی اور آپ 7 اکتوبر 1977ء کو وفات پا گئیں۔ میں اس وقت ایران میں بسلسلہ ملازمت گیا ہوا تھا۔ ان کی وفات کی جس وقت مجھے اطلاع ملی میں ایران کے ایک شہر رضائیہ جو تبریز سے آگے ترکی کی سرحد کے قریب ہے' میں کام کر رہا تھا۔ میں وہاں سے فوراً تہران پہنچا اور وہاں سے کراچی اور پھر ربوہ پہنچا۔ اس سفر میں اللہ تعالیٰ نے معجزانہ رنگ میں میری مدد فرمائی اور مجھے ان کا آخری دیدار کرنے کا موقع مل گیا۔

آپ کے جسد خاکی کو مکرمی بھائی جان لندن سے ربوہ لائے۔ آپ کا جنازہ حضرت مرزا ناصراحمد صاحب امام الثالث جماعت احمدیہ نے پڑھایا اور ازراہ شفقت بہشتی مقبرہ میں مبشرین کے قطعہ خاص میں اباجان کے عین سرہانے کی طرف دفن کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔ آپ نے ایک مرتبہ حضرت مرزا ناصراحمد صاحب کی خدمت میں گزارش کی تھی کہ انہیں اُن کے خاوند کے قدموں میں دفن کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس پر حضرت امام الثالث نے فرمایا تھا کہ ”آپ کے شوہر نامدار نے ہمیشہ آپ کو سر آنکھوں پر بٹھایا تھا' ہم بھی آپ کو ان کے سرہانے کی طرف جگہ دیں گے۔“

ہمارے تایا

آپ کا نام غلام حسین تھا۔ آپ 21 جنوری 1874ء کو جھنگ شہر میں پیدا ہوئے۔

آپ نے ایم۔بی مڈل سکول جھنگ شہر سے مڈل کا امتحان پاس کیا تھا اور صوبہ پنجاب میں اول آئے تھے۔ میٹرک کا امتحان آپ نے گورنمنٹ ہائی سکول جھنگ سے دیا تھا اور صوبہ میں دوسرے نمبر پر آئے تھے۔ جھنگ میں چونکہ کوئی کالج نہیں تھا' اس لئے مزید تعلیم آپ نے مشن کالج (موجودہ ایف۔سی کالج) لاہور سے حاصل کی اور امتیاز کے ساتھ بی-اے کا امتحان پاس کیا۔

ملازمت

تعلیم مکمل کرنے کے بعد کچھ عرصہ آپ نے گورنمنٹ ہائی اسکول جھنگ میں ملازمت کی۔ بعد میں آپ پنجاب ایجوکیشنل سروس (PES) سے منسلک ہو گئے اور آپ کو ڈیرہ غازی خان میں بطور اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز (ADI) متعین کیا گیا۔ اس کے بعد آپ کو گورنمنٹ ہائی اسکول لدھیانہ میں ہیڈماسٹر مقرر کیا گیا۔ وہاں آپ نے بہت محنت اور جانفشانی سے کام کیا جس کی وجہ سے اُنہیں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز (DI) کے عہدہ پر ترقی دے دی گئی۔ انہوں نے اسی عہدہ پر کرنال' فیروزپور اور ڈیرہ غازی خان میں کام کیا۔

1932ء میں آپ ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے کچھ عرصہ بعد تک آپ اپنے آبائی وطن جھنگ شہر میں رہے۔ ملازمت کے دوران 1927ء میں انہوں نے قادیان میں اپنا مکان تعمیر کرا لیا تھا۔ چنانچہ 35-1934ء میں آپ قادیان منتقل ہو گئے۔ تقسیم ہند کے فوراً بعد آپ چند دن ملتان ہمارے ہاں رہے اور بعد میں انہوں نے جھنگ شہر میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

مذہبی رجحان

ابتداء میں آپ نے تعلیم اہل حدیث لوگوں میں پائی۔ آپ کلام الٰہی اور حدیث کے اچھے عالم تھے۔ عالم شباب میں جامع..... جھنگ شہر کے خطیب مقرر ہوئے۔ اس بیت کے اردگرد ہندوؤں کی دکانیں تھیں۔

ایک مرتبہ خطبہ جمعہ دینے کے بعد جب آپ باہر نکلے تو وہاں ایک ہندو دکاندار جو آپ کا منتظر تھا' نے دین الٰہی پر کچھ اعتراضات کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ کیا کبھی انہوں نے شیطان دیکھا ہے جو اس کے بارے میں اتنا لمبا خطبہ دیا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ "میں نے نہ صرف شیطان کو دیکھا ہے بلکہ تمہیں بھی دکھا سکتا ہوں۔" یہ سُن کر اس ہندوؤ نے شیطان دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے اسے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی۔ وہ ہندوؤ شیطان دیکھنے کے شوق میں خوشی خوشی آپ کے ساتھ چل پڑا۔ اپنے مکان پر پہنچنے کے بعد وہ خود تو مکان کے اندر چلے گئے اور اس ہندوؤ سے کہا کہ وہ وہیں ان کا انتظار کرے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ باہر آئے تو ان کے ہاتھوں میں ایک آئینہ تھا۔ جسے انہوں نے اس ہندوؤ کو دیتے ہوئے کہا کہ وہ اس کے اندر دیکھے اسے شیطان نظر آئے گا۔ اس بات سے وہ بہت شرمندہ ہوا اور آئندہ اس نے دین الٰہی پر اعتراضات کرنا بند کر دیئے۔

مشن کالج لاہور میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران آپ کے زہد و تقویٰ کی وجہ سے پرانا قلعہ لاہور کے قریب بیگم شاہی.... میں آپ کو امام مقرر کیا گیا تھا۔ انہی ایام میں آپ کو حضرت مرزا غلام احمد صاحب کے دعویٰ کا علم ہوا' چنانچہ آپ نے حضرت مرزا غلام احمد صاحب کے ایک اشد ترین مخالف مولوی محمد حسین صاحب سے مل کر حضرت مرزا صاحب کی مخالفت کی' جس میں آپ اتنے بڑھ گئے کہ انہوں نے حضرت مرزا صاحب کی مخالفت میں ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کے بعد آپ شدید ہیضہ میں مبتلا ہو گئے۔ ابا جان بتاتے تھے کہ حکماء اسے "کالا ہیضہ" کہتے تھے۔ چنانچہ انہیں علاج کے لئے لاہور لایا گیا۔ وہاں علاج سے ان کی طبیعت سنبھل گئی' جس کے بعد انہیں خیال آیا کہ کہیں وہ بیماری (حضرت) مرزا غلام احمد (صاحب) کی مخالفت کرنے کی وجہ سے نہ ہوئی ہو۔ جب آپ مکمل طور پر روبصحت ہو گئے تو انہوں نے حضرت مرزا صاحب کے دعویٰ پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا اور ان کی مخالفت ترک کر دی۔ بالآخر ایک خواب کی بنا پر وہ جماعت احمدیہ میں داخل ہو گئے۔ لیکن اس بات کا انہیں تمام عمر افسوس رہا کہ حضرت مرزا غلام احمد صاحب کی زندگی میں وہ اس سعادت کو حاصل کرنے سے محروم رہے۔

شیخ محمدؒ اسمٰعیل پانی پتی جنھوں نے ہمارے ابا جان کی ڈائریوں سے "سوانح محمد حسین" مرتب کی تھی نے تایا جان کے بارے میں تحریر کیا:

"چودھری محمد حسین صاحب کے بڑے بھائی چودھری غلام حسین صاحب عرصہ دراز تک پنجاب کے مختلف اضلاع میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز رہے۔ مجھ سے اُن کے تعلقات اُس وقت سے تھے' جب وہ کرنال میں تعینات تھے۔ پانی پت ضلع کرنال میں واقع ہے۔ چودھری صاحب سرکاری دورے پر پانی پت آتے تو مجھے بڑی شفقت اور محبت سے ملتے اور یہ مخلصانہ تعلقات آخر وقت تک قائم رہے۔"

"حضرت چودھری صاحب باوجود حد درجہ مذہبی آدمی ہونے کے بڑے بذلہ سنج لطیفہ گو' شگفتہ مزاج اور باغ و بہار قسم کے انسان تھے۔ لطیف مزاح اُن کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا اور اُن کا شائستہ طنز بہت ہی

پرلطف ہوتا تھا۔ جب وہ کرنال میں تھے تو کسی ضرورت سے دہلی گئے۔ وہاں شرفاء کی ایک مجلس میں پنجابی زبان کا مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ اُن لوگوں کو چاہیے تھا کہ چودھری صاحب کے جانے کے بعد وہ اخلاقاً اس گفتگو کو بند کر دیتے جو پنجابی ہونے کے لحاظ سے چودھری صاحب کے لئے یقیناً ناگوار تھی' مگر انہوں نے سلسلہ کلام کو جاری رکھا اور بدستور اردو کے مقابلے میں پنجابی کا مذاق اُڑاتے رہے۔ مزید ستم یہ کیا کہ حاضرین میں ایک صاحب اُن سے فرمانے لگے کہ "حضرت آپ کچھ نہیں بولتے؟" چودھری صاحب پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے' فرمانے لگے: "جناب! ہم کیا اور ہماری زبان کیا۔ زبان تو ماشاء اللہ آپ کی ہے' جس میں حضرت کے معنی بدمعاش کے' صلوٰۃ کے معنی گالی کے۔ خلیفہ کے معنی نائی کے اور استاد کے معنی عیار کے ہیں۔" یہ سنتے ہی سارے مجمع پر سناٹا چھا گیا اور لوگ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے مگر جواب کسی سے بن نہ آیا۔"

ایک دوسری جگہ پانی پتی صاحب نے لکھا ہے کہ "حضرت چودھری صاحب نہایت صلح کل' بے تعصب اور مرنجاں مرنج قسم کے افسر تھے۔ ہندوؤ اور مسلمان مدرسین سے بالکل ایک جیسا سلوک کرتے تھے۔ سب اُن سے خوش تھے اور وہ سب سے خوش تھے۔ ساری عمر کسی مدرس کو اُن کے ہاتھ زبان یا قلم سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ ماتحتوں سے نہایت شریں زبانی مہربانی اور نرمی سے پیش آتے تھے۔ کسی سے کوئی شکایت بھی پیدا ہوتی تو نہایت لطیف پیرائے میں اُس کو توجہ دلاتے تھے۔ ایک مرتبہ کرنال کے دیہات کا اچانک دورہ کر رہے تھے' ایک گاؤں کے اسکول میں پہنچے تو مدرس صاحب غائب تھے۔ اُن کا حقہ میز پر رکھا ہوا تھا اور طلباء پڑھائی میں مصروف تھے۔ انہوں نے ڈھونڈ کر لاگ بک نکالی اور اُس پر اپنے معائنہ کی کیفیت اس طرح لکھی۔ "میں معائنہ کے لئے اسکول میں گیا۔ مدرس صاحب کو کوئی بہت ضروری کام پیش آ گیا تھا' وہ اپنے نائب کو سارا کام سپرد کر کے کہیں تشریف لے گئے تھے اور نائب صاحب کی موجودگی میں لڑکے نہایت باقاعدگی اور خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھے۔" (چودھری صاحب کی نائب سے مراد وہ حقہ تھا جو مدرس صاحب جاتے ہوئے میز پر رکھ گئے تھے۔)
(سوانح محمد حسین' ص 51' 53' 54)

ارض مقدس میں جانا

آپ نام و نمود اور دکھاوے سے ہمیشہ متنفر رہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد آپ حج کو گئے' لیکن کئی ماہ تک واپس نہ آئے اور نہ ہی اپنے بارے میں کوئی اطلاع بھجوائی۔ اباجان بتایا کرتے تھے کہ "ہماری بھاوجہ تو رو دھو بیٹھی تھیں۔" کہ ایک روز اچانک واپس آ گئے اور ریلوے اسٹیشن سے اُتر کر خاموشی سے گھر کو چلے گئے۔ تمام عزیزوں نے گلہ کیا کہ ہمیں اپنی آمد کی اطلاع تو دی ہوتی' تاکہ آپ کے استقبال کو پہنچتے تو آپ نے مسکرا کر فرمایا: "میں نے حج خدا کے لئے کیا تھا استقبال کے لئے نہیں۔" انہیں یہ بات قطعاً اچھی نہیں لگتی تھی کہ انہیں "حاجی" کہا جائے۔ فرمایا کرتے کہ یہ دین الٰہی کا ایک رکن ہے۔ کیا نماز پڑھنے والے کو آپ نمازی کہتے ہیں اور زکوٰۃ دینے والے کو زکوتی کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس لئے مجھے حاجی کہہ کر نہ پکارے۔

جب ان سے اتنی دیر سے واپس آنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے بتایا کہ "سلطان عبدالعزیز ابن سعود کو کسی نے ان کے بارے میں بتایا کہ وہ ایک اچھے عالم ہیں اور انگریزی کے علاوہ دوسری زبانوں پر بھی انہیں عبور حاصل ہے تو انہوں نے ان سے بعض کتب کے انگریزی میں تراجم کرائے تھے۔ اس کام کے پایہ تکمیل تک پہنچنے سے پہلے وہ واپس نہیں آسکتے تھے۔" پھر انہوں نے بتایا کہ انہوں نے سلطان عبدالعزیز ابن سعود کو اس حدیث کی طرف متوجہ کرتے ہوئے بتایا کہ ارض حجاز میں تیل ہے۔

حدیث لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی تَخْرُجَ نَارٌ: مِنْ اَرْضِ الْحَجَازِ تُضِی اَعْنَاقَ الْاِبِلِ بِبُصْرٰی۔"

(بخاری کتاب "الفتن" حدیث نمبر 1993)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قیامت اس تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ ایک آگ حجاز کی زمین سے نہ نکلے گی جو بصرے تک کے اونٹوں کی گردنیں روشن کردے گی۔"

چنانچہ سلطان عبدالعزیز ابن سعود نے "دی سعودین عربین مائننگ سنڈیکیٹ لمیٹڈ ان کارپوریٹڈ ان انگلینڈ۔

(The Saudian Arabian Mining Syndicate Ltd Incorporated in England.)

کو تیل وغیرہ نکالنے کا ٹھیکہ دینے کا ایک معاہدہ طے کیا اور اس کمپنی کی کوششوں سے ارض حجاز میں تیل دریافت ہوا۔ اس دریافت میں ہمارے تایا جان نے فرمانروائے ارض حجاز کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی روشنی میں راہنمائی کی تھی۔

آپ کلام الٰہی کے بڑے عالم تھے۔ آپ صاحب کشف بزرگ تھے۔ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں کئی بار زیارت ہوئی۔ کشف میں ایک بار شیخ سعدیؒ کو دیکھا اور ان سے باتیں کیں۔

ہمارے ابا جان نے اپنی ڈائری میں اپنے بھائی کی شخصیت کے بارے میں لکھا:

"برادر موصوف نہایت صاحب فراست، با اخلاق، متقی، عالم با عمل، بردبار، ذکی الطبع، غرباء کے ہمدرد، یتیم پرور، امیر ہو کر فقیر منش شخص، فرمانبردار بیٹے، مہربان بھائی اور شفیق دوست تھے۔"

اگست 1949ء آپ کی سب سے چھوٹی بیٹی امتہ الحفیظ سے بھائی جان کی شادی ہوئی تھی۔

وفات

مارچ 1950ء میں آپ کو نمونیہ ہو گیا تھا۔ صرف چند روز بیمار رہنے کے بعد آپ نے 24 مارچ 1950ء کو وفات پائی۔ آپ کو جھنگ شہر میں اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

3

بھائی جان کی پیدائش، بچپن اور تعلیم

ہمارے ابا جان نے پہلی شادی سعیدہ بیگم سے کی۔ جن کے بطن سے ہماری بڑی ہمشیرہ مسعودہ 30 اپریل 1922ء کو پیدا ہوئیں۔ جن کی پیدائش کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ان کی والدہ فوت ہوگئیں۔ اپنی پہلی بیوی کی وفات کے قریباً تین سال بعد ابا جان نے ہماری والدہ ہاجرہ بیگم سے 12 مئی 1925ء کو شادی کی۔ ان کی بارات جھنگ سے سنتوکھ داس ضلع منٹگمری (موجودہ ساہیوال) گئی تھی۔ ہمارے نانا حضرت حافظ نبی بخش وہاں ملازم تھے۔

تین جون 1925ء کو مسجد احمدیہ جھنگ شہر میں مغرب کی نماز ادا کرتے ہوئے آخری رکعت میں ابا جان نے قرآن کریم کی یہ دعا پڑھی:

"رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ ازْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۔"

(الفرقان: 75)

ترجمہ: "اے ہمارے رب العزت! ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کو ہمارے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک بنا اور ہمیں متقیوں کے لئے راہنما بنا۔)

انہیں کشف میں ایک لڑکا پکڑا دیا گیا۔ اس بارے میں ابا جان نے اپنی ڈائری میں لکھا: "دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک لڑکا پکڑا دیا گیا جس کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا میں نے اس کا نام دریافت کیا تو بتایا گیا کہ اس کا نام عبدالسلام ہے میں نے اس پر اللہ کا شکر ادا کیا اور چٹھی کے ذریعے اپنی بیوی کو یہ کشف بتایا جسے شادی کے چند دن بعد مروجہ رواج کے مطابق اسے ان کے میکے پہنچا دیا تھا۔" ابا جان نے یہی کشف دوسرے روز اپنے ایک قریبی اور عزیز دوست میاں ناصر علی صاحب سپرنٹنڈنٹ ڈپٹی کمشنر آفس جھنگ کو ان کے گھر جا کر بتایا۔

پھر ابا جان نے اپنی ڈائری میں لکھا: "آخر 29 جنوری 1926ء کو عزیز عبدالسلام جمعتہ المبارک کے روز نماز جمعہ کے وقت آ گیا۔ حضرت صاحب (مراد حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد جماعت احمدیہ کے دوسرے امام۔ ناقل) کی خدمت میں تمام ماجرا لکھا' نام کی درخواست کی تو حضور نے فرمایا: "جب خدا تعالیٰ نے خود ہی نام رکھ دیا ہے تو ہم کیسے دخل دیں۔"

بھائی جان ضلع منٹگمری (موجودہ ساہیوال) کے ایک گاؤں سنتوکھ داس میں اپنے ننھیال میں پیدا ہوئے تھے۔ ہمارے نانا حضرت حافظ نبی بخش صاحب وہاں محکمہ مال میں پٹواری تھے۔ منٹگمری (ساہیوال) سے

پاکپتن جاتے ہوئے ملکہ ہانس سے ایک سڑک ہیڈ سلیمانکی کو جاتی ہے۔ سنتوکھ داس اسی سڑک پر حویلی لکھا سے قریباً آٹھ نو میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وارث شاہ نے مشہور رومانی داستان ''ہیر وارث شاہ'' ملکہ ہانس کی ایک مسجد کے حجرہ میں بیٹھ کر لکھی تھی۔ عجیب اتفاق ہے کہ ہیر کا تعلق بھی جھنگ سے تھا۔ بھائی جان کی پیدائش کے چالیس روز بعد ہماری والدہ جھنگ واپس آئیں۔ بھائی جان کا بچپن' لڑکپن اور نوجوانی جھنگ شہر جو ہمارا آبائی وطن ہے میں گزری۔

بھائی جان کی پیدائش کی اطلاع ہمارے تایا چوہدری غلام حسین کو دی گئی' وہ اس وقت کرنال (انڈیا) میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز تھے۔ اتفاق سے ہمارے ابا جان کے چچا میاں احمد بخش انہی دنوں کرنال میں ہمارے تایا جان کے پاس مقیم تھے۔ بھائی جان کی پیدائش کی اطلاع جب اُنہیں ملی تو اس وقت وہ ہماری تایا زاد امتہ الحفیظ کو لوری دے رہے تھے۔ یہ خبر سنتے ہی انہوں نے ننھی امتہ الحفیظ سے مخاطب ہوتے ہوئے مندرجہ ذیل اشعار فی البدیہہ کہے جو دعائیہ بھی ہیں اور ان میں پیشین گوئی بھی ہے۔

آپا[1] آسیں تے کاکا لیاسیں توں جھولی بہہ کھڈائیں
متھا چمیں بودی چمیں تاڑی مار رہائیں[2]
ایہا گل کریندیاں سنتوکوں[3] چھٹی آئی
عبدالسلام جوں پیدا ہویا فضل کیتا رب سائیں
چنگا وار جمعے دا بھائی عبدالسلام جوں آیا
حمد ہزاراں تے شکر کروڑاں رب فضلو مہینہ وسایا
میرا سر کمزوری تے ترکل[4] دوہری بن ڈونگوری[5] آیا
اللہ پاک حیاتی رکھس ہوسس[6] بخت سوایا[7]

حاشیہ: (1) ہم اپنی والدہ کو آپا پکارتے تھے۔ (2) خاموش کرانا۔ (3) سنتوکھ داس (4) کمر۔ (5) ڈانگ بمعنی سہارا۔ (میاں احمد بخش لاولد تھے) (6) ہو گا۔ (7) بلند۔

اردو ترجمہ: آپا آئے گی تو وہ بچہ (لڑکا) لائے گی' تم اسے اپنی گود میں بٹھا کر اس سے کھیلنا۔ اس کا ماتھا اور سر چومنا اور تالی بجا کر اسے خاموش کرانا۔ یہی بات کرتے ہوئے سنتوکھ داس سے خط آیا کہ عبدالسلام پیدا ہوا ہے۔ اللہ نے بہت ہی فضل کیا ہے۔ جمعہ کا روز بہت اچھا ہے کہ اس روز عبدالسلام پیدا ہوا۔ اللہ کے اس فضل پر اس کی ہزاروں بار حمد اور کروڑ بار شکر ادا کرتا ہوں۔ (بڑھاپے کی وجہ سے اور بوجہ رعشہ) میرا سر کمزور ہے اور میری کمر دوہری ہوئی ہوئی ہے' وہ میرا سہارا بن کر آیا ہے' اللہ پاک اس کی عمر دراز کرے' وہ بہت بلند بخت والا ہو گا۔''

بچپن میں بھائی جان نے دیر سے بولنا شروع کیا تھا۔ اس وجہ سے والدین پریشان تھے۔ انہیں دنوں اتفاق سے حضرت مولانا غلام رسول راجیکی جنہیں حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے اولین رفقاء میں سے ہونے کا شرف حاصل تھا جماعتی ڈیوٹی پر جھنگ آئے تو اباجان انہیں اپنے گھرلے آئے وہ بہت دعاگو اور صاحب کشف بزرگ تھے۔ ہماری والدہ نے ان کی خاطرمدارت کرنے کے بعد حضرت مولانا سے عرض کیا کہ ''یہ (سلام) بولتا نہیں اس کے لئے دعا کریں۔'' انہوں نے ننھے سلام کو اپنی گود میں لیا اور اسے مخاطب ہو کر کہا: ''او گونگلو تو بولتا کیوں نہیں۔'' پھر اسی وقت انہوں نے دعا کی اور ہمارے والدین کو بتایا کہ ''یہ اتنا بولے گا کہ دنیا سنے گی۔'' 1960ء میں' میں ایک مرتبہ ربوہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے یہ واقعہ مجھے سنایا تھا اور پھر مسکرا کر فرمایا: ''دیکھ لو اللہ نے میری دعا کو قبول فرمایا اب سلام اتنا بولتا ہے کہ ایک دنیا اسے سنتی ہے۔''

ایک مرتبہ بچپن میں بھائی جان نے چوہے مارنے والی زہریلی گولیاں میٹھی پھلیاں سمجھ کر کھالیں۔ یہ زہریلی گولیاں اباجان میونسپل کمیٹی کے دفتر سے چوہے مارنے کے لئے لائے تھے اور ان کی سائیکل کے پیچھے بندھے اوزاروں والے تھیلے میں رکھی رہ گئی تھیں۔ گولیاں کھانے کے کچھ دیر بعد بھائی جان کو قے آئی' جس سے والدین کچھ پریشان ہوئے اور پوچھا: ''سلام تم نے کیا کھایا ہے؟'' بھائی جان نے بڑی معصومیت سے بتایا کہ ''ابا جی! میں نے آپ کے سائیکل میں پڑی ہوئی میٹھی پھلیاں کھائی ہیں۔'' یہ سنتے ہی والدین کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور وہ اپنے بیٹے کو فوراً گھر کے قریب ایک ہندو ڈاکٹر کے پاس لے گئے' جس نے انہیں مزید قے کرا کر ان کا معدہ صاف کیا اور کچھ دوائیں دیں۔ اگر انہیں پہلے ہی قے نہ آتی تو ممکن ہے کہ وہ زہریلی گولیاں اپنا کام کر جاتیں۔ سچ ہے جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

بھائی جان جب تین چار برس کے ہوئے تو اباجان انہیں اپنی سائیکل پر بٹھا کر مختلف فیکٹریاں دکھانے لے جاتے اور کبھی جھنگ کے قریب دریائے چناب پر تیموں ہیڈورکس دکھانے لے جاتے تھے۔ جس کی بنیادی وجہ ان کے علم اور واقفیت کو وسیع کرنا تھا۔

بھائی جان ابھی کم سن ہی تھے کہ اباجان نے ان کے بارے میں دو خواب دیکھے' جنہیں اپنی ڈائری میں انہوں نے یوں لکھا:

''رویا میں ایک نہایت بلند درخت دکھایا گیا' جس کی شاخیں فضا میں نہایت ارفع چلی گئی ہیں۔ سلام اس درخت پر چڑھ رہا ہے اور بڑی پھرتی سے چڑھتا چلا جا رہا ہے۔ یہ دیکھ کر میں ڈرا کہ معصوم بچہ ہے گر نہ جائے اور اسے زور سے آواز دینے لگا کہ سلام اب بس کرو اور نیچے اترو۔ بچہ میری طرف دیکھتا ہے اور مسکراتے ہوئے کہتا ہے کہ اباجان فکر نہ کریں۔ یہ کہتے ہوئے پھر اوپر ہی اوپر چڑھتا گیا اور اتنی بلندی پر گیا کہ گویا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔''

ایک مرتبہ رویا میں مخدومنا جناب چوہدری محمد ظفراللہ خان صاحب کو دیکھا کہ ایک دلفریب بیش قیمت خلعت کو نہایت چمکدار اور خوشنما نقرئی بٹن لگا رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر ہنستے ہوئے فرمایا کہ ”عبدالسلام کے لئے خلعت تیار کیا جا رہا ہے۔“

ابتدائی تعلیم

بھائی جان کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں ابا جان نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ ”عزیز کی والدہ نے خدا تعالیٰ کا نام لے کر الف ب شروع کرائی۔ اللہ کریم کا فضل تھا۔ عزیز شوق سے پڑھتا تھا اور وہ بھی اسے باقاعدگی کے ساتھ پڑھاتی تھیں۔ بچپن میں میں نے آسان کہانیوں کی اردو کتابیں اس کے سامنے رکھیں رسالے اُردو میرے پاس آتے تھے جو عزیز کو پڑھنے کے لئے دیئے جاتے۔ روزانہ دلچسپ کہانیاں عزیز کو سنائی جاتیں۔ عزیز جب روزانہ نئی سے نئی کہانیاں سنتا تو آخر یہ کہنے پر مجبور ہوتا کہ یہ کہانی تو مجھے آتی ہے۔ اس پر اور نئی کہانیاں تلاش کی جاتیں اور عزیز کے علم کو بڑھایا جاتا۔“ ابا جان' بھائی جان سے انہیں سنائی گئی کہانیاں سنا بھی کرتے تھے۔ بقول ان کے ”تاسلام کی قوت حافظہ و گویائی میں بتدریج ترقی ہوتی رہے۔“ یہی بات وہ انگریزی میں ایسے بیان کرتے تھے۔

"To develope and improve Salam,s power of retention and expression."

جب وہ کچھ لکھنے اور پڑھنے کے قابل شمار ہونے لگے تو ساڑھے چھ سال کی عمر میں انہیں ایم-بی مڈل سکول جھنگ شہر میں داخل کرا دیا۔ حافظ محمد امین اس سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے جنہوں نے سرسری جائزہ لینے کے بعد انہیں چوتھی جماعت میں داخل کر لیا۔ ہیڈماسٹر ابا جان کے دوستوں میں سے تھے اس لئے انہوں نے بھائی جان کی تعلیم میں خاصی دلچسپی لینا شروع کر دی۔ دوسرے استاد بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ ابا جان روزانہ بھائی جان کے اساتذہ سے مل کر ان کی تعلیم کے بارے میں دریافت کرتے رہتے۔

اس بارے میں اپنے ایک انٹرویو میں بھائی جان نے کہا کہ ”بچے کی تعلیم میں باپ کا دلچسپی لینا بہت ضروری ہے۔ ابا جان نہ صرف یہ پوچھا کرتے کہ کیا پڑھا ہے بلکہ ساتھ ساتھ میرے لئے دعائیں بھی کرتے تھے اور دعا کا فلسفہ بھی مجھے سمجھاتے جو ساری عمر میرے کام آیا اور میں نے اس سے بڑا فائدہ اٹھایا۔“

اباجان دفتر جاتے ہوئے بھائی جان کے استاد کو کبھی چار آنے (25 پیسے) کبھی آٹھ آنے (پچاس پیسے) دیتے کہ جو لڑکا کلاس میں فرسٹ آئے اسے وہ رقم انعام کے طور پر دی جائے۔ یہ رقم ہمیشہ بھائی جان ہی انعام میں حاصل کرتے۔ ان کے مقابل پر دو ہندو لڑکے بودھ راج اور امیرچند تھے' وہ دونوں بھی لائق تھے اور بہت زیادہ محنتی تھے۔ ان میں سے ایک مدرسہ کے چھابڑی فروش رام پیارا کا لڑکا تھا۔ رام پیارا

بھی اپنے بیٹے کے متعلق اساتذہ کو تاکید کرتا رہتا تھا۔ غرضیکہ ان لڑکوں سے مقابلہ بھائی جان کے لئے کافی سے زیادہ محنت کرنے کا باعث بنا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھائی جان پانچویں سے آٹھویں تک اپنی کلاس میں ہمیشہ اول آتے رہے۔

مڈل کے امتحان میں اگرچہ بھائی جان ضلع جھنگ میں اول آئے لیکن صوبہ پنجاب میں ان کا نمبر پانچواں تھا۔ اول آنے والا لڑکا لائلپور (موجودہ فیصل آباد) کے ایک سکول کا تھا۔ اس نتیجہ سے ابا جان کو بے حد افسوس ہوا۔ چنانچہ انہوں نے اول آنے والے لڑکے اور بھائی جان کے پرچے نکلوا کر انہیں دکھائے۔ بقول بھائی جان کے "ان دونوں کے پرچوں میں کوئی خاص فرق نہیں تھا بس ایک "حادثہ" سا ہو گیا تھا۔" مڈل کے امتحان کے اس مایوس کن نتیجہ کے بعد ابا جان نے بھائی جان کو کہا: "بچو" آئندہ ہر امتحان میں تم نے اول آنا ہے۔" چنانچہ انہوں نے اس نصیحت کو اپنے پلے باندھ لیا۔

گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج جھنگ میں داخلہ

ان دنوں جھنگ میں کوئی کالج نہیں تھا۔ 1938ء میں گورنمنٹ ہائی سکول جھنگ کو انٹرمیڈیٹ کالج کا درجہ دیا گیا اور اس میں نویں سے بارہویں تک کی کلاسیں جاری کر دی گئیں۔ کالج کی عمارت جھنگ شہر اور مگھیانہ کے درمیان واقع ہے' اس لئے اس جگہ کو آدھی وال کہا جاتا ہے۔

مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد بھائی جان نے اس کالج میں نویں جماعت میں داخلہ لیا اور وہیں سے 1940ء میں میٹرک اور 1942ء میں ایف۔اے کے امتحان پاس کئے تھے۔

جھنگ شہر میں ہمارے دو مکان ہیں۔ ایک آبائی مکان جسے بھائی جان نے 1979ء میں نوبل انعام ملنے کے بعد اِن ہاؤس میوزیم (In House Museum) بنانے کے لئے حکومت پاکستان کو دیا تھا۔ (لیکن نہایت افسوس ہے کہ اٹھارہ سال گزرنے کے بعد بھی اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔) دوسرا مکان ابا جان نے ایک کنال رقبہ پر 1935ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس مکان میں تین کمرے' باورچی خانہ' برآمدہ' بیٹھک' گراج اور کشادہ صحن ہے۔ ایک کمرہ بھائی جان کے لئے مخصوص تھا' جس میں وہ پڑھائی کرتے اور اسی میں سوتے تھے۔ ان دنوں چونکہ جھنگ شہر میں بجلی نہیں تھی اس لئے رات کو پڑھائی لالٹین پر کی جاتی تھی۔ جس کی چمنی ہماری ہمشیرگان صاف کرتیں' جبکہ اس میں مٹی کا تیل ڈالنے کا کام بھائی محمد عبدالسمیع اور میرے سپرد تھا۔ بھائی جان رات کو جلد سو جانے کے عادی تھے' وہ زیادہ تر پڑھائی علی الصبح کیا کرتے تھے۔

اباجان بتایا کرتے تھے کہ "سلام امتحان سے کم از کم دو ماہ پہلے اپنا کورس ختم کر لیا کرتا تھا اور پھر اُسے دوہراتا رہتا تھا۔ وہ امتحان کے دنوں میں جلد سونے کا عادی تھا۔ اس نے امتحان کا "بھوت" کبھی اپنے اوپر مسلط نہیں ہونے دیا۔" انہوں نے بتایا کہ "میٹرک کے امتحان سے چند دن پہلے سلام کی آنکھیں دکھنے آ گئیں' لیکن اسے چنداں فکر نہ ہوئی' کیونکہ اس نے کورس کئی مرتبہ دوہرا لیا ہوا تھا۔"

میٹرک کے امتحان سے چند ماہ قبل ابا جان نے ان کے مضامین کا جائزہ لیا۔ اس بارے میں اپنی ڈائری میں انہوں نے لکھا کہ "میں نے دیکھا کہ عزیز جیومٹری کی ڈیڈ کشنز (Deduction)' عربی ترجمہ' سائنس پریکٹیکل میں کمزور ہے اور عام لکھنے میں باریک لکھتا ہے۔ اگر کمزور نظر ممتحن سے واسطہ پڑ جائے تو وہ ناراض ہو کر پورے نمبر نہ دے گا۔ انگریزی کا سٹائل میٹرک کے عام لڑکے سے بالا ہے ممکن ہے اُسے بمباسٹک سٹائل (Bombastic style) تصور کیا جائے اور عزیز کو نقصان ہو۔ چنانچہ میں حکیم محمد حسین صاحب ایم۔اے پرنسپل انٹرمیڈیٹ کالج جھنگ کی کوٹھی پر گیا۔ صاحب بہادر نہایت تپاک سے ملے۔ باغیچہ میں بیٹھ کر میری داستان سنی۔ میں نے یہ بھی کہا کہ "اول آکر کالج کے لئے عزیز باعث فخر ہو گا۔ عزیز کے ساتھ دلچسپی لیں۔" آپ نے فرمایا کہ "ہمیں اول آنے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ ہمیں پاس ہونے والے لڑکوں کی اعلیٰ فیصد چاہیے۔" (یعنی Pass Percentage) پھر فرمایا: "پروفیسروں کے نام لکھ دوں۔ میں ان کا جواب طلب کر لوں گا۔" میں نے کہا کہ "اس سے جو دلچسپی وہ لیتے ہیں' وہ بھی نہ لیں گے۔" اس پر آپ خفا ہو گئے اور کہا کہ "لڑکے کا سرٹیفکیٹ لے کر پرائیویٹ امتحان دلائیں۔" اس پر مجھے بھی غصہ آیا۔ میں نے عرض کیا کہ "میرا لڑکا جانتا ہے کہ اگر فیس ایک دن لیٹ دی جائے تو ایک آنہ جرمانہ دینا پڑتا ہے۔ دو دن کا دو آنے اور اس طرح ساتویں روز نام کٹ جاتا ہے۔ لڑکے جماعت بناتے ہیں۔ جماعتوں سے استاد اور استادوں سے پرنسپل کا وجود بنتا ہے۔ میری درخواست اگر آپ نہ سنیں تو کالج میں کس سے کہوں۔" پرنسپل صاحب غصہ سے سُرخ ہو گئے۔ ذرا دھیمے ہوئے اور فرمانے لگے کہ خود ان استادوں سے کہیں۔ میں نے منظور کر لیا۔ پھر از راہ تلطف فرمایا کہ لڑکے کو میرے پاس بھیج دیں اس کی انگریزی دیکھوں گا۔ چنانچہ میں نے عزیز کو بھیجا۔ انہوں نے انگریزی میں دو مضامین لکھنے کو دیئے۔ چند روز بعد میں دریافت کرنے گیا تو آپ نے فرمایا کہ:

" Fortunately or unfortunately boy has got so great a retentive power that in his essay it is difficult to discriminate whether the language used is his own or he has borrowed it from some other author, so need not bother."

(ترجمہ از قابل) "خوش قسمتی سے لڑکے کی قوت یاداشت اتنی زیادہ ہے کہ اس کے مضمون سے اس بات کا امتیاز کرنا بہت مشکل ہے کہ اس نے اپنی زبان استعمال کی ہے یا کسی دوسرے مصنف سے الفاظ مستعار لئے ہیں۔ اس لئے آپ کسی قسم کی فکر نہ کریں۔"

اباجان نے مزید لکھا کہ "پھر میں دوسرے پروفیسروں کے پاس گیا۔ عربی والے نے خوب حوصلہ افزائی کی' حساب والے نے کہا کہ ایک خاص کاپی ہے وہ دے دے گا لڑکا لائق ہو جائے گا۔ میں نے کہا کہ حساب تو بڑی مشق سے آتا ہے کیا کوئی اللہ دین کا لیمپ تو آپ کے پاس نہیں چنانچہ اس نے باقاعدہ کام

کرانا شروع کر دیا' پروفیسر کیمسٹری' فزکس' پریکٹیکل کے پاس گیا تو وہ سٹپٹایا اور خاص توجہ دینے سے انکار کر دیا میں نے بار بار کہا آخر مان گیا۔ اس کے بعد شیخ یوسف شاہ صاحب ایم-ای-ڈی بیرسٹرایٹ لاء کے پاس گیا۔ اُنہوں نے فرمایا کہ امتحان نزدیک آگیا ہے' اب سٹائل کو نہ چھیڑیں' خدا تعالیٰ پر بھروسہ کریں۔"

مندرجہ بالا تحریر میں اباجان نے بھائی جان کے انگریزی سٹائل کے بارے میں جس خدشہ کا اظہار کیا تھا وہ قریباً پورا ہو چلا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ایک خاص نصرت نے دردمند باپ کی دعاؤں کے طفیل انہیں ایک ممکنہ نقصان سے محفوظ رکھا۔ ہوا یوں کہ ان کا انگریزی کا ایک پرچہ گورنمنٹ ہائی سکول منٹگمری (موجودہ ساہیوال) کے ایک استاد کو بھجوایا گیا۔ وہاں کیا ہوا اس بارے میں وہاں کے ایک ٹیچر چوہدری رشید احمد صاحب کی زبانی سنیئے:

"میں رشید احمد ولد چوہدری چھجو خان صاحب عزیزم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے بارے میں جو کچھ مجھے یاد ہے اپنی سوچ کے مطابق ٹھیک ٹھیک درج کروا رہا ہوں۔ میں ہوشیار پور (سڑوعہ ان کا وطن تھا) (مشرقی پنجاب انڈیا--- ناقل) میں 1906ء میں پیدا ہوا۔ اس وقت میری عمر تقریباً 91 سال ہے۔" (یہ تحریر 8 اپریل 1997ء کی ہے۔) مگر یہ باتیں مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ مارچ 1940ء میں عزیزم عبدالسلام نے میٹرک کا امتحان دیا۔ اس وقت موجودہ ساہیوال جس کا نام منٹگمری تھا میں شیخ محمدؐ اسحاق ایم-اے کے پاس عزیزم عبدالسلام کا انگریزی کا پرچہ آیا۔ شیخ صاحب میرے پرانے دوست تھے۔ انہوں نے ایک ایک لفظ پڑھا۔ اس میں کوئی غلطی نہ ملی' وہ حیران ہو گئے اور پرچہ لے کر میرے پاس آ گئے اور پرچہ مجھے دکھایا اور کہا کہ اس کو چیک کریں' مجھے شک ہے کہ امتحان کے سپرنٹنڈنٹ نے اس کو نقل کرائی ہے یا کوئی اور بات ہے۔ اتنا صاف ستھرا اور اعلیٰ انگریزی لکھنے والا طالب علم کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں نے شیخ صاحب کو کہا کہ اگر طالب علم نے سارا حل ٹھیک کیا ہے تو آپ اس لڑکے کے نمبر کاٹنے والے کون ہیں۔ اگر آپ کو کوئی ڈر ہے تو اس کا ایک نمبر کاٹ لیں۔ مگر وہ خاموش ہو گئے۔ پھر وہ کہنے لگے ہیڈ ایگزمینر (Head Examinar) کوئی اعتراض نہ کرے۔ سلام صاحب نے اس پرچہ میں 100/100 نمبر حاصل کئے۔" چوہدری رشید احمد صاحب کو اس وقت یہ علم نہیں تھا کہ وہ پرچہ بھائی جان کا تھا۔ 1943ء میں جب ان کی تعیناتی گورنمنٹ ہائی اسکول ملتان ہوئی تو انہوں نے یہ واقعہ ابا جان کو سنایا' جو اس وقت ملتان میں ملازمت کرتے تھے۔ اگر ممتحن ان کے نمبر کاٹ لیتا تو ممکن ہے کہ وہ یونیورسٹی میں اول ہی نہ آتے۔

پاکستان کے مشہور اور نامور ادیب ڈاکٹر وزیر آغا جھنگ کالج میں بھائی جان سے ایک کلاس سینئر تھے۔ انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح حیات "شام کی منڈیر سے" مطبوعہ 1986ء کے صفحہ 39 پر لکھا۔ "بمشکل دو تین ماہ گزرے ہوں گے کہ مجھے اپنے سیکشن کے اچھے طلباء میں شمار کیا جانے لگا۔ مگر جب فرسٹ ایئر کے امتحان کا نتیجہ نکلا تو میں نہ صرف اپنی کلاس میں اول آیا تھا بلکہ انگریزی' اردو' فلسفہ اور فارسی وغیرہ مضامین میں بھی میں نے پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔ یکایک تمام استادوں کی نظر کرم مجھ پر مرکوز ہو گئی۔ پھر کالج کی سالانہ تقریب انعامات

میں مجھے کئی انعام ملے۔ یہ انعامات انگریزی کتابوں کی صورت میں تھے۔ ان کتابوں میں سے ایک ہکسلے Huxley کی Rotunda بھی تھی۔ (یہ کتاب اب بھی میرے پاس محفوظ پڑی ہے۔) لیکن اس جلسہ تقسیم انعامات میں سب سے زیادہ انعامات ایک چھوٹے قد کے لڑکے کو ملے جو اس وقت میٹرک کا طالب علم تھا۔ اسے انعام میں کتابوں کا اتنا بڑا ڈھیر ملا کہ اُس سے اُٹھایا نہیں جاتا تھا۔ کالج کے اساتذہ کھسر پھسر کر رہے تھے کہ یہ لڑکا تو Genius (غیر معمولی ذہین' ناقل) ہے۔ ریاضی اور سائنس اس کے مضامین تھے' جن میں وہ اپنی کلاس کے طلبا سے میلوں بلکہ صدیوں آگے تھا اس لڑکے کا نام عبدالسلام تھا۔ برسوں بعد اسے طبیعات کا نوبل انعام ملا اور وہ دنیا بھر میں مشہور ہو گیا۔ میں کالج میگزین کا مدیر تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے عبدالسلام کا ایک اردو ڈراما بھی شائع کیا تھا۔ مگر افسوس کہ میرے پاس اس رسالے کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔ پچھلے دنوں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے مجھے پیغام بھیجا کہ میں انہیں وہ پرچہ مہیا کروں' جس میں یہ ڈراما چھپا تھا۔ مگر میں یہ پرچہ کہاں سے لاتا۔ کالج کی لائبریری میں بھی اس میگزین کا کوئی شمارہ محفوظ نہیں۔ سنا ہے کہ 1950ء کے بعد ایک بار دریائے چناب کے سیلاب نے کالج کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ دوسری کتابوں کے علاوہ کالج میگزین (میگزین کا نام بھی "چناب" تھا) کے سارے پرچے بھی دریا برد ہو گئے تھے۔"

میٹرک کے امتحان کا نتیجہ

بھائی جان نے میٹرک کا امتحان مارچ 1940ء میں دیا تھا' وہ غیر منقسم پنجاب کی واحد یونیورسٹی میں اول آئے تھے اور ایک نیا ریکارڈ قائم کیا تھا۔ 7 دسمبر 1987ء کو لاہور میں ایک انٹرویو میں انہوں نے میٹرک کے نتیجے کے بارے میں بتایا:

"مجھے یاد ہے کہ جس دن رزلٹ نکلا میں والد صاحب کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ انہوں نے رزلٹ کی کاپی لینے کے لئے ایک آدمی کو مگھیانہ ریلوے اسٹیشن بھجوایا۔ وہ جب رزلٹ کی کاپی لایا تو اس کے پہلے صفحہ پر میرا نام لکھا ہوا تھا کہ عبدالسلام رول نمبر 14888' 765/850 (عجیب اتفاق ہے رول نمبر کا حاصل جمع 29 ہے' جو بھائی جان کی تاریخ پیدائش ہے۔) نمبر لے کر صوبہ بھر میں اول آیا ہے۔ دوم آنے والے لڑکے نے 733 نمبر حاصل کئے تھے۔ ابا جان نے اللہ کا شکر ادا کیا اور سجدہ میں چلے گئے۔

مجھے یاد ہے کہ نتیجہ سے ایک دن پہلے میں حجام کی دکان پر بال کٹوانے گیا تھا۔ اس نے مجھے اپنے نو آمند شاگرد کے حوالہ کر دیا۔ جس نے میرے بال کاٹتے کاٹتے اتنے چھوٹے کر دیئے تھے کہ میری "ٹنڈ" نکل آئی' جسے چھپانے کے لئے مجھے پگڑی باندھنی پڑی۔ نتیجہ سننے کے بعد میں فوراً اپنے سائیکل پر جھنگ شہر کے لئے روانہ ہو گیا تھا۔ جھنگ شہر کے چار دروازے تھے جن میں سے اب تین دروازے رہ گئے ہیں۔ مجھے اپنے گھر پہنچنے کے لئے نور شاہ گیٹ سے ممنہ گیٹ جانا تھا۔ رستہ شہر کے وسط سے تھا۔ وہاں تمام دکانیں ہندوؤں کی تھیں۔ اس وقت سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ تمام ہندو دکاندار اپنی دکانوں کے باہر میری تعظیم کے لئے کھڑے تھے حالانکہ اس وقت وہ عموماً چھپروں کے نیچے پڑے آرام کر رہے ہوتے تھے' وہ ایک عجیب سماں تھا۔

پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات میں ہمیشہ ہندو یا سکھ لڑکے اول آیا کرتے تھے۔ لیکن اس سال میٹرک کے امتحان میں میرا اول آنا اور وہ بھی جھنگ جیسے پسماندہ علاقہ سے ہر ایک کے لئے ایک عجوبہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ڈی-اے-وی ہائی سکول لاہور (ہندوؤں کا ایک مشہور اسکول) نے اپنے چند اساتذہ مجھے دیکھنے کے لئے جھنگ بھجوائے تھے' وہ سب مجھ سے ملے اور انہوں نے میری تصاویر بنائی تھیں۔"

میٹرک کے نتیجہ سے پہلے ابا جان کا ایک خواب دیکھنا

میٹرک کے نتیجے سے پہلے ابا جان نے ایک خواب دیکھا' جسے انہوں نے اپنی ڈائری میں درج کرتے ہوئے لکھا:

"مسجد میاں اللہ داد جھنگ شہر کے ساتھ والی سڑک پر جا رہا ہوں' میرا منہ جانب مشرق ہے۔ ایک بیل زرد رنگ میرے پیچھے پڑ گیا ہے اس کے سینگ کافی لمبے ہیں۔ میں بھاگ رہا ہوں۔ سڑک کے دونوں طرف پختہ دیواریں ہیں اور میرے لئے اِدھر اُدھر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں سامنے دیکھا تو سڑک ایک دیوار سے بند ہے۔ آگے بھی نہیں جا سکتا۔ بیل بھی پہنچ گیا ہے۔ میں اللہ کا نام لے کر دیوار کو ہاتھ لگاتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ میرے لئے ایک چھوٹا سا دروازہ کھل گیا ہے۔ میں پھلانگ کر باہر نکل جاتا ہوں۔ بیل کا خطرہ نہیں رہا اور تیز بھاگتا جاتا ہوں اتنے تک کہ اہل حدیث مسجد کی لائبریری میں داخل ہوتا ہوں جہاں شیخ محمدؐ حسین لائبریرین کو دیکھا آپ نے مجھے تھکا دیکھ کر ایک لبالب شربت کا پیالہ پیش کیا۔ میں نے اسے پیا اور بہت لطف پایا۔ (مجھے اس کی لذت اب بھی یاد آ رہی ہے) میں نے پوچھا کہ یہ شربت کس چیز کا ہے۔ شیخ صاحب نے ایک شاخ نیم کی دکھائی' جس پر پتے' پھول اور پھل لگے ہوئے تھے۔ اس نے بتایا کہ اس میں لذت بھی ہے اور مٹھاس کے بد اثرات سے بچانے کے لئے نیم ہے۔ گویا مصفی خون بھی ہے۔ میں بہت خوش ہوا اور اللہ تعالیٰ کی شان بیان کی۔ چند روز بعد دعا کا اثر معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم و فضل سے عزیز سلام کو نہ صرف صوبہ بھر میں اول مقام بخشا ہے بلکہ ریکارڈ مات کرنے کی توفیق بھی دی ہے۔ اس وقت معلوم ہوا کہ وہ پیالہ آسمانی پیالہ تھا' جس کی لذت ہمیشہ رہنے والی تھی۔ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔"

میٹرک کے امتحان میں صوبہ بھر میں اول آنے پر کالج نے بھائی جان کو سونے کا میڈل دیا اور حکومت پنجاب نے 20 روپے ماہوار وظیفہ دیا تھا۔

میٹرک کے نتیجہ کے بعد ابا جان نے اپنی ڈائری میں ایک اور خواب تحریر کیا۔ لکھتے ہیں: "جھنگ شہر۔ نتیجہ میٹرک نکلنے کے بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ میں جھنگ شہر میں اپنے مکان میں ہوں۔ سر سکندر حیات گورنر پنجاب اندر آ گئے۔ (وہ پنجاب یونیورسٹی کے چانسلر بھی تھے) آپ نے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ کا بیٹا (یعنی عزیز عبدالسلام سلمہ) کہاں ہے؟ میں نے اپنے گھر میں اونچے سرس کے درخت کی چوٹی پر

بیٹھا ہوا بچہ دکھایا اور کہا کہ وہ (بندر کی طرح) چوٹی پر بیٹھا ہے۔ انہوں نے اسے غور سے دیکھا اور پھر چلے گئے۔" پھر لکھا کہ "اُس وقت میرے مکان میں سات درخت تھے۔ جن میں سے چار سرس کے تھے۔ ایک شیشم کا' ایک بیری کا اور ایک لسوڑا کا تھا۔ ان میں سے جس پر عزیز سلام سلمہ بیٹھا تھا سب سے اونچا تھا اور لڑکے بھی سات تھے۔ باقی معاملات خدا جانتا ہے۔ چند روز بعد میاں افضل حسین صاحب وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے مبارک باد کا خط پرنسپل صاحب کے نام آیا۔ انہوں نے مجھے نقل بھیج دی۔"

میٹرک کے امتحان میں صوبہ پنجاب میں اول آنے پر گوجرہ سے احسن اسماعیل صدیقی نے مندرجہ ذیل اشعار ابا جان کو بھجوائے۔ (چند سال ہوئے صدیقی صاحب وفات پا گئے تھے۔)

میٹرک کا ریکارڈ مات کرنے پر مبارک باد

کیا خوش نصیب باپ ہے کیا خوش نصیب ماں
لخت جگر ہو جن کا دنیا میں کامراں

اہل جہاں کو رشک ہے اس نیک نام پر
فضل خدا کو ناز ہے عبدالسلام پر

میدان جیت آیا ہے قرۃ العین آج
دل شاد پھر رہے ہیں محمدؐ حسین آج

آیا ہوں لے کے خدمت والا میں چند پھول
میری طرف سے ہو ہدیہ تبریک قبول

دنیا میں رہ کر نام ہی پیدا کرے کوئی
احسن وگرنہ کیا ہے جئے یا مرے کوئی

بھائی جان کے لئے ایک نصرت الٰہی

جماعت احمدیہ کے دوسرے امام حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب نے 1939ء میں جماعت احمدیہ کے ذہین طلباء کے لئے کچھ وظائف کا اعلان فرمایا جس کا پس منظر یہ تھا کہ 1938ء میں چوہدری محمدؐ ظفراللہ خان نے قادیان میں اپنی ایک تقریر میں کہا کہ "آئندہ سال یعنی 1939ء میں جماعت احمدیہ کو تین نوع کی خوشیاں نصیب ہوں گی۔

اول : حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کے عہد امامت کے 25 سال پورے ہو جائیں گے۔

دوئم : اُن کی عمر پچاس سال ہو جائے گی۔

سوئم : سلسلہ عالیہ احمدیہ کے قیام کو بھی پچاس سال ہو جائیں گے۔ لہٰذا اس خوشی کے موقع پر شکرانے کا اظہار کرتے ہوئے جماعت کو تین لاکھ روپے کی رقم جمع کر کے اپنے پیارے امام کی خدمت میں پیش کرنا چاہیے اور مزید یہ کہ وہ جس طرح چاہیں اس رقم کو خرچ فرمائیں۔"

چنانچہ احباب جماعت احمدیہ نے چوہدری محمدؐ ظفراللہ خان کی اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے تین لاکھ کی خطیر رقم جمع کرنے کے بعد 28 دسمبر 1939ء کے دن حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کی خدمت میں

پیش کی۔ اس رقم کا چیک وصول کرنے کے بعد انہوں نے ایک تقریر فرمائی‘ جس میں اس رقم کو خرچ کرنے کے بارے میں تفاصیل بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

”ہماری جماعت کے غرباء کی اعلیٰ تعلیم کے لئے فی الحال انتظامات نہیں ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کند ذہن لڑکے جن کے ماں باپ استطاعت رکھتے ہیں‘ پڑھتے جاتے ہیں۔ مگر ذہین بوجہ غربت کے رہ جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس رقم سے اس کا بھی انتظام کیا جائے اور میں نے تجویز کی ہے کہ اس کی آمد سے شروع میں فی الحال ہر سال ایک ایک وظیفہ مستحق طلباء کو دیا جائے۔ پہلے سال مڈل سے شروع کیا جائے۔ مقابلہ کا امتحان ہو اور جو لڑکا اول رہے اور کم سے کم 70 فیصدی نمبر حاصل کرے اُسے انٹرنس تک بارہ روپیہ ماہوار وظیفہ دیا جائے اور پھر انٹرنس میں اول۔ دوم اور سوم رہنے والوں کو تیس روپیہ ماہوار جو ایف۔اے میں یہ امتیاز حاصل کریں انہیں 45 روپے ماہوار اور پھر جو بی-اے میں اول آئے اسے 60 روپے ماہوار دیا جائے اور تین سال بعد جب اس فنڈ سے آمد شروع ہو جائے تو احمدی نوجوانوں کا مقابلہ کا امتحان ہو اور پھر جو لڑکا اول آئے اُسے انگلستان یا امریکہ میں جا کر تعلیم حاصل کرنے کے لئے اڑھائی سو روپے ماہوار تین سال کے لئے امداد دی جائے۔ اس طرح غرباء کی تعلیم کا انتظام ہو جائے گا اور جوں جوں آمد بڑھتی جائے گی ان وظائف کو ہم بڑھاتے رہیں گے۔ کئی غربا اس لئے محنت نہیں کرتے کہ وہ سمجھتے ہیں ہم آگے تو پڑھ نہیں سکتے خواہ مخواہ کیوں مشقت اٹھائیں۔ لیکن اس طرح جب ان کے لئے ترقی کا امکان ہو گا تو وہ محنت سے تعلیم حاصل کریں گے۔ مڈل میں اول رہنے والوں کے لئے جو وظیفہ مقرر ہے وہ صرف تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان کے طلبا کے لئے ہی مخصوص ہو گا‘ کیونکہ سب جگہ مڈل میں پڑھنے والے احمدی طلبا میں مقابلہ کے امتحان کا انتظام ہم نہیں کر سکتے۔ یونیورسٹی کے امتحان میں امتیاز حاصل کرنے والا خواہ کسی یونیورسٹی کا ہو وظیفہ حاصل کر سکے گا۔ ہم صرف زیادہ نمبر دیکھیں گے۔ کسی یونیورسٹی کا فرسٹ‘ سیکنڈ اور تھرڈ رہنے والا طالب علم بھی اسے حاصل کر سکے گا اور اگر کسی بھی یونیورسٹی کا کوئی احمدی طالب علم یہ امتیاز حاصل نہ کر سکے تو جس کے بھی سب سے زیادہ نمبر ہوں اُسے یہ وظیفہ دے دیا جائے گا۔ انگلستان یا امریکہ میں حصول تعلیم کے لئے جو وظیفہ مقرر ہے اس کے لئے ہم سارے ملک میں اعلان کر کے جو بھی مقابلہ میں شامل ہونا چاہیں ان کا امتحان لیں گے اور جو بھی فرسٹ رہے گا اُسے یہ وظیفہ دیا جائے گا۔“

اپنی ڈائری میں انہوں نے لکھا: ”حضور (مراد حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب...... مرتب) نے جلسہ 1939ء میں جوبلی فنڈ سے جو تین لاکھ روپیہ کا تحفہ حضرت صاحب کے سامنے جماعت کی طرف سے سر محمدؓ ظفر اللہ خان صاحب نے پیش فرمایا تھا کا ذکر فرمایا کہ اس رقم میں سے ایک حصہ ان طلبا کو دیا جائے گا جو ہماری جماعت سے تمام ہندوستان کی کسی یونیورسٹی میں اول یا دوم آئیں گے۔ میٹرک کے بعد 30 روپے ماہوار دو سال کے لئے (ایف-اے یا ایف-ایس-سی) ایف-اے یا ایف-ایس-سی کے بعد دو سال کے لئے 45 روپے ماہوار (بی-اے یا بی-ایس-سی میں) اس کے بعد 60 روپے ماہوار ایم-اے یا ایم-ایس-سی میں دو سال کے لئے ولایت

جائے تو نصف خرچ دیا جائے گا۔ اسی شام ہماری جماعت (جھنگ شہر.. ناقل) کی حضور سے ملاقات تھی۔ عزیز سلام سلمہ اللہ تعالیٰ میرے ساتھ تھے۔ میں نے عرض کی کہ حضور یہ وظائف جو حضور نے اعلان فرمائے ہیں۔ عزیز سلام سب لے جائے گا۔ حضور حیران ہوئے اور چپ ہو گئے۔ 1940ء میں عزیز سلام سلمہ اللہ تعالیٰ نے میٹرک کا امتحان دیا اول آ کر ریکارڈ توڑا۔ حضرت صاحب بہت خوش ہوئے اور حسب اعلان وظیفہ کے علاوہ ایک سو روپیہ نقد ریکارڈ مات کرنے کا اعلان کیا اور دیا۔ ایف-اے اور بی-اے میں اسی طرح ہوا۔ عزیز کا بی-اے کا ریکارڈ 1944ء سے تاحال موجود ہے۔ انگلش آنرز کا ریکارڈ تاحال موجود ہے۔ حضور نے علاوہ وظیفہ کے دو سو روپیہ نقد انعام دیا۔ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ ایسا جوبلی فنڈ نہ پہلے کبھی جمع کر کے حضور کے پیش ہوا تھا اور نہ بعد میں کبھی جمع ہوا گویا یہ سارے سامان عزیز سلام سلمہ اللہ تعالیٰ کے لئے آسمان والے نے اپنے فضل سے پیدا فرمائے۔"

بھائی جان نے میٹرک ایف-اے، بی-اے اور ایم-اے میں یہ اعلان کردہ وظائف حاصل کئے اس طرح اللہ تعالیٰ نے ابا جان کی 1939ء میں کہی ہوئی بات کو بڑی شان سے شرف قبولیت بخشا۔

ایف-اے (انٹرمیڈیٹ) میں داخلہ

1940ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد انہوں نے اپنے ہی کالج (گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج جھنگ) میں فرسٹ ایئر کلاس میں داخلہ لیا۔ انٹر آرٹس میں انہوں نے ریاضی، انگلش، کیمسٹری، فزکس اور عربی (اختیاری) مضامین اختیار کئے۔ (ابا جان کی خواہش پر انہوں نے عربی کا مضمون اختیار کیا تھا کیونکہ ابا جان یہ چاہتے تھے کہ انہیں قرآن حکیم کے معنی سمجھنے میں آسانی ہو۔)

ہمارا گھر کالج سے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر تھا۔ بھائی جان کالج پیدل جاتے تھے۔ گرمی کے موسم میں دھوپ اور سورج کی تپش سے بچنے کے لئے وہ چھٹی کے بعد کالج میں ہی بیٹھ کر اپنا ہوم ورک ختم کر لیا کرتے تھے۔ جھنگ شہر سے ان کے کلاس فیلوز بھی وہیں بیٹھ کر ان کی نقل کر کے اپنا ہوم ورک بھی مکمل کر لیا کرتے تھے۔ جب گرمی میں کمی آ جاتی اور سائے ڈھل جاتے تو وہ اپنے کلاس فیلوز کے ہمراہ اپنے گھر کو روانہ ہوتے۔

سیکنڈ ایئر میں انہیں کالج کے میگزین جس کا نام "چناب" تھا کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ اس کام میں انہوں نے بہت دلچسپی لی اور میگزین کی ایڈیٹنگ (Editing) سے انہیں بہت فائدہ پہنچا۔ کالج کی لائبریری میں بہت اچھی کتب تھیں اپنے کورس کی کتب کے علاوہ انہیں دوسری کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ انہیں دنوں مرزا غالب پر نسخہ حمیدیہ یا دیوان غالب مرتبہ عبدالرحمٰن پڑھنے کا اتفاق ہوا جس سے انہیں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ ایک مقالہ لکھیں، جس سے یہ ثابت کریں کہ مرزا اسد اللہ غالب نے اسد سے غالب تخلص کب اور کس تاریخ کو اختیار کیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بہت عرق ریزی کے بعد تحقیقی مقالہ لکھ کر کالج

میگزین میں شائع کرایا۔ 7 دسمبر 1987ء کے انٹرویو میں آپ نے بتایا کہ ”جب 1942ء میں میں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا تھا تو میں نے وہی تحقیقی مقالہ مشہور رسالہ ادبی دنیا (یہ مقالہ رسالہ ”ہمایوں“ میں شائع ہوا تھا..... مرتب) کے ایڈیٹر کو بھجوایا جو انہوں نے شکریہ کے ساتھ اپنے رسالہ میں شائع کر دیا اور مجھے ایک تعریفی خط لکھ کر مزید لکھنے کی حوصلہ افزائی کی۔“ اس تحقیقی مقالہ کے بارے میں بھائی جان نے ایک دلچسپ واقع سناتے ہوئے بتایا کہ بی-اے میں غیر اختیاری مضمون اردو میں صرف ایک شاعر کے بارے میں پڑھایا جاتا تھا۔ ہمارے کورس میں وہ شاعر مرزا اسد اللہ غالب تھے۔ میرے ایک کلاس فیلو جن کا نام ہاشمی تھا جو بعد میں سٹیٹ بنک آف پاکستان میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز رہے۔ (وہ ڈائریکٹر اسٹیٹ بنک تھے) نے وہ مقالہ پڑھا جو انہیں اچھا لگا اور اس سے بے حد متاثر ہوئے۔ چنانچہ اس نے اس مقالہ سے چند چیدہ چیدہ باتیں ایک کاغذ پر لکھ لیں۔ اس کے بعد وہ میرے پاس آئے اور مجھے بتایا کہ اس نے ایک بڑا اچھا مقالہ پڑھا ہے‘ جس میں مقالہ نگار نے‘ اس بات کا تعین کیا ہے کہ مرزا غالب نے اسد سے غالب تخلص کب اختیار کیا تھا۔ جب وہ اپنی بات ختم کر چکا تو میں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم نے یہ دیکھا تھا کہ اس مقالہ کا مصنف کون تھا۔ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تو میں نے اسے بتایا کہ وہ مقالہ میں نے لکھا تھا۔ یہ سن کر پہلے تو اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا چند منٹ خاموش رہنے کے بعد اس نے وہ کاغذ جس پر اس نے نوٹ لکھے تھے پھاڑ کر پھینک دیا۔ وہ شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ مقالہ کسی بڑے ادیب نے لکھا تھا۔“

اپنے اسی انٹرویو میں بھائی جان نے ایک اور واقعہ سناتے ہوئے بتایا کہ ”جب وہ جھنگ کالج میں سیکنڈ ایئر کے طالب علم تھے تو ایک دن ان کے فزکس کے استاد نے مقناطیسی قوت اور بجلی کے بارے میں پڑھاتے ہوئے ہمیں بتایا کہ بجلی میں بڑی طاقت ہوتی ہے اور وہ بڑے بڑے شہروں جیسے لاہور وغیرہ میں ہوتی ہے۔ ہمیں یہ سن کر بڑی حیرانگی ہوئی اور بجلی دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ (ان دنوں جھنگ میں بجلی نہیں تھی) بھائی جان کی یہ خواہش اس وقت پوری ہوئی تھی جب 1942ء میں انہوں نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا تھا۔

ایف-اے کا امتحان بھائی جان نے 1942ء میں پاس کیا تھا۔ اس امتحان میں بھی وہ پنجاب یونیورسٹی میں اول آئے تھے۔ انہوں نے 600 میں سے 555 نمبر حاصل کئے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے انہیں 30 روپے اور جماعت احمدیہ کے جوبلی فنڈ سے 45 روپے ماہوار وظائف دیئے گئے۔ علاوہ ازیں ان کے کالج نے اُنہیں سونے کا میڈل دیا تھا۔

ایف-اے کے امتحان میں پنجاب یونیورسٹی میں اول آنے پر

عبدالرشید ارشد ڈیرہ غازی خان کا نذرانہ عقیدت

پھولے نہیں سماتے وہ کہ آئی صبحدم
احباب و اقربا کے کان میں صدائے مست

ہاتف سے جس نے اختیار کی نئی روش
آواز دے کے دور سے کر کے دراز دست

آؤ عزیز و آپ کو مژدہ سنائیں آج
ایف-اے کے امتحان میں عبدالسلام فرسٹ

حیرت زدہ ہیں ممبران یونیورسٹی
پنجاب کے ریکارڈ کو دی اب بھی ہے شکست

شاباش اے جوان مرد صاحب قوے
رہنا صدا حصول علم کے نشے میں مست

ہمت کرو ہمت کرو مد نظر رکھو
بی-اے کے امتحان کا ابھی سے بندوبست

پنجاب کو ہے ناز تم پہ فخر والدین
ایسے دراز ہوں نصیب تم کو چمپ چست

ارشد کی ہے دعا کہ سہل تر کرے خدا
ہوں تمہارے سب زمانے کے بلند و پست

گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ 1942ء

بھائی جان کی تعلیم کے متعلق ابا جان مندرجہ ذیل بزرگوں سے مشورہ لیتے رہتے تھے:

1. حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب' جماعت احمدیہ کے دوسرے امام۔
2. چوہدری سر محمدؐ ظفراللہ خان صاحب۔
3. میاں افضل حسین صاحب' وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی۔
4. حافظ عبدالمجید صاحب' ڈپٹی کمشنر لدھیانہ۔
5. میاں محمدؐ شفیع صاحب اسسٹنٹ ایکسٹرا کمشنر جھنگ۔
6. ملک غلام رسول شوق صاحب' ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز ملتان ڈویژن۔

چنانچہ تھرڈ ائیر میں مضامین اختیار کرنے کے بارے میں انہوں نے میاں افضل حسین صاحب کی خدمت میں مشورہ کے لئے ایک خط لکھا میاں صاحب نے وہ خط حافظ عبدالمجید صاحب کو بھجوا دیا۔ وہ آئی-سی-ایس (انڈین سول سروس) میں تھے۔ پاکستان بننے کے بعد غالباً وہ پنجاب کے چیف سیکرٹری کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے تھے۔ حافظ عبدالمجید صاحب نے ابا جان کو شملہ سے مندرجہ ذیل جواب لکھا۔ (اس وقت شملہ حکومت پنجاب کا موسم گرما کا دارالخلافہ ہوا کرتا تھا۔)

کنکر لاج
شملہ-ای
13-8-42

محترمی محمدؐ حسین صاحب

سلام مسنون
آپ نے جو خط میاں افضل حسین صاحب کو 42-7-13 کو بھیجا تھا وہ انہوں نے مجھے بھیج دیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ضروری مشورہ میں آپ کو دے دوں۔ جواب میں تاخیر کی وجہ یہ ہے کہ میں اس معاملہ پر غور کرتا رہا ہوں۔
مجھے یہ سن کر بے حد خوشی ہوئی ہے کہ آپ کے صاحبزادہ عبدالسلام نے انٹرنس اور انٹرمیڈیٹ میں اس قدر شاندار کامیابی حاصل کی ہے دعا ہے کہ آئندہ اس سے بھی بہتر کامیابی حاصل کرے۔
میں بھی اپنے زمانہ میں اچھا طالب علم شمار ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میاں افضل حسین صاحب نے مجھ سے مشورہ لیا ہے۔ ایف-اے میں میرے مضامین عربی' سائنس' بی-اے میں ریاضی کے دونوں کورس اور انگریزی آنرز تھے۔ ایم-اے میں ریاضی کا طالب علم تھا۔ میرے خیال میں آپ کے صاحبزادہ کو بھی یہی مضامین لینے چاہئیں۔ بی-اے میں ریاضی آنرز نہ کرنے کا نقصان ایم-اے ریاضی میں ہو سکتا ہے۔ آپ کا صاحبزادہ ہونہار ہے۔ آسانی سے کمی پوری کرلے گا۔
عام خیال یہ ہے کہ مقابلہ کے امتحانوں میں ریاضی کا مضمون فائدہ مند نہیں ہے لیکن اچھے طالب علموں کو اتنی دقت نہیں ہوتی میں نے صرف Lower Mathematics کا مضمون آئی-سی-ایس کے امتحان میں لیا تھا۔ اس میں میرے نمبر 200 میں سے 190 آئے تھے۔ اب تو ریاضی کے مضامین غالباً 800 نمبروں کے لئے جاسکتے ہیں۔ اے کورس اور عربی لینا بے معنی ہے' کیونکہ اے کورس سے پڑھائی پوری نہیں ہوتی۔ ایک ہوشیار لڑکے کے لئے عربی اپنے آپ تیار کرلینا کوئی مشکل نہیں ہے۔
ہسٹری اس مرحلہ پر پڑھانا مناسب نہیں ہوگا۔
اگر آپ لڑکے کو لاہور کے گورنمنٹ کالج میں بھیج سکیں تو اس کے لئے بہتر ہوگا۔ مگر ملتان کے کالج میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔
اگر آپ کو مجھ سے کسی مزید بات پر مشورہ لینا ہو تو میں حاضر ہوں۔ میرے لئے یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ مجھے ایسے ہونہار لڑکے کا علم ہو گیا ہے۔

نیاز مند۔ عبدالمجید

چونکہ ابا جان کی یہ خواہش تھی کہ ان کا بیٹا انڈین سول سروس میں شامل ہو کر ایک بڑا افسر بنے اس لئے بھائی جان کا مطمع نظر بھی یہی تھا۔ اس بارے میں بھائی جان نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا کہ "مجھے

شروع سے والد اور دوستوں نے یہی توجہ دلائی تھی کہ ایک ذہین طالب علم کے لئے سب سے اچھا پیشہ (Career) یہ ہے کہ وہ آئی-سی-ایس (ICS) کا امتحان پاس کرے چنانچہ بچپن سے والد صاحب نے آئی-سی-ایس کے پچھلے پرچے اور اس سے متعلق دوسری چیزیں مجھے تیاری کے لئے فراہم کر دی تھیں حالانکہ میں ابھی دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔"

چنانچہ حافظ عبدالمجید صاحب کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور بی-اے میں ریاضی کے دونوں مضامین (Mathematies A and B Courses) اور انگریزی آنرز اختیار کیا اور اس کے ساتھ اردو غیر اختیاری (Optinal) مضمون رکھا۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر سراج الدین صاحب انگریزی آنرز کا مضمون جبکہ ملک عمر حیات (بعد میں انہیں پنجاب یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا تھا) پروفیسر گنگولی اور پروفیسر چاؤلہ ریاضی پڑھاتے تھے۔ یہ سب استاد بقول بھائی جان مسٹر تھے' یعنی ان میں کوئی بھی پی-ایچ-ڈی نہیں تھا۔

بھائی جان اپنے اساتذہ کی بہت عزت اور احترام کرتے تھے۔

نوبل انعام ملنے کے بعد حکومت ہندوستان کی دعوت پر بھائی جان نے جنوری 1981ء میں اس ملک کا دورہ کیا تھا۔ وہاں سے واپسی کے بعد کراچی یونیورسٹی کے پروفیسر محمد رفیع نے ان سے چند سوالات کئے تھے' جن میں سے ایک سوال یہ تھا: (پورا انٹرویو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی باب میں دیا جا رہا ہے۔)

سوال: ہند کے اس دورے کے دوران ذاتی اعتبار سے کون کون سے یادگار واقعات آپ کے ذہن میں محفوظ ہیں؟

جواب: پرانے ہم جماعت اور دوستوں سے ملاقات کے علاوہ جو چیز میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی وہ میری اساتذہ کرام سے ملاقات ہے۔ میں اپنے ان سب اساتذہ کا جنہوں نے مجھے کسی بھی جماعت میں پڑھایا ہے' بے حد عزت کرتا ہوں۔ والدین کے بعد یہی لوگ عزت و احترام کے مستحق ہیں۔ اس دورے کے دوران مجھے ہند میں مقیم اپنے چار استادوں کو تلاش کرنے میں کامیابی ہوئی۔ جناب ایشا کمار صاحب (چندی گڑھ)' لالہ ہنس راج بھاٹلہ صاحب (دہلی)' پروفیسر اے-این گنگولی صاحب (کلکتہ) اور جناب پی ٹی چندی صاحب (بنگلور) جب میں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میرے اساتذہ صاحبان کی بھی عزت افزائی کی جائے تو میری خواہش کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسا ہی کیا گیا۔ اسی طرح جب میں دسمبر 1979ء میں پاکستان آیا تو صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے میرے استاد علامہ شیر افضل جعفری صاحب کو جو جھنگ میں رہتے ہیں اسلام آباد میں منعقدہ سرکاری تقریب میں مدعو کیا۔

اب یہاں میں پروفیسر گنگولی کا خاص طور سے ذکر کروں گا جنہوں نے مجھے لاہور میں 1945ء سے 1946ء تک علم الحساب پڑھایا تھا۔ جب مجھے کلکتہ یونیورسٹی نے تمغہ دینا چاہا تو میں نے اسے اس شرط پر

قبول کرنے کا وعدہ کیا کہ کلکتہ میں مقیم میرے استاد گنگولی صاحب کی بھی عزت افزائی کی جائے۔ کلکتہ یونیورسٹی نے اسے بخوشی منظور کر لیا۔ اٹھاسی سال کے عمر رسیدہ پروفیسر گنگولی جو ناسور جیسے موذی مرض میں مبتلا ہیں' اس قابل نہ تھے کہ تقریب میں شرکت کے لئے حاضر ہو سکتے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر آر۔کے پڈار میرے ہمراہ ان کے گھر تشریف لے گئے اور انہیں تین ہزار روپے کا چیک اور ایک سند پیش کی جو ان کے درس و تدریس کی خدمات کے اعزاز میں تھی۔ میری رائے ہے کہ اسی قسم کے انعامات پاکستان میں بھی تقسیم کئے جائیں۔"

ایسا ہی ایک واقعہ پہلے بھی ہماری تاریخ میں محفوظ ہے۔ شاعر مشرق علامہ محمدؒ اقبال کو جب حکومت برطانیہ نے "سر" کا خطاب دینے کا فیصلہ کیا تو انہوں نے اُسے قبول کرنے کے لیے یہ شرط رکھی کہ پہلے ان کے استاد حضرت علامہ میر حسن صاحب کو خطاب دیا جائے۔ چنانچہ حکومت ہند نے حضرت علامہ میر حسن صاحب کو "شمس العلماء" کے خطاب سے نوازا۔ اس کے بعد علامہ محمدؒ اقبال نے "سر" کا خطاب قبول کیا تھا۔

بھائی جان کالج کے نیو ہوسٹل میں رہتے تھے۔ امتحان سے چالیس پچاس روز پہلے دوسرے طالب علموں کی دخل در معقولات اور تضیع اوقات سے بچنے کے لئے وہ اپنے کمرے کے دروازے کو باہر سے تالا لگوا دیا کرتے تھے۔ یہ کام ہوسٹل کا ایک ملازم جس کا نام سیدا تھا بڑی راز داری سے کیا کرتا تھا۔ تالا لگانے کے بعد وہ چابی دروازے کے نیچے سے انہیں دے دیتا تھا۔ کبھی کبھی وہ پڑھائی اپنے ایک دوست کے کمرے میں بھی کرتے تھے جو سائنس پریکٹیکلز کی وجہ سے اپنے کمرے میں دیر سے آتا تھا۔

ان کے خیال میں پڑھائی میں یک سوئی حاصل کرنے کا یہی ایک موثر اور بہتر طریقہ تھا۔

اپنی قابلیت اور حسن سلوک سے وہ کالج میں ہر دلعزیز تھے۔ اسی وجہ سے انہیں کالج کی سٹوڈنٹس یونین کا بلا مقابلہ پریزیڈنٹ منتخب کیا گیا تھا۔ وہ ایک اچھے مقرر تھے اور تقریری مقابلوں میں ہمیشہ اول آیا کرتے تھے۔ انہیں کالج کے میگزین "راوی" کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا تھا جبکہ 1946ء میں انہیں کالج میگزین کا ایڈیٹر انچیف بنایا گیا۔

1943ء میں جب وہ فورتھ ایئر کے طالب علم تھے تو ایک روز ان کے ریاضی کے پروفیسر چاؤلہ نے ایک ہندوستانی ریاضی دان سری نواس رامانوجن (Srinivas Ramanujan) کی ریاضی کی ایک مساوات (Equation) کا کلاس میں ذکر کیا۔ بھائی جان نے اس مساوات کا بہتر اور مختصر حل پیش کر دیا۔ ان کا وہ پہلا تحقیقی مقالہ جو انہوں نے سترہ سال کی عمر میں لکھا تھا۔ مدراس سے شائع ہونے والے میتھس سٹوڈنٹ (Maths Student) کی جلد گیارہ' شمارہ 2۔1 مارچ - جون 1943 میں شائع ہوا تھا۔

رامانوجن کے بارے میں بھائی جان نے بتایا کہ "وہ ذات کا برہمن اور پیشے کے اعتبار سے ایک کلرک تھا۔ اس نے ریاضی کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی کیونکہ کتب خریدنے کے لئے اس میں استطاعت

نہ تھی۔ البتہ اس کے پاس ریاضی کی بک آف ریزلٹس (Book of Results) تھی جس کی مدد سے وہ مساوات حل کیا کرتا تھا' وہ انوکھی قسم کا ایک عجیب و غریب ریاضی دان تھا۔ ایک مرتبہ اس نے ریاضی کی ایک سو بیس مساوات کے حل کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور ریاضی دان پروفیسر ہارڈی (Professor Hardy) کو بھجوائے۔ پروفیسر ہارڈی نے ان کے بارے میں بتایا کہ "پہلے ساٹھ حل تو ادنیٰ قسم کے تھے۔ اگلے تیس حل میرے دل کو لگے۔ لیکن آخری تیس کو میں سمجھ نہ سکا۔ اس پر میں نے رامانوجن کو خط لکھ کر دریافت کیا کہ آخری تیس مساوات اس نے کیسے حل کی ہیں اور اس کے حل کا ثبوت کیا ہے۔ اس کے جواب میں اُس نے پروفیسر ہارڈی کو لکھا کہ "یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں کہ میں نے وہ مساوات کیسے حل کی ہیں۔ دراصل دیویاں خواب میں آکر مجھے حل بتا جاتی ہیں۔" اس کے بعد پروفیسر ہارڈی نے اُسے کیمرج آنے کی دعوت دی لیکن اس کی والدہ نے اُس کی مخالفت کی کیونکہ وہ کٹر برہمن تھا اور مذہبی نقطہ نگاہ سے برہمن کو سات سمندر پار سفر کرنے کی اجازت نہ تھی۔ تاہم اس نے اس سفر کے لئے اپنی والدہ کو رضامند کر لیا۔ کیمبرج میں وہ اکثر بھجن گایا کرتا تھا اور اپنے کپڑوں کو پانی سے بھگو کر رکھتا تھا جس کی وجہ سے اسے نمونیہ ہو گیا اور وہ وہیں فوت ہو گیا۔ بھائی جان نے بتایا کہ پروفیسر ہارڈی کہا کرتے تھے کہ "میں نے اپنی زندگی میں صرف دو اشخاص کو ریاضی میں اپنا رفیق کار بنایا تھا رامانوجن ان میں سے ایک تھا۔"

ابا جان ملتان میں ملازمت کرتے تھے اس لئے بھائی جان گرمی کی چھٹیاں وہاں گزارتے تھے۔ وہاں ان کی پڑھائی کے لئے ابا جان گورنمنٹ ہائی سکول کے ہوسٹل میں انتظام کرتے۔ اس بارے میں چوہدری رشید احمد صاحب جو ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور جن کا پہلے ذکر آچکا ہے بیان کرتے ہیں:

"1943ء میں میں ملتان آگیا اور ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ بن گیا۔ میں نے ایک کمرہ سلام کو پڑھائی کے لئے دے دیا تھا۔ اُس میں ایک چارپائی' بستر' میز اور کرسی ہر وقت تیار رہتی تھی۔ پانی اور چائے کا خاص انتظام کیا ہوا تھا۔ بجلی بھی موجود تھی۔ سلام صاحب صبح آٹھ بجے آتے۔ ساڑھے بارہ بجے گھر چلے جاتے اور پھر دو بجے آتے اور تقریباً چھ بجے شام تک پڑھتے۔ اس وقت وہ ایک منٹ بھی ضائع نہ کرتے تھے۔ پوری توجہ کام کی طرف کرتے تھے۔ میں نے ایسا طالب علم ساری زندگی نہیں دیکھا جس کو اپنی تعلیم کا اتنا فکر ہو۔ سلام کا گھر تقریباً ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلہ پر تھا۔ پانچ بجے تک مولوی نواب دین صاحب (ایم-اے اردو و فارسی' ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ملتان--- ناقل) میرے پاس آجاتے۔ پھر سلام صاحب چھ بجے ہمارے پاس آجاتے اور ایک گھنٹہ ہمارے پاس بیٹھتے۔ مگر اس دوران اُس نے کبھی لاپرواہی نہ کی تھی۔ وہ کسی اور رنگ کا لڑکا تھا۔ عام طالب علموں سے الگ رہتا دماغ بہت اچھا تھا۔ والدین کی دعائیں ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھیں۔ 1943ء میں ایم-اے پاس کرنے تک ہمارے پاس آتا تھا۔ ہر وقت اس کے چہرہ پر مسکراہٹ رہتی تھی۔ اپنے ملک کی بات ہوتی جنگ عظیم جو ان دنوں لڑی جا رہی

تھی----- ناقل) یا غیر ملکی بات ہوتی وہ ہمیشہ غور سے سنتا پھر سوچتا رہتا اور خاموش رہتا' اُن کی صحت بہت اچھی تھی۔"

بھائی جان جب تھرڈ ایئر کے طالب علم تھے تو انہوں نے اپنے چند کلاس فیلوز کے ساتھ ریلوے میں انجینئرنگ اپرنٹس شپ سکیم کے لئے انٹرویو دیا تھا اور اس میں کامیاب بھی ہو گئے تھے' لیکن بعض وجوہات کی بناء پر انہوں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ 1962ء میں میری ملاقات ریلوے کے چیف انجینئر سے ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ "آپ کے بھائی عبدالسلام نے میرے ساتھ ریلوے کی اپرنٹس سکیم میں انٹرویو دیا تھا۔ اچھا ہی ہوا کہ انہوں نے ریلوے کی ملازمت اختیار نہ کی ورنہ آج وہ میری طرح ایک چیف انجینئر ہی ہوتے۔"

گرمی کی چھٹیوں میں وہ بطور ٹیوٹر چند دنوں کے لئے ملتان کے ایک بہت بڑے زمیندار ملک عمر علی کھوکھر کے دو بیٹوں کے ہمراہ بغرض سیر و تفریح شملہ جایا کرتے تھے۔ سفر اور رہائش وغیرہ کے تمام اخراجات ملک صاحب ادا کرتے تھے۔

میٹرک اور ایف-اے کے امتحانوں میں عموماً ہندو اور سکھ لڑکے پنجاب یونیورسٹی میں اول آیا کرتے تھے۔ گویا اس میدان میں بھی ان کی اجارہ داری تھی۔ ان امتحانوں میں بھائی جان کے اول آنے سے یہ قومیں خصوصاً ہندو بہت سٹپٹائے ہوئے تھے۔ چنانچہ ڈی-اے-وی کالج لاہور جو کٹر ہندو کالج تھا کے چند اساتذہ نے مل کر ایک ذہین ہندو طالب علم کو بی-اے کے امتحان کے لئے خصوصی توجہ سے پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل' والدین اور دوسرے بزرگوں کی دعاؤں کے طفیل بھائی جان بی-اے کے امتحان میں نہ صرف پنجاب یونیورسٹی میں اول آئے بلکہ انہوں نے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا جسے آج تک کوئی مات نہیں کر سکا۔ قدرت خداوندی اس سال یونیورسٹی میں دوم اور سوم آنے والے لڑکے بھی مسلمان تھے اور وہ ہندو لڑکا بمشکل ساتویں یا آٹھویں پوزیشن حاصل کر سکا۔

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خنداں زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

ابا جان کہا کرتے تھے کہ "دنیا کے سامنے جب بھی ہاتھ پھیلایا ہے خالی آیا ہے اور اس مالک حقیقی کے سامنے جب بھی جھولی پھیلائی ہے کبھی خالی نہیں لوٹا۔"

بی-اے میں بھائی جان کے حاصل کردہ نمبروں کی تفصیل:

ریاضی 300/300' انگریزی آنرز 121/150' اردو غیر اختیاری 30/50 اردو میں حاصل کردہ نمبروں سے بھائی جان مطمئن نہیں تھے۔ ان کا اردو کا پرچہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کسی استاد کے پاس بھجوایا گیا تھا وہ کہا کرتے کہ "انہیں میری اردو پسند نہیں آئی تھی۔ میری توقع کے مطابق مجھے کم از کم 40 یا 45 نمبر ملنے چاہئیں تھے۔"

بی-اے میں جو میڈل انعام میں ملے ان کی تفصیل:
بی-اے انگلش آنرز۔ نہال چند گولڈ میڈل
بی-اے ریکارڈ توڑنے پر سلور میڈل
بی-اے ریکارڈ توڑنے پر سلور میڈل ڈائریکٹر تعلیم لاہور نے دیا۔
بی-اے کے امتحان کے بعد انہوں نے حکومت پنجاب سے 35 روپے اور جماعت احمدیہ جوبلی فنڈ سے 60 روپے ماہوار کے وظائف حاصل کئے تھے۔ علاوہ ازیں حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب (جماعت احمدیہ کے دوسرے امام) نے بی-اے میں اول آنے پر بھائی جان کو دو سو روپے نقد انعام دیا تھا۔
ڈسٹرکٹ بورڈ جھنگ ایک اخبار شائع کیا کرتا تھا جس کا نام عروج تھا۔ شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی عروج کے ایڈیٹر تھے۔ (وہ تقریباً 149 کتب کے مؤلف تھے اور برصغیر ہندوپاک کے نامور ادیبوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ 1970ء میں حکومت پاکستان نے ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں تمغہ حسن کارکردگی عطا فرمایا تھا۔ بھائی جان کی فرمائش پر 1974ء میں انہوں نے ہمارے والد حضرت چوہدری محمد حسین صاحب کی ڈائریوں سے "سوانح محمد حسین" مرتب کی تھی۔)
بی-اے کے امتحان میں پنجاب یونیورسٹی میں اول آنے پر عروج نے مندرجہ ذیل ہدیہ تبریک پیش کیا تھا:

کیا باد صبا لائی مسرت کی نوید آج
قسمت نے دکھایا ہے عجیب روز سعید آج
کس شان سے چمکا ہے تو اے عبدالسلام آج
روشن تیرے نام سے ہوا جھنگ کا نام آج
اے مادر پنجاب کی گود کے دلارے
اے جھنگ کی آغوش کے رخشندہ ستارے
ہستی پہ تیری جھنگ سدا ناز کرے گا
پنجاب کو ہستی پہ تیری فخر رہے گا
قسمت کی خوشی جھنگ کے تجھ لال کو بخشے
اللہ بلندی تیرے اقبال کو بخشے
ہیں جھنگ کے بھائیوں کے عقیدت کے یہی پھول
تحفہ و مبارک رہے عزت جو ہو مقبول

ایم-اے میں داخلہ اور بھائی جان کی زندگی کا پہلا اہم موڑ

1939ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی تھی اس لئے حکومت نے انڈین سول سروس میں داخلے کے لئے مقابلے کے امتحان غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کر دیئے تھے۔ 1944ء میں جب بھائی جان نے بی-اے کا امتحان پاس کیا تو اس وقت بھی جنگ جاری تھی اس لئے انہوں نے ایم-اے میں داخلہ لے لیا اور ریاضی کا انتخاب کیا۔

1945ء میں اگرچہ جنگ ختم ہو گئی تھی لیکن آزادی ہند کی تحریک زور شور سے چل رہی تھی اور انگریزوں کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اب وہ وقت قریب ہے جب انہیں ہندوستان سے چلے جانا ہو گا۔ لہٰذا انہوں نے انڈین سول سروس میں داخلے کے امتحان 1947ء تک ملتوی کر دیئے۔ یہ فیصلہ بھائی جان کی زندگی میں آنے والے تین اہم موڑوں جن کا وہ اکثر تذکرہ کیا کرتے تھے' پہلا موڑ تھا۔ اس بارے میں اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے بتایا کہ "میری زندگی میں تین اہم موڑ آئے ہیں اور یہیں سے میری زندگی کی نئی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ مثلاً شروع ہی سے والدین کی خواہش تھی کہ میں آئی-سی-ایس (I. C. S) بن جاؤں' ممکن ہے میں خود بھی اس خواہش کی تکمیل میں رکاوٹ نہ بن سکتا لیکن اچانک جنگ شروع ہو گئی اور اس مقابلے کے امتحانات ہی نہ ہو سکے۔ اگر امتحان ہو جاتے اور میں ان میں شریک ہو جاتا تو اس وقت میرے کریئر کی معراج چیف سیکرٹری کا عہدہ ہوتا۔" انہیں موڑوں یا اتفاقات نے اُنہیں ایک سائنسی محقق بنا دیا۔ وہ یہ بات زور دے کر کہتے کہ "ترقی پذیر ممالک کی سوسائٹیاں کئی لحاظ سے ایک ایسا سائٹیفک اور عادلانہ نظام قائم کرنے میں ناکام رہی ہیں جس میں ہر مرد اور عورت کو اپنی صلاحیتوں کو اپنی انتہائی استعداد تک ترقی دینے کا موقع مل سکے اور یہ محض حادثات یا اتفاقات ہیں جن کی بدولت تمام بڑے آدمیوں کو بقائے انسانیت کی خاطر جدوجہد کرنے کا موقع ملتا رہا جب کہ نہ جانے کتنے لائق افراد اپنی زندگیوں میں پیش آنے والے "حادثات" کے فقدان کے سبب محض ضائع ہو جاتے ہیں۔ ہمارے غیر سائنٹیفک نظام کی خامیاں اور نقائص ہمارے اس دعویٰ کی واضح تردید کرتے ہیں کہ ہم ایک سائنسی زمانے میں سانس لے رہے ہیں۔ فی الحقیقت ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ سائنس ہماری مادی ضروریات پوری کرتی رہے۔ ہم اپنے عوامی اور معاشرتی اعمال اور رویوں کو سائنسی فکر و منطق سے منطبق کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرتے۔"

بھائی جان نے ایم-اے فائنل کا امتحان 1946ء میں دینا تھا جبکہ آئی-سی-ایس میں داخلے کے امتحان 1947ء میں ہونا قرار پایا تھا۔ یوں انہیں ایک سال انتظار کرنا پڑتا۔ لیکن وہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہیں اب ہوشمندی اور سمجھ داری سے اپنے کریئر (Career) کا انتخاب کرنا تھا۔ چنانچہ اباجان نے میاں افضل حسین سے اس بارے میں مشورہ کے لئے رجوع کیا۔ میاں صاحب نے مشورہ دیا چونکہ داخلے

کے امتحان کی حد عمر 25 سال ہے۔ اس لئے ایک سال ضائع کرنے کی بجائے سلام اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرون ملک چلے جائیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ وہ ایم-اے کے بعد کیمبرج یونیورسٹی سے ریاضی ٹرائی پوز حصہ دوئم کریں (Mathematics Tripos Part II) بجائے پی-ایچ-ڈی میں داخلہ لیں جیسا کہ برصغیر سے ایم-اے کرنے والے طلبا کی اکثریت کیا کرتی ہے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ پی-ایچ-ڈی کرنے سے پہلے علم کی سرحدوں کو اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیے کیونکہ کسی مضمون کا جامع علم حاصل ہونے کے بعد اس علم کی گہرائی میں جانا اور اس کے مسائل کو سلجھانا آسان ہو جایا کرتا ہے۔

کیمبرج یونیورسٹی میں اگرچہ تعلیمی سال کا آغاز اکتوبر میں ہوتا ہے لیکن وہاں داخلے ایک سال پہلے جولائی، اگست تک مکمل کر لئے جاتے ہیں۔ چنانچہ میاں افضل حسین کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے بھائی جان نے مارچ 1946ء میں داخلے کے لئے درخواست کیمبرج بھجوا دی۔

1946ء میں بھائی جان نے ایم-اے کا امتحان پاس کر لیا۔ انہوں نے چھ سو میں سے پانچ سو تہتر نمبر حاصل کئے اور یونیورسٹی میں اول آئے۔

بھائی جان کی زندگی کا دوسرا اہم موڑ

بھائی جان نے اگرچہ کیمبرج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخلے کی درخواست تو بھجوا دی تھی لیکن ابا جان اپنے بیٹے کو بیرون ملک تعلیم دلانے کے اخراجات کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ ان کی خودداری انہیں اس بات کی بھی اجازت نہ دیتی تھی کہ وہ اس سلسلے میں کسی اور سے مدد طلب کرتے چنانچہ وہ دعاؤں کے ذریعے اپنے رب کریم سے اس کی نصرت کے طالب گار ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاؤں کو غیر معمولی طور پر شرف قبولیت بخشا اور ایسے رنگ میں مدد فرمائی جس کا وہم و گمان ہی نہیں تھا۔

ملک خضر حیات ٹوانہ، کالرہ ضلع سرگودھا کے ایک بہت بڑے جاگیردار تھے۔ وہ ہزاروں ایکڑ زرعی اراضی کے مالک تھے۔ ان کا تعلق یونینسٹ پارٹی سے تھا، جس کے سربراہ میاں افضل حسین کے بڑے بھائی سر فضل حسین تھے۔ ملک خضر حیات ٹوانہ نے حکومت برطانیہ کو جنگ عظیم میں مدد دینے کے لئے تین لاکھ روپے اکٹھے کئے، مگر 1945ء میں جنگ ختم ہو گئی اور سر فضل حسین کے بعد 1946ء میں انہوں نے کانگریس پارلیمنٹری پارٹی سے مل کر مخلوط حکومت بنائی جس کے وہ وزیر اعلیٰ تھے۔ ان کی کابینہ میں ایک وزیر سر چھوٹو رام تھے جو ایک معمولی کاشتکار کے بیٹے تھے۔ ان کے باپ اور ان جیسے اور چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کو سود خور ہندو بنیوں نے بے حد ستایا ہوا تھا۔ وہ کسانوں کی فصل سود میں اٹھا لے جاتے جبکہ اصل قرض جوں کا توں رہتا۔ ان سود خور بنیوں کی غیر انسانی کارروائیوں سے چھوٹے کسانوں کو تحفظ دینے کے لئے سر چھوٹو رام نے اپنی پارٹی کی حکومت کے ذریعے کچھ اقدام کئے تھے جن کی وجہ سے وہ اُن میں بہت ہر دلعزیز ہو گئے۔ ان کی تعریف میں لکھی گئی ایک نظم چھوٹے کاشتکاروں میں بہت مقبول ہوئی۔

غالباً اس کا مصرعہ تھا: "ہے تو وہ چھوٹو رام پر کام کرتا ہے بڑے بڑے" وہ چھوٹے کاشتکاروں کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ نہ کچھ کرتے رہتے تھے۔

"وار فنڈ" جسے ملک خضر حیات ٹوانہ نے جمع کیا تھا۔ ابھی تک وہ کسی مصرف میں نہیں آیا تھا۔ سر چھوٹو رام نے تجویز کیا کہ اس فنڈ سے چھوٹے زمینداروں کے ہونہار بچوں کو بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کے لئے وظائف دیئے جائیں۔ چنانچہ جمع شدہ رقم سے اس مقصد کے لئے ایک فنڈ قائم کیا گیا جس کا نام پیزنٹ ویلفیئر فنڈ (Peasant Welfare fund) رکھا گیا۔ چھوٹے زمینداروں کے مفاد کو تحفظ دینے کے لئے یہ شرط عائد کی گئی کہ اس فنڈ سے وظائف صرف ان زمینداروں کے بچوں کے لئے مختص کئے جائیے جو پچیّس روپے یا اس سے کم سالانہ مالیہ حکومت کو ادا کرتے ہوں۔

جیسے ہی اس سکیم کا ابا جان کو علم ہوا تو انہیں اپنے بیٹے کو بیرون ملک تعلیم دلوانے کے لئے امید کی ایک کرن نظر آئی۔ اگرچہ وہ زمیندار تو نہیں تھے لیکن ان کے ذہن میں ایک بات آئی اور وہ فوراً ملتان سے قادیان (تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور) اپنے بڑے بھائی حضرت چودھری غلام حسین صاحب کے پاس گئے اور تمام صورت حال سے انہیں آگاہ کرتے ہوئے اُنھوں نے اپنے بھائی سے درخواست کی کہ اگر وہ اپنی زرعی اراضی میں سے تھوڑا سا رقبہ ان کے نام منتقل کردیں تو اس طرح وہ ایک چھوٹے زمیندار کے زمرے میں آجائیں گے اور یوں سلام کو وظیفہ ملنے کا امکان ہو سکتا ہے۔ چنانچہ تایا جان نے اپنے بھائی کی خواہش کو پورا کرتے ہوئے کچھ زرعی اراضی ان کے نام منتقل کردی۔ اس انتقال اراضی کی تصدیق ڈپٹی کمشنر گورداسپور کے دفتر سے کرائی گئی۔ اس سلسلے میں مرزا عبدالحق صاحب ایڈوکیٹ گورداسپور حال سرگودہا نے قانونی امداد کی۔ یوں بھائی جان پیزنٹ ویلفیئر فنڈ سے وظیفہ کے حق دار ٹھہرے اور انہوں نے وظیفہ کے حصول کے لئے اپنی درخواست محکمہ تعلیم حکومت پنجاب کو بھجوائی۔

میاں افضل حسین وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی وظیفہ دینے والی کمیٹی کے چیئرمین تھے وہ چونکہ بھائی جان کے تعلیمی ریکارڈ سے بڑی اچھی طرح سے واقف تھے اس لئے انہوں نے بھائی جان کا انٹرویو لئے بغیر ان کے لئے وظیفہ کی منظوری دے دی۔ بھائی جان کے علاوہ چار اور طلباء کو بھی اسی فنڈ سے وظائف کی منظوری دی گئی تھی۔

کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ

انگلستان کی یونیورسٹیوں میں داخلہ لندن میں ہندوستانی ہائی کمیشن کے دفتر کی معرفت ہوا کرتے تھے۔ عموماً یہ داخلے اکتوبر میں تعلیمی سال شروع ہونے سے ایک سال پہلے ہی مکمل کر لئے جاتے تھے۔ مگر بھائی جان کو اس بات کا علم نہیں تھا لیکن جیسے ہی اُنہیں اس بات کا پتہ چلا تو انہوں نے میاں افضل حسین کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے ٹرائی پوزیشن انڈر گریجویٹ میں داخلہ کے لئے اپنی درخواست قاعدہ کی رو سے

لندن میں ہندوستانی ہائی کمشنر کے دفتر کی معرفت سینٹ جونز کالج (St John's College) بھجوا دی۔ چونکہ ان کی درخواست وقت مقررہ کے بعد بھجوائی گئی تھی اس لئے انہیں داخلہ ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن مشیت ایزدی جو قدم قدم پر بھائی جان کی مدد کرتی آ رہی تھی نے اپنا فضل کیا کہ 4 ستمبر 1946ء کو ہندوستانی ہائی کمشنر لندن کے دفتر سے بھائی جان کو ملتان کے پتہ پر ایک تار موصول ہوئی جس میں لکھا تھا کہ سینٹ جونز کالج کیمبرج میں غیر متوقع طور پر ایک جگہ خالی ہوئی ہے۔ اگر وہ اکتوبر کے پہلے ہفتہ تک وہاں پہنچ جائیں تو اُنہیں داخلہ مل سکتا ہے۔ اس غیر متوقع صورت حال کا پس منظر کچھ یوں تھا:

ہندوستان کی کسی یونیورسٹی سے ایک شخص پروفیسر محمد یوسف کو سینٹ جونز کالج نے بطور ریسرچ سکالر یعنی پی-ایچ-ڈی کرنے کے لئے داخلہ دیا تھا۔ لیکن اگست 1946ء میں پروفیسر محمد یوسف نے سینٹ جونز کالج کو اطلاع دی کہ وہ ریسرچ نہیں کرنا چاہتا اس لئے وہ اپنا نام واپس لیتا ہے۔ چنانچہ یہ اطلاع ملتے ہی کالج کی انتظامیہ نے فوری طور پر انڈین ہائی کمیشن لندن آفس سے رابطہ قائم کر کے ان سے کہا کہ ان کے ہاں غیر متوقع طور پر ایک جگہ خالی ہوئی ہے مگر وہ بجائے ریسرچ کرنے کے کسی ایسے طالب علم کو داخلہ دینے کے لئے تیار ہیں جو ٹرائی پوز کرنا چاہتا ہو۔ اس وقت انڈین ہائی کمیشن میں دو طلباء کی داخلہ کے لئے درخواستیں موجود تھیں۔ اتفاق سے دونوں کا نام عبدالسلام تھا۔ ایک کا تعلق حیدر آباد دکن یونیورسٹی سے اور دوسرے کا تعلق پنجاب یونیورسٹی سے تھا۔ حیدر آباد دکن کا عبدالسلام ریسرچ کرنا چاہتا تھا جبکہ پنجاب یونیورسٹی کا عبدالسلام (یعنی بھائی جان) ٹرائی پوز کرنا چاہتے تھے لیکن انڈین ہائی کمیشن آفس نے حیدر آباد دکن کے عبدالسلام کی درخواست سینٹ جونز کالج بھجوا دی تاہم انہیں جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے عبدالسلام کی درخواست سینٹ جونز کالج بھجوائی جسے کالج نے فوراً داخلہ کے لئے منظور کرتے ہوئے انڈین ہائی کمیشن لندن آفس سے کہا کہ وہ عبدالسلام کو اکتوبر کے پہلے ہفتے میں کیمبرج پہنچنے کے لئے کہہ دیں۔

وظیفہ کی منظوری معلوم کرنے کے لئے شملہ کا سفر

اگرچہ بھائی جان کو سینٹ جونز کالج کیمبرج میں داخلہ کی اطلاع مل گئی تھی لیکن اس وقت تک انہیں وظیفہ کی منظوری کی اطلاع نہیں ملی تھی۔ چنانچہ یہ معلوم کرنے کے لئے وہ فوراً ملتان سے لاہور گئے۔ وہاں انہیں پتہ چلا کہ محکمہ تعلیم کا عملہ ابھی تک شملہ میں ہے۔ (انگریزوں کے دور حکومت میں موسم گرما میں پنجاب سیکرٹریٹ کے دفاتر شملہ منتقل ہو جایا کرتے تھے۔ جو مری کی طرح ایک صحت افزا مقام تھا) چنانچہ بغیر کوئی وقت ضائع کئے وہ لاہور سے شملہ چلے گئے۔ وہ شملہ سے اچھی طرح واقف تھے کیونکہ پچھلے چند سالوں سے وہ ملتان کے ایک رئیس ملک عمر علی کھوکھر (جو بڑے ملک عمر علی کہلاتے تھے) کے بیٹوں ملک زوار حسین اور ملک نثار حسین کے بطور ٹیوٹر ان کے ساتھ چند ہفتوں کے لئے وہاں جایا کرتے تھے۔

شملہ پہنچ کر متعلقہ دفتر جانے کے لئے وہ ایک پہاڑی پر چڑھ رہے تھے کہ انہوں نے ایک شخص سے جو پہاڑی سے اتر رہا تھا متعلقہ دفتر کا پتہ دریافت کیا تو اتفاق سے وہ اسی دفتر کا ایک ملازم تھا۔ اس نے بھائی جان سے پوچھا کہ انہیں وہاں کیا کام ہے۔ جب بھائی جان نے اسے بتایا کہ وہ اپنے وظیفے کے بارے میں معلوم کرنے آئے ہیں، تو اس نے ایک لفافہ بھائی جان کے حوالے کرتے ہوئے کہا: "میں یہ خط آپ کو ہی پوسٹ کرنے جا رہا تھا۔ آپ اسے یہیں وصول کر لیں۔" بھائی جان نے جب لفافہ کھولا تو اس میں انہیں وظیفہ کی منظوری کی اطلاع دی گئی تھی، جو اس بات سے مشروط تھی کہ انہیں کیمبرج یا انگلستان کی کسی اور یونیورسٹی میں داخلہ مل جائے۔ بھائی جان خط پڑھ کر بہت خوش ہوئے اور خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر وہ دفتر میں گئے اور وہاں وہ سید غلام خالق جو ایک سینئر افسر تھے سے ملے۔ سید غلام خالق غالباً گورنمنٹ کالج لاہور سے بھائی جان کو جانتے تھے۔ بھائی جان نے جب انہیں یہ بتایا کہ کیمبرج یونیورسٹی میں انہیں داخلہ مل گیا ہے تو وہ اس پر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے کہا: "بیٹا یہ تو بہت اچھا ہوا ہے کہ تمہیں کیمبرج میں داخلہ مل گیا ہے اور وظیفہ بھی منظور ہو گیا ہے۔ اب تم جلدی سے دہلی چلے جاؤ اور اپنے لئے کسی بحری جہاز پر انگلستان کے لئے سیٹ بک کراؤ۔" پھر انہوں نے کمال مہربانی سے دہلی میں ایک شپنگ لائینز کے دفتر میں کسی کے نام تعارفی خط دیا اور بھائی جان کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ "برخوردار سمندری سفر ہر ایک کو موافق نہیں آتا۔ بعض اوقات انسان کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ اس لئے اپنے ساتھ اچار اور بادام روغن وغیرہ ضرور لے جانا۔" بھائی جان نے اس نصیحت پر عمل کیا تھا یا نہیں یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن اپنے بھائی کی طبیعت کو جانتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ انہوں نے اس نصیحت پر ضرور عمل کیا ہو گا۔ سید غلام خالق کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ شملہ سے دہلی کے لئے روانہ ہو گئے۔ سفر میں یہ ان کا مسلسل تیسرا دن تھا۔

دہلی پہنچ کر وہ شپنگ لائینز کے دفتر میں اس شخص سے ملے جس کے نام سید غلام خالق نے تعارفی خط دیا تھا، لیکن وہ کوئی بدمزاج شخص ثابت ہوا اور وہ بڑی بے رخی اور درشتی سے پیش آیا اور کہنے لگا: "آ جاتے ہیں منہ اٹھائے ہوئے۔ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ وقت کیا ہو گیا ہے۔" (غالباً وہ ہفتہ کا روز تھا اور دفتر میں چھٹی ہونے والی تھی) اس نے کسی قسم کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ بھائی جان اس شخص کے رویے سے مایوس ہو کر اس دفتر سے باہر نکل رہے تھے کہ کسی نے انہیں پیچھے سے آواز دی کہ "ذرا رک جائیے۔" آواز دینے والا آدمی جب ان کے نزدیک آیا تو اس نے بتایا کہ "وہ اسی دفتر میں کام کرتا ہے اور اس نے اپنے افسر کی باتیں سنی ہیں۔" اس نے مزید بتایا کہ "وہ افسر اینگلو انڈین ہے اور وہ اپنے آپ کو بڑا صاحب سمجھتا ہے اور وہ کسی کا کوئی کام نہیں کرتا۔" اپنے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ مسلمان ہے اور اس کا نام مبارک علی ہے۔" پھر اس نے کہا کہ آپ بھی مجھے مسلمان معلوم دکھائی دیتے ہیں اس لئے میں آپ کی ضرور مدد کروں گا۔ میں اگرچہ آپ کے لئے "پکی" سیٹ تو بک نہیں کر سکتا لیکن عارضی بکنگ کر

سکتا ہوں۔" پھر اس نے ایک فارم بھروایا اور بمبئی میں اپنے دفتر میں ایک دوست کے نام تعارفی خط دیا اور بھائی جان سے کہا: "وہ جلد از جلد بمبئی چلے جائیں کیونکہ 18 ستمبر کو ایک بحری جہاز انگلستان کی بندرگاہ لیور پول کے لئے روانہ ہونے والا ہے' ممکن ہے اس جہاز میں انہیں سیٹ مل جائے۔ اگرچہ یہ کام ہے ذرا مشکل ہے کیونکہ اکثر برطانوی فوجی اور ان کے اہل خاندان برصغیر کی آزادی اور ممکنہ تقسیم کے پیش نظر تیزی سے برطانیہ واپس جا رہے ہیں۔ اس لئے کسی بحری جہاز میں سیٹ ملنا مشکل ہے۔" بھائی جان نے اس فرشتہ سیرت انسان کا شکریہ ادا کیا اور اسی وقت ملتان کے لئے روانہ ہو گئے۔

مسلسل چار راتیں سفر میں گزارنے کے بعد جب وہ ملتان پہنچے تو ابا جان ان کا بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔ بھائی جان نے اپنے سفر کی روئداد انہیں تفصیل سے سنائی۔ وظیفہ کے ملنے کا سن کر وہ فوراً سجدہ میں چلے گئے اور اپنے رب کا شکر ادا کیا۔

بھائی جان نے چونکہ فوراً بمبئی کے لئے روانہ ہونا تھا۔ وقت بہت کم تھا اور سفر کی تیاری کرنا تھی۔ ضرورت کی چیزیں خریدنا تھیں' لیکن اتفاق سے ابا جان کے پاس رقم کی کمی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ایک دوست شیخ محمد شفیع صاحب جو گورنمنٹ ہائی اسکول ملتان میں ٹیچر تھے سے مبلغ نو صد روپے قرض لیا۔ جس سے انہوں نے لوہے کا نیا ٹرنک' ضروری کپڑے وغیرہ خریدے' بھائی جان نے اپنی ایم-اے کی کتب بھی اس ٹرنک میں بھر لیں اور سفر پر روانہ ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔ انہوں نے بمبئی براستہ لاہور۔ بٹھنڈہ جانا تھا۔ ان کی گاڑی ملتان سے رات کے وقت چلنی تھی۔ ان دنوں وہاں ہندو مسلم فسادات کی وجہ سے رات کو کرفیو لگا کرتا تھا۔ اس لئے ابا جان نے ڈپٹی کمشنر آفس سے ریلوے اسٹیشن پر جانے کے لئے کرفیو پاس بنوا لئے' لیکن خود سٹیشن پر اپنے بیٹے کو الوادع کرنے کے لئے نہ گئے۔ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "بیٹا میں گھر میں بیٹھ کر تمہارے لئے دعا کروں گا' اللہ تمہیں اپنی حفاظت میں لے جائے۔"

مرزا مرید احمد جو جھنگ شہر میں ہمارے ہمسائے تھے اور بھائی جان کے دوست وہ لاہور سے بٹھنڈہ تک بھائی جان کے ساتھ گئے۔ (وہ ریلوے پولیس میں ملازم تھے) بٹھنڈہ نارتھ ویسٹرن ریلوے جو بعد میں پاکستان ویسٹرن ریلوے اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد پاکستان ریلوے کہلائی کا آخری بڑا ریلوے جنکشن تھا۔

مرزا مرید احمد نے ایک دفعہ بتایا کہ "ایک مرتبہ وہ جھنگ سے لاہور اپنے کسی کام سے گئے۔ بھائی جان ان دنوں گورنمنٹ کالج کے طالب علم تھے اور نیو ہوسٹل میں رہتے تھے۔ مرزا مرید احمد ان سے ملنے کے لئے ہوسٹل چلے گئے۔ مغرب کا وقت تھا۔ سلام مجھے بھاٹی دروازہ مچھلی کھلانے کے لئے لے گیا۔ وہاں سب سے بڑی دکان پر پہنچ کر اُس نے ایک پاؤ مچھلی کا آرڈر دیا تو میں نے دل میں سوچا کہ اس ایک پاؤ مچھلی سے کیا بنے گا۔ (مرزا مرید احمد ایک قوی الجثہ انسان تھے۔)

جیسے ہی مچھلی کی پلیٹ ہمارے ہاتھوں میں آئی تو سلام نے مزید ایک پاؤ کا آرڈر دے دیا۔ اس طرح نہ جانے ہم کتنے پاؤ مچھلی کھا گئے۔ بعد میں سلام نے بتایا کہ ایک ایک پاؤ آرڈر دینے کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں گرم گرم مچھلی ملتی رہے۔

بمبئی میں آمد اور انگلستان کے لئے روانگی

بھائی جان خیریت سے بمبئی پہنچ گئے۔ وہاں بھی ہندو مسلم فسادات کی وجہ سے رات کے وقت کرفیو لگا کرتا تھا۔ اس لئے وہ بندرگاہ کے بالکل قریب ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ پی اینڈ او شپنگ لائنز (P.O.Shiping lines) کے دفتر میں اس شخص سے ملنے گئے جس کے نام دہلی سے ایک نیک سیرت آدمی نے تعارفی خط دیا تھا' وہ آدمی ان سے بہت اچھی طرح سے پیش آیا اور اس نے بھائی جان کو تسلی دیتے ہوئے کہا وہ فکر نہ کریں جہاز میں ابھی بہت جگہ خالی ہے' آپ کو ضرور ایک سیٹ مل جائے گی۔ چنانچہ ایس-ایس فرینکونیا (S.S Franconia) نامی بحری جہاز پر بھائی جان کی سیٹ بک ہو گئی' اس جہاز نے 18 ستمبر کو لیور پول (Liver pool) کے لئے روانہ ہونا تھا۔

جب بھائی جان کی جہاز میں سیٹ بک ہو گئی تو کئی دنوں بعد اس رات وہ اطمینان کی نیند سوئے تھے کہ اچانک آدھی رات کو ایک زلزلہ سا آگیا۔ کوئی ان کے ہوٹل کے کمرے کے دروازے کو پیٹ رہا تھا ان کی آنکھ کھل گئی اور گھبراہٹ میں انہوں نے جب دروازہ کھولا تو انہوں نے رائل انڈین ملٹری پولیس کے دو سپاہیوں کو کھڑے دیکھا جنہیں دیکھ کر ان کی گھبراہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا لیکن جلد ہی انہوں نے اپنے حواس کو جمع کیا اور ان سے پوچھا کہ وہ کیسے آئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ان کی اطلاع کے مطابق "تم رائل انڈین نیوی کے بھگوڑے ہو اور ہم تمہیں گرفتار کرنے آئے ہیں۔" یہ سن کر بھائی جان نے انہیں بتایا کہ وہ ایک طالب علم ہیں اور انگلستان تعلیم حاصل کرنے کے لئے جا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنا پاسپورٹ اور کیمبرج یونیورسٹی میں داخلے کے کاغذات انہیں دکھائے۔ بعد میں ان سپاہیوں نے بھائی جان کے کمرے کی تلاشی لی۔ جب ان کی تسلی ہو گئی تو وہ معذرت کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔ خدانخواستہ اگر کسی غلط فہمی کی وجہ سے بھائی جان کو اس رات گرفتار کر لیا جاتا تو دنیا ایک عظیم سائنسدان کی خدمات سے محروم ہو جاتی۔

دوسرے روز جہاز اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ جہاز پر تقریباً چھ صد اطالوی جنگی قیدی' تین سو کے قریب برطانوی فوجی اور ان کے اہل خاندان اور تقریباً پندرہ بیس طالب علم سوار تھے۔ طالب علموں میں ایک کا نام فضل الرحمٰن تھا' جو بعد میں پاکستان میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے نام سے مشہور ہوئے اور ایک ایس-اے مینائی تھے جو بعد میں اسلامک بنک کے وائس پریزیڈنٹ بنے تھے۔ مینائی اور بھائی جان ایک ہی کیبن میں تھے۔ 18 روزہ سفر کے دوران مینائی 16 روز کیبن میں ہی رہے کیونکہ سمندری سفر سے ان کی طبیعت اچھی نہیں تھی وہ قے (الٹیاں) کرتے رہے۔ اس دوران بھائی جان سارا وقت جہاز کے عرشہ پر گزارتے۔

تقریباً اٹھارہ روز کے سفر کے بعد جہاز انگلستان کی بندرگاہ لیورپول پہنچا۔ وہ ایک سرد صبح تھی۔ بھائی جان چونکہ وہاں کے موسم سے آشنا نہیں تھے۔ اس لئے جو لباس انہوں نے پہن رکھا تھا وہ وہاں کی سردی سے بچاؤ کے لئے ناکافی تھا اس لئے وہ سردی سے کانپ رہے تھے کہ اچانک چودھری محمدؐ ظفراللہ خان کی نظر اُن پر پڑی وہ اپنے کسی عزیز ؎ "اپنے مختلف انٹرویو میں بھائی جان نے ہمیشہ یہ کہا کہ چودھری صاحب اپنے Nephew کو لینے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ میں نے اس بات کی تصدیق کے لئے چودھری حمید نصراللہ خان' امیر جماعت احمدیہ لاہور سے بات کی تو انہوں نے بتایا کہ ان دنوں ان کے والد چودھری عبداللہ خان مرحوم (جو چودھری محمد ظفراللہ خان کے چھوٹے بھائی تھے" انگلینڈ اپنے گھٹنے کا اپریشن کرانے کے لئے گئے تھے۔) کو جو اسی جہاز سے وہاں پہنچا تھا' لینے کے لئے آئے ہوئے تھے۔" چودھری صاحب نے بھائی جان کو پہچان لیا اور ان کی حالت زار دیکھتے ہوئے انہوں نے اپنا بھاری کوٹ انہیں پہنا دیا۔ پھر چودھری صاحب نے ان سے پوچھا کہ ان کا سامان کہاں ہے؟ بھائی جان نے اپنے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ کسی قلی کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس پر چودھری صاحب نے انہیں بتایا چونکہ جنگ عظیم حال میں ختم ہوئی ہے جس کی وجہ سے وہاں مزدوروں کی قلت ہے۔ للہٰذا کسی قلی کے لئے انتظار کرنا بے سود ہے۔ پھر انہوں نے ان کے بھاری بکس کو ایک طرف سے اٹھایا اور دوسری طرف سے بھائی جان نے یوں وہ اسے نزدیک کھڑی ہوئی لندن جانے والی ریل گاڑی تک لے گئے۔ چودھری صاحب نے بھی اس ریل گاڑی سے لندن تک کا سفر کیا۔ سفر کے دوران وہ بھائی جان کو انگلینڈ کے خوبصورت اور دلکش مناظر کے بارے میں بتاتے رہے چوہدری سر محمد ظفراللہ خان صاحب کی اس شفقت کو بھائی جان تمام عمر نہ بھلا سکے۔ ان کا عنایت کردہ بھاری کوٹ بھی ایک لمبے عرصہ تک ان کے زیر استعمال رہا۔

احمدیہ مشن ہاؤس لندن میں ایک رات بسر کرنے کے بعد بھائی جان کیمبرج چلے گئے۔

کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم 1946ء - 1949ء

کیمبرج ایک خوبصورت شہر ہے جو دریا کیم (Cam) کے کنارے آباد ہے۔ یہ لندن سے قریباً تیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں بیس سے زیادہ کالج ہیں اسی لئے اسے کالجوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ یہاں کے سب سے بڑے کالج کا نام ٹرینٹی کالج (Trinity College) ہے۔ جس کے ایک برآمدے میں بیٹھ کر نیوٹن نے اپنے قوانین لکھے تھے۔ دوسرا بڑا کالج سینٹ جونز (St. John's) ہے جس میں بھائی جان کو داخلہ ملا تھا۔ سینٹ جونز کالج کی بنیاد 1511ء میں رکھی گئی تھی۔

کیمرج میں کالجوں کی عمارتیں بطور ہوسٹل استعمال ہوتی ہیں۔ وہاں کالج کے پرنسپل کو ماسٹر(Master) کہتے ہیں جس کا دفتر کالج کی بلڈنگ میں ہوتا ہے۔ دیگر انتظامی دفاتر' سپروائزر اور فیلوز کے کمرے بھی کالج کی عمارت میں ہوتے ہیں۔ وہاں ہر طالب علم کے لئے لازم ہوتا ہے کہ وہ رات کا کھانا۔ (میں 1946ء کی بات کر رہا ہوں۔ آج کل کے قوانین کا مجھے علم نہیں) کالج میں کھائے خواہ وہ ہوسٹل میں رہتا ہو یا نہ' کھانے کی قیمت

فیس کے ساتھ وصول کی جاتی ہے۔ جس وقت بھائی جان نے وہاں داخلہ لیا تھا ان دنوں ہوسٹل کا ڈسپلن بہت سخت ہوا کرتا تھا۔ طلبا کو دس بجے رات تک کالج سے باہر رہنے کی اجازت ہوتی تھی۔ اگر کوئی طالب علم رات دس اور بارہ بجے کے درمیان کالج واپس آتا تو اسے ایک پنس جرمانہ کیا جاتا تھا۔ لیکن اگر کوئی طالب علم رات بارہ بجے کے بعد ہوسٹل آتا تو اسے سات دن کی Gatting (جرمانہ) ہوتی' اگر ایک سال تین بار ایسا ہوتا تو اسے یونیورسٹی سے نکال دیا جاتا تھا۔ 1968ء کے بعد یہ سختیاں ختم کر دی گئی تھیں۔

وہاں پڑھائی شہر کی مختلف عمارتوں میں ہوتی ہے جنہیں وہاں پڑھائے جانے والے مضامین کی مناسبت سے "سکول" کہا جاتا ہے۔ مثلاً جس عمارت میں ریاضی پڑھائی جاتی ہے اسے سکول آف میتھیمیٹکس (School of Mathematics) جہاں کیمسٹری پڑھائی جاتی ہے۔ اسے سکول آف کیمسٹری (School of Chemistry) وغیرہ کہا جاتا ہے۔ طبیعات (فزکس) مشہور زمانہ کیونڈش لیبارٹری میں پڑھائی جاتی ہے۔ تمام کالجوں کے طالب علم اپنے کورس کا مضمون پڑھنے کے لئے متعلقہ سکول میں جاتے ہیں وہاں مختلف کالجوں کے استاد ایک ہی مضمون دو علیحدہ علیحدہ کمروں میں پڑھاتے ہیں۔ اور یہ طالب علم کی صوابدید پر ہوتا ہے کہ وہ کس استاد سے پڑھنا چاہیں گے۔ اگر ایک استاد کا طرز تعلیم کسی کو پسند نہ ہو تو انہیں دوسرے استاد سے پڑھنے کا اختیار ہوتا ہے۔

کیمبرج یونیورسٹی میں ریاضی اور طبیعات وغیرہ میں بی-اے کی امتیازی ڈگری کو ٹرائی پوز (Tripos) کہتے ہیں۔ وہاں بی-ایس-سی یا ایم-ایس-سی کی ڈگریاں نہیں ہوتیں۔ بی-اے کی ڈگری کے حصول کے بعد یونیورسٹی کو فیس ادا کرنے کے بعد ایم-اے لکھا جا سکتا ہے۔

ٹرائی پوز کورس کے تین پارٹ ہوتے ہیں۔ پارٹ I, II اور III۔ ہر طالب علم کسی ترتیب سے کسی ایک پارٹ کا انتخاب کر سکتا ہے۔ اگرچہ اس کورس کی مدت تین سال ہوتی ہے لیکن اگر کوئی طالب علم اسے ایک یا دو سال کے عرصہ میں کرنا چاہے تو اسے اس کی اجازت ہوتی ہے۔ بشرطیکہ اس نے ابتدائی امتحان جسے وہاں کی زبان میں Prelims یعنی Preliminary Examination کہتے ہیں پاس کر لیا ہو۔

بھائی جان اکتوبر 1946ء کے دوسرے ہفتے میں کیمبرج پہنچ گئے تھے وہ جب پہلی دفعہ سینٹ جونز (St.John's) کالج گئے تو اس کے سبزہ زار اور گلاب کے پھولوں کی کیاریوں کو دیکھ کر دم بخود ہو گئے۔ اس دلفریب نظارہ کو دیکھ کر وہ دو تین منٹ تک کوئی بات نہ کر سکے اور نہ ہی استقبالیہ پر یہ بتا سکے کہ وہ کون ہیں۔ کچھ دیر بعد انہوں نے اپنا تعارف کرایا تو انہیں ہوسٹل میں ایک کمرہ الاٹ کر دیا گیا۔ پھر انہوں نے وہاں ایک پورٹر سے کہا کہ یہ میرا بکس ہے۔ (ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ اسے اٹھا کر ان کے کمرے تک لے جائے۔) اس پر پورٹر نے ان سے کہا کہ "جناب وہ ہاتھ گاڑی (Wheel Barrow) پڑی ہے آیئے میں آپ کا بکس اس پر رکھوا دیتا ہوں آپ خود ہی اسے اپنے کمرہ تک لے جائیں۔" اپنے ہاتھوں سے کام کرنے کا یہ پہلا سبق تھا جو انہیں کیمبرج میں ملا۔

بھائی جان نے جب اپنی پڑھائی شروع کی تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں اساتذہ طلبا سے توقع رکھتے کہ وہ ازخود بھی مطالعہ کر کے جو کمی رہ جائے اسے پورا کریں۔ طلبا کو دو دو تین تین کے گروپ میں بانٹ کر انہیں ایک ٹیوٹر/سپروائزر جو ان کے کالج کا لیکچرار ہی ہوتا ہے سے منسلک کر دیا جاتا ہے جو انہیں ہفتے میں دو گھنٹے اپنے کالج کے کمرے میں پڑھاتا ہے یہ ایک قسم کی ٹیوشن ہوتی جسے یونیورسٹی نے باقاعدہ طور پر منظور کیا ہوتا ہے۔ اس ٹیوشن کی مقررہ فیس جو کالج فیس کے علاوہ ہوتی ہے ٹیوٹر کو دی جاتی ہے۔

بھائی جان نے جب اپنی تعلیم شروع کی تو انہیں جلد یہ احساس ہوا کہ اگرچہ اپنے مضامین میں ان کا مطالعہ وسیع و عمیق تھا لیکن ان کا جنرل نالج محدود تھا۔ ان کے خیال میں ''اس کی وجہ ہمارے ہاں درس و تدریس کا غلط طریقہ کار تھا جو طالب علم کو کنوئیں کا مینڈک بنا دیتا تھا۔'' چنانچہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے وقت نکال کر اپنے کالج کی شاندار لائبریری سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے مختلف کتب جن میں تاریخ اسلام، اسلامی تہذیب و ثقافت، تاریخ اقوام عالم، اسلام کے اولین اور نامور سائنسدانوں کے حالات زندگی کا مطالعہ شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے ہندو مذہب کے اٹھارہ شاستر جن کا مکس مولر (Max Muller) نے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا پڑھ ڈالے۔ یوں انہوں نے اپنے ذہن کو وسعت دی جو بعد ازاں ان کی تقاریر اور تحریروں میں برمحل حوالہ جات دینے سے عیاں تھی۔

1947ء میں انہوں نے ابتدائی امتحان فرسٹ کلاس میں پاس کر لیا۔ جبکہ ان کے اکثر ہم جماعت جو انگلینڈ کے مشہور سکولوں ایسٹن (Eaton) اور ہیرو (Harrow) وغیرہ سے پڑھے ہوئے تھے۔ تھرڈ کلاس میں پاس ہوئے۔ وہ لڑکے ایسے ماحول سے آئے تھے جس میں ان کے استاد اچھے پڑھنے والوں کو یہ سمجھا کر کیمبرج روانہ کرتے کہ ''تم اس قوم کے فرزند ہو جس میں نیوٹن پیدا ہوا تھا۔ سائنس اور ریاضی کا علم تمہاری میراث ہے۔ اگر تم چاہو تو تم بھی نیوٹن بن سکتے ہو۔'' ان نتائج پر حیرانگی کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے اپنے ٹیوٹر سے پوچھا کہ "How come that they have done miserably"

(ان لڑکوں کے نتائج بہت مایوس کن ہیں ایسا کیوں ہوا ہے؟) اس پر اُن کے ٹیوٹر نے انہیں بتایا:

We set exams of the "prelims" (Preliminary Examinations) so hard so as to make distinction between just those boys and the people who are really serious."

''ہم ابتدائی امتحان کے پرچے اتنے مشکل بناتے ہیں تاکہ ہم سنجیدہ اور دوسرے لڑکوں کے مابین امتیاز کر سکیں۔) بھائی جان نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ:

''کیمبرج میں کسی طالب علم کو امتحان میں اول قرار نہیں دیا جاتا۔ تاہم شواہد سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً اول آنے والے لڑکے کو وظیفہ یا دوسری مراعات ملنے سے یا بعض اوقات ٹیوٹر کے بتانے سے۔''

ابتدائی امتحان پاس کرنے کے بعد بھائی جان نے ٹرائی پوز پارٹ II کے لئے پڑھائی شروع کر دی۔ جس کے دوران کبھی کبھی وہ پارٹ III کے لیکچر بھی سننے چلے جاتے تھے جو پروفیسر ڈیراک دیا کرتے تھے۔ پروفیسر ڈیراک کو 1933ء میں فزکس کا نوبل انعام دیا گیا تھا۔ اس کی ذہانت اور قابلیت سے بھائی جان بہت متاثر تھے۔ ان کی رائے میں پروفیسر ڈیراک بیسویں صدی کا سب سے بڑا اور عظیم سائنسدان تھا۔ آئن سٹائن سے بھی بڑا' بھائی جان اسے فزکس کا "دیوتا" سمجھتے تھے۔ یہ اسی کے لیکچر ہی تو تھے جنہیں سننے کے بعد بھائی جان نے فزکس میں ریسرچ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

1948ء میں انہوں نے ٹرائی پوز پارٹ II کا امتحان فرسٹ کلاس میں پاس کر لیا۔ کیمبرج یونیورسٹی سے ریاضی کا امتحان فرسٹ کلاس میں پاس کرنے والے کو رینگلر (Wrangler) کہتے ہیں۔ (دوسروں سے ممتاز کرنے کے لئے) بھائی جان پہلے پاکستانی تھے جنہیں رینگلر بننے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ مسلمانوں میں پہلے رینگلر علامہ عنایت اللہ مشرقی تھے' انہوں نے یہ اعزاز تقسیم ہند سے پہلے حاصل کیا تھا۔

بھائی جان کی رائے میں روایتی ریاضی اور طبیعات میں کوئی نمایاں فرق نہیں تھا وہ بتاتے تھے کہ:

"Pure Mathematics is used in Physics although the concept are different but the language is the same."

(ان میں استعمال ہونے والی زبان اگرچہ ایک ہی ہوتی مگر ان کے نظریے الگ الگ ہوتے ہیں۔) ان کے خیال میں:

"Mathematics Department was the repository of Physics."

(ریاضی کا ڈیپارٹمنٹ فزکس کا "مال خانہ" ہوتا ہے۔)

1947ء میں ہندوستان کو آزادی مل گئی تھی۔ پاکستان معرض وجود میں آ چکا تھا اور بھائی جان نے ٹرائی پوز کر لیا تھا۔ اس لئے انہوں نے سوچا کہ وہ اپنے وطن واپس لوٹ جائیں لیکن ایسا فیصلہ از خود کرنے کی بجائے انہوں نے حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب امام الثانی جماعت احمدیہ کی خدمت اقدس میں مشورہ کے لئے خط لکھا۔ انہوں نے مشورہ دیتے ہوئے بھائی جان کو لکھا کہ "ہمارے نزدیک یہ آپ کی بزدلی ہوگی اگر آپ ملا ہوا وظیفہ چھوڑ کر واپس آتے ہیں۔" اس مشورہ کی روشنی میں ابا جان نے بھی بھائی جان کو اپنے خط میں لکھا کہ ایسے مواقع بار بار نہیں آتے اس لئے اس وظیفہ سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ مزید کچھ پڑھ لیں۔ چنانچہ ان مشوروں کی روشنی میں بھائی جان نے اپنے سپروائزر فریڈ ہائیل (Fred Hoyel) سے رجوع کیا۔ جنہیں تمام حالات سے آگاہ کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ اندریں حالات انہیں کیا کرنا چاہیے۔ اس پر فریڈ ہائیل نے ان سے دریافت کیا کہ وہ خود کیا کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ "میں ریاضی پارٹ III کرنے کی بجائے فزکس ٹرائی پوز پارٹ II کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ پچھلے چھ سالوں میں میں نے نہ تو فزکس پڑھی ہے اور نہ ہی اس میں کوئی تجربات کئے

ہیں۔ اس لئے مجھے ڈر ہے کہ میں اس میں شاید سیکنڈ کلاس بھی نہ لے سکوں جبکہ اگر میں ریاضی پارٹ III پڑھوں تو مجھے یقین ہے کہ میں اس میں فرسٹ کلاس حاصل کر لوں گا۔ بھائی جان کی بات سن کر فریڈ ہائیل نے کہا:

"If you want to do physics, then you should take up physics and take experimental physics, because unless you do experimental Physics you will never be able to look a Physicsit into his eyes."

"اگر تم فزکس (نظریاتی) پڑھنا چاہتے تو پھر ضرور فزکس پڑھو لیکن تجرباتی فزکس کیونکہ جب تک تم تجرباتی فزکس نہیں پڑھو گے تم کسی ماہر طبیعات (تجرباتی) کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ دیکھ سکو گے۔"

فریڈ ہائیل ماہر فلکیات اور عالم طبیعات تھے۔ بعد میں انہیں پروفیسر کے عہدہ پر ترقی دی گئی تھی۔ سائنس میں ان کی خدمات کے اعتراف میں ملکہ برطانیہ نے انہیں سر (Sir) کا خطاب عطا کیا تھا۔

بھائی جان کی وفات کے بعد سینٹ جونز کالج کے میگزین میں سر فریڈ ہائیل نے ان کے طالب علمی کے زمانے کی باتیں کرتے ہوئے لکھا:

"....I found it much less of a strain to tackle hard problems with a student like Abdus Salam than it was to be asked easier thing by those chaps who just sat ther and stared out into space. With the latter you had to roll two stones uphill simultaneously. Ont stone, was the problem itself, the other was to get the chap to understand. With Abdus Salam you only had one stone and he would do a fair amount of the pushing."

ترجمہ: میرے مشاہدہ کے مطابق بعض طالب علموں سے اگر آسان سوال بھی پوچھا جاتا تو وہ ٹکٹکی لگا کر فضا میں گھورنا شروع کر دیتے تھے جبکہ عبدالسلام جیسے طالب علم کے مشکل سوال کو سلجھانے میں میں نے کبھی تھوڑا سا کھچاؤ بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اول الذکر کے ساتھ دو مسائل تھے' وہ سوال بھی نہیں سمجھتے تھے اور اکثر اس کا حل بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا' لیکن عبدالسلام سوال سمجھ کر خودبخود اس کے حل کی تلاش میں کوشاں ہو جاتا تھا۔

سر فریڈ ہائیل نے مزید لکھا:

"....As the years moved with remorselesaly increasing rapidity he was soon a Fellow of the College, soon University Lecturer, and then regretably leaving to take a Professorship of Theoretical

Physics at Imperial College. I always hoped that one day Abdus Salam would return to Cambridge and I think that an offer of a Chair in Theoretical Physics would indeed have brought him back. There were two chances in the 1960s. But on both occasions the Faculty of Mathematics instructed the electrol board that there was a greater need for an appointment in Quantnum Machanics than in Theoretical Physics. This I did not beleive myself and it was one of the reasons why from the mid 1960s my relations with the Faculty fell to zero point.

After I had left Combridge in 1972 and after Adus Salam had become the Director of the International Centre for Theoretical Physics in Trieste, I would drop in on him with a fair frequency. So in the event I saw more of him in later years than I might have expected. One firm view of his, which he held to the end of his life, I must record now by way of ending this short appreciation.

For Abdus Salam, the greatest Scientist of twentieth century was undoubtedly Dirac Of Course, you could say this was one John's man supporting another. But when I asked him if this included Einstein he was clear in this answer, which went some thing like this:

"Einstein had his mathematics all done for him. Dirac invented his. Not only that, but it was dirac who first made it clear that the route towards real understanding in theoretical Physics lies throught abstract mathematics not through engineering mathematics."

For those of us who do not aspire to more than engineering Mathcmatics this may seem deflating. But I think it was entirely correct.

ترجمہ: سال بے رحمی اور سرعت سے گزرتے گئے' وہ جلد ہی کالج کا فیلو اور پھر یونیورسٹی میں لیکچرار مقرر کیا گیا۔ یہ ہمارے لئے قابل افسوس بات تھی کہ امپریل کالج لندن میں نظریاتی طبیعات کی پروفیسر شپ کی خاطر وہ ہمیں چھوڑ گیا۔ لیکن میں نے ہمیشہ یہ امید رکھی کہ عبدالسلام ایک دن ضرور کیمبرج واپس آئے گا۔ اگر اسے نظریاتی طبیعات کی چیئر پیش کی جاتی تو وہ ضرور واپس آجاتا (کیمبرج میں مترجم) 1960ء کی دہائی میں دو ایسے مواقع آئے لیکن دونوں مرتبہ فیکلٹی آف متھیمیٹکس نے انتخابی بورڈ سے کہا کہ انہیں نظریاتی طبیعات کی بجائے کوانٹم میکینکس کے لئے آدمی چاہیے۔ لیکن مجھے ان کی اس بات سے اتفاق نہیں تھا۔ اسی وجہ سے 1960ء کی دہائی کے وسط سے متھیمیٹکس) فیکلٹی سے میرے تعلقات صفر ہو گئے تھے۔

1972ء میں میں نے کیمبرج چھوڑ دیا تھا اور عبدالسلام سے اکثر ملنے ٹریسٹ جاتا جہاں وہ انٹرنیشنل مرکز برائے نظریاتی طبیعات میں ڈائریکٹر تھا۔ اس طرح زندگی کے آخری چند سالوں میں ہمیں ایک دوسرے سے بار بار ملنے کے مواقع ملے جو شاید ویسے کبھی نہ ملتے۔ سلام کی توصیف اس کی اس رائے پر ختم کرنا چاہوں گا جس پر وہ اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک قائم رہا:

''عبدالسلام کی نظر میں ڈیراک بیسویں صدی کا سب سے بڑا سائنسدان تھا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جونز (مراد سینٹ جونز کالج' ناقل) کے ایک دوسرے کی حمایت ہے۔ لیکن جب میں نے اس (سلام ناقل) سے یہ پوچھا کہ کیا اُس کی اِس رائے میں آئن سٹائن بھی شامل ہے تو اس کا جواب کچھ یوں تھا جو بالکل واضح ہے:

''آئن سٹائن کو (روایتی) ریاضی بنی بنائی مل گئی تھی' لیکن ڈیراک نے اسے ایجاد کیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ ڈیراک ہی تھا جس نے یہ واضح کیا تھا کہ نظریاتی طبیعات کو تجریدی ریاضی کی مدد سے ہی سمجھا جا سکتا ہے نہ کہ ''انجینئر'' (گھڑی گھڑائی) کی ہوئی ریاضی سے۔ جو ریاضی کو ''انجینئر'' کرتے ہیں ان کے لئے یہ بات ایسی ہی ہوگی جیسے کسی نے ان کے ''غبارہ سے ہوا نکال دی ہو۔'' میری رائے میں (سلام) کی یہ بات سو فیصدی صحیح ہے۔''

مزید پڑھائی کے لیے فریڈ ہائیل سے مشورہ کرنے کے بعد بھائی جان نے اپنے ایک اور استاد جے-ایم ورڈی (J.M. Wordie) جو بعد میں سینٹ جونز کالج کے ماسٹر (پرنسپل) بنے سے بھی مشورہ کیا۔ اس نے بھائی جان سے دریافت کیا کہ وہ خود کیا کرنا چاہتے ہیں؟ بھائی جان نے اسے بتایا کہ :

"I am half thingking of doing mathematics and half thinking of doing physics."

(کبھی میں سوچتا ہوں کہ ریاضی پڑھوں کبھی خیال آتا ہے کہ فزکس پڑھوں) بھائی جان کا جواب سن کر ورڈی نے کہا: "Oh you must do Physics" (او! تم ضرور فزکس پڑھو) بھائی جان نے اس کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا:

"I want to test a theory of mine, which is that a good man should be able to get a first class in Physics after one year, although my experience is to the contrary. G.P. Thomson and N.F. Mott tried to do Tripos Part I and II of Physics in one year but they failed, although both were brilliant boys."

ترجمہ: (میں اپنے ایک نظریے (تھیوری) کو آزمانا چاہتا ہوں جو یہ ہے کہ ایک لائق طالب علم کو فزکس کا امتحان فرسٹ کلاس میں ایک سال میں پاس کر لینا چاہیے۔ لیکن میرا تجربہ اس کے برعکس ہے۔ کیونکہ جی۔پی تھامسن اور این۔ایف موٹ نے ایسی کوشش کی تھی لیکن وہ دونوں اس میں ناکام ہوئے تھے۔ حالانکہ وہ دونوں بہت ذہین تھے۔ (تھامسن نے 1937ء اور موٹ نے 1977ء میں فزکس کا نوبل انعام حاصل کیا تھا۔)

بھائی جان نے ورڈی کا چیلنج منظور کر لیا اور فزکس ٹرائی پوز پارٹ I اور پارٹ II کے امتحان کے لئے پڑھائی شروع کر دی۔ ان دونوں حصوں کے چھ پرچے اور پریکٹیکل کا ایک پرچہ تھا۔

فزکس کیونڈش لیبارٹری میں پڑھائی جاتی ہے اور اس کے پریکٹیکل (تجربات) بھی وہیں کئے جاتے ہیں۔ پریکٹیکل کے بارے میں بھائی جان نے بتایا کہ "لیبارٹری میں آلات خاصے پرانے تھے انہیں استعمال کرنا بھی مشکل اور تکلیف دہ تھا۔ پہلا تجربہ جو مجھے کرنا پڑا وہ گو آسان تھا یعنی سوڈیم کی سپکٹرل لائنز (Spectral lines) یعنی Wave Length کا فرق معلوم کرنا تھا۔ مجھے آلات کو درست طریقے پر رکھنے میں ہی دو تین دن لگ گئے۔ میں نے تین مشاہدات کے اعداد نوٹ کر لئے۔ میرے ذہن میں یہ عمومی حسابی نظریہ تھا کہ دو مشاہدات سے مجھے ایک خط مستقیم حاصل ہو جائے گا اور تیسرے مشاہدہ سے اس خط مستقیم کا سیدھا ہونا ثابت ہو جائے گا۔ تجربہ مکمل کرنے کے بعد میں نتائج لے کر لیبارٹری کے نوجوان سپروائزر ڈینس و لکنسن (Denys Wilkinson) کے پاس لے گیا۔ اس نے میری نتائج پر ایک تمسخر آمیز نظر ڈالتے ہوئے دریافت کیا:

"What is your educational back ground?"

(تمہارا تعلیمی پس منظر کیا ہے)

میں نے اسے بتایا کہ "میں ریاضی سے آیا ہوں۔" تو اس نے کہا کہ "میرا بھی یہی خیال تھا۔" پھر اس نے کہا کہ خط مستقیم ثابت کرنے کے لئے تمہیں ایک یا دو نہیں بلکہ بے شمار readings لینا ہوں گی یہ کام جو تم کر کے لائے ہو اس قابل نہیں کہ اس پر نمبر دیئے جا سکیں۔ بھائی جان نے مزید بتایا کہ "میں تجرباتی کام سے بیزار ہو چکا تھا۔ ہر کام اور تجربہ غلط ہو رہا تھا۔ مثلاً پانی کے بہاؤ کا تجربہ کرنا ہوتا تو اپنی غلطی سے تجرباتی نالیوں میں بہاؤ کی بجائے رکاوٹیں بن جاتیں۔ خلاصہ یہ کہ تجربات ایک طرف اور تجربہ کرنے

والا دوسری طرف جاتا۔ مجھے بار بار تجربہ دہرانا پڑتا۔" اس امتحان کے لئے انہیں دن رات بہت محنت کرنا پڑی انہوں نے بتایا کہ:

"That was the hardest examination of my life."

(وہ میری زندگی کا مشکل ترین امتحان تھا۔)

فزکس ٹرائی پوز کا امتحان دینے کے بعد انہوں نے ابا جان کو خط لکھا کہ "میرا پریکٹیکل ٹھیک نہیں ہوا میں شاید یہ امتحان پاس نہ کر سکوں۔ یہ معجزہ ہوگا اگر میں پاس ہو گیا۔ میری کامیابی کے لئے بہت دعا کریں۔" لیکن جب نتیجہ نکلا تو خدا کے فضل سے وہ نہ صرف پاس ہو گئے بلکہ ان کی فرسٹ کلاس آئی۔

1957ء میں امپیریل کالج لندن میں پروفیسر مقرر ہونے کے بعد بھائی جان اور میں 212 اولڈ براہمپٹن روڈ (Old Brompton Road) لندن جوارلز کورٹ انڈر گراؤنڈ سٹیشن سے زیادہ دور نہیں رہتے تھے۔ پرانی باتیں یاد کرتے ہوئے ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ فزکس ٹرائی پوز پارٹ II کا امتحان دینے کے بعد انہوں نے جو خط ابا جان کو لکھا تھا اس کا پس منظر کیا تھا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ "میرا پریکٹیکل پورے آٹھ گھنٹوں کا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے لئے میں چکن سینڈوچ بنا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا جنہیں وقفہ کے دوران میں نے بڑے مزے سے کھایا اور اپنا پریکٹیکل کرتا رہا۔ جسے مکمل کرنے کے بعد جب میں نے اپنے مشاہدات کو جمع کرنا شروع کیا تو مجھے پتہ چلا کہ پریکٹیکل کے لئے جو طریقہ کار میں نے اختیار کیا تھا وہ غلط تھا جس کی وجہ سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ دیر اتنی ہو چکی تھی کہ میں نئے سرے سے پریکٹیکل دوبارہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے میں نے گھبرا کر ابا جان کو دعا کے لئے خط لکھا تھا۔" یہ سن کر میں نے ان سے دریافت کیا "کہ ان حالات میں وہ فرسٹ کلاس میں پاس کس طرح ہوئے؟" تو انہوں نے بتایا کہ "جب امتحان کا نتیجہ نکلا تو میں خود بھی حیران ہوا تھا چنانچہ میں نے اسی وقت اپنے پریکٹیکل کے سپروائزر کے پاس گیا اور اسے کہا کہ تمہیں تو اچھی طرح معلوم ہے کہ میرا پریکٹیکل ٹھیک نہیں ہوا تھا یہ کیسے ہوا ہے کہ میں فرسٹ کلاس میں پاس ہو گیا ہوں؟" میری بات سن کر سپروائزر نے بتایا کہ "تمہارے تھیوری کے چھ کے چھ پرچے اتنے اعلیٰ تھے کہ

"They (examiners) had even not asked for you practical result."

انہوں نے (ممتحن حضرات) نے تمہارے پریکٹیکل کے بارے میں پوچھا ہی نہیں۔"

سپروائزر کو شاہد اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس نتیجہ کے پیچھے والدین کی پچھلی راتوں کو نم ناک آنکھوں سے کی ہوئی دعائیں تھیں، جن کے طفیل اللہ تعالیٰ نے معجزہ کر دکھایا۔ حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب کا یہ شعر یاد آتا ہے:

غیر ممکن کو یہ ممکن میں بدل دیتی ہے
اے میرے فلسفیو زور دعا دیکھو تو

اس نتیجہ کے بعد ان کے سپروائزر ڈینس و لکنسن (جو اب سسکس یونیورسٹی (Sussex University) کے وائس چانسلر ہیں ملکہ برطانیہ نے انہیں سر (Sir) کا خطاب عطا کیا تھا) نے کہا کہ "ایک استاد اپنے طلباء کے متعلق بعض اوقات کیسے غلط اندازے قائم کر لیتا ہے۔" ڈینس و لکنسن بھائی جان کو محض لیبارٹری کا ایک نالائق طالب علم سمجھتا تھا۔

کیمبرج سے واپسی

کیمبرج میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد بھائی جان جون 1949ء میں پاکستان واپس آئے۔ کراچی پہنچتے ہی اُنہوں نے میاں افضل حسین سے ملاقات کی۔ میاں صاحب اُس وقت فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین تھے اور کراچی میں رہتے تھے۔ انہوں نے ہی پیئرنٹ ویلفیئر فنڈ سے بھائی جان کے لئے وظیفہ کی منظوری دی تھی۔ اس ملاقات کے دوران میاں صاحب نے بھائی جان سے دریافت کیا کہ "کیا سی-ایس-پی بننا چاہتے ہو کیونکہ تم جو آئی-سی-ایس مین جانا چاہتے تھے وہ اب سی-ایس-پی (سول سروس آف پاکستان) ہو گیا ہے۔" میاں صاحب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بھائی جان نے کہا کہ "وہ اب سی-ایس-پی میں نہیں جانا چاہتے بلکہ انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ کیمبرج واپس جا کر فزکس میں ریسرچ کر کے پی-ایچ-ڈی کی ڈگری حاصل کریں۔" میاں صاحب کو بھائی جان کا یہ جواب سن کر بے حد خوشی ہوئی۔ چنانچہ اُنہوں نے اُسی وقت ایس-ایم-شریف ڈائریکٹر تعلیم اور غلام خالق صاحب جو حکومت پنجاب کے محکمہ تعلیم میں اب ایک اعلیٰ افسر تھے کے نام سفارشی خط لکھتے ہوئے اُن سے کہا کہ پیئرنٹ ویلفیئر فنڈ سے سلام کو مزید دو سال کے لئے وظیفہ دیا جائے۔ اس فنڈ میں ابھی کچھ رقم باقی تھی کیونکہ وہ چاروں طلبا جنہیں بھائی جان کے علاوہ اس فنڈ سے وظائف دیئے گئے تھے کسی یونیورسٹی میں داخلے نہ ملنے کی وجہ سے بیرون ملک نہ جا سکے تھے۔ اسی اثناء میں ملک تقسیم ہو گیا اور اُن کے وظائف کی منظوری بھی ختم کر دی گئی تھی۔ ایسا ہونا مشیت ایزدی تھی جو بھائی جان کی مزید تعلیم کے لئے بندوبست کر رہی تھی۔

کراچی میں ایک دو روز قیام کرنے کے بعد بھائی جان ملتان تشریف لے آئے۔ چونکہ اُن کی ملتان آمد کے بارے میں کوئی مصدقہ اطلاع نہیں ملی تھی اس لئے ابا جان اُن کے استقبال کے لئے ریلوے اسٹیشن پر تشریف نہ لے گئے۔ البتہ انہوں نے احتیاطاً مجھے ریلوے اسٹیشن پر بھجوا دیا۔ اتفاق سے بھائی جان اُسی روز ملتان پہنچ گئے تھے۔ مجھے اکیلا دیکھ کر وہ کچھ پریشان اور حیران ہوئے اور ابا جان کے بارے میں دریافت کیا۔ اس پر میں نے اُن کی خدمت میں عرض کیا کہ چونکہ اُن کی آمد کی کوئی مصدقہ اطلاع نہیں ملی تھی اس لئے ابا جان اسٹیشن پر تشریف نہیں لائے۔ جب ہم گھر پہنچے تو اس اثنا میں ابا جان بھی دفتر سے گھر پہنچ چکے تھے۔ تین سال کی جدائی کے بعد والدین سے ملاقات ایک بڑا پر مسرت منظر پیش کر رہا تھا۔ خوشی کے آنسو ہر آنکھ میں تھے۔

بھائی جان نے ابا جان کو کراچی میں میاں افضال حسین سے اپنی ملاقات کی تفصیل سے آگاہ کیا اور انہیں بتایا کہ وہ کیمبرج پی-ایچ-ڈی کرنے کے لئے واپس جانا چاہتے ہیں۔ ابا جان نے جن کی شروع سے یہی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا انڈین سول سروس میں جائے نے اپنا یہ خیال ترک کر دیا اور بھائی جان کے اس ارادہ کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

ملتان چند روز قیام کرنے کے بعد بھائی جان مزید وظیفہ کے حصول کے لئے لاہور چلے گئے۔ وہاں انہوں نے میاں افضل حسین کا خط ایس ایم شریف ڈائریکٹر تعلیم پنجاب کو دیا اور وہ غلام خالق صاحب سے بھی ملے۔ ان دونوں نے بھائی جان کو امداد کا یقین دلایا اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ گورنر پنجاب سر فرانس مودی جو سینٹ کالج کیمبرج کے فارغ التحصیل ہیں سے ضرور مل لیں۔ بھائی جان نے اسی وقت ملتان ابا جان کو پیغام بھجوایا کہ ان کے کپڑوں سے ان کے کالج کی نیکٹائی انہیں لاہور بھجوانے کا انتظام کریں۔

گورنر پنجاب سے ملاقات کے وقت بھائی جان نے اپنے کالج کی نیکٹائی لگا رکھی تھی جسے دیکھتے ہی سر فرانس مودی نے پہچان لیا کہ وہ سینٹ جان کالج کے طالب علم ہیں اس لئے وہ بھائی جان سے بڑی شفقت سے پیش آئے۔ بھائی جان کے تعلیمی ریکارڈ پر آگاہی پر انہیں خوشی ہوئی اور انہوں نے بھائی جان کو یقین دلایا کہ وہ مزید وظیفہ کے لئے ان کی پوری مدد کریں گے۔

بھائی جان نے میاں افضل حسین کو اپنے ایک خط کے ذریعے لاہور میں گورنر پنجاب اور محکمہ تعلیم کے آفسران سے ملاقات کے بارے میں مطلع کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا۔ بھائی جان کے خط کے جواب میں میاں افضل حسین نے بھائی جان کو مندرجہ ذیل خط لکھا۔

دکھم ہاؤس' 552 ماڈل کالونی
جہانگیر سٹنا روڈ' کراچی
23 اگست 1949ء

پیارے عبدالسلام

ابھی ابھی مجھے آپ کا 16 اگست کا خط ملا۔ اسکے ساتھ ہی مجھے شریف صاحب کا خط بھی موصول ہوا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ شریف صاحب آپ کی بھرپور مدد کریں گے۔ اگر کیمبرج میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آپ کو مزید دو سال کے لئے چھ سو پونڈ سالانہ وظیفہ مل جائے تو میرے خیال میں آپ بہت خوش قسمت ہوں گے۔ مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ محکمہ تعلیم آپ کو اس شرط پر ملازمت بھی دے دے گا کہ کیمبرج میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد وطن واپس آ کر آپ کام شروع کر دیں۔ تاہم مجھے اس بات کا پورا یقین نہیں ہے کہ آپ اپنی سینارٹی (Seniority) اسی روز سے شمار کر سکیں گے یا نہیں جس روز آپ کو ملازمت کا آرڈر ملے گا۔ مجھے جولائی 1916ء میں ملازمت کی پیش کش ہوئی تھی لیکن میں جنوری 1918ء تک ملازمت شروع نہ کر سکا جس وجہ سے میں اپنی سینارٹی کھو بیٹھا تھا لیکن ایسے

معاملات میں قسمت آزمائی ضرور کرنا چاہیے۔ میں آپ کو یہ نصیحت کرتا ہوں کہ آپ پہلے وظیفہ حاصل کریں اور کیمبرج جاکر اپنی تعلیم جاری رکھیں دیگر باتوں سے چنداں فکر مند نہ ہوں۔

میں آپ کی نیک تمناؤں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں انشاء اللہ آئندہ ماہ کی 27 تاریخ کو حج کرنے کے لئے روانہ ہوں گا۔

آپ کے مستقبل کے لئے نیک خواہشات کے ساتھ

آپ کا مخلص
ایم-افضل حسین"

میاں افضل حسین کی سفارش سے بھائی جان کو مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے دو سال کے لئے وظیفہ مل گیا۔ انہوں نے اُسی سال اکتوبر میں کیمبرج چلے جانے کا فیصلہ کرلیا اور اسی دوران والدین نے بھی ایک فیصلہ کرلیا تھا وہ یہ کہ کیمبرج واپس جانے سے پہلے بھائی جان کی شادی کردی جائے۔

شادی

بچپن سے ہی بھائی جان کی نسبت ہماری تایا زاد امتہ الحفیظ بیگم سے طے پا چکی تھی۔ آپ کا نکاح حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب امام الثانی جماعت احمدیہ نے کوئٹہ میں پڑھا۔ آپ اُن دنوں موسم گرما کی وجہ سے وہاں مقیم تھے۔ اس موقع پر اُنہوں نے فرمایا کہ ہر باپ اپنے بیٹے کی تعریف کرتا ہے۔ عزیز کے والد نے بھی ایسی توقعات کا اظہار کیا تھا۔ (دس سال قبل دسمبر1939ء میں حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب نے جوبلی فنڈ سے فرسٹ' سیکنڈ اور تھرڈ آنے والے طلبا کو وظائف دینے کا اعلان فرمایا تھا۔ (پچھلے صفحات میں اس کی تفصیلات آچکی ہیں) ابا جان نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ "سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں عزیز سلام نے ان سب کو پورا کرنے کی توفیق پائی۔"

19 اگست 1949ء کو بھائی جان کی شادی کی تقریب منعقد ہوئی۔ آپ کی بارات ملتان سے جھنگ گئی تھی۔

شادی کے قریباً چھ ہفتے بعد وہ کیمبرج کے لئے روانہ ہو گئے۔ ابا جان اور ہم سب بھائی انہیں الوداع کرنے کے لئے ملتان چھاؤنی کے ریلوے اسٹیشن پر گئے۔ ریل گاڑی کی روانگی سے چند منٹ پہلے ابا جان نے اجتماعی دعا کرائی۔ ریل گاڑی جب نظروں سے اوجھل ہوگئی تو ابا جان نے ہمیں بتایا کہ دعا کے دوران ان پر کشفی حالت طاری ہوئی اور انہوں نے دیکھا کہ "دو بڑے بڑے پرندے آئے ہیں اور سلام کو اٹھا کر لے گئے ہیں اور بادلوں میں گم ہو گئے ہیں۔"

کیمبرج پہنچ کر بھائی جان نے اپنے خط میں یہ اطلاع دی تھی کہ وہ کراچی سے لندن جس جہاز سے گئے تھے اُس کے دو انجن تھے۔

4

پی-ایچ-ڈی کی ڈگری کا حصول

پی-ایچ-ڈی کی ڈگری کے حصول کے لئے بھائی جان اکتوبر 1949ء میں کیمبرج تشریف لے گئے تھے۔ وہاں انہیں کیونڈش لیبارٹری (Cavendish Laboratory) میں داخل کیا گیا۔ پروفیسر روتھر فورڈ (Prof. Ruther ford) نے 1920ء کے لگ بھگ یہ لیبارٹری قائم کی تھی' جس کا آج دنیا کی چند بہترین لیبارٹریوں میں شمار ہوتا ہے۔

روتھر فورڈ چونکہ خود ایک اعلیٰ پایہ کے تجرباتی فزکس دان تھے اس لئے انہوں نے ایک روایت قائم کی' جس کے تحت بی-اے فزکس میں فرسٹ کلاس حاصل کرنے والے وہ طلبا جو فزکس میں پی-ایچ-ڈی کے خواہشمند ہوتے کو تجرباتی فزکس (Experimental Physics) میں تحقیق کرنے کی ترغیب دی جاتی تھی جبکہ دوسرے اور تیسرے درجے میں پاس ہونے والوں کو نظریاتی طبیعات (Theoratical Physics) میں پی-ایچ-ڈی کے لئے تحقیق کرنے کے لئے کہا جاتا۔ بھائی جان نے چونکہ بی-اے میں فرسٹ کلاس حاصل کی تھی اس لئے انہیں کیونڈش لیبارٹری میں داخل کیا گیا تھا۔ جہاں انہوں نے سموئیل ڈے ونس (Samuel Devons) (جنہیں بعد میں کولمبیا یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر کیا گیا تھا) کے زیر نگرانی تجرباتی فزکس میں تحقیق کا کام شروع کر دیا۔

پہلے تجربہ میں ہائیڈروجن کے ایٹموں کو Deutrons پر ٹکرا کر نتائج حاصل کرنا تھا۔ (ٹری ٹیوم (Tritium) بمقابلہ ڈیوٹریم (Detreium) بکھرنے کا تجربہ) تجربات کرنے کے لئے آلات طالب علم کو خود بنانے ہوتے تھے جنہیں تیار کرنے کے لئے بھائی جان کو تین دن صرف کرنا پڑے۔ لیکن وہ صحیح آلات پھر بھی نہ بنا سکے۔ جب انہوں نے یہ تجربہ شروع کیا تو انہیں صحیح جوابات نہیں مل رہے تھے کبھی کچھ خرابی پیدا ہو جاتی اور کبھی کچھ۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تجربات کرنے کے لئے صبر' تحمل اور بردباری کی ضرورت ہوتی ہے۔ بقول بھائی جان کے "مجھ میں ان باتوں کا فقدان تھا۔" بہرحال قہر درویش برجان درویش انہوں نے کیونڈش لیبارٹری میں قریباً چار ماہ کام کیا۔ چونکہ ان کا میلان طبع تجرباتی فزکس کی طرف نہیں تھا اس لئے انہوں نے اس میدان کو خیرباد کہنے کا تہیہ کر لیا۔ مارچ 1950ء میں وہ اپنے نگران سے ملے اور اسے تمام صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے اس سے نظریاتی فزکس میں کام کرنے کی اجازت چاہی۔ اسی اثناء میں ان کے نگران کو بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ تجرباتی فزکس سلام کے بس کا روگ نہیں۔ چنانچہ اُس نے اس شرط پر اجازت دے دی کہ اگر وہ اپنے لئے کسی اور نگران کا انتظام کر سکیں

ورنہ اس نے کہا کہ "نظریاتی فزکس میں پی-ایچ-ڈی کرنے کے لئے انہیں کیمبرج یونیورسٹی کو خیرباد کہہ کر کسی اور یونیورسٹی میں جانا ہوگا۔" بھائی جان اس صورت حال کے لئے ہرگز تیار نہیں تھے کیونکہ پچھلے تین سالوں میں انہیں کیمبرج یونیورسٹی سے دلی لگاؤ پیدا ہو چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے لئے ایک نئے نگران کی تلاش شروع کر دی۔ آخرکار ان کی ملاقات نکولس کیمبر سے ہوئی۔ وہ سینٹ جونز کالج میں لیکچرار تھے۔ نکولس کیمبر (Nicholas Kemmar) روسی نژاد تھے۔ بھائی جان نے ان سے کہا کہ وہ نظریاتی طبیعات میں پی-ایچ-ڈی کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کیمبر کو مزید بتایا کہ وہ ایک نئی فیلڈ اور جہت کی تلاش میں ہیں جس میں تحقیقی کام کر کے وہ اپنے لئے ایک مقام پیدا کر سکیں۔ انہوں نے کوانٹم الیکٹروڈائنامکس (Quantum Electro Dynamics) جو اُن دنوں انتہائی کٹھن تحقیقات اور گہری دلچسپی کا موضوع تھا میں ریسرچ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ان دنوں فزکس کے سائنسدانوں کی توجہ کوانٹم الیکٹروڈائنامکس کے حساب کتاب کو درپیش بعض مشکلات کو دور کرنے پر مرکوز تھی۔ اس وقت کے مشہور سائنس دان جولین شونگر (Julian Schwinger) رچرڈ فائن مین (Richard Feyman) اور فری مین ڈائسن (Freeman Dyson) وغیرہ ان معاملات میں مصروف تھے۔ (اول الذکر دونوں کو 1965ء میں فزکس کا نوبل انعام دیا گیا تھا۔) بھائی جان کی بات سن کر کیمبر نے کہا کہ اس فیلڈ میں بہت سے مسائل ان کے ایک شاگرد پال میتھیوز (Paul Mathews) بعد میں پال میتھیوز اور بھائی جان بہت گہرے دوست بن گئے تھے۔ 1957ء میں بھائی جان جب امپیریل کالج لندن میں پروفیسر کے طور پر متعین ہوئے تو انہوں نے میتھیوز کو وہاں بطور رجسٹرار مقرر کرایا تھا۔ چند سال بعد انہیں انگلینڈ کی باتھ (Bath) یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ 1987ء میں وہ کار کے ایک ہولناک حادثہ میں وفات پا گئے تھے۔) جو ان کی زیر نگرانی پی-ایچ-ڈی کی ڈگری کے لئے تیاری کر رہا ہے نے حل کر لئے ہیں۔ مگر پھر بھی تم اس کے پاس چلے جاؤ۔ شاید اس کے پاس ابھی کچھ حل طلب مسائل ہوں۔ چنانچہ کیمبر کے کہنے پر بھائی جان پال میتھیوز کے پاس گئے اور اسے کہا کہ وہ کوانٹم الیکٹرو ڈائنا مکس (Quantum Electro Dynamics) میں تحقیق کرنا چاہتے ہیں مجھے پتہ چلا ہے کہ اس میدان میں آپ نے کافی کام کیا ہے لیکن پھر بھی اگر کچھ "بھونگے" بچ گئے ہوں تو مجھے بتاؤ۔ (انگریزی میں بھائی جان نے کہا تھا: "If there were any crumbs left" یہ پوچھنے سے مراد تھی کہ اگر ابھی کچھ حل طلب مسائل ہوں تو میتھیوز انہیں بتائے) بھائی جان سے اس کی جو باتیں ہوئی تھیں وہ بعد میں بتائی جائیں گے۔ یہاں یہ بتانا مناسب ہوتا ہے کہ نکولس کیمبر نے بھائی جان سے اپنی جان چھڑانے کے لئے انہیں پال میتھیوز کے پاس بھجوایا تھا۔ ایک موقع پر نکولس کیمبر نے 1946ء-1953ء تک کی باتیں یاد کرتے ہوئے کہا کہ "میرے نظریاتی و تجرباتی فزکس کے بعض رفقاء نے ایک مرتبہ مجھے ایک مشکل سے دوچار کر دیا تھا وہ مشکل یہ تھی کہ میرے ساتھیوں نے مجھے ایک اور طالب علم کی نگرانی قبول کرنے کی سفارش کی جو نظریاتی فزکس میں پی-ایچ-ڈی کرنا چاہتا تھا ان کی بات سن کر میں نے ان سے کہا کہ میں تو اس بات کا منتظر ہوں کہ پال میتھیوز سے میری جان کب چھوٹتی ہے کیونکہ

اس کے علاوہ مجھے سات اور طلبا کی نگرانی کے فرائض انجام دینے پڑ رہے ہیں۔ اس پر میرے رفقاء نے مجھے بتایا کہ جس طالب علم کی وہ سفارش کر رہے ہیں اس نے ریاضی اور فزکس میں ٹرائی پوز کیا ہے اور وہ ان تمام طلبا سے زیادہ ذہین ہے جنہیں اس کے پاس بھجوایا جاتا رہا ہے۔ یہ سن کر میں نے ان سے پوچھا کہ وہ لڑکا کون ہے؟ تو انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ایک پاکستانی طالب علم ہے۔ یہ سن کر میرے اندر اس طالب علم کی قابلیت کے بارے میں کچھ شبہات پیدا ہوئے لیکن پھر بھی میں نے اپنے ساتھیوں کے کہنے پر اس کا نگران بننا قبول کر لیا تھا۔ وہ جب میرے پاس آیا تھا تو میں نے اسے پال میتھیوز سے ملنے کے لئے کہا اور یوں میں نے اس سے اپنی جان چھڑائی تھی۔" یہ سب کچھ بتانے کے بعد پروفیسر کیمر نے کہا کہ "قیاس آرائی میں آدمی کتنا غلط ہو سکتا ہے۔" ایسا کہنے کا ان کا مقصد یہ تھا کہ 1950ء میں جس طالب علم کی قابلیت کے بارے میں اس کے اندر شبہات پیدا ہوئے تھے 29 سال بعد اسی طالب علم نے فزکس میں نوبل انعام حاصل کیا۔

اب ہم پال میتھیوز اور بھائی جان کی بات چیت کی طرف آتے ہیں۔ بھائی جان جب اس سے ملے تھے تو وہ اپنی پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے مقالہ لکھ چکا تھا اور جلد ہی اس نے زبانی امتحان (Viva) دینا تھا۔

مئی 1985ء میں فرمی نیشنل ایکسلریٹر لیبارٹری بٹیاویہ (Fermi National Accelerator Laboratory, Batavia) میں تقریر کرتے ہوئے بھائی جان نے بتایا کہ میتھیوز نے اس وقت جو پہلی نصیحت مجھے کی وہ یہ تھی کہ میں شونگر اور فی مین کی تحریروں کو بھول جاؤں۔ بلکہ ڈائسن کے ان دو کلاسیکی مضامین پر اپنی توجہ مرکوز کروں۔ خاص طور پر اس مضمون پر جو اس نے 1949ء میں شائع کرایا تھا جس میں اس نے بتایا تھا کہ برقی حرکیات ۔ (Quantum Electro Dyamics) کو کر ہر آرڈر میں ری نارملائز کیا جا سکتا ہے۔ میتھیوز نے مجھے بتایا کہ اُس نے اس مسئلہ پر ڈیڑھ برس کام کیا ہے اور اب تک وہ صرف دوسرے آرڈر تک پہنچ پایا ہے۔ اس کے نظریے کے مطابق سپن زیرو (Spin Zero) کی مدد سے میزان تھیوریز (Meson Theories) کو ری نارملائز کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی پی-ایچ-ڈی کے لئے One loop کا حساب بنا رہا تھا جس کی مدد سے اُس نے یہ ثابت کیا کہ اس سے ری نار ملائزیشن (Renormalization) ممکن ہو سکتی ہے وہ ایک لوپ سے آگے نہ جا سکا کیونکہ بلند تر لوپ کی صورت میں ایک دوسرے پر پڑتی ہوئی لامتناہیوں (Overlapping infinities) کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مجھے سب سے پہلے اس بنیادی مسئلہ کو حل کرنا تھا کیونکہ اسے حل کئے بغیر مزید پیش رفت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ مارچ 1950ء میں کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔" اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا کہ:

"تراکب لامتنائیاں بلاشبہ کیو-ای-ڈی (Q E D) میں ظاہر ہوئی تھیں' جہاں ایک عمومی خود توانائی گراف کے تبدیل شدہ راس (Modified Vertix) کے ادغام (Insertion) کو دیکھا جا سکتا ہے۔ خود توانائی پست ترین ترتیب (Order) کے دونوں کناروں پر' تبدیل شدہ راس کے دونوں کناروں پر ادغام دوہری گنتی کے مترادف ہوں گے۔ مگر ڈائی سن نے اپنے مضمون میں ان پر بحث کرتے ہوئے ٹھیک یہ سفارش کی کہ راس کے

حصے کی زیر متناہیوں (Sub infinities) کو دوبار تفریق کیا جائے اس سے پہلے کہ خود توانائی آخر میں منہا ہو۔ ڈائی سن ضرور سچ کہتا ہو گا مگر کیوں؟ جس شے نے زندگی کو پریشان کر کے رکھ دیا تھا یہ تھی کہ جب یہ الجھانے والا تراکب وقوع پذیر ہوتا ہے تو وہ صرف کیو-ای-ڈی کی خود توانائیوں میں ہوتا ہے اور میزان نظریے کے لامتناہیوں کے تراکب ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔" یہ تھا مسئلہ جس پر میتھیوز نے ابھی تحقیق کرنا تھی۔ اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے بھائی جان نے بتایا کہ میتھیوز نے انہیں بتایا کہ "ڈگری لینے کے بعد وہ چند ماہ چھٹیاں منانے کا ارادہ رکھتا ہے اس کے بعد وہ پرنسٹن جانا چاہتا ہے۔ "اس اثناء میں تم میزان تھیوری کو نارملائز (Normalize) کرنے کے متعلق جو مسائل ہیں انہیں حل کرنے کی کوشش کرو۔ اگر میرے واپس آنے تک اس مسئلہ کا کوئی حل تلاش نہ کر سکے تو پھر میں اسے دوبارہ اپنے ہاتھوں میں لے کر خود تحقیق کروں گا۔" یہ ایک شریفانہ معاہدہ تھا جو ہمارے درمیان ہوا۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ اب مجھے اس مسئلہ کو چند ماہ کی مدت میں حل کرنا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اس سلسلے میں میں ڈائی سن سے راہنمائی حاصل کروں۔ چنانچہ میں نے اس سے فون پر بات کی اور اسے بتایا کہ میں ایک طالبعلم ہوں اور اپنی ریسرچ کا آغاز کر رہا ہوں۔ میں میزان تھیوری (Meson Theory) کو نارملائز کرنا چاہتا ہوں۔ میرے سامنے مختلف سمتوں میں جانے والے تراکب ہیں جن کو آپ حل کر چکے ہیں۔ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں کیا آپ مجھے کچھ وقت دے سکتے ہیں؟" ڈائی سن نے جواب میں کہا: "میں کل صبح امریکہ واپس جانے والا ہوں کیا تم آج رات برمنگھم آ سکتے ہو؟"" (ڈائی سن سال میں ایک ماہ برمنگھم یونیورسٹی میں گزارا کرتا تھا) چنانچہ میں اسی رات برمنگھم پہنچ گیا وہاں ڈالٹز (Dalitz) اور ان کی بیگم نے اس رات مجھے اپنے ہاں مہمان ٹھہرایا۔ جس کے لئے میں ان کا مشکور تھا۔

دوسری صبح ڈائی سن شعبہ میں آیا میں اس روز اُسے پہلی بار ملا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تراکب لامتناہیوں (Over Lapping Infinities) کا اس کے پاس کیا حل ہے؟ ڈائسن نے جواب دیا کہ "میرے پاس اس کا کوئی حل نہیں میں تو اس بارے میں ایک رائے رکھتا ہوں۔" ایک نوجوان طالب علم جس نے ریسرچ کا آغاز کیا ہو کے لئے یہ جواب ایک شدید جھٹکا تھا کیونکہ ڈائسن ہمارا ہیرو تھا۔ اس میدان میں اس کے مضامین کلاسیک تھے۔ اس کے لئے یہ کہنے سے کہ وہ تو صرف ایک رائے رکھتا ہے مجھے اپنے قدموں کے نیچے سے زمین سرکتی محسوس ہوئی۔ شاید وہ اپنے متعلق انتہائی انکساری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ پھر اس نے جو وضاحتیں کیں ان سے میں سمجھ گیا کہ اس مسئلہ میں اس کی رائے درست تھی۔ اسی سہ پہر میں نے اس کے ساتھ برمنگھم سے لندن تک ریل سے سفر کیا کیونکہ وہ اس رات ساؤتھ ایمپٹن (Southempton) سے بحری جہاز سے امریکہ جانے والا تھا۔ اس سفر کے دوران ڈائی سن سے گفتگو کرنے کے بعد مجھے پہلی مرتبہ اس امر کا احساس ہوا کہ کمزور توانیاں (Weak forces) واقعی کتنی کمزور ہیں۔ اگلے روز میں اپنے کالج واپس آ گیا۔ لیکن میرا ذہن تراکب لامتناہیوں میں الجھا ہوا تھا اور اس بات سے متفکر تھا کہ کیا میتھیوز کے دیئے ہوئے وقت کے اندر میں اس مسئلہ کا حل دریافت کر سکوں گا یا نہیں؟ میں نے ڈائی سن کی بتائی ہوئی باتوں میں سے تجنیس (Generalization) پر

غور کرنا شروع کر دیا کہ اچانک ایک بجلی سی کوندی اور قدرت نے مجھے یہ سجھا دیا کہ سپن زیرو میزان (Spin zero meson) کو بلاشبہ تمام آرڈرز (all orders) میں ری نارملائز (Renormalize) کیا جا سکتا ہے چنانچہ اس غیبی اشارہ پر میں نے فوراً کام شروع کر دیا۔ اس مسئلہ پر چونکہ مجھے ڈائی سن سے راہنمائی لینا تھی لیکن اس وقت بحرالکاہل کے آر پار فزکس کی تحقیق کے لئے ستافون کرنے کی سہولتیں میسر نہیں تھیں۔ اس لئے میں نے اس موضوع پر ڈائی سن کے ساتھ خط و کتابت شروع کر دی۔ میرا نگران جو میری رہنمائی کر رہا تھا اس میں برابر کا شریک رہا۔ وہ بہت ہی ہیجان خیز ایام تھے۔"

آخر کار پانچ ماہ کی محنت شاقہ کے بعد خداداد ذہانت' والدین اور بزرگوں کی دعاؤں کے طفیل اللہ تعالیٰ نے بھائی جان کی نصرت فرمائی اور انہوں نے ثابت کر دیا کہ ڈائی سن کی رائے درست تھی۔ بھائی جان کا ری نارملائزیشن کا ثبوت الیکٹرون کے برقی چارج کے ری نارملائزیشن کی طبعیاتی توجیہ پر مبنی تھا۔ منفی چارج کے الیکٹرون کے چاروں طرف لحاتی (Virtial) پوزیٹرانوں کی ہمہ وقت ایک دھند رہتی ہے۔ (1930ء میں ڈیراک (Dirac) نے نظریاتی بنیاد پر اس بات کی پیشین گوئی کی تھی کہ ہر ذرہ کا ایک ضد ذرہ (anti particle) بھی ہوتا ہے۔ جس کی کمیت اس ذرہ کی کمیت کے برابر ہوتی ہے مگر اس پر الٹا برقی چارج ہوتا ہے۔ بعد میں تجربات نے اس پیشین گوئی کی تصدیق کی کہ ایک پوزیٹران الیکٹران کا ضد ذرہ ہے۔ (ڈیراک کو 1933ء میں فزکس کا نوبل انعام دیا گیا تھا) عموماً ایک پوزیٹران اور الیکٹران ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتے کیونکہ وہ تیزی سے باہم مل کر گاما (Gamma) تابکاری پیدا کر دیتے ہیں لیکن ایک لحاتی پوزیٹران الیکٹران کے اردگرد یکایک پیدا ہوتا ہے اور قبل اس کے کہ وہ الیکٹران سے مل کر گاما تابکاری پیدا کرے پھر غائب ہو جاتا ہے۔ یہ سلسلہ مستقل چلتا رہتا ہے اور یہ سب ہائزن برگ (Heisenberg) 1901-1976ء۔ جنہیں 1932ء میں فزکس کا نوبل انعام دیا گیا تھا کہ اصول غیر۔یقینیت کے تحت ہوتا ہے جس کی صداقت مسلم مانی جاتی ہے۔

ایک لحاتی پوزیٹران اتنی تیزی سے غائب ہوتا ہے کہ اسے کسی تجربہ سے دیکھنا ممکن نہیں۔ البتہ اس کے مستقل پیدا اور غائب ہونے سے الیکٹران کے چاروں طرف پوزیٹرانوں کا ایک دبیز بادل قائم ہو جاتا ہے۔ یہ بادل کبھی بھی الیکٹران کے اتنے قریب نہیں آیا تاکہ وہ الیکٹران سے مل کر گاما تابکاری پیدا کرے ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ الیکٹران پر موجود لامتناہی منفی چارج کے اثر کو کافی کم کر دیتا ہے۔ الیکٹران پر جو چارج ہمیں تجربہ سے ملتا ہے وہ الیکٹران کا اصلی چارج نہ ہو کر اس بادل کے اثر سے کم شدہ ہوتا ہے۔ بھائی جان نے اس تصور کو میزان (Meson) تھیوری کے لئے ریاضاتی شکل دی تھی۔ اس طرح انہوں نے ری نارملائزیشن (Renormalization) کے سلسلہ کا ایک بنیادی کام کر دکھایا۔ یہ پانچ ماہ کی کاوش ان کا پی-ایچ-ڈی کا کام تھا' جس نے انہیں عالمگیر شہرت کا مالک بنا دیا۔

بھائی جان کا یہ تھیسس (Thesis) ماہرانہ پرکھ کے لئے ڈائسن کو پرنسٹن انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس سٹیڈیز امریکہ بھجوا دیا گیا۔ وہ بھائی جان کے کام سے بے حد متاثر ہوئے انہوں نے پرنسٹن انسٹی ٹیوٹ کے

ڈائریکٹر رابرٹ اوپن ہائیمر (Robert Oppen himer) جو امریکہ کے ایٹم بم بنانے والے ادارہ کے پراجیکٹ ڈائریکٹر رہ چکے تھے کو بتایا کہ "سلام اگرچہ ایشیائی ہے لیکن وہ ایک غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کا مالک ہے۔" پس پرنسٹن انسٹی ٹیوٹ نے بھائی جان کو جنوری 1951ء سے فیلو شپ دے دی اور وہ امریکہ چلے گئے۔ وہ اپنے ساتھ اپنے تحقیقی مقالہ کی نقل لے گئے اور وہ رابرٹ اوپن ہائیمر کو دی۔ اپنی تقریر میں جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے بھائی جان نے بتایا کہ "مجھے خیال آیا کہ جو نقل میں نے اوپن ہائیمر کو دی ہے اس کے ساتھ اشکال (Dagram) لگانا تو میں بھول گیا۔ چنانچہ میں مسودہ واپس لینے کے لئے ان کے دفتر میں گیا وہاں مجھے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا کیونکہ ان کے ملاقاتی آئے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے دفتر سے باہر آئے اور مجھے دیکھ کر کہا: "میں نے تمہارے مضمون کا بغور مطالعہ کیا ہے یہ بہت اچھا مضمون ہے۔" مجھے یہ سن کر خاموش ہو جانا چاہیے تھا مگر میں ایک احمق کی طرح بول اٹھا: "میرا خیال نہیں کہ آپ اس مضمون کو سمجھ سکتے ہیں کیونکہ اس کے ساتھ اشکال نہیں تھیں۔" میری یہ بات سن کر اوپن ہائیمر کے چہرے کا رنگ بری طرح بدل گیا مگر اس نے صرف اس قدر کہا کہ "اس کے نتائج بہرحال درست ہیں اور وہ اشکال کے بغیر بھی سمجھ میں آتا ہے۔"

پرنسٹن انسٹیٹیوٹ کے بارے میں بھائی جان نے بتایا کہ اسے ایک Toilet paper بنانے والے شخص نے قائم کیا تھا۔ آئن سٹائن اس انسٹی ٹیوٹ کے پہلے ڈائریکٹر تھے جو اس وقت نازیوں سے پناہ ڈھونڈھنے کے لئے امریکہ نقل مکانی کر گئے تھے وہ انسٹی ٹیوٹ سے ملحقہ ایک مکان میں رہتے تھے اور اس وقت بھی وہ کشش ثقل (تجاذب) اور برقی مقناطیسی قوتوں کے اتحاد کی کوشش میں مصروف تھے لیکن وہ اپنے کام میں کوئی خاص سنجیدہ نظر نہیں آتے تھے شاید ایسا ان کی عمر کے تقاضا کی وجہ سے تھا۔ (آئن سٹائن 1879ء میں پیدا ہوئے تھے اور 1955ء میں انتقال کر گئے تھے۔) بھائی جان نے جب انہیں دیکھا تھا تو اس وقت وہ 72 برس کے تھے۔ آئن سٹائن سے اپنی ملاقات کے بارے میں بھائی جان نے بتایا کہ "وہ تھوڑی دیر کے لئے انسٹی ٹیوٹ میں آتے تھے۔ ہم ان کے مکان کے باہر کھڑے ہو جاتے۔ جب وہ اپنے گھر سے باہر آتے تو ہم انہیں انسٹی ٹیوٹ تک لے جاتے تھے اور کچھ دیر بعد انہیں ان کے گھر واپس لے جاتے تھے۔ "کیا انہوں نے سائنسی موضوعات پر کبھی آئن سٹائن سے بات کی تھی؟" اس سوال کے جواب میں بھائی جان نے بتایا کہ "ایک مرتبہ جب ہم ان کے مکان کے باہر کھڑے ہوئے تھے تو انہوں نے میری طرف دیکھ کر مجھ سے پوچھا تھا کہ "تم کیا کرتے ہو؟" اس پر میں نے انہیں بتایا کہ میں ری نارملائزیشن (Renormalization) پر کام کر رہا ہوں تو انہوں نے کہا: "I am not interested in this" یعنی مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں پھر انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا تمہیں کشش ثقل (تجاذب) اور برقی مقناطیسی قوتوں کے اتحاد میں دلچسپی ہے۔" "مجھے چونکہ اس وقت اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لئے میں خاموش کھڑا رہا۔ پھر انہوں نے اپنی تھیوری کے بارے میں ہمیں آدھ گھنٹے تک لیکچر دیا جسے ہم خاموشی سے سنتے رہے۔" بھائی جان نے یہ بھی بتایا کہ

بعض اوقات مائیں اپنے بچوں کو وہاں لے آتی تھیں اور وہ ان کے بچوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا کرتے تھے۔ (جیسے ہمارے ملک میں پیر فقیر کرتے ہیں۔)

پرنسٹن میں تقریباً آٹھ ماہ تحقیقی کام کرنے کے بعد بھائی جان کیمبرج واپس چلے گئے کیونکہ ستمبر میں ان کے وظیفے کی مدت ختم ہو رہی تھی اور انہیں پاکستان واپس جانا تھا۔

کیمبرج یونیورسٹی کے قوانین کے مطابق پی-ایچ-ڈی کی ڈگری تین سال سے پہلے نہیں دی جاتی لیکن بھائی جان کی خاطر ان قوانین میں کچھ ترمیم کی گئی اور انہیں اس بات کی خصوصی اجازت دی گئی کہ وہ اپنا تھیسس (Thesis) لاہور سے بھجوا سکتے ہیں لیکن زبانی امتحان (Viva) کے لئے انہیں بہرطور کیمبرج جانا تھا۔ چنانچہ 1952ء کے موسم گرما میں وہ کیمبرج گئے۔ اپنے زبانی امتحان کے لئے انہیں برمنگھم جانا پڑا کیونکہ پروفیسر روڈلف پیریل (Rudolf Peirels) جنہوں نے یہ امتحان لینا تھا وہاں پڑھاتے تھے۔ ان کا زبانی امتحان اچھا ہو گیا اور انہیں پی-ایچ-ڈی کی ڈگری دے دی گئی۔

1950ء میں کیمبرج یونیورسٹی نے پی-ایچ-ڈی کے لئے بہترین مقالہ لکھنے پر انہیں سمتھ پرائز (Smith Prize) دیا تھا۔

1951ء میں ان کے شاندار تحقیقی کام کی بنیاد پر سینٹ جونز کالج نے انہیں اپنے کالج کا فیلو منتخب کیا تھا۔ اس بارے میں جب فیصلہ کیا گیا تو بھائی جان اس وقت پرنسٹن انسٹی ٹیوٹ امریکہ میں تھے۔ چنانچہ وہاں انہیں بذریعہ تار اس فیصلہ سے مطلع کیا گیا۔

بھائی جان کی فیلو شپ اور ان کی اعلیٰ پایہ کے تحقیق کے بارے میں ان کے نگران کیمر نے لکھا:

"I feel that I must preface my report on Mr. Abdus Salam's thesis by an explanation of my personal position in relation to this remarkable young man and his work. In January of last year I became his research supervisor after he had spent one term under the supervision of an experimental physicts. I was quite reluctant to take him on as I already had more research students than ideas for problems, but I was pressed to accept him. I anticipated that he would not give me much trouble for the first year as he had no previous know ledge of the field of research. I was interested in and would, like other such men. I had encountered, necessarily spend that time studying other people's work. However things

developed very differently, within six weeks or so he had solved a problem which the best of my students had failed to solve and within another month I was going to him for clarification of details in the latest publication. The work he had done since, thorgh based on recent ideas of Dyson and in more detail Mathews has been entirely his own and some of its details are to this day too complicated for me to follow, at least in the time. I have hitherto been able to spare for it. Whenever I discuss any aspect of the work with him. I find complete clearty of ideas in his mind, and profound understanding of what, after all, is one of the most difficullt subjects at present being studied by theoretical phypsicst. Today I feel that I am very much more Salam's. pupil than his teacher; I do not think I have been taken in, in judging him so highly, for this belief my best support is that Dyson, the man who has gone and continues to go farthest in line of modern development has not only accepted Salam's results but has made it clear (in a paper shortly to be published) that he himself has derived much benefit from discussions with Salam. I was not in the least surprised that Salam was gladly given membership at the Institute for Advanced Studies at Princeton less than one year after he began his theoretical research."

(آزاد ترجمہ از مرتب)

میں چاہتا ہوں کہ عبدالسلام کے مقالہ (Thesis) پر اس رپورٹ کا تعارف اپنے ان تعلقات سے کروں جو مجھے اس غیر معمولی اور ممتاز نوجوان سے اور اس کے کام سے رہے ہیں۔ پچھلے سال جنوری میں (1950ء ناقل) میں اس کا ریسرچ سپروائزر بنا تھا۔ قبل ازیں ایک ٹرم (Term) پہلے اس نے ایک تجرباتی عالم طبیعات کے زیر نگرانی کام کیا تھا۔ میں اسے اپنی نگرانی میں لینے کے لئے بالکل رضامند نہیں تھا کیونکہ میرے پاس ریسرچ سٹوڈنٹس کی تعداد تحقیق کے لئے موضوعات و خیالات سے زیادہ تھی۔ لیکن مجھے اس کا نگران بننے پر مجبور کیا گیا تھا۔ میں نے ایسا فیصلہ یہ سوچتے ہوئے کیا تھا کہ پہلے سال وہ مجھے زیادہ تنگ

نہیں کرے گا کیونکہ تحقیق کے اس میدان میں اسے بالکل ہی کوئی علم نہیں تھا۔ میرا یہ بھی خیال تھا کہ وہ ایک سال تک تو دوسروں کا ہی کام دیکھتا رہے گا لیکن یہاں تو معاملہ ہی مختلف ہو گیا۔ چھ ہفتوں کے اندر اس نے ایک ایسا مشکل مسئلہ حل کر لیا جسے میرے بہترین اور ذہین شاگرد حل کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ اس واقعہ کے بعد ابھی ایک ماہ بھی نہیں گزرا تھا کہ میں ان مسائل کی تفصیلات جو سائنسی رسائل میں شائع ہوتے تھے معلوم کرنے کے لئے اس کے پاس جانے لگا۔ اب تک جو تحقیقی کام اس نے شائع کیا ہے وہ اس کی اپنی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ ان مسائل کی موجودگی کا مرکزی خیال ڈائسن اور زیادہ تر میتھیوز کا تھا۔ اس کے تحقیقی کام کی بعض تفصیلات اتنی پیچیدہ ہیں کہ انہیں محدود وقت میں میرے لئے بھی سمجھنا مشکل ہے۔ تحقیقی کام کے کسی پہلو کے بارے میں میں جب ان سے گفتگو کرتا تو ان کے ذہن میں نظریات کی ایک مکمل وضاحت اور سوچ پاتا۔ اس بارے میں اس کا مطالعہ بہت عمیق ہے۔ آج کل کے نظریاتی طبعیات کے عالموں کے زیر مطالعہ یہ مشکل ترین کام ہے۔ اس لئے آج میں اپنے آپ کو سلام کا شاگرد سمجھتا ہوں نہ کہ اس کا استاد۔ میں نے اس کے اس بلند مرتبہ کو سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کھائی۔ میری اس رائے کی تائید ڈائسن خود ہے۔ جس نے اس مضمون (کوانٹم الیکٹروڈائنامکس--- ناقل) کی ارتقاء کے لئے بہت کام کیا ہے۔ اس نے نہ صرف سلام کے تحقیقی نتائج کو تسلیم کیا ہے بلکہ اس بات کی بھی وضاحت کی ہے۔ (یہ ایک سائنسی رسالہ میں شائع کی جا رہی ہے) کہ اس موضوع پر سلام سے گفتگو کر کے اس نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ اس لئے یہ بات میرے لئے ذرا بھر باعث حیرت نہیں ہوئی کہ انسٹی ٹیوٹ برائے ایڈوانس سٹڈیز پرنسٹن (Institute for Advanced Studies at Princetion) نے سلام کو اپنا ممبر بنایا ہے حالانکہ نظریاتی طبعیات میں تحقیق کرتے ہوئے اسے ابھی ایک سال کا عرصہ بھی نہیں ہوا۔

ٹرینٹی کالج کیمبرج کی فیلوشپ کو مسترد کرنا

یہاں یہ بتانا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ اپنی پی-ایچ-ڈی ڈگری کے لئے تحقیقی کام میں انہیں جو حیرت انگیز کامیابی ہوئی اور جس کی وجہ سے وہ طبعیات کی ایک معتبر شخصیت بن گئے تو اس کے پیش نظر کیمبرج یونیورسٹی کے ایک قدیم اور بڑے کالج یعنی ٹرینٹی کالج نے انہیں اپنا فیلو بنانے کی پیشکش کی تھی۔ لیکن بھائی جان نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔ اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے بتایا کہ ”اس کالج کی تاریخ میں میں پہلا آدمی تھا جسے ایسی پیش کش کو رد کرنے کا ”اعزاز“ حاصل ہوا۔“ جب ان سے اس پیش کش کو ٹھکرانے کی وجہ دریافت کی گئی تو انہوں نے بتایا کہ ”سینٹ جونز کالج کے لان اور پھولوں کے باغات ٹرینٹی کے لان اور باغات سے زیادہ خوبصورت تھے۔ میں نے وہاں تین برس کا عرصہ گزارا تھا۔“ اور پھر انہوں نے قدرے مسکرا کر کہا کہ ”آخر وفاداری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔“

یاد رہے کہ ٹرینٹی کالج کے ایک برآمدے میں بیٹھ کر مشہور زمانہ سائنس دان نیوٹن نے اپنے کلیات تشکیل کئے تھے۔ وہ برآمدہ ابھی تک اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ اگرچہ سیاحوں کے چلنے سے اس کے فرش میں گڑھے پڑ چکے ہیں جنہیں اصلی حالت میں رکھنے کی وجہ سے مرمت نہیں کیا جاتا۔

پرنسٹن (امریکہ) میں تقریباً ایک سال تحقیق کرنے کے بعد بھائی جان جولائی 1951ء میں کیمبرج واپس چلے گئے اور پھر انھوں نے پاکستان واپسی کی تیاری شروع کر دی۔ یہ خدا کا احسان تھا کہ انہوں نے تحقیق شروع کرنے کے چند مہینوں کے اندر نہایت اہم کامیابی حاصل کر لی اور ان کے اس مقالہ کو پی-ایچ-ڈی کی ڈگری کے لئے منظور کر لیا گیا تھا اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہوتا تو شاید انہیں پی-ایچ-ڈی کی ڈگری لئے بغیر ہی پاکستان واپس آنا پڑتا کیونکہ ان کا وظیفہ صرف دو سال کے لئے تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے' جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

کیمبرج سے رخصت ہونے سے پہلے وہ اپنے سپروائزر کے پاس گئے اور اس سے لیٹر آف ریکمنڈیشن (Letter of recommendation) مانگا تو سپروائزر نے جواب دیا کہ "تم مجھے تصدیق نامہ (Testimonial) دو کہ تم نے میرے ساتھ کام کیا ہے۔"

ستمبر1951ء میں بھائی جان پاکستان واپس آ گئے۔ ان کی واپسی سے قبل ابا جان نے میاں افضل حسین جو اس وقت کراچی میں پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین تھے کو بھائی جان کی کامیابیوں کے بارے میں ایک خط لکھا تھا جس کے جواب میں میاں صاحب نے مندرجہ ذیل خط لکھا:

Pakistan Public Service Commission

Karachi

12th June, 1952

My Dear Mohd. Hussain Sahib,

My heartiest congratudations on Abdus Salam's brilliant success. Wherever he has been he has won laurals. We are all very proud of him and I know you must be particularly proud of his achievements.

Men like Abdus Salam do not belong to any communiy or country. Their place is amongst the most brilliant in the world and therefore they belong to the ertire humanity. In my opinion wherever Abdus Salam has the facilities for work he should stay there and Pakistan should help him to stay there. His personal

gain or gain to his family or gain to his Country would be insignificant as comparcd to the gains to science to which he is dovoted and the advancement he makes will benifit all human beings which ever country they may be living in.

I am afraid Abdus Salam will not find facilities for work as good as they are in Cambridge or in any Univirsity in America but I am sure, when he comes over and joins Government College, Lahore, the Government would provide him whatever they can. Let us hope for the best.

With best wishes and respected Congratulation.

Yours Sincerly,
M. Afzal Husain

Mohd. Husain Sahib,
House No 634
Nawan Shehr
Multan.

ترجمہ:

”میرے پیارے محمد حسین صاحب

عبدالسلام کی شاندار کامیابی پر میری طرف سے دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔ وہ جہاں بھی گئے۔ انہیں اعزازات سے نوازا گیا ہمیں ان پر فخر ہے مجھے یقین ہے کہ ان کی کامیابی پر آپ کو بجا طور پر فخر ہو گا۔

عبدالسلام جیسے افرد پر کسی ایک فرقہ' قوم یا ملک کی اجارہ داری نہیں ہوتی بلکہ ایسے نامی و گرامی لوگوں کا اپنا ایک مقام ہوتا ہے اور وہ تمام دنیا بلکہ بنی نوع انسان کی ملکیت ہوتے ہیں۔ میری رائے میں عبدالسلام کو جہاں بہتر سہولتیں ملیں انہیں وہیں رہنا چاہیے اور پاکستان کو ان کی ہر ممکن مدد فراہم کرنا چاہیے۔

ان کی ذاتی' خاندانی یا ملکی منفعت اس فائدہ کے مقابل پر حقیر ہو گی جو دنیائے سائنس کو ان سے حاصل ہو گی۔ جس کی ترقی کے لئے انہوں نے اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے۔ اس میدان میں وہ جو بھی ترقی کریں گے اُس سے تمام نسل انسانی استفادہ کرے گی ان کا تعلق خواہ کسی ملک سے بھی ہو۔

کیمبرج اور امریکہ میں عبدالسلام کو جو سہولتیں میسر ہوں گیں شاید وہ پاکستان میں اسے نہ مل سکیں۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ واپس آ کر جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ملازمت اختیار کریں گے تو حکومت ہر ممکن سہولت انہیں دے گی۔ اس لئے ہمیں بہتری کی توقع رکھنا چاہیے۔

نیک خواہشات اور دوبارہ مبارک باد عرض کرتے ہوئے۔

آپ کا مخلص

ایم افضل حسین"

1994ء میں ورلڈ سائنٹیفک پبلیشنگ کمپنی (پرائیویٹ) لمیٹڈ سنگاپور نے بھائی جان کی ان تقاریر کو جو وقتاً فوقتاً وہ اسلامی دنیا میں سائنس کے احیاء کے بارے میں کرتے رہے تھے کو کتابی شکل میں شائع کیا۔ ان تقاریر کو ڈاکٹر ایچ آر دلافی (H.R.Dalafi) اور ڈاکٹر ایم-ایچ-اے حسن نے 1988ء میں مرتب کیا تھا۔ اس کتاب کا نام ''اسلامی ممالک میں سائنس کا احیاء'' ("Renaissance of Sciences in Islamic Countries") ہے۔

ڈاکٹر دلافی اور ڈاکٹر حسن نے اس کتاب کے تعارفی نوٹ کو میاں افضل حسین کے مندرجہ بالا خط کے دوسرے پیراگراف سے شروع کیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے لکھا ہے کہ ''میاں افضل حسین وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کی پیشین گوئی جو انہوں نے عبدالسلام کے والد چوہدری محمد حسین کو جون 1951ء میں اپنے خط میں لکھی تھی جلد ہی سچ ثابت ہوئی۔ سلام اپنے تصورات اور نظریوں کو مضبوطی سے تھامے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ 1979ء میں انہیں نوبل انعام دیا گیا۔''

پی-ایچ-ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد انگلستان سے واپسی پر نذرانہ عقیدت

نیک بخت و نیک خو نیک طینت نیک نام
تجھ کو عرف و عام میں کہتے ہیں عبدالسلام

ایک مدت بعد تو اپنے وطن میں نزیل
بھیجتا ہوں آج تجھ کو مخلصانہ سا سلام

فاخران علم کو نیچا دکھا آیا ہے تو
مرحبا اے صاحب عالی نظر اے خوش کلام

علم و حکمت پہ ترے اہل جہاں حیران ہیں
حق تعالیٰ نے تجھے بخشا ہے وہ عالی مقام

ملک کی نظریں ہیں تری قوت پرواز پر
عرش پہ جا کے بھی رہوار تخیل کو نہ تھام

کاش تجھ سے اس وطن میں اور بھی ہوں نوجوان
قوم کی تقدیر جاگے ملک کا بدلے نظام

ہاں تجھے توفیق ہے تو اب عمل پیرا بھی ہو
علم کی تحصیل ورنہ کیسے آ سکتی ہے کام

تجھ پر فرنگی فسوں کاری اثر نہ کر سکی
تجھ پر ملک و قوم کی خدمت کا لازم اہتمام

کاش تیرا علم تجھ پر حقیقت کھول دے
علم کیا ہے ہاتھ میں گر نہ ہو تیغ بے نیام

علم سے بڑھ کر جوانی کو سکھا سر حیات
زندگی ہے اصل میں اپنے وطن کا احترام

5

گورنمنٹ کالج لاہور میں ملازمت

1953-1951ء

ستمبر 1951ء میں بھائی جان جب انگلینڈ سے پاکستان واپس آئے تو انہیں گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر مقرر کیا گیا اور انہیں شعبہ ریاضی کا صدر بھی بنا دیا گیا۔ حکومت پنجاب کی تاریخ میں غالباً وہ پہلے ملازم تھے جنہیں تقرری کے وقت سات پیشگی سالانہ ترقیاں دی گئیں۔ یہ ایک منفرد مثال تھی انہیں پنجاب یونیورسٹی نے اپنے شعبہ ریاضی کا اعزازی صدر بھی مقرر کر دیا تھا۔

اس وقت پروفیسر سراج الدین گورنمنٹ کالج کے پرنسپل تھے۔ وہ بی-اے میں بھائی جان کے انگریزی کے استاد تھے۔ انھوں نے بھائی جان سے اپنی پہلی ملاقات میں کہا تھا کہ "سنا ہے آپ کیمبرج اور پرنسٹن میں اچھی تحقیقات کر کے آئے ہیں لیکن اس کام کو آپ بھول جائیں۔ ہمیں اس کالج میں فرض شناس پڑھانے والوں کی ضرورت ہے۔ یہ کالج عرصہ دراز سے قابل فخر روایات کا حامل چلا آ رہا ہے اور اس کے فارغ التحصیل ہونے والے اکثر طلباء انڈین سول سروس میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں اور اب پاکستان سول سروس میں بھی کام کر رہے ہیں۔ اگر آپ تدریس کے اوقات کے علاوہ فارغ وقت میں کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو اس سلسلے میں میرے پاس آپ کے لئے تین پیش کشیں ہیں:

"آپ یا کالج کے ہوسٹل کے وارڈن بن جائیں

یا

کالج کے حسابات کے چیف خزانچی بن جائیں

یا

کالج کے فٹ بال کلب کی صدارت قبول کر لیں۔"

کالج کے ان تین عہدوں کے انتخاب کی پیش کش بھائی جان کی ان تحقیقاتی کارکردگیوں کا اعتراف تھی۔ جن پر کیمبرج نے انہیں سمتھ پرائز سے نوازا تھا اور پرنسٹن انسٹی ٹیوٹ نے انہیں ایک سال کے لئے اپنا فیلو بنایا تھا۔ ان تین عہدوں کے انتخاب کی پیش کش کرتے ہوئے شاید پرنسپل کے ذہن میں ایک ایسے عالم و فاضل محقق کی دیومالائی یا روایتی تصویر موجود تھی جو بالعموم عجیب و غریب عادات کا حامل، خود پسند، غائب دماغ، عقل سلیم سے عاری عام معلومات میں صفر، آدم بیزار سا اور ادب آداب سے نا آشنا،

لباس کی جانب سے بے پرواہ ایک احمق سا آدمی ہوا کرتا ہے۔ محقق سائنسدانوں کے بارے میں اس قسم کے خیالات ترقی پذیر ممالک میں اب تک چلے آ رہے ہیں۔ ان سائنسدانوں کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سب سے الگ تھلگ رہتے ہیں اور مردم بیزار ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس ایک ایسی چیز ہے جو زندگی کی ہر ترقی کے مدارج میں شامل ہے۔ سائنسدان محض وہ ہے جس کا مقدر اور اعزاز یہ ہے کہ وہ علم کی کسی شاخ کی انتہاء میں پہنچ کر تحقیق و جستجو کرے اور اس علم کو اپنے روزگار کی بنیاد بنائے۔ یوں بہت سے سائنسدان طبقہ اوسط سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طبقے سے تعلق رکھتے ہوئے ان کے لئے ایسے اعلیٰ پیشوں میں داخلہ ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہوتا ہے۔ جن کی بدولت ان کے مالی حالات بہتر ہو سکیں۔ اپنے خاندان کی مالی طور پر خود کفالت خوشحالی اور تحفظ ہر انسان کی مانند ایک سائنس دان کی بھی خواہش ہوتی ہے لیکن ایک ترقی پذیر ملک میں سیاسی راہنماؤں کے نزدیک سائنسدان محض نمائشی چیز ہوتے ہیں۔ وہ سائنسدانوں کو اس طرح لیبارٹریوں تک محدود رکھتے ہیں جیسے چڑیا گھروں کے جانوروں کو ان کے پنجروں میں۔

یہاں ایک واقعہ بیان کرنا چاہوں گا۔ 1959ء میں بھائی جان پاکستان آئے۔ میں ان دنوں کراچی میں تھا۔ ایئر مارشل (ر) ظفر چوہدری جو اس وقت ونگ کمانڈر تھے نے بھائی جان کو شام کے کھانے کی دعوت دی۔ (شیزان۔ وکٹوریہ روڈ میں) انہوں نے اپنے ایک افسر گروپ کیپٹن رب کو بھی مدعو کیا ہوا تھا۔ ونگ کمانڈر ظفر چوہدری نے جب بھائی جان کو گروپ کیپٹن رب سے متعارف کرایا تو انہوں نے بھائی جان کو پکڑ کر ٹٹولنا شروع کر دیا اور یہ کہنے لگے کہ ”ہم نے تو سنا تھا سائنسدان بڑے مریل سے یا دبلے پتلے اور خشک طبیعت کے ہوتے ہیں آپ تو ماشاء اللہ اچھے موٹے تازہ ہیں اور ہنس مکھ بھی۔“

پرنسپل صاحب کی پیش کش بھائی جان کے لئے انتہائی حیرت ناک اور تعجب خیز تھی۔ بہرحال انہوں نے فٹ بال ٹیم کی نگرانی کرنے کی حامی بھرلی۔ چنانچہ وہ روزانہ چوبرجی میں واقع کالج گراؤنڈ میں فٹ بال ٹیم کی نگرانی کرنے کے لئے جایا کرتے۔ وہاں کھلاڑیوں کی صحت کا خیال رکھنے کے لئے انہیں کالج فنڈ میں سے روزانہ دودھ پلاتے تھے۔

تحقیقی کام کے لئے ایک ماحول کا ہونا اشد ضروری ہے لیکن لاہور میں کوئی اچھی لائبریری نہیں تھی۔ جدید تحقیق پر کتابوں اور سائنسی رسائل کا فقدان تھا۔ بھائی جان بتاتے تھے کہ لائبریری میں انہیں ایک سائنسی رسالہ نظر آیا جو جنگ عظیم دوم کے زمانے یعنی 1939ء کا تھا۔ نہ ہی لاہور میں ان کے ہم پلہ کوئی اور ریسرچ سکالر تھا جس کے ساتھ وہ اپنے نظریات کے بارے میں گفتگو کر سکتے اس پر ستم یہ ہوا کہ وہ رہائش گاہ بھی حاصل نہ کر سکے۔ کافی عرصہ تک وہ بحالت مجبوری پروفیسر قاضی محمد اسلم وائس پرنسپل کے گھر کے ایک کمرے میں رہتے رہے جبکہ ہماری بھابھی صاحبہ اور ان کی ایک سالہ بیٹی ابا جان کے پاس ملتان میں مقیم تھیں۔ جنہیں ملنے کے لئے وہ ہر ہفتے ملتان جایا کرتے وہ تقریباً چھ گھنٹے کا سفر ہوا کرتا تھا۔

سرکاری مکان کی الاٹمنٹ کے لئے وہ متعلقہ محکمہ کے افسران بالا سے ملتے رہتے لیکن انہیں "ٹرخا" دیا جاتا تھا۔ آخر ایک مرتبہ ان کے کسی دوست نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اس سلسلہ میں وزیر تعلیم سے مل کر ان کی مدد حاصل کریں۔ چنانچہ انہوں نے عبدالحمید دستی وزیر تعلیم پنجاب سے ملاقات کی اور اپنی مشکلات کا ان سے ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جب تک ان کی رہائش کا مسئلہ حل نہیں کیا جاتا انہیں ریسرچ میں یک سوئی حاصل نہیں ہو سکتی۔ بھائی جان کی بات سننے کے بعد دستی صاحب نے ان سے کہا کہ وہ اس بارے میں متعلقہ افسر سے ملیں۔ بھائی جان نے انہیں بتایا کہ "وہ تو ہر دوسرے روز ان سے ملتے ہیں لیکن "ٹال مٹول" سے کام لیا جاتا ہے۔" یہاں انہوں نے اپنے مؤقف پر زور دینے کے لئے وزیر صاحب سے یہ کہہ دیا کہ اگر ان کی رہائش کا مسئلہ جلد حل نہ کیا گیا تو ممکن ہے وہ ملازمت چھوڑ دیں۔ یہ سن کر وزیر موصوف نے قدرے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: "نگدی جے تے کم کرو ورنہ جاؤ۔" یعنی اگر آپ کے وارے میں آتا ہے تو کام کریں ورنہ چلے جائیں۔ دستی صاحب کی اس بات سے وہ بہت دل برداشتہ ہوئے تاہم اس واقعہ کے چند دنوں بعد ہی کچہری روڈ پر کوٹھی نمبر 6 انہیں الاٹ کر دی گئی۔ یہ کوٹھی یونیورسٹی ڈاکخانہ سے ملحقہ ہے۔ اس کے پیچھے پنجاب یونیورسٹی کی پرانی عمارت ہے۔ اب اس کوٹھی کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہوا ہے۔

رہائش کا مسئلہ حل ہونے کے بعد ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس سے بھائی جان کو بے حد تکلیف اور دکھ پہنچا۔ دسمبر 1951ء میں کالج موسم سرما (جنہیں ان دنوں کرسمس کی چھٹیوں کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا) کی چھٹیوں کی وجہ سے بند تھا کہ بھائی جان کو پروفیسر وولف گینگ پاؤلی (Rrof. Wolfgang Pauli) جنہیں (Exclusian Principle) کی دریافت پر 1945ء کا نوبل انعام دیا گیا تھا۔ (یاد رہے یہ کام انہوں نے 1925ء میں مکمل کر لیا ہوا تھا) نے بمبئی سے تار بھیجا:

"I am very lonely can you come to Bombay."

(میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہا ہوں کیا تم بمبئی آ سکتے ہو۔) بھائی جان کی رائے میں پروفیسر پاؤلی بیسویں صدی کے پہلے چار سائنسدانوں میں سے ایک تھا۔ (باقی تین آئن سٹائن' ہائزنبرگ اور ڈیراک تھے) پروفیسر پاؤلی کو ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ نے مدعو کیا تھا۔ اسی اثنا میں بھائی جان کو انڈین ایٹمی توانائی کمیشن کے چیئرمین ڈاکٹر ہومی بھابھا کا تار بھی ملا جس میں انہوں نے لکھا کہ "ہم نے آپ کو بمبئی آنے اور جانے کے لئے ٹکٹ بھجوا دیا ہے اس لئے آپ فوراً یہاں آ جائیں۔" پروفیسر پاؤلی اور ڈاکٹر بھابھا بھائی جان کے Renormalization پر ایک سال پہلے کئے ہوئے کام کے بہت قدردان تھے اس لئے انہوں نے کرسمس کی چھٹیوں کے دوران ان سے ملاقات کرنے کی خواہش کی۔

بھائی جان کو جیسے ہی ہوائی جہاز کا ٹکٹ موصول ہوا وہ بمبئی کے لئے روانہ ہو گئے۔ اس بارے میں بھائی جان نے اپنے 7 دسمبر 1987ء کے انٹرویو میں بتایا کہ "ان دنوں جہاز سیدھا بمبئی نہیں جاتا تھا۔ بلکہ

براستہ دلی ناگ پور جایا کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے پہلے دلی اور پھر ناگ پور جہاز تبدیل کئے اور تقریباً ساری رات سفر کرنے کے بعد میں بمبئی پہنچا۔ وہاں مجھے خیال آیا کہ اپنے ہوٹل جانے سے پہلے میں پروفیسر پاؤلی سے ''سلام دعا'' کرتا جاؤں۔ چنانچہ میں ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ کے گیسٹ ہاؤس چلا گیا وہاں میں نے جب پاؤلی کے کمرے کے دروازہ کو کھٹکٹایا تو اندر سے پاؤلی نے کہا: ''آ جائیں۔'' میں جیسے ہی اس کے کمرے میں داخل ہوا تو پاؤلی نے بغیر سلام دعا کے فوراً کہا کہ:

"Schwinger is wrong I can prove it."

(میں ثابت کر سکتا ہوں کہ شونگر اپنے خیالات میں غلطی پر ہے۔)

(شونگر کو 1965ء میں فزکس کا نوبل انعام دیا گیا تھا) پاؤلی کی بات سن کر بھائی جان کو غصہ آیا تو انہوں نے اسے کہا: ''پاؤلی میں ساری رات کا سفر کر کے یہاں پہنچا ہوں۔ میں سخت تھکا ہوا ہوں۔ مجھے کچھ دیر آرام کر لینے دو اس کے بعد میں آپ سے اس موضوع پر بات کروں گا۔'' پھر وہ اپنے ہوٹل چلے گئے۔ وہاں چند گھنٹے آرام کرنے کے بعد وہ پروفیسر پاؤلی سے ملے۔ اس کے بعد جتنے دن وہ بمبئی میں رہے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

بمبئی سے لاہور واپس آنے کے بعد کالج کے پرنسپل نے انہیں چارج شیٹ بھجوا دی کہ چھٹیوں کے دوران اگر وہ بیرون ملک گئے تھے تو جانے سے پہلے انہوں نے سرکاری طور پر اس کی اجازت کیوں نہ لی۔ بھائی جان کو اس قانون کا علم نہیں تھا اور نہ ہی کسی نے انہیں اس بارے میں کچھ بتایا تھا۔ پرنسپل صاحب کی اس بات سے انہیں بہت دکھ پہنچا۔ آخر کار ایس۔ایم شریف ڈائیریکٹر آف ایجوکیشن پنجاب نے مداخلت کرتے ہوئے ان ایام کو جن میں وہ پاکستان سے باہر رہے تھے۔ Leave without pay (چھٹی بلاتنخواہ) کے کھاتے میں ڈال کر اس کیس کو نمٹا دیا۔

ہر سرکاری ملازم کی کارکردگی کے بارے میں اس کا متعلقہ افسر ایک سالانہ کنفیڈنشل رپورٹ (Annual Confedential Report) لکھتا ہے جس میں مندرجات کی روشنی میں اس ملازم کی سالانہ ترقی کے بارے میں فیصلہ کیا جاتا ہے۔ 1951ء کے بھائی جان کی سالانہ کنفیڈنشل رپورٹ میں پرنسپل نے تحریر کیا: ''سلام گورنمنٹ کالج لاہور کے لئے موزوں نہیں وہ ریسرچ کے میدان میں بہترین ثابت ہو سکتے ہیں لیکن تدریس و تعلیم کے میدان میں نہیں۔''

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پروفیسر سراج الدین تو بھائی جان کے استاد تھے۔ انہیں تو اپنے شاگرد کے ساتھ خوش ہونا چاہیے تھا' وہ ان کے خلاف کیوں ہو گئے اور ان کی مسلسل زیادتیوں کی وجہ کیا تھی۔ اس کا پس منظر کچھ یوں ہے:

تقسیم ہند سے پہلے گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل مسٹر سوندھی ہوا کرتے تھے' وہ ہندو تھے۔ ان کی بیٹی جس کا نام ارمیلا تھا گورنمنٹ کالج کی طالبہ تھی اور بھائی جان سے ایک سال سینیئر ۔ بھائی جان سے

پہلے وہ کالج کے رسالہ "راوی" کے انگریزی سیکشن کی ایڈیٹر بھی تھی۔ اس نے 1943ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا تھا۔ (بی۔اے آنرز (Honours) میں اس کا مضمون انگلش تھا' جس میں وہ اول آئی تھی۔ پروفیسر سراج الدین انگلش کے استاد ہوا کرتے تھے۔ ارمیلا نے جب بی۔اے کا امتحان پاس کر لیا تو اس نے اپنے والدین کی مرضی کے برخلاف پروفیسر سراج الدین سے شادی کر لی۔ 1944ء میں بھائی جان نے بی۔اے انگلش آنرز میں آکر اس کا ریکارڈ توڑ دیا۔ کسی روسیاہ نے پروفیسر سراج الدین سے کہا کہ دیکھو جی سلام نے ارمیلا کا ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ چنانچہ اس بات سے ان کے دل میں بھائی جان کے خلاف گرہ پڑ گئی۔ اس لئے جیسے ہی انہیں مواقعے ملے انہوں نے بھائی جان کو نقصان پہنچایا۔ اب آیئے میں آپ کو تصویر کا دوسرا رُخ بھی دکھلاتا ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ:

"وقروامن تتعلمون منه العلم" جامع الصغیر یسوطیؒ (ابن عمر)

ترجمہ: "جن سے تم علم سیکھتے ہو ان کی تعظیم کرو۔"

کی روشنی میں بھائی جان اپنے اساتذہ کی بہت عزت کرتے تھے۔ باوجود اس بات کہ پروفیسر سراج الدین نے انہیں قدم قدم پر نقصان پہنچایا بھائی جان کے دل میں ان کی قدر و منزلت میں کوئی کمی نہ آئی۔ وہ جب بھی پاکستان آئے اور ان کا لاہور آنا ہوتا تو وہ پروفیسر سراج الدین سے ضرور ملاقات کرتے تھے۔ دسمبر 1979ء میں نوبل انعام ملنے کے بعد جب وہ حکومت پاکستان کی دعوت پر لاہور آئے تو وہ پروفیسر سراج الدین سے ان کی کوٹھی واقع لاہور چھاؤنی ملنے گئے تھے۔ میں ان کے ہمراہ تھا۔ پروفیسر اس وقت بہت ضعیف تھے۔ بھائی جان سے کہنے لگے: "کیا تم خوش نہیں ہو کہ میں نے تمہیں پاکستان سے باہر پھینک دیا تھا ورنہ تمہیں یہ نوبل انعام نہ ملتا۔"

پرنسپل صاحب کے ناروا سلوک کے علاوہ ایک اور واقعہ پیش آیا جس سے بھائی جان دل برداشتہ ہوئے اور انہوں نے پاکستان کو خیرباد کہنے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اس واقعہ کا پس منظر بیان کر دیتا ہوں جسے چوہدری محمد ظفراللہ خان کی سوانح عمری "تحدیث نعمت" ص 583-586 سے ماخوذ کیا ہے۔

"1953ء میں جماعت احمدیہ کے خلاف وقتاً فوقتاً ملک کے مختلف مقامات پر پرجوش مظاہرے کئے جا رہے تھے۔ متعدد عناصر نے مل کر مخالفت کا ایک محاذ قائم کر لیا تھا۔ اس محاذ کی طرف سے ایک فہرست مطالبات کی تیار کی گئی اور کثرت سے عوام کے دستخطوں کے ساتھ بذریعہ ڈاک حکومت کو بھجوائی گئی۔ مطالبات تو کوئی نصف درجن تھے لیکن معلوم ہوتا تھا کہ ان میں سو کو اہم شمار کیا جاتا تھا: اول یہ کہ جماعت احمدیہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ دوسرے چوہدری سر محمد ظفراللہ خان کو وزارت خارجہ سے علیحدہ کیا جائے کیونکہ وہ احمدی ہیں۔ حقیقت میں دوسرا مطالبہ پہلے مطالبہ کا ہی جزو تھا۔

جب حکومت کو ڈاک کے ذریعے کثرت سے مطالبات بھجوانے سے مقصد پورا نہ ہوا تو محاذ کی طرف سے فیصلہ کیا گیا کہ حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لئے راست اقدام کیا جائے اور جمعہ کی نماز کے بعد مساجد سے مطالبات کی تائید میں جلوس نکالے جائیں۔ اس تحریک کا سب سے زیادہ جوش شروع میں کراچی اور لاہور میں تھا جو کہ بعد میں دوسروں شہروں تک پھیل گیا۔

اُن دنوں مغربی پنجاب کے گورنر ابراہیم اسمٰعیل چندریگر اور وزیر اعلیٰ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ تھے۔ گورنر پنجاب نے ایک وزیر اعظم پاکستان خواجہ ناظم الدین کو ٹیلیفون پر بتایا کہ لاہور میں حالات خطرناک صورت اختیار کر گئے ہیں اور وزیر اعلیٰ کا مشورہ ہے کہ محاذ کے مطالبات کومنظور کرنے کا فوری طور پر اعلان کیا جائے کیونکہ ان کی رائے میں حالات پر قابو پانے کا اور کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا۔ گورنر صاحب نے یہ بھی کہا کہ اگر مطالبات کو قبول کرنے کا اعلان نہ کیا گیا تو لاہور کا اکثر حصہ شام تک نذر آتش ہو کر راکھ کا ڈھیر ہو جائے گا۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ وہاں احمدیوں کے مکان اور جائیدادیں جلائی جا رہی تھیں۔"

"اسی اثناء میں سیکرٹری دفاع سکندر مرزا سے کہا گیا کہ وہ فوجی لاسلکی پیغامات کے ذریعے لفٹیننٹ جنرل محمد اعظم خان جو لاہور میں دسویں ڈویژن کے جنرل آفیسر کمانڈنگ تھے سے معلوم کریں کہ صحیح صورت حال کیا ہے اور ان سے دریافت کریں کہ کیا انہیں امن قائم کرنے میں کسی دقت کے پیش آنے کا اندیشہ ہے۔ لفٹیننٹ جنرل محمد اعظم خان نے سکندر مرزا کو بتایا کہ حالات تو ویسے ہی ہیں جیسے گورنر صاحب نے وزیر اعظم صاحب کو بتایئے ہیں اگر انہیں ہدایت دی جائے تو فوج ایک گھنٹے کے اندر امن قائم کر سکتی ہے اس پر سکندر مرزا نے لفٹیننٹ جنرل محمد اعظم سے کہہ دیا کہ وہ مناسب اقدام کریں۔

جیسے لفٹیننٹ جنرل محمد اعظم خان نے اندازہ کیا تھا۔ فوج کے شہر میں داخل ہوتے ہی عوام کی مفسدانہ سرگرمیاں سرد پڑ گئیں اور حالات بہت جلد قابو میں آ گئے۔ جماعت احمدیہ کے افراد کو اس عرصہ میں ہر قسم کی اذیت کا نشانہ بنایا گیا۔ طرح طرح کے دکھ دیئے گئے۔ مال جائیدادیں تلف ہوئیں۔ جانوں پر آ پڑی۔ دو افراد کو زندہ نذر آتش کیا گیا۔"

فوج نے محاذ کے سرکردہ راہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ ان میں سے ایک "مولانا" نے (جو اب بڑے سیاسی لیڈر ہیں) جان بچانے کے لئے اپنی داڑھی مونڈھ دی اور برقع اوڑھ کے شہر سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن اسے جلد ہی گرفتار کر لیا گیا۔ اخباروں میں بغیر داڑھی کے اس کی تصویر شائع ہوئی تھی۔"

لاہور میں جب خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی تو بعض شرپسندوں نے بھائی جان کو جان سے مار دینے کا منصوبہ بنایا اور ایک جلوس کی صورت میں ان کی رہائش گاہ کی طرف چل پڑے۔ کسی طرح بھائی جان کے پرانے استاد عبدالحمید صاحب کو اس منصوبہ کا علم ہو گیا تو انہوں نے اپنے بیٹے کو کار دے کر بھائی جان کو

ان کی کوٹھی سے نکالنے کے لئے بھیج دیا۔ ہمارے والدین اس وقت بھائی جان کے پاس رہائش پذیر تھے۔ چنانچہ تمام اہل خاندان جن میں ہمارے والدین، بھائی جان اور ان کی بیگم صاحبہ اور بیٹی اور ہمارا چھوٹا بھائی محمد عبدالماجد کار میں سوار ہو گئے۔ یہ وہی وقت تھا جب فوج شہر میں داخل ہوئی تھی۔ فوج کے کنٹرول سنبھالتے ہی وہ اپنے گھر واپس آ گئے۔ یہ واقعات 1953ء میں ہوئے تھے۔

موسم گرما کی چھٹیوں میں بھائی جان کیمبرج گئے۔ ان کے ایک دوست نے انگلستان جانے اور واپسی کا ٹکٹ صرف ستر پونڈ میں مہیا کر دیا تھا۔ وہاں جانے کی غرض چند تحقیقی مقالے لکھنے کی تھی۔

بھائی جان ابھی کیمبرج میں ہی تھے کہ انہیں سینٹ جونز کالج نے اپنے ہاں لیکچرار کے عہدہ کی پیشکش کی۔ یہ عہدہ ان کے استاد نکولس کیمبر کے وہاں سے چلے جانے کی وجہ سے خالی ہوا تھا۔ انہیں ایڈ نبرا یونیورسٹی میں پروفیسرشپ مل گئی تھی۔ انہوں نے ہی سینٹ جونز کالج کی انتظامیہ کو مشورہ دیا تھا کہ ان کی جگہ پر سلام کو رکھیں کیونکہ وہی موزوں ترین شخص ہے۔ لیکن بھائی جان نے اس پیش کش کو قبول کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں سینٹ جونز کالج کو کچھ نہ بتایا لیکن اس پیش کش نے بھائی جان کو گہری سوچوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ انہیں اپنے ملک اور اس کی مٹی سے بے پناہ اور والہانہ محبت تھی انہیں اب بھی امید تھی کہ ان ہمت شکنیوں کے باوجود پاکستان میں سائنسی علوم کے فروغ کے لئے بہت کچھ کر سکیں گے۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے پروفیسر نکولس کیمر کی یہ شدید خواہش تھی کہ ان کی جگہ ان کا شاگرد پر کرے چنانچہ اس نے ہماری حکومت کو ایک خط لکھا جس کی کاپی جو آج بھی پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ ریاضی میں موجود ہے۔ مجھے صدر شعبہ ریاضی پنجاب یونیورسٹی پروفیسر خالد میر نے ڈاکٹر مجاہد کامران صدر شعبہ فزکس پنجاب یونیورسٹی کے ذریعے اس خط کی نقل دی تھی۔ اس خط کی نقل اور ترجمہ یہاں دیا جا رہا ہے جس سے عیاں ہے کہ پروفیسر نکولس کی کتنی شدید خواہش تھی کہ بھائی جان کیمبرج یونیورسٹی میں ملازمت اختیار کریں۔

From: N Kemmer, Tait Professor of Natural Philosophy, Edinburgh, formerly Stokes Lecturer in Mathematics, St. John's College Cambridge and Fellow Trintly College Cambaridge.

1. I fell it is my duty to acquaint you with the circumtanes of the offer of a Lectureship at Cambridge University to Dr. Abdus Salam. I am member of the Faculty Board of Mathematics and of the Appointment Committee which has offered Salam the succession. In addition I am his former teacher and feel I count

myself as his friend. I know him not only as a great theoretical physicist but as a man and know very well that his strong sense of duty to his country is making it hard for him to decide to accept the post offered to him. That is why I feel I can be of some use in writing this letter.

Dr. Abdus Salam's standing as a research worker in the most advanced difficult and exciting field of modern theoretical physics is very high indeed. Here in Cambridge I have had the Chance of selecting students from among the very best brain in the world and not my opinion only as the award of a Fellowship at St.John's College the membership of the Institute for Advanced Study, Princeton, N.T. USA and the present offer from our Faculty prove.

Lectureships at Cambridge are offered only partly to secure good teachers, are set much greater standard on appointing learder in their fields of research, and in this case opinion was unanimous that Salam was the man for the post before anyone else in the world. If he accepts it, I shall feel happy, when I leave to succeed Professor Max Born at Edinburgh. that my former duties will pan into the best hands possible.

However, even though the actual appointment would be for three years only, Salam may feel unable to accept it. I respect his sentiments greatly but I think, and I have done my best to make Salam agree that it would be really in the interest of all concerned if he would accept.

Dr. Adbus Salam is at present at the age of greatest scientific productivity and given the of close contacts with worker in allied fields he is certain to increase his reputation from year to year and in due course, can become one of those few to whom advanced

students from all over the world come to learn wherever he might be. In a few years he would then be capable of going back to Lahore or wherever he pleases and with the necessrary financial backing, establish his own school of theoretical physics with the heights international reputation. However, if he were to stay at Lahore now scientifically isolated and inevitably burdended with very elemintry teaching he would certainly loose the chance of any great scientific and educational achievement later on, for even the best young scientist in a field such as ours cannot be expected to thrive with out concentrating on advanced work and constant stimulus from others of similar intellect and interests.

I hope very much that you will help to make it possible for Abdus Salam to take up the appointment at Cambridge. You would be acting in the interests of international science of one of your greatest citizens and your country."

ترجمہ مرتب: از طرف: این کیمر ٹیسٹ پروفیسر آف نیچرل فلاسفی' ایڈنبرا' سابق سٹوکس لیکچرار' ریاضی و سابق فیلوٹرینٹی کالج کیمبرج۔

میں یہ اپنا فرض منصبی سمجھتا ہوں کہ آپ کو ان حالات سے آگاہ کروں جن میں ڈاکٹر عبدالسلام کو کیمبرج میں لیکچرار شپ کی پیش کش کی گئی ہے۔ میں فیکلٹی آف میتھیمیٹکس (شعبہ ریاضی) جامعہ کیمبرج اور اس تعیناتی کمیٹی کا بھی ممبر ہوں جس نے سلام کو ملازمت کی پیش کش کی ہے۔ علاوہ ازیں میں اس کا استاد بھی رہا ہوں چنانچہ اس ناطے سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کا دوست بھی ہوں۔ میں اسے ایک عظیم نظریاتی طبیعات دان سمجھتا ہوں۔ بطور انسان مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ اپنے ملک سے محبت اُسے اس ملازمت کو قبول کرنے میں حائل رہی ہے۔ میرے اس خط لکھنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ شاید اس سلسلے میں کچھ کام آسکوں۔

جدید نظریاتی طبیعات بہت ترقی یافتہ مشکل اور ہیجان خیز ہے اور اس میدان میں ڈاکٹر عبدالسلام کا رتبہ بطور محقق بہت بلند ہے۔ کیمبرج میں مجھے بہترین دماغی صلاحیت رکھنے والے طلباء کے انتخاب کا موقع ملتا ہے۔ سینٹ جونز کالج کی فیلو شپ (بھائی جان اُس وقت سینٹ جونز کالج کے فیلو تھے۔ یہ اعزاز 1951ء میں انہیں دیا گیا تھا۔ کیمر کا اشارہ اُسی طرف ہے۔ ناقل/مترجم) اور انسٹی ٹیوٹ فار ایڈوانسڈ سٹڈی پرنسٹن

این-جے (نیوجرسی' ناقل) یو-ایس-اے (Institute for Advanced study, Princtn, N.J. USA) کی ممبرشپ اور ہمارے شعبہ کی طرف سے انہیں ملازمت کی پیش کش میرے نقطہ نظر کو ثابت کرتا ہے۔

کیمبرج میں لیکچرار شپ اچھے اساتذہ کو ہی پیش کی جاتی ہے۔ ہم صرف انہیں ملازمت دیتے ہیں جنہوں نے نمایاں تحقیقی کام کیا ہوتا ہے۔ موجودہ صورت میں ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ سلام ہی دنیا کا وہ واحد شخص ہے جو اس عہدہ کے لئے موزوں ترین ہے۔ میرے ایڈنبرا (Edinburgh University Scotland) میں پروفیسر میکس بورن (Professor Max Born) کی جگہ پر جانے سے پہلے اگر وہ یہ پیش کش منظور کرلیتے ہیں تو مجھے ازحد خوشی ہوگی کہ میں نے بہترین ہاتھوں میں چارج دیا ہے۔

چونکہ یہ پیش کش صرف تین سال کے لئے ہے ممکن ہے اسی وجہ سے سلام کو اسے منظور کرنے میں تامل ہو۔ مجھے اس کے جذبات کا احترام ہے۔ میں نے اپنی جانب سے پوری کوشش کرلی ہے کہ سلام اس پیشکش کو قبول کرے یہ بات ہر ایک کے لئے بہتر ہوگی۔

ڈاکٹر عبدالسلام اس وقت (یہ خط 1953ء میں لکھا گیا تھا۔ ناقل/مترجم) اپنی عمر کے اس حصہ میں ہیں جسے سائنسی باوری کے لئے بہترین کہا جاتا ہے۔ اگر اس میدان میں دیگر محققین کے شانہ بشانہ کام کریں تو یقیناً سال بہ سال ان کی شہرت اور وقار میں اضافہ ہوتا جائے گا اور جلد ہی وہ ایک ایسی شخصیت بن جائیں گے جس کے پاس دنیا کے کونے کونے سے طلباء اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے آئیں گے خواہ وہ کسی جگہ اور کہیں بھی مقیم ہوں۔ پھر چند سال بعد وہ لاہور واپس جا سکتا ہے یا جہاں بھی وہ جانا چاہے جا سکتا ہے۔ اگر اسے مالی وسائل میسر ہو جائیں تو وہ نظریاتی طبعیات کے لئے ایک سکول بھی قائم کر سکتا ہے۔ (ٹریسٹ سنٹر برائے نظریاتی طبعیات کی شکل میں پروفیسر کی یہ پیشن گوئی پوری ہوئی۔ ناقل) جس کی ساکھ اور شہرت بہت اعلیٰ ہوگی۔ لیکن وہ اگر ابھی لاہور میں رہنا پسند کرے تو اس کا سائنسی رابطہ منقطع ہو جائے گا اور دوسروں کو ابتدائی تعلیم دینے سے یقیناً وہ سائنسی اور تعلیمی کامرانیاں حاصل نہیں کر سکے گا کیونکہ ہماری فیلڈ (مراد نظریاتی طبعیات-- ناقل/ مترجم) میں بہترین نوجوان سائنسدان اُس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اپنے تحقیقی کام پر خصوصی توجہ نہ دے اور وہ ان لوگوں سے نہ ملے جو اُسی میدان میں تحقیق کر رہے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ کیمبرج میں ملازمت کی پیشکش قبول کرنے میں آپ عبدالسلام کی مدد کریں گے۔ ایسا کرنے سے آپ نہ صرف عالمی سائنس کی مدد کریں گے بلکہ اپنے ملک کے عظیم شہری کی بھی۔"

بھائی جان اگست 1953ء میں لاہور واپس آ گئے۔ کیمبرج یونیورسٹی میں لیکچرار شپ کی پیشکش نے انہیں گہری سوچوں اور تذبذب میں مبتلا کر دیا تھا۔ انہیں اپنے وطن سے محبت تھی لیکن گورنمنٹ کالج

لاہور میں چند سال کی ملازمت کے بعد انہیں اس بات کا شدید احساس ہو گیا تھا کہ وہاں تحقیقی کاموں کے لئے فضا ناموافق ہے اور نہ ہی وہاں سہولتیں میسر تھیں۔ اس صورت حال کو وہ اپنی تحقیقی زندگی کی موت سمجھتے تھے۔ ان حالات کے علاوہ کالج کے پرنسپل صاحب کا ان کے ساتھ ناروا سلوک نے بھی ان کی طبیعت پر گہرا اثر کیا تھا۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ لیکن انہیں والدین' بہن' بھائیوں' رشتہ داروں اور دوست احباب کو چھوڑنے کا خیال کیمبرج کی پیشکش قبول کرنے میں آڑے آتا تھا کہ اچانک انہیں سینٹ جونز کالج سے ایک تار موصول ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ ان کی پیشکش قبول کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں حتمی طور پر انہیں 30 ستمبر تک آگاہ کیا جائے۔

اسی اثناء میں ایس-ایم شریف سیکرٹری تعلیم پنجاب کو جب اس بات کا علم ہوا کہ سلام کو اتنا بڑا اعزاز دیا جا رہا ہے تو انہوں نے بھائی جان کو مشورہ دیا کہ وہ کیمبرج یونیورسٹی کی اس پیشکش کو فوراً قبول کر لیں کیونکہ یہ نہ صرف ان کے لئے بلکہ پورے ملک کے لئے بہت بڑی عزت کی بات ہے۔ انہوں نے بھائی جان کو یہ مشورہ بھی دیا کہ اگر وہ گورنمنٹ کالج لاہور کی ملازمت چھوڑنا نہ بھی چاہئیں تو حکومت پنجاب انہیں چند سال کے لئے وہاں ڈیپوٹیشن (Deputation) پر بھجوا سکتی ہے۔ اس نئی صورت حال سے انہوں نے والدین سے مشورہ کرنے کے بعد 30 ستمبر کو کیمبرج یونیورسٹی کو ان کی پیش کش قبول کرنے کے بارے میں تار بھجوا دی اور انہیں یہ لکھا چونکہ انہیں یہاں معاملات نمٹانے ہیں اس لئے وہ یکم جنوری 1954ء سے کیمبرج میں اپنا کام شروع کر سکیں گے۔ یہ فیصلہ بھائی جان کی زندگی میں آنے والے تین اہم موڑوں میں تیسرا موڑ تھا۔ اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ "میں اپنا وطن کسی صورت میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن وطن نہ چھوڑتا تو میں سائنس کا "معیاری" استاد کبھی تسلیم نہ کیا جاتا۔"

1953ء کے آخر میں وہ اپنی بیگم اور اڑھائی سالہ بیٹی عزیزہ سلام کے ہمراہ بحری جہاز سے انگلستان روانہ ہو گئے۔

قدرت کے رازوں کا کسے علم ہوتا ہے کہ اس سفر کا آغاز ایک سائنس دان کی "معراج" نوبل انعام کے حصول پر اختتام پذیر ہونا ہے۔

کیمبرج جانے کے بعد حکومت پنجاب نے اپنے نوٹیفیکیشن نمبر6075/2 مورخہ 16 فروری 1954ء بھائی جان کو مندرجہ ذیل شرائط پر کیمبرج میں ڈیپوٹیشن پر وہاں لیکچر شپ کے عہدہ پر کام کرنے کی اجازت دے دی۔

"The Governor of the Punjab is pleased to

place the services of Dr. Abdus Salam, M.A (Pb) B.A (Cantab) Ph.D (Cantab), Professor, Government College, Lahore, At the Disposal of Cambridge (England) for Appointment as stokes lecturer in

mathematics for a period of three years or less (If he should return to Pakistan Earlier) with Effect from 1-1-1954.

Dr.Abdus Salam's appointment at cambridge carries the following terms:

	Per Annum
(a) Fellowship at st John's College.	p.stg 300
(b) Stipend for lecture at the University	p.stg 450
(c) Allowances	p.stg 50
Total	p.stg 800

During the period of his deputation De. Abdus Salam will Draw a special Allowance of Rs.180/= p.m. From the Punjab Government."

ترجمہ: "گورنر پنجاب کی جانب سے ڈاکٹر عبدالسلام ایم-اے (پنجاب) پی-اے (کینٹ) پی-ایچ-ڈی (کینٹ) پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور کی خدمات بخوشی تین سال یا اس سے کم (اگر وہ جلد ہی پاکستان واپس آ گئے) مدت کے لئے بحیثیت ریاضی کے سٹوکس لیکچرار یکم جنوری 1954ء سے کیمبرج یونیورسٹی کے سپرد کی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام کی کیمبرج میں تقرری کی شرائط حسب ذیل ہوں گی:

	سالانہ
سینٹ جان کی فیلوشپ	300 پاؤنڈ
یونیورسٹی میں بحیثیت لیکچرار تنخواہ	450 پاؤنڈ
الاؤنس	50 پاؤنڈ
کل	800 پاؤنڈ

اپنے ڈیپوٹیشن کے عرصہ میں ڈاکٹر عبدالسلام حکومت پنجاب سے ایک سو اسی روپے ماہوار خصوصی الاؤنس حاصل کرتے رہیں گے۔"

6

کیمبرج یونیورسٹی میں ملازمت

1956-1954ء

کیمبرج دریا کیم (Came) کے کنارے آباد ہے۔ یہ بہت خوبصورت شہر ہے۔ اسے اگر کالجوں کا شہر کہا جائے تو بجا نہ ہو گا کیونکہ اس شہر میں قریباً اکیس کالج ہیں۔
کیمبرج یونیورسٹی برطانیہ کی دوسری بڑی اور قدیم درسگاہ ہے جو 1915ء میں قائم ہوئی۔ مشہور سائنسدان نیوٹن کے علاوہ اس یونیورسٹی نے بے شمار صف اول کے سائنسدان پیدا کئے جن میں سے متعدد سائنسدانوں اور ماہرین نے نوبل انعام حاصل کئے۔ یہ یونیورسٹی صرف ایسے لوگوں کو بحیثیت استاد جگہ دیتی ہے جو عالم فاضل ہوں جن میں تحقیق اور جستجو کرنے کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہو۔
سینٹ جونز کالج نے اگرچہ بھائی جان کو 1951ء میں اپنا فیلو منتخب کر لیا تھا لیکن ان کے ہاں جیسے ہی ایک لیکچرار کی جگہ خالی ہوئی تو اس نے بھائی جان کو ان کے منفرد تعلیمی ریکارڈ اور اعلیٰ تحقیقی کام کی بناء پر اپنے ہاں استاد مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ پچھلے باب میں اس کی تفصیل دی جا چکی ہے۔
یکم جنوری 1954ء سے بھائی جان نے وہاں درس و تدریس کا کام سنبھال لیا۔ ان پر کام کا بوجھ کافی زیادہ تھا۔ تعلیمی سال کی پہلی دو ٹرم میں انڈر گریجویٹ طلباء کو ہفتہ میں تین بار پڑھانا، انڈر گریجویٹ طلباء جو مختلف منصوبوں پر کام کر رہے ہوتے ان کی ہفتہ میں چھ گھنٹے نگرانی کرنے کے علاوہ پی-ایچ-ڈی کے طلباء کی تیسری ٹرم کو ہفتہ میں تین گھنٹے کی نگرانی کا اضافی فریضہ بھی ادا کرنا پڑتا تھا۔ اس صورت حال سے وہ مطمئن نہیں تھے کیونکہ انہیں اپنے تحقیقی کاموں کے لئے بہت کم وقت ملتا تھا۔
کیمبرج میں پہلے سال انہوں نے پروفیسر ڈیراک کا کوانٹم (مقداری) میکانیات کا کورس پڑھایا کیونکہ خود پروفیسر ڈیراک ایک سال کی چھٹی پر تھے۔ کیمبرج میں ریاضی کے انڈر گریجویٹ طلباء کے لئے یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ ہر مضمون ایک ہی وقت میں دو الگ الگ کمروں میں دو مختلف استاد پڑھاتے ہیں اور طلباء کو یہ آزادی ہوتی ہے کہ وہ جس استاد سے پڑھنا چاہئیں اس کی کلاس میں بیٹھیں۔ بھائی جان کو بجلی اور مقناطیسیت پڑھانے کے لئے دیا گیا۔ ان کے لیکچر اتنے مقبول ہوئے کہ طلباء کی اکثریت ان کی کلاس میں آ کر بیٹھنے لگی۔ طلباء کو اُن کی یہ خصوصیات پسند تھی کہ وہ مضمون کی مشکلات میں طلباء کا ساتھ دیتے تھے وہ اس بات کے حامی تھے کہ استاد اور طلباء کے درمیان دوستانہ فضا ہونی چاہیے جس سے وہ (طلباء)

کھلے ذہن سے اپنی آراء کا اظہار کر سکیں یہی وجہ تھی کہ انہوں نے چند نہایت لائق محقق طلباء کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ان طلباء میں سے ایک والٹر گلبرٹ (Walter Gillbert) تھا جس نے 1956 میں بھائی جان کے ساتھ مشترکہ طور پر ایک تحقیقی مقالہ "On Generalized Dispersion Relation II" لکھا تھا۔ پی-ایچ-ڈی کی ڈگری کے لئے بھائی جان اس کے نگران تھے۔ کیمبرج میں وہ امریکن سائنسدان جے-ڈی واٹسن کا ہمسایہ تھا جس نے جینیٹک (Genetics) (علم خلق) کے کوڈ دریافت کئے تھے۔ پی-ایچ-ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد والٹر گلبرٹ واٹسن کے ساتھ امریکہ چلا گیا تھا۔

1956ء کے بعد بھائی جان کی اپنے ہونہار شاگرد سے 1961ء میں اچانک ملاقات ہوئی وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ ان کا شاگرد جس نے نظریاتی طبعیات میں پی-ایچ-ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی ابھی بھی نظریاتی طبعیات میں تحقیق کر رہا ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے گلبرٹ سے پوچھا کہ اس کا کام کیسے چل رہا ہے تو وہ کچھ کھسیانہ سا ہوا اور اس نے کہا: "میں آپ کے لئے شاید شرمندگی کا باعث ہوں۔ میرا وقت آج کل جراثیموں کی افزائش میں گزرتا ہے۔" والٹر گلبرٹ کا ایسا کرنا واٹسن کی قربت کا نتیجہ تھا' جس نے اُسے اپنی طرف مائل کر لیا تھا۔

گلبرٹ نے جلد ہی جینیٹکس (Genetics) کوڈ کی تعبیر (Decipher) کرنے کا فصیح طریقہ کار دریافت کر لیا اور اسے 1980ء میں علم کیمیا (کیمسٹری) کا نوبل انعام دیا گیا۔ 1981ء میں اس نے ہارورڈ یونیورسٹی میں اپنی چیئر (Chair) چھوڑ دی اور ایک ایسی کمپنی کی بنیاد رکھی جس میں چار ہزار امریکن ڈالر سے سرمایہ کاری کی گئی تھی وہ مختلف ادویات خصوصاً ہیومن انسولین (Human Insulin) تیار کرتی ہے۔ اس کمپنی کا نام بایوجن (Biogen) ہے اور اسے سوئٹزرلینڈ میں رجسٹر کیا گیا تھا۔ اب اس کمپنی کی مالیت ایک کروڑ چالیس لاکھ امریکن ڈالر ہے۔

والٹر گلبرٹ کے علاوہ ان کے شاگردوں میں سے جے-سی-ٹیلر اور جے-سی پولکنگ ہارن (J.C. Polkinghorne) کو کیمبرج یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر کیا گیا۔ (موخر الذکر بعد میں پادری بن گئے تھے) آرشا کو ڈرہم یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر کیا گیا تھا۔ پاکستان کے چند مشہور ماہر طبعیات بھی بھائی جان کے شاگرد تھے۔

کیمبرج یونیورسٹی میں فیلو کو مندرجہ ذیل مراعات دی جاتی ہیں:

- رہائش کے لئے مکان۔
- تحقیقی کام کے لئے کالج کی عمارت میں ایک کمرہ
- رات کا مفت کھانا۔
- مفت تجہیز و تدفین۔

بھائی جان کو کالج کے قریب ایک خوبصورت فلیٹ دیا گیا تھا۔ رات کا کھانا سب فیلو مل کر کھاتے ہیں۔

جس ہال میں کھانا کھایا جاتا ہے اس میں ایک لمبی سی میز کے دونوں اطراف فیلوز بیٹھتے ہیں۔ ہال میں ہلکی سی روشنی ہوتی ہے۔ میز پر موم بتیاں روشن کی جاتی ہیں۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے سب سے معمر فیلو لاطینی زبان میں اجتماعی دعا کراتا ہے۔ جس میز پر کھانا کھایا جاتا ہے اُسے ہائی ٹیبل کہا جاتا ہے کسی طالب علم کو اس ہال میں جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ البتہ فیلوز ایک مہمان کو مدعو کر سکتے ہیں۔ جس کے لئے انتظامیہ کو پہلے سے بتا دیا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ بھائی جان نے چوہدری سر محمد ظفراللہ خان کو کھانے کے لئے مدعو کیا تھا۔ بھائی جان نے مجھے بھی ہائی ٹیبل پر کھانا کھانے کا اعزاز بخشا تھا۔ نہایت ہی ذہین، فطین دانشوروں کے ہمراہ کھانا تناول کرنا میرے لئے بے حد عزت افزائی تھی۔

کیمبرج میں قیام کے دوران بھائی جان بحیثیت سائنسی محقق اپنے علم و تجربہ کے سبب ترقیوں کے زینے چڑھتے چلے گئے۔ وہ اپنے تحقیقی کام میں انتھک محنت کرنے والے انسان تھے۔ 1954ء میں وہ صرف دو تحقیقی مقالے لکھ سکے۔ 1955ء میں انہوں نے پانچ تحقیقی مقالے لکھے۔

1955ء میں انہوں نے پہلی روچسٹر کانفرنس میں شرکت کی جس میں دنیا کے پچاس چوٹی کے ماہرین طبعیات ہائی انرجی فزکس میں جدید ترین میلانات پر بحث مباحثہ کرنے آئے ہوئے تھے۔

1955ء میں انہوں نے جینوا سوئٹرز لینڈ میں اقوام متحدہ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی پہلی ایٹم برائے امن کانفرنس میں بطور سائنٹیفک سیکرٹری کے فرائض انجام دیئے۔ وہ اس اعزاز سے بے حد متاثر ہوئے اور انہیں پہلی مرتبہ اس بات کا اندازہ ہوا کہ اقوام متحدہ کا ادارہ دنیائے سائنس میں کیا کچھ کر گزرنے کی قوت رکھتا ہے۔

جنیوا میں ایٹم برائے امن میں شرکت کے بعد بھائی جان جھنگ والدین سے ملنے کے لئے تشریف لے گئے۔ وہاں میاں بشیر احمد امیر جماعت احمدیہ جھنگ اور نور سلطان صاحب ایڈووکیٹ نے مشترکہ طور پر ڈسٹرکٹ بورڈ ہال میں ان کے اعزاز میں عصرانہ دیا تھا۔ اس موقع پر بھائی جان نے معلومات افروز انگریزی لیکچر میں ایٹم کی تاریخ اور اس کی طاقت پر نہایت دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی۔ اپنے لیکچر کے بعد انہوں نے سوالوں کے جوابات بھی دیئے۔

اس علمی تقریر کی کارروائی جماعت اسلامی کے ترجمان روزنامہ ''تسنیم'' لاہور نے اپنی اشاعت مورخہ 14 ستمبر 1955ء میں ان الفاظ میں شائع کی:

''جھنگ مگھیانہ (ڈاک سے) دنیا کے مشہور سائنسدان مسٹر آئن سٹائن کے واحد ایشیائی ساتھی جناب ڈاکٹر عبدالسلام ایم-اے-پی-ایچ-ڈی کینٹب نے امین الدین ہال جھنگ میں مقامی حکام ضلع، وکلاء اور شہر کے صاحب علم و فکر معززین کے ایک بہت بڑے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ایٹمی طاقت صرف جنگ ہی میں نہیں بلکہ پر امن مقاصد کے لئے بھی ایک نعمت ثابت ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام جو سینٹ کالج کیمبرج کے فیلو ہیں اور جنیوا کی حالیہ بین الاقوامی ایٹم برائے امن کانفرنس کے سائنٹیفک

سیکرٹری بھی تھے۔ شیخ بشیر احمد ایجنٹ برماشیل جھنگ کی طرف سے دی گئی پارٹی میں تقریر کر رہے تھے۔
آپ نے کہا کہ امریکہ نے قریباً چھ سیر صاف شدہ یورینیم ایٹمی تجربات کے لئے پاکستان کو دی ہے۔ اس
کے علاوہ بہت جلد پاکستان میں ایک ایٹمی ری ایکٹر بھی تعمیر کیا جائے گا۔ اس طرح طاقت کی فاضل پیداوار
سے عوام کے معیار زندگی پر کافی خوشگوار اثر پڑے گا۔
ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ آئندہ قریباً ساٹھ سال تک دنیا میں طاقت کے وسائل از قسم پٹرول' کوئلہ'
گیس وغیرہ میں بہت حد تک کمی واقع ہو جائے گی تو اس وقت طاقت کی تمام ضروریات ایٹمی قوت سے ہی
پوری کی جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر کے دوران میں تختہ سیاہ پر سامعین کو مختلف اشکال کے
ذریعہ یہ سمجھایا کہ ایٹمی فارمولا سے کسی طرح حسب ضرورت کام لیا جا سکتا ہے' کس طرح ایٹم کو توڑا جا
سکتا ہے اور کس طرح اس سے طاقت حاصل کر کے کارخانے' فیکٹریاں اور دوسری روزمرہ کی ضروریات
میں کام لایا جا سکتا ہے۔ آپ نے بعض اصحاب کے سوالات کے جوابات میں فارمولا کی تفصیل کے ساتھ
وضاحت کی' آپ نے کہا: "برطانیہ میں ڈیڑھ سو یونٹ طاقت استعمال کرنے پر 22 سو ڈالر آمدنی' شام'
لبنان اور ترکی میں تیس یونٹ پر ڈیڑھ سو ڈالر آمدنی اور پاکستان میں چار یونٹ پر پچاس ڈالر فی کس آمدنی کا
تخمینہ ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے ہائیڈروجن ایٹم کے سلسلے میں وضاحت کے ساتھ اپنے تجربات کا نچوڑ
بتایا۔ آپ نے انگریزی زبان میں بات کرتے ہوئے کہا کہ روس میں ہائیڈروجن ایٹم سے متعلق بہت زیادہ
کوشش سے تحقیقات جاری ہے کیونکہ جہاں یورینیم کے حصول میں مختلف قسم کی دقتیں پیش آتی ہیں
وہاں ہائیڈروجن ایٹم کی تیاری میں صرف پانی سے کام لیا جاتا ہے۔
ڈاکٹر عبدالسلام کا تعارف کراتے ہوئے صدر جلسہ شیخ یوسف شاہ بریسٹریٹ لاء نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب
جھنگ کے ایک متوسط و معزز گھرانہ کے ہونہار فرزند ہیں۔ آپ نے میٹرک' بی-اے اور ایم-اے میں
پنجاب یونیورسٹی اور پی-ایچ-ڈی میں کیمبرج یونیورسٹی کے سابقہ ریکارڈ کو مات کیا۔ ڈاکٹر صاحب پہلے اور
واحد ایشیائی ماہر ریاضی دان ہیں جنہوں نے مغرب کے شہرہ آفاق سائنس دان مسٹر آئن سٹائن کے ساتھ
کام کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی عمر 34-33 سال ہے۔ (اس وقت بھائی جان کی عمر 29 سال تھی۔ سہواً
34-33 سال کہا گیا تھا۔ ناقل) اور آپ جھنگ کے ایک ریٹائرڈ ہیڈ کلرک محکمہ تعلیم کے صاحبزادے ہیں۔
آج کل آپ کیمبرج یونیورسٹی میں سائنس کے لیکچرار ہیں اور بین الاقوامی ایٹم برائے امن کانفرنس جینوا
کے سیکرٹری ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ دنیا کے چیدہ دماغوں میں سے ایک بہترین
دماغ کے مالک ہیں۔ یہ تقریب آپ کے اعزاز میں شیخ ایم بشیر احمد تاجر و ایجنٹ برماشیل و مسٹر نور سلطان
ایڈووکیٹ جھنگ کی طرف سے منعقد کی گئی تھی جو قریباً اڑھائی گھنٹے جاری رہی۔"
1956ء میں انہوں نے تین تحقیقی مقالے لکھے جو زیادہ تر (Generalized Dispersion
Relation) پر تھے جن کی مدد سے (Strong Nuclear Interaction) سٹرانگ نیوکلیر انٹرایکشن

میں انتشار معکوس (Back Scattering Amplitude) بھی نکالا جا سکتا ہے۔ ان تحقیقی مقالوں کے علاوہ انہوں نے ڈسپرشن تھیوری پر Cern جنیوا اور راچسٹر یونیورسٹی میں لیکچر دیئے تھے۔

نومبر 1956ء کے لگ بھگ بھائی جان نے ایک بنیادی اہمیت کا کام کیا جو پریٹی وائلیشن (Perity Violation) پر تھا۔ بھائی جان کے اس کام سے پہلے اس بات کو تقریباً کلیہ کے طور پر تسلیم کر لیا جاتا تھا کہ قدرت کی بنیادی قوتیں بائیں پن اور دائیں پن میں کوئی تمیز نہیں کرتیں۔ یعنی کسی بنیادی قوت کے تحت ہونے والا عمل اور آئینے میں اس کے عکس کے تجرباتی نتائج یکساں ہوں گے اس کے برخلاف اگر کوئی بنیادی قوت بائیں پن اور دائیں پن میں تمیز کرے تو طبعیات کی زبان میں اسے پیریٹی وائلیشن کہا جاتا ہے۔

اگر بھائی جان اپنے اس تحقیقی مقالہ کو شائع کرا دیتے تو 1957ء میں پروفیسر ینگ اور پروفیسر لی کے ساتھ انہیں مشترکہ طور پر نوبل انعام دیا جاتا۔ لیکن بھائی جان نے پروفیسر پاؤلی کے مشورہ پر اپنا تحقیقی مقالہ شائع نہ کرایا کیونکہ پروفیسر پاؤلی کی رائے میں ان کا نظریہ صحیح نہیں تھا۔ جبکہ بعد میں مادام وو (Wu et cu) وغیرہ نے وائلیشن کے حق میں ایک تجرباتی ثبوت فراہم کر دیا جو بھائی جان کے نظریے سے مطابقت رکھتا تھا۔ پروفیسر یانگ اور پروفیسر لی نے اپنا نظریہ 1957ء کے شروع میں شائع کرا دیا تھا اس لئے انہیں نوبل انعام دیا گیا۔

وائلیشن کے نظریہ کے وجود میں آنے کی کہانی بڑی دلچسپ ہے' جسے بھائی جان نے 8 دسمبر 1979ء کو سٹاک ہالم سویڈن میں نوبل انعام کی تقریب میں اپنی تقریر میں ان الفاظ میں بیان کیا۔

"...سی ایٹل (Seatle) امریکہ کانفرنس کے موقعہ پر پروفیسر یانگ (Yang) نے اپنے اور پروفیسر لی (Lee) کے ان خیالات کی وضاحت کی جو وہ بائیں دائیں تشاکل (Symmetry) کے مقدس اصول کے بارے میں رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ کمزور نیوکلیر قوت کے تعامل کی حد تک اس معمے (τ,Θ) کے حل کا تصور نہیں کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ میں امریکہ سے لندن کے لئے امریکن ایئر فورس کے ایک ٹرانسپورٹ طیارے (Mats) سے سفر کر رہا تھا۔ اس رات ایئر فورس کے طیارے سے سفر کرنے کے لئے مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ بریگیڈیئر یا فیلڈ مارشل کا عہدہ دیا گیا تھا وہ جہاز بہت غیر آرام دہ تھا۔ اس میں فوجی اور ان کے بیوی بچے سفر کر رہے تھے جن کے چیخنے چلانے اور رونے کے سبب میں ساری رات سو نہ سکا اس لئے میں مستقل سوچتا رہا کہ کمزور نیوکلیر انٹرایکشن (Weak Nuclear Interaction) میں فطرت دائیں بائیں سمڑی کیوں بگاڑتی ہے اس سلسلہ کی اہم بات یہ ہے کہ انٹرایکشن میں پاؤلی کے نیوٹرینو کا الجھاؤ ناگزیر ہے۔ ہمارا ہوائی جہاز بحرالکاہل کے اوپر پرواز کر رہا تھا کہ اچانک میرے ذہن میں پروفیسر روڈلف پیریل کا نیوٹرنو کے بارے تصویری سوال جو انہوں نے مجھ سے اس وقت پوچھا جب چند سال قبل وہ میرا پی-ایچ-ڈی کا زبانی امتحان لے رہے تھے۔ پیریل کا سوال یہ تھا: "مکسویل کی برقی مقناطیسیت کے گیج

سمٹری کے اصول کے تحت فوٹان کی کمیت صفر ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ نیوٹرینو کی کمیت صفر کیوں ہے؟" اس وقت مجھے اس بات پر حیرت ہوئی کہ پیریل پی-ایچ-ڈی کے زبانی امتحان میں مجھ سے ایک سوال پوچھ رہے ہیں جس کا جواب وہ خود نہیں جانتے۔ لیکن رات بھر کی بے آرامی کے بعد اس سوال کا جواب میرے ذہن میں آ گیا یعنی فوٹان کی گیج سمٹری کا بدل نیوٹرینو کے لئے موجود ہے۔ نیوٹرینو کی بے کمیتی (Masslessness) کا تعلق γ_5 ٹرانسفارمیشن سمٹری سے ہے۔ (اس سمٹری کا نام کائرل سمٹری (Chiral Symmetry) رکھا گیا۔ بے کمیت نیوٹرینو کی اس سمٹری کا مطلب یہ تھا کہ نیوٹرینو انٹرایکشن میں ($1+\gamma_5$) یا ($1-r_5$) ($1-\gamma_5$) کی موجودگی قدرت کے جمالیات ذوق کے سامنے دو متوازی راہیں کھلی تھیں۔ ایک وہ جس پر نیوٹرینو پریٹی وائیلیشن کے جلو میں روشنی کی رفتار سے سفر کرتا ہے دوسری وہ جس پر پریٹی وائیلیشن تو نہ ہو مگر نیوٹرینو میں کچھ بہت قلیل کمیت ہو مگر ایک الیکٹران کی کمیت سے دس ہزار گنا کم۔ اس سوچ کے بعد مجھ پر یہ بات واضح ہو گئی کہ قدرت کا انتخاب کیا ہے یقیناً بائیں دائیں سمٹری کو نیوٹرینو انٹرایکشن پر بھینٹ چڑھانے کی بات تھی۔

اگلی صبح میں ہوائی جہاز سے اترا تو خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ میں فوراً کیونڈش جا پہنچا۔ وہاں مائیکل پیرامیٹر (Michel parametre) پر پیمائش کی اور γ_5 کے دوسرے تشاکل کے نتائج معلوم کئے اور فوراً ریل گاڑی سے برمنگھم روانہ ہو گیا۔ پیریل اسی شہر میں رہتے تھے۔ میں نے ان سے اپنی ملاقات میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ دراصل یہ وہی تھے جنہوں نے اس موضوع پر مجھ سے سوال کیا تھا۔ اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا وہ میرے ان خیالات کی تصدیق کریں گے۔ پیریل کا جواب بڑا شفیقا مگر دو ٹوک تھا۔ انہوں نے کہا: "میں اس بات پر ہرگز یقین نہیں رکھتا کہ بائیں دائیں سمٹری کمزور نیوکلائی طاقتوں سے بگڑ جاتی ہے میں ایسے نظریے کو چمٹے سے چھونا بھی پسند نہیں کروں گا۔" یوں زلیخا ڈوبسن (Zuleika Dobson) کی طرح برمنگھم میں دھتکارے جانے کے بعد میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کس طرف کا رخ کرنا چاہیے۔ میرے لئے اب ایک ہی رستہ تھا کہ میں سرن (Cern) جنیوا میں پروفیسر پاؤلی سے رابطہ کروں جو نیوٹرینو کے "باپ" تصور کئے جاتے تھے۔ پاؤلی جنیوا کے قریب زیورچ میں رہتے تھے۔ اس زمانہ میں سرن (Cern) جنیوا کے ہوائی اڈہ کے قریب لکڑی کی ایک "کٹیا" میں واقع تھی میرے دوست پرنٹکی (Prentki) اور ڈی اسپگناٹ (D. Espognat) وہاں رہتے تھے۔ ان کے علاوہ وہاں گیس کا ایک چولھا تھا' جس پر سرن کا بنیادی اور مقبول کھانا (Entrecot A La Creme) تیار کیا جاتا تھا۔ اُسی کٹیا میں ایم-آئی-ٹی (MIT) کے پروفیسر ویلارز (Villars) بھی رہتے تھے۔ جو اُسی روز پاؤلی سے ملنے زیورچ جا رہے تھے چنانچہ میں نے اپنا تحقیقی مقالہ ان کے ہاتھوں پاؤلی کو بھجوا دیا۔ چند روز بعد ویلارز پاؤلی کا میرے لئے یہ دانشمندانہ پیغام لائے۔ "میرے دوست سلام کو میرا آداب پہنچے اسے کہو کہ وہ کسی بہتر چیز کے بارے میں سوچے۔" میرے لئے یہ پیغام بے حد مایوس کن تھا۔ مگر پاؤلی نے اپنی شفقت اور فراخدلانہ مہربانی نے اس کی تلافی کر دی۔ جب مسز وو (Wo) لڈر مین

(Lederman) اور ٹیلگڈی (Telegdi) نے تجربات سے ثابت کر دیا کہ ویک نیوکلر انٹرایکشن میں پیریٹی وائلیشن ہوتا ہے۔ (یعنی بائیں دائیں سمرٹی میں بلاشبہ انحراف ہوتا ہے) جس کی پیشین گوئی میرے نظریے کائرل سمرٹی (Chiral Symmetry) میں کی گئی تھی۔ تب 24 جنوری 1957ء کو پاؤلی کی طرف سے مجھے معذرت خواہانہ سا خط موصول ہوا۔"

یہ پریٹی وائلیشن نظریہ کی مختصر سی تاریخ ہے اور بھائی جان کے ویک نیوکلیر انٹرایکشن میں دو اجزائی نیوٹرینوں کے فیصلہ کن معروضہ کے انکشاف میں سبقت لے جانے کی کہانی۔

بھائی جان نے پریٹی وائلیشن پر اپنا تحقیقی مقالہ فزیکل ریویو (طبیعات کا چوٹی کا مجلّہ جس میں اعلیٰ پائے کے تازے تحقیقی مقالے شائع کئے جاتے ہیں) کو بھجوا دیا تھا۔ لیکن جب پاؤلی کی جانب سے اس مقالہ کے بارے میں مایوس کن پیغام ملا تو انہوں نے اس رسالہ سے اپنا مقالہ واپس منگوا لیا تھا۔ جسے ایڈیٹر واپس نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ طباعت کے تمام ابتدائی مراحل سے گزر کر چھپنے کے لئے تیار تھا۔

چند ماہ بعد چینی نژاد امریکن سائنسدانوں پروفیسر یانگ اور لی نے بھی اپنے طور پر یہی نظریہ پیش کیا اور اُسے شائع کرا دیا۔ اسی مقالہ پر انہیں 1957ء میں فزکس کا نوبل انعام دیا گیا۔ جس روز یانگ اور لی کو نوبل انعام دیئے جانے کی خبر شائع ہوئی تھی اسی روز لندن کے مشہور زمانہ اخبار "لندن ٹائمز" نے اپنی اشاعت میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ "کیا سلام بھی اس انعام کا حق دار نہیں؟" اگرچہ یانگ اور لی نے اصول پریٹی کے متعلق شکوک پیدا کرنے میں اولیت حاصل کی تھی۔ لیکن بھائی جان دو اجزائی تھیوری وضع کرنے میں سبقت لے گئے تھے۔ ایک ایسی بہتر تھیوری جس نے پچھلی خام تھیوری کا مقام لیا تھا۔ امریکی اخبارات اور رسالہ ٹائمز نے یانگ اور لی کے اس تحقیقی مقالہ کی بڑھ چڑھ کر تشہیر کی تھی اگر اس وقت بھائی جان بھی امریکن شہریت رکھتے تو یقیناً انہیں بھی یانگ اور لی کے ساتھ نوبل انعام کا حقدار ٹھہرایا جاتا۔"

پروفیسر پاؤلی کے غلط مشورہ سے 1957ء میں نوبل انعام نہ ملنے کی وجہ سے طبعاً بھائی جان بے حد رنجیدہ ہوئے لیکن اس "حادثہ" کے اثرات سے آپ جلد نکل آئے اور اپنے تحقیقی کام میں پہلے سے بھی بڑھ چڑھ کر رواں دواں ہو گئے۔ بالآخر 1956ء کے اپنے تحقیقی کام کو آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے برقی مقناطیسی طاقت اور کمزور نیوکلیر طاقت کی وحدت ثابت کر دکھائی اور 1979ء میں اس کام پر نوبل انعام حاصل کیا۔ علم ہندسہ میں دلچسپی رکھنے والوں کے لئے عرض کرتا چلوں کہ 1979ء کے ہندسوں کا حاصل جمع 26 ہے جو بھائی جان کا سال پیدائش تھا جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ میٹرک میں ان کے رول نمبر کا حاصل جمع 29 تھا جو ان کی تاریخ پیدائش تھا۔

چوہدری محمد علی پاکستان کے چوتھے وزیر اعظم تھے۔ وہ اس عہدہ پر اگست 1955ء سے ستمبر 1956ء تک فائز رہے۔ 1957ء میں وہ اپنے علاج کے لئے لندن میں مقیم تھے۔ ایک روز بھائی جان ان کی عیادت کے لئے گئے تو مجھے بھی اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ انہیں دنوں 1957ء کے فزکس کے نوبل انعام کا اعلان ہوا تھا۔ چوہدری

صاحب نے اس بات پر افسوس کیا کہ بھائی جان کو اس انعام سے محروم رکھا گیا ہے۔ تاہم انہوں نے بھائی جان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ حکومت پاکستان سے سفارش کریں گے کہ سائنس میں خدمات پر انہیں پریزیڈنٹ میڈل اور بیس ہزار روپے نقد انعام دے۔ چنانچہ حکومت پاکستان نے 23 مارچ 1958ء کو "یوم جمہوریہ" کے موقع پر بھائی جان کو یہ انعام دیئے تھے۔ (اس انعام کو آج کل پرایڈ آف پرفارمنس کہا جاتا ہے) اس کی مندرجہ ذیل تفصیل جماعت احمدیہ کے اخبار روزنامہ "الفضل ربوہ" نے اپنی اشاعت مورخہ 2 اپریل 1958ء کو شائع کی تھی۔

"یہ خبر جماعت میں نہایت درجہ خوشی اور مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ صدر مملکت جناب سکندر مرزا نے اس سال 23 مارچ کو "یوم جمہوریہ" کے موقعہ پر کارہائے نمایاں سرانجام دینے پر جن نمایاں شخصیتوں کو میڈل اور انعامات عطا کئے ہیں ان میں پاکستان کے نامور و مایہ ناز سائنسدان محترم جناب ڈاکٹر عبدالسلام صاحب پروفیسر امپریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی لندن کا نام سرفہرست ہے۔ آپ جماعت احمدیہ جھنگ شہر کے پریزیڈنٹ محترم جناب محمد حسین صاحب کے فرزند اکبر ہیں۔ سائنس کے میدان میں آپ کی شہرہ آفاق ریسرچ اور گراں قدر خدمات کے اعتراف کے طور پر صدر مملکت نے آپ کو پریزیڈنٹ میڈل کے علاوہ بیس ہزار روپے کا انعام بھی عطا فرمایا ہے۔ اس موقعہ پر مختلف شعبہ ہائے علوم و فنون میں کارہائے نمایاں سرانجام دینے والی جن نامور شخصیتوں کے لئے مجموعی طور پر ایک لاکھ پانچ ہزار روپے کے انعامات کا اعلان کیا گیا ہے اس میں سب سے زیادہ رقم آپ کے لئے مخصوص کی گئی ہے۔

ادارہ الفضل اس قومی اعزاز پر محترم ڈاکٹر صاحب موصوف آپ کے والد محترم اور دیگر افراد خاندان کی خدمت میں دلی مبارک باد عرض کرتا ہے اور دست بدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس اعزاز کو محترم ڈاکٹر صاحب معصوف کے لئے ہر طرح سے خیر و برکت کا موجب بنائے اور آپ کو بیش از بیش دینی و دینوی ترقیات سے نوازتے ہوئے آپ کو پہلے سے بھی بڑھ چڑھ کر دین حق، ملک و ملت اور عالم انسانیت کی خدمت بجالانے کی توفیق عطا کرے۔"

بھائی جان کی سوانح عمری میں عموماً لکھا ہوتا ہے کہ پرائڈ آف پرفارمنس انہیں 1959ء میں دیا گیا۔ یہ غلط ہے، میں نے اس امر کی تصدیق ایوان صدر سے کرائی تھی۔ یہ انعام 1958ء میں ہی دیا گیا تھا۔

سینٹ جان کالج کے میگزین میں ایک مرتبہ ایک طالب علم نے اپنے استادوں کے بارے میں مضمون لکھا، جس میں خصوصی طور پر دو اساتذہ کے بارے یوں ذکر کیا: "جب برف باری ہوتی ہے تو ہمارا ایک استاد گھر سے باہر نکل جاتا ہے، وہ سیٹیاں بجا کر اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ جبکہ ہمارا ایک دوسرا استاد اُس وقت بھی گیس ہیٹر کے سامنے بیٹھا ہوا آگ تاپ رہا ہوتا ہے جب کہ باہر موسم خوشگوار اور دھوپ نکلی ہوتی ہے۔" پہلا استاد ایک روسی تھا، دوسرے استاد بھائی جان تھے، جنہیں سردی بہت محسوس ہوتی تھی۔

بھائی جان جب کیمبرج میں لیکچرار تھے' اس وقت میں پیٹربرو (Peterborough) میں ایک بہت بڑی انجینئرنگ کمپنی میں گریجویٹ اپرنٹس شپ (Graduate Adprentice ship) کر رہا تھا۔ پیٹر برو کیمبرج سے قریباً تیس میل کے فاصلہ پر ہے' چنانچہ میں ہر جمعہ کی شام کو وہاں سے کیمبرج چلا جاتا تھا اور اتوار کی شام کو وہاں سے میری واپسی ہوتی تھی۔ اس طرح مجھے بھائی جان کو قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے۔ ایک مرتبہ میں کیمبرج گیا' ان دنوں ہماری بھابھی صاحبہ پاکستان گئی ہوئی تھیں۔ دوسری صبح ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد بھائی جان نے فرمایا کہ "اج میں پلا پکاواں گا۔" (آج میں پلاؤ پکاؤں گا) ان کی یہ بات سن کر مجھے قدرے حیرانگی ہوئی کیونکہ میں نے انہیں باورچی خانہ میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے حیرت سے اُن سے دریافت کیا کہ کیا انہیں پلاؤ پکانا آتا ہے تو وہ فرمانے لگے: "ایہہ کی مشکل اے۔" (یہ کیا مشکل ہے) کچھ دیر بعد میں اپنے کسی کام سے شہر چلا گیا۔ جب میں گھر واپس آیا تو پلاؤ تیار تھا اور بھائی جان نے نعرہ لگایا: "آؤ میاں پلاؤ کھاؤ۔" چنانچہ میں کھانے والی میز پر بیٹھ گیا تو انہوں نے دیگچی میں سے کچھ عجیب و غریب چیز نکال کر پلیٹوں میں ڈالی' جو یقیناً پلاؤ نہیں تھا بلکہ "بھپا" سا تھا۔ میں نے جب اس کا لقمہ لیا تو وہ چیز کھا نہ سکا۔ بھائی جان میری طرف دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے مسکرا کر کہا: "کھاؤ میاں بہت اچھا ہے۔" میں نے عرض کیا کہ جناب مجھ سے تو یہ نہیں کھایا جائے گا' اس لئے میں تو کسی ریسٹورنٹ میں جا کر کھانا کھاؤں گا۔ پہلے تو وہ یہی کہتے رہے کہ یہ بہت اچھا ہے کھاؤ۔ بعد میں وہ کہنے لگے: "اچھا میں بھی تمہارے ساتھ ریسٹورنٹ چلتا ہوں۔ چنانچہ ہم دونوں گھر کے قریب ہی تاج محل ریسٹورنٹ میں چلے گئے۔ وہاں کھانا کھانے کے دوران میں نے ان سے پوچھا کہ انہوں نے چاولوں میں کیا کچھ ڈالا تھا؟ تو انہوں نے بتایا جو مصالحہ ان کے ہاتھ میں آتا گیا وہ اسے دیگچی میں ڈالتے گئے۔ سب سے آخر میں جو چیز انہوں نے دیگچی میں ڈالی' اسے انہوں نے چکھا تھا' وہ اچور تھی۔ بھائی جان کے اس پلاؤ کو میں ساری عمر بھلا نہیں سکا' سچ ہے جس کا کام اُسی کو ساجھے۔

کیمبرج میں ملازمت کے دوران بھائی جان چھٹیوں میں اکثر امریکہ اور دوسرے ممالک میں کانفرنسوں میں شرکت کے لئے جاتے رہتے تھے۔ لیکن وہ رُوس نہیں جاتے تھے۔ کیونکہ انہیں اس بات کا ڈر تھا کہ ایسا کرنے سے کہیں ان کے امریکہ جانے میں روکاٹ نہ ہو۔ اس وقت آفتاب احمد خان پاکستان ہائی کمیشن لندن میں فرسٹ سیکرٹری تھے' وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے وقت سے ان کے دوست تھے۔ انہوں نے بھائی جان کو مشورہ دیا بلکہ ان پر زور ڈالا کہ وہ روس بھی ضرور جائیں۔ (اگر انہیں وہاں مدعو کیا جائے) چنانچہ جب انہیں روس سے دعوت نامہ ملا تو آپ وہاں تشریف لے گئے۔ آفتاب احمد خان بعد میں متعدد ممالک میں پاکستان کے سفیر متعین رہے' ریٹائرمنٹ کے بعد وہ لندن میں مقیم ہو گئے تھے۔ انہیں بطور امیر جماعت احمدیہ انگلستان خدمت کرنے کا موقع ملا۔ بھائی جان کی وفات سے کچھ پہلے انہوں نے وفات پائی تھی۔

1971ء میں اکیڈمی آف سائنسز ماسکو نے انہیں اپنا ممبر بنایا تھا۔ وہ روس کے سائنسی حلقوں میں بہت مقبول تھے۔ ڈاکٹر آئی-ایچ عثمانی' چیئرمین پاکستان اٹامک توانائی کمیشن نے ایک دفعہ مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ وہ ریل گاڑی

سے لینن گراڈ سے ماسکو سفر کر رہے تھے کہ رات تین یا چار بجے کے قریب ان کے کمرے کا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا' انہوں نے پریشانی میں جب کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا تو وہاں دو آدمیوں کو کھڑا پایا۔ انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ "ہمیں ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ ایک پاکستانی سائنسدان اس ٹرین سے سفر کر رہے ہیں۔ ہم نے سمجھا کہ وہ ڈاکٹر سلام ہوں گے۔ اس لئے ہم ان کی خدمت میں اپنا سلام پیش کرنے آئے ہیں۔"

1956ء تک بھائی جان Renormlization اور Generalized Dispersion Relation پر بلند پایہ کام کرنے کی وجہ سے ماہر طبعیات کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل کر چکے تھے اور اس میدان میں ان کا شمار چوٹی کے سائنسدانوں میں ہونے لگا۔

پروفیسر پیٹرک بلیکٹ امپریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی لندن میں ڈین آف سائنس تھے۔ انہیں اپریشنل ریسرچ میں قد آور شخصیت مانا جاتا تھا۔ انہیں 1948ء میں
Improvement of the Wilson Cloud Chamber Method and Resulting Discoveries in Nuclear Physics and Cosmic Rays
(ولسن کلاوڈ چیمبر کی دریافت اور نیوکلیر فزکس میں کائناتی شعاعوں کی دریافت) فزکس کا نوبل انعام دیا گیا تھا۔ وہ امپریل کالج میں نظریاتی طبعیات (Theoretical Physics) کا شعبہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ جس کے لئے انہیں ایک ایسے شخص کی تلاش تھی جسے نظریاتی طبعیات میں اعلیٰ مقام حاصل ہو' جو اس شعبہ کو قائم کر کے درس و تدریس کا کام شروع کر سکے۔

1956ء کے آخر میں پروفیسر بلیکٹ کیمبرج یونیورسٹی اپنے کسی کام سے گئے' وہاں ان کی ملاقات ان کے ایک دیرینہ دوست پروفیسر ایچ-اے بیتھے (Professor H.A.Bethe) سے ہوئی۔ وہ جرمن امریکن نژاد' ماہر طبعیات تھے۔ انہیں نیوکلیرری ایکشن بالخصوص ستاروں میں توانائی کے پروڈکشن سے متعلق دریافتوں پر 1967ء کا فزکس کا نوبل انعام دیا گیا تھا۔ سب سے پہلے وہ اس وقت کیمبرج آئے تھے جب پروفیسر بلیکٹ برقی توانائی والے ذرات کی توانائی کا تعین' اپنے کلاوڈ چیمبر میں ان ذرات کا فاصلہ سفر (Range) کے علم سے کر سکنے کے امکان کے سلسلہ میں تجربات کر رہے تھے۔ چونکہ پروفیسر بیتھے اس بابت کچھ نظریاتی کام کر چکے تھے' اس لئے پروفیسر بلیکٹ نے اس سلسلہ میں ان سے تعاون چاہا تھا' تاکہ ان کے نظریات کی روشنی میں وہ اپنے تجربات سے یقینی نتائج اخذ کر سکیں۔ اس طرح یہ دونوں سائنسدان 1940ء سے پہلے ہی ایک دوسرے کے قریب آ چکے تھے۔

پروفیسر بیتھے لاس الاموس (امریکہ) (Losalmos) میں ایٹم بم کی تیاری پر بھی کام کر چکے تھے۔

پروفیسر بلیکٹ نے پروفیسر بیتھے کو امپریل کالج میں نظریاتی طبعیات کا شعبہ قائم کرنے کے بارے میں اپنی تجویز سے آگاہ کرتے ہوئے ان سے اس شعبہ کی چیئر (پروفیسر) کے لئے چند موزوں نام تجویز کرنے کے لئے کہا۔ انہوں نے فوراً بھائی جان کا نام تجویز کیا۔ پروفیسر بلیکٹ یہ سنتے ہی بھائی جان کے دفتر جا پہنچے اور

ان کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہی انتظار کئے بغیر فوراً کمرے کے اندر چلے گئے۔ بھائی جان پروفیسر بلیکٹ کو اچانک اپنے کمرے میں پا کر کچھ حیران ہوئے۔ پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہتے پروفیسر بلیکٹ نے ان سے دریافت کیا:

"کیا آپ کو امپریل کالج میں چیئر چاہیے؟"

بھائی جان نے جواب دیا: "جی ہاں۔"

پروفیسر بلیکٹ: "تو پھر سمجھیں آپ کو چیئر مل گئی۔"

بھائی جان اس غیر متوقع پیشکش سے خوش ہوئے اور پروفیسر بلیکٹ کا شکریہ ادا کیا' اس کے بعد انہیں ایک رسمی سے انٹرویو کے لئے پروفیسر ٹمپل کے سامنے پیش ہونا پڑا۔ پروفیسر ٹمپل ماہر فلکیات ایڈنگٹن (Eddingtion) کے بڑے مداح تھے۔ انہوں نے بھائی جان سے پہلا اور آخری سوال یہ پوچھا کہ "ایڈنگٹن کی فلکیات پر لکھی ہوئی کتاب کے بارے میں اُن کی رائے کیا ہے؟" یہ ایک مشکل سوال تھا کیونکہ وہ (بھائی جان) اُس کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ پروفیسر ٹمپل کی ایڈنگٹن کے کاموں میں دلچسپی اور لگاؤ دیکھتے ہوئے انہوں نے جواب دیا: "میں نے اُن کی کتاب کو آزادی فکر (غیر جانبداری) سے نہیں پڑھا۔" بھائی جان کا یہ جواب سن کر پروفیسر ٹمپل مسکرائے اور اُن کے جواب پر تبصرہ کیا: "نوجوان تمہیں تو ڈپلومیٹک سروس میں ہونا چاہیے تھا۔" اس طرح وہ رسمی انٹرویو ختم ہوا اور انہیں امپریل کالج کے شعبہ ریاضی میں پروفیسر مقرر کیا گیا۔

ان سے پہلے اسی چیئر پر بڑی بڑی شخصیات مثلاً الفرڈ نارتھ وائٹ ہیڈ (Alfred North White Head) جنہوں نے ریاضی کے کلیے (Principia Mathemetica) لکھنے میں برٹرینڈ رسل (Bertrand Russel) کی معاونت کی تھی' فائز رہ چکے تھے۔

برٹرینڈ رسل (Bertrand Russel) ایک عظیم فلاسفر بھی تھے۔ بھائی جان نے ان سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے ایک دلچسپ بات بتائی کہ: "صدر ایوب خان برطانیہ کے دورے پر آئے۔ بھٹو صاحب بھی ان کے ساتھ تھے۔ ان دنوں ایک بنگالی اے-ٹی-ایم مصطفٰے وزیر تعلیم تھے۔ اتفاق سے ایوب خان کے دورے کے دنوں میں برٹرینڈ رسل سے میری ملاقات طے ہو چکی تھی۔ اے-ٹی-ایم مصطفٰے نے بھی برٹرینڈ رسل سے ملنے کی خواہش کی۔ چنانچہ وہ میرے ساتھ چل دیئے۔ اے-ٹی-ایم مصطفٰے نے خدا کے وجود کے مسئلے پر برٹرینڈ رسل سے بڑی زور دار بحث کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ تو چلے گئے اور میں برٹرینڈ رسل کے پاس رہ گیا۔ بوڑھے برٹرینڈ رسل نے کہا: "لوگ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ 95 سال کے برٹرینڈ رسل کو آدھ گھنٹہ کی گفتگو سے خدا کے وجود کا قائل بنایا جا سکتا ہے۔" چنانچہ یہ بحث میرے ساتھ بھی شروع ہو گئی۔ میں نے کہا کہ "خدا کو مانے بغیر انسان کے کردار میں بہت سی بنیادی خرابیاں رہ جاتی ہیں اور مشاہدہ بھی

یہی بتاتا ہے کہ خدا کو ماننے والوں نے انسانیت کی خاطر زیادہ قربانیاں دیں اور خدا کو نہ ماننے والوں کے مقابلے میں بہتر انسان ثابت ہوئے۔" برٹرینڈ رسل نے کہا: "کوئی مثال دو؟" ظاہر ہے مثال دیتے ہوئے مجھے بہت محتاط ہونے کی ضرورت تھی۔ کسی ایسے نام کی تلاش تھی جس پر برٹرینڈ رسل اتفاق کر سکے۔ میرے ذہن میں گاندھی کا نام آیا۔ گاندھی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آخری وقت میں اُس نے متعصب ہندوؤں کی پالیسی سے ڈٹ کر اختلاف کیا اور غالباً مسلمانوں کی طرف نرم رویہ رکھنے کی پاداش میں انہیں قتل کر دیا گیا۔

(نوٹ: بھائی جان کے اس بیان کی تائید میں ذیل میں لاہور کے روزنامہ "دی نیوز" مورخہ 4 اگست 1997ء میں شائع ہونے والی ایک خبر کا ترجمہ دیا جا رہا ہے:

"ہم گاندھی کو دوبارہ قتل کر دیتے' قاتل کے بھائی کا بیان۔"

پونا' انڈیا: مہاتما گاندھی قدرتی موت کا حقدار نہیں تھا۔ اس کی موت ایسے ہی لکھی تھی۔ یہ بات گھنے بالوں والے پنشنر گوپال گاڈسے نے اپنے کندھے اچکاتے ہوئے کہی۔ اس کی آواز میں غصہ نہیں تھا بلکہ اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ مکھیاں مارنے کی بات کر رہا ہو۔ ہمیں اس سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی' اسے سیاسی وجوہ کی بنا پر قتل کیا گیا تھا۔ ہمیں گاندھی سے نفرت نہیں تھی اور نہ ہی اس کے قتل پر ہمیں افسوس ہے۔ میرے اہل خاندان کو مجھ پر فخر ہے بلکہ وہ سب میرے بڑے بھائی ناتھو رام پر زیادہ فخر کرتے ہیں۔ گوپال اگرچہ قتل کی اس سازش میں شریک تھا' لیکن گولی ناتھو رام نے 30 جنوری 1948ء کو چلائی تھی۔ ناتھو رام اور اس کے دیگر 9 ساتھیوں کی فریم کردہ فوٹو کھڑکی میں رکھی تھی۔

گاڈسے نے کہا کہ اگر گاندھی آج بھی زندہ ہوتا تو وہ اسے ایک بار دوبارہ قتل کرنے میں مدد دیتا۔ میرے بھائی نے بالکل ٹھیک کیا تھا۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر ویسی سازش پھر سے کی جائے تو میں اس میں ضرور حصہ لوں گا۔ ویسے وہ ایک عام سا آدمی دکھائی دیتا ہے جو اب پڑدادا ہے۔ وہ اپنی بیوی' دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کے ساتھ کم تھیکر روڈ پونا میں رہتا ہے۔ یہ 78 سالہ بوڑھا ابھی بھی چاک و چوبند ہے۔ وہ جب سیاست کی بات کرتا ہے تو اس وقت "کٹر ہندو" اس کے اندر جاگ اٹھتا ہے۔ گاڈسے نے کہا کہ 50 سال پہلے اپنی عدم تشدد پالیسی کی وجہ سے گاندھی نے برطانوی راج سے چھٹکارہ دلایا تھا لیکن تقسیم سے پہلے مسلمانوں کی حمایت کر کے اس نے اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دیئے تھے۔

گاندھی کا یہ مطالبہ کہ نئی دہلی تقسیم کے بعد پاکستان کو اس کے حصے کے 55 کروڑ روپے ادا کر دیے۔ سازشیوں کے لئے قابل قبول نہ تھا۔ گاندھی نے اس بارے میں بھوک ہڑتال کرنے سے اپنے جرم میں اضافہ کر لیا تھا۔ اسے اس بات کا کوئی خیال نہیں تھا کہ پنجاب میں لاکھوں ہندوؤں کو قتل کیا جاتا رہا۔ (گاڈسے نے مسلمانوں کے قتل کا کوئی ذکر نہیں کیا) گاندھی دھوکہ باز' بلیک میلر اور مکار انسان تھا' اس کی عدم تشدد کی پالیسی ہندوؤں کی لاشوں پر تعمیر ہوئی تھی۔ گاندھی کے کہنے پر جواہر لعل نہرو نے پاکستان کو جو رقم دی تھی' اس سے ہتھیار خرید کر پاکستان نے 1948ء میں کشمیر میں جنگ لڑی تھی۔")

میں نے برٹرینڈ رسل سے کہا کہ گاندھی کی شخصیت کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ برٹرینڈ رسل نے بڑی حیرانگی سے میری طرف دیکھا اور کہا: "کس کا نام لیتے ہو گاندھی کا؟"

"وہ تو نہایت ظالم اور سنگدل انسان تھا۔" میں نے کہا: "وہ کیسے؟" برٹرینڈرسل نے کہا: "اس ظالم نے 40 سال کی عمر میں اپنی بیوی کو تمام ازدواجی مسرتوں سے محروم کر دیا تھا' اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے۔"

("نوائے وقت" 3 دسمبر1979ء' وارث میر کو انٹرویو)

بھائی جان کو کیمبرج چھوڑنے میں کچھ ہچکچاہٹ سی ہو رہی تھی' جو ایک قدرتی بات تھی' کیونکہ انہوں نے وہاں تعلیم حاصل کی تھی اور اپنی عمر عزیز کے قریباً دس سال وہاں گزارے تھے۔ وہیں رہتے ہوئے انہوں نے دنیائے سائنس میں بلندیوں کے عروج کو چھوا تھا۔ کیمبرج چھوڑنے کے بارے میں انہوں نے پروفیسر نیول ایف ماٹ (Nevill.F.Mott) سے بات کی۔ پروفیسر ماٹ کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے۔ (1977ء میں انہیں For Contribution to the Development of Modern Electronic Sold State Circuitry and Basic Theories of Magnetism and Conduction (مقناطیسی اور بے ترتیب نظامات کے الیکٹرانک ڈھانچے پر بنیادی و اہم تھیورٹیکل تحقیقات) پر کام کرنے میں فزکس کا نوبل انعام دیا گیا تھا۔)

وہ کیونڈش میں پروفیسر تھے۔ بھائی جان نے پروفیسر ماٹ سے کہا کہ وہ ہرگز کیمبرج سے جانا پسند نہ کرتے اگر امپریل کالج کے پروفیسر کی حیثیت سے انہیں وہاں ریسرچ کے لئے زیادہ سہولتیں میسر نہ ہوتیں۔ اس کے علاوہ انہیں وہاں کوئی سپروائزنگ (نگرانی) جیسا فریضہ نہ ادا کرنا ہوگا۔ جس پر کیمبرج میں ان کا خاصا وقت صرف ہو جاتا ہے۔ یہ سن کر پروفیسر ماٹ نے بھائی جان سے کہا کہ انہیں "لوہاروں کے کالج" (یہ نام کیمبرج والوں نے امپریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کو دے رکھا تھا) نہیں جانے چاہیے۔ انہوں نے بھائی جان کو کیمبرج میں رہنے کی ترغیب دیتے ہوئے کہا کہ وہ انہیں نگرانی کی ڈیوٹی سے فارغ کر کے "فلوسوفیکل میگزین" جو طبیعات کا ایک بلند پایہ مجلّہ تھا کا ایڈیٹر بنا دیں گے۔ (اس وقت پروفیسر ماٹ خود اس مجلّہ کے ایڈیٹر تھے' اس سے بھائی جان کی تنخواہ میں ایک سو پونڈ کا اضافہ ہو جاتا۔ انہیں بتایا گیا کہ تنخواہ میں اضافہ کے علاوہ انہیں جتنا چاہئیں پینے کے لئے شیری (ایک قسم کی شراب) دی جائے گی۔ شیری "فلوسوفیکل" میگزین کے پبلشر کا سائیڈ کاروبار تھا۔

پروفیسر ماٹ کی ان ترغیب کے باوجود بھائی جان نے کیمبرج چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگرچہ بھائی جان نے یکم جنوری 1957ء سے امپریل کالج لندن میں کام شروع کر دیا تھا لیکن انہوں نے کیمبرج میں اپنا فلیٹ چھ ماہ تک خالی نہ کیا کہ شاید وہ واپس وہاں چلے جائیں۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ انہیں کیمبرج سے کتنا لگاؤ تھا۔

7

بھائی جان امپیریل کالج لندن میں

1957-1993ء

امپیریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (اب اس کالج میں میڈیسن کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔) لندن کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ یکم جنوری 1957ء کو بھائی جان نے جب وہاں پروفیسر کا عہدہ سنبھالا تو اس وقت ان کی عمر تیس سال اور گیارہ ماہ تھی۔ وہ امپیریل کالج میں مقرر ہونے والے سب سے کم عمر پروفیسر تھے' وہ دولت مشترکہ کے ممالک سے پہلے اور واحد سائنس دان تھے' جنہیں اس عہدہ پر متعین کیا گیا۔ علاوہ ازیں وہ پہلے ایشیائی تھے' جنہیں برطانیہ کی کسی یونیورسٹی نے اپنے ہاں فیکلٹی آف سائنس کی کرسی (چیئر) دی تھی۔ ان سے پہلے ڈاکٹر رادھا کرشن جو بعد میں ہندوستان کے دوسرے صدر بنے آکسفورڈ یونیورسٹی میں انڈین فلاسفی کے پروفیسر رہ چکے تھے' لیکن کہاں فلاسفی اور کہاں سائنس اور وہ بھی فزکس' جس پر صدیوں سے مغرب کی اجارہ داری ہے۔ یہ یقیناً ایک بہت بڑا اعزاز تھا جو اللہ تعالیٰ نے بھائی جان کو عطا کیا۔ "یہ اللہ کا فضل ہے جسے وہ چاہتا ہے دیتا ہے۔"

امپیریل کالج میں ان کی تقرری سے برطانیہ میں تعلیم حاصل کرنے والے پاکستانی طلباء میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی اور ان کے سر فخر سے بلند ہو گئے تھے۔ انہیں دنوں روزنامہ "پاکستان ٹائمز" لاہور کے مالک اور مشہور سیاستدان میاں افتخار الدین اپنے کسی کام سے لندن گئے' انہیں جب اس بات کا علم ہوا کہ ایک پاکستانی کو امپیریل کالج لندن میں پروفیسر مقرر کیا گیا ہے تو انہیں ہرگز یقین نہ آیا۔ چنانچہ وہ بھائی جان سے ملے اور اپنی ملاقات میں بار بار ان سے پوچھتے رہے: "سلام کیا یہ خبر صحیح ہے' کیا یہ سچ ہے؟" بعد میں میاں صاحب کی ہدایت پر روزنامہ "پاکستان ٹائمز" لاہور نے اپنی 25 اگست 1957ء کی اشاعت میں بھائی جان کے بارے میں ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا: "ایک پاکستانی ماہر طبیعات کا ممتاز مقام" یہ مضمون لندن میں مقیم اخبار کے سٹاف رپورٹر نے لکھا تھا۔ اس مضمون کے چند حصوں کا ترجمہ درج ذیل ہیں:

"دنیا کے چوٹی کے علما طبیعات کے علاوہ بہت کم لوگ ایک پاکستانی سائنس دان کے اس علمی کارنامے کے بارے میں جانتے ہوں گے' جو انہوں نے اس سال کے شروع میں نظریاتی طبیعات کے میدان میں سر انجام دیا۔ ان کے اپنے وطن میں ان کے اس کارہائے نمایاں کے بارے میں تو بہت ہی کم افراد کو علم ہو گا۔

ان کا نام نامی ڈاکٹر عبدالسلام ہے' حال ہی میں ان کا تقرر امپیریل کالج ساؤتھ کنسینگٹن (South Kensington) کے شعبہ اطلاقی ریاضی اور نظری طبیعات میں ہوا ہے۔ آپ پروفیسر ہاٹیمین لیوی کے جانے کے بعد اس عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے ہیں۔ امپیریل کالج تحقیق کے میدان میں اعلیٰ کامیابیوں کی وجہ سے مشہور ہے' اس لئے اس درسگاہ کو دیگر ممالک سے سائنسی مقابلے کے لئے سائنس دانوں کی تربیت کے لئے ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔"

"پروفیسر سلام نے نظریاتی طبیعات میں جو کارنامہ سر انجام دیا ہے' اس کا تعلق Reflexion Symmetry Principle سے ہے جس کو Principle of Parity بھی کہا جاتا ہے۔ نئے نظریے کی تخلیق اور اس کی نظریاتی تصدیق کے سلسلے میں جن چار علما طبیعات کا نام لیا جاتا ہے' ان میں پاکستان کے پروفیسر سلام' سویٹ یونین کے پروفیسر لینڈوؤ اور دو چینی نژاد امریکن پروفیسر ینگ اور پروفیسر لی شامل ہیں۔

پروفیسر ینگ اور لی وہ پہلے سائنسدان ہیں' جنہوں نے 1965ء کے وسط میں دائیں بائیں سمرٹی کے اصول کی درستی پر سائنسی طور پر شک کا اظہار کیا تھا۔ اس وقت تک تمام طبیعات دان اس نظریے کو درست سمجھتے تھے۔ ان دونوں نے اس نظریے کی جانچ پڑتال کے لئے کئی تجربات تجویز کئے۔ چنانچہ جنوری 1957ء کے وسط میں ایک اور چینی نژاد امریکن طبیعات دان مسز وو (Wu) نے ایسے تجربات کئے جن سے پروفیسر ینگ اور لی کے خدشات کو درست پایا۔

لیکن ان تجربات سے پہلے ہی پروفیسر سلام نے نومبر 1956ء میں اپنی تحقیق سے ان تجربات کے نتائج کی پیشین گوئی کر دی تھی۔ انہوں نے اپنی تحقیق پر مبنی اس بارے میں ایک تحقیقی مقالہ لکھا' جس میں اپنی تحقیق سے اخذ کردہ نتائج اور درست اعداد و شمار پر مشتمل حساب پیش کر کے اسے اٹلی کے مشہور سائنسی جریدہ "الی نوو سیمنٹو" (Ilnuovo Cimento) کو بھجوایا۔ یہ مقالہ جریدہ کے ایڈیٹر کو 15 نومبر 1956ء کو معصول ہوا۔ علاوہ ازیں پروفیسر سلام نے اپنے مقالہ کی ایک نقل نوبل انعام یافتہ طبیعات دان زیورچ کے پروفیسر پاؤلی کو بھی بھجوائی' وہ پیریٹی کے بنیادی اصول پر اتنا گہرا یقین رکھتے تھے کہ انہوں نے پروفیسر سلام کا مقالہ موصول ہونے پر انہیں یہ پیغام بھجوایا: "میری نیک تمناؤں کا اظہار میرے دوست سلام تک پہنچا دیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ وہ کوئی بہتر بات سوچیں۔"

بعد ازاں ان تجربات کے نتائج کے اعلان کے بعد پروفیسر پاؤلی نے پروفیسر وسکوف (Weiss kopf) کے نام اپنے خطوط محررہ 19 اور 21 جنوری 1957ء میں یہ بات تسلیم کی کہ انہیں پروفیسر سلام کا تحقیقی مقالہ پروفیسر ینگ اور لی کے تحقیقی مقالے سے کئی ہفتے قبل مل گیا تھا۔ پروفیسر ینگ اور لی نے بھی اس بات کو تسلیم کیا کہ انہوں نے اپنا تحقیقی مقالہ لکھنے سے پہلے پروفیسر سلام کے مقالے کا مسودہ پڑھا تھا۔ انہی دنوں دسمبر 1956ء میں ایک روسی سائنس دان پروفیسر لینڈوؤ نے بھی الگ کام کرتے ہوئے وہی نظریہ پیش کیا' جیسے پروفیسر سلام پیش کر چکے تھے۔ پس ترتیب کے لحاظ سے پروفیسر سلام کا مقالہ پروفیسر لینڈوؤ

کے مقالے سے ایک ماہ قبل منظر عام پر آیا جبکہ پروفیسر ینگ اور لی کا مقالہ پروفیسر لینڈوؤ کے مقالے کے ایک ماہ بعد شائع ہوا۔ یہ حقائق اس مضمون سے وابستہ سائنسی جرائد کے ریکارڈ پر موجود ہیں اور جب بھی ان جرائد میں یہ نیا نظریہ زیر بحث آتا ہے' ان چاروں طبیعات دانوں کا نام اکٹھا آتا ہے' لیکن امریکی اخبارات اور پریس میں صرف چینی نژاد امریکن پروفیسروں کا نام لیا جاتا ہے۔ نئے تجربات سے نتائج سامنے آتے ہی امریکی پریس نے پروفیسر ینگ اور لی کے ناموں کو خوب اچھالا لیکن اُن سے پہلے اسی نظریہ کو پیش کرنے والوں پروفیسر سلام اور پروفیسر لینڈوو کے ناموں کو اندھیرے میں گم کر دیا جاتا ہے۔ ایک ہی ماہ کے اندر امریکن رسالوں "ٹائمز"' "لائف"' "فارچون"' "سائنٹیفک امریکن" اور "پوسٹ" وغیرہ نے پروفیسر ینگ اور لی پر طویل مضامین شائع کئے اور انہیں آسمان سائنس پر نظروں کو خیرہ کر دینے والے ستارے قرار دیا۔ اخبار "نیویارک ٹائمز" نے تو پروفیسر ینگ اور لی کے مقالے کو چار مکمل صفحات پر شائع کیا' جس کی مغرب کی اخباروں میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔

ان چاروں طبیعات دانوں کے پیش کردہ نئے نظریہ کا مادے کے بنیادی ذرات سے متعلق نظریے پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ نیوکلیر فزکس کے میدان میں یہ ایک نمایاں کام ہے۔ اس نظریہ نے ماضی کے سائنس دان لیبنز (Leibniz) کے زمانہ سے تسلیم شدہ اس قدیم خیال کو باطل قرار دے دیا ہے کہ اندرونی طور پر فطرت دائیں اور بائیں میں فرق نہیں کرتی۔ لیبنز کے وقت سے طبیعات دان یہ یقین رکھتے آئے تھے کہ قدرت کی بنیادی قوتیں دائیں پن اور بائیں پن میں کوئی تمیز نہیں کرتیں' یعنی کسی بنیادی قوت کے تحت ہونے والا عمل اور آئینے میں اس کے عکس کے تجرباتی نتائج یکساں ہوں گے' اس کے برخلاف اگر کوئی بنیادی قوت دائیں پن اور بائیں پن میں تمیز کرے تو طبیعات کی زبان میں اسے پیریٹی وائلیشن کہا جاتا ہے۔"

مضمون نگار نے مزید لکھا ہے کہ "پروفیسر ینگ اور لی نے اپنے مقالے

Parity Non-Conservation and a two-component theory of the neutrino

میں یہ بات تسلیم کی ہے کہ پروفیسر سلام نے ان کو بھی اپنا مقالہ بھیجا تھا۔ چنانچہ پروفیسر ینگ اور لی اپنے مقالے کے فٹ نوٹ نمبر5 میں لکھتے ہیں: "ہمیں پروفیسر سلام کا نیوٹرینو کے بارے میں نظریے پر مقالہ ملا ہے' یہ نظریہ ویسا ہی ہے جسے ہم اپنے مقالے میں زیر بحث لائے ہیں۔ پروفیسر سلام نے خاص طور پر نقاط (A) اور (B) پر ہمارے خیال جیسی بات کی ہے۔ انہوں نے Mu. Decay کا Michel Parameter بھی دیا ہے' جو ہمارے حل شدہ نتائج (جو سیکشن نمبر6 میں دیئے گئے ہیں) سے مطابقت رکھتا ہے۔"

مزید لکھا ہے کہ "ان تجربات کا اصل سہرا ایک چینی خاتون طبیعات دان مادام وؤ کے سر ہے' وہ ینگ اور لی کی طرح امریکہ آبسی ہیں۔ جب ان چینی سائنس دانوں کو عالمی شہرت ملی تو چیانگ کائی شک کی

تائیوان میں کومن ٹاگ (Kuomintag) حکومت نے فخریہ اعلان کیا کہ یہ سائنس دان ان کے شہری ہیں اور انہیں سونے کے تمغوں سے نوازا گیا اور ہر ایک کو ایک ہزار ڈالر کا انعام بھی دیا گیا۔"

اس کے بعد مضمون نگار نے بھائی جان کی پیدائش سے لے کر امپیریل کالج لندن میں ملازمت تک کے مختصر کوائف لکھے ہیں' جس کے بعد انہوں نے لکھا ہے کہ "پروفیسر سلام ارجنٹائن' برازیل اور فرانس کے دورے سے حال ہی میں واپس آئے ہیں۔ آپ نے دو ہفتے بیونس آئرس (Buenos Aires) میں قیام فرمایا اور وہاں ارجنٹائن کے ایٹمی توانائی کمشن کی دعوت پر ایٹمی توانائی کے بارے میں لیکچر دیئے۔ ایک ہفتہ آپ ریوڈی جنیرو (Rio-De-Janeiro) میں رہے۔ (مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ بھائی جان نے وہاں سے مجھے پکچر پوسٹ کارڈ بھیجا تھا۔ مرتب) اور اسی موضوع پر لیکچر دیئے۔ فرانسیسی حکومت کی دعوت پر آپ نے Les Houche میں انٹرنیشنل تھیورٹیکل فزکس سمر سکول میں سلسلہ وار لیکچر دیئے۔ آپ آئندہ ماہ مادے کے بنیادی ذرات پر کئی لیکچر دینے کے لئے اٹلی تشریف لے جائیں گے۔"

امپیریل کالج میں تقرری کے بعد ہر پروفیسر کو ایک افتتاحی لیکچر دینا ہوتا ہے' جس میں کالج کے پروفیسروں' طلباء' دانشوروں اور معززین کو مدعو کیا جاتا ہے۔ ان دنوں میں امپیریل کالج کے قریب 212 اولڈ برامپٹن روڈ (Old Brompton Road) پر ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ چونکہ ہماری بھابھی صاحبہ (بیگم سلام) پاکستان گئی ہوئی تھیں' اسی لئے بھائی جان رہائش کے لئے میرے پاس آ گئے تھے۔ ایک روز کالج سے واپسی پر انہوں نے کہا کہ وہ اپنے افتتاحی لیکچر کے موقع پر سیول رو (Saivell Row) سے نیا سوٹ سلوانا چاہتے ہیں۔ لندن کے ویسٹ انڈ (West End) کے علاقہ پکاڈلی (Piccadilly) میں سیول رو ایک بازار نما سڑک ہے' جس پر درزیوں کی دکانیں ہیں' وہ مشین کی بجائے ہاتھ سے سوٹ سیتے ہیں یعنی (Hand Stitched)۔ وہ ہر کس و ناکس کو سوٹ بنا کر نہیں دیتے بلکہ ان کے گاہک برطانیہ کے امراء کا مخصوص طبقہ ہوتا ہے یا وہ اس کا کام کرتے ہیں جس کے پاس ان کے کسی گاہک کا تعارفی خط ہو۔ چونکہ وہ سوٹ کی سلائی ہاتھوں سے کرتے ہیں' اس لئے وہ بہت مہنگے ہوتے ہیں۔ بھائی جان کا ارادہ سن کر مجھے کچھ حیرت ہوئی کیونکہ اگرچہ وہ ہمیشہ سادہ کپڑوں میں ملبوس رہتے تھے (لیکن لباس پہننے کے آداب سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس اعتبار سے وہ ہمیشہ ممتاز نظر آتے تھے) بہرحال ایک شام ہم دونوں سیول رو کی سب سے بڑی دکان ہاکس (Hawks) میں گئے۔ وہاں کاؤنٹر کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا تھا' اس سے رسمی سلام دعا کے بعد بھائی جان نے کہا کہ وہ سوٹ سلوانا چاہتے ہیں۔ اس شخص نے پہلی بات یہی پوچھی کہ کیا آپ ہمارے پرانے گاہک ہیں؟ نفی میں جواب سننے کے بعد اس نے پوچھا کہ کیا آپ کے پاس ہمارے کسی گاہک کا کوئی تعارفی خط ہے؟ اس کا بھی نفی میں جواب سن کر اس شخص نے بڑے سپاٹ لہجے میں کہا کہ ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ یہ مایوس کن جواب سننے کے بعد ہم جب دوکان سے باہر آ رہے تھے کہ اس شخص نے آواز دے کر ہمیں واپس بلایا اور اس نے بھائی جان

سے دریافت کیا کہ جناب آپ کام کیا کرتے ہیں؟ اس پر بھائی جان نے بڑی سادگی سے اسے بتایا کہ وہ امپیریل کالج لندن میں فزکس کے پروفیسر ہیں۔ اتنا سنتے ہی اس کا رویہ بدل گیا اور اس نے کہا کہ جناب آپ اندر تشریف لے چلیں اور اپنے پسند کے کپڑے کا انتخاب کریں۔ میں آپ کا ناپ لے لوں گا۔ پھر اس نے کہا کہ جناب یہ تو ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسے عالم فاضل نے ہمیں خدمت کرنے کا موقع دیا ہے۔ چنانچہ بھائی جان نے کپڑا پسند کیا' ان کا ناپ لیا گیا اور ہمیں ایک تاریخ دے دی گئی۔ اس پر بھائی جان نے اسے کہا "کیا وہ یہ سوٹ کچھ جلدی تیار کر کے نہیں دے سکتے کیونکہ میں اسے اپنے افتتاحی لیکچر کے موقعہ پر پہننا چاہتا ہوں۔" اس پر اس شخص نے کہا کہ ہم پوری کوشش کریں گے کہ آپ کو مقررہ تاریخ سے پہلے سوٹ بنا دیں۔ برطانیہ میں ایک پروفیسر کی جو عزت و توقیر کی جاتی ہے' یہ اس کی ایک مثال ہے۔ اس سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ بھی پیش آیا۔ ستمبر1958ء میں مجھے پاکستان واپس آنا تھا' چنانچہ واپسی سے کچھ عرصہ قبل میں نے ایک کار خریدی' جسے میں اپنے ساتھ لانا چاہتا تھا' لیکن بعض وجوہات کی بناء پر میں نے اپنا ارادہ تبدیل کر لیا اور وہ کار بھائی جان کے نام ٹرانسفر کرا دی۔ کار کی انشورنس بھی میرے نام تھی۔ اسے بھائی جان کے نام تبدیل کرانے کے لئے جب میں انشورنس کمپنی کے دفتر گیا تو انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ جب میں اس دفتر سے باہر نکل رہا تھا تو ایک کلرک نے مجھے آواز دے کر واپس بلایا اور مجھ سے پوچھا کہ آپ کے بھائی کیا کام کرتے ہیں؟ جب میں نے انہیں بتایا کہ وہ امپیریل کالج لندن میں فزکس کے پروفیسر ہیں تو ان کا رویہ بھی بدل گیا اور انہوں نے کار کی انشورنس پالیسی بھائی جان کے نام ٹرانسفر کر دی۔

بھائی جان کے افتتاحی (Inaugural) لیکچر کے لئے 14 مئی (1957ء) کی تاریخ مقرر کی گئی۔ علمی شخصیات کے علاوہ انگلستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر اور بھائی جان کے دوستوں کو خاص طور پر ان کا لیکچر سننے کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ میں بھی ان خوش نصیبوں میں سے ایک تھا۔

یہ تقریب امپیریل کالج جسے رائل کالج بھی کہا جاتا تھا کے کیمسٹری تھیٹر میں ساڑھے پانچ بجے شام منعقد ہوئی۔ لیکچر سے پہلے تمام مدعین کی چائے سے تواضع کی گئی۔ اس تقریب کی صدارت پروفیسر پی-ایم-ایس بلیکٹ ڈین آف دی رائل کالج نے کی تھی۔ لیکچر کا موضوع تھا "بنیادی ذرات" پروفیسر بلیکٹ نے لیکچر سے پہلے بھائی جان کا تعارف کراتے ہوئے کہا:

"Dr Salam had a meteoric academic career at school in Pakistan and seemed to possess an extra ordinary facility for being unable to pass any examination in any subject except at the very top of the list. In 1946 he migrated to Cambridge and came to the greatest decision of his life, a decision which affected us here when he had

to make up his mind wheter to take an M.A. in English literature or in Mathematics. Luckily for Physics and Imperial College he choose the latter.

In 1955 he showed his administrative gifts by becoming one of the scientific secretaries of the great international confrence at Geniva on the peaceful uses of atomic energy. Salam's work in theoretical Physcis has been mainly of a very abstract kind, originally dealing with Quantum Theory of Fields, a subject of which I both do not know anything and know I'll never understand. Latterly he has gravitated towards the field of Elementry Particles, which is a very familiar and a dear one to myself and to my young colleagues here in other parts of England and in the world, and this is what he is going to talk about to day."

ترجمہ: پاکستان میں ڈاکٹر سلام کا تعلیمی ریکارڈ بڑا تابناک تھا۔ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے وہ ہر امتحان میں اول آتے رہے' وہ اس سے کم پر بات نہیں کرتے تھے۔ 1946ء میں جب وہ کیمبرج آئے تو اس وقت انہیں اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ کرنا تھا کہ آیا وہ ایم-اے انگلش کے لئے داخلہ لیں یا ریاضی کے لئے۔ یہ ایک فیصلہ تھا' جس سے ہم سب متاثر ہوئے۔ یہ نہ صرف فزکس بلکہ امپیریل کالج کی خوش قسمتی تھی کہ انہوں نے ریاضی پڑھنے کا فیصلہ کیا۔"

اپنے صدارتی خطاب کو جاری رکھتے ہوئے بھائی جان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر شاندار طریقہ سے روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر بلیکٹ نے کہا:

"1955ء میں ایٹم برائے امن کانفرنس جو جنیوا میں منعقد ہوئی تھی' آپ اس کے سائنسی سیکرٹریوں میں سے ایک تھے۔ آپ نے وہاں اپنی خداداد انتظامی صلاحیتوں کا بہترین مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا لوہا منوایا تھا۔ تھیورٹیکل فزکس میں سلام کا تحقیقی کام بنیادی طور پر Abstract قسم کا ہے' جس کا تعلق اصولاً کوانٹم تھیوری آف فیلڈز سے ہے۔ یہ ایک مضمون ہے' جس کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ میں اسے کبھی سمجھ بھی نہیں سکوں گا۔ حال ہی میں وہ بنیادی ذرات کے مضمون کی طرف آئے ہیں۔ یہ مضمون میرا جانا پہچانا ہے۔ مجھے اور انگلینڈ کے دوسرے حصوں میں بلکہ ساری دنیا میں میرے نوجوان ساتھیوں کو اس مضمون سے گہرا لگاؤ ہے اور آج اسی مضمون پر آپ اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے۔"

پروفیسر بلیکٹ کے تعارفی خطاب کے بعد بھائی جان نے بنیادی ذرات پر لیکچر دیا جس کے دوران سلائیڈز کی مدد سے اور تختہ سیاہ پر وہ اپنے نقطہ نظر کی وضاحتیں کرتے رہے' لیکچر کے دوران وہاں مکمل خاموشی چھائی رہی۔

بھائی جان نے اپنا لیکچر مندرجہ ذیل آیت پڑھ کر ختم کیا۔

ترجمہ: "تو رحمٰن (خدا) کی پیدائش میں کوئی رخنہ نہیں دیکھتا اور تو اپنی آنکھ کو (ادھر اُدھر) پھیر کر اچھی طرح سے دیکھ لے' کیا تجھے (خدا) کی مخلوق میں کسی جگہ بھی کوئی رخنہ نظر آتا ہے؟ پھر بار بار اپنی نظر کو چکر دے وہ آخر تیری طرف ناکام ہو کر لوٹ آئے گی اور وہ تھکی ہوئی ہوگی۔ (اور کوئی رخنہ نظر نہیں آئے گا۔)

الملک: 5:4

جیسے ہی ان کا لیکچر ختم ہوا تھیٹر میں موجود تمام حاضرین نے کھڑے ہو کر تالیاں بجا کر انہیں داد دی۔ ڈاکٹر سجاد احمد جو لاہور میں آنکھوں کے ماہر ہیں اور بھائی جان کے دوست' وہ بھی یہ لیکچر سننے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بعد میں بتایا کہ پورے پانچ منٹ تک تالیاں بجائیں گیں جو ان کے خیال میں ایک ریکارڈ تھا۔

ایک مرتبہ پاکستان کا دورہ کرتے ہوئے پروفیسر بلیکٹ نے بتایا تھا کہ "امپیریل کالج میں انہوں نے اس سے زیادہ فصیح لیکچر نہیں سنا تھا۔"

بھائی جان کے نئے نظریات نے امپیریل کالج میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ان کی اعلیٰ کارکردگی اور مسحور کن شخصیت کی بدولت امپیریل کالج نہ صرف برطانیہ بلکہ پورے یورپ میں ہائی انرجی تھیورٹیکل فزکس کے لئے کام کرنے کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ جس میں امریکہ سمیت دنیا کے مختلف ممالک سے ذہین ماہرین طبیعات اس ادارے کی طرف کھنچے چلے آنے لگے۔

اپنے ساتھی سائنس دان کے ساتھ بحث مباحثہ میں وہ مسلسل نئے نظریات پر نظریات پیش کرتے جاتے اور جب ان کی کسی بات کو درست تسلیم کر لیا جاتا تو وہ فاتحانہ انداز میں کہتے: "دیکھا میں نے ایسا پہلے نہیں کیا تھا؟" وہ تحقیقی مقالے حیرت انگیز تیزی کے ساتھ شائع کرواتے رہے۔ کسی نئے تخیل یا نظریے پر آدھی رات کو فون کر کے اپنے ساتھی سائنس دانوں کو جگا دیا کرتے تھے۔

امپیریل کالج کے پہلے آٹھ برسوں 1957-1964ء تک انہوں نے قریباً پچاس تحقیقی مقالے بین الاقوامی معیاری سائنسی جرائد میں شائع کرائے۔ (1943ء میں جب ان کا پہلا مقالہ شائع ہوا تھا تو اس وقت وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں تھرڈ ایئر کے طالب علم تھے) 1993ء تک ان کے کل دو سو چھتر (276) سائنسی مقالے شائع ہوئے۔ امپیریل کالج میں ان کے زیر نگرانی پچاس سے زائد طلباء نے پی-ایچ-ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ جن میں چند پاکستانی بھی ہیں۔ آپ کے ایک ہونہار طالب علم ڈاکٹر غلام مرتضٰی

قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں ڈین فیکلٹی آف نیچرل سائنسز ہیں علاوہ ازیں آپ کے ایک شاگرد نے نوبل انعام بھی حاصل کیا۔

امپیریل کالج میں انتھک محنت کرنے کے علاوہ آپ مسلسل پاکستان میں تعلیم، سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے فروغ کے لئے کوشاں رہے۔ 1957ء میں جب بقول ان کے پاکستان نے انہیں "دوبارہ دریافت کیا" تو اس وقت سے لے کر1990ء تک آپ باقاعدگی سے پاکستان تشریف لاتے رہے اور مندرجہ ذیل اداروں کے ذریعے وطن عزیز کی خدمت میں کوشاں رہے۔

- ممبرپاکستان ایٹمی توانائی کمشن 1958-1974ء
- ممبرپاکستان سائنٹیفک کمشن 1959ء
- مشیر تعلیم 1959ء
- صدر پاکستان ایسوسی ایشن برائے فروغ سائنس 1959ء
- بانی صدر بالائی فضا کا تحقیقی ادارہ 1961-1964ء
- پاکستان کے دو صدور اور ایک وزیر اعظم کے اعزازی سائنسی مشیر اعلیٰ۔ 1961-1974
- ممبر نیشنل سائنس کونسل 1963-1975ء
- ممبربورڈ آف پاکستان سائنس فاؤنڈیشن 1973-1977ء

1964ء تک بھائی جان نے ایک عقبری کی حیثیت سے شہرت حاصل کرلی تھی، وہ دنیا کی قدر آور سائنسی شخصیات میں پہلے پاکستانی تھے جو اس بلند و بالا مقام پر پہنچے تھے۔ اپنے گراں قدر تحقیقی کاموں جن کی ابتداء ویک انٹرایکشن پر بنیادی کام سے شروع ہوئی کی بنیاد پر 33 سال کی عمر میں 1959ء میں رائل سوسائٹی نے انہیں اپنا فیلو منتخب کیا۔ رائل سوسائٹی دنیا کی ایک عظیم سائنسی تنظیم سمجھی جاتی ہے۔ آپ رائل سوسائٹی کے سب سے کم عمر فیلو تھے، آپ پہلے پاکستانی اور مسلمان تھے جنہیں اس اعزاز سے نوازا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ اس اعزاز کے ملنے کے فوراً بعد 1959ء میں جب آپ پاکستان تشریف لائے تو میں انہیں خوش آمدید کہنے کے لئے کراچی کے ہوائی اڈہ پر گیا۔ وہاں انہوں نے اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ اب وہ یہ کوشش کریں گے کہ ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی کو بھی رائل سوسائٹی کا فیلو منتخب کرائیں۔ چنانچہ ان کی جدوجہد سے ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی کو رائل سوسائٹی کا فیلو منتخب کرلیا گیا۔

یاد رہے کہ نئے فیلو کے انتخاب کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ کم از کم دو فیلو اس کا نام تجویز کریں۔

بھائی جان کے پیریٹی کے بگاڑ پر کام کو سب سے پہلے ان کی کیمبرج یونیورسٹی نے 1957-58ء میں انہیں فزکس میں بہترین کام کرنے پر ہوپکنز (Hopkins) پرائز دیا اور کیمبرج یونیورسٹی نے ہی 1958ء میں ایڈمز (Adams) پرائز دیا۔ 1961ء میں برطانیہ کی سب سے بڑی سائنسی سوسائٹی یعنی فزیکل سوسائٹی نے پہلا میکسویل میڈل دیا۔ 1964ء میں رائل سوسائٹی جو دنیا کی بے حد معزز اور سب سے

پرانی سائنسی سوسائٹی شمار ہوتی ہے' نے بھائی جان کو ہیوز میڈل (Hughes) سے نوازا۔ یہاں "نیچر" جو برطانیہ کا مشہور سائنسی جریدہ ہے کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ یہ 19 دسمبر 1964ء کو شائع ہوا تھا' جب رائل سوسائٹی کے صدر نے بھائی جان کو ان کی کوانٹم میکنکس اور اساسی ذرات کی تھیوری پر قابل قدر کارکردگی کے صلے میں ہیوز میڈل سے نواز تھا۔

"ہیوز میڈل' پروفیسر اے سلام' ایف-آر-ایس۔"

دنیا میں بہت کم ماہرین طبعیات ایسے ہیں جنھوں نے نت نئے اور تحیر کن نظریات کا بہاؤ اس زرخیز ذہنی تسلسل کے ساتھ جاری کر رکھا ہو گا جس طرح ڈاکٹر عبدالسلام گزشتہ تیرہ برسوں سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ 1951ء میں شائع ہونے والا ان کا پی-ایچ-ڈی کا مقالہ Renormalization Theory میں ایک اساسی کام تھا' جس کی بدولت انہیں بڑے بلند درجے کی شہرت نصیب ہوئی' بعد میں آنے والے دو مواقع پر انہوں نے بنیادی ذرات کی تھیوری کے سلسلے میں قابل قدر تحقیقاتی خدمات انجام دیں۔

1957ء میں سلام نے پریٹی وائلیشن اور نیوٹرینو کی صفر کمیت کے درمیان ایک گہرے اور قریبی تعلق کو ثابت کیا۔ یہ تھیوری بڑی تعداد میں نیوٹرینو خصوصیات اور اس طریقے کی جس میں پیریٹی نیوٹرینو باہمہ گیر اعمال (تفاعل) میں بگڑ جاتی ہے کی پیشین گوئیاں کرتی ہے اور یہ سب کچھ تجربات سے صحیح ثابت ہو چکا ہے۔ 1961ء میں سلام نے جے سی وارڈ کی معاونت میں یہ تجویز پیش کی کہ بنیادی ذرات کے سٹرانگ انٹرایکشن پر یونیٹری سمٹری لاگو ہونی چاہیے۔

اس کے یہ معنی ہوئے کہ ذرات اور ذرات نما (Reso nances) کو ایک ہی اسپن اور پیریٹی کے سپر ملٹی پلٹ (Supermultiplets) کے تحت آنا چاہیے۔ خصوصاً سلام اور وارڈ نے سپن میزان کے ہشت پہلو کے بارے میں پیشین گوئی کی تھی' جن کا سٹرانگ انٹرایکشن میں وہی رول ہے جو برقی مقناطیس انٹرایکشن میں فوٹان کا۔ یہ سارے کے سارے میزان (Mesons) اب دریافت کئے جا چکے ہیں اور (Omcga-minus) کی دریافت کے بعد یہ نظریہ بنیادی طور پر مصدقہ قرار دیا جا چکا ہے۔

یہ دونوں کام جو دس سال کی طویل جدوجہد کے بعد انجام پائے طبعیات کے بنیادی کاموں میں سے ہیں۔ اس عرصہ میں سلام نے سو تحقیقی مقالے شائع کروائے اور ساتھ ہی اپنے مضمون کی تیزی سے آگے بڑھتی ہوئی سرحد پر سب سے آگے اپنی جگہ برقرار رکھی۔"

بھائی جان کے پیریٹی وائلیشن اور یونیٹری سمٹری کے کاموں کو سویڈن کی سائنس کمیونٹی نے بھی سراہا۔ اس کا باضابطہ اعتراف 1970ء میں انہیں رائل سویڈش اکیڈمی آف سائنس کا فیلو منتخب کر کے کیا۔

مارچ 1971ء میں روس کی اکیڈمی آف سائنس نے بھائی جان کو اپنی اکیڈمی کا فارن ممبر منتخب کیا۔ اس سلسلہ میں روسی اکیڈمی آف سائنس کے صدر اور سیکرٹری کی طرف سے مندرجہ ذیل تار انہیں موصول ہوا۔

"یو-ایس-ایس-آر اکیڈمی آف سائنس کی جنرل اسمبلی نے 3 مارچ 1971ء کو اپنے سالانہ سیشن کے موقع پر آپ کو اکیڈمی کا فارن ممبر منتخب کیا ہے۔ جنرل اسمبلی کی طرف سے ہم انتہائی دوستانہ اور مخلصانہ طور پر آپ کو مبارک باد دیتے ہیں اور آپ کی اچھی صحت اور تخلیقی کاموں میں اعلیٰ درجہ کی کامیابیوں اور کامرانیوں کی دعا کرتے ہیں۔"

اس کے فوراً بعد ہی دوسری سپرپاور کے سائنس دانوں نے بھائی جان کی قدر افزائی کی چنانچہ امریکن اکیڈمی آف سائنس اینڈ آرٹس کے سیکرٹری نے 12 مئی 1971ء کو بھائی جان کو یہ خط لکھا:

"اس لفافہ میں امریکن اکیڈمی آف سائنس اینڈ آرٹس کے فارن اعزازی ممبر کی حیثیت سے آپ کے انتخاب کا رسمی نوٹیفکیشن ہے' میں کونسل کی طرف سے آپ کو اس انتخاب پر مباک باد پیش کرتا ہوں اور آپ کی ممبرشپ کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

اکیڈمی کے دو ہزار فیلوز ہر سال غیر ممالک کے شہریوں میں سے فارن اعزازی ممبروں کی ایک قلیل تعداد کا انتخاب کرتے ہیں جو اپنی دریافتوں اور دیگر کارناموں کے سلسلے میں دنیا سے اپنی حیثیت منوا چکے ہوتے ہیں۔"

میامی یونیورسٹی (امریکہ) نے بھائی جان کو یونیورسٹی آف میامی سنٹر فار تھیورٹیکل فزکس کی طرف سے جے رابرٹ اوپن ہائیمر میموریل پرائز کے لئے منتخب کیا' جس کا آغاز 1969ء سے ہوا تھا اور جسے ہر سال اپنے میدانوں میں شاندار کارکردگی دکھانے والے سائنس دان کو دیا جاتا ہے۔

میامی یونیورسٹی کی بارہ رکنی سائنس کونسل نے اپنے نیوز بیورو کے مطابق بھائی جان کو ان کی کوانٹم الیکٹروڈائینمکس اور فزکس آف ایلیمنٹری پارٹیکلس خصوصاً ویک انٹرایکشن میں پیریٹی کے بگاڑ کی دو اجزائی نیوٹرینو تھیوری اور بنیادی ذرات کی سمرٹی کی خصوصیات پر قابل قدر کام انجام دینے پر سائنس کونسل کا ممبر چن لیا۔"

میامی کونسل میامی یونیورسٹی کے چھ نمائندوں کے علاوہ مندرجہ ذیل نیشنل نمائندہ پر مشتمل ہے۔ پروفیسر ملیکن یونیورسٹی آف شکاگو' ڈاکٹر جیرالڈ ایڈلمین راکفیلر یونیورسٹی' ڈاکٹر موریس گولڈ ہاربر بروک ہیون نیشنل لیبارٹری' پروفیسر لارس اونسیگر ژیل یونیورسٹی پروفیسر جولین شونگر' ہارورڈ یونیورسٹی اور پروفیسر ایڈورڈ ٹیلر یونیورسٹی آف کیلی فورنیا لیور مور۔

امپیریل کالج میں اپنی درس و تدریس اور پاکستان میں سائنس کے فروغ کے کاموں کے علاوہ 1960ء سے بھائی جان ترقی پذیر ممالک میں لائق اور قابل ماہرین طبیعات کے بن ماس کا مسئلہ دور کرنے کے لئے ایک مثالی سنٹر فار تھیورٹیکل فزکس کے قیام کے سلسلہ میں کوشاں رہے جو بالاخر ان کی شب و روز محنت و لگن سے 1964ء میں اٹلی کے شہر ٹریسٹ میں قائم کیا گیا۔ اس کی تفصیلات الگ دی جائیں گی۔

خرابی صحت کی وجہ سے بھائی جان 1993ء میں امپیریل کالج کی ملازمت سے ریٹائر ہو گئے تھے۔

8

صدر پاکستان کا بھائی جان کو سائنسی مشیر اعلیٰ مقرر کرنا اور پاکستان میں سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کے لئے ان کی کاوشیں

پاکستان میں سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی بہت حد تک بھائی جان کی خداداد فراست' تدبر اور ان کے ذاتی اثر و رسوخ کی مرہون منت ہے۔

پاکستان میں سائنس کی نشوونما کے لئے وہ اس دن سے ہی سرگرم عمل ہو گئے تھے' جب 1955ء میں جنیوا میں اقوام متحدہ کے تحت منعقد ہونے والی پہلی ایٹمی توانائی کانفرنس برائے امن میں انہیں پاکستانی وفد میں شامل کیا گیا تھا' وہ اس وفد کے سب سے زیادہ فعال ممبر تھے۔ اُس کانفرنس کے لئے جو سائنٹیفک سیکرٹری مقرر کئے گئے تھے' وہ ان میں سے ایک تھے اور یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا جو نہ صرف پاکستان بلکہ خود بھائی جان کے حصہ میں آیا۔ اس وقت ان کی عمر 29 سال تھی۔

اس وقت بھی پاکستان میں نیوکلیر توانائی برائے امن کی ترقی ان کو بہت عزیز تھی۔ اسی وجہ سے انہوں نے حکومت پاکستان کو مشورہ دیا کہ اس کا وفد پاکستان میں نیوکلیر پاور کے نشوونما کے لئے ایک منصوبہ بنا کر اپنے ہمراہ لائے۔ چنانچہ اس کانفرنس کے دوران بھائی جان نے پاکستان کے وفد کی ملاقات سر جان کاکروفٹ (Sir John Crockroft) جو ہارویل (Harrwell) انگلینڈ میں ایٹمی ریسرچ کے ادارہ کے ڈائریکٹر تھے' سے کرائی (سر جان کاکروفٹ کو 1951ء میں فزکس کا نوبل انعام دیا گیا تھا) اس ملاقات کا مقصد پاکستان کے لئے ایٹمی توانائی کے پر امن استعمال کے لئے ذرائع اور وسائل کی تلاش تھی۔ اس کانفرنس میں شمولیت کے بعد پاکستانی وفد (جس کے بھائی جان بھی ممبر تھے) نے حکومت پاکستان کو ایک رپورٹ کے ذریعے سفارش کی کہ وہ ملک میں ایک نیوکلیر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور ایک ریسرچ ری ایکٹر کی تعمیر کے علاوہ زراعت' میڈیسن صحت (ہیلتھ) میں ریسرچ کے لئے نیوکلیر آئی سوٹوپ (Istop) کی لیبارٹری بھی تعمیر کی جائے۔ اس رپورٹ میں یہ تجویز بھی دی گئی تھی کہ ریسرچ ری ایکٹر کے بعد نیوکلیر پاور پلانٹ کی تعمیر کا منصوبہ تیار کرنا چاہیے۔

جنیوا میں اس کانفرنس کے انعقاد کے بعد پاکستان نے ایک مرتبہ پھر بھائی جان کو فراموش کر دیا' مگر اگست 1957ء میں روزنامہ "پاکستان ٹائمز لاہور" میں ان کے بارے میں ایک مفصل مضمون شائع ہونے کے بعد بقول بھائی جان:

"I was rediscovered by Pakistan"

(یعنی پاکستان نے مجھے دوبارہ دریافت کیا) اُس مضمون کے شائع ہونے کے نتیجے میں پنجاب یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی ڈگری دی۔ (یہ ڈگری دسمبر 1957ء میں دی گئی تھی) اس کے علاوہ آل پاکستان سائنس کانفرنسوں میں بھی انہیں مدعو کیا جانے لگا۔ چنانچہ 1958ء میں کراچی یونیورسٹی میں منعقد ہونے والی آل پاکستان سائنس کانفرنس میں انہوں نے شرکت کی۔ اُس سائنس کانفرنس کا افتتاح صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان نے کیا تھا۔ اسی موقع پر وہ صدر پاکستان سے پہلی مرتبہ ملے تھے۔ اس ملاقات میں صدر پاکستان نے بھائی جان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے معاملات میں حکومت پاکستان کو اپنے مشوروں سے نوازیں۔ اس ملاقات کے بعد انہیں ایجوکیشن کمیشن کا مشیر اور سائنٹیفک کمیشن کا ممبر نامزد کیا گیا۔

انہی دنوں حکومت پاکستان نے ایٹمی توانائی کا محکمہ بنایا تھا۔ بعد میں اس کا نام پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن (PAEC) رکھا گیا۔ ڈاکٹر نذیر احمد جو ایک نباتاتی سائنسدان تھے۔ (Botanist) اور کاٹن کمیشن کے چیئر مین رہ چکے تھے کو اس نئے محکمہ کا چیئر مین مقرر کیا گیا۔ بھائی جان کو اس کمیشن کا جزوقتی ممبر نامزد کیا گیا۔ وہ اس عہدہ پر 1974ء تک کام کرتے رہے۔

اگست 1959ء میں صدر پاکستان محمد ایوب خان نے سائنٹیفک کمیشن کے پہلے اجلاس میں اپنی افتتاحی تقریر میں کہا: ".....اور آخر میں مجھے یہ کہتے ہوئے بے حد مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ میں پروفیسر عبدالسلام کو یہاں اپنے ہم وطنوں میں دیکھ رہا ہوں۔ انہوں نے اتنی کم عمری میں سائنس کے میدان میں جو تحیر خیز کارنامے انجام دیئے ہیں' وہ سب کے لئے انتہائی فخر کا باعث ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی وابستگی سے کمیشن کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔"

دسمبر 1959ء میں کراچی میں گیارہویں آل پاکستان سائنس کانفرنس منعقد ہوئی' جس کا افتتاح صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان نے کیا تھا۔ بھائی جان نے بھی اس سائنس کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ ان کا ایک لیکچر ڈو میڈیکل کالج کے ہال میں ہوا تھا' جو سامعین سے بھرا ہوا تھا اور اس میں تل دھرنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ ان کے لیکچر کا موضوع "بنیادی ذرات" تھا۔ انہوں نے اپنے لیکچر کے دوران سلائیڈز دکھائیں اور اپنا نقطہ نگاہ تختہ سیاہ پر بھی سمجھایا۔ اپنے لیکچر کے دوران ایک موقع پر انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا: Dirac's Neutrino is the real devil یعنی ڈیراک کا نیوٹرینو ہی اصل شیطان ہے۔ یہ سن کر حاضرین نے ایک قہقہہ بلند کیا جس سے سنجیدہ محفل کشت زعفران بن گئی۔

مجھے بھی اس لیکچر کو سننے کا موقع ملا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں تو وہاں اس لئے موجود تھا کہ میرے بھائی لیکچر دے رہے تھے۔ (میرے پلے تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں پڑی تھی) ہال کی پہلی قطار میں میرے سامنے ایک ادھیڑ عمر کے بزرگ تشریف فرما تھے اور وہ بھائی جان کو بڑھ چڑھ کر داد دے رہے تھے۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ انہیں سارا لیکچر سمجھ آ رہا ہے اور وہ اس سے لطف اٹھا رہے ہوں۔ بھائی جان کی نگاہ ان پر پڑ گئی

تو اپنے لیکچر کے بعد انہوں نے ان صاحب کو اپنے پاس بلایا اور ان سے اپنا تعارف کرانے کے لئے کہا۔ انہوں نے بھائی جان کو بتایا کہ ان کا نام ڈاکٹر عشرت حسین عثمانی ہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ ”میں نے 1937ء میں امپیریل کالج لندن سے فزکس میں پی-ایچ-ڈی کی ڈگری لی تھی۔ ڈاکٹر تھامسن پی-ایچ-ڈی کے لئے میرے نگران تھے۔ (ڈاکٹر تھامسن کو 1937ء میں فزکس کا نوبل انعام دیا گیا۔) پھر میں نے سول سروس میں ملازمت کر لی۔ تقسیم ہند کے بعد میں پاکستان آگیا' اب میں حکومت پاکستان میں بطور چیف کنٹرولر آف امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ کام کر رہا ہوں۔“ اس تعارف سے بھائی جان بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے ڈاکٹر عثمانی صاحب سے ایک تفصیلی ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس ملاقات کا موقع اتفاقاً یوں پیدا ہو گیا کہ بھائی جان کراچی سے ملتان (وہ اپنی ہمشیرگان اور بھائی سے ملنے کے لئے ملتان جا رہے تھے) کے لئے ریل گاڑی سے سفر کر رہے تھے اور ڈاکٹر عثمانی بھی اسی ریل گاڑی سے لاہور جا رہے تھے۔ چنانچہ اس سفر کے دوران بھائی جان نے ڈاکٹر عثمانی سے پوچھا کہ کیا وہ پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن میں کام کرنا پسند کریں گے۔ ڈاکٹر عثمانی نے کہا کہ وہ سوچ کر جواب دیں گے۔ چند دنوں بعد انہوں نے بھائی جان سے پھر ملاقات کی اور مشروط طور پر کمیشن میں کام کرنے کی رضامندی ظاہر کی۔ ان کی شرط یہ تھی کہ ڈاکٹر نذیر احمد کے ریٹائر ہونے کے بعد انہیں اگر چیئرمین بنایا جائے تو انہیں یہ پیش کش منظور ہے۔ چنانچہ بھائی جان نے صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان سے اس معاملہ پر بات کی تو انہوں نے بھائی جان کے مشورہ کو منظور کرتے ہوئے پہلے ڈاکٹر عثمانی کو پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کا ممبر نامزد کیا اور پھر ڈاکٹر نذیر احمد کی ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں کمیشن کا چیئرمین مقرر کر دیا۔ پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کے موجودہ چیئرمین ڈاکٹر اشفاق احمد نے بھائی جان کے بارے میں اپنے ایک مضمون جو کمیشن کے جریدہ ”دی نیوکلس“ جلد 33 شمارہ (1-2) 1996 کے صفحہ ایک پر لکھا:

A Vital Contribution of Prof Salam was Induction of Dr.I.H. Usmani as a Member of the Atomic Energy Commission and later its Chairman."

ترجمہ: پروفیسر سلام کا سب سے اہم کام ڈاکٹر آئی-ایچ عثمانی کو پہلے اٹامک انرجی کمیشن کا ممبر اور بعد میں اس کا چیئرمین مقرر کرانا تھا۔“

اس طرح ڈاکٹر عثمانی اور بھائی جان کے درمیان ایک مثالی دوستی کی بنیاد کا آغاز ہوا۔ ان دونوں نے مل کر پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کو دنیا کے نقشے پر لا کھڑا کیا۔

1958ء میں ایٹمی توانائی کمیشن اور سائنٹیفک کمیشن کا ممبر بننے کے بعد بھائی جان نے پاکستان میں سائنس کی تنظیم خصوصاً سائنسدانوں کو تربیت دینے اور سائنس کی ترویج و ترقی کی کوششوں کو تیز تر کر دیا۔ انہوں نے جس کام کو اولیت دی وہ سائنسدانوں اور سائنس سے متعلقہ انجینئروں اور ٹیکنیشنوں کی

بیرون ملک اعلیٰ تعلیم تھی۔ انہوں وفاقی سیکرٹری تعلیم ایس-ایم شریف جنہیں وہ اپنے طالب علمی اور گورنمنٹ کالج میں ملازمت کے دنوں سے جانتے تھے کو اس امر پر رضامند کر لیا کہ حکومت طبیعات میں پوسٹ گریجویٹ کی تعلیم کے لئے لائق اور ذہین طلبا کو وظائف دینے کے لئے فنڈز مہیا کرے۔ اسی سکیم کی بدولت ان کے ہونہار شاگرد ریاض الدین اور ان کے بھائی فیاض الدین اور چند دیگر قابل طالب علموں نے برطانیہ اور دوسرے ممالک سے فزکس میں پی-ایچ-ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر عثمانی اور بھائی جان نے ایٹمی توانائی کمیشن کے سائنسدانوں، نیوکلیائی انجینئروں، ریاضی دانوں، زراعت، بیالوجی وغیرہ میں بیرون ممالک تعلیم و تربیت کے لئے ایک وسیع اور جامع پروگرام مرتب کیا۔ بھائی جان نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے بہت سے غیر ممالک سے فنڈز اور گرانٹس (Grants) حاصل کیں، جن سے ایٹمی توانائی کمیشن کے تقریباً پانچ صد نوجوانوں کو اپنی اپنی فیلڈ میں پی-ایچ-ڈی وغیرہ کی ڈگریوں کے لئے بھجوایا۔ بعد میں وہی نوجوان کمیشن کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے، بلکہ ابھی بھی اپنے کاموں میں سرگرم عمل ہیں۔ یوں بھائی جان نے Development of human resources کا ایسا کام کیا جسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ اس بارے میں ڈاکٹر اشفاق احمد (1998ء) چیئرمین پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن نے اپنے مضمون

Prof. Salam Contribution in the Development of Science and Technology in Pakistan.

(پاکستان میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے لئے پروفیسر سلام کی خدمات)
میں تحریر کیا:

"One of the first action of Dr. Usmani as Chairman was to plan for sending out about 500 physicists, mathematicians, health scientists and biologist abroad. Salam helped Dr. Umani not only in the formulation of this plan but also in its execution by helping in the placement of these scientists and engineers at the best academic institution in the US and UK."

(THe Nucleus Vol 33 No (1-2), 1996 Page 2)

ترجمہ: "ڈاکٹر عثمانی نے چیئرمین مقرر ہونے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ انہوں نے تقریباً پانچ صد طبیعات دانوں، ریاضی دانوں، ہیلتھ سائنس دانوں اور بیالوجسٹوں کو بیرون ممالک بھجوانے کا پروگرام مرتب کیا۔ سلام (صاحب) نے ڈاکٹر عثمانی کی اس کام میں نہ صرف معاونت کی بلکہ انہوں (سلام صاحب) نے اس پروگرام کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ان تمام سائنسدانوں اور انجینئروں کو یو-ایس اور یو-کے کی بہترین علمی درسگاہوں میں داخلے دلائے۔"

ایسا سب کچھ اس لئے کیا گیا کہ بھائی جان کو اس بات کا بخوبی علم اور تجربہ تھا کہ سائنس دانوں کی کمی کا اصل سبب یہ ہے کہ پاکستان میں ان کا مستقبل ابھی تک غیر یقینی سمجھا جاتا ہے' وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس مسئلہ کے حل تک پہنچنے کے لئے حکومت کے پاس کوئی جامع منصوبہ نہیں ہے۔ اسی لئے وہ سائنس دانوں کو تحفظ دینے اور سائنس کو فروغ دینے میں ناکام رہی تھی۔ ان کے خیال میں اس کا حل یہ تھا کہ یونیورسٹیوں کو تحقیقی کام کے لئے فنڈز دیئے جائیں اور سائنسدانوں کو بیرون ملک تربیت دی جائے۔ (مئی 1998ء میں پاکستان کا نیوکلیر دھماکہ انہیں سائنس دانوں اور انجینئروں کی بدولت ہوا' جنہیں بھائی جان نے بیرونی ممالک سے تعلیم تربیت دلوائی تھی۔)

سوشل سائنسز کے میدان میں بھائی جان کا عظیم الشان کارنامہ ان کا وہ صدارتی خطبہ تھا جو انہوں نے 11 جنوری 1961ء کو ڈھاکہ میں آل پاکستان سائنس کانفرنس کی تیرھویں سالانہ اجلاس کے موقعہ پر دیا' ان کی تقریر کا موضوع تھا: ''ٹیکنالوجی اور پاکستان کا غربت پر حملہ۔'' یہ موضوع اب تک (چھتیس سال بعد بھی) پاکستان کے لئے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اپنے اس جامع خطاب میں انہوں نے ترقی کے اقتصادی قوانین کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس امر پر زور دیا کہ پاکستان کو اپنے لاکھوں کروڑوں عوام کی جڑوں میں انتہائی گہرائی تک پہنچی ہوئی غربت کو جڑ سے اکھاڑنے کے لئے ان قواعد و قوانین کو اختیار کر لینا چاہیے۔

بھائی جان کے اس خطاب سے چند اہم اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں: (یہ خطاب انگریزی میں تھا) ترجمہ:

''میں آج کے خطاب میں اس سائنسی میدان کے بارے میں کچھ باتیں عرض کرتا' جس میں مجھے کام کرنے کا موقع ملا۔ یعنی بنیادی ذرات۔ یہ وہ اساسی اجزاء ہیں جن سے مادہ تشکیل پاتا ہے اور انہی سے کائنات کی تمام توانائی بنتی ہے۔ میں آپ کے ساتھ مل کر اپنے علم اور اپنی لاعلمی کی سرحدوں کا تعین کرتا اور آپ کو بعض طبیعات دانوں کے ان تصورات کے بارے میں بتاتا جو انہوں نے خدا کے بنائے ہوئے نظام کو سمجھنے میں تخلیق کئے ہیں۔ میں آپ کو یہ بھی بتاتا کہ باوجود کم علمیت کے ایک طبیعات دان میں ایک صوفی کے اوصاف کے ساتھ ساتھ اس میں ایک فنکار کی زود حسی بھی ہوتی ہے مگر میں کوئی ایسی بات نہیں کروں گا۔ بنیادی ذرات پر بات کرنے کی بجائے میں ٹیکنالوجی اور پاکستان میں غربت دور کرنے کے لئے اس کی جنگ کے عمومی موضوع پر بات کروں گا۔

ہم پاکستانی غریب قوم ہیں۔ نسل انسانی کی طرح غربت ہمارا سب سے بڑا اور اہم مسئلہ ہے۔ یہ دنیا کے سو ممالک میں رہنے والے ایک ارب باشندوں کا اور ہمارا مشترکہ مسئلہ ہے۔ پاکستان میں ہم کھانے والے کوئی پچاس فیصد ہیں۔ ان میں سے پچھتّر فیصد ایک روپے سے بھی کم کماتے ہیں جب کہ اس کے مقابلے میں کوئی چالیس کروڑ لوگ شمالی امریکہ اور یورپ میں آباد ہیں۔ ان کی آمدنی پندرہ روپے روزانہ ہے۔ اس بات کو ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے کہ دولت کی یہ غیر یکساں تقسیم کوئی زیادہ پرانا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ماضی قریب کی پیداوار ہے۔ اب سے تین سو پچاس سال قبل اکبر کے ہندوستان' شاہ عباس کے ایران اور انگلینڈ کی ملکہ الزبتھ

اول کے ادوار میں اگر معیار زندگی کا موازنہ کریں تو اس میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ پھر جلد ہی یورپ میں زراعت اور صنعت میں ترقی شروع ہو گئی جس سے خوشحالی پیدا ہوئی۔ یہ سائنسی علم پر دسترس کا نتیجہ تھا۔
اقتصادی افزائش کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے ہنرمندی اور سرمایہ کی فراہمی دو بنیادی شرائط ہیں۔ پچھلی دو صدیوں میں دوسری اقوام نے انہیں سے کامیابیاں حاصل کرتے ہوئے اپنے تجربوں کے مخصوص نقوش چھوڑے ہیں۔ ان میں سے برطانیہ' جاپان' روس اور چین میں تجربات ہوئے جن کی وجہ سے بڑی واضح ترقی نظر آتی ہے۔ برطانیہ پہلا ملک تھا' جس نے یہ ثابت کیا کہ اگر ہنرمندی اور سرمایہ موجود ہوں تو غربت کی فصیلوں کو توڑا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد جاپانیوں نے ثابت کیا کہ ٹیکنالوجی کی ترسیل و حصول ممکن ہے اور اسے سیکھنا اور حاصل کرنا مشکل نہیں۔ جاپانیوں کے تجربے نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ ٹیکنالوجیکل استعداد کوئی موروثی خصوصیت نہیں۔ جو قوم چاہے اسے نہایت تیزی سے حاصل کر سکتی ہے۔ تیسرا اہم سبق روس نے سکھایا۔ اس نے یہ ثابت کیا کہ ترقی و افزائش (Growth) کو استوار کرنے کے لئے ایک صدی یا اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ دور کا ایسا منظر ہے جو ایک آدمی کی زندگی میں دوربینی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے' بشرطیکہ بھاری صنعت کو فوقیت دی جائے اور پھر سب سے آخر میں چین کا تجربہ ہے کہ سستی مزدوری خود اپنے طور پر ایک سرمایہ ہے۔"

اپنے خطاب میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "ان کی خوشحالی معاشرتی تنظیم کی بدولت ہے' جہاں سائنسی علوم کو قومی پیداوار میں اضافے کے لئے بھرپور استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ خوشحالی اس امید کا شگون ہے۔ اس امید کا کہ ہم اس قسم کے طریقہ کو استعمال کر کے پاکستان میں بھی ایسی خوشحالی اور خود کفالت لا سکتے ہیں۔"

"اس مختصر خلاصہ کے بعد آیئے اب پاکستان کی صورت حال میں حقیقتوں کا مطالعہ کریں۔ ہماری غربت کے حقائق خاصے واضح ہیں۔ لہٰذا میں ان کو بیان کرنے میں الفاظ ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ آپ کسی گلی محلے میں نکل جائیں۔ آپ اسے اپنے اردگرد پھیلا ہوا دیکھیں گے۔ میرا اشارہ ان نظر آنے والے بے گھر لوگوں اور ضرورت مندوں کی طرف نہیں ہے۔ میرے ذہن میں اس وقت کروڑوں لوگ ہیں جو اپنی دبی ہوئی بھوک کا گلہ بھی نہیں کرتے۔ وہ کروڑوں لوگ جن کے سامنے یہ سوال کئی بار اٹھتا ہے کہ وہ ایک وقت کا کھانا کھا لیں یا اپنے بچے کے لئے کتاب خرید لیں۔ ہماری غربت سے نہ صرف مادی بلکہ روحانی مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

كَادَ الْفَقْرُ اَنْ تَكُوْنَ كُفْراً

"مفلسی کفر کے مترادف ہے۔" (جامع الصغیر السیوطی" زیر لفظ "ک")

"مجھے اجازت دیجئے کہ پورے جوش و خروش کے ساتھ کہوں کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان پاکستان کی ہر مذہبی درس گاہ کے دروازہ پر روشن حروف میں لکھ دیا جائے۔ کفر کو پرکھنے کے اور

بھی بہت سے پیمانے ہوں گے لیکن اس صدی میں میرے ناچیز خیال میں کفر کا معیاری پیمانہ غربت کو بغیر قومی سطح پر جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کسی کوشش کے خاموشی سے سہتے چلے جانا ہے۔"

"اب جب ہم 1961ء میں اپنی پچھلی ترقی کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے کہ ہم اتنے عرصہ سے اپنے درمیان غربت و افلاس کو بڑی خاموشی سے برداشت کرتے چلے آ رہے ہیں اور بقول شخصے "وہ شخص جو جہالت اور غریبی سے نباہ کرتا ہے وہ ان تمام جرائم اور خرابیوں کا ذمہ دار ہوتا ہے جو جہالت کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے روشنی کے مینار کی تمام روشنیوں کو بجھا دینے والا شخص جہازوں کے حادثوں اور تباہی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔" غربت کے خلاف جنگ کرنے کے لئے ایک روشن خیال سیاسی لیڈر شپ کی اہم ضرورت پر زور دیتے ہوئے انہوں نے پروفیسر راسٹو (Rostow) کے یہ الفاظ دوہرائے:

"کسی بھی قوم کی مسلسل ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اس امر کا انتظار نہ کرے۔ نہ معاشرتی غیر ترقیاتی سرمائے کے جمع ہونے کا--- اس سرمائے کا بھی نہیں جو سکولوں اور ٹیکنیکل درسگاہوں میں لگایا جاتا ہے۔ اسے نہ صرف اس ٹیکنیکل اور ترقیاتی لہر کا انتظار ہوتا ہے جو زراعت اور صنعت میں دوڑ سکے بلکہ اسے ایک سیاسی قوت کے ظہور کی بھی ضرورت ہوا کرتی ہے جو معیشت کو جدید خطوط پر استوار کرنے کے کام کو ایک بلند پایہ سنجیدہ سیاسی بزنس کا درجہ دینے پر تیار ہو۔"

ایسی صورت حال جرمنی کو 1848ء میں پیش آئی تھی۔ یہی معاملہ جاپان کے ساتھ میجی (Meiji) بادشاہت کے دوران 1868ء میں پیش آیا اور یہی صورت حال روس اور جاپان کے انقلابات کے سلسلے میں بھی تھی۔ 1947ء میں جب ہم نے آزادی حاصل کی تو یہ ہمارے لئے لازمی تحریکی عمل ہونا چاہیے تھا مگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہو پایا۔ ہماری آزادی سے ایک سیاسی طبقہ پیدا ہوا جس نے اقتصادی افزائش کو ریاست کی حکمت عملی میں مناسب جگہ نہ دی۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ جو استدلال اس وقت دیئے جاتے تھے، نجی طور پر بھی اور کھلے بندوں بھی وہ پاکستان کی آئیڈیالوجی (نظریہ) کے بارے میں ابتدائی دنوں کی توجیہات تھیں، مگر میں نے اس بحث میں کبھی یہ نہیں سنا کہ کسی نے غربت کے خاتمے کی بات کی ہو جو کہ ہماری ریاستی حکمت عملی کا ایک بنیادی تفاعل ہونا چاہیے تھا۔"

اپنے خطاب کو جاری رکھتے ہوئے بھائی جان نے کہا:

"غالباً سب سے زیادہ دل گیر طبقہ سائنسی کارندوں اور یونیورسٹیوں میں درس دینے والوں کا ہے۔ پاکستان میں تمام تحقیقی ادارے حکومت کے نوکر شاہی نظام کے کنٹرول کے تحت چل رہے ہیں۔ میں جب کنٹرول کا لفظ استعمال کرتا ہوں وہاں میرا مطلب کنٹرول ہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں دنیا میں سائنس کا دور دورہ ہے وہاں ہمارے سائنس دانوں کو اس بات کا اہل سمجھا ہی نہیں جاتا کہ وہ کوئی کام کر

سکتے ہیں۔ سائنس کے بارے میں سرکاری طور پر ایسی بے اعتنائی برتی جاتی ہے جیسا کہ بخارا میں شاہی دور میں علماء اور فضلا کا رویہ مقامی غریب عیسائی گھڑی ساز کے بارے میں ہوتا تھا۔ اس کو یہ اجازت تھی کہ وہ مسجد میں داخل ہو کر مسجد کے کلاک کو ٹھیک کرے۔ یہ اس بنیاد پر تھا کہ تکنیکی افادیت کے معاملے میں وہ گدھے کے برابر تھا جو سب سے پہلے مسجد میں پتھر اور اینٹیں لے کر داخل ہوتا تھا۔ معاشرتی سطح پر ایک گھڑی ساز سے ایسا برتاؤ کیوں کیا جاتا تھا۔ ہماری نوکر شاہی نے نہ صرف گھڑی سازوں کی طرف رعونت کا رویہ جاری رکھا بلکہ یہ بھی کوشش کی کہ جہاں تک ممکن ہو گھڑی ساز کو ہی درآمد کیا جائے۔"

اپنے خطاب کو ختم کرتے ہوئے بھائی جان نے کہا:

"اب میں آخر میں اپنی کہی ہوئی چند باتیں دہرانا چاہوں گا۔ قومی خوشحالی کے سلسلے میں پہلا قدم کامیابی سے اٹھانے کے لئے ہمیں دوسرے کئی غریب ممالک کی طرح ایسے اسباب پر انحصار کرنا ہوگا جو ہمارے قومی اختیار سے باہر ہیں۔ لیکن کچھ پیشگی اندرونی قومی تقاضے ایسے ہیں جو معاشرے میں قابل ذکر تبدیلی لانے کے لئے پورے کرنے پڑیں گے۔ سب سے پہلی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ قوم کے دل میں یہ آگ بھڑکا دی جائے کہ وہ ایک نسل کے اندر غربت کے خاتمے کے لئے دن رات کوشش کریں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ایک لمحے کے لئے بھی اپنے اقتصادی مقاصد سے غافل نہ ہوں۔ خاص طور پر ہمیں پوری قوم کو اس بات پر قائل کرنا ہوگا کہ اس اقتصادی حکمت عملی سے پورے معاشرے کے اقتصادی حالات بہتر ہو جائیں گے اور یہ سب کچھ محض کسی ایک طبقے کے لئے نہیں ہے۔

ہمیں اس معاملہ میں بالکل واضح ہونا چاہیے اور ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم کونسا انقلاب لانا چاہتے ہیں۔ یہ تکنیکی اور سائنسی انقلاب ہے' لہٰذا اس کے لئے لازم ہے کہ سب سے زیادہ فوقیت قوم کے سائنس اور ٹیکنالوجیکل ہنرمندی کو ترقی دینے کے لئے ہونی چاہیے اور ہم سائنس دانوں کو غربت کا مقابلہ کرنا چاہیے اور اس چیلنج کو قبول کرنا چاہیے جو غربت نے ہمیں دیا ہے۔ مستقبل کے مؤرخ کو یہ چرچا کرنے کا موقع دیجئے کہ قومی خوشحالی اور اقتصادی ترقی کے میدان میں روسیوں اور چینیوں کی مانند تیزی سے آگے بڑھنے کا پانچواں سبق پاکستان نے سکھایا اور اس طرح کہ ان دو ملکوں کے برعکس پاکستان میں نہ انسانوں کو ٹارچر کیا گیا اور نہ ان کی جانیں لی گئیں۔ مجھے قرآن کریم سے اقتباس کی اجازت دیجئے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ

(الرعد: 12)

"اللہ تعالیٰ کبھی بھی کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی (اندرونی) حالت کو نہ بدلے۔"

اقتصادی ترقی کی انسانی تاریخ پر دیا گیا بھائی جان کا یہ زود فہم اور پر اثر تجزیاتی خطبہ ایسا تھا کہ اس نے ہر کسی کی توجہ اپنی جانب مبذول کرلی۔ اس کا مجموعی تاثر حیرت انگیز تھا۔ اس میں جو علمی و تجرباتی حقائق بیان کئے گئے تھے' جو حکمت عملی اختیار کی گئی تھی اور مختلف راستوں کی جس بے خوفی اور بے باکی سے

نشاندہی کی گئی تھی، ان سے بھائی جان کے انقلابی نظریات و احساسات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کی یہ تقریر ایسی نہ تھی کہ ارباب بست و کشاد اس سے غافل رہ سکتے۔ Ideals and Realities -71-84۔

ڈھاکہ میں کی گئی اس تقریر پر فوری ردعمل دکھاتے ہوئے جنرل محمد ایوب خان صدر پاکستان نے بھائی جان کو اپنا سائنسی مشیر اعلیٰ مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ بھائی جان اس عہدہ پر کل وقتی (فل ٹائم) طور پر باقاعدہ تنخواہ کے ساتھ کام کریں جبکہ بھائی جان جزوقتی اور بلاتنخواہ (اعزازی) کام کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ امپیریل کالج لندن میں ہائی انرجی تھیورٹیکل فزکس میں تحقیقی کام میں حرج نہ ہو۔ بالآخر جنرل محمد ایوب خان نے بھائی جان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے انہیں 1961ء میں اپنا اعزازی سائنسی مشیر اعلیٰ مقرر کیا۔

اس تقرری کے بعد ان کی سفارش پر صدر کے حکم سے کئی سائنسی منصوبوں (جن کی تفصیل آگے آئے گی) پر فوری عملدرآمد کا آغاز ہوا۔ کچھ عرصہ بعد وزارت خزانہ کی طرف سے یہ اعتراض کئے جانے لگے کہ سائنسی کاموں پر حکومت جو روپیہ صرف کر رہی ہے اس کا عشر عشیر بھی اسے منافع کے طور پر واپس نہیں مل رہا۔ وزارت خزانہ اس امر سے بالکل نابلد تھی کہ سائنس کے فوائد و ثمرات براہ راست اور تیزی سے عوام تک پہنچنے سے پہلے سائنس کی تنظیم کو مین پاور (Man Power) میں ایک سطح حاصل کرنا ہوتی ہے۔ جس پر پہنچنے کے بعد ہی سائنس کے اقتصادی و دیگر ثمرات عوام تک پہنچنے شروع ہوتے ہیں۔ سائنسی مشیر اعلیٰ کی حیثیت سے بھائی جان پاکستان میں سائنس اور سائنسی تعلیم کی جانب سے مسلسل غفلت اور تساہل برتنے پر عوام کی توجہ مبذول کراتے رہے۔ انہیں اس بات پر شدید حیرت ہوا کرتی تھی کہ آخر قوم کا ضمیر سائنس کو نظرانداز کرنے پر اسے جھنجھوڑتا کیوں نہیں۔ ان کے نزدیک غربت و افلاس کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر مطمئن ہو جانا انتہائی جہالت تھی۔ قوم کی اقتصادی و خوشحالی چونکہ لیڈروں اور منتظمین پر منحصر تھی اور سائنٹیفک اور سائنسی ذہنی نشوونما اس سلسلے میں بنیادی کام کر سکتے تھے، اس لئے انہوں نے اپنا زور بیان و اثر رسوخ انہیں یہ سمجھانے میں صرف کر دیا کہ قومی فلاح و بہبود کے لئے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم میں نئی اور سخت قسم کی اصلاحات کرنی ضروری تھیں۔ وہ اس خیال کا بار بار اظہار کرتے تھے کہ جو قوم سائنسی طرز فکر اور سائنسی طریق کار سے خود کو آراستہ کرے وہ خوشحالی اور فارغ البالی سے یقیناً ہمکنار ہو گی۔

ان کے نزدیک سائنس کی تعلیم کے کئی نمایاں قسم کے اور بھی فوائد ہیں، جیسا کہ خود ان کا تجربہ ہے۔ مثلاً سائنس ہماری فطرت میں تحیر کے عنصر کو ابھارتی اور تسکین دیتی ہے۔ تجسّس کو بھڑکاتی ہے، قوت مشاہدہ کو تیز کرتی ہے۔ سیکھنے والے کو اپنے دریافت کردہ حقائق کو پرکھنے کا شعور عطا کرتی ہے۔ تنقید و تبصرہ کے رجحان کو تقویت بخشتی ہے اور اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ پس ذہن کے دروازے کھولنے کے لئے قوت فیصلہ کی تربیت کے لئے، قوت متخیلہ میں تحریک پیدا کرنے کے لئے اور احترام انسانیت کے

جذبے کی افزائش کے لئے ایک نہایت موثر ہتھیار ہے۔ سائنس کی اہمیت اس کے جنگوں' دفاع' صنعت و تجارت کی خوشحالی میں استعمال سے ثابت ہوتی ہے۔ ان سب باتوں نے بھائی جان کو پاکستان میں وسیع پیمانے پر سائنسی تعلیم تحقیق کی ترقی و ترویج کے لئے مصروف جہاد رکھا۔

یہ واضح کرنے کے لئے مادی ناہمواریاں کوئی اتنی پرانی نہیں ہیں' انہوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ "میں اپنی کہانی تین صدیوں پہلے کے زمانے سے شروع کروں گا۔ 1660 کے لگ بھگ جدید تاریخ کی دو عظیم الشان یادگاریں وجود میں آئیں۔ ایک مغرب میں اور دوسری مشرق میں۔ سینٹ پال کیتھڈرل لندن میں اور آگرہ کا تاج محل عظیم مغلوں کے ہندوستان میں۔ ہر چشم بینا دیکھ سکتی ہے کہ یہ یادگاریں دینے والی تہذیبوں میں کونسی تہذیب ضاعی' حکمت و دانائی' صنعت و حرفت اور ثروت کے لحاظ سے کس مقام پر تھی۔ البتہ اسی زمانہ میں ایک اور یادگار وجود میں آئی مگر صرف مغرب میں۔ یہ تیسری یادگار جس کی افادیت انسانیت کے لئے مسلم ہے۔ نیوٹن کی پرنسپیا ہیں جو 1668 میں شائع ہوئی۔

مغلوں کے ہندوستان نے کسی نیوٹن کو پیدا نہ کیا۔ مسلمانوں کی سائنسی ترقی کے سوتے خشک ہو چکے تھے۔ تاج محل ایک تہذیب کا آخری کمال تھا۔ ایک ایسی تہذیب کی کی تخلیقی صلاحیتیں افیون زدہ ہو گئی تھیں' جس کا فنا نہ ہونا تعجب خیز ہوتا۔"

اس تاریخی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے بھائی جان نے صدر پاکستان محمد ایوب خان کو مجبور کیا کہ وہ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف نیوکلیر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (PINSTECH) کے قیام کی منظوری دے دیں جو ایک تخلیقی سائنسی یادگار ہوگی' جس کی بدولت پاکستان میں سائنسی تعلیمات خصوصاً نیوکلیئر سائنس کا احیاء ہوگا۔ چنانچہ جنرل محمد ایوب خان نے اس انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے لئے جگہ کا انتخاب بھائی جان کے ذمہ لگایا۔

اپنے ایک انٹرویو میں بھائی جان نے بتایا کہ "اس کے لئے تین مقامات' ہزارہ' ٹیکسلا اور اسلام آباد زیر غور آئے۔ کافی سوچ و بچار کے بعد میں نے حکومت کو مشورہ دیا کہ یہ انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد کے قریب بنائی جائے۔" اس انسٹی ٹیوٹ کا نقشہ ایک مشہور امریکن ماہر تعمیرات (جنہوں نے واپڈا ہاؤس لاہور کا نقشہ بنایا تھا) سے بنوا کر اسے تعمیر کرایا۔

حکومت پاکستان کو بھائی جان نے مشورہ دیا کہ وہ کراچی میں ایک سو پچاس میگاواٹ کا پاور ری ایکٹر لگائے' جس میں ایندھن کے طور پر قدرتی یورینیم اور (Fission) نیوٹرون کی رفتار کم کرنے کے لئے "بھاری پانی" کا استعمال کیا جائے۔ چنانچہ کینیڈا سے اس پاور ری ایکٹر کے لئے مشینری حاصل کی گئی۔ اس پاور ری ایکٹر کا افتتاح وزیراعظم زیڈ-اے بھٹو نے کیا تھا۔ افتتاحی تقریب میں خطبہ استقبالیہ بھائی جان نے پڑھا تھا' کیونکہ اس پروجیکٹ کے افتتاح سے قبل ڈاکٹر عثمانی کو بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر انہیں ان کے عہدہ سے ہٹا کر وفاقی سیکرٹری تعلیم مقرر کر دیا گیا تھا۔

بھائی جان نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں ڈاکٹر عثمانی کو ان کی خدمات پر زبردست خراج تحسین پیش کیا' اگرچہ ایسا کرنا ایک مشکل امر تھا کیونکہ زیڈ-اے بھٹو ان سے ناخوش تھے۔ جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق ادا کر کے بھائی جان نے ڈاکٹر عثمانی کی خدمات اور ان سے اپنی دوستی کا حق ادا کر دیا۔

اس پروجیکٹ کا نام کراچی پاور پروجیکٹ (KANUPP) ہے۔ اس کے قیام کے کچھ عرصے بعد کینیڈا کی حکومت نے اس میں استعمال ہونے والے ایندھن کی سپلائی بند کر دی تھی' لیکن پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کے ان انجینئروں اور ٹیکنیشنوں نے جنہیں کینیڈا میں ٹریننگ دلائی گئی تھی' اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے پاور ری ایکٹر میں استعمال ہونے والے ایندھن کو پاکستان میں اپنے وسائل سے تیار کر لیا تھا۔ ان انجینئروں میں ہمارے خالہ زاد شیخ لطیف احمد سرفہرست میں جنہوں نے کینیڈا سے دو سال کی ٹریننگ حاصل کی تھی۔

سپارکو کا قیام

1961ء میں بھائی جان کی تجویز پر میزائل ریسرچ اور اس سے ملحقہ میدان میں ترقی کے لئے خلا اور بالائی فضا کی تحقیقی کمیٹی سپارکو (SUPARCO) کا قیام عمل میں آیا۔ بھائی جان اس کے بانی چیئرمین تھے وہ اس عہدہ پر 1964ء تک فائز رہے۔ سپارکو نے 7 جون 1962ء کو سومیانی بیچ (Beach) سے پہلا موسمی راکٹ فضا میں چھوڑا تھا۔ بعد میں پاکستان میں تیار ہونے والے میزائل کی تیاری کا ابتدائی کام سپارکو کے انجینئروں اور ٹیکنیشنوں نے ہی کیا تھا جبکہ اس کام کا سہرا کسی اور نے اپنے سر باندھا۔

صدر محمد ایوب خان اور پنڈت نہرو کے درمیان ملاقات کرانے کی کوشش

پاکستان میں سائنس و ٹیکنالوجی کے فروغ کے لئے بھائی جان نے کئی اقدامات تجویز کئے' لیکن ان کے لئے مطلوبہ رقم مہیا نہ ہو سکی' جس کی وجہ سے مثبت نتائج سامنے نہ آئے۔ جلد ہی انہیں یہ احساس ہونے لگا کہ دراصل یہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ہونے والی اسلحہ کی دوڑ ہے۔ جہاں زیادہ سرمایہ جا رہا ہے اور ملک کے حقیقی ترقیاتی پروگراموں کے لئے رقم باقی نہیں بچتی۔ اُس دور میں امریکہ اور روس کے درمیان اسلحہ کی دوڑ ہو رہی تھی' جس کا اثر بھی ساری دنیا پر تھا۔

1964ء میں ہندوستان کے شہر اودے پور میں سائنس دانوں کی ایک عالمی کانفرنس ہوئی۔ (اسے سائنس دانوں کی "پگ واش کانفرنس" (Pugwash Conference of Scientists) کہا جاتا ہے۔ اُس زمانے میں اس کانفرنس میں شمولیت کرنے والے بڑے بڑے سائنسدان دو عظیم طاقتوں کے درمیان نیوکلیر جنگ کو روکنے کے لئے کوشاں رہتے تھے) ہندوستان میں یہ کانفرنس ڈاکٹر ہومی بھابھا چیئرمین انڈین ایٹمی توانائی کمیشن کی دعوت پر منعقد ہوئی تھی۔ بھائی جان کو اس کانفرنس میں شرکت کے لئے دعوت دی گئی تھی۔ ڈاکٹر بھابھا اور بھائی جان نے آپس میں صلاح مشورہ کرنے کے بعد کوشش کی کہ

صدر محمد ایوب خان اور پنڈت جواہر لعل نہرو کے درمیان ملاقات ہو' دونوں ملک ممکنہ تصادم سے بچ جائیں اور ان دونوں کے درمیان اسلحہ کی جو دوڑ ہو رہی ہے' اُسے ختم کر کے اس پر خرچ ہونے والے سرمایہ کو وہ اپنے اپنے ملک میں فلاح و بہبود پر خرچ کریں۔

اس کانفرنس کے فوراً بعد بھائی جان دہلی سے لاہور کے لئے روانہ ہوئے۔ چونکہ ان کا یہ پروگرام اچانک بنا تھا' انہیں ہوائی جہاز میں سیٹ نہ مل سکی۔ لہٰذا انہوں نے یہ سفر جہاز کے پائلٹ کیبن میں کھڑے ہو کر کیا تھا۔ پاکستان پہنچ کر انہوں نے صدر محمد ایوب خان سے خصوصی ملاقات کر کے انہیں پنڈت نہرو سے ملاقات کرنے کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ بھائی جان کی بات سننے کے بعد صدر محمد ایوب خاں نے کہا کہ پنڈت نہرو کبھی بھی یہ ملاقات نہیں کرے گا' کیونکہ اس کے پاس کہنے کے لئے کوئی سچی بات ہے ہی نہیں۔ اس نے ریاست جموں و کشمیر کے عوام سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی مرضی معلوم کرنے کے لئے وہاں رائے شماری کرائے گا لیکن بعد میں وہ مکر گیا۔ تاہم بھائی جان نے صدر محمد ایوب خان کو اس ملاقات کے لئے آمادہ کر لیا۔ یہی پگ واش کانفرنس کے اغراض و مقاصد تھے۔ دوسری طرف ڈاکٹر بھابھا پنڈت نہرو کو صدر محمد ایوب خان کے ساتھ ملاقات کرنے پر آمادہ نہ کر سکے۔

سیدو شریف کی سوات سائنس کانفرنس

بھائی جان کے مشورہ پر اگست 1965ء میں سوات میں سیدو شریف کے مقام پر صدر محمد ایوب خان کے زیر سرپرستی اور ان کی موجودگی میں ایک خاص سائنس کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں ملک کے چوٹی کے سائنسدانوں نے شرکت کی۔ (مجھے یاد ہے بھائی جان ابا جان کو بھی اپنے ہمراہ سیدو شریف لے گئے تھے ان کی آب و ہوا میں تبدیلی ہو اور وہ ابا جان کے قریب رہ سکیں) اس کانفرنس میں رسمی و غیر رسمی بحث و مناظرے ہوتے رہے۔ کشمیر میں حالات خراب ہونے کی خبریں متواتر آ رہی تھیں۔ اس کے علاوہ بھارتی حملے کی افوائیں بھی ہر ایک کے لئے پریشانی کا سبب بنی ہوئی تھیں۔ بھائی جان بھی اس صورت حال سے فکر مند تھے۔ ایک روز انہوں نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ اگر خدانخواستہ یہ جنگ چھڑ گئی تو اس کا خاص نتیجہ برآمد نہ ہو گا' سوائے اس کے کہ ہمارے بے شمار محب وطن نوجوان اپنے ملک کا دفاع کرتے ہوئے شہید ہو جائیں گے۔

اسی کانفرنس میں صدر پاکستان کے سائنسی مشیر اعلیٰ کی حیثیت سے صدر پاکستان کو اپنے خطاب میں انہوں نے کہا: ''پاکستانی سوسائٹی میں پہلی بار سائنس کو جائز مقام اس وقت ملا جب آپ نے 1959 میں سائنسی کمیشن کا تقرر کیا تھا اور دوسری بار اس وقت جب آپ کے حکم سے 1962ء میں پانچ ریسرچ کونسلیں قائم کی گئی تھیں اور تیسری بار اس وقت جب آپ کے زیر ہدایت سائنٹیفک اینڈ ٹیکنالوجیکل ریسرچ ڈویژن قائم ہوا۔

اپنے اس خطاب میں انہوں نے ریسرچ کے لئے مجموعی قومی پیداوار کے "ایک فیصد" کے لئے درخواست کی تھی اور یہ بھی کہ ریسرچ کے معاملات روایتی "نوکر شاہی" کے کنٹرول میں نہ ہوں۔

انہوں نے سائنسی کاموں کے سلسلے میں کچھ تجاویز پیش کیں اور اصرار کیا کہ ان پر جلد از جلد عملدرآمد کیا جائے اور سائنسی ریسرچ سے یہ توقع کی جائے کہ حسب ذیل میدانوں میں جلد از جلد مثبت نتائج دیں:

1۔ ڈیفنس سائنس
2۔ یونیورسٹیوں میں سائنس کا فروغ
3۔ میڈیسن صحت عامہ اور ہائی جین
4۔ خوراک' زراعت و فوڈ ٹیکنالوجی
5۔ آبپاشی' ہائیڈرالوجی و آراضی سائنس
6۔ ملکی خام مال پر مبنی صنعتیں

انہوں نے ایک نیشنل سائنس کونسل کے قیام پر بھی زور دیا۔ تاکہ اولیت دیئے جانے والے کاموں کا تعین کیا جائے۔ علاوہ ازیں انہوں نے مندرجہ ذیل کے قیام پر بھی زور دیا۔

1 ٹیکنیکل انفارمیشن سروس کا قیام۔
2 وہیٹ (گندم) ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔
3 رائس (چاول) ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔
4 نیشنل فزیکل لیبارٹریز۔
5 انسٹی چیوٹ آف میٹالرجی (Metallurgy)

سیدو شریف میں کانفرنس کے بعد بھائی جان جس دن پاکستان سے رخصت ہوئے' اسی روز ہندوستان نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ یہ خبر انہوں نے لندن ایئرپورٹ پر اترنے کے بعد سنی۔ اسی وقت ان کا دل چاہا کہ فوراً کراچی واپس چلے جائیں۔ اس انتہائی پریشانی اور اضطراب کے عالم میں وہ اپنے آپ کو بے حد بے بس اور مجبور سمجھ رہے تھے۔ حکومت پاکستان نے انہیں وہیں رہنے کی ہدایت کی اور پھر واشنگٹن جا کر جیروم ویسر (Jerome Wieser) جیسے لوگوں پر اپنا ذاتی اثر و رسوخ استعمال کریں اور جنگ بندی کے لئے ایسی کوشش کریں جو ملکی مفاد میں بہترین ہو۔ آپ نے ایسا ہی کیا۔ (جیروم ویسر صدر کینڈی کے سائنسی مشیر رہے تھے۔)

سیم اور تھور

بھائی جان ایک محب وطن تھے۔ پاکستان کی سربلندی اور بہتری ہمیشہ ان کے مدنظر رہتی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ پاکستان میں وسیع نہری نظام کی وجہ سے سیم اور تھور (Salinity and Water logging) زرخیز زرعی زمین کو تباہ و برباد کر رہی تھی۔ انہوں نے اس موضوع پر چند مضامین لکھے۔ انہیں اس پریشان کن مسئلے کے حل کی اتنی فکر تھی کہ انہوں نے حکومت

کو مجبور کیا تھا کہ اس مسئلے کو سلجھانے کے لئے امریکن ماہرین کی ایک ٹیم پاکستان بلوائی جائے۔ اس حل طلب مسئلہ کے لئے انہوں نے جو کوشش کی یہاں ان کا جائزہ لینا مفید ہوگا۔

کیلی فورنیا یونیورسٹی میں ایک تقریر کرتے ہوئے انہوں نے پاکستان میں برطانوی حکومت کے قائم کردہ نظام آبپاشی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا: "ہر چند اس نہری نظام کا مقصد پیداوار بڑھانا تھا مگر کسی نے بھی اس مرحلے پر تعلیمی نظام کے طور پر زرعی ٹیکنالوجی کو متعارف کرانے کے بارے نہ سوچا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے جہاں ہر ضلع میں تقریباً اکتیس آرٹس کالج، برٹش ہسٹری، ارسطو کا میٹا فزکس حق و انصاف کے قانون، علم المسائل و غیب پڑھانے کے لئے کھولے گئے۔ وہاں اس وسیع علاقہ کے لئے جو اب پاکستان ہے صرف ایک انجینئرنگ کالج اور ایک زراعتی کالج کو کافی سمجھا گیا۔ یہ دونوں کالج اس کثیر آبادی کے لئے تھے جو پانچ کروڑ کے قریب تھی۔ یعنی زرعی ترقی کی سطح تقریباً وہی رہی جیسی کہ مغلوں کے زمانے میں تھی۔

سیم و تھور کی قدرتی لعنت کے بعد 1961ء میں امریکہ کہ صدر کینڈی کی ہدایت پر راجر ریویل (Roger Revelle) کی سرکردگی میں ایک سائنسی مشن پاکستان بھیجا گیا۔ اس میں یونیورسٹیوں کے سائنسدانوں، ہائیڈرالوجسٹ اور انجینئر شامل تھے۔ اس مشن نے پاکستان میں سیم و تھور کے مسئلے کا جائزہ لینا تھا۔ اس مشن کی پاکستان میں بھجوائے جانے کی کہانی کچھ یوں ہے کہ 1961ء میں بھائی جان امریکہ کی ایم-آئی-ٹی کی سوویں سالگرہ کی تقریبات میں مدعو تھے۔ وہاں انہیں امپیریل کالج لندن سے آئے ہوئے نوبل انعام یافتہ پروفیسر بلیکٹ (Blavkett) کے بعد لیکچر دینا تھا۔ پروفیسر بلیکٹ نے اپنے لیکچر میں کہا: "دنیا کی سپر مارکیٹ میں ترقی پذیر ممالک کے لئے ہر قسم کی ٹیکنالوجی موجود ہے، جائیں اور اسے خرید لیں۔" بھائی جان نے ان کے خیال سے اتفاق نہ کیا اور کہا کہ "پاکستان میں سیم جیسے عذاب کا کبھی سائنسی بنیاد پر مطالعہ کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔" ویسنر اس وقت ایم-آئی-ٹی میں پروفیسر تھے۔ انہیں صدر کینڈی نے انہیں دنوں اپنا سائنسی مشیر نامزد کیا تھا۔ بھائی جان کا لیکچر ختم ہونے کے بعد وہ ان کے پاس گئے اور ان سے کہا: "کیا آپ میرے ساتھ واشنگٹن چلنا پسند کریں گے۔ شاید امریکن سائنسدان آپ کا مسئلہ حل کرنے میں آپ کی مدد کر سکیں۔ صدر کینڈی، صدر ایوب خان سے ان کے امریکہ کے سرکاری دورہ کے دوران بات چیت کریں گے اور امریکی ماہرین کی ایک ٹیم کی پیش کش کریں جو پاکستان جا کر اس اہم مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش میں آپ کی مدد کرے۔"

بھائی جان نے "فزیکل سائنسز میں بین الاقوامی تعاون" کے زیر عنوان اپنے مضمون جو سائنس اینڈ اسٹرونا مکس یو-ایس ہاؤس آف ری پریزنیٹٹوز (U.S. House of Representatives Committee on Science and Astronautics) میں پیش کیا گیا تھا، لکھا: "ہماری کثیر زرعی دولت جسے ہماری زرخیز مٹی عطا کرتی ہے، اس عظیم نظام آب پاشی کا ثمر ہے جو دنیا میں سب سے بڑا نہری نظام سمجھا جاتا ہے۔ جس سے دو کروڑ تیس لاکھ ایکٹر اراضی سیراب ہوتی ہے اور جسے برطانیہ نے انیسویں

صدی کی ڈیم بلڈنگ ٹیکنالوجی کے ورثے کے طور پر ہمارے لئے چھوڑا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ قومی تائید و مدد کے بغیر کوئی بھی درآمد شدہ ٹیکنالوجی ترقی پذیری کا مسئلہ حل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ترقی پذیر دنیا تقریباً نصف صدی سے بلیک بکس ٹیکنالوجی درآمد کرتی چلی آ رہی ہے اور اس امر نے ان کی ترقی کی رفتار کو جوں کا توں رکھا ہوا ہے بلکہ اور بھی گھٹا دیا ہے۔

ٹیکنالوجی کو لانے کے لئے اسے سوسائٹی کے ڈھانچے میں جذب کرنے اور اپنی روایات کا ایک جز بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسے سائنسی علوم اور مہارتوں کی ایک مضبوط مقامی بنیاد فراہم کی جائے۔ ایک حقیقتی ٹیکنالوجیکل انقلاب کے لئے اس بنیاد کو تعمیر کرنا ہی ہوگا۔ اس بنیاد کی تعمیر کے لئے اس چشم امتیاز کو وا کرنے کے لئے جو یہ دیکھ سکے کہ کیا قابل اعتماد ہے اور کیا نہیں۔ کیا اصل ہے اور کیا نقل ہے۔ موجودہ سائنس کے براہ راست تجربہ کے علاوہ دوسری کوئی راہ نہیں' البتہ یہ تجربہ اپنی تہذیبی روایات کی حدود میں ہو۔

سیم اور شور کا مسئلہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ نظام آبپاشی۔ یہ بہت پہلے سے معلوم ہے کہ مناسب طور سے نالیوں کا نظم کرنا ہی اس کا واحد علاج ہے۔ لیکن اس علاج کو جو چیز وادی سندھ میں ناممکن بناتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میدان کی ڈھلان فی میل ایک فٹ سے زیادہ نہیں ہے۔ ریویل ٹیم نے انہیں حالات کے پیش نظر عمودی ڈرینج کی تجویز پیش کی تھی۔ ٹیوب ویلوں کا جال بچھا کر زیر زمین پانی نکال لیا جائے۔ اس طرح کچھ پانی زیر زمین ضرور جذب ہو جایا کرے گا' لیکن اس میں شور بہت نہ ہوگی۔ یوں سیم کا علاج ہوتا جائے گا۔ عمودی ڈرینج کا طریقہ پندرہ سال سے پاکستان میں استعمال کیا جا رہا ہے اور نتائج وہی مایوس کن ہیں۔

امریکی ٹیم نے اپنی چھان بین کے بعد اس امر کی نشاندہی کی کہ اصل مشکل یہ تھی کہ اس طریقہ کو بڑے محدود پیمانے پر استعمال کیا گیا تھا۔ مثال کے طور پر صرف ایک ہی کنواں پانی کی سطح کم کرنے میں کوئی مدد نہ دے سکتا تھا۔ کیونکہ گرد و پیش کا پانی تیزی سے رس رس کر اس میں جمع ہونا شروع ہو جاتا تھا اور فوراً ہی کنویں کو لبالب بھر دیتا تھا۔ اس سے قبل کہ اسے نکالا جا سکے پانی کی سطح کے سائز میں اضافہ سے متعلق رقبہ بمقابلہ گھر کے زیادہ تیزی سے بڑھتا ہے۔ یہ وہی اصول ہے جس نے دوران جنگ برطانیہ کو اس نتیجے پر پہنچایا تھا کہ بحراوقیانوس میں نقل و حمل کے لئے بڑی بحری کاروان بہ نسبت چھوٹے کاروانوں کے بیرونی حملوں کا زیادہ موثر طریقے سے مقابلہ کر سکتے تھے۔ ہارورڈ میں ریویل کے تخمینہ سے یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ اگر کم سے کم دس لاکھ ایکڑ یعنی چالیس مربع میل کے دائرے میں ایک کنواں کھودا جائے تو اس میں رس رس کر جمع ہونے والا پانی پمپ کرنے تک اسے لبریز کر کے آس پاس نہیں اڈ پڑتا۔ لہٰذا ہونا یہ چاہیے کہ کم رقبوں میں زیادہ سیم نالے بنائیں جائیں اور ان میں رس آنے والے پانی کو جلد جلد پمپ کر کے باہر نکال لیا جائے۔ اس طریقے سے ایک یا دو سال کے اندر اندر اس سنگین قسم کی زمینی بیماری سیم اور شور سے نجات پائی جا سکتی ہے۔"

بھائی جان کی دیگر خدمات بطور سائنسی مشیر اعلیٰ صدر پاکستان

ترقی پذیر ممالک کی معاشرتی پسماندگی اور اس کے اسباب نے بھائی جان کو مستقلاً" پریشان و متفکر رکھا۔ ان کے شب و روز کا شاید ہی کوئی لمحہ ہو جب وہ ان مسائل پر نہ سوچتے ہوں۔ اس سلسلے میں ان کی قلبی کیفیت ان کی تقاریر سے عیاں ہوتی ہے۔ انہوں نے 1963ء میں ایک عظیم مسلمان طبیب الاصولی (Al-Asuli) کا تذکرہ کیا جو نو سو برس پہلے بخارا میں رہتے تھے' اس نے ایک طبی کتاب "الادویہ" (Pharmacopia) لکھی' جس کو اس نے دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ امراء کی بیماریوں پر تھا اور دوسرا حصہ غربا کی بیماریوں پر۔ بھائی جان نے کہا: "اگر الاصولی آج زندہ ہوتا اور انسانوں کی بیماریوں کے متعلق کوئی کتاب لکھتا تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنی کتاب "الادویہ" کو اُسی طرح دو حصوں میں تقسیم کرتا۔ ایک حصہ ان بیماروں کے متعلق ہوتا جن کے شکار امیر ملکوں کے انسان ہیں' جیسے نیوکلیائی تباہ کاری کا خوف اور دوسرا ان بیماریوں پر ہوتا' جن کے شکار غریب ملکوں کے باشندے ہیں۔ جیسے ان کی بھوک اور فاقہ زدگی۔ وہ اپنی کتاب میں یہ بھی اضافہ کرتا کہ ان دونوں بنیادی بیماریوں کا بنیادی سبب ایک ہی ہے یعنی سائنس ہے۔ ایک کے یہاں سائنس کی زیادتی اور دوسرے کے یہاں اس کا فقدان۔

اپنے ملک پاکستان کی غربت اور پسماندگی کا ذکر کرتے ہوئے بھائی جان نے کہا: "میرے ملک پاکستان کے پچاس فیصد لوگوں کی روزانہ آمدنی آٹھ سینٹ (Cent) اور پچاس فیصد کی چودہ سینٹ ہے' جن پر وہ گزارہ کرتے ہیں۔ اسی آمدنی سے وہ دو وقت کی روٹی' پہننے کے کپڑے' رہائش اور بچوں کی تعلیم کے اخراجات پورے کرتے ہیں۔"

نیوکلیائی اسلحہ خانہ کے بارے میں انہوں نے لکھا: "ہمارے لئے نیوکلیئر مسئلہ اس لحاظ سے ایک بڑا المیہ ہے کہ یہ زمینی وسائل کی مجرمانہ حد تک بربادی ہے۔ میرے لئے یہ ذاتی طور پر المناک ہے کیونکہ یہ ہمارے عہد کے برٹرینڈرسل جیسے رشیوں کی تمام تر توانائیوں کو چاٹ رہا ہے۔ جنہوں نے عام حالات میں بھوک و افلاس کے خلاف جہاد کی تحریک چلائی ہوتی۔

یہ سوال اٹھاتے ہوئے کہ ہم غریب کیوں ہیں؟ بھائی جان نے خود ہی جواب دیا۔ زیادہ تر' بلاشبہ' خود اپنی حماقتوں کی بدولت' لیکن مجھے انتہائی عجز و انکسار کے ساتھ کہنے دیجئے کہ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم دولت مندوں کی خوشحالی میں اضافہ کرنے کے لئے سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ میں سالہا سال سے یہ دیکھتا چلا آ رہا ہوں کہ پاکستان میں میرے گاؤں میں کپاس کی فصل ہوتی ہے' اس کی قیمت فروخت کم سے کم تر ہوتی جا رہی ہے جب کہ درآمد شدہ کھاد کی قیمت بتدریج بڑھتی چلی جا رہی ہے۔" غربت و افلاس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے انہوں نے ایک ٹھوس قسم کا لائحہ عمل ان الفاظ میں تجویز کیا: "یہ مستعمل ہے' ملکی وسائل کے وسیع پیمانے پر جائزہ لینے پر' معلوم تکنیکی مہارتوں کے حصول کے طویل عمل پر اور

انسانی و مادی ذرائع سے وسائل کے تکنیکی طور پر بروئے کار لانے کے دانشمندانہ تعین پر۔" اس تجویز کے ساتھ انہوں نے ایک نوٹ تحریر کیا: "بہت سے ترقی پذیر ممالک میں چند آدمی ہی ہیں جو اولیت دیئے جانے والے کاموں کی صحیح فہرست بنا سکتے ہیں۔" ایسا اس لئے کہ ان کا نظام پست' خامیوں سے بھرپور اور سائنسی ہدایت و تحقیق کے لئے نامناسب ہے۔"

ایک موقع پر کیلی فورنیا یونیورسٹی میں بھائی جان نے کہا: "یہ عین ممکن ہے کہ صنعتی نظام کا نیا دور آ جائے اور عالمی بنک کے قرضوں اور غیر ملکی ماہرین کی مدد سے سرمایہ کاری کی جائے۔ لیکن یہ دور ملک کے دل کو جہاں تک ملکی تکنیکی مہارت و قابلیت کا تعلق ہے پہلے کی مانند بغیر چھوئے ہی چھوڑ سکتا ہے اور ایسا ہونے کا حقیقی خطرہ موجود ہے۔ کیونکہ عالمی بنک یا کسی اور امداد دینے والی ایجنسی کو یہ دیکھنے کی بجائے کہ منصوبوں کی تکمیل پاکستانی ماہرین کے ہاتھوں سے ہو اس میں زیادہ دلچسپی ہوتی ہے کہ منصوبے کم سے کم وقت میں پایہ تکمیل کو پہنچ جائیں۔ اس طریقے سے پاکستانی ماہرین میں تجربہ اور خود اعتمادی پیدا نہیں ہو سکتی۔ پھر دوسرے خطرات بھی برے خوابوں کی طرح ہر ترقی پذیر ملک کے سر پر منڈلاتے رہتے ہیں۔ مثلاً غیر ملکی امداد ختم ہو جانے کا خوف وغیرہ۔"

1967ء میں ڈھاکہ میں نیوکلیئر فزکس کا ایک انٹرنیشنل سیمینار منعقد ہوا' جہاں پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن نے (Me. Van de Graaf Accelerator) سرع کو پروٹون کے انٹر ایکشن پر تحقیقات کے لئے لگا رکھا تھا۔ بھائی جان کے ذاتی اثر و رسوخ اور رابطے کی بدولت یورپ و امریکہ کے کچھ چوٹی کے ماہرین طبعیات بھی اس سیمنار میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ اس سیمینار میں اپنے افتتاحیہ خطبے میں بھائی جان نے کہا: "آج سے تقریباً بارہ سو سال پہلے دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر المنصور نے ایک بین الاقوامی سائنس کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے اپنے نئے دارالحکومت بغداد کی بنیاد رکھی تھی۔ المنصور کی یہ کانفرنس توقعات سے بڑھ کر کامیاب ہوئی تھی۔ اس نے اسلام میں علوم ریاضیات و ہیئت کی بنیادیں رکھی تھیں۔ اس کانفرنس میں سائنسی تحقیقات کے لئے دنیا کے پہلے بین الاقوامی ادارے "بیت الحکمت" کے قیام کی تجویز پیش ہوئی۔ اس کانفرنس میں جو زیادہ عملی منصوبہ بنایا گیا تھا وہ یہ تھا کہ اس عہد کے مشہور ماہر تعمیرات ماشاء اللہ اور مہندس (انجینئر) نوبخت کی کتابوں اور مقالات کی وسیع پیمانے پر اشاعت و ترویج کی جائے۔ یہ ماہرین اس کانفرنس کے موقع پر وہاں موجود تھے۔ انہوں نے آگے چل کر بغداد کی بڑی بڑی تعمیرات و تنصیبات کے لئے اہم خدمات انجام دیں۔ اس کانفرنس کے انعقاد کے ساتھ ہی بغداد میں آلات سازی کی صنعت کی بنیاد پڑی۔ جس کے نمونے عیسیٰ اصطرلابی کے بڑے بڑے بلند پایہ کاموں میں اب بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ہمارے آج کے اجلاس میں پڑھے جانے والے مضامین اور پیش کردہ تجاویز تاریخی اعتبار سے ایسی ہی معنی خیز اور اہمیت کی حامل ثابت ہوں گی جیسا کہ بغداد کی اس کانفرنس میں۔ تاہم تمام تر عجز و انکسار کے ساتھ مجھے یہ کہنے دیجئے کہ یہ نیوکلیئر سائنس کا پہلا بین الاقوامی

سمپوزریم پاکستان میں اس مضمون کی رفتار نبض تیز کر دے گا۔ یہ حقیقت کہ خوش قسمتی سے ہمیں دنیا کے ممتاز ترین اور معروف ترین ماہرین طبعیات کا یہاں اپنے وطن میں استقبال کرنے کا موقع ملا ہے۔ اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ ڈھاکہ سنٹر میں ہونے والا کام اعلیٰ درجہ کا ہے۔ ہم پر امید ہیں کہ جلد ہی ڈھاکہ کی اور پاکستان کی سائنسی برادری جو دنیا سے اب تک کٹی کٹی سی تھی۔ بین الاقوامی سائنس کی رود عظیم کا ایک حصہ بن جائے گی۔"

1968ء میں ترقی پذیر ممالک میں اعلیٰ سائنسی ریسرچ میں پیش آنے والی مشکلات پر بات کرتے ہوئے بھائی جان نے کہا تھا: "بدقسمتی یہ ہے کہ ریسرچ بہت مہنگا کام ہے جیسا کہ ہم نے دیکھا بہت سے ممالک اب بھی یہ محسوس نہیں کرتے کہ ریسرچ کا کام ان کے وسائل کے لئے ہمسرانہ دعوؤں میں اولیت کا مقام رکھتا ہے۔ نہ ہی عملی ریسرچ ان ترقی کے اہم منصوبوں میں اولیت پا سکتی ہے۔ منتظمین اس طریقے کو زیادہ منافع بخش اور سستا سمجھتے ہیں کہ عملی سائنس کو ورلڈ مارکیٹ سے خرید لیا جائے۔ چنانچہ جہاں تک اعلیٰ ریسرچ کا تعلق ہے اس کا معاملہ 1470 کے قندھار جیسے سرد خانے میں پڑا رہتا ہے۔ میرے نزدیک تمام اعلیٰ ریسرچ کے لئے سب سے پہلا اور اہم ترین عنصر ایسے سرکردہ افراد کا مہیا کرنا ہے جن کے گرد بڑے بڑے ادارے تعمیر کئے جا سکیں۔ ایسے افراد ان تمام آدمیوں کا جنہیں ریسرچ کی ٹریننگ دی جا رہی ہے' شاہد پانچ فیصد ہوں۔ البتہ یہ بات ایک معجزے سے کم نہ ہوگی کہ ان تمام تر خطرات اور مصائب کے باوجود جو ایک غریب معاشرے کا خاصہ ہوتے ہیں سائنس کے لئے کوئی ایسا جوہر قابل محفوظ رہ جائے۔

یحییٰ خان صدر پاکستان کے سائنسی مشیر اعلیٰ

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے بعد جنرل محمد یحییٰ خان پاکستان کے صدر بنے تو انہوں نے بھائی جان کو سائنسی مشیر اعلیٰ کے عہدہ پر برقرار رکھا۔ ان کے چند سالہ دور حکومت میں لفٹیننٹ جنرل پیرزادہ چیف آف جنرل سٹاف تھے۔ جنہوں نے بھائی جان کو یحییٰ خان سے کبھی بھی ملنے نہیں دیا تھا۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ حکومت کے محکمہ بہبود آبادی کے چند افسروں نے منصوبہ بندی کے لئے کروڑوں روپے کا سامان درآمد کیا۔ حقیقت میں اس سامان کی مالیت لاکھوں روپے بھی نہ تھی۔ یوں ان مفاد پرستوں نے قومی خزانہ کو لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے کا نقصان پہنچایا۔ کچھ عرصہ بعد اٹلی کے دورے پر گئے ہوئے ایک اعلیٰ افسر نے بھائی جان کو اس بارے میں بتایا تو وہ بے حد حیران ہوئے اور کہا یہ چیزیں تو بے حد سستی ملتی ہیں۔ اگر ان سے کہا ہوتا تو وہی چیزیں بہت ہی کم قیمت پر مہیا کروا سکتے تھے۔ قومی خزانہ لوٹنے والوں کو جب اس بات کا علم ہوا کہ بھائی جان کو یہ پتا چل گیا ہے کہ ان لوگوں نے کیا کیا ہے تو انہوں نے اپنی جانیں بچانے کی خاطر بھائی جان کے خلاف جنرل پیرزادہ کے کان بھرتے ہوئے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ڈاکٹر سلام ملک کا وفادار نہیں ہے اور اس کے خلاف باتیں کرتا ہے۔ چنانچہ لفٹیننٹ جنرل پیرزادہ نے بھائی جان

کو ایک سخت خط لکھا جس کے آخر میں اس نے لکھا کہ "ملک کے ساتھ تمہاری دیانت داری اور وفاداری مشکوک ہے۔" اس خط سے بھائی جان کو بہت دکھ ہوا کیونکہ وہ تو اپنے ملک کی بے لوث خدمت کر رہے تھے۔ بھائی جان نے اس خط کا جواب دیتے ہوئے اپنے خط کے آخر میں لکھا کہ "میں اس سرزمین کا بیٹا ہوں ملک کے ساتھ میری وفاداری پر ذرہ بھر بھی شک نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ آپ جیسے لوگ جو ہندوستان سے نقل مکانی کر کے پاکستان آئے ہیں' ان کی دیانت داری اور وفاداری مشکوک ہے۔" اس کے بعد لفٹیننٹ جنرل پیرزادہ نے بھائی جان کو جنرل یحیٰی خان سے کبھی بھی ملاقات نہ کرنے دی۔

چنانچہ اس حقیقت کے باوجود بھائی جان نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ "ہم جو کچھ کر سکتے ہیں ہمیں اس کی انتہاء تک پہنچ جانا چاہیے۔ ہمیں اس بارے میں کبھی قیاس سے کام یا پریشان نہ ہونا چاہیے کہ ہم کوئی کام کرنے کے لائق نہیں۔ کسی بھی صورت اور حالات میں ناامیدی کا خیال میرے ذہن میں نہیں آیا۔"

غالباً یہ ان تمام بڑے آدمیوں کا طرہ امتیاز ہے جو عظمت اور شوکت کی بلندیوں پر پہنچتے ہیں اور جن میں عزم و ولولہ اور شدید تر محنت کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ ان باتوں کے باوجود انہوں نے "پاکستان کے لئے سائنسی' تحقیقی اور ترقیاتی پالیسی" پر مضمون تحریر کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا: "ہمارے پاس تین بڑے اہم وسائل موجود ہیں۔"

1 قدرتی گیس۔

2 زرخیز مٹی بشرطیکہ اسے مغربی پاکستان میں آبپاشی سے سیراب کیا جا سکے اور مشرقی پاکستان میں سیلابوں سے محفوظ رکھا جا سکے۔

3 افرادی قوت کی فراوانی بشرطیکہ اسے مختلف مہارتوں سے آراستہ کیا جا سکے۔ مثلاً زراعت' سائنس' انجینئرنگ اور ریاضیات کے میدانوں میں مہارتیں۔

انہوں نے اپنے مضمون میں لکھا کہ پاکستان کی سائنس اور ٹیکنالوجی میں ریسرچ کی کوششوں کو ناکام بنانے والی تین چیزیں ہیں:

1 معیشت کی تکنیکی ضروریات اور ملکی ثقافتی عمدگی کے لحاظ سے سائنس کا نہ ہونے کے برابر ہونا۔

2 چند اہم میدانوں میں ریسرچ کے فروغ سے بے اعتنائی۔

3 بین الاقوامی سائنس سے رابطہ کی کمی۔

یہ خامیاں یا کوتاہیاں بنیادی طور پر ایک ہی اصلیت رکھتی ہیں۔ پاکستان کی کبھی کوئی مربوط اور منظم سائنسی پالیسی نہیں رہی۔ ریسرچ اور ترقی پر ہونے والے کل اخراجات پاکستان کی قومی آمدنی کے ایک فیصد کا آٹھواں حصہ ہوتے ہیں۔ دنیا کے زیادہ ترقی یافتہ ملکوں مثلاً بھارت' کوریا' تائیوان اور برازیل میں یہ اخراجات قومی آمدنی کا ایک فیصد ہوتے ہیں۔

فی زمانہ پاکستان ٹیکنیکل سامان' ٹیکنیکل طرائق' مشینری و پلانٹ' بنیادی خام مال مندرجہ ذیل میدانوں میں باہر سے درآمد کرتا ہے۔

1 بہت سی مینو فیکچرنگ اور ایندھن صاف کرنے کی صنعتیں۔

2 مواصلات' ٹرانسپورٹ' انرجی بشمول ایٹمی پاور۔

3 ادویات' دوا سازی اور کھاد کی مینو فیکچرنگ۔

یہ امید کرنا بعید از حقیقت ہو گا کہ پاکستانی سائنس جلد ہی وسیع پیمانے کی ریسرچ اور ترقی کی کوشش کی بدولت ترقی یافتہ ممالک سے درآمد کردہ سائنسی طرائق و علوم کے برابر ہو جائے گی۔ دراصل ایک دانشمندانہ سائنسی پالیسی کی ضرورت ہے۔ جس سے ان میدانوں میں مقامی جدوجہد کے لئے راہ ہموار ہو۔ یہ پالیسی مربوط ہو اور اس کا دائرہ کار وسیع ہو تاکہ اس سے معاشی ثمرات جلد از جلد حاصل کئے جا سکیں۔ یہاں یہ ملحوظ رہے کہ جاپان جیسے ملک کی قومی آمدنی کا ڈیڑھ فیصد خرچ ہو جاتا ہے جب کہ اس بابت ہمارا خرچ اس کی آمدنی کا صرف ایک فیصد کا آٹھواں حصہ ہے۔

ایک نہایت افسوس ناک مثال پاکستانی یونیورسٹیوں میں سائنس کو نظرانداز کئے جانے کی ہے۔ گو ناقابل یقین مگر سچ ہے کہ پاکستان میں گریجویٹ سکول ٹرینگ کی کوئی روایت موجود نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ایک مثال پیش کروں گا۔ پاکستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی' پنجاب یونیورسٹی نے اپنے قیام سے لے کر اب تک سو سالوں میں ریاضیات میں ایک بھی پی-ایچ-ڈی پیدا نہیں کیا۔ پاکستان میں "سنٹر آف ایکسی لنس" جیسے الفاظ یونیورسٹی کے ریسرچ اداروں میں عام بول چال میں استعمال ہونے لگے ہیں۔ بدقسمتی سے ان الفاظ کا استعمال یہ تاثر دیتا ہے کہ اوسط کوالٹی کے گریجویٹ ادارے وہاں پہلے سے ہی موجود ہیں اور اگر انہیں مزید وسائل مہیا کر دیئے جائیں تو وہ ورلڈ کلاس حاصل کر سکتے ہیں۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ بہت سی یونیورسٹیوں میں بہت سے مضامین میں کسی بھی خصوصیت کا کوئی بھی پوسٹ گریجویٹ ادارہ موجود نہیں ہے' میں یہاں یہ درخواست کرتا ہوں کہ اگر ہر یونیورسٹی اور ہر شعبے کے لئے ممکن نہ ہو تو چند یونیورسٹیوں اور شعبوں ہی کے لئے نارمل پوسٹ گریجوئٹس تحقیقات کی سہولتوں کی فراہمی کے لئے علمی و مالی امداد دی جائے۔

اس طرح بہترین تدریس اور ریسرچ کے لئے آلات کے موجودہ سٹاف اور فنڈز میں دوگنا یا چوگنا اضافہ کرنا ناگزیر ہے۔ ایسے پوسٹ گریجوئٹس اداروں کے لئے کچھ فنڈز یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کی طرف سے مہیا کئے جائیں اور کچھ نیشنل سائنس فاؤنڈیشن کی طرف سے جس کی ہمیں جلد بنیاد رکھنی چاہیے۔ یہ ادارے غیر ملکی پوسٹ گریجویٹ ٹریننگ کی ضرورت کو بڑی حد تک دور کرتے ہوئے پی-ایچ-ڈی کی ڈگریاں دیا کریں گے۔

وہ ضروری اصلاح جسے میں پاکستان میں سائنسی تحقیقات کے سارے مستقبل کی بنیاد قرار دیتا ہوں' یونیورسٹیوں میں ریسرچ کے لئے بڑے پیمانے پر وسائل کی فراہمی اور اس کے لئے الگ سرمایہ مختص کرنا ہے' اس اصلاح کے بغیر پاکستانی سائنس کو نہ تو کوئی طاقت ہو گی نہ تو اس کی ریڑھ کی ہڈی مضبوط ہو گی اور نہ ہی اس کا کوئی پائیدار مستقبل ہو گا۔

ریسرچ ایسی فضا میں ہرگز نہیں پھولتی پھلتی جہاں قیادتی ڈھانچہ' معاش کے مواقع' مطلوبہ آلات اور سہولتوں کی فراہمی کے طرائق کار حکومت کے انتظامی محکمہ کے سپرد ہوں۔ یہ ضروری ہے کہ یونیورسٹیاں پاکستان کے اندر پوسٹ گریجویٹ اداروں میں ریسرچ پر زور دیں۔ اس میں مدد دینے کے لئے اور یونیورسٹیوں کی بنیادی سائنسوں میں ریسرچ کی کوششوں کی سرپرستی کے لئے یہ ضروری ہے کہ امریکہ میں نیشنل سائنس کونسل یا برطانیہ میں سائنس ریسرچ کونسل جیسا ادارہ قائم کیا جائے جو گریجویٹ ریسرچ ٹریننگ ایوارڈ اور ریسرچ فیلوشپ دیا کرے اور آلات کی خریداری کے لئے گرانٹ بھی دیا کرے۔"

دنیائے سائنس سے منقطع ہونے والے رابطہ کے بارے میں انہوں نے کہا: "اس سلسلے میں ایک ایسی جامع پالیسی اور سرمایہ کی فراہمی کی ضرورت ہے جو پاکستانی سائنس اور سائنس دانوں کو دنیائے سائنس سے الگ تھلگ نہ رکھے۔ اس لئے چھٹیوں کے ضابطوں سے پابندیاں اٹھائی جائیں۔ سائنس دانوں کو بیرون ملک جانے کے لئے فنڈز مہیا کئے جائیں اور سائنسی لٹریچر کی درآمد کرنے کے لئے سہولتیں دی جائیں۔ پاکستان شائد دنیا کے ان چند ممالک میں سے ایک ہے جس میں سائنس دانوں کو بیرونی ممالک میں سائنس کانفرنسوں میں شمولیت کے لئے صوبائی اور مرکزی وزیروں سے اجازت لینا ضروری ہوتا ہے۔"

آخر میں انہوں نے کہا: "سائنس کے بین الاقوامی کردار کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس کے خدوخال بھی بین الاقوامی ہیں۔ چاہے ان کا تعلق فی سائنس دان خرچ سے ہو یا سروس کے کوائف و شرائط سے' جس کے تحت اس کا کام ترقی کر سکتا ہے۔ ہمیں ہمیشہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہم اپنی بین الاقوامی سائنس پر خرچ کردہ رقومات کو صرف اسی صورت میں واپس لے سکتے ہیں جب ہم انہیں پاکستان میں سائنس پر صرف کریں۔"

بھائی جان کے اس مضمون سے یحیٰی خان کے دور میں وفاقی سیکرٹری مالیات (فنانس) مرزا مظفر احمد کو تحریک ہوئی اور انہوں نے "پاکستان سائنس فاؤنڈیشن" کے قیام کے لئے ایک کروڑ روپے مختص کرائے۔ (جسے بعد میں کم کر کے پچاس لاکھ روپے کر دیا گیا۔)

بھٹو کا دور 1971-1974

دسمبر 1971ء میں ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے صدر بن گئے۔ 1972ء کے اوائل میں ملتان میں آل پاکستان سائنس کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں زیڈ-اے بھٹو نے بحیثیت صدر و چیف مارشل لا ایڈ منسٹریٹر فیصلہ کیا کہ بھائی جان جو اپنی سائنس میں اپنی کارگزاریوں کی بدولت عالمی شہرت کے حامل اور نہایت واجب الاحترام شخصیت بن چکے تھے۔ بدستور صدر پاکستان کے سائنسی مشیر اعلیٰ کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں انجام دیتے رہیں۔ بھائی جان اس پر راضی ہو گئے کیونکہ ان کے خیال میں نئی حکومت کے آغاز کے ساتھ ہی پاکستان اپنی حیات کا ایک نیا ورق الٹنے والا تھا۔ کم سے کم جہاں تک سائنس اور ٹیکنالوجی کا تعلق تھا۔ فضا میں بھی جوش و خروش تھا لیکن ایک بار پھر انہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

1960ء سے بھائی جان پاکستان میں سائنس کے ذریعے پیداواری قوت میں ترقی اور معیار زندگی کی بہتری کے ترجمان چلے آ رہے تھے۔ سائنس کی ترقی کے لئے انہوں نے نہایت اہم تجاویز دیں۔ 1974ء تک حکومتوں کی سردمہری کی وجہ سے ان پر کچھ مایوسی اور نا امیدی سی طاری ہونے لگی۔ دکھائی یہ دیتا ہے کہ ترقی پذیر ممالک کی بیشتر حکومتیں مستقبل کی امید کے لئے جھوٹی تحریکات' اقتصادی خوشحالی کے لئے ترقی کے پر کشش وعدوں (از قسم روٹی' کپڑا' مکان) ماہرین کے بیانات سے اپنی عوام کو دھوکے اور فریب کے سنہری جال میں الجھائے رکھتی ہیں اور محض دکھاوے کے لئے ملکی و سائنسی ترقی کے منصوبوں پر کاغذی کارروائیاں کرتی رہتی ہیں۔ جنہیں عملی جامہ پہنائے جانے سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا' وہ ان کارگزاریوں کو اپنی سوسائٹی میں سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کی ترقی کے لئے جن پر ایثار اور جان لیوا کوششوں کی ضرورت ہے اس کے بدل کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ ان ممالک میں ہمیشہ ایسا کچھ ہی ہوتا چلا آتا ہے۔ نعرے بازی ہوتی ہے۔ ایک لیڈر آتا ہے اس کے ساتھ ہی رشوت کا بازار گرم ہوتا ہے۔ نا اہلیت اور فضول خرچی کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے۔ وعدے کئے جاتے ہیں جنہیں پورا نہیں کیا جاتا' جس کی وجہ سے عوام میں مایوسی پیدا ہونے لگتی ہے۔ عوامی ذمہ داریوں کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔ نسل انسانی کی توہین و تحقیر کی جاتی ہے۔ ان حالات میں برسر اقتدار لیڈر کو اقتدار سے ہٹانے کی جدوجہد شروع کر دی جاتی ہے۔ اسے بے دخل کرنے کے بعد نئے نعروں کی گونج میں ایک اور لیڈر آگے بڑھتا ہے لیکن عوام کی ایک بڑی تعداد جن کی ثقافتی اور سیاسی سطح پست ہوتی ہے' اپنے مفاد کے علاوہ قومی سطح پر ملکی مفادات کو نہیں دیکھ سکتی۔ ان حالات میں ایک مخلص قیادت کی ضرورت ہے جو بیسویں صدی کی ٹیکنالوجی اور سائنس کو ترقی دینے کے لئے صلاحیت رکھتی ہو۔

اسلامی نظام پر گزشتہ صدیوں سے کوئی عمل درآمد نہیں کیا گیا کیونکہ اس کے لئے ایسے آدمیوں کی تعداد ناکافی تھی۔ جنہیں صنعتی معاشرے کے پیدا کردہ عملی مسائل پر مکمل گرفت حاصل ہو۔ اس کے آدمیوں میں کمیونزم اور سرمایہ داری کے فلسفوں کے درمیان سیاسی مہارت' کام کرنے کے جذبے اور امنگ کا فقدان تھا۔ ایک عظیم مسلم معاشرے کے قیام کے مسائل اس سے بھی بڑے ہوتے ہیں جتنا کہ ہمیں دکھایا گیا ہے یا یقین دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر ہم ان کی صحیح نوعیت اور درپیش مشکلات کی وسعت کو بخوبی سمجھ سکیں تو ہمارے پاس ان سے نمٹنے کے سامان موجود ہوں۔

جہاں تک بھائی جان کا تعلق تھا' ان کی دلچسپی اس کام سے جو انہیں تفویض کیا گیا تھا سے بھی آگے نکل گئی۔ انہوں نے معاشرے کو مکمل طور پر اسلامی بنانے کے لئے دو مکتب فکر کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ بعض لوگ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ زکوۃ دینے' روزے رکھنے' نمازیں پڑھنے اور انفرادی پاکیزگی سے بیسویں صدی میں اسلام کی عظمت اور شوکت رفتہ کا احیاء ممکن ہو سکتا تھا۔ جب کہ ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ دوسرے مکتب فکر کا اعتقاد تھا کہ مسلم اقوام کی عظمت و شوکت رفتہ کا احیاء خاص طور پر جدید

سائنسی کلچر کی "اسلامائزیشن" کے عمل کے ایک جز کی حیثیت سے ترقی اور مسلم معاشروں سے جہالت و افلاس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے سے ہی ممکن ہو سکتا تھا۔

اس لئے 1974ء میں لاہور میں منعقد ہونے والی پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس میں پاکستان کی طرف سے "اسلامی سائنس فاؤنڈیشن" کے قیام کی تجویز پیش کی گئی۔ یہ تجویز بھائی جان نے بطور سائنسی مشیر اعلیٰ لکھ کر وزیر اعظم پاکستان زیڈ-اے بھٹو کو دی تھی۔ اس بارے میں بھائی جان نے لکھا:

اسلامی سائنس فاؤنڈیشن

(i) یہ اسلامی ممالک کی طرف سے ایک فاؤنڈیشن قائم کرنے کی تجویز ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو اعلیٰ سطح تک ترقی دی جائے۔ یہ فاؤنڈیشن (جو اسلامی کانفرنس سے مل کر کام کرے گی) مسلم ممالک کی کفالت سے بنائی جائے گی۔ جو اس کی سرپرستی کریں گے۔ اس کے کاموں کے لئے ایک ہزار ملین ڈالر مخصوص کئے جائیں، جس سے سالانہ آمدنی کا تخمینہ ساٹھ، ستر ملین ڈالر لگایا گیا ہے۔ یہ فاؤنڈیشن غیر سیاسی ہو گی۔ اسے مسلم ممالک کے چوٹی کے سائنس و ٹیکنالوجی کے ماہرین چلائیں گے۔

(ii) ضرورت

کوئی بھی مسلمان ملک جس کا تعلق خواہ مشرقِ وسطیٰ سے ہو یا مشرقِ بعید سے یا افریقہ سے ایسی اعلیٰ سطح کی سائنسی اور تکنیکی صلاحیت نہیں رکھتا جو معیار میں بین الاقوامی سطح کے برابر ہو۔ اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ حکومتوں اور معاشرے نے حالیہ برسوں میں اسے نظرانداز کیا ہے کہ ایسی صلاحیت حاصل کی جا سکے۔ اسلامی دنیا کا معیار بین الاقوامی معیار (جہاں تین فیصد اقتصادی طور پر فعال افرادی قوت، اعلیٰ تر سائنسی، طبعی اور ٹیکنالوجیکل جدوجہد میں مصروف ہے اور جہاں جی-این-پی کا ایک سے دو فیصد اس مد پر خرچ ہوتا ہے) جو تمام اسلامی دنیا میں موجود ہے وہ اس کا دسواں حصہ ہے جس کی جدید معاشرے میں توقع کی جا سکتی ہے۔

(iii) فاؤنڈیشن کے مقاصد

یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ وسائل سے بہتر طور پر مزین، اسلامی سائنس فاؤنڈیشن تخلیق کی جائے جس کے دو مقاصد ہوں۔ ایسے افراد پیدا کرے جو اعلیٰ سطح کی سائنسی تربیت رکھتے ہوں اور وہ سائنسی ادارے قائم کرے۔

(ا) یہ فاؤنڈیشن وہاں سائنس دانوں کے ایسے نئے تنظیمی معاشرے تشکیل دے گی، جہاں وہ موجود نہیں ہے اور اس معاشرے کو مضبوط کرے گی جو موجود ہیں۔ ایسا باقاعدہ طور پر کیا جائے گا اور اسے جلدی سے جلدی مکمل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(ب) فاؤنڈیشن بین الاقوامی سطح کے اعلیٰ سائنسی تحقیقاتی ادارے بنانے اور مضبوط کرنے میں مدد دے

گی۔ یہ ادارے نظریاتی اور اطلاقی دونوں طرح کے ہوں گے' ان میں مسلم ممالک کی ضروریات اور ان کی ترقی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

فاؤنڈیشن اس بات پر زور دے گی کہ سائنس کے سلسلے میں جو کچھ بھی کیا جائے وہ بین الاقوامی معیار اور حصول کے مطابق ہو۔ جن دو مقاصد کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی ایسے افراد پیدا کرنا جو اعلیٰ سائنسی سطح رکھتے ہوں۔ فاؤنڈیشن کے ابتدائی مراحل میں انہیں فوقیت دی جائے گی۔

(iv) پروگرام

اپنے مقاصد کے حصول کے لئے:

(ا) ایسی افرادی قوت بنانا جسے باقاعدہ طور پر اعلیٰ سائنسی صلاحیت حاصل ہو۔

(ب) اس افرادی قوت کو اسلامی معاشروں کی بہبود اور مضبوطی کے لئے استعمال کرنے کے لئے فاؤنڈیشن مندرجہ ذیل پروگرام پر عمل کرے گی۔

(ا) سائنسی برادریاں بنائیں جائیں گی

(i) سکالروں کی کفالت کی جائے گی کہ وہ سائنس میں اعلیٰ تر تعلیم حاصل کریں' وہ علاقے جہاں سائنس کے سربرآوردہ لوگ موجود نہ ہوں' انہیں یہ علم کہیں سے بھی فراہم کیا جائے گا۔ جب ایسے لوگ حصول علم کے بعد اپنے وطن واپس آئیں گے تو کوشش کی جائے گی کہ ان کا کام جاری رکھا جائے۔ دس ملین ڈالر کوئی چار ہزار سکالروں کی ایک سال کی ضروریات کے لئے کافی ہو گا۔ جو اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہوں گے اور ہزار سکالروں کی ضروریات کو اس وقت پورا کرے گا جب ان کے وطن میں انہیں ان سہولتوں کی ضرورت ہو گی۔

(ii) یہ پروگرام موجودہ سائنسی رہنماؤں کے گرد تشکیل دیا جائے گا۔ تاکہ اعلیٰ سطح کی سائنسی افرادی قوت حاصل ہو سکے۔ اس مقصد کے لئے یونیورسٹی کے شعبوں کو کونٹرکٹ (Contract) دیا جائے گا۔ تاکہ منتخب شعبوں میں ان کا کام قوی تر بنیادوں پر استوار ہو سکے۔ یونیورسٹیوں کی فیکلیٹوں کا معیار ایسے کانٹرکٹ (Contract) فراہم کرنے کی بنیاد پر ہو گا۔ ان معیاروں پر کوئی پندرہ ملین ڈالر سالانہ خرچ ہو گا۔

(iii) اسلامی دنیا کے سکالروں کا دنیا کے سائنٹیفک طبقے سے رابطہ

مسلم دنیا میں موجودہ سائنس کمزور ہے کیونکہ وہ الگ تھلگ ہے' مسلم ممالک کے سکالروں کا دنیا بھر کے سائنسی طبقے کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے' سائنس تو زندہ ہی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ آپس میں تبادلہ خیالات ہو اور تنقید کا سلسلہ مسلسل جاری رہے۔ ان ممالک میں جہاں بین الاقوامی سائنسی رابطہ نہ ہو' وہاں سائنس جمہور کا شکار ہو کر مرجاتی ہے۔ فاؤنڈیشن کوشش کرے گی کہ یہ صورت حال تبدیل ہو۔

اس کا حصول اس طرح ہوگا کہ دونوں طرف کے سکالر اور فیلو ایک دوسرے کے ہاں آئیں جائیں گے اور اس کے ساتھ بین الاقوامی مباحثے اور کانفرنسیں ہوں گی۔ اس پر کوئی نو ملین لاگت آئے گی۔ جس کی مدد سے ہر سال دو ماہ کی مدت کی بنیاد پر کوئی تین ہزار ملاقاتیں (Visits) ہوں گیئں اور ان کا پھیلاؤ دس علوم اور 75 ممالک تک ہوگا اور اس میں ہر ملک اور ہر سائنس کے بیس دورے ہوں گے۔

(ب) متعلقہ اطلاقی تحقیق کی کفالت

فاؤنڈیشن مشرقی وسطیٰ اور اسلامی دنیا میں ترقی کے مسائل پر نئے تحقیقی ادارے قائم کرے گی اور پرانے اداروں کو بھی تقویت دے گی۔ اس پر کوئی پنتیس ملین ڈالر خرچ ہوں گے۔ بین الاقوامی طور پر معیار کے یہ نئے ادارے صحت' ٹیکنالوجی (بشمول پٹرولیم ٹیکنالوجی) زراعتی ٹیکنالوجی اور آبی ذرائع کے لئے وقف ہوں گے۔ یہ ادارے اقوام متحدہ یونیورسٹی سسٹم کے یونٹ بن جائیں گے۔ تاکہ کوالٹی کا بین الاقوامی معیار اور حصول بین الاقوامی کمیونٹی کے ذریعے حاصل کیا جا سکے۔ ایک کامیاب ادارہ جیسا کہ فلپائن کا انٹرنیشنل رائس انسٹی ٹیوٹ ہے' قائم کرنے میں پچپن چھپن ملین ڈالر کے مصارف اٹھتے ہیں اور تقریباً اتنی ہی رقم ان کو بین الاقوامی سطح پر چلانے کے لئے صرف ہوگی۔

(ج) فاؤنڈیشن کی اسلامی ممالک کی عمومی آبادی کو ٹیکنالوجی اور سائنسی ذہن بنانے کے لئے کوئی پچپن ملین ڈالر خرچ کرنے پڑیں گے۔ اس کا حصول ان ہدایات کے ذریعے ہوگا جو ماس میڈیا (Mass Media) سائنس میوزیم' کتب خانے اور نمائشوں کے ذریعے دی جائیں گی اور ان کے علاوہ دریافتوں اور ایجادوں پر انعامات بھی دیئے جائیں گے۔ یہ انتہائی ضروری ہے کہ لوگ سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت کو سمجھیں' اگر ہم واقعی اس امر کے خواہش مند ہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی ہمارے معاشرے پر اثر انداز ہو۔

(د) فاؤنڈیشن یونیورسٹی اور اسکول کی سطح پر سائنس اور ٹیکنالوجی کے نصاب کو جدید تقاضوں کے مطابق بنانے میں مدد دے گی۔

(V) فاؤنڈیشن کے تفاعل (Functions)

(ا) فاؤنڈیشن کا آغاز اور کفالت وہ تمام اسلامی ممالک کریں گے جو اسلامی کانفرنس کے ممبر ہیں۔

(ب) فاؤنڈیشن کا مرکزی دفتر اس جگہ ہوگا جہاں کانفرنس کا مرکزی دفتر ہوگا۔ اپنے تمام تحقیقی مراکز اور بنائے ہوئے پراجیکٹوں سے فعال اور مسلسل رابطہ رکھنے کے لئے فاؤنڈیشن ذیلی دفتر بھی بنا سکتی ہے یا ایسے سائنسی نمائندے رکھ سکتی ہے جو گھوم پھر کر کارکردگی کی نگرانی کریں۔

(ج) فاؤنڈیشن کے ٹرسٹیوں (Trustees) کا بورڈ اس امر کا ذمہ دار ہوگا کہ وہ مختلف حکومتوں کے ساتھ رابطہ رکھے۔ اس کے اراکین مختلف حکومتوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوں گے۔ بہتر ہوگا کہ وہ سائنس دان ہوں۔

(د) فاؤنڈیشن ایک انتظامی کونسل ہوگی۔ جس میں مسلم ممالک کے سربرآوردہ سائنس دان شامل ہوں گے۔ پہلی کونسل اور اس کا صدر (جو کہ فاؤنڈیشن کا چیف ایگزیکٹو بھی ہوگا) پانچ برس کے لئے ہوگا اور اسے بورڈ آف ٹرسٹیز منتخب کرے گا۔ یہ کونسل فیصلہ کرے گی کہ فاؤنڈیشن کی حکمت عملی کیا ہوگی' مصارف کیسے کئے جائیں گے' فنڈ کی تقسیم کیسے ہوگی اور انتظامی امور کیسے چلائے جائیں گے؟ فاؤنڈیشن اور اس کی انتظامی کونسل ہر طرح کے سیاسی اثر سے آزاد ہوگی۔ بورڈ آف ٹرسٹیز کو قانونی طور پر استحاق دیا جائے گا کہ وہ اسے لاگو کر سکیں۔

(ہ) فاؤنڈیشن کو ایک رجسٹرڈ نفع نہ کمانے والے ادارے کی قانونی حیثیت بھی حاصل ہوگی کہ اس کے اپنے ماحصل (Endowment) اور ملازمین کی تنخواہیں ٹیکس سے مستثنیٰ ہوں گیں۔

فاؤنڈیشن اقوام متحدہ' یونیسکو اور اقوام متحدہ کے تعلیمی سسٹم کے ساتھ ایک غیر سرکاری ادارے (Non Government Organization) کی حیثیت میں رابطہ رکھے گی۔

(vi) فاؤنڈیشن کی مالیات

(ا) یہ توقع کی جاتی ہے کہ کفالت فراہم کرنے والے ممالک یہ ذمے داری قبول کریں گے کہ وہ مختص کردہ ایک ہزار ملین ڈالر چار سالانہ اقساط میں ادا کریں گے۔

(ب) وقف فنڈ کا تناسب جو ہر کفالت کرنے والا ملک اپنے حصے کے طور پر ادا کرے گا' اس کا انحصار اس امر پر ہوگا کہ اس ملک کی برآمدات کتنی ہیں۔ بہرصورت 1972ء کی سطح پر پچیّس ملین ڈالر سالانہ ایک ایسی شراکت ہے جو ایک فیصد سالانہ سے کم بنتی ہے مگر یہ اساس ایک بلین ڈالر کا سرمایہ چار سال سے زائد میں قائم کرنے کے لئے کافی ہوگا۔''

3 جولائی 1973ء کو یہ یادداشت 1973ء کی معاشی فضا دیکھ کر لکھی گئی تھی۔ ان تجاویز پر تمام اسلامی ممالک کی حکومتوں کی طرف سے فوری غور و خوض کیا جانے لگا۔ 1981ء کی طائف کانفرنس کے موقع پر مسلم ممالک نے فاؤنڈیشن کے قیام کے لئے پچاس ملین ڈالر کی رقم کے حق میں ووٹ دیئے جو بھائی جان کی تجویز کردہ رقم کے مقابلے میں آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ کہاں ایک ہزار ملین ڈالر کی تجویز اور کہاں صرف پچاس ملین ڈالر کی منظوری۔

اسلامی ممالک میں سائنس کی ترقی کے لئے بھائی جان کے دل میں جو تڑپ تھی' اس کی ایک جھلک ان کی اسلامی فاؤنڈیشن کے قیام کے بارے میں مندرجہ بالا تحریر کردہ تجویز سے دیکھی جا سکتی ہے۔

(ماخوذ ''اسلام اور سائنس''' ''ارمان اور حقیقت' ص 184۔215)

بھیانک سازش

ستمبر 1974ء میں ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت بعض سیاسی اغراض کے تابع اس وقت کی بھٹو

حکومت نے قومی اسمبلی کے ذریعے احمدیوں کو دائرہ اسلام سے خارج کرتے ہوئے انہیں قانونی مقاصد کے لئے "ناٹ مسلم" قرار دیا۔ چنانچہ 10 ستمبر 1974ء کو بھائی جان نے انتہائی دکھے دل کے ساتھ بحیثیت اعزازی سائنسی مشیر اعلیٰ اپنا استعفیٰ وزیر اعظم بھٹو کو پیش کر دیا۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے لکھا:

"آپ جانتے ہیں کہ میں اسلام کے احمدیہ فرقہ کا ایک رکن ہوں۔ میرے خیال میں حال ہی میں قومی اسمبلی نے اس فرقہ سے متعلق جو قرارداد منظور کی ہے وہ اسلام کی روح کے منافی ہے۔ کیونکہ اسلام مذہبی رواداری کا حامی ہے اور خالق اور مخلوق کے تعلق میں مداخلت کرنا اس کی پالیسی نہیں اور نہ کسی اسلامی فرقہ کے بارے میں کفر و ارتداد کا فتویٰ دنیا اسلامی تعلیمات کے لحاظ سے جائز ہے۔

میں قومی اسمبلی کے اس فیصلہ کو ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا' لیکن اب جب کہ یہ فیصلہ ہو چکا ہے اور اس پر عمل درآمد کا آغاز بھی کیا جا چکا ہے تو میرے لئے بہتر یہی ہے کہ میں اس حکومت سے قطع تعلق کر لوں جس نے ایسا مضحکہ خیز قانون منظور کیا ہے۔"

وزیر اعظم بھٹو نے بھائی جان کا استعفیٰ منظور کر لیا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ غیر رسمی طور پر اپنے ملک کے لئے سائنسی مشورے دیتے رہا کریں۔ بھائی جان نے یہ بات مان لی۔

اسی زمانے میں ان کا ایک اور کارنامہ 1976ء میں نتھیا گلی کے مقام پر پاکستان اٹامک انرجی کمیشن' ٹریسٹ سنٹر اور پہلے سال کے لئے سویڈش ڈیویلپمنٹ اتھارٹی (ایس-آئی-ڈی-اے SIDA) کی سپانسر شپ میں انٹرنیشنل سیمنار کا انعقاد تھا۔ نتھیا گلی میں یہ سکول آج تک منعقد ہو رہا ہے اور ہر سال دنیا کے چوٹی کے سائنس دان اس میں اپنے تحقیقی مقالے پڑھتے ہیں۔

1977ء میں بھارتی ماہر طبعیات ایس-این بوس کی سو سالہ بین الاقوامی تقریبات کے موقع پر بھارت جاتے ہوئے کراچی کے ہوائی اڈہ پر بھائی جان کی ملاقات ان کے ایک دوست ڈاکٹر عبدالغنی سے ہوئی۔ وہ امپیریل کالج لندن میں بھائی جان کے شاگرد تھے۔ ڈاکٹر عبدالغنی کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ انہوں نے داڑھی رکھ لی تھی۔ اس تبدیلی کی وجہ دریافت کرنے پر بھائی جان نے جواب دیا: "تم لوگوں نے مجھے خارج از اسلام تو ضرور قرار دے دیا ہے لیکن تم مجھے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کرنے سے نہیں روک سکتے۔"

جب ان سے یہ دریافت کیا گیا کہ بھٹو حکومت کے اس فیصلہ پر انہوں نے کیا محسوس کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب میں کہا: "پچھلی کئی صدیوں کی تاریخ گواہ ہے کہ ہمارے علماء نے کافر گری کا کاروبار پھیلا رکھا ہے۔ جہاں کسی نے ان سے ذرا سا بھی اختلاف کیا اس کے خلاف کفر و ارتداد کا فتویٰ آ گیا۔ ہمارے اکابر میں کون ہے جو ان کے اس وار سے بچا ہو۔ اس سلسلے کی سب سے زیادہ دردناک مثال سر سید کی ہے جن کو مسلمانوں کے ہر مذہبی مکتب فکر نے دین سے خارج سمجھا اور بعضوں نے تو ان کو واجب القتل

بھی قرار دے دیا تھا۔ دراصل بھٹو حکومت نے خلاف احمدیت قانون کی منظوری دے کر ایک انتہائی فاش غلطی اور ایک بڑے ظلم کا ارتکاب کیا ہے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں پہلے کی ہی طرح حتیٰ المقدور ملک و ملت کی بے لوث خدمت کرتا رہوں گا۔ البتہ بھٹو حکومت نے ایک اور لحاظ سے بھی ایک بڑے ظلم کا ارتکاب کیا ہے کہ اس نے دنیا کی نگاہ میں امت مسلمہ کو سائنس و ٹیکنالوجی کے لئے ایک پرزور آواز اٹھانے والے سے محروم کر دیا ہے۔ رہی کٹر ملاؤں کے رویے کی بات تو اس کی فکر مجھے کیوں ہو۔ جب کہ میں خود کو بوعلی سینا کی قطار میں پاتا ہوں' جنہیں میری ہی طرح کافر کہا گیا تھا اور جس کا جواب انہوں نے یہ دیا:

کفرے چومن گزاف آساں نبود　　　　بحکم تراز ایمان من ایمان نبود
در دہر چومن یکے و آنہم کافر　　　　پس درہمہ دہر یک مسلمان نبود

ترجمہ: "اگر تم مجھ پر کفر کا فتویٰ لگاتے ہو تو یہ کوئی آسان بات نہیں' کیونکہ (اسلام پر) کسی اور کا یقین اتنا محکم نہیں جتنا کہ میرا ہے جب تم مجھ جیسے یکتا مسلمان کو بھی کافر قرار دیتے ہو تو پھر دنیا میں مسلمان کون باقی بچا۔"

بھٹو کے بعد ضیاء الحق' غلام اسحاق اور بے نظیر بھٹو کے دور آئے۔ بھائی جان اپنے ملک کی خدمت کرتے رہے کیونکہ ایسا کرنا ان کے ایمان کا حصہ تھا۔

ایک مرتبہ وہ پاکستان آئے اس وقت بے نظیر بھٹو ملک کی وزیر اعظم تھیں' لیکن اس نے بھائی جان سے خود ملاقات کرنے کی بجائے اپنے سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے وزیر کو ان سے ملاقات کے لئے بھجوایا۔ بھائی جان اس وزیر سے متعارف نہ تھے۔ ان سے جب بھائی جان نے دریافت کیا کہ "جناب آپ کی تعلیم کیا ہے؟" تو انہوں نے بتایا کہ "وہ ایم-اے پولٹیکل سائنس ہیں۔ ضیاء الحق کے دور حکومت میں انہوں نے کوڑے کھائے تھے اور وہ کچھ عرصہ جیل میں رہے تھے۔"

البتہ اس وقت کے صدر غلام اسحاق خان نے بھائی جان کو ایوان صدر میں ظہرانہ کی دعوت دی اور ان سے ملاقات کی تھی۔

9

نظریاتی طبعیات کا بین الاقوامی مرکز (ICTP) ٹریسٹ (اٹلی)

تقریباً اڑھائی ہزار سال قبل افلاطون نے یونان کے شہر تیھنز کے نزدیک ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ جس میں نوجوانوں کو بنی نوع انسان کے مسائل سمجھنے اور ان سے ہمدردی اور شائستگی سے پیش آنے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ایسا ہی خواب جھنگ کے ایک نوجوان نے بھی دیکھا تھا۔ اس نے تمام دنیا خاص طور پر غریب ممالک میں غربت اور محرومیوں کے شکار ذہین نوجوانوں کی تعلیمی ضروریات پوری کرنے کے لئے ایک ادارہ قائم کرنے کا عہد کیا۔ نظریاتی طبعیات کا بین الاقوامی مرکز اس عہد کی تکمیل ہے۔ جب آپ ٹریسٹ سنٹر میں جائیں تو وہاں اس کی عمارت کی دوسری منزل پر کونے کے ایک کمرے میں گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ایک شخص نظر آئے گا جسے دیکھتے ہی ایتھنز کے اس فلاسفر کی یاد آ جاتی ہے جس نے انسانوں کو ہمدردی اور منطق کا پہلا سبق دیا تھا۔ اللہ عبدالسلام پر فضل کرے اور اسے عمر دراز عطا کرے۔

(پروفیسر اے-ایم ہارون الرشید یونیورسٹی آف ڈھاکہ' بنگلہ دیش)

(From a Vision to a System ICTP, page 260 - 1994)

بھائی جان نظریاتی طبعیات کے اعلیٰ محقق بن کر ابھرے تھے۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ملازمت کا آغاز کیا اور جلد ہی انہوں نے یہ محسوس کیا کہ وہاں رہتے ہوئے وہ تحقیقی کام نہیں کر سکیں گے کیونکہ وہاں کوئی اچھی لائبریری نہیں تھی۔ وہاں طبعیات کا کوئی لٹریچر موجود نہ تھا اور نہ ہی وہاں کسی طرح کا بین الاقوامی رابطہ تھا وہ اپنے آپ کو اکیلا اور الگ تھلگ محسوس کرتے تھے۔ ان کے خیال میں یہ اکیلا پن نظریاتی طبعیات میں تحقیق کے نقطہ نظر سے موت تھا۔

فزکس ٹوڈے (Physics Today) کے نومبر 1978ء کے شمارے میں بھائی جان کی ایک تحریر شائع ہوئی تھی' جس میں انہوں نے لکھا: "طبعیات میں تحقیق کو اپنانا خواہ یہ تحقیق نظریاتی ہی کیوں نہ ہو۔ ترقی پذیر ملک میں ایک دل شکن کام بن جاتا ہے۔ جب میں 1951ء میں کیمبرج اور پرنسٹن میں پارٹیکل طبعیات (Particle Physics) پر کام کرنے کے بعد پاکستان لوٹا تو نو کروڑ کی آبادی کے اس ملک میں

صرف ایک ماہر طبعیات ایسا تھا جس نے ڈیراک (Dirac) کی مساوات (Equation) پر کام کیا ہوا تھا۔ جس سے میں بات چیت اور مشورہ کر سکتا تھا اور جس سے مجھے تحریک حاصل ہوتی تھی۔ فزیکل ریویو (فزکس پر اعلیٰ پایہ کا رسالہ.... ناقل) کے تازہ ترین شمارے جو وہاں موجود تھے وہ جنگ عظیم سے ذرا پہلے یعنی 1939ء سے تعلق رکھتے تھے۔ کوئی ایسی گرانٹ موجود نہیں تھی، جس کے تحت سپوزیم یا کانفرنسوں میں شرکت کی جاسکے۔ بس ایک ہی بار میں برطانیہ میں ایک کانفرنس میں شرکت کرپایا تھا اور اس پر میری سال بھر کی جمع پونجی صرف ہوگئی تھی۔"

ایسے حالات میں تحقیقی کام آسان نہ تھا۔ چنانچہ بھائی جان نے یہ عہد کیا کہ وہ ایک ایسا طریق کار ڈھونڈھ نکالنے کی کوشش کریں گے جو ان لائق اور ذہین افراد کے علمی بن باس کو دور کرنے میں مددگار ثابت ہو جو اپنے ملکوں میں رہتے ہوئے کام کرنا چاہتے ہیں لیکن سہولتیں میسر نہ ہونے کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کرسکتے۔

خوش قسمتی سے بھائی جان کا اپنا "علمی بن باس" اس وقت ختم ہوا جب کیمبرج یونیورسٹی نے انہیں اپنے ہاں ملازمت کی پیش کش کی۔ کیمبرج اور بعد میں امپیریل کالج میں ملازمت کے دوران وہ اپنے عہد کو عملی جامہ پہنانے کے بارے میں مسلسل سوچتے رہے۔ خلوص دل اور نیک نیتی سے انسان جب کوئی کام کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ بھی اس کی مدد کرتا ہے۔ ستمبر 1960ء میں بھائی جان امریکہ کے شہر روچسٹر میں ایک سائنس کانفرنس میں شمولیت کے لئے گئے۔ وہاں امریکہ کے ایٹمی توانائی کمیشن کے صدر جان میکون نے طبعیات کا ایک بین الاقوامی سینٹر قائم کرنے کی طرف اشارہ کیا۔ اس سے بھائی جان کو اپنا عہد پورا کرنے میں امید کی ایک کرن نظر آئی۔ ہاں وہی عہد جسے وہ 1953ء سے اپنے ساتھ لئے پھرتے رہتے تھے۔ اس بارے میں بھائی جان کی تقاریر اور بیانات میں سے چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں:

"ستمبر 1960ء میں روچسٹر کانفرنس کے موقع پر کھانے کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر جان میکون (Mr. John Mecone) جو اس زمانے میں امریکہ کے ایٹمی توانائی کمشن کے صدر تھے نے یہ اشارہ کیا تھا کہ طبعیات کا ایک بین الاقوامی مرکز قائم کیا جانا چاہیے۔ اصل میں ان کے ذہن میں ایک ایسا ادارہ تھا جہاں مسرع (Accelerator) لگایا ہو جو امریکہ، روس اور یورپی ممالک کے تعاون سے عمل میں آئے۔ کھانے کے بعد کافی پیتے ہوئے مجھے یاد ہے جو مکالمہ میرے اور ہنس بیتھے (Hans Bethe) رچرڈ ساخس (Richard Sachs) اور نیکولس کیمر (Nicholas Kemmer) کے مابین روچسٹر یونیورسٹی کی خواتین کے خوبصورت رہائشی ہال میں ہوا تھا۔ اس میں ہم نے اس بات پر گفتگو کی تھی کہ عملی طور پر ایسا مرکز کس طریقے سے قائم کیا جائے۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ سب سے زیادہ سادہ بات یہ ہوگی کہ ایک بین الاقوامی نظریاتی طبعیات کے مرکز کے بارے میں سوچا جائے۔"

”اسی ماہ مجھے یہ موقع ملا کہ میں حکومت پاکستان کی طرف سے اس سلسلے میں آواز اٹھا سکوں۔ (مجھے انٹرنیشنل ایٹمی توانائی ایجنسی وی آنا (آسٹریا) کی سالانہ کانفرنس میں پاکستان کے نمائندے کے طور پر شرکت کا موقع ملا تھا) یہ آئیڈیل جو محض تصور کی صورت میں تھا اس نے انٹرنیشنل ایٹمی توانائی ایجنسی کی سالانہ کانفرنس میں ایک قرارداد کی شکل اختیار کر لی۔ یہ جلسہ وی آنا میں ہوا تھا۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ حکومت افغانستان، جمہوریہ جرمنی، ایران، عراق، جاپان، فلپائن، پرتگال، تھائی لینڈ اور ترکی بھی ہمارے ساتھ قرار داد کو پیش کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ جیسا کہ قرارداد پیش کرنے والوں کی فہرست سے ظاہر ہے کہ ایسا مرکز قائم کرنا صرف کم سہولت یافتہ ممالک کے افادے میں تھا۔ بلکہ بہت سے ترقی یافتہ ممالک بھی اس میں دلچسپی لے رہے تھے۔ توقع یہ تھی کہ اس قسم کا کوئی مرکز نہ صرف مشرق اور مغرب کے سائنس دانوں کو ایک مفاہمتی بین الاقوامی تحقیق کے لئے موقع فراہم کرے گا بلکہ وہ ایک پریشان کن مسئلے کو حل کرنے میں بھی مددگار ثابت ہو گا کہ غریب ممالک کے سائنس دان خود کو دنیا سے کٹا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ ایسے لوگوں کی مدد کے لئے جب بین الاقوامی سرمایہ فراہم ہو گا تو وہ متعدد بار اس مرکز میں اپنے روابط کو تازہ کرنے کے لئے اور تحقیق کے میدان میں فعال رہنے کے لئے آیا کریں گے۔

ابتدا ہی سے ہمیں طبعیات برادری کی گرم جوش حمایت حاصل رہی۔ نیلس بوہر (Niels Bohar) (نوبل انعام یافتہ 1922ء) نے اپنی وفات سے پہلے اپنے مکمل تعاون کی یقین دہائی کرائی، جو اس سائنٹیفک پینل میں کرائی گئی تھی۔ جس کا اہتمام 1961ء میں کیا گیا تھا۔ اس پینل کے اراکین آگی بوہر (Aage Bohar) (نوبل انعام 1975ء) پولو بوڈینخک (Paolo Budinich)، برنارڈ فلڈ (Bernard Feld)، لیوپولڈ انفلڈ (Leopold Infeld)، موری لیوی (Maurice Levy) اور والٹر تھیرنگ (Walter Therring) تھے۔“

امریکہ اور روس جیسی بڑی طاقتوں کے علاوہ بعض ترقی پذیر ممالک نے نظریاتی طبعیات کا بین الاقوامی مرکز قائم کرنے کی مخالفت کی تھی۔ 1961ء سے 1963ء تک بھائی جان انٹرنیشنل ایٹمی توانائی ایجنسی کی سالانہ کانفرنسوں میں اس مخالفت کا مقابلہ کرتے رہے اور عالمی ادارہ برائے نظریاتی طبعیات کے قیام کے لئے کوشاں رہے۔

مندرجہ ذیل خطبہ بھائی جان نے انٹرنیشنل ایٹمی توانائی ایجنسی کی سالانہ کانفرنس کے موقع پر 1962ء میں وی آنا (آسٹریا) میں نظریاتی طبعیات کے بین الاقوامی مرکز تخلیق کرنے کی قرارداد پیش کرتے ہوئے دیا:

نظریاتی طبعیات کے بین الاقوامی مرکز کی ضرورت

”دو برس پہلے ستمبر 1960ء میں پاکستان کے وفد کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ وہ نظریاتی طبعیات کا بین الاقوامی مرکز قائم کرنے کے لئے ایک ادارہ بنانے کی قرارداد کو دوسروں کے ساتھ مل کر پیش کرے۔ ان

دو برسوں میں یہ خیال آگے بڑھا ہے۔ اول تو اس وجہ سے کہ ڈینش (Danish) اور اطالوی حکومتوں نے فیاضانہ مالی امداد کی پیشکش کی ہے تاکہ ایسا مرکز قائم کیا جاسکے۔ دوم یہ کہ دنیا بھر کے ماہرین طبعیات نے اس خیال کی شدومد کے ساتھ حمایت کی ہے۔ ماہرین طبعیات کی جماعت (Panel) نے جسے مارچ 1961ء میں ڈائریکٹر جنرل نے قائم کیا تھا۔ (جن کی رپورٹ اراکین حکومتوں کو بھجوائی گئی ہے) انہوں نے جوش و خروش کے ساتھ مرکز کے خیال کی تائید کی ہے اور اس کا دائرہ کار متعین کیا ہے اور مقاصد واضح کئے ہیں کہ وہ کس طریقے سے قائم کیا جائے اور کیسے چلایا جائے۔ میں بار بار ان نتائج کا حوالہ دوں گا جو اس پینل نے نکالے ہیں۔

اس سوال کو زیر غور لاتے ہوئے کہ کیا ایجنسی کو یہ مرکز قائم کرنا چاہیے۔ تین سوالات ہیں جو ہمیں خود سے پوچھنے پڑتے ہیں:

1 کیا ایجنسی کی سرگرمیوں کے دائرہ کار میں نظریاتی طبعیات کی تحقیق آتی ہے یا نہیں؟

2 کیا ابھرتے ہوئے ممالک کے ماہرین طبعیات کو حقیقی طور پر ایسے مرکز کی ضرورت ہے' کیا وہ ایسا چاہتے ہیں؟

3 اگر مرکز کی ضرورت ہے تو کیا وہ قائم کیا جاسکتا ہے اور کیا ایجنسی ایسا کرنے کی استطاعت رکھتی ہے؟

آیئے اس معاملے کو ان تین سوالات کی روشنی میں دیکھیں۔ پہلا یہ سوال ہے کہ کیا نظریاتی تحقیق ایجنسی کی سرگرمیوں کے دائرہ کار میں آتی ہے؟

قرارداد پیش کرنے والوں کی گزارش یہ تھی کہ بلاشبہ کم ہی علوم نے ایٹمی دور کو دنیا میں لانے کے لئے اتنا کام کیا' جتنا کہ نظریاتی طبعیات نے کیا ہے' اگر ہم اس امر کو فراموش بھی کردیں کہ آئن سٹائن دنیا کا پہلا سائنس دان تھا جس نے کمیت (Mass) اور توانائی (Energy) کے مساوی ہونے کا خواب دیکھا تھا اور ہماری سائنس کے لئے پوری بنیاد مہیا کی تھی۔ اگر ہم یہ بھول جائیں کہ دنیا کے دو چوٹی کے ماہرین نظریاتی طبعیات فرمی (Fermi) (نوبل انعام 1938ء) اور ویگنر (Wigner) (نوبل انعام 1963) نے حقیقی طور پر دنیا کا پہلا ایٹمی ری ایکٹر بنایا تھا۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ابھی تک طبعیات میں ایسے علاقے موجود ہیں' جو نظریاتی پلازمہ (Plasma) طبعیات میں خالی پڑے ہیں۔ جو فیوژن (Fusion) (طاقت) کو جاری کرنے کے لئے لازمی ہیں۔ ہمیں کسی صورت میں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ نیوکلر طبعیات میں جاری پیش قدمی کے باوجود ہمیں ابھی تک یہ معلوم نہیں ہے کہ دو نیوکلونز (Nucleons) کے درمیان توانائی کے قانون کا نظریاتی اظہار کیا ہے؟ بلاشبہ یہ معاملات نظریاتی طبعیات کے اپنے معاملات ہیں جو ایجنسی کے لئے بلاواسطہ اور فوری اہمیت کے حامل ہیں اور ان میں ریسرچ کرنا اس کی بڑی ذمہ داری ہے۔ آیئے ان معاملات (Areas) کی پہچان کریں یہ ری ایکٹر نظریہ پلازمہ (Plasma) نظریہ' پست (Low) انرجی نیوکلیر طبعیات' نظریاتی اعلیٰ انرجی نیوکلیر طبعیات'

جس آخری طبعیات کا ذکر کیا گیا ہے وہ بہت زیادہ مفکرانہ نظریاتی طبعیات ہے۔ مگر بعض اوقات مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہماری ایجنسی اس نامعلوم نوجوان ماہر طبعیات کی درخواست کا کیا جواب دیتی' اگر 1904ء میں البرٹ آئن سٹائن فیلوشپ کے لئے باقاعدہ درخواست دیتے اور کہتے کہ میری تصورات کا اطلاق' امکان و زمان پر کر کے دیکھو' ہم میں سے کون یہ سوچ سکتا تھا کہ وہ اتنا بڑا ہو جائے گا اور اس کے اسی مضمون میں توانائی اور کمیت کا مسئلہ بھی موجود ہے؟ ہم میں سے کون آج یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ کل کے توانائی کے مسائل کے لئے ماؤن فیوژن کے بارے میں نظریاتی غور و فکر غیر متعلقہ ہو۔

جو بیان میں نے نظریاتی طبعیات اور اس کے متعلقہ ایجنسی کی سرگرمیوں پر دیا ہے' اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں نے سائنس کے دوسرے شعبوں کے کردار سے انکار کیا ہے اور نہ ہی میں نے یہ کہا ہے کہ ان کی ذمے داری ایجنسی پر نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ نظریاتی طبعیات کا ایک کلیم (Claim) جو اس سے مخصوص ہے۔ یہ ہے کہ نظریاتی طبعیات کو کسی طرح کے آلات کی ضرورت نہیں' چنانچہ یہ سب سائنسوں سے کہیں زیادہ کم خرچ ہے مگر مقابلتاً" اس سے جو واپسی ہوتی ہے وہ علوم کے تمام شعبوں کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ اگر ایجنسی کے پیش کردہ نظریہ یہ ہو کہ اسے کم بجٹ کی بنیاد پر دوسری سائنسوں کے بارے میں سوچنا ہے تو بلاشبہ اس صورت میں نظریاتی طبعیات ہی اس کا چناؤ ہو گا۔

جب ہم اس موضوع کو ابھرتے ہوئے ممالک کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں تو ایجنسی کے لئے نظریاتی طبعیات کے معاملے کو آگے بڑھانے کے لئے زیادہ مضبوط بنیاد فراہم ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ترقی پذیر ممالک کے نوجوان سائنس دان اپنے اندر یہ خواہش رکھتے ہیں کہ سب کی طرح وہ بھی بنیادی سائنس کے چیلنج کو قبول کریں۔ بنیادی علوم میں نظریاتی طبعیات ان کے لئے خاص جاذبیت رکھتی ہے۔

1 اول یہ کہ اس کے لئے کسی طرح کے مہنگے آلات کی ضرورت نہیں۔

2 دوئم یہ کہ اس میدان میں انفرادی کوشش' اجتماعی کوشش کے بغیر' ابھی تک نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

تقریباً ہمیشہ ہی نظریاتی طبعیات پہلی سائنس ہوتی ہے جو چھوٹے ممالک میں سب سے پہلے ترقی پا کر ایڈوانس سطح تک پہنچ جاتی ہے۔ تاریخ میرے اس بیان کو ثابت کرتی ہے۔ جاپان میں یہی معاملہ یوکاوا (Yukawa) اور توموناگا (Tomonaga) کے سلسلے کا ہوا۔ ہندوستان کے ساتھ یہی صورت حال پیش آئی' پھر برازیل' ترکی' لبنان اور ارجنٹائن میں یہی داستان دہرائی گئی۔ کوئی بھی اس تاریخی عمل کو الٹا نہیں چلا سکتا' جس سے سائنس امیر اور غریب ممالک کی مٹی میں نشوونما پاتی ہے۔ لیکن مقامی صلاحیت کے باوجود ان کے سائنسدانوں کے عزم کے باوجود جو وہ اپنے ملک کے دوسرے سائنس دانوں کے ساتھ مشترکہ طور پر رکھتے ہیں' وہ ایک ناگزیر مشکل اور تنہائی کا شکار ضرور ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے ایک سفاک انتخاب ہوتا ہے یا تو اپنے ممالک کو چھوڑ دیں یا جامد ہو کر رہ جائیں اور محض سائنس کی انتظامیہ کا

کل پرزہ بن جائیں۔ دوسرے سائنس دانوں کے برعکس جن کے ناکارہ ہو جانے میں اس بات کو بھی دخل ہے کہ ان کے پاس مہنگے آلات اور اوزار نہیں ہوتے۔ مگر نظریاتی طبعیات تو بہت ہی معمولی خرچے پر زندہ رکھی جا سکتی ہے۔ یعنی دوسروں کے ساتھ روابط کے معقول مواقع فراہم کئے جائیں۔ ان کو فعال مراکز کی سیاحت کے لئے بار بار مواقع دیئے جائیں اور انہیں وہاں کچھ مدت ٹھہرنے بھی دیا جائے۔

اب ہم اساس پر آ گئے ہیں۔ اس لئے ہم سیاحتی فیلو شپ پروگرام کا ذکر کر رہے ہیں' مجھے یقین ہے کہ اب تک خاص تعداد میں نمائندے ہمارے ہم خیال بن چکے ہیں۔ میرے خیال میں نمائندوں کی الجھن یہیں سے شروع ہوتی ہے کہ اس فیلو شپ کا انتظام کس طرح کیا جانا چاہیے۔ اس کے لئے سادہ ترین طریقہ جیسا کہ ساک (SAC) نے تجویز کیا ہے کہ سرن (CERN)' کوپن ہیگن' ڈبنا (Dubna) (روس' مرتب) اور پرنسٹن جیسے چنیدہ علاقائی اور قومی سنٹروں کو یہ فیلو شپ دینا چاہیں۔ (اگر آئی-اے-ای-اے پر ایسی فیلوشپ دینے کی ذمہ داری ڈال دی جائے تو وہ عموماً فیصلہ کرنے میں 17 ماہ لیتی ہے۔ لحاظہ وقت بچانے کے لئے اس کا فیصلہ اُس مرکز کو تفویض کرنا چاہیے جس کے بارے میں ہم آج گفتگو کر رہے ہیں۔)

یوں تو فیلو شپ کا پروگرام ٹھیک ہے مگر اس میں نقص یہ ہے کہ موجودہ مراکز میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ وہ ایسے پروگرام کی ضروریات پوری کر سکیں۔ ڈائریکٹر جنرل نے اس بارے میں ماہرین طبعیات کا جو پینل تشکیل دیا اس نے بھی اسی بات کو نمایاں کیا تھا۔ پینل کے اراکین ان ممالک سے ہی تعلق رکھتے تھے جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ اس بات پر ایک بار پھر ان خطوط کے ذریعے اصرار کیا گیا ہے جو سرن اور کوپن ہیگن سے ڈائریکٹر جنرل کو وصول ہوئے ہیں۔

میں نے نظریاتی طبعیات کے پینل کی کارگزاری کا ذکر کیا ہے۔ اس پینل پر یونیسکو (UNESCO) کا ایک نمائندہ بھی موجود تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ یونیسکو بھی ایسے مرکز میں گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ مگر یونیسکو کے اغراض و مقاصد انہیں اس امر کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ اپنے جھنڈے تلے ایسا کر سکیں۔

ایک اہم سوال جو بار بار پوچھا جاتا ہے' یہ ہے کہ کیا مرکز ابھرتے ہوئے ممالک کے سائنس دانوں کو اپنے گھر سے دور دل لبھانے کا فریضہ سرانجام دے گا؟ ہمارا جواب با اصرار یہ ہے نہیں بلکہ اس کے برعکس یہ مرکز اس لہر کو روکے گا' جس کے تحت یہ لوگ نقل وطن کرتے ہیں۔ اگر کسی کو یہ یقین ہو کہ وہ چند ماہ کسی فعال مرکز میں گزار سکتا ہے تو اس بات کا امکان کم ہو جائے گا کہ وہ مستقل طور پر جلا وطنی اختیار کرے۔

آخری سوال یہ ہے کہ کیا پس ماندہ ممالک کے سائنس دان ایسے مرکز کی خواہش رکھتے ہیں' ہمارے سامنے ایک دستاویز ہے جس پر 53 شرکاء کے دستخط موجود ہیں' جنہوں نے ٹریسٹ کے سیمینار میں شرکت کی تھی۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس دستاویز میں سے کچھ آپ کو پڑھ کر سناؤں۔

"اس سیمینار کے دوران جو چھ ہفتے تک جاری رہا' سب اطراف سے زرخیز خیالات ابھرے۔ سیمینار نے اس بات کی ضرورت کو واضح طور پر محسوس کیا کہ ایسا مرکز ہونا چاہیے تاکہ مشروط طور پر اہم کام سرانجام دیا جاسکے۔ ایسا رابطہ جو گرمیوں کے موسم میں چھ ہفتے سے زیادہ کے لئے ہونا ضروری ہے۔"

اب میں تیسرے سوال کی طرف آتا ہوں۔

کیا ایسا مرکز قائم کرنا ممکن ہے۔ کیا ایسے تین یا چار سربرآوردہ ماہرین طبعیات مل سکتے ہیں جو یہ محسوس کرتے ہوں کہ اگر وہ اس مرکز میں کام کریں اور اس کے سٹاف کا مستقل حصہ بن جائیں تو مرکز کے لئے ان کی خدمات زیادہ سود مند ہوں۔ کیا دوسرے اعلیٰ پائے کے لوگ اس مرکز میں وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر آنا قبول کریں گے؟ ہم بہت انکساری کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ایسے سوالوں کا جواب بورڈ آف گورنرز کے اجلاس کی بحث میں نہیں مل سکتا۔ اس کا جواب اس امر پر مبنی ہے کہ کیا ماہرین طبعیات کی عالمی برادری (Community) اس مرکز کے لئے اپنے دل میں کوئی گرمجوشی رکھتی ہے یا نہیں' میں اس حقیقت کو ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ نیلس بوہر (Niels Bohar)' یدیکی یوکاوا (Yideki Yukawa)' ہنس بیتھے (Hans Bethe)' رابرٹ اوپن ہائیمر (Robert Oppenheimer)' وکٹر وسیکوف (Victor Weisskpof)' روبرٹ مارشک (Robirt Marshak)' جولین شونگر (Julian Schwinger)' ابراحام پائیس (Abraham Pais)' لیوپورڈ انفلڈ (Leopord Infeld) جیسے لوگ (میں نے چند ہی نام گنوائے ہیں) ایک بین الاقوامی مرکز کے حق میں ہیں۔ جب ایک بار یہ قائم ہو جائے گا تو پھر اس کی سرگرمیاں بہت ہوں گی۔ مثلاً وہ ترقی پذیر ممالک میں سیمینار منعقد کرائے گا۔ ناگزیر طور پر یہ مرکز نئے خیالات کی چھان پھٹک کی جگہ ہوگی اور اس کے ساتھ نظریاتی طبعیات کی برادری کی مشابہت متعلق ہو گئی ہے۔

حضرات..... آیئے اب سے بیس برس بعد دیکھنے کی کوشش کریں۔ دنیا اقتصادی' عقلی اور سائنسی سطح پر قریب آتی چلی جا رہی ہے۔ اگلے بیس برس میں بین الاقوامی تحقیقی مراکز نہ صرف نظریاتی طبعیات کے لئے بلکہ زیادہ تر بنیادی علوم کے لئے قائم ہو جائیں گے۔ دنیا کا رجحان اسی طرف ہے اور کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ اس ایجنسی میں ہمارے لئے ممکن ہے کہ اس تحریک کو ہم آگے بڑھائیں' مجھے امید ہے کہ ہم ایسا ہی کریں گے۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی میں اس قرارداد کی سفارش کرتا ہوں جو ہمارے سامنے ہے۔"

بھائی جان کی قرارداد پر بحث شروع ہوئی۔ اس کی روئیداد ایک موقع پر انہوں نے یوں بیان فرمائی:

"میری قرارداد پر بحث مباحثہ شروع ہوا۔ وہ دیکھنے کا منظر تھا۔ اپنی طاقت بحال رکھنے کے لئے میں نے ایک کلو انگور منگوا کر اپنی میز پر رکھے (کھانے کے لئے)۔ ہم نے تیسری دنیا کے مندوبین کو پہلے سے آمادہ کر لیا تھا کہ وہ میرے حق میں بولیں گے۔ مجوزہ مرکز کی مخالفت میں پہلا "گولہ" میرے دوست ڈاکٹر ہیری

سمتھ (Dr. Harry Smithe) جو آئی-اے-ای-اے میں امریکہ کے نمائندے تھے نے داغا۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت طبعیات کے لئے ایک نیا مرکز بنانے کا خیال غیر دانش مندانہ ہے۔ سوویت یونین اور اس کے حواری چیکو سلاوکیہ ' ہنگری ' پولینڈ اور رومانیہ بھی مرکز کے حق میں نہ تھے۔ بلجیم ' کینیڈا ' فرانس ' نیدر لینڈ ' انگلینڈ اور دیگر صنعتی ممالک (سوائے اٹلی اور شمالی ممالک کے) نے بھی اعتراضات کئے۔ جرمنی کے نمائندے نے کہا اس نے 1960ء میں پہلی قرارداد پر دستخط کئے تھے لیکن بعد میں "اوپر" سے منع کر دیا گیا ہے۔ تاہم اس نے ہماری کامیابی کے لئے نیک تمنا کا اظہار کیا اور کہا کہ ذاتی طور پر اسے یقین ہے کہ مجوزہ مرکز بن جائے گا اور وہ بہت کامیاب ہو گا۔ آسٹریلیا کا نمائندہ تو بہت دور کی کوڑی لایا۔ اس نے کہا کہ نظریاتی طبعیات تو سائنس کی رولز رائس (Rolls Royce) ہے۔ (یہ دنیا کی مہنگی ترین کار ہے ' جو انگلینڈ میں بنائی جاتی ہے--- مرتب) غریب ممالک کو تو گدھا گاڑیاں کافی ہیں۔" (شاید اسی ریمارک کی وجہ سے بھائی جان نے اپنی زندگی میں آسٹریلیا کا کبھی دورہ نہیں کیا تھا--- مرتب) اس کے بعد ہمارے نقطہ نظر کی حمایت کرنے والے بولنے لگے۔ غریب ممالک کے مندوبین کے الفاظ ان کے دل سے نکلے رہے تھے۔ افغانستان ' برازیل ' فلپائن اور سعودی عرب نے پرجوش حمایت کی۔ ہمیں 35 ووٹ ملے ' جبکہ 18 غیر حاضر رہے۔ قرارداد منظور ہو گئی اور مرکز کا قیام تسلیم کر لیا گیا۔ اس ابتدائی کامیابی کے بعد عالمی ادارہ برائے ایٹمی توانائی کے بورڈ آف گورنرز نے "فراخدلی" کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجوزہ مرکز کے ایک سال کے اخراجات کے لئے 55 ہزار ڈالر مختص کئے اس کے علاوہ اقوام متحدہ کی تعلیمی و سائنسی تنظیم یونیسکو (UNESCO) نے 27000 ڈالر فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ عالمی سطح پر کام کرنے والے مرکز کے لئے یہ رقم کچھ بھی نہیں تھی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ ہمیں ناکام کرنا چاہتے ہیں۔ اس نیم دلانہ پیش رفت سے خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ شاید مرکز کے قیام کی تجویز ختم کر دی جائے۔"

"کچھ ممالک کو یہ اعتراض تھا کہ اس سنٹر کے قیام سے تیسری دنیا کے ذہن افراد مستقل ہجرت کر جائیں گے۔" بھائی جان نے انہیں بتایا کہ "اس مرکز میں ایشیا افریقہ ' لاطینی امریکہ وغیرہ سے ذہین طبعیات دان سال میں چھ ماہ کے لئے آئیں گے اور وہاں مشرق اور مغرب کے ترقی یافتہ ممالک کے چوٹی کے سائنسدانوں کے ساتھ مل کر تحقیق کریں گے۔ پھر اپنے اپنے ممالک میں واپس جا کر کام کریں گے۔"

ابھی بھی کچھ مخالفت باقی تھی ' جسے ختم کرنے کے لئے بھائی جان نے ایک اور تدبیر کی۔ انہوں نے آئی-اے-ای-اے کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر اکلنڈ کو نظریاتی طبعیات پر ایک سیمینار کرانے کے لئے قائل کر لیا ' اس کا مقصد انہیں مجوزہ مرکز کی افادیت اور اس کے طریق کار کی ایک جھلک دکھانا تھی۔ چنانچہ پروفیسر پالوبوڈ-نخک صدر شعبہ فزکس ٹریسٹ یونیورسٹی کی وساطت سے اٹلی کی حکومت اور ٹریسٹ یونیورسٹی کی طرف سے آئی-اے-ای-اے کو ٹریسٹ میں یہ سیمینار منعقد کرنے کی دعوت دی گئی۔ یہ سیمینار 1962ء کے موسم گرما میں کرایا گیا۔ پروفیسر جولین شونگر (Julian Schwinger) ' پروفیسر

یوجین وِگنر (Eugine Wigner)' ٹولیو ریگ (Tullio Regge) بھائی جان اور بہت سے دوسرے سائنس دانوں نے اس سیمینار میں لیکچر دیئے۔ اس کے اختتام پر مجوزہ مرکز کی افادیت دیکھتے ہوئے تمام شرکاء نے متفقہ طور پر اسے قائم کرنے کے بارے میں رائے دی۔ اس رائے کے نتیجے میں ڈاکٹر اگلنڈ نے مئی 1963ء میں چوٹی کے تین ماہرین طبعیات کی ایک کمیٹی تشکیل دی' جسے اس مجوزہ مرکز کے کار آمد ہونے کے بارے میں حتمی رپورٹ دینے کے لئے کہا گیا۔ اس کمیٹی کے اراکین امریکہ سے پروفیسر رابرٹ مارشک (Robert Marshak) برازیل سے جے جے ٹومینو (J.J.Tiomno) بلجیم سے ایل وان ہیو (L.Van Hove) تھے۔ چونکہ یہ تینوں نامور سائنس دان تھے' اس لئے اس کمیٹی کو تین "داناؤں" کا نام دیا گیا۔ (The Three Wisemen) ان تین "داناؤں" نے بالاتفاق اٹلی کے شہر ٹرئیسٹ میں نظریاتی طبعیات کا مرکز قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ جون 1963ء میں ان تین "داناؤں" کی رپورٹ/مشورہ کو منظور کر لیا گیا۔ لیکن مزید مالی امداد کے لئے ان ممالک کی طرف رجوع کرنے کے لئے کہا گیا'جو اس مرکز کے قیام کے لئے اپنی دلچسپی کا اظہار کر چکے تھے۔ ان ممالک میں اٹلی شامل تھا جس نے ٹرئیسٹ میں اس مرکز کو قائم کرنا چاہا' آسٹریا نے وی آنا کے لئے کہا' ڈنمارک نے کوپن ہیگن کا نام لیا' پاکستان نے لاہور تجویز کیا اور ترکی نے انقرہ۔ سب سے فراخدلانہ پیش کش حکومت اٹلی کی تھی' جس نے یہ کہا تھا' وہ تین لاکھ ڈالر کے علاوہ مرکز کے لئے عمارت بھی مہیا کرے گی۔ بھائی جان کی خواہش تھی کہ یہ مرکز لاہور میں قائم ہو۔ چنانچہ وہ فوراً پاکستان آئے اور صدر محمد ایوب خان سے کہا کہ وہ پاکستان میں اس مرکز کے قیام کی منظوری دیں۔ بھائی جان کی موجودگی میں صدر محمد ایوب خان نے اپنے وزیر خزانہ (محمد شعیب) سے ٹیلی فون پر مشورہ کیا تو وزیر خزانہ نے کہا: "جناب پروفیسر دنیا بھر کی سائنسی برادری کے لئے ایک بین الاقوامی ہوٹل قائم کرنا چاہتے ہیں نہ کہ پاکستان میں کوئی نظریاتی طبعیات کا سکول" یوں پاکستان کے بڑوں کی کوتاہ بینی نے اس عالمی مرکز کو پاکستان میں قائم کرنے کا سنہری موقع ضائع کر دیا۔ حکومت پاکستان کے مایوس کن رویہ کو دیکھتے ہوئے انٹرنیشنل ایٹمی توانائی ایجنسی نے بھائی جان کی سفارش پر اٹلی کی حکومت کی پیش کش منظور کر لی۔ اٹلی کی اس فیاضانہ پیش کش کی وجہ پروفیسر پالوبوڈی کا عزم تھا' وہ 1960ء سے بھائی جان کے اس خواب کو حقیقت کا روپ دھارنے میں کوشاں تھے۔ جس میں بالآخر وہ کامیاب ہو گئے۔

ٹریسٹ دلوں کو موہ لینے والا شہر ہے۔ اسے اٹلی کا مشرقی دروازہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شہر وسطی بحیرہ روم (Adriatic Sea) کے کنارے سلوانیا (Slovenia) کی سرحد کے پاس واقع ہے۔ پرانے زمانے میں یہ شہر رومیوں کے تسلط میں رہا۔ پھر ایک آزاد شہر بن گیا۔ 1957ء میں اٹلی نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب یہ علم' تہذیب اور جغرافیائی اہمیت کا مرقع بن چکا ہے۔ یہاں شمال جنوب سے ملتا ہے اور مشرق مغرب کا استقبال کرتا ہے۔ آج کل اسے بجا طور پر "سائنس کا شہر" کہا جاتا ہے۔

چونکہ اٹلی نے اس مرکز کے لئے ایک عمارت مہیا کرنے کا وعدہ کیا تھا' اس لئے مرکز کے ڈپٹی ڈائریکٹر پروفیسر پالوبودی بخک کی سرکردگی میں کسی موزوں عمارت کی تلاش کا کام شروع کر دیا گیا۔ (چونکہ نئی عمارت تعمیر کرنے کے لئے وقت نہیں تھا اس لئے مرکز کو ایک عارضی عمارت میں قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا) کافی تگ و دو کے بعد 6 دسمبر کو ٹریسٹ کے وسط میں پی آزا اوبرڈن (Piazza Oberdan) کے علاقے میں ایک پانچ منزلہ عمارت اس مرکز کے لئے منتخب کی گئی۔ یہ عمارت دوسری جنگ عظیم سے چند سال پہلے تعمیر کی گئی تھی۔ ٹریسٹ کی انتظامیہ اور میونسپل کمیٹی نے اس کے لئے 270 ملین لیرا (اٹلی کا سکہ (150,000 ڈالر) فراہم کئے تھے۔ اوبرڈن کا علاقہ اٹلی کے ایک محب وطن کے نام سے منسوب ہے۔ ضروری مرمت' تزئین و آرائش کے بعد جون 1964ء سے مرکز نے اس عارضی ہیڈکوارٹر سے کام کا آغاز کیا۔ یکم اکتوبر 1964ء کو سرکاری طور پر اس کا افتتاح ہوا۔ جس کی تقریب ایک مقامی ہوٹل جولی (Hotel Jolly) میں منعقد ہوئی۔ حکومت اٹلی اور شہر کی انتظامیہ کے نمائندوں کے علاوہ پروفیسر رابرٹ اوپن ہائیمر' بھائی جان اور تقریباً 70 سائنس دانوں نے اس تقریب میں حصہ لیا۔ اٹلی میں پاکستان کی سفیر محترمہ بیگم رعنا لیاقت علی خان نے بھی اس افتتاحی تقریب میں شرکت کی تھی۔ بقول بھائی جان:

"شروع میں مرکز چلانے کے لئے چار برس کا اجازت نامہ دیا گیا۔ رابرٹ اوپن ہائیمر اپنی علالت کے باوجود ٹریسٹ گئے' وہاں انہوں نے مرکز کی قرارداد مقاصد (Charter) کا مسودہ تیار کرنے میں مدد دی۔ ان کی شخصیت اور ان کی رواں تحریر دونوں ہی بے حد پسندیدہ تھے' وہ قانونی تحریروں کے بھی ماہر تھے۔"

مرکز کے افتتاح کے ساتھ ہی جھنگ کے اس نوجوان کا خواب بھی شرمندہ تعبیر ہوا' جو اس نے برسوں پہلے دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ لوگی ستاسی (Luigi Stasi) سیکرٹری انٹرنیشنل فاؤنڈیشن برائے آزادی و ترقی آف سائنسز' ٹریسٹ نے کہا تھا:

"عبدالسلام خواب دیکھتا ہے اور پھر انہیں حقیقت کا روپ دیتا ہے۔"

مرکز کے عارضی ہیڈکوارٹر کے افتتاح کے فوراً بعد ٹریسٹ کے مفاضات میں میرا میر (Miramare) کے خوبصورت علاقہ میں ایک وسیع قلعہ اراضی حاصل کرنے کے بعد اس پر مرکز کی نئی عمارت کی تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا۔ جون 1968ء میں مرکز اپنی نئی عمارت میں منتقل ہو گیا۔ حکومت اٹلی کے ایک نمائندہ نے نئی عمارت کی "طلائی چابی" انٹرنیشنل ایٹمی انرجی ایجنسی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر سیکوارڈ اکلنڈ کو دی' جسے انہوں نے بھائی جان کے حوالے کرتے ہوئے انہیں مبارک باد دی۔

نئی عمارت کے افتتاح کے موقع پر ایک ماہ کا سمپوزیم ہوا۔ اس میں 300 سے زائد چوٹی کے ماہرین طبعیات نے ذراتی طبعیات' کثیف مادے کی طبعیات' کوانٹم الیکٹرونکس' فلکیاتی طبعیات' نظریہ اضافیت' پلازمہ طبعیات' فلکیات' نیوکلیر طبعیات اور زندہ اجسام کی طبعیات جیسے وسیع علمی میدانوں میں اپنے افکار اور تحقیقی کاموں سے ایک دوسرے کو آگاہ کیا۔ اس سمپوزیم میں درجن بھر نوبل انعام یافتہ سائنس دانوں نے شرکت کی۔

معمول کی کارروائی کے علاوہ ہر شام نوبل انعام یافتہ عظیم سائنسدانوں (Grand Masters) کی تقاریر کا بھی سلسلہ شروع کیا گیا۔ بھائی جان ہر مقرر کا تعارف کراتے تھے۔ مقررین میں بیسیوں صدی کے دو عظیم سائنسدان ہائزبرگ (Heisinberg) اور ڈیراک (Dirac) جنہوں نے 1932ء اور 1933ء میں فزکس کے نوبل انعام حاصل کئے تھے شامل تھے۔ ڈیراک کیمبرج میں بھائی جان کے استاد تھے۔ ہائزنبرگ کا سامعین سے تعارف کراتے ہوئے بھائی جان نے کہا: "1748ء میں ایران کے بادشاہ نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا اور دہلی پر قبضہ کر لیا۔ جس کے بعد نادر شاہ اور مغل بادشاہ کے درمیان صلح کی تفصیلات طے پائیں، جن کے نتیجے میں تخت طاؤس دہلی سے ایران منتقل کرنے کا فیصلہ ہوا۔ بات چیت کے بعد ہندوستان کے شکستہ خوردہ بادشاہ آصف جاہ نے اپنے وزیر سے کہا کہ وہ دونوں بادشاہوں کو شراب کا پیالہ پیش کرے۔ اس بات نے وزیر کو پریشان کر دیا کہ وہ پیالہ پہلے کسے پیش کرے۔ اِدھر کنواں اُدھر کھائی والی صورت حال پیدا ہو گئی۔ کیونکہ اگر وہ اپنے بادشاہ کو پیالہ پیش کرتا تو ڈر تھا اسے بے عزتی سمجھتے ہوئے ایران کا بادشاہ تلوار سے اس کا سر قلم کر دے اور اگر وہ پیالہ پہلے ایران کے بادشاہ کو پیش کرتا تو بعد میں اس کا بادشاہ اسے سزا دیتا۔ چند فکر مند لمحوں کے بعد اس وزیر باتدبیر کو اس مسئلہ کے حل کی ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے دونوں پیالے ایک طلائی طشت پر رکھ کر اپنے بادشاہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ یہ میرا مقام نہیں کہ میں بادشاہوں کو جام پیش کروں، اسے ایک بادشاہ کو دوسرے بادشاہ کو پیش کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں اپنے مضمون (فزکس) کے ایک گرینڈ ماسٹر (Grand Master) پروفیسر ڈیراک سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ دوسرے گرینڈ ماسٹر پروفیسر ہائزبرگ کا تعارف کرائیں۔"

بھائی جان اس عالمی ادارہ کے پہلے ڈائریکٹر تھے۔ ان پر پہلے ہی کام کا بہت بوجھ تھا۔ امپیریل کالج لندن میں درس و تدریس کی ذمہ داری، دنیا بھر میں مختلف سائنس کانفرنسوں میں شرکت کرنے کے علاوہ انہیں سال میں کئی مرتبہ پاکستان کا دورہ بھی کرنا پڑتا تھا کیونکہ وہ صدر پاکستان کے سائنسی مشیر اعلیٰ بھی تھے۔ نئے مرکز کے قیام سے ان کی ذمہ داریاں اور بڑھ گئی تھیں، وہ عام طور پر مہینے میں دو تین ہفتے ٹریسٹ میں کام کرتے تھے۔ انہیں مغربی طرز کا کھانا مرغوب نہیں تھا۔ اس لئے وہ پاکستانی کھانا لندن سے پکوا کر اپنے ساتھ ٹریسٹ لے جاتے اور وہاں ڈیپ فریزر (Deep Freezer) سے نکال کر کھاتے رہتے تھے۔ بے آرامی اور کام کی زیادتی سے ان کی طبیعت کچھ ناساز رہنے لگی۔ انہوں نے جب اپنا مکمل ڈاکٹری معائنہ کرایا تو پتہ چلا کہ انہیں اپنڈکس (Appendicitis) کی تکلیف ہے۔ ٹریسٹ مرکز کے ڈاکٹر ایس لین (Dr.S.Lin) نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپریشن لندن میں کرائیں۔ چنانچہ ان کا اپریشن لندن میں ہوا اور وہ چند دنوں کے لئے ہسپتال میں داخل رہے۔

اپریشن سے پہلے بھائی جان نے حضرت ابا جان کو تمام حالات سے آگاہ کرتے ہوئے دعا کرنے کے لئے درخواست کی۔ مجھے یاد ہے کہ بھائی جان کے اپریشن کے بارے میں پتہ چلتے ہی میں نے ان کی خدمت

میں ایک خط لکھا تھا' جس کے آخر میں' میں نے لکھا کہ میری ناقص رائے میں ان کا اپریشن اس لئے ہو رہا ہے کہ یوں وہ لازمی طور پر چند دن ہسپتال میں گزاریں گے' اس طرح انہیں دوسرے کاموں سے کچھ فرصت ملے گی اور وہ کچھ آرام کر سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جلد شفا عطا کی۔

اپنے وجود میں آنے کے بعد مرکز نے بہت ترقی کی۔ مئی 1985ء میں فرمی نیشنل ایکسیلریٹر لیبارٹری (Fermi National Accelerator) میں پارٹیکل کی تاریخ پی اون (Pion) سے کوارکس (Quarks) تک کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے بھائی جان نے کہا:

"1964ء میں جب ہم ٹریسٹ میں ایک کرائے کی عمارت میں جمع ہوئے تو یہ سارا منصوبہ ایک خواب نظر آتا تھا۔ ایک بار پھر دنیا کی نظریاتی (طبعیات کی) برادری ہمارے گرد جمع ہوئی تھی۔ اس میں پلازمہ طبعیات دان اور پارٹیکل طبعیات دونوں شامل ہوئے تھے۔ ہمیں کسی آرائش کی پروا نہیں تھی۔ ہم تو صرف طبعیات کے دیوانے تھے۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہم سائنس کی وجہ سے پہچانے جائیں۔ اس میں ہم کامیاب ہو گئے تھے۔ چنانچہ مرکز کے قیام کے ایک سال بعد اوپن ہائیمر نے 1965ء میں مرکز کی سائنس کونسل کو اپنے پیغام میں کہا: "مرکز نے اپنے قیام کے آٹھ نو ماہ کی مدت میں تین اہم طریقوں سے کامیابی حاصل کی ہے' اس نے قابل قدر نظریاتی طبعیات پیدا کی ہے اور اس کی افزائش بھی کی ہے اور مادے کی نوعیت کی بنیادی ترقی کی تقسیم کو مرکز توجہ بنا دیا ہے۔"

مرکز نے ترقی پذیر ممالک سے آنے والوں کی حوصلہ افزائی کی ہے' ان کو تحریک دی ہے اور ان کی مدد کی ہے۔ وہ خاموشی کے ایک طویل عرصے کے بعد لکھنے پر اور اپنے لکھے ہوئے کو شائع کروانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ یہ سب کچھ ٹریسٹ کے مراکز کی سیاحت کے بعد ہوا ہے۔ یہ بات ان ماہرین طبعیات کے بارے میں درست ہے جو لاطینی امریکہ سے آئے تھے یا مشرق وسطیٰ سے' مشرقی یورپ یا ایشیا سے۔ دوسروں کے بارے میں بھی بلاشبہ یہی حقیقت ہے۔ یہ مرکز خود ایک مرکزی نقطہ توجہ بن گیا ہے اور بہت ثمر آور ہوا ہے اور اس کی وجہ سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سائنس دانوں نے سویٹ روس کے سائنس دانوں کے بنیادی مسائل کو سمجھنے میں ایک دوسرے سے تعاون کیا ہے' اس میں پلازمہ (مادہ کی ایک حالت--- ناقل) کا اضطراری ہونا اور اس کو استقلال کی حالت میں لانے کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ ٹریسٹ کے مرکز کے بغیر شاید یہ ممکن نہ ہو سکتا کہ ایسے تعاون کی ان کے درمیان پیدا ہونے کی کوئی صورت نکل سکتی اور پھر اس تعاون کے تسلسل کو جاری رکھا جا سکتا۔ اس مرکز کے کام کی سطح جیسا کہ میں بخوبی جانتا ہوں معیار کے لحاظ سے بہت اعلیٰ سطح ہے۔ ایک برس سے بھی کم عرصہ میں وہ ان راہنما اداروں میں سے ایک ہو گیا ہے جو اہم' دشوار مگر بنیادی شعبوں میں کام کرتے ہیں۔"

بھائی جان نے اپنی تقریر میں کہا:

"اس قصے کے مختصر بیان کو جاری رکھتے ہوئے (میں یہ عرض کروں گا) کہ اپنے وجود میں آنے کے بیس

برس میں یہ مرکز خاصا پھلا پھولا ہے اور اس میں 100 ممالک (1997ء تک یہ تعداد خاصی زیادہ ہو گئی ہے--- ناقل) کے ماہرین طبعیات آتے جاتے رہے ہیں۔ ان کا تعلق مشرق اور مغرب' شمال اور جنوب سب سمتوں سے اور طبعیات کے تمام شعبوں سے رہا ہے' یعنی بنیادی طبعیات سے لے کر ٹیکنالوجی کے ان مسائل تک جن کا تعلق طبعیات سے بنتا ہے۔ اس میں ماحولیات' توانائی' رہائشی صورت حال اور اطلاقی ریاضی کے مسائل بھی شامل ہیں۔ یہ مرکز 1000 سائنس دانوں کو صنعتی علاقوں سے اور کوئی 1000 (1996ء تک یہ تعداد 38500 اور 31500 تک پہنچ گئی تھی) ترقی پذیر ممالک سے تحقیقی کورسوں کے لئے مرکز میں بلاتا ہے اور ان کے قیام کی مدت چند ماہ سے چند سال تک ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اطالوی حکومت کی فراخدلانہ گرانٹ کی وجہ سے ہم نے تجرباتی طبعیات کے لئے کوئی 100 فیلوشپس کا انتظام کیا ہے' جس کا تعلق اطالوی تجربہ گاہوں سے ہوگا۔ ہم کوئی 200 ایسے اداروں سے تعاون کر رہے ہیں جن میں سے زیادہ تر کا تعلق ترقی پذیر ممالک سے ہے۔ اس کے علاوہ ہماری سائنٹیفک کونسل کوئی 300 ماہرین طبعیات کو منتخب کرتی ہے۔ (جنہیں ہم مرکز کے ایسوسی ایٹس Associates کہتے ہیں۔) ان خواتین و حضرات کو یہ سہولت ہوتی ہے کہ وہ چھ برس میں تین بار اس مرکز میں تین تین ماہ کے لئے آسکتے ہیں۔ اس آمد کا وقت وہ اپنی سہولت کے مطابق مقرر کرتے ہیں۔ اس کے لئے شرط محض اس قدر ہے کہ وہ ترقی پذیر ممالک میں رہتے اور کام کرتے ہوں۔"

اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے بھائی جان نے کہا:

"اگرچہ اس مرکز کو قائم کرنے اور اسے چلانے کے لئے ہم نے دنیا بھر کے ممتاز ماہرین طبعیات رضاکارانہ تعاون پر بھروسہ کیا ہے۔ مگر یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کی طبعیاتی برادری نے مجموعی طور پر منظم صورت میں ہم سے بہت ہی کم تعاون کیا ہے' حالانکہ ہمارا مقصد ترقی پذیر ممالک میں بھی طبعیات کے مقصد کو تقویت دینا تھا اور اس میں ہمارا مرکز بھی شامل ہے۔ میں منظم کے لفظ پر اصرار کرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری طرف سے وہ دلی شکریہ ادا ہونے سے رہ جائے' جو اس سلسلے میں ان عظیم افراد کا کرنا چاہتا ہوں' جنہوں نے اس مقصد کے لئے واقعی قربانیاں دی ہیں۔

مرکز میں سالانہ بجٹ

1964ء - 1968ء تک مرکز کا سالانہ بجٹ مندرجہ ذیل تھا:

- اٹلی کی حکومت کی طرف سے 278,000 ڈالر بشمول 28,000 ڈالر برائے فیلوشپ۔
- انٹرنیشنل ایٹمی توانائی ایجنسی کی طرف سے۔
- 1965-64 میں 55,000 ڈالر سالانہ
- 1966ء میں 110,000 ڈالر سالانہ
- 1968-67ء 150,000 ڈالر سالانہ

- یونیسکو نے 64-1968ء تک 22,000 ڈالر سالانہ فیلوشپ کے لئے دیئے۔

1969ء سے مرکز کا بجٹ بڑھتا رہا' حتیٰ کہ 1997ء کا سالانہ بجٹ حسب ذیل تھا:

- یونیسکو سے 395,000 ڈالر (تین لاکھ پچانوے ہزار)
- آئی-اے-ای-اے 1,835,000 ڈالر (اٹھارہ لاکھ پینتیس ہزار)
- حکومت اٹلی 11,800,000 ڈالر (ایک کروڑ اٹھارہ لاکھ)

ان رقوم کے علاوہ بھائی جان اپنی ذاتی کوششوں سے امریکہ کی فورڈ فاؤنڈیشن' سویڈن کی سویڈش انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ ایجنسی (SIDA) مختلف حکومتوں' اکیڈمیوں' انسٹیٹیوٹیسز (Institutes) وغیرہ سے مرکز کے اضافی اخراجات کے لئے عطیات وصول کرنے میں کامیاب رہے۔

مرکز کی ترقی

1969 میں مرکز نے طبعیات کی پہلے سے زیادہ شاخوں کا احاطہ کرنا شروع کر دیا۔ ترقی پذیر ممالک نے مطالبہ شروع کیا کہ مزید طبعیاتی شاخوں کا اضافہ کر کے ان کی علمی ضروریات پوری کی جائیں۔ چنانچہ 1970ء میں یونیسکو (UNESCO) نے مزید تعاون کیا اور مرکز میں ریاضی' سمندری طبعیات' فضائی طبعیات' زمینی طبعیات' موسم' مالیکیولر (Molecular) اور لیزر کی طبعیات' توانائی کی طبعیات اور طبعیات پڑھانے کے طریقوں کا اضافہ کیا گیا۔

70-1980ء کے زمانے میں مرکز نے اپنے آپ کو مضبوط کیا' لیکن اس کے دائرہ کار کو مزید وسعت نہ دی گئی۔ البتہ 1972ء میں بھائی جان نے کوائنٹم میکینکس (Quantum Mechanics) کے بنیادی نظریہ اور اس کی تاریخ کے بارے میں اس مضمون کے بقید حیات بانیوں کی ایک کانفرنس بلائی' جس میں ہائنزبرگ' ڈیراک' جورڈن' ویگنر' پیرل کے علاوہ اور دوسرے سائنس دانوں نے شمولیت کی۔

1980ء کے بعد مرکز نے بہت ترقی کی۔ اس کی بنیای وجہ 1979ء میں بھائی جان کو نوبل انعام ملنا تھا۔ اس سے نہ صرف ان کا نام چمکا بلکہ مرکز کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ انہی دنوں بھائی جان نے اٹلی کی حکومت کو قائل کر کے ملنے والی امداد میں 4.6 گنا اضافہ کرایا۔ (ایسا اٹلی کے وزیر خارجہ گیلسو اینڈ روٹی جو بعد میں وزیر اعظم بن گئے تھے سے ان کے بھائی جان سے ذاتی تعلقات کی وجہ سے ہوا۔) مرکز کے 25 سال 1989ء میں پورے ہوئے اس موقع پر ٹریسٹ میں ایک کانفرنس ہوئی' جس میں طبعیات کے چوٹی کے ماہرین نے اپنی اپنی شاخ سے متعلق تازہ ترین کاموں اور تحقیق پر روشنی ڈالی۔ اب تک مرکز میں کام کرنے والے طبعیات دان پانچ ہزار سے زائد تحقیقی مقالے عالمی رسائل میں شائع کرا چکے ہیں۔ مرکز بے شمار چھوٹے کورس ورکشاپ' سیمینار' کانفرنسیں اور دیگر اعلیٰ علمی مجالس منعقد کرا چکا ہے۔ مائکرو پروسیسرز (Microprocessors) اور سپر کنڈکٹیوٹی (Superconductivity) پر کام کرنے کے لئے وہاں لیزر (LASER) لیبارٹری بھی قائم کی جا چکی ہے۔

غریب ممالک سے اب تک 38 ہزار سے زائد سائنسدان اور سکالر اس مرکز میں آکر تازہ اور جدید علم سے منور ہو کر واپس اپنے ملکوں کو جا چکے ہیں۔ (تازہ اعداد و شمار کے مطابق 1964ء سے 1997ء کے وسط تک تقریباً 70 ہزار سائنسدان اس مرکز سے استفادہ کر چکے ہیں) کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کا ہر طبعیات دان ٹریسٹ کی "یاترا" کر چکا ہے یا وہاں جانے والا ہے یا وہاں جانے کا خواہشمند ہے۔ پاکستان سے بھی بے شمار طبعیات دان ٹریسٹ مرکز جا چکے ہیں۔ قائداعظم یونیورسٹی کی طبعیات کی ایک طالبہ 1996ء میں وہاں گئی تھی۔ اس کے والد نے اپنی بیٹی کے تاثرات سناتے ہوئے بتایا کہ وہاں اسے ان ماہرین سے ملنے اور ان کے لیکچر سننے کا اتفاق ہوا۔ جنہوں نے اس کے کورس کی کتب لکھی تھیں۔ ان کی بیٹی نے بتایا کہ وہاں کا ماحول ناقابل بیان ہے۔ بھائی جان کے بارے میں اس نے بتایا کہ "ڈاکٹر سلام کو وہاں ایک "پیر" کی طرح پوجا جاتا ہے۔" غرضیکہ یہ مرکز بھائی جان کی عالی ہمتی کا مظہر ہے۔ انہوں نے امیر اور غریب ممالک کی دو مختلف دنیاؤں کے درمیان اس مرکز کے ذریعے ایک پل تعمیر کیا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے رسالہ "تہذیب الاخلاق" جنوری 1986ء کا شمارہ جو عبدالسلام نمبر تھا۔ (جسے بھائی جان کی ساٹھویں سالگرہ کے موقع پر شائع کیا گیا) میں آئی-سی-ٹی-پی (انٹرنیشنل سنٹر برائے نظریاتی طبعیات) کے بارے میں مندرجہ ذیل مضمون شائع ہوا تھا:

آئی - سی - ٹی - پی

"تاج محل سے کون واقف نہ ہوگا۔ مشرق کی یہ وہ نادر المثال یادگار ہے جس نے ہر چشم فکر پر ایک نیا عکس بنایا ہے اور جسے دیکھنے والا خراج تحسین پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سنگ مرمر کے اس تراشہ کے دل کو چھو لینے والے حسن اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے جمال کا سرچشمہ درد عشق ہے جو تاج محل کی شکل میں مجسم ہو گیا ہے۔ ٹیگور کی زبان میں:

"تاج ایک چشم عشق کا منجمد آنسو ہے"

آئی-سی-ٹی-پی (انٹرنیشنل سینٹر فار تھیوریٹیکل فزکس' ٹریسٹ' اٹلی) ایک بین الاقوامی ادارہ ہے جس کا بنیادی مقصد تیسری دنیا کے ممالک میں سائنسی علوم کا فروغ ہے۔ یہاں دنیا کے کونے کونے سے ترقی یافتہ و پسماندہ ممالک کے سائنس دان مختصر مدت کے لئے علم کی پیاس بجھانے آتے ہیں۔ کچھ سیکھتے ہیں' کچھ سکھاتے ہیں۔ پھر نئے خیالات و نئے رجحانات کی مے سے سرشار واپس لوٹ کر اپنے اپنے ممالک کی تعمیر و ترقی میں لگ جاتے ہیں۔ فی الحقیقت آئی-سی-ٹی-پی ایک ادارہ نہیں انسانی برادری کے وحدت کے خواب کی زندہ تعبیر ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں امیر و غریب' رنگ و نسل اور مذہب و قومیت کی ساری سرحدیں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہاں مسلمان عیسائی کو گلے لگاتا ہے' گورا کالے کو خوش آمدید کہتا ہے اور اشتراکی سرمایہ دار کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے۔ اس ادارے نے دانستہ و نادانستہ طور پر پسماندہ ممالک میں سائنسی علوم

کو پھیلانے میں کیا اہم کردار ادا کیا ہے' اس کا صحیح اندازہ تو آنے والا مورخ ہی کرے گا۔ البتہ یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس ادارے نے پسماندہ ممالک میں سائنسی انقلاب کی ایک لہر پیدا کر دی ہے جو ہر آن بڑھتی جا رہی ہے۔

تاج کی طرح آئی-سی-ٹی-پی بھی ہر چشم بینا سے خراج عقیدت وصول کر رہا ہے۔ اٹلی کے ایک چھوٹے سے شہر میں قائم اس ادارے کے جمال لیلیٰ علم و نور شمع انسانیت کا سرچشمہ ایک حساس اور دردمند انسان کا خون جگر ہے سچ تو یہ ہے:

"آئی-سی-ٹی-پی ایک غمگسار دل کا منجمد لہو ہے"

اور وہ غمگسار دل سائنس کے اس تاج محل کے شاہ جہاں محمد عبدالسلام کے علاوہ کس کا ہو سکتا ہے۔ جو صرف کائنات کے راز سربستہ سے سرگوشی ہی نہیں کرتے بلکہ تیسری دنیا خصوصاً عالم اسلام کی حالت زار پر اشک خون بھی بہاتے ہیں۔"

رابرٹ وال گیٹ نے اپنے مضمون "دو دنیاؤں کا آدمی" میں آپ کی زندگی میں ہی کیا خوب کہا تھا:

He (Salam) is one man without time, strung across two worlds and two problems. It is a loss to the world that he cannot have two lives."

آپ حدود وقت سے بالا ہیں۔ دو دنیاؤں اور مسائل سے منسلک ہیں۔ لیکن افسوس ہے اسے دو زندگیاں نہیں مل سکتیں۔"

بھائی جان مرکز کے تیس سال تک ڈائریکٹر رہے۔ انہوں نے خرابی صحت کی وجہ سے 1994ء میں اس عہدہ سے استعفیٰ دے دیا۔ تاہم انہیں مرکز کا پریذیڈنٹ بنا دیا گیا۔

ارجنٹائن کے پروفیسر انیجل ویرا سورو (Angel Viasoro) کو آئی-سی-ٹی-پی کا نیا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔

1996ء میں مرکز کی انتظامیہ کو آئی-اے-ای-اے سے یونیسکو (UNESCO) کے زیر نگرانی کر دیا گیا اور مرکز کا نیا نام آئی-سی-ٹی-پی سے آئی-سی-ٹی-پی آف یونیسکو اور آئی-اے-ای-اے۔

(Internatinal centre for Theoretical Physics of UNESCO and IAEA)

رکھ دیا گیا۔

مرکز کی اپنی شاندار لائبریری ہے' جس میں پچاس ہزار کتب (1995ء تک) 47000 ہزار جلد کردہ رسائل' 1500 مقالے اور پچاس ہزار مختلف رپورٹیں ہیں۔

ٹریسٹ سنٹر کے بارے میں بھائی جان کے ایک انٹرویو سے

بھائی جان نے پاکستان ٹائمز لاہور کے ایڈیٹر فورم کو خطاب کرتے ہوئے کچھ سوالات کے جواب دیئے

تھے۔ اُس خطاب کی تفصیل پاکستان ٹائمز نے 25 فروری 1983ء کو شائع کی تھی۔ اس انٹرویو میں چند سوال انٹرنیشنل مرکز برائے نظریاتی طبعیات کے بارے میں بھی تھے وہ سوال اور بھائی جان کے جواب یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

(ترجمہ از مرتب)

سوال: آپ پنسٹک (Pakistan Institute of Nuclear Science and Technology) اور سپارکو (Pakistan Space and Uper Atmosphere Committee) کے بانی ہیں۔ لیکن اب آپ نے ٹریسٹ میں انٹرنیشنل مرکز برائے نظریاتی طبعیات قائم کیا ہے۔ اس سائنٹیفک "جنت" بنانے پر آپ کو کس نے مجبور کیا تھا۔ ٹریسٹ میں آپ کا یہ قائم کردہ مرکز تیسری دنیا کے لئے کیا کر رہا ہے؟

جواب: جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ مجھے اپنے ملک سے "دیس نکالا" ملا تھا۔ 1979ء میں نوبل انعام پانے کے بعد میں اپنے استاد اور پرنسپل پروفیسر سراج صاحب کی خدمت میں ملاقات کرنے کے لئے حاضر ہوا۔ (لاہور کینٹ میں--- ناقل) تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ "کیا تمہیں اس بات سے خوشی نہیں ہوئی کہ میں نے تمہیں اپنے ملک سے باہر نکال پھینکا تھا؟"

تب مجھے ایک سنٹر بنانے کا خیال آیا تھا جسے میں پاکستان میں بنانا چاہتا تھا تاکہ نہ صرف میں پاکستان لوٹ آؤں بلکہ اقوامہ متحدہ کی مدد سے دوسرے لوگوں کو بھی اس سنٹر میں کام کرنے کے لئے لاؤں۔ پاکستان ٹائمز نے میرے بارے میں جو مضمون لکھا تھا (اگست 1957ء میں--- ناقل) اس کی روشنی میں حکومت پاکستان کو یہ خیال آیا کہ میں اس کے لئے کوئی اچھا کام کر سکتا ہوں۔ چنانچہ صدر ایوب خان نے مجھے انٹرنیشنل ایٹمی انرجی ایجنسی میں منعقد ہونے والی مختلف کانفرنسوں میں پاکستان کا نمائندہ مقرر کیا۔ وہاں میں نے ایک انٹرنیشنل سنٹر برائے نظریاتی طبعیات قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی اور یہ درخواست کی تھی کہ اقوام متحدہ کو ایسا سنٹر کسی ترقی پذیر ملک میں قائم کرنا چاہیے۔ 1960ء میں ان لوگوں نے میری باتیں سنیں اور کئی ممالک نے اس تجویز کی حمایت کی۔ 1961ء میں ہمیں اٹلی کی حکومت کی بھی حمایت حاصل ہو گئی۔ 1962ء میں ایک مرتبہ پھر اس موضوع پر بحث ہوئی، میں اس وقت بھی پاکستانی وفد کا رکن تھا جبکہ ڈاکٹر عثمانی اس وفد کے سربراہ تھے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ اس موضوع پر صبح کے دس بجے بحث شروع ہوئی جو سہ پہر تین بجے تک جاری رہی۔ ہماری تجویز کی مخالفت کرنے والے ممالک میں ہالینڈ، امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس، کینیڈا، جرمنی اور بھارت تھے۔ ان تمام ممالک نے کہا کہ ایسا مرکز بنانے کی کوئی ضرورت نہیں، جبکہ تیونس، ایران، سعودی عرب کے علاوہ بہت سے ترقی پذیر ممالک نے ہماری تجویز کی حمایت کرتے ہوئے نظریاتی طبعیات کے لئے سنٹر کے قیام کی ضرورت پر زور دیا حالانکہ ان

بیچاروں کو نظریاتی طبعیات کی الف ب تک کا پتہ نہیں تھا۔ تاہم اس روز ہماری تجویز کے حق میں زیادہ ووٹ ڈالے گئے، جس کی وجہ سے ہماری تجویز منظور کرلی گئی۔

سوال: کیا یہ سچ ہے کہ بھارت نے بھی ایسے سنٹر کے قیام کی مخالفت کی تھی؟

جواب: جی ہاں یہ درست ہے کیونکہ ہندوستانی کمیشن (ایٹمی توانائی کمیشن---- ناقل) کے چیئرمین ڈاکٹر بھابھا کو ایسا سنٹر پسند نہیں تھا۔ بہرحال ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن بورڈ آف گورنر نے اس مقصد کے لئے صرف پینتیس ہزار ڈالر کی منظوری دی تھی۔ اس کے بعد ہم نے سنٹر کے لئے عمارت اور مزید رقم کی تلاش شروع کردی۔ چنانچہ اسی مقصد کے لئے میں پاکستان صدر ایوب خان سے ملنے کے لئے آیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ یہ سنٹر پاکستان میں قائم کرنے کی منظوری دیں۔ وہ اس وقت کراچی میں تھے۔ میری بات سننے کے بعد انہوں نے اپنے وزیر شعیب (وزیر خزانہ--- ناقل) سے فون پر رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ دوسری طرف سے شعیب نے ان سے دریافت کیا کہ "پروفیسر نے سنٹر کی کیا قیمت لگائی ہے؟" اس پر صدر ایوب نے اسے بتایا کہ "انہیں کام کرنے اور رہائش کے لئے ایک عمارت درکار ہے۔" یہ سن کر شعیب نے کہا کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر سنٹر کے لئے جگہ نہیں مانگ رہے بلکہ وہ ایک انٹرنیشنل ہوٹل بنانا چاہتے ہیں۔"

اس کے بعد اٹلی کی حکومت نے اس سنٹر کے قیام کے لئے ایک فیاضانہ پیشکش کی حالانکہ کئی دوسرے ممالک نے بھی اس میں دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ اس کے بعد عثمانی اور میں نے یہ بات بھی منظور کرالی کہ یہ سنٹر کم از کم چار سال کے لئے قائم کیا جائے گا۔ اس مدت کے ختم ہونے پر اس کے آئندہ جائے وقوع کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔

اب دیکھئے 1967ء میں کیا ہوا۔ (جب نئے جائے وقوع کے بارے میں انٹرنیشنل ایٹمی انرجی ایجنسی کے بورڈ آف گورنر کا اجلاس وی آنا میں ہوا---- ناقل)

حکومت پاکستان کے وزیر سائنس، میں ان کا نام نہیں لوں گا کیونکہ وہ آج (1983 میں) بھی زندہ ہیں نے پاکستانی وفد کو تحریری ہدایت دی کہ "اس سنٹر کو پاکستان میں منتقل کرنے کی مخالفت کی جائے۔" میں اس پاکستانی وفد کا رکن نہیں تھا کیونکہ اس وقت میں انٹرنیشنل ایٹمی انرجی ایجنسی کا ممبر تھا۔ اس وزیر کی اس ہدایت کا اس کے سوا اور کوئی مقصد نہ تھا کہ میں ہمیشہ کے لئے "جلاوطن" رہوں۔ ویسے مجھے یقین تھا کہ سنٹر کو اور کہیں منتقل نہیں کیا جائے گا کیونکہ یہ مسلمہ امر ہے کہ جب ایک مرتبہ کوئی چیز بنا دی جائے تو پھر اسے کہیں اور منتقل کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔ بہرحال جو لوگ اس قسم کے فیصلے کرتے ہیں ان کی نفسیاتی دلچسپی کا موجب ضرور ہوتی ہے، وہ سنٹر اپنی جگہ پر قائم ہے اور میں اسے کئی سالوں سے چلا رہا ہوں۔"

سوال: کیا حکومت کے اس رویے میں آپ کچھ تبدیلی محسوس کرتے ہیں؟
(سوال کنندہ کا اشارہ اس وقت کے وزیر سائنس کے رویے کی طرف تھا--- ناقل)

جواب: نہیں' لیکن ایک بات میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ محبوب الحق نے ملک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کچھ تبدیلیاں کی ہیں۔ لیکن اسے اُن پر عمل کرانے میں بہت دشواری پیش آئے گی۔ میں حکومت کے طریقہ کار کی بات نہیں کر رہا بلکہ میں ان لوگوں کی بات کر رہا ہوں جو ہم پر حکومت کرتے ہیں یعنی نوکر شاہی اور سیکرٹری صاحبان ان میں کوئی وسیع الخیالی نہیں اور نہ ہی وہ سائنسدانوں کو کسی قسم کی شخصی آزادی یا کوئی سہولت دینے کے حق میں ہیں۔ انہیں تو صرف اور صرف ''اختیار'' چاہیے' وہ یہی لفظ اختیار (Control) ہی تو ہے جسے وہ استعمال کرتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے میرے دوست اور کلاس فیلو ہیں لیکن آپ انہیں سمجھا نہیں سکتے۔ محبوب نے مجھے بتایا کہ وہ اس دستور العمل یا ضابطہ کار جسے حکومت بناتی ہے کی کچھ بھی پرواہ نہیں کرتے۔ بلکہ اکثر ان کی بدترین تشریح کرتے ہیں۔ اگر آپ ان کی سوچ کو تبدیل کرنا چاہیں تو یہ ایک بہت مشکل کام ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں کہ میں ہمیشہ جلاوطنی کی زندگی بسر کروں' لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اس ملک میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ مجھے اپنی کہانی ختم کرنے کی اجازت دیجئے۔ ٹریسٹ میں جس مکان میں رہتا ہوں وہ وہاں کے شہریوں کے قائم کردہ کنسورشیم کی ملکیت ہے' ان کا ایک بینک بھی ہے' جس کی تمام آمدنی خیراتی کاموں میں صرف کی جاتی ہے۔ اس شہر نے ہمیں سنٹر کے لئے ایک عمارت دی تھی' جس کی قیمت پندرہ لاکھ ڈالر ہے۔ یہ سب کچھ مہیا کرنا اس سوسائٹی کے سائنس کے بارے میں احساسات کو ظاہر کرتا ہے۔

سوال: آپ کے سنٹر میں کتنے مسلمان سائنسدان کام کرتے ہیں؟

جواب: سائنسدانوں کا تو آنا جانا لگا رہتا ہے۔ ہمارے ہاں تقریباً دو ہزار سائنسدان ہر سال آتے ہیں۔ ان میں سے مسلمان سائنسدانوں کی تعداد ایک صد پچاس سے دو صد تک ہوتی ہے۔ یہ دنیا کے مختلف ممالک سے آتے ہیں۔

ایک یادگاری تقریب

بھائی جان کی وفات کے بعد ان کی پہلی برسی کے موقع پر انٹرنیشنل سنٹر برائے نظریاتی طبعیات ٹریسٹ (اٹلی) نے 19 سے 22 نومبر 1997ء کو ایک کانفرنس منعقد کی۔ 21 نومبر کا دن (جس تاریخ کو انہوں نے وفات پائی) خصوصی طور پر ان کی یاد کے لئے مختص کیا گیا۔ اس روز بھائی جان کے شاگردوں' ساتھیوں اور دوستوں نے انہیں گلہائے عقیدت پیش کئے۔ اس موقعہ پر حضرت مرزا طاہر احمد صاحب امام الرابع جماعت احمدیہ کا ایک خصوصی پیغام بھائی جان کے بیٹے عزیزم احمد سلام نے پڑھ کر سنایا اس کانفرنس کی

تفصیل الفضل انٹرنیشنل لندن نے اپنی اشاعت مورخہ 9 جنوری 1998ء کو شائع کی جسے یہاں شکریہ کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے:

"اٹلی میں فزکس کی دنیا کے مشہور و معروف مرکز "انٹرنیشنل سنٹر فا تھیورٹیکل فزکس" کی جانب سے 19 نومبر سے 22 نومبر 1997ء ایک سالانہ کانفرنس منعقد ہوئی' جس میں دنیا کے معروف سائنسدانوں نے اپنے مقالے پڑھے۔

اس موقع پر کانفرنس کا ایک دن "عبدالسلام یادگاری دن" کے طور پر بھی مخصوص کیا گیا' جس میں انٹرنیشنل سنٹر فار تھیورٹیکل فزکس کے ڈائریکٹر جناب پروفیسر Migual Virasaro نے یہ تجویز پیش کی کہ ڈاکٹر عبدالسلام کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے سب سے موزوں بات یہ ہوگی کہ ہم اس ادارہ کو عبدالسلام کے نام سے منسوب کر کے اس کا نام "عبدالسلام انٹرنیشنل سنٹر فار تھیورٹیکل فزکس" رکھیں۔ چنانچہ اس تجویز کا تمام مندوبین کی طرف سے پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔

اس موقع پر امام جماعت احمدیہ حضرت مرزا طاہر احمد صاحب کی خدمت میں بھی پروفیسر M.A.Virasoro نے خاص پیغام کی درخواست کی تھی' جسے حضرت صاحب نے منظور فرمایا اور یہ خصوصی پیغام 21 نومبر کو عبدالسلام یادگاری دن کے موقع پر مکرم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے بیٹے مکرم احمد سلام نے پڑھ کر سنایا:

اس تقریب میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے خاندان کے سبھی افراد کو مدعو کیا گیا تھا۔ اسی شام اس تقریب کے شایان شان Adriatico Guesthouse میں ایک ڈنر کا بھی اہتمام تھا۔

اس یادگاری تقریب میں پروفیسر Virasoro نے کہا کہ ایسے عظیم انسان کے لئے یہی سب سے موزوں خراج عقیدت ہے جبکہ ڈاکٹر سلام مرکز کے بانی تھے اور 1960ء میں ڈاکٹر سلام نے ہی تجویز پیش کی تھی کہ تیسری دنیا کے طبعیات کے ماہرین کے لئے ایک علیحدہ ادارہ ہونا چاہیے جو مغربی اور مشرقی دنیا کے جدید سائنس دانوں سے روابط رکھ سکے۔ اس وقت یہ ادارہ 80 فیصد ترقی یافتہ ممالک کے سائنس دانوں کے لئے 70 ہزار مطالعاتی دوروں کی کفالت بہم پہنچا چکا ہے۔ تاکہ وہ ترقی یافتہ ملکوں کے ہم عصر سائنس دانوں کے شانہ بشانہ چل سکیں۔ اس بارے میں اس مرکز سے ہزارہا کی تعداد میں مقالے اور سائنسی رپورٹس منظر عام پر آ چکی ہیں۔

البانیہ کے صدر پروفیسر Rexhep Meidani جو خود بھی ایک معروف ماہر طبعیات ہیں اور انٹرنیشنل سنٹر فار تھیورٹیکل فزکس میں ریسرچ سکالر رہ چکے ہیں نے کہا کہ عبدالسلام نے غیر ترقی یافتہ ملکوں کے غریب سائنس دانوں کو اعزاز اور وقار دے کر جو عظیم کام کیا ہے اس سے وہ بلاشبہ تیسری دنیا کے ہیرو ہیں۔

حکومت اٹلی کے نمائندے نے کہا کہ یہ مرکز حکومت اٹلی' انٹرنیشنل ایٹمی انرجی ایجنسی (IAEA) اور اقوام متحدہ کے تعلیمی سائنسی اور کلچرل ادارے (UNESCO) کے اشتراک سے کام کر رہا ہے' جس کے لئے حکومت اٹلی اور City of Trieste کی جانب سے 20 ملین ڈالر کا عطیہ ملتا ہے جو کل بجٹ کا 80 فیصد ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس ادارہ پر فخر کرتے ہیں اور اس کی کارکردگی پر مکمل طور پر مطمئن ہیں۔ انہوں نے اس بات کا یقین دلایا کہ وہ تیسری دنیا کے سائنسدانوں اور بین الاقوامی فزکس برادری کے لئے گرانقدر خدمات سرانجام دینے والے اس ادارہ کی اسی طرح بھرپور اعانت کرتے رہیں گے۔

ڈائریکٹر جنرل IAEA جناب Prof. Hans Blix نے اس ادارہ کے نام کو عبدالسلام کے نام سے منسوب کرنے کی تجویز کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس بات کا ذکر کیا کہ اس ادارے کے UNESCO کی زیر نگرانی آنے سے 30 سال پہلے IAEA ادارہ اس کی معاونت میں شامل تھا۔ انہوں نے عبدالسلام کو اپنے ہم عصر سائنس دانوں میں ممتاز شخصیت اور امن کا خادم قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ عبدالسلام نے اس مرکز کے منشور میں نمایاں اضافہ کیا۔ نظریاتی سائنس کے ساتھ ساتھ اس کے عملی حصوں مثلاً کمپیوٹر' لیزر' جیوفزکس اور میٹریل سائنس کے مضامین کو بھی شامل کیا۔ A.Badran ڈاکٹر (بدران) ڈپٹی ڈائریکٹر یونیسکو نے کہا کہ عبدالسلام نے تیسری دنیا کے سائنس دانوں کو بہت سے نئے راستے دکھائے' جس کی وجہ سے غیر ترقی یافتہ ملکوں میں ان کی خدمات آئندہ آنے والی دہائیوں میں یاد رہیں گی۔

ویت نام کے پروفیسر Nguyen Van Hieu (پریذیڈنٹ نیشنل سنٹر برائے سائنس اینڈ ٹیکنالوجی ویت نام) نے کہا کہ ویت نام میں سائنس کی حمایت میں جو کام عبدالسلام نے کیا' اس کی قدر شناسی کے طور پر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ہنوئی Hanoi میں "سلام سنٹر فار تھیورٹیکل فزکس" کا ادارہ قائم کیا جائے۔

محترمہ پروفیسر Lydia Makhubu جو Third World Organisation for Women in Science کی صدر ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ کس طرح عبدالسلام نے سائنس دان عورتوں کو ریسرچ کے میدان میں ڈالا اور سائنسی ریسرچ کی دنیا میں عورت کے عظیم کردار کو ہمیشہ سراہا۔

پروفیسر جے زیمن (J Ziman) جو ڈاکٹر اسلام کے بہت قریب رہ کر انگلستان میں کام کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ سلام صرف تیسری دنیا کے لئے ہی قابل فخر نہیں تھا' بلکہ وہ فزکس کی عام دنیا کے لئے بھی قابل احترام تھے اور انہیں اس صدی کا عظیم سائنس دان اور اس دور کا آئن سٹائن کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر سلام کو اپنے لئے نوبل انعام کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر وہ چاہتے تھے کہ غیر ترقی یافتہ ممالک کی عزت نفس اور خود اعتمادی بحال ہو اور اس میں اضافہ ہو۔

پاکستان کے سابق چیئرمین اٹامک انرجی کمیشن منیر احمد خان نے کہا کہ سلام ایسے کشف بین انسان تھے جو نئے نئے ادارے متشکل کیا کرتے تھے' وہ ایک ایسے محب وطن تھے کہ جنہوں نے اپنے ملک کی جی بھر کر خدمت کی۔ تیسری دنیا کے ایسے خدمت گزار تھے کہ جس نے تیسری دنیا کے سائنس دانوں میں نئی

امیدوں' ولولوں اور امنگوں کی روح پھونک دیا۔ اس لحاظ سے وہ اس صدی کے سائنس دانوں کے قائد تھے۔ انہوں نے یاد دلایا کہ سلام پاکستان میں اٹامک انرجی کمیشن کے 14 سال تک سرگرم رکن رہے اور کمیشن کے مختلف منصوبوں کی راہنمائی ترقی اور تکمیل میں گراں قدر کام کیا' جس میں PINSTECH اور KANUPP کے منصوبے شامل ہیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے جب صدر ایوب خان سے کہا کہ مجھے ٹیکنالوجی کی ضرورت ہے' نہ کہ امریکن قرضے کی۔ اس کے نتیجے میں صدر کینڈی نے Revelle Comminion پاکستان بھجوایا تاکہ وہ پانی کی نکاسی اور سیم کا جائزہ لے سکے۔ SUPARCO کے ادارہ کا قیام بھی ڈاکٹر سلام کا مرہون منت ہے۔ جہاں سے سائنس دانوں کو تربیت پانے کے مواقع حاصل ہوئے۔ جنہوں نے بعد میں جاکر تحقیق و ترقی کے اداروں میں اور ملک کی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ مرتبے حاصل کئے۔ منیر احمد خان نے کہا کہ ہم جنہوں نے سائنس کی دنیا کو کھو دیا تھا' ڈاکٹر سلام ہمارے لئے ایسا دریچہ ثابت ہوئے جہاں سے ہم نے سائنس کی نئی دنیا دیکھنے کی صلاحیت حاصل کی۔

پروفیسر پرویز ہود بھائی نے کہا کہ پروفیسر سلام کو دنیا بھر میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ہر مسلمان ملک ان پر فخر کرتا ہے لیکن ڈاکٹر سلام نے اپنے ملک پاکستان میں انتہائی اذیت اٹھائی اور احمدیہ جماعت کا فرد ہونے کی وجہ سے عناد اور امتیازی سلوک کا شکار ہوئے۔ اس وقت جب پاکستان انہیں بھول گیا تھا ساری دنیا انہیں قدر و منزلت سے نواز رہی تھی۔

پروفیسر M.A.Virasoro کے نام ایک پیغام میں جناب نواز شریف وزیر اعظم اسلامک ریپبلک آف پاکستان نے کہا کہ مجھے یہ جان کر بہت مسرت ہوئی ہے کہ انٹر نیشنل سنٹر فار تھیورٹیکل فزکس کی مجلس منتظمہ کو حکومت اٹلی کا تعاون حاصل ہے اور انٹر نیشنل اٹامک انرجی ایجنسی اور یونیسکو کے مشترکہ فیصلہ سے اس ادارہ کا نام ڈاکٹر عبدالسلام کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ جناب وزیر اعظم نے کہا کہ یہ عظیم مرکز نہ صرف ان کے لئے باعث اعزاز ہے بلکہ یہ پاکستان کے لئے بھی اسی طرح عزت افزائی کا موجب ہے۔ ڈاکٹر سلام دنیا کے بلند مرتبہ سائنس دان تھے' جنہوں نے 30 سال پہلے اس ادارہ کو قائم کیا' ہم فخر کرتے ہیں کہ وہ واحد پاکستانی ہیں جو نوبل انعام یافتہ ہیں۔ انہوں نے صدر پاکستان کے سائنسی مشیر کی حیثیت میں 14 سال تک ملک کی گراں قدر خدمت سرانجام دی۔ ICTP کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے نہ صرف انہوں نے عالمی فزکس برادری کی خدمت کی بلکہ انہوں نے تیسری دنیا کے سائنسدانوں کی تربیت و رہنمائی کا موثر اہتمام کیا۔ انہوں نے علم کی حدود میں وسعت پیدا کی اور اپنی صلاحیتوں سے دنیا بھر میں سائنس کی ترویج میں غیر معمولی کام کیا۔ وزیر اعظم پاکستان نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ اس مرکز کا نیا نام دنیا بھر کے سائنسدانوں میں ایک جوش اور ولولہ پیدا کرنے کا موجب ہو گا۔"

نوبل انعام کے بعد اگر کسی چیز کو عزت و توقیر سے دیکھا جاتا ہے تو وہ عبدالسلام سنٹر فار تھیورٹیکل فزکس ہے۔

انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس' ٹرائسٹ (اٹلی) کے زیر اہتمام

''سلام'' یادگاری کانفرنس (19 تا 22 نومبر 1997) کے موقع پر

حضرت امام جماعت احمدیہ الرابع کا خصوصی پیغام

میں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے منتظمین انٹرنیشنل سنٹر تھیوریٹیکل فزکس کانفرنس کے محرکین اور مندوبین جو وقت نکال کر (۔) پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کی دلکش یادوں کو تازہ کر کے اور اپنے تحسین بھرے جذبات کے اظہار کے لئے یہاں تشریف لائے ہیں' ان سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس شکریہ کا اعادہ بھی کرتا ہوں کہ اس کانفرنس کی منتظمہ نے مجھے نادر موقع دیا ہے کہ میں بھی ان کے ذکر خیر میں شامل ہو سکوں۔ جو ایک ایسے فہم و ذہانت میں یکتا انسان کے اعزاز میں منعقد کی جا رہی ہے' جس کے دل و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتیں کسی مخصوص خطہ کے لئے محدود نہ تھیں اور یہی خصوصیت ان کی حقیقی عظمت کا نشان تھی۔ جس نے انہیں ہم عصر نادر روزگار دانشوروں میں سربلند کر رکھا تھا۔

میں انہیں بچپن سے جانتا تھا لیکن صرف اس حد تک کہ جیسے ایک بچہ ستاروں کو جانتا ہے۔ مگر ایسی کوئی بے تکلفی اور ذاتی تعلق نہ تھا۔ جس سے یہ تعلق کوئی غیر رسمی خصوصیت رکھتا ہو۔ مگر یہ 1978ء کی بات ہے جب میں سیر و تفریح کی غرض سے شمالی امریکہ اور یورپ آیا۔ ڈاکٹر سلام' سوائے اس کے کہ بانی سلسلہ احمدیہ کے خاندان سے دلی عقیدت رکھتے تھے اور انکی بیوی مکرمہ امتہ الحفیظ بیگم صاحبہ سے میری والدہ (۔) دلی محبت رکھتی تھیں۔ بس یہی تعلق تھا جس پر انہوں نے مجھ کو اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی۔ اس موقع پر جب ہماری خواتین ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھیں میں اور ڈاکٹر سلام ہم دونوں دوسرے کمرے میں محو گفتگو تھے' جس سے ہمیں ایک دوسرے کے بہت قریب آنے کا موقع ملا۔ یہی وہ پہلا موقع تھا کہ ہمارے درمیان بہت گہرے ذاتی مراسم کی ابتداء ہوئی۔ یہ مراسم باہم روشن خیالی' روحانی رشتے اور مخلصانہ جذبات پر مبنی تھے اور ان کی وفات تک اسی طرح قائم رہے۔ مگر وہ خوش طبع شخص جس کی دلکشی اور انسانی جذبہ کی سرشاری کسی تنگ جگہ کے لئے محدود نہ تھی' وہ بھی مجھے بالآخر سوگوار چھوڑ گیا۔

یہ وہ پہلی ملاقات تھی جس میں میں نے انہیں بہت کشادہ دل اور متوازن طبع انسان پایا اور یہ وہ حقیقت تھی جو مجھ پر عیاں ہوئی کہ مذہب کے بارے میں ان کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ پراسرار تصوف (Cryptic Sufism) کے فلسفے کا فہم رکھتے تھے۔ تاریخ پر ان کا مطالعہ عمیق تھا۔ نظریاتی طبعیات اگرچہ ان کا اپنا مضمون تھا مگر یہی ایک مضمون نہ تھا جس پر انہیں استادانہ عبور حاصل تھا۔ کیمسٹری کے گہرے علم کے ساتھ ساتھ علم الحیات' موجودات کے ذرات اور کائنات کے عجائب پر بھی حیرت انگیز نظر رکھتے تھے۔ لیکن جب وہ کارخانہ قدرت کی وسعت اور خدا تعالیٰ کی صفت وحدانیت کی

طرف لوٹتے تھے اس مقام پر ان کا عرفان و وجدان ان کے لئے ایک نئی دنیا کو اجاگر کر دیتا تھا۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ یونیفائیڈ فیلڈ تھیوری' خدا تعالیٰ کی وحدانیت کے عقیدے سے تعلق اور ایمان کی جڑ سے پھوٹی تھی کیونکہ ان کا ایمان تھا کہ ہر چیز خدا تعالیٰ سے شروع ہوتی ہے اور اسی میں مدغم ہو جاتی ہے۔ یقیناً اسی عقیدہ نے انہیں تقویت دی کہ وہ سائنسی اعتبار سے یہ ثابت کر سکے کہ یونیفائیڈ فیلڈ تھیوری کے تحت اس کی کچھ بنیادی طاقتیں ہیں' جو موجودات میں کام کرتی نظر آتی ہیں۔ ہماری اس گفتگو کے دوران انہوں نے مجھ سے اظہار کیا کہ وہ اپنی تحقیقات میں اس مسئلہ پر پہلے ہی بہت آگے بڑھ چکے ہیں کہ وہ عالم موجودات میں دو اور طاقتوں کا ادغام ثابت کر سکیں۔ اگر وہ اور زندہ رہتے تو مجھے یقین ہے کہ وہ ایک اور نوبل انعام حاصل کر پاتے جبکہ انہیں دو اور بنیادی طاقتوں کے ادغام کا مثبت نظریہ پیش کرنا تھا۔

اس مختصر وقت میں اس ذہین و فہیم انسان کی تحسین کے ساتھ ساتھ اس کی سائنسی کامیابیوں کا ذکر کرنے کا یہ موقع نہیں۔ میں تو ڈاکٹر سلام کی ایک جھلک دکھا کر اس بابرکت تقریب میں حصہ دار بن رہا ہوں۔ اس ڈاکٹر عبدالسلام کی جس نے کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی تھی کہ وہ جدید سائنسی علوم اور ان کی پیچیدگیوں پر مجھ جیسے عام علم رکھنے والے کے ساتھ بے تکلفانہ تبادلہ خیالات کرتے۔ ادھر میری یہ حالت کہ میری تمام تر کوششیں اس بات کو سمجھنے کی طرف لگی ہوئی تھیں کہ روشنی کی رفتار 186000 میل فی سیکنڈ سے آگے کیوں نہیں بڑھ سکتی۔ پھر بھی ان کے صبر کی داد دیتا ہوں کہ میرے استدلال اور بار بار کے اصرار پر انہوں نے مشروط قسم کی حامی بھری۔ میرا سوال یہ تھا کہ وہ اسباب و علل جو روشنی کے سفر کے لئے زیادہ سے زیادہ موزوں ہیں اگر بنیادی طور پر ان میں تبدیلی ہو جائے جو روشنی کی رفتار کو تیز کر سکیں تو کیا روشنی کی رفتار اس حد سے آگے نہ بڑھے گی جو اس کی حد قائم ہے؟ ان کی طرف سے جواب اگرچہ رکا رکا سا تھا لیکن ان کے سر کے ہلنے سے کچھ کچھ اثباتی جھلک ضرور نظر آتی تھی۔

میں نے اپنی پیاس بجھانے کے لئے اور بھی بہت سے سوالات کئے جن میں Heat Radiation کی نوعیت سے متعلق سوال بھی تھے۔ آخر' شعاع بھی روشنی کی رفتار سے چلتی ہے۔ اگرچہ یہ اپنے ہی طول موج پر سفر کرتی ہے اور آہستہ آہستہ حرکت کرتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جہاں سے وہ آگ سلگی ہے اس کی روشنی بھی اسی ذریعہ سے باہر نکلی ہے جو عملاً کمرہ کو بھرنے کے لئے وقت نہیں لیتی۔ ایسے لگتا ہے جیسے اسے دوسری طرف پہنچنے کے لئے صدیاں لگ جائیں گی۔ اس قسم کے بے شمار متجسسانہ سوالات کی میری طرف سے بھرمار تھی اور ان کی طرف سے دیانت دارانہ طور پر پوری کوشش رہی کہ وہ آخر تک جواب دیتے رہیں۔ یہاں بھی انہوں نے بالآخر خاموش لہجے میں اقرار کیا کہ شعاع حرارت کی نوعیت کے بارے میں ایک حصہ ضرور ایسا ہے جس کو بہت سے جدید سائنس دان ابھی سمجھنے سے قاصر ہیں۔

یہ اس بے تکلف اور دلربا ملاقات کی باتیں تھیں' جس سے میں عبدالسلام کی عظمت کو جان سکا۔ یہ ان کے فہم و ادراک کا معراج ہی تھا جس میں ان کی عظمت پوشیدہ ہے۔ یہ تھی وہ ملاقات جس کے بعد

پھر ہم کبھی جدا نہیں ہو سکے۔ میرا ان سے ہمیشہ گفتگو اور استفسار کا تعلق رہا۔ وہ اپنے پیچیدہ پیچیدہ مسائل جو انہیں درپیش ہوتے زیر بحث لاتے اور میں نے بھی ایسی ملاقاتوں کو ہمیشہ جاندار بنانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی اور یہ ملاقاتیں میرے لئے ازدیاد علم کا باعث ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر سلام کا مزاج انسان دوستی کا تھا اور ان میں دوستی کا جذبہ بے انتہا اور بے حد تھا۔ وہ کسی خارجی ستائش کے محتاج نہ تھے۔ کوئی مذہبی' سیاسی' غیر ملکی یا ملکی حد اس انسان کے شفاف دل پر واقع نہیں تھی۔ عبدالسلام کے لئے انسان دوستی کا نعرہ تحسین' ٹرائسٹی کے تھیورٹیکل فزکس کا ادارہ ہمیشہ بلند کرتا چلا آیا ہے اور ہمیشہ کرتا چلا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر سلام کی روح کو سکون بخشے اور ان نیک مقاصد کو مرہون تکمیل کرے جو انہیں دنیا میں عمر بھر عزیز رہے۔

(حضرت صاحب کے پیغام کا اردو میں مفہوم مکرم بشیرالدین سامی نے تیار کیا۔)

("الفضل انٹرنیشنل" 9 جنوری تا 15 جنوری 1998ء)

گورو نانک دیو یونیورسٹی امرتسر (انڈیا) کے پروفیسر ایچ ایس ورک کا خراج تحسین

بھائی جان کی وفات سے پہلے گورو نانک دیو یونیورسٹی امرتسر (انڈیا) کے شعبہ فزکس نے پروفیسر ایچ-ایس-ورک نے ان کے بارے میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا:

"A Genus Called Abdus Salam"

(غیر معمولی ذہین انسان جسے عبدالسلام کہا جاتا ہے)

پروفیسر ورک کا یہ مضمون Current Science Vol 72, No 11۔ June 10,1997 میں شائع ہوا تھا۔ یہ ایک جامع مضمون ہے جس نے بھائی جان کو ان کی گرانقدر بے لوث خدمات اور تحقیقات پر شاندار خراج تحسین پیش کرنے کے بعد آخر میں اپنے مضمون کو اس فقرہ پر ختم کیا:

"If Trieste has become Mecca for Third World Scientists over the years since its creation in 1964, Professor Abdus Salam, Nobel Laureate and genius from Punjab was destined to play the role of the prophet of third World Scientists. May the mercy of Allah be on his servant."

10

بنیادی ذرات اور بھائی جان کی چند اہم تحقیقات

بھائی جان نے نظری طبعیات (Theoretical Physics) کے میدان میں بنیادی ذرات (Elementry Particles) پر بنیادی اور اہم تحقیقی کام کیا ہے۔ ذیل میں ان کی چند اہم تحقیقات مختصراً بیان کرنے سے پہلے مادے کے بنیادی ذرات ان کے مابین موجود قوتیں اور ان کی وحدت گیج فیلڈ نظریے (Gauge Flied Theory) سے آگہی مفید ثابت ہوگی۔ اسے پروفیسر سید محمد ابوالہاشم رضوی، شعبہ طبعیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے یوں بیان کیا ہے:

ذرات، بنیادی قوتیں اور ان کی وحدت کا تصور

ماہرین طبعیات کا موجودہ تصور یہ ہے کہ مادہ بنیادی ذرات سے مل کر بنا ہے۔ یہ بنیادی ذرات دو قسم کے ہیں: ہیڈران (Hadron) اور لیپٹان (Leptons)۔ ہیڈران نسبتاً بھاری ذرات ہوتے ہیں، مثلاً پروٹان (Protons)، نیوٹران (Neutrons) مختلف قسم کے میسان (Mesons) اور دوسرے بھاری ذرات۔ اس کے برخلاف لپٹان ہلکے ہوتے ہیں، مثلاً الیکٹران (Electrons) میوآن (Muon) اور مختلف طرح کے نیوٹرینو (Neutrinos)۔ ان ذرات کے علاوہ ہر ذرے کا ایک ضد ذرہ (Anti Particle) بھی پایا جاتا ہے۔ ہماری دنیا کے ایٹم (Atom) ذرات سے مل کر بنے ہیں، ہو سکتا ہے کہ کسی اور ضد دنیا کے ایٹم کی تشکیل ضد ذرات سے ہوئی ہو۔

موجودہ تصور کے تحت کسی ذرے کے بیان کے لئے کوانٹم فیلڈ کی ضرورت ہوتی ہے، جو کوانٹم میکیانیات (Quantum Mechanics) اور نظریہ اضافی (Quantum Theory) کے امتزاج کی شکل ہے۔ مختلف قسم کے فیلڈ ذرات کے تبادلوں کی وجہ سے دو ذرات کے درمیان قوت نمودار ہوتی ہے، اس لئے مذکورہ بالا مادی ذرات کے علاوہ کچھ فیلڈ ذرات بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً فوٹان (Photon) جس کو نور کا ذرہ بھی کہا جا سکتا ہے اور جس کا تبادلہ برقی چارج رکھنے والے دو مادی ذرات کے مابین برقی مقناطیسی قوت کا مظہر ہے۔ اسی طرح ایک فیلڈ ذرہ گریوٹان (Greviton) بھی ہے جس کے تبادلے سے ہر دو مادی ذرات کے درمیان قوت کشش ثقل پیدا ہوتی ہے۔

فی الحال یہ خیال ہے لیپٹان ذرات کو بنیادی تصور کیا جا سکتا ہے۔

(10^{-16} cm کے فاصلہ تک) جب کہ ہیڈران ذرات کی ساخت مرکب ہے یعنی ہیڈران اور زیادہ بنیادی اجزاء سے مل کر بنے ہیں۔ مادے کے ان حتمی اجزاء (Ultimate Building Block) کو کوارک

(Quark) کا نام دیا گیا ہے۔ کوارک کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ اس خاصیت کو (Flavour) کہا جاتا ہے۔ مثلاً تازہ ترین نظریات کے تحت کوارک کے چھ فلیور ہیں۔ ,Down (d) Up(u), Strange (s) اور Charm (c), Beauty(b) Truth(T) اس کے علاوہ ان میں سے ہر قسم کا کوارک ایک اور خاصیت کا حامل ہوتا ہے جسے رنگ (Colour) کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس طرح ہر فلیور کا کوارک تین مختلف رنگوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ رنگ ایک سائنسی تصور ہے اور ہماری روزمرہ زندگی میں پائے جانے والے رنگوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

گو کہ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ کوارک بذات خود کچھ اور "بنیادی" اجزاء سے مل کر بنے ہیں۔ مگر سائنسدانوں کی اکثریت بھی اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ مادہ بنیادی سطح پر "چھ عدد" لیپٹان یعنی uet اور ان سے وابستہ نیوٹرینو ذرات اور چھ طرح کے کوارک یعنی t,c,s,u اور b سے مل کر بنا ہے۔ یہ کوارک اور لیپٹان تین نسلوں میں عمل پذیر ہوتے ہیں۔

	کوارک	لپٹان
پہلی نسل	u,d	e,Ve
دوسری نسل	c,s	u,Vm
تیسری نسل	t,b	z Vz

ان تمام ذرات (اور اس وجہ سے تمام مادے) کا عمل (Behaviour) ان قوتوں پر مبنی ہے جو ان ذرات کے مابین کام کرتی ہیں۔ فی زمانہ ان قوتوں کا بیان کوانٹم فیلڈ نظریے (Quantum Field Theory) کی زبان میں کیا جاتا ہے۔ کچھ سال پہلے تک اس طرح کی بنیادی قوتوں کو ہم چار قسموں میں بانٹ سکتے تھے۔

1 مادی کشش یا کشش ثقل (Gravitational Force) تمام مادی ذرات ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں' یہ قوت کشش ذرے کی کمیت (Mass) کے تناسب سے (Proportional) ہوتی ہے۔ یہی وہ قوت ہے جو کہ ستاروں' سیاروں اور کہکشاؤں کا باعث ہوتی ہے۔ گویا تمام کائناتی صفات کی بنیادی وجہ یہی قوت ہے۔ گریوٹان ذرے کا تبادلہ اس قوت کو دو ذروں کے درمیان پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔

2 برق مقناطیسی قوت (Electromagnetic Force) یہ قوت کشش اور دفع دونوں طرح کی ہو سکتی ہے۔ دو ذرات کے درمیان یہ قوت ان کے برقی چارج (Electrical Charge) کی مناسبت سے ہوتی ہے۔ اسی قوت کی وجہ سے ایٹم قائم و دائم ہے۔ اور یہی قوت زمین پر زندگی کے تمام عمل اور اثرات کی بنیادی طور پر ذمہ دار ہے۔ دو برقی ذرات کے درمیان قوت کی ذمہ داری فوٹان ذرے کے تبادلے پر ہے۔

3 شدید نیوکلیر قوت (Strong Nuclear Force) ہیڈران ذرات ایک اور طرح کے "چارج" یعنی (Strong Nuclear Force) کے بھی حامل ہوتے ہیں اور جب یہ ذرات بہت قریب تقریباً 10^{-13} cm ہوتے ہیں تو ایک دوسرے پر کشش انداز ہوتے ہیں۔ یہ قوت نیوکلیس (Nucleus) کو قائم اور مستحکم رکھنے کی ذمہ دار ہے۔ فشن (Fission) اور فیوژن (Fusion) کے عمل اسی قوت کے مظہر ہیں۔ کوارک کے مابین گلوآن (Gluons) کا تبادلہ اس قوت کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔

4 ضعیف نیوکلیر قوت (Weak Nuclear Force) ہیڈران اور لیپٹان کے درمیان ایک بہت کم فاصلہ 10^{-16} cm دائرہ عمل (Range) رکھنے والی ضعیف نیوکلیر (بہ نسبت شدید نیوکلیر) قوت ہوتی ہے جو کہ ذرات کے ریڈیو ایکٹیو (Radio Active) زوال کی وجہ ہے۔ اس کو ضعیف نیوکلیر قوت کہتے ہیں جو کہ ذرات کے ضعیف چارج سے نسبت رکھتی ہے۔ زمین اور کائنات میں بھاری عناصر کے وجود کی خاص وجہ یہ قوت ہے۔ بوسان ذرات $\pm$ W اور Z تبادلے اس قوت کا سبب بنتے ہیں۔

یہ بات قابل غور ہے کہ تمام ہیڈران ذرات شدید نیوکلیر تفاعل (Interaction) میں ضرور حصہ لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور متعدد تفاعل بھی شریک ہوتے ہیں' برخلاف اس کے لیپٹان ذرات صرف ضعیف نیوکلیر تفاعل اور برق مقناطیسی تفاعل میں شریک ہوتے ہیں' لیکن شدید تفاعل کے کسی بھی عمل میں حصہ نہیں لیتے۔

ان تمام بنیادی قوتوں کی وحدت کا تصور ماہرین طبعیات کا ایک بہت پرانا خواب ہے۔ تقریباً ایک سو بیس سال قبل میکسول (Maxwell) نے برقی اور مقناطیسی قوتوں کو وحدت کی لڑی میں پرو دیا تھا۔ یہاں سے ہی وحدت کے گیج نظریے (Gauge Theory of Unification) کی شروعات ہوئی۔ اس کے کافی عرصے بعد آئن سٹائن نے مادی کشش کی قوت اور برقی مقناطیسی قوت کو یک جا کرنے کی کوشش کی اور تمام قوتوں کے وحدت کے تصور کو کافی اجاگر کیا۔ مگر اس کو عملی جامہ پہنانے میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس نقطہ میں مادی کشش کے کوانٹم اثرات شامل نہیں تھے۔

اب اسی اتحاد کی کوشش ایک دوسرے نقطہ نظر سے کی گئی ہے۔ پچھلے پندرہ برسوں میں گیج فیلڈ نظریہ وحدت کافی مقبولیت اختیار کر گیا ہے اور کامیابی کا ضامن معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس نظریے کی متعدد پیشین گوئیاں پچھلے چند برسوں میں تجربہ گاہوں میں صحیح ثابت ہو چکی ہیں۔

اس طرح تحقیق کئی رخ اختیار کر چکی ہے۔ مثلاً ایک طرف مادے کی بنیادی ساخت کی تلاش ہے' دوسری طرف بنیادی قوت کے راز کو سمجھنے کی کوشش ہے۔ گیج نظریہ ان دونوں کاوشوں کو یک جا کرتا ہے۔ اس نظریے کی روح یہ ہے کہ بنیادی ذرات کی اضافیتی کوانٹم فیلڈ (Relative Quantum Field) کچھ مخصوص چارج آپریٹر کے گروپ خاکے میں اور پھر تمام بنیادی

قوتیں ان چارجوں کے مابین کشش اور دفع کی قوتوں (جو کہ مختلف ذرات کے تبادلوں کی وجہ سے ہیں) کے طور سے سمجھی جا سکتی ہیں۔ یہ چارج آر پیٹر برقی چارج' کمیت' کوانٹم' گھماؤ یا سپن رنگ (Colour) قسم کوارک (Flavour) وغیرہ ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد سب سے بنیادی تلاش اس "شے" (Entity) کی ہے جو ان Charges کو وحدت کا جامہ پہنا دے گویا یہ تمام قسم کے چارج نہ صرف اس بنیادی شے کے مختلف اجزا یا اشکال اور رخ ہیں بلکہ ایک شکل سے دوسری شکل میں تبدیل بھی ہو سکتے ہیں۔ اس بنیادی چارج کی فطرت کو سمجھنا ہی غالباً ذراتی فزکس کا سب سے بنیادی اور اہم کام ہے۔"

پروفیسر عبدالسلام کی اہم تحقیقات

ذیل میں پروفیسر عبدالسلام کے تحقیقی کاموں کا ایک تاریخ وار جائزہ آسان زبان میں لینے کی کوشش کی گئی ہے' مندرجہ بالا تعارف پر نظر ڈالنے کے بعد قارئین کو اس کوشش کی دقتوں کا اندازہ بخوبی ہو گیا ہو گا اس لئے امید ہے کہ وہ میری خامیوں اور کوتاہیوں کو نظر انداز کریں گے۔

1 ری نارملائزیشن (Renormalization)۔ پروفیسر عبدالسلام کا پہلا بڑا تحقیقی کام (1950-51) کوانٹم فیلڈ تھیوری کے ری نارملائزیشن نظریہ (Renomalization Theory) سے متعلق ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک نظریے میں مختلف ناپی جا سکنے والی طبعی خاصیتوں کے تکملہ (Integrals) متسع (Diverge) ہو جاتے ہیں اور نتیجہ غیر طبعی لامتناہیہ (Unphysical Infinities) کی شکل میں بار بار نمودار ہوتا ہے۔ اس دقت کو دور کرنے کے لئے ری نارملائزیشن کی ترکیب استعمال کی جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک کوانٹم فیلڈ تھیوری کے ری نارملائزیشن ہونے کے قابل ہونے سے یہ مطلب ہے کہ اس نظریے میں جو بار بار بے ضابطہ لامتناہیات آتی ہیں' ان سے بچا جا سکے' تاکہ اس نظریے کو کسی طبعی خاصیت کے حساب (Calculation) میں استعمال کیا جا سکے اور محدود جوابات حاصل کئے جا سکیں اور تجربات سے ان کا مقابلہ کیا جا سکے۔

1949ء میں فائن مین' شوئنگر' ٹوماگا اور ڈائسن (Feynman, Schwinger, Tomonaga, Dyson) نے کوانٹم برق حرکیات (Quantum Electro-Dynamics) (جو کہ طبعی نظریات میں سب سے کامیاب نظریہ کہا جا سکتا ہے) کی تشکیل مکمل کر لی تھی' اس نظریے کا ری نارملائز ہونے کے قابل ہونے کا مکمل ریاضیاتی ثبوت عبدالسلام نے مہیا کر دیا۔

اس کے بعد عبدالسلام اور میتھیوز (Mathews) نے میسان نظریوں کے ری نارملائز ہونے کی قابلیت کو پرکھا اور یہ پایا کہ صفر سپن (Zero Spin) والے میسان' ذرات کے لئے یہ نظریے ری نارملائز ہونے کے قابل ہوتے ہیں' اس وقت جو میسان ذرات معلوم تھے ان کی یہی خاصیت تھی۔

2 دو اجزائی نیوٹرینو کا نظریہ اور پیرٹی (Parity) کی شرط۔

ان کے ایک اور اہم کام کا تعلق ذراتی فزکس میں پیرٹی (Parity) کے تصور سے ہے۔ پیرٹی سے مراد اس عمل سے ہے جو کسی واقعے اور آئینے میں اس کے عکس کی یکسانیت یا سمرٹی (Symmetry) کے تعلق کو بیان کرتا ہے۔ 1956ء تک یہ خیال تھا کہ فطرت نے دائیں اور بائیں میں کوئی بنیادی فرق نہ رکھا ہوگا اور تمام قوانین فطرت پیرٹی برقرار رکھنے کی شرط کے پابند ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ مثلاً جب ایک ریڈیو ایکٹو (Radio Active) نیو کلیس بیٹا ذرہ (β Particte) یعنی الیکٹران کو خارج کر کے زوال پذیر ہوتا ہے اور ساتھ میں نیوٹرینو بھی نکلتے ہیں تو پیرٹی برقرار رکھنے والی شرط کے تحت اس بات کا احتمال کہ یہ ذرات نکلتے وقت بائیں طرف یا دائیں طرف گھومیں (Spin) کریں۔ برابر ہوگا۔ 1956ء میں امریکی چینی ماہر طبعیات لی (Lee) اور یانگ (Yang) نے یہ کہا کہ ضعیف نیوکلیر قوتوں کے لئے پیرٹی کا قانون صحیح نہیں ہے۔ (بھائی جان نے یہ نظریہ نومبر 1956ء میں سب سے پہلے پیش کیا' جس پر انہیں یانگ روری کے ساتھ نوبل انعام ملنا چاہیے تھا--- مرتب) نتیجتاً اوپر والی مثال میں دائیں اور بائیں طرف سپن (Spin) کرنے والے الیکٹران کی تعداد برابر نہ ہوگی۔ 1957ء میں یہ بات تجربہ سے بھی ثابت ہو گئی ہے۔ اس بارے میں مشہور ماہر طبعیات پاؤلی (Pauli) نے کہا کہ "ایسا لگتا ہے خدا بائیں ہتھا ہے۔" (God is Left Handed)۔

عبدالسلام کے نزدیک پیرٹی برقرار رکھنے کے اصول کے ٹوٹنے کی وجہ قانون فطرت میں جو بدشکلی پیدا ہوتی نظر آتی ہے اس کا کوئی نہایت خوبصورت بنیادی جواز ہونا چاہیے تاکہ یہ بدشکلی قابل قبول ہو سکے۔ انہوں نے یاد دلایا کہ کسی نے نیوٹرینو کی صفر کمیت (Zero Mass) کی کوئی وجہ نہیں سمجھائی ہے۔ انہوں نے 1957ء میں نیوٹرینو کے متعلق یہ نیا نظریہ پیش کیا کہ یہ ذرہ اس خصوصیت کا حامل ہے کہ اس کی ایک مخصوص صفت ہیلسٹی (Helicity) ہے۔ (یعنی چلتے وقت نیوٹرینو صرف ایک ہی مخصوص سمت Spin کرتا ہے) اس کے نتیجے کے طور پر نہ ہی نیوٹرینو کی کمیت ہوتی ہے اور نہ ہی یہ پیرٹی کے اصول کو مانتا ہے۔ نیوٹرینو کا یہ تصور دو اجزائی نیوٹرینو نظریہ (Two Component Theory of Nentrino Symmetry) یا کائرل یکسانیت (Chirol Symmetry) کہلاتا ہے۔ تقریباً یہ بات 1957ء میں ہی روسی سائنسدان لینڈاؤ (Landu) اور الگ سے یانگ اور لی نے بھی کہی۔ اس تصور کو بڑھانے کے بعد ضعیف تفاعل (Weak Interaction) کا موجودہ (V-A) کا نظریہ وجود میں آیا۔

3۔ بنیادی ذرات کی یکسانیت کی صفات:(Symmetry Properties)

اس کے بعد عبدالسلام نے اور بنیادی سوالات کی طرف توجہ کی مثلاً کیا یہ تمام (بنیادی) ذرات بنیادی کہلائے جا سکتے ہیں؟ یا اُن میں سے کچھ دوسروں کی نسبت زیادہ بنیادی ہیں؟ ان سوالات کے جوابات کی

تلاش کے سلسلے میں انہوں نے بنیادی ذرات کے خواص یکسانی (Symmetry Property) پر بڑا زور دیا اور خاندانی گروپ (Family Groups) کی تلاش کی تاکہ اگر معلوم ہو کہ ایک ذرہ پایا جاتا ہے تو دوسرے ذرات جو سمیڑی اصول کے تحت اسی خاندان میں شریک ہوں' کے متعلق پیشین گوئی کی جا سکے۔

4- یونٹری سمیڑی: (Unitry Symmetry)

اسی سلسلے میں جاپانی سائنس دان اوہنوکی (Ohnuki) نے 1960 میں ذرات کے مابین یونٹری سیمڑی کے نظریے کو اجاگر کیا۔ اس کے تحت اکثر ذرات تین بنیادی اجزاء سے مل کر بنے ہیں۔ عبدالسلام نے اس نظریے کی پرجوش حمایت کی اور وارڈ (Ward) کے ساتھ مل کر 1961ء میں آٹھ ذرات پر مشتمل ذرات کے ایک نئے خاندان (جن کی سپن واحد ہے) کی پیشین گوئی کی۔ یہ ذرات کچھ ماہ کے بعد تجربات سے دریافت کئے گئے۔ اسی زمانہ میں عبدالسلام کے ساتھ کام کرنے والے ایک محقق یوال ینی مان (Yuval Neman) (یہ امپیریل کالج میں بھائی جان کا شاگرد تھا--- مرتب) نے یہ ثابت کر دیا کہ اہم بنیادی ذرات پروٹان' نیوٹران بھی اسی طرح کے ایک ہشت پہلی (Eight Fold) سمیڑی کے ایک خاندان میں شامل ہیں۔ (یو ال نیمان نے بھائی جان کی تجویز پر جس کا تذکرہ اس نے اپنے پی-ایچ-ڈی کے مقالے میں کیا ہے۔ یونٹری سمیڑی میں تحقیقات کو اور بھی آگے بڑھایا اور یہ بھی ثابت کیا کہ بیریان (Baryons) (جو نیوٹران' پروٹان جیسے ذرات میں شامل سب سے اہم اور بھاری ذرات ہیں) بھی آٹھ ذراتی خاندان کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس دریافت کو پہلے بھائی جان اور یوال نیمان کی مشترکہ دریافت کی حیثیت سے منظر عام پر لانا طے تھا۔ مگر بھائی جان نے اپنی مخصوص بردبار اور فراخدل فطرت کی وجہ سے اپنے شاگرد سے کہا کہ وہ اس دریافت کو صرف اپنے کارنامے کی حیثیت سے منظر عام پر لائے جو اس نے کیا---- مرتب)

آزادانہ اور خودمختارانہ طور پر کیلی فورنیا کی انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے گیل مان (Gell Mann) نے بھی یہی نتائج اخذ کئے۔ انہوں نے ہشت پہلو خاندان کے رکن کی حیثیت سے ایک عجیب و غریب سے ذرے کی پیشین گوئی کی یعنی اومیگا مائنس (Omega Minius) جو کہ 1964ء میں دریافت کر لیا گیا اور اسی طرح یونٹری سیمٹری نظریے کی تجرباتی تصدیق ہو گی۔ (گیل مان کو اساسی ذرات اور ان کے تفاعلات کی جماعت بندی کے متعلق دریافتوں پر 1969ء میں نوبل انعام دیا گیا۔) بعد میں یہ اور ترقیوں کا ذریعہ بنا۔ مثلاً عبدالسلام نے رابرٹ ڈل برو (Robert Delborough) اور جان اسٹرتھیڈی (John Strathdee) (یہ نیوزی لینڈ کا رہنے والا ہے۔ امپیریل کالج لندن اور انٹرنیشنل سنٹر برائے تھیورٹیکل سنٹر ٹریسٹ اٹلی میں اس نے 1965ء-1991ء تک بھائی جان کے ساتھ تحقیقی کام کیا۔ بھائی

جان کی ریٹائرمنٹ کے بعد مسٹر تھمبرڈی نیوزی لینڈ چلا گیا تھا' اب وہیں مقیم ہے--- مرتب) کے ساتھ مل کر زمان اور مکان کی 4 بعدوں (Dimension) کو استعمال کر کے اور بڑا یکسانی خاکہ (Symmetry Pattern) دریافت کیا۔

5۔ برق مقناطیسی اور ضعیف نیوکلیر قوتوں کی گیج وحدت کا نظریہ

بعد میں عبدالسلام نے نیوٹرینو کے لئے اپنی کائی رل سیمٹری کے نظریے کو بڑھا کر اس کو الیکٹران اور میوآن کے لئے بھی لاگو کیا۔ چونکہ الیکٹران اور میوآن کی کمیت صفر نہیں ہوتی' اسی لئے شروع میں (رینارملائزیشن برقرار رکھنے کے لئے) تو یہ ذرات صفر مقدار مادے کے لئے جاتے ہیں۔ بعد میں سیمرٹی کی حرکی ازخود شکستگی (Dynamical Spontaneous Symmatry Breaking) کی مدد سے غیر صفر کمیت ظہور میں لائی جاتی ہے۔ ان ذرات کی کائی رل سیمیٹری کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ضعیف قوت کے ماتحت زوالوں (Wear Decays) کے لئے سپن واحد بوسان (وہ ذرات جن پر بوس آئن شٹائن شماریات لاگو ہوتی ہے اور جو کہ (W + Intermediate Vactor Boson کہلاتے ہیں) کے تبادلے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ان ذرات کی کمیت بہت زیادہ ہونی چاہیے۔ کیوں ضعیف تفاعل کا دائرہ عمل (Range) بہت کم ہوتا ہے۔ (اور قوت کے دائرہ عمل اور فیلڈ کے کوانٹم ذرے کی کمیت میں الٹا تناسب ہوتا ہے) اس کے برعکس برق مقناطیسی تفاعل کے لئے فوٹان کے تبادلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ (اور قوت کا دائرہ عمل دور تک ہے-) W + بوسان اور فوٹان کے اس فرق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوانٹم برق حرکیات (q-e-d) کا نظریہ تو مقامی گیج غیر تغیری (Locally Guage Invariant) کی صفت رکھتا ہے اور ری نارملائزیشن کے قابل ہوتا ہے۔ مگر ضعیف تفاعل کے نظریہ ($\pm$ W کی غیر صفر کمیت کی وجہ سے) میں یہ صفت نہیں ہوتی۔

ضعیف تفاعل کے نظریے کو مقامی گیج غیر تغیری کی صفت عطا کرنے کے لئے 1954ء میں یانگ اور ملز (Yang + Mills) کی قسم کا غیر ابیلین گیج نظریہ (Ncn Abelian Gauge Theory) سہارہ دیتا ہے۔ اس نظریے میں میکسول نظریے کے گیج کا تصور امتزاج (2)SU گروپ کی داخلی سیمٹری سے کیا جاتا ہے۔ (2)Su کی داخلی سیمرٹی پروٹان اور نیوٹران کی آئسو سپن یکسانیت پر مبنی ہے۔ عبدالسلام کے ایک شاگرد رونالڈ شا (Ronald Shaw) نے الگ سے 1955ء میں اپنی تھیسس میں خود اس طرح کا تصور پیش کیا تھا۔ غرض کہ 1957ء سے لے کر 1971ء تک کی تحقیقات کے پیش نظر آخر کار ضعیف تفاعل کے لئے (Yang, Mills, Shaw) قسم کے غیر ابیلین گیج نظریے کا تصور مضبوط ہوتا گیا۔ انٹرمیڈیٹ وکٹر بوسان کی کمیت کو ظہور میں لانے کے لئے ازخود شکستہ سیمرٹی کا عمل کارگر ثابت ہوا اور اس طرح سے نظریہ ری نارملائزیشن کے قابل بھی رہا۔ یہ بذات خود بڑی کامیابی تھی۔

اب اگر ضعیف تفاعل کے لئے یانگ ملز نظریہ درست ہے تو Su(2) گروپ کی تہائی (Triplet) میں 2 عدد برقی چارج رکھنے والے انٹرمیڈیٹ وکٹر بوسان (جو W ± کہلاتے ہیں) چارج شدہ ضعیف کرنٹ (Charged Weak Current) سے منسلک ہوتے ہیں۔ SU(2) کے تیسرے ممبر کے لئے کئی امکانات ہیں مثلاً:

1 یہ برق مقناطیسی کرنٹ (C.m.Current) ہے۔ (گویا اس طرح سے ضعیف اور برقی مقناطیسی قوتیں یک جا ہوتی ہیں۔)

2 یہ ایک غیر برق مقناطیسی، ضعیف نیوٹرل کرنٹ (Weak Neutral Current) ہے اور یا

3 ان دونوں کی ملاوٹ ہے۔

1959ء میں عبدالسلام اور وارڈ اور الگ سے گلیشاؤ نے ان نظریات کو استعمال کر کے ضعیف نیوکلیر قوت اور برقی مقناطیسی قوت کو یک جا کرنے کے تصور کو عملی جامہ پہنانے میں کافی ترقی کی۔ بعد میں 1961ء میں گلیشاؤ اور 1964ء میں عبدالسلام اور وارڈ نے دونوں برق مقناطیسی کرنٹ اور ضعیف نیوٹرل کرنٹ اور ان سے متعلق گیج ذرات (W + , Z Y) کی اہمیت پر زور دیا کیوں کہ اگر ضعیف نیوکلیر اور برق مقناطیسی قوت کو ایک ہی مصدر سے حاصل کرنا ہے تو نظریے میں ضعیف قوت کے لئے پیریٹی کے بقا کی شرط توڑنے اور برق مقناطیسی قوت کے لئے اس شرط کو برقرار رکھنے دونوں باتوں کی بیک وقت گنجائش ہونا چاہیے، اس لئے اوپر دیئے ہوئے تیسرے امکان کو نظریے میں شامل کیا گیا۔

اسی دوران عبدالسلام نے سٹیون وائنبرگ (Steven Weinberg) کے ساتھ مل کر ان ہی مسائل سے متعلق ایک مشہور تھیورم (جو گولڈ اسٹون تھیورم کہلاتی ہے) کا ثبوت مہیا کیا۔ اس تھیورم کے تحت ازخود شکستہ سیمٹری (جس کی ضرورت وکٹر بوسان کی کمیت حاصل کرنے کے لئے ہے) کی وجہ سے صفر سپن کے ذرات کا ظہور پذیر ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جبکہ ایسے ذرات کی تجرباتی تصدیق نہیں ہے۔ اس دشواری سے نکلنے کا راستہ امپیریل کالج لندن کے کئی لوگوں کی مشترکہ کاوش کے بعد ملا۔ یہ ہگس ترکیب (Higgs Mechanism) کہلاتی ہے۔

اس طرح آخرکار 67-1968ء میں عبدالسلام اور وائن برگ نے الگ الگ کام کر کے ازخود شکستہ SU(2) x U(1) گیج نظریہ مکمل کرلیا جو کہ دو بنیادی قوتوں (یعنی ضعیف نیوکلیر اور برق مقناطیسی) کو ایک ہی مصدر سے حاصل کرتا ہے۔ اس میں صرف ایک پیرامیٹر (Parameter) کی مدد سے ان دونوں قوتوں سے متعلق تمام طبعی واقعوں کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح وحدت کا پرانا خواب جزوی طور سے پورا ہوتا ہے۔ ان ہی تحقیقی کاموں کی بناء پر عبدالسلام، وائن برگ اور گلیشاؤ کو 1979ء میں نوبل انعام سے نوازا گیا۔

شروع میں یہ وحدت صرف لیپٹان ذرات کے درمیان دونوں طرح کی قوتوں کے درمیان قائم کی گئی

تھی۔ بعد میں گلیشیاؤ اور ان کے ساتھی محققوں کے کام سے 1970ء میں چار قسم کے کوارک کو استعمال کر کے ہیڈران ذرات کو اس نظریے کے تحت لے آیا گیا۔ عبدالسلام اور وائن برگ کا خیال تھا کہ یہ نظریہ غالباً ری نارملائزیشن کی کسوٹی پر پورا اترے گا۔ اس کا ثبوت 1971ء میں ٹی ہوفٹ (T.Hooft) نے دے کر اس میدان کے تحقیقی کاموں میں جان ڈال دی اور ماہرین اس قسم کے نظریات پر گرم جوشی سے تحقیقات کرنے لگے۔

6۔ ضعیف نیوٹرل کرنٹ، ڈبلیوپلس اور سائنسی ذرات کے متعلق پیشین گوئیاں:

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ عبدالسلام، وائن برگ نظریے کے تحت فوٹان (γ) کے علاوہ ایک نیا نیوٹرل وکٹر بوسان ذرہ (Z°) بھی ہونا ضروری ہے جو کہ لیپٹان ذرات اور کوارک ذرات سے منسلک ہوتا ہے اور ضعیف نیوٹرل کرنٹ کا باعث بنتا ہے۔ اسی طرح سے ضعیف چارج کرنٹ $W^{\pm}$ ذرات کا ہونا بہت پہلے سے سوچا جا رہا ہے۔ مگر Z° ذرے کی پیشین گوئی عبدالسلام وائن برگ نظریے کی دین ہے۔ اس کے علاوہ نظریے نے ان ذرات کی کمیتوں کے متعلق بھی پکی پیشین گوئیاں کیں۔

1973ء میں جنیوا میں CERN کی تجربہ گاہ نے ضعیف نیوٹرل کرنٹ دریافت کر لی اور اس سے علم طبعیات کی دنیا میں ایک بڑا تہلکا مچا اور وحدت کے اس انداز فکر میں جان پڑ گئی۔ بعد میں اس طرح کے نیوٹرل کرنٹ کی تجرباتی تصدیق مختلف تجربہ گاہوں (مثلاً SLAC, Fermilab, Brookha γ an) وغیرہ میں ہوئی۔ اس طرح سے وحدت کے اس تصور میں کشش بڑھتی ہی گئی۔

1983ء میں جنیوا کی CERN تجربہ گاہ میں دو مختلف تجرباتی ٹیموں نے 270 ارب الیکٹرون وولٹ (Gev 270) کی طاقت والے پروٹان ذرات کو اتنی ہی طاقت رکھنے والے ضد پروٹان ذرات سے تصادم کرا کے $W^{\pm}$ اور Z° ذرات کی تجرباتی تصدیق کی اور ان ذرات کے متعلق اور ان کی صفات کے متعلق پیشین گوئیوں کو صحیح ثابت کر دیا۔ اب یہ خود اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس طرح کی تحقیقات میں کتنی سرگرمی آئی ہوگی اور کتنا جوش و خروش بڑھ گیا ہوگا۔

7۔ وحدت اولیٰ Grand Unification

اس کے بعد عبدالسلام نے بنیادی قوتوں کی وحدت کی سیڑھی پر اگلا قدم رکھا۔ یعنی ضعیف برقی $U_{(1)}$ $SU_{(2)}$ نظریے (جو برق مقناطیسی اور ضعیف نیوکلیر قوت کو یک جا کرتا ہے) کو شدید نیوکلیر قوت سے ملانے کی کوشش۔ یہ عمل وحدت اولیٰ (Grand Unification) کہلاتا ہے اور ایسے نظریے وحدت اولیٰ کے نظریے یعنی GUT کہلاتے ہیں۔

شدید نیوکلیر قوت یا کوارکس کے درمیان قوت کا گیج نظریہ $SU_{(3)}$ گروپ کا حامل ہے۔ کیونکہ کوارکس تین قسم کے "رنگین چارج" رکھتے ہیں۔ یہ نظریہ جو تینوں "رنگوں" کو گیج نقطہ نظر سے دیکھتا ہے کوانٹم رنگین

حرکیات (Quantum Chromodynamics) کہلاتا ہے۔ اس کے تحت 8 طرح کے گیج بوسان ذرات (جو کہ گلوآن کہلاتے) کے تبادلے سے دو کوآرک کے درمیان قوت کے باعث بنتے ہیں۔ ان گلوآن ذراعت کی ایک خاص صفت یہ بھی ہے کہ یہ خود "رنگین" چارج رکھتے ہیں اور اس لئے ایک دوسرے سے منسلک بھی ہو سکتے ہیں۔ (جبکہ فوٹان ذرات میں یہ صفت نہیں ہے)

اس وحدت اولیٰ کے سلسلے میں عبدالسلام اور جو گیش پتی (بھونشر انڈیا کا رہنے والا تھا' آج کل امریکہ میں رہتا ہے۔) نے 1973ء میں ایک بڑا اہم قدم اٹھایا۔ انہوں نے لپستان ذرات کو کوارکس کے ساتھ ایک وحدانی گروپ Unifying Group)G) ملٹیپلٹ (Multipult) میں ساتھ ساتھ رکھا۔ گویا لپٹان ذرات کوارکس کے لئے "چوتھے رنگ" کی طرح ہیں۔ اس گروپ G کے لئے غرا ایبلین ہونا اور SU(3) Colour x U (1) x SU(2) گروپ کا جز ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح کے کام کو جارجی' گلیشیاؤ' کوئن اور وائن برگ نے بڑھا دیا۔ اس انداز فکر کے تحت یہ تخمینہ لگایا گیا کہ کائنات کے ارتقاء کے شروع میں ایک بہت بڑی کمیت یا طاقت تقریباً GeV 10^{13} پر یہ تمام بنیادی قوتیں ایک ہی پیانے کی ہوتی ہیں۔ (اور اس طرح وحدت کی لڑی میں جڑی ہوتی ہیں) اور جیسے جیسے وقت کے ساتھ طاقت کم ہوتی جاتی ہے۔ (مثلاً کائنات کی عمر بڑھتی جاتی ہے) بنیادی قوتوں کے پیانے مختلف نظر آنے لگتے ہیں اور عام حالت میں یہ تینوں قوتیں الگ الگ سمجھی جاتی ہیں۔

8۔ پروٹان کے زوال پذیر ہونے کی پیشین گوئی

عبدالسلام اور پتی کے نظریے کے تحت اب بریان نمبر (Baryon Number) اور لپٹان نمبر (Lipton No) کا الگ الگ برقرار رہنا ضروری نہیں رہتا۔ بلکہ ان کا مجموعہ برقرار اور قائم رہتا ہے۔ یعنی اس نظریے کے تحت بیریاں ذرات لیپٹان ذرات میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اس بات کا ایک بہت اہم نتیجہ یہ ہے کہ پروٹان قائم و دائم ذرہ نہیں ہے بلکہ زوال پذیر ہو گا۔ گویا ہر مادہ خود ایک عرصہ کے بعد زوال پذیر ہو گا۔

غنیمت ہے کہ پروٹان کی حیات کا وقفہ بہت لمبا ہے' ورنہ قیامت شاید بالکل نزدیک ہوتی۔ نظریے کی اس اہم پیشین گوئی کو پرکھنے کے لئے دنیا میں کئی جگہ پروٹان کے زوال کا مشاہدہ کرنے کی کوششیں ہو رہی ہے۔ ہمارے ملک (انڈیا مرتب) میں بھی گولار سونے کی کان میں زمین دوز تجربات اس سلسلے میں جاری ہیں۔ امید ہے کہ جلد ہی آخری نتائج معلوم ہوں گے اور عبدالسلام کے اس نظریے کی ایک اہم پیشین گوئی کی تصدیق کی جا سکے گی۔ عبدالسلام کے علاوہ بھی کچھ ماہرین کے نظریات میں بھی پروٹان کے زوال پذیر ہونے کی پیشین گوئی کی گئی ہے اس کا فیصلہ کہ کون سا نظریہ صحیح ہے تجربات کے نتائج ہی کریں گے۔

9۔ ذراتی طبعیات میں مادی کشش کی قوت کی اہمیت اور اتحاد اعلیٰ:

بنیادی ذراتی طبعیات میں مادی کشش کی قوت کو عام طور سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے کیونکہ اس کے

تفاعل کی شدت بنیادی ذرات کے لئے بہت کم ہے۔ لیکن عبدالسلام اور کچھ دوسرے ماہرین طبعیات کا خیال ہے کہ تمام بنیادی طبعی اعمال کو جامع اور مکمل طور سے سمجھنے کے لئے مادی کشش کی قوت کو بھی شامل کرنا ضروری ہے۔ ورنہ نہ صرف قدرت سے متعلق نظریاتی تصویر ادھوری رہ جائے گی۔ بلکہ نامکمل نظریے کے اندرونی تضاد کی بنیاد پر لامتناہیت سے چھٹکارا نہیں مل پائے گا۔

مذکورہ بالا اتحاد اولیٰ کے نقطہ نظر میں یہی کمی ہے کہ وہ چوتھی بنیادی قوت یعنی مادی کشش (Gravity) کو شامل نہیں کرتا۔ جو نظریہ ان چاروں قسم کی بنیادی قوتوں کو متحد کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ اتحاد اعلیٰ (Super Unification) کہلاتا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے کہ زمان و مکان کی چار بعدوں (Dimension) کی جیومیٹری کی صفات سے مادی کشش کی قوت کا ادراک ہوتا ہے۔ اس قوت کے علاوہ بقیہ تین قوتوں کا جو گیج نظریہ ہے اس میں مقامی اور داخلی سمیٹری کا دخل ہے۔ ان دونوں طرح کے نظریوں کو یکجا کرنے کا کام یقیناً آسان نہیں ہے اور موجودہ طبعیات کے بے حد بنیادی سوالات میں سے ایک ہے۔

چونکہ اتحاد اولیٰ (Grand Unification) ایک مقامی گیج غیر تغیری (Local Gauage Invariant) نقطہ نظر ہے۔ اس لئے گمان یہ ہے کہ تمام قوتوں کی وحدت اعلیٰ (Super Unification) کا نظریہ بھی مقامی گیج یکسانیت رکھتا ہوگا۔ ایک ایسا نقطہ نظر اعلیٰ قوت کشش (Super Gravity) کہلاتا ہے۔ سپر گریوٹی کا نظریہ آئن سٹائن کے عام نظریہ اضافی (General Theory of Relativity) کی ترقی شدہ شکل ہے۔ جس میں کوانٹم اثرات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ گویا آئن سٹائن کا نظریہ اس کی غیر کوانٹم (Classical) شکل ہے۔ مادی کشش کے کوانٹم اثرات کا حساب (Calculation) آئن سٹائن کے نظریے میں لامتناہیات دیتا ہے۔ جب کہ سپر گریوٹی میں محدود جوابات حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ یہ بذات خود ایک بڑی ترقی ہے۔

10۔ یکسانیت اعلیٰ (Super Symmetry)

اعلیٰ قوت کشش کے نظریے کی بنیاد ایک اور نئی اور بنیادی یکسانیت پر ہے۔ جس کو یکسانیت اعلیٰ (Super Symmetry) کہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی یکسانیت کا تصور ہے جس میں فرمی ذرات (Fermions) یعنی وہ ذرات جن کی سپن نصف اکائی ہوتی ہے اور بوس ذرات (Bosons یعنی وہ ذرات جن کی سپن صفر یا پوری اکائی ہوتی ہے) ساتھ ساتھ ایک ہی زمرے میں لئے جاتے ہیں اور اس طرح فرمی ذرات اور بوس ذرات کا ایک دوسرے میں تبدیل ہو جانا ممکن ہو جاتا ہے۔ اس یکسانیت اعلیٰ کی شرط اگر کائناتی (Global) سے بڑھا کر مقامی (Local) بنا دی جائے تو نئی گیج فیلڈ اور نئے ذرات حاصل ہوتے ہیں۔ سپر سیمٹری کی بڑی خاص بات یہ ہے کہ بار بار سمیٹری کے عمل کو دوہرانے سے فرمی یا

بوس ذرہ ایک نقطہ سے دوسرے نقطے پر با آسانی منتقل کیا جا سکتا ہے۔ ایسی زمان و مکان والی یکسانیت (جو کہ پوان کرے Poincare سمیٹری کہلاتی ہے) چونکہ مادی کشش کی حامل ہوتی ہے اس طرح سے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ مادی کشش (بصورت ایک گیج قوت) کو دوسری قوتوں سے ملایا جا سکے۔ یہی نظریہ سپر گریوٹی کہلاتا ہے۔ اس میدان میں 1975ء سے کئی ماہر طبعیات نے بڑا کام کیا ہے ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

گولفاں' والکوف' اکلوف' فریڈ مین' زومینو' ریمانڈ' عبدالسلام' سٹرلتھ ڈی وغیرہ۔

اس نظریے میں سپن 2 رکھنے والے گرویٹان (Graviton) ذرات کے ساتھ سپن 3/2 والے صفر کمیت کے گریوٹینو (Gravitino) ذرات بھی ضروری ہوتے ہیں۔ اس نظریے کی ترقی یافتہ شکلوں (Extended Super Gravity Theories) ہیں اور دوسرے ذرات بھی نظریے میں ظہور میں آتے ہیں۔

جس طرح پروٹان کا زوال وحدت اولیٰ کے نظریات کی تجرباتی کسوٹی ہے' اس طرح کی کسوٹی اعلیٰ قوت کشش کے نظریے کے لئے کیا ہے؟

یہ خیال ہے کہ 3/2 سپن رکھنے والا بھاری گریوٹینو (جس کا وزن یکسانیت کی شکستگی سے آتا ہے) کا پایا جانا اس نظریے کی سچائی کی طرف اشارہ ہوگا۔ تجربہ کرنے والوں کے لئے اس کا پتہ لگانا ناممکن تو نہیں مگر بے حد دشوار کام ہوگا۔

سپر گریوٹی کے نظریے میں مادی کشش کوانٹم فیلڈ کی زبان میں بیان کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ نظریہ جیومیٹری کی زبان میں (جس طرح سے آئن سٹائن نے اپنا مادی کشش کا نظریہ پیش کیا تھا) بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔ ایسا کرنے کے لئے زائد سمتی اقدار (Coordinater) اور زائد بعدوں (Diamension) کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان سمتی اقدار (Coordinatier) کی یہ خصوصیت ہے وہ کمیوٹ (Commute) نہیں کرتے۔ (یعنی کسی بھی عمل میں ان کی ترتیب اہم ہوتی ہے) ان نقطوں کے مکان کو "اعلیٰ مکان" (Super space) کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عبدالسلام اور جان سٹرلتھ ڈی نے 1974ء میں اسی طرح کے مکان اعلیٰ کو استعمال کر کے اعلیٰ قوت کشش کا نظریہ پیش کیا اور کئی تحقیقی مقالے لکھے۔

اس طرح کی تحقیق کے سلسلے میں دو نقطہ نظر ہیں۔ (1) کل البعاد (Dimensions) کو 4 سے بڑھا کر زیادہ کیا جائے۔ مثلاً ایک نظریے کے تحت 11 العباد کی ضرورت ہے۔ ان میں سے تو 4 سمجھی بوجھی زماں و مکان والی بعدیں ہیں۔ (جن کا تعلق مادی کشش سے ہے) اور اس کے علاوہ 7 زائد بعدیں داخلی سیمٹری سے تعلق رکھتی ہیں۔ سمجھا جاتا ہے کہ کائنات کی حیات کی بالکل ابتداء میں ان زائد سمتوں نے یک جا ہو کر پلینک لمبائی (Plank Lenght) یعنی تقریباً 10^{-33} Cm کا سائز حاصل کر لیا ہوگا۔ (2) دوسرا نقطہ نظر

وہیلر اور ہاکنگ وغیرہ کا ہے۔ اس میں زائد سمتوں کے استعمال کے بجائے مختلف قسم کے چارجوں کا تعلق زمان و مکان کی ٹاپولوجی (Topology) سے پیدا کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ پنیر کی سطح پر چھوٹے چھوٹے سوراخ ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے زمان و مکان کی ٹاپولوجی میں تقریباً 10^{-33} cm سائز کے سوراخوں کا تعلق مختلف طرح کے چارجوں سے ہوتا ہے۔ اس طرح سے وہ بنیادی قوتیں جو ذراتی طبعیات کے بیان کے لئے ضروری ہوتی ہیں' وہی کائناتی ارتقاء کو سمجھنے کے لئے بھی ضروری ثابت ہوتی ہے۔

11۔ بنیادیت کی تلاش جاری ہے

(کیا Preons یا Prequarks ہیں؟) کوارک ذرات بھی کم از کم 3 عدد چارج رکھتے ہیں: قسم رنگ اور نسلی نمبر۔ اسی لئے یہ بھی بہت ممکن ہے کہ کوارک اور لپٹان ذرات جن کو آج کل بنیادی سمجھا جاتا ہے' بنیادی نہ ہوں' بلکہ اور زیادہ بنیادی اجزاء (Preons یا Prequarkes) سے مل کر بنے ہوں جن کا صرف ایک بنیادی چارج ہو۔ اس طرح کا نظریہ عبدالسلام پتی اور سٹر یتھ ڈی نے 1975ء میں پیش کیا اور 1980ء تک اس نے اور ترقی کی۔ اس نقطہ نظر میں چار کرومان (Chromons) اور چار فلیون (Flarons) ہیں' جن کی وجہ سے بنیادی گروپ Su(8) اس گروپ کا جزوی گروپ $Su_p(4) \times Su_s(4)$ ہے۔ اسی خیال کے تحت یہ بھی تصور ہے کہ پریان (Preons) مقناطیسی چارج کے حامل بھی ہوتے ہیں۔ (اور بہت ہی کم دائرہ عمل والی قوت کی وجہ سے قائم ہیں۔) لپٹان اور کوارک کے ذرات ان سے مل کر کچھ اس طرح سے بنے ہیں کہ لپٹان اور کوارک ذرات کی مقناطیسیت صفر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کے خیالات کو ٹرائٹ اور فرنڈ نے بھی 1979ء میں پیش کئے ان لوگوں کے Su(8) گروپ میں تین کرومان' دو فیلوان اور تین فیمیلان (Familons) شامل ہیں۔

بنیادی قوتوں اور مادی کائنات کی کہانی بڑی طویل ہے اور اس کا اختتام نہ معلوم کب کہاں اور کیسے ہو؟ بہرحال اس کہانی کے بیان کو ختم کرنے کا اختیار ہم رکھتے ہیں۔ اس اختیار کو استعمال کرنے سے قبل اس قصہ کا ماحاصل مختصراً بیان کرنا شاید نامناسب نہ ہو۔ ماہرین کے موجودہ تصور کے تحت کائنات کی شروعات اور بنیادی قوتوں کے اتحاد میں بڑا گہرا تعلق ہے' دراصل عظیم دھماکے (Big Bang) یا کائنات کی ابتداء کے وقت تمام بنیادی قوتیں متحد تھیں' گویا صرف ایک بنیادی قوت تھی اور مکمل یکسانیت تھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا' کائنات اپنی ارتقائی منازل طے کرتی رہی اور یکسانیت کی شکستگی کی وجہ سے قوتوں کی شدت (Strength) مختلف ہونے لگی اور واحد قوت کے بجائے مختلف قوتیں نظر آنے لگیں۔ گویا وقت کے پردے کی وجہ سے وحدت کے بنیادی راز کے مختلف رخ نظر آنے کی بنا پر بنیادی وحدت چھپ گئی۔ مگر چشم بینا رکھنے والے ماہرین طبعیات نے اس بنیادی وحدت کو اجاگر کرنے کی کاوش جاری رکھی ہے۔

اختتام

مندرجہ بالا تحریر سے معلوم ہوا کہ قدرت کے راز کو سمجھنے کے سلسلے میں نظریاتی طبعیات نے کتنی ترقی پچھلے چند برسوں میں کرلی ہے اور اس ترقی میں پروفیسر عبدالسلام کی تحقیقات کا کافی بڑا اثر رہا ہے۔ اس میدان میں عجیب مگر خوب صورت تصورات اور نظریات کی کمی نہیں ہے۔ اب تک جتنے تجربات ہو سکے ہیں' اُن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان نظریات میں کچھ صداقت ضرور ہے اور کم از کم ترقی کی سمت تو صحیح معلوم ہوتی ہے۔ امید ہے کہ آنے والے برسوں کی تحقیقات اس کا فیصلہ کن جواب فراہم کریں گی۔
(''تہذیب الاخلاق'' جلد 3' جولائی 1984ء' شمارہ 13' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

نوٹ از مرتب

بھائی جان کی اہم تحقیقات کے بارے میں مندرجہ بالا مضمون 1984ء میں لکھا گیا تھا۔ آپ نے 1985ء اور 1993ء کے دوران 28 تحقیقی مقالے لکھے جو مختلف سائنسی جرائد میں شائع ہوئے۔

1986ء میں آپ نے جے سی پتی اور بی-وی سری کانستن کے ساتھ مل کر ایک تحقیقی مقالہ لکھا جس کا موضوع تھا۔ پروٹان کے زوال کو تلاش کرنے لئے چاند کی سطح کو استعمال کرنا چاہیے۔

آخری عمر میں بھائی جان کی توجہ بائیو کیمسٹری (Biochemistry) میں تحقیق کی طرف مبذول ہوئی۔ آپ کا خیال تھا کہ اس میدان میں تحقیق کرنا مفید ہوگا اور ممکن ہے اس کے نتیجہ میں شاید انہیں ایک اور نوبل انعام مل جائے۔ چنانچہ 1991ء میں آپ نے اپنی مشہور کاتی رل تھیوری کا زندگی کے ارتقاء میں کردار کے موضوع پر ایک اہم تحقیقی مقالہ لکھا' لیکن افسوس کہ اپنی بیماری کی وجہ سے اس میدان میں زیادہ تحقیق جاری نہ رکھ سکے۔

11

نوبل انعام کی تاریخ اور اس اعزاز کا بھائی جان کو ملنا

الفریڈ نوبل سویڈن کے دارالخلافہ سٹاک ہوم میں 21 اکتوبر 1833ء پیدا ہوا۔ 1842ء میں اس کا خاندان سینٹ پٹسبرگ (روس) چلا گیا۔ جہاں اس کے والد نے کاروبار شروع کر رکھا تھا۔ جسے بعد میں اس کے بھائیوں رابرٹ اور لڈوگ نے سنبھال لیا۔

الفریڈ نوبل نے فزکس اور کیمسٹری میں تعلیم حاصل کی۔ اس نے پانچ زبانوں' سویڈش' رشین (روسی) انگریزی' فرانسیسی اور جرمن پر بھی عبور حاصل کر لیا تھا۔ 1863ء میں وہ اپنے والدین اور چھوٹے بھائی ایمل کے ہمراہ سویڈن واپس آ گیا اور وہاں سٹاک ہوم کے علاقہ ہیلن بورگ میں اپنے والد کی لیبارٹری میں بطور کیمسٹ کام کرنے لگا۔

1864ء میں اس نے اطالوی سائنسدان اسکانیو سوبیرو (Ascanio Sobrero) کے بھک سے اڑ جانے والے مادہ بنانے کی ترکیب میں کچھ ضروری ردوبدل کرنے کے بعد اسے خود تیار کرنا شروع کر دیا۔ 1866ء میں اس نے ڈائنامائٹ بنانے کے طریقہ کو قانونی طور پر محفوظ کرا لیا۔ علاوہ ازیں اس نے ڈائنامائیٹ کو دور سے اڑانے کا طریقہ کار ایجاد کر کے اسے بنانے کے حقوق بھی محفوظ کرا لئے۔ ڈائنامائیٹ بنانے کے علاوہ اس نے کیمیاوی ترکیب سے مصنوعی ربڑ اور چمڑا بھی بنانا شروع کر دیا۔ اس نے سٹاک ہوم' ہیمبرگ' آرڈیر (Ardear) پیرس' کارلسکوگا اور سان ریمو میں لبیارٹریاں قائم کیں اور یہ چیزیں بنانے کے لئے بیس دوسرے ممالک میں نوے کمپنیاں بنائیں۔ اس نے مختلف چیزیں بنانے کے لئے تین صد پچپن پیٹنٹ (Patent) حاصل کئے۔ اس میں ایک موجد کے علاوہ ایک سائنسدان کی خوبیاں بھی پائی جاتی تھیں۔ اسے ادب اور شاعری سے بھی گہرا لگاؤ تھا اور وہ ڈرامے بھی لکھتا رہتا تھا۔

الفریڈ نوبل نے جو بہت سی کمپنیاں بنائی تھیں ان میں سے برطانیہ کی امپیریل کیمکل انڈسٹریز (ICI)' فرانس میں سوسائٹی سنٹرل ڈی ڈائنامائیٹ' ناروے میں ڈائنو انڈسٹریز اور سویڈن میں اے۔بی۔یو فورس اب بھی مصنوعات تیار کرنے میں سرگرم عمل ہیں۔

الفریڈ نوبل نے دس دسمبر 1896ء میں اٹلی کے شہر سان ریمو میں وفات پائی تھی۔

ڈائنامائیٹ اور دیگر مصنوعات کی فروخت سے الفریڈ نوبل نے خوب دولت کمائی۔ 1896ء میں اس کی وفات کے وقت اس کی دولت کا تخمینہ نوے لاکھ ڈالر تھا جو 1995ء میں بڑھ کر تقریباً اکیس کروڑ ڈالر (دو صد دس ملین) ہو گئی تھی۔

اپنی وفات سے ایک سال پہلے الفریڈ نوبل نے وصیت کی کہ اس کی دولت سے حاصل ہونے والی آمدنی سے ہر سال فزکس، کیمسٹری، میڈیسن، فیزیالوجی، ادب اور امن کے ماہرین اور سائنسدانوں کو بنی نوع انسان کی خدمت، بھلائی اور بہتری کے لئے کارہائے نمایاں انجام دینے پر انہیں ایک خطیر رقم انعام دی جائے۔ انعام دینے کے لئے وصیت نامہ میں ان اداروں کا بھی تعین کر دیا گیا تھا جنہیں انعام کے لئے نام تجویز کرنے کے اختیار دیئے گئے تھے۔ الفریڈ نوبل نے اپنی وصیت میں اس بات کی خواہش کا بھی اظہار کیا تھا کہ یہ انعام بلا تخصیص دیئے جائیں۔ چنانچہ الفریڈ نوبل کی وصیت کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک ادارہ قائم کیا گیا جس کا نام نوبل فاؤنڈیشن رکھا گیا۔

نوبل فاؤنڈیشن

یہ نجی ادارہ الفریڈ نوبل کی وفات کے بعد 1900ء میں سٹاک ہوم (سویڈن) میں قائم کیا گیا۔ اس فاؤنڈیشن کے ممبران کی تعداد سات ہے۔ ان کے علاوہ دو نائبین بھی ہوتے ہیں، جنہیں سویڈن اور ناروے کے شہریوں سے منتخب کیا جاتا ہے۔ اس فاؤنڈیشن کا چیئرمین، وائس چیئرمین اور ایک ایگزیکٹیو ڈائریکٹر ہوتا ہے۔ اس فاؤنڈیشن کے ذمہ دو اہم کام ہیں:

1 الفریڈ نوبل کے اثاثوں کی دیکھ بھال اور اس کی دولت کی منافع بخش کاروبار میں سرمایہ کاری کرنا۔
2 منافع سے نوبل انعام کے لئے رقم فراہم کرنا۔
3 انعام دینے والے اداروں اور کمیٹیوں کی دیکھ بھال اور انہیں تحفظ فراہم کرنا۔

نوبل انعام دینے کے لئے مندرجہ ذیل اداروں کو نامزد کیا گیا۔

1۔ رائل سویڈش اکیڈمی آف سائنسز

(The Royal Swedish Academy of Sciences)

یہ اکیڈمی فزکس اور کیمسٹری کے لئے نوبل انعام دیتی ہے۔ چونکہ اقتصادیات (اکنامکس سائنسز) کاروبار زندگی میں اہم کردار ادا کرتی ہے، اس لئے 1968ء میں نوبل فاؤنڈیشن نے اس شعبہ میں بھی انعام دینے کا فیصلہ کیا۔ الفریڈ نوبل نے چونکہ اس شعبہ کے لئے کوئی انعام مخصوص نہیں کیا تھا اس لئے اسے نوبل انعام نہیں کہا جاتا اور نہ ہی یہ انعام حاصل کرنے والا "نوبل انعام یافتہ" (Nobel Laureate) کہلاتا ہے۔ یہ انعام بنک آف سویڈن (The Bank of Sweden (Sveriges Riksbank)) کی طرف سے دیا جاتا ہے اور اس کا نام "الفریڈ نوبل کی یاد میں بنک آف سویڈن کا اکنامکس سائنسز کے لئے انعام"

(The Bank of Swden Prize in Economic Sciences in Memory of Alfred Nobel)

رکھا گیا۔ پہلی مرتبہ یہ انعام بنک آف سویڈن کی تین صد سالہ سالگرہ کے موقع پر دیا گیا تھا۔ 1969ء میں ہالینڈ کے آر فرسک (R Frisch) اور ناروے کے جے ٹنبرگن (J.Tinbergen) کو اس شعبہ میں پہلی مرتبہ مشترکہ طور پر دیا گیا۔

اس اکیڈمی کے تین صد سویڈش ممبر ہیں۔ (1970ء میں اس اکیڈمی نے بھائی جان کو اپنا فیلو منتخب کیا تھا۔)

اکنامکس سائنسز میں انعام دینے کے لئے اس اکیڈمی کے تحت ایک علیحدہ کمیٹی کام کرتی ہے جس کا نام "انعامی کمیٹی" ہے۔

2۔ کارولنسکا انسٹی ٹیوٹ میں نوبل اسمبلی

(The Nobel Assembly at the Karolinska Institute)

یہ اسمبلی فیزیالوجی یا میڈیسن (طب) کے لئے نوبل انعام کا اعلان کرتی ہے۔ اس اسمبلی کے پچاس ممبر ہوتے ہیں۔

3۔ سویڈش اکیڈمی (The Swedish Academy)

یہ اکیڈمی ادب کے لئے نوبل انعام کا اعلان کرتی ہے۔ اس کے اٹھارہ ممبر ہیں۔

4۔ ناروے کی نوبل کمیٹی (The Norwegian Noble Committee)

یہ کمیٹی امن کا نوبل انعام دینے کا اعلان کرتی ہے۔ ناروے کی قومی اسمبلی کے پانچ ارکان اس کمیٹی کے ممبر نامزد کئے جاتے ہیں۔ الفریڈ نوبل نے جب اپنا وصیت نامہ لکھا تھا تو اس وقت سویڈن اور ناروے کا الحاق تھا' جسے 1905ء میں ختم کر دیا گیا تھا۔ تاہم اس سے نوبل انعام دینے کی پالیسی پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔

نوبل انعام کے لئے چناؤ کا طریقہ کار

مختلف کمیٹیاں ہزاروں سائنسدانوں' اپنے ممبروں اور بہت سے ممالک کی یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کو ہر سال فرداً فرداً نوبل انعام کے لئے امیدواروں کے نام تجویز کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ یہ دعوت نامے قابل افراد کو بھجوائے جاتے ہیں اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس سلسلہ میں دنیا کے زیادہ سے زیادہ ممالک اور یونیورسٹیوں کی نمائندگی ہو۔ انعام کے لئے تجویز کردہ نام ہر سال یکم فروی تک پہنچنے لازمی ہوتے ہیں۔

تمام تجویز کردہ ناموں کی چھان بین خصوصی ماہرین سے کرائی جاتی ہے۔ کمیٹیاں تجویز کردہ ناموں سے ممکنہ امیدواروں کے نام چن کر انعام دینے والے اداروں کو بھجواتی ہیں۔ جو ووٹوں کے ذریعے قطعی فیصلہ

کرتی ہیں۔ ووٹنگ کے فوراً بعد اکتوبر کے وسط تک نوبل انعام حاصل کرنے والوں کے ناموں کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ یہ انعام ہر سال دس دسمبر کو الفریڈ نوبل کی برسی کے موقعہ پر سٹاک ہوم میں سویڈن کا بادشاہ دیتا ہے جبکہ اسی دن امن کا نوبل انعام ناروے نوبل کمیٹی کے چیئرمین اوسلو کے سٹی ہال میں ناروے کے بادشاہ کی موجودگی میں ہوتا ہے۔

مندرجہ ذیل اداروں کو بھی نوبل انعام کے لئے امیدواروں کے نام تجویز کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔

طبعیات اور کیمسٹری کے لئے

1 اکیڈمی آف سائنسز کے ملکی و غیر ملکی ممبر۔
2 طبعیات اور کیمسٹری کے لئے نوبل کمیٹی کے ممبر۔
3 طبعیات اور کیمسٹری میں نوبل انعام کنندگان جو بقید حیات ہوں۔
4 سویڈن' ڈنمارک' فن لینڈ' آئس لینڈ اور ناروے کی یونیورسٹیوں اور انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں فزکس و کیمسٹری کے پروفیسرز اور اسسٹنٹ پروفیسرز جو مستقل بنیاد پر کام کر رہے ہوں۔
5 دنیا کی چھ مختلف ممالک کی یونیورسٹیوں یا یونیورسٹی کالجوں میں طبعیات و کیمسٹری کے شعبوں کے چیئرمین جنہیں اکیڈمی آف سائنسز منتخب کرے۔
6 وہ سائنسدان جن سے اکیڈمی آف سائنسز رائے لینا مناسب سمجھے۔

فیزیالوجی یا میڈیسن (طب) کے لئے

1 کارولنسکا انسٹی ٹیوٹ میں نوبل اسمبلی کے ممبر۔
2 رائل اکیڈمی آف سائنسز کے سویڈش و غیر ملکی میڈیکل ممبر۔
3 فزیالوجی / میڈیسن (طب) میں نوبل انعام حاصل کرنے والے بقید حیات ممبر۔
4 نوبل کمیٹی کے ایسے ممبر جو نمبر ایک کے تحت نہ آتے ہوں۔
5 سویڈن' ڈنمارک' فن لینڈ' آئس لینڈ اور ناروے کی یونیورسٹیوں میں میڈیسن کے پروفیسر۔
6 نیچرل سائنسز میں کام کرنے والے (ڈاکٹر) جن سے ادارہ رائے لینا چاہیے۔

ادب

ادب کے لئے نوبل انعام کے امیدواروں کے نام تجویز کرنے کا اختیار مندرجہ ذیل کو دیا گیا ہے۔

- سویڈش اکیڈمی
- ایسی اکیڈمیاں' سوسائٹیاں اور ادارے جن کے مقاصد اور دستور اساسی سویڈش اکیڈمی سے ملتے جلتے ہوں۔

- ادب کا نوبل انعام حاصل کرنے والے جو بقید حیات ہوں۔
- مختلف ممالک کے ادبی مصنّفین۔

امن

1 ناروے کی نوبل کمیٹی کے فعال و سابقہ ممبر اور ایسے مشیر جنہیں ناروے کی نوبل انسٹی ٹیوٹ مقرر کرے۔
2 مختلف ریاستوں کی نیشنل اسمبلیوں و حکومتوں کے ممبر۔
3 عالمی عدالت انصاف و عالمی ثالثی عدالت ہیگ کے ممبر۔
4 مستقل انٹرنیشنل بیورو برائے امن کے ممبر۔
5 انسٹی ٹیوٹ ڈی ڈیٹرائیٹ کے ممبر و ایسوسی ایٹ ممبر۔
6 مختلف یونیورسٹیوں کے پولیٹکل سائنس' قانون' تاریخ اور فلاسفی کے پروفیسر۔
7 نوبل انعام برائے امن حاصل کرنے والے جو بقید حیات ہوں۔

بنک آف سویڈن کا الفریڈ نوبل کی یاد میں اکنامکس سائنسز میں انعام دینے کا طریقہ کار

1 اکیڈمی آف سائنسز کے سویڈش و غیر ملکی ممبر۔
2 اکنامکس سائنسز میں الفریڈ نوبل کی یاد میں انعام دینے والی کمیٹی کے ممبر۔
3 اکنامکس سائنسز میں انعام حاصل کرنے والے جو بقید حیات ہوں۔
4 سویڈن' ڈنمارک' فن لینڈ' آئس لینڈ اور ناروے کی یونیورسٹیوں میں متعلقہ مضمون کے پروفیسر۔
5 کم از کم چھ یونیورسٹیوں یا یونیورسٹی کالجوں میں متعلقہ مضمون کے چیئرمین۔
6 وہ سائنسدان جنہیں اکیڈمی آف سائنسز تجاویز دینے کے لئے درخواست کرے۔

1901ء سے 1997ء تک 645 نوبل انعام دیئے گئے' جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

طبعیات (فزکس)	154
کیمسٹری (کیمیا)	128
میڈیسن / فیزیالوجی	166
ادب	94
امن	103

الفریڈ نوبل کی یاد میں اکنامکس میں 1969ء سے 1997ء تک 42 انعام دیئے گئے۔

ان سالوں کی تعداد جن میں کسی وجہ سے نوبل انعام نہیں دیئے گئے۔ (جنگ عظیم اول اور دوم کے دوران یہ انعام نہیں دیئے گئے تھے۔)

فزکس 6 سال' کیمسٹری 6 سال' میڈیسن 8 سال' ادب 7 سال' امن 18 سال۔
اُن ممالک کے نام جن کے سائنسدانوں' ادیبوں کو نوبل انعام اور دوسرے افراد کو امن اور اکنامکس کے لئے انعام دیئے گئے:
ارجنٹائن' آسٹریلیا' آسٹریا' بلجیئم' کینڈا' کولمبیا' کوسٹاریکا' چیکو سلاویہ' ڈنمارک' مصر' فن لینڈ' فرانس' جرمنی' برطانیہ' یونان' گوئٹے مالا' ہنگری' آئس لینڈ' انڈیا' آئرلینڈ' اسرائیل' اٹلی' جاپان' میکسیکو' ہالینڈ' نائیجیریا' پاکستان' فلسطین' پولینڈ' پرتگال' روس' سپین' سویڈن' سوئٹزرلینڈ' جنوبی افریقہ' تبت' امریکہ' ویت نام' یوگوسلاویہ۔
1995ء میں کینڈا کی پگ واش (Pug Wash) کانفرنس کو پروفیسر روٹ بولٹ (Prof Rotbolt) کے ساتھ مشترکہ طور پر امن کا نوبل انعام دیا گیا تھا کیونکہ اس کانفرنس کے سائنس دان دو سپر پاورز کے درمیان نیوکلیر جنگ کے خطرات کو ختم کرانے میں کامیاب ہوئے تھے۔

بھائی جان کے لئے نوبل انعام

1979ء میں بھائی جان اور دو امریکن پروفیسر وائن برگ اور پروفیسر گلاشو کو فزکس کا نوبل انعام مشترکہ طور پر دیا گیا تھا۔ یہ انعام کائنات کو یکجا رکھنے والی قوتوں پر ان کے تحقیقی کام جو الگ الگ کئے گئے تھے کے سلسلے میں دیا گیا تھا۔ چار قوتیں یعنی برقی مقناطیسی یا الیکٹرومیگناٹیزم' کشش ثقل' قومی نیوکلیائی اور خفیف نیوکلیائی کائنات کا یکجا رکھتی ہیں۔ دنیا کا عظیم سائنس دان آئن سٹائن اپنی کوششوں کے باوجود ان چار قوتوں کو ایک واحد قوت کا تصور بخشنے میں ناکام رہا۔ 1970ء کی دہائی میں تقریباً 1967ء میں بھائی جان نے اپنے تحقیقی کام سے یہ ثابت کیا کہ چار میں سے دو قوتیں یعنی برقی مقناطیسی اور خفیف نیوکلیائی قوت تیسری قوت کی مظہر ہیں۔ یہ اس نظریہ کو ثابت کرنے کی جانب ایک بہت بڑا قدم تھا کہ یہ چاروں قوتیں کائنات کی یکجہتی کا مظہر ہیں۔
جس دن نوبل انعام دیئے جانے کا اعلان ہوا اس روز بھائی جان لندن اپنے گھر میں تھے۔ اس روز دن کے بارہ بجے عالمی ایٹمی توانائی ایجنسی وی آنا آسٹریا کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر اےکلنڈ (Dr.Eklund) کے نائب کا فون آیا کہ انہیں نوبل انعام دینے کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ اس کے چند منٹ بعد انہیں سٹاک ہوم سے بھی سرکاری طور پر فون کے ذریعے یہی اطلاع موصول ہوگئی۔ یہ خبر سنتے ہی بھائی جان کا پہلا رد عمل یہ تھا کہ فوراً اپنے گھر کے قریب مسجد فضل (لندن) گئے اور وہاں شکرانے کے نفل پڑھے۔
بعد میں بھائی جان نے امپریل کالج میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا: ”سٹاک ہوم (سویڈن) سے فون پر اطلاع ملنے سے پہلے انہیں یہ انعام ملنے کا یقین تھا اس لئے فون کے بعد اُن کے ذہن میں یہ سوال نہیں اٹھا جو عام طور پر ایسے موقع پر نوبل انعام حاصل کرنے والے اپنے آپ سے کیا کرتے ہیں' کیا میں اس انعام کا اہل ہوں۔“

عظیم سائنس دان پی-ایم ڈیراک (جنہیں 1933ء میں فزکس کا نوبل انعام دیا گیا تھا) نے اس انعام کے لئے بھائی جان کا نام تجویز کیا تھا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس سے کسی رو رعایت کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کی طرف سے بھائی جان کا نام تجویز کرنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی شہنشاہ کسی کو خلعت فاخرہ اور اعلیٰ ترین خطاب عطا کرے۔ گویا کہ ان کی طرف سے بھائی جان کا نام پیش کیا جانا ایک مہر تصدیق تھا۔ بھائی جان کے نزدیک یہ بات بھی ایک نشان تھا کہ ڈیراک (جو دہریہ تھا) اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے پورا ہونے میں ایک آلہ بن گیا۔

نوبل انعام ملنے کے ساتھ ہی بھائی جان کو مبارک باد کے سینکڑوں پیغامات موصول ہوئے۔ حضرت مرزا ناصر احمد صاحب جو اس وقت جماعت احمدیہ کے امام تھے نے انہیں مندرجہ ذیل مبارک باد کا تار ارسال کیا:

"سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں۔ میری طرف سے اور جماعت احمدیہ کی طرف سے پرخلوص دلی مبارک باد قبول کریں۔ احمدیوں اور تمام پاکستانیوں کو آپ پر فخر ہے۔ احمدیوں کے لئے یہ بات انتہائی فخر کا موجب ہے کہ وہ پہلا مسلمان سائنس دان اور پاکستانی جس کو نوبل انعام ملا وہ ایک احمدی ہے۔ خدا تعالیٰ مستقبل میں آپ کو اس عظیم تر اعزازات سے نوازے اور آپ کو اپنی تائید و نصرت سے نوازتا رہے۔"

صدر پاکستان جنرل محمدؐ ضیاء الحق نے بھائی جان کو مبارک باد کا تار ارسال کیا' جس میں انہوں نے لکھا:

"میرے لئے یہ امر انتہائی خوشی اور فخر کا موجب ہے کہ آپ نے نوبل پرائز حاصل کیا ہے۔ یہ آپ کی محنت شاقہ' تحقیق اور ان عالمانہ کارناموں کا ایک اعتراف ہے جو کہ آپ نے فزکس کے میدان میں سرانجام دیئے ہیں۔ براہ کرم میری طرف سے اور پاکستان کے عوام کی طرف سے یہ اعزاز حاصل کرنے پر دلی مبارک باد قبول کریں۔ آپ نے یقینی طور پر پاکستان کی عظمتوں کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔"

صدر پاکستان نے بھائی جان کو پاکستان کا سب سے بڑا سول اعزاز "نشان امتیاز" دینے کا بھی اعلان کیا۔ پاکستان کے اخبارات نے اس موقع پر اپنے اداریوں میں دھرتی کے اس سپوت کو زبردست خراج تحسین پیش کئے۔ روزنامہ امروز لاہور نے اپنے اداریے میں لکھا: (17 اکتوبر 1979ء)

"پروفیسر عبدالسلام کو 1979ء کا فزکس کا سب سے بڑا اور سب سے معتبر اعزاز نوبل پرائز علم و ہنر کے میدان میں ان کے شاندار کارناموں کی روشن کتاب کا درخشندہ باب ہے۔ یہ اعزاز صرف جھنگ کا ہی نہیں کہ وہاں 1926ء میں ایک چراغ روشن ہوا جسے عالمی افق پر جگمگانا تھا۔ یہ اعزاز صرف گورنمنٹ کالج جھنگ و لاہور اور پنجاب کی دانش گاہ کا ہی نہیں ہے کہ میٹرک سے ایم-اے تک ہر امتحان میں اول پوزیشن حاصل کرنے والے ایک جوہر قابل کو اس کی

دیواروں سے محبت ہے۔ یہ اعزاز محض پاکستان کا بھی نہیں ہے کہ ترقی کی دوڑ میں قدم قدم پر روکاٹوں کی زد میں آنے والی اس سرزمین سے سائنس کی دنیا میں انقلاب برپا کرنے والے اور کائنات کے پوشیدہ رازوں کو طشت ازبام کرنے والے سائنسدان کو جنم دیا۔ یہ اعزاز ان ترقی پذیر ملکوں اور اقتصادی لحاظ سے پسماندہ قوموں کا بھی ہے جن کے سوچنے والے دماغوں پر ایک طویل عرصہ تک سامراجی پنجے گڑے رہے اور جن کی استعداد کار پر استحصال کے پردے بیٹھے رہے۔

پروفیسر عبدالسلام کا یہ اعزاز پسماندہ اور ترقی پذیر ملکوں کے جوہر قابل کو حوصلہ دیتا ہے کہ وہ احساس کمتری کے عفریت سے نجات پائیں اور خداوند کریم نے انہیں جو صلاحیتیں ودیعت کی ہیں' انہیں بروئے کار لائیں۔ کندھے سے کندھا ملائیں' انتھک محنت اور لگن سے کام لیں اور کم از کم وقت میں اپنی قوم کو ترقی یافتہ قوموں کی صف میں کھڑا کرنے کی سعی کریں۔ پروفیسر عبدالسلام کا یہ اعزاز ان بڑی طاقتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی جرأت بھی دیتا ہے' جو سائنس کی دریافتوں اور جوہری توانائی کی اجارہ دار بنی ہوئی ہیں اور چھوٹی قوموں اور ترقی پذیر ملکوں کو جوہری توانائی سے فیض یاب ہونے کا مستحق نہیں سمجھتیں۔"

تقسیم نوبل انعامات

یہ انعامات ہر سال 10 دسمبر کو دیئے جاتے ہیں۔ یہی الفریڈ نوبل کی برسی کا دن ہے۔ تقسیم انعامات کی تقریب منفرد اور انتہائی سحرانگیز ہوتی ہے۔ انعام یافتگان اور ان کے اہل خاندان دس دن سویڈن کے بادشاہ اور اُن کی ملکہ کے مہمان ہوتے ہیں' جنہیں گرینڈ ہوٹل سٹاک ہوم میں ٹھہرایا جاتا ہے۔ تقریب سے پہلے اس کے آداب کی ریہرسل کرائی جاتی ہے۔

فزکس' کیمسٹری' میڈسن اور ادب کے لئے جلسہ تقسیم انعامات سٹاک ہوم میں منعقد ہوتا ہے جس میں بادشاہ سلامت سکالرز کو ڈپلومے (اسناد) میڈل اور انعام کی رقوم کے چیک عطا کرتے ہیں۔ 1979ء میں ان انعامات کی کل رقم 8 لاکھ سویڈش کراؤن تھی۔

تقریب انعامات

مولانا منیر الدین احمد مشنری انچارج جماعت احمدیہ متعینہ سویڈن بھائی جان کی خصوصی دعوت پر اس تقریب میں شامل ہوئے۔ اس تقریب کے بارے میں انہوں نے ایک رپورٹ مرتب کی جس سے کچھ اقتباسات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

"راقم الحروف (منیر الدین احمد--- ناقل) بھی اس تاریخی اور یادگار تقریب میں مدعو تھا۔ چنانچہ گوٹن برگ (سویڈن کا دوسرا بڑا شہر--- ناقل) سے سٹاک ہوم پہنچا اور اسے اللہ تعالیٰ نے حضرت بانی سلسلہ عالیہ

احمدیہ کے توحید و رسالت کے بارے میں فرمودات کا انگریزی ترجمہ (Essence of Islam) شاہ سویڈن کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت عطا فرمائی۔ جسے سربراہ موصوف نے بعد لطف و تشکر قبول کیا۔"

"اس تقریب میں فزکس لاریئٹ ڈاکٹر پروفیسر عبدالسلام نے قرآن کریم کی سورۃ "الملک" کی آیات 4 تا 5 کی تلاوت کی اور ان کی انگریزی میں ایسی لطیف تفسیر بیان کی جو حاضرین کے لئے اضافہ معلومات کا باعث ہوئی۔ سویڈن کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس ملک کے بادشاہ' ملکہ' شاہی ارکان اور دیگر اعیان و اکابر اور اعلیٰ دانشور طبقے نے قرآن سنا۔

دوسری انوکھی بات جو شرکاء کانفرنس نے بڑی تحسین کی نظروں سے دیکھی یہ تھی کہ نوبل تقریب میں شرکت کے مخصوص "سول ڈریس" (Civil Dress) کی بجائے ڈاکٹر سلام اس میں اپنے قومی لباس (پگڑی' شیروانی' شلوار اور کھسہ) کی سج دھج کے ساتھ شریک ہوئے۔ جس کے لئے انہوں نے تقریب کے منتظمین کو پیش از وقت مطلع کر دیا تھا۔ چنانچہ اخبارات نے اپنے تبصروں میں ان کے لباس کو "سول ڈریس" سے بہتر لباس قرار دیا۔

تقریب انعامات میں پاکستانی فزکس لاریئٹ کے افراد خاندان کے علاوہ سابق سفیر پاکستان آفتاب احمد خان اور سویڈن میں پاکستانی سفیر جناب عزت بخش اعوان بھی شریک ہوئے۔ تقریب کی کارروائی ساڑھے چار بجے شروع ہوئی' جس سے پندرہ منٹ قبل ہی تمام معزز مہمان مخصوص نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ سٹیج پر ایک طرف نوبل اداروں کے عہدیدار تشریف فرما تھے اور دوسری طرف سالہائے گزشتہ میں نوبل انعام یافتگان۔ ہال میں پہلی قطار میں شاہی خاندان کے افراد اور انعام لینے والوں کی بیگمات بیٹھی تھیں۔ پچھلی قطاروں میں انعام حاصل کرنے والوں کے اعزہ و اقارب بیٹھے تھے اور بالائی گیلریوں میں سویڈن کے وزراء ممبر آف دی پارلیمنٹ' اخباری نمائندے اور دیگر معززین تشریف فرما تھے۔ شاہی بینڈ کے کارندے بھی اوپر کی گیلری میں بیٹھے تھے۔

ٹھیک سوا چار بجے بادشاہ اپنی ملکہ ولی عہد اور بیگم ولی عہد کے ساتھ ہال میں داخل ہوئے تو تمام حاضرین نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ بینڈ نے شاہی نغمہ الاپا' نغمہ ختم ہونے کے بعد ارکان شاہی اپنی اپنی کرسیوں پر متمکن ہوئے' اس کے بعد بگل بجا اور دوسرے دروازے سے انعام لینے والے ایک جلوس کی صورت میں سٹیج پر آئے اور شاہی کرسیوں کے سامنے دوسری طرف بچھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد بینڈ نے قومی ترانہ بجانا شروع کیا اور تمام حاضرین ایک دفعہ پھر احتراماً کھڑے ہو گئے۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ سویڈن کے ولی عہد شاہ سویڈن کے چچا ہیں۔ ان کی عمر شاہ سویڈن سے بہت زیادہ ہے۔ شاہ صرف 32 سال (عمر) کے ہیں اور ولی عہد 60 سال کے۔ شاہی دستور کے مطابق جب تک بادشاہ شادی نہ کرے ولی عہد شادی نہیں کر سکتا۔ بادشاہ نے شادی 1975ء میں کی اور ولی عہد نے ان کے بعد بڑھاپے میں شادی کی۔

ساڑھے چار بجے تقریب کی کارروائی شروع ہوئی۔ نوبل فاؤنڈیشن کے انچارج نے بادشاہ' ملکہ' ولی عہد' سکالرز اور دیگر مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ نوبل اداروں کا تعارف کرایا' جس کے بعد انعامات تقسیم ہونا شروع ہوئے۔

ہر کمیٹی کا انچارج تعارفی تقریر میں یہ بتاتا ہے کہ متعلقہ مضمون میں انعام حاصل کرنے والے نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے اور اس کی افادیت کیا ہے۔ آخر میں متعلقہ سکالر کا نام پکارتا اور بادشاہ سے درخواست کرتا کہ وہ انعام عطا کریں۔ بادشاہ اپنی مسند سے اٹھ کر اسٹیج کے درمیان آ کر انعام دیتے۔ جسے متعلقہ سکالر اپنی سیٹ سے اٹھ کر اسٹیج کے درمیان آ کر شاہ سے انعام حاصل کرتا' جس پر حاضرین پرزور تالیاں بجا کر اس اعزاز کا خیر مقدم کرتے اور متعلقہ سکالر انعام حاصل کرنے کے بعد جھک کر شکریہ ادا کرنے کے بعد اپنی سیٹ پر جا بیٹھتا۔ اس دوران شاہی بینڈ وقفے وقفے سے اپنے نغموں سے محظوظ کرتا رہتا۔ یہ پروگرام ساتھ کے ساتھ ٹی وی سے نشر ہوتا رہا جسے سارے ملک میں دیکھا گیا۔ پاکستان ٹی وی نے بھی سٹیلائٹ کی مدد سے ڈاکٹر عبدالسلام سے متعلقہ حصہ براہ راست نشر کیا۔ (پی ٹی وی نے بھائی جان کی قرآن حکیم کی آیات کی تلاوت کو سنسر کیا تھا۔۔۔ ناقل)

تقریب کا دوسرا حصہ

"اس کے بعد تقریب کا دوسرا حصہ شروع ہوا۔ سب لوگ سٹی ہال کے "بلیو ہال" میں گئے۔ جہاں عشائیے کا اہتمام تھا۔ چارٹ پر تمام مدعوئین کے نام حروف ابجد کی ترتیب سے درج تھے جس کی مدد سے سب اپنی اپنی سیٹ پر جا بیٹھے۔"

"جب تمام مدعوئین اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ چکے تو ایک دم بگل کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ معلوم ہوا کہ بادشاہ سلامت دیگر مہمانان خصوصی کے ساتھ تشریف لا رہے ہیں' یہ پارٹی دو قطاروں میں آ رہی تھی۔"

سب سے پہلے نوبل فاؤنڈیشن کے چیئرمین نے کھڑے ہو کر بادشاہ کا جام صحت تجویز کیا۔ پھر بادشاہ نے الفریڈ نوبل کے لئے جام تجویز کیا۔ میز پر شراب کے جام پڑے تھے' ساتھ سوڈا واٹر/ پھلوں کے رس کا اہتمام بھی تھا تاکہ جو شراب نہیں پیتے وہ سوڈا استعمال کر لیں۔ کھانے کے دوران یونیورسٹی کے طلباء نغمات گاتے رہے۔ بینڈ بھی وقفے وقفے سے دھنیں بجاتے رہے۔ لمبے وقفے کے بعد میوزک کی ایک انوکھی دھن نے سب کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیا۔ معلوم ہوا کہ آئس کریم آ رہی ہے۔ میوزک کی دھنوں کے ساتھ بیرے ہاتھوں میں آئس کریم تھامے چلے آ رہے تھے۔ ہر ٹرے میں آئس کریم کا ایک بڑا سا ٹکڑا تھا جس پر نمایاں طور پر لفظ این (N) نصب تھا' جس کا اشارہ نوبل کی طرف تھا۔ آئس کریم کے بعد کافی پیش کی گئی۔ ازاں بعد انعام حاصل کرنے والوں نے باری باری تقاریر کیں:

ہر انعام یافتہ کو تین منٹ کے لئے تقریر کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔
ڈاکٹر اسلام کو فزکس میں نوبل حاصل کرنے والوں کی طرف سے تقریر کرنے کی دعوت دی گئی۔ تقریر سے پہلے بھی بگل بجایا جاتا ہے۔

(ہفت روزہ ''لاہور'' 20 جنوری 1980ء)

بھائی جان نے اس تقریب میں مندرجہ ذیل تقریر کی:
یور میجسٹی' ایکسی لینسز' خواتین و حضرات:
اپنے ساتھیوں پروفیسر گلاشو اور پروفیسر وائن برگ اور اپنی جانب سے میں نوبل فاؤنڈیشن اور رائل اکیڈمی آف سائنسز کا اس عظیم اعزاز اور مثالی عزت افزائی پر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں اس نوازش کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اپنے خطاب میں آپ مجھ سے میری قومی زبان اردو میں مخاطب ہوئے۔
پاکستان اس کے لئے آپ کا بہت مشکور ہے۔

(Pakistan is deeply indebited to you for this)

طبعیات کی تخلیق تمام انسانیت کا مشترکہ ورثہ ہے۔ مشرق اور مغرب' شمال اور جنوب سب نے اس میں مساوی حصہ لیا ہے۔ اسلام کی مقدس کتاب میں اللہ فرماتا ہے:

مَاتَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ هَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ ۝
ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ کَرَّتَیۡنِ یَنۡقَلِبۡ اِلَیۡکَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیۡرٌ ۝

(سورۃ ''الملک'' 4-5)

ترجمہ: تو رحمٰن (خدا) کی پیدائش میں کوئی رخنہ نہیں دیکھتا اور تو اپنی آنکھ کو (اِدھر اُدھر) پھیر کر اچھی طرح سے دیکھ لے' کیا تجھے (خدا کی مخلوق میں کسی جگہ بھی) کوئی رخنہ نظر آتا ہے۔
پھر بار بار نظر کو چکر دے وہ آخری تیری طرف ناکام ہو کر لوٹ آئے گی اور وہ تھکی ہوئی ہوگی (اور کوئی رخنہ نظر نہیں آئے گا۔)

فی الحقیقت تمام ماہرین طبعیات کا یہی ایمان ہے' جتنی گہرائی تک ہم تلاش میں اتریں اتنی ہی ہماری حیرت بڑھتی جاتی ہے۔

میں یہ بات صرف اس لئے نہیں کہہ رہا کہ میں آج شام آپ کو اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں بلکہ یہ بات میں خاص طور پر تیسری دنیا کو مخاطب کر کے بھی کہہ رہا ہوں۔ تیسری دنیا والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ سائنسی علم کی جستجو کی بازی ہار چکے ہیں' کیونکہ ان کے پاس مواقع و ذرائع کا فقدان ہے۔

آج کی اس پر مسرت اور پروقار تقریب کے موقع پر مجھے ان لوگوں سے جنہیں خدا نے اپنی بے پایاں نعمتوں سے نوازا ہے' مجھے یہ کہنے دیجئے کہ الفریڈ نوبل نے یہ پیماں باندھا تھا کہ رنگ و نسل کا کوئی بھی امتیاز اس کی فیاضی کے حصول میں حائل نہیں ہوگا۔ آیئے ہم سب مل کر دنیا کے تمام انسانوں کو برابری

کی سطح پر مواقع مہیا کرنے کی جدوجہد کریں تاکہ وہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے طبعیات اور سائنس کی تخلیق کے لئے اپنی توانائیاں وقف کر سکیں۔ یہ سب کچھ الفریڈ نوبل کی آرزو اور ان کے خیالات کے مطابق ہو گا جو اس کی زندگی میں نفوذ کر گئے تھے۔"

خدا آپ کو نوازے

نوبل انعامات کی تقسیم کے سلسلے میں منعقد ہونے والی رنگا رنگ تقریب موجودہ دور میں کچھ عجیب سی لگتی ہو گی۔ لیکن اسے اس طرح شاہانہ رنگ دے کر دراصل انعام پانے والے سکالرز اور سائنسدانوں کی عظمت کو خراج تحسین پیش کیا جاتا ہے۔

نوبل انعام ملنے کے بعد بھی بھائی جان اپنے بارے میں عاجزانہ سوچ رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی مجلس میں انسان کی ذہنی صلاحیتوں پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "اگر اس بارے میں مقابلہ ہو تو مجھے شاید "حوصلہ افزای" کا انعام بھی نہیں ملے گا۔" یہ کسر نفسی تھی۔ غالباً ان کا مطلب یہ تھا کہ ان میں ایک چالاک انسان جیسی تیزی نہیں ہے جو بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے ہیں۔ آپ گہرائی میں غور و فکر کرنے والے ایک ذہین و فطین مدبر تھے۔

نوبل انعام ملنے کے بعد بھائی جان کے آگے بڑھنے کی رفتار میں بہت تیزی سی نظر آنے لگی۔ جیسے وہ ایک مسلسل جلدی میں تھے۔ اپنے اردگرد کے حالات سے وہ خوب آگاہ تھے۔ برموقع باصبر ردعمل دکھاتے' وہ بیٹھ رہنے والوں میں سے نہ تھے بلکہ صف اول کے غازی تھے' وہ احساس ذمہ داری سے بھرپور اور قلم و تقریر کی قوت سے مالا مال۔ ان تمام فطری جوہروں میں انعام ملنے کے بعد ایک جلا پیدا ہو گئی تھی۔ لوگ پہلے سے بڑھ کر ان سے اپنے امور میں مشورہ لیتے تھے۔ آپ کے پر مغز خیالات کی بارش ہر ایک پر بلا تفریق برستی۔ گلف یونیورسٹی' رائل مراکن اکیڈمی' یونیورسٹی آف اٹاوہ وغیرہ میں آپ نے سائنس' تعلیم' غربت کا خاتمہ اور متعلقہ امور پر اپنی آراء کا اظہار بلا خوف و خطر کیا۔

12

نوبل انعام ملنے کے بعد حکومت پاکستان کی دعوت پر بھائی جان کا دورہ پاکستان' دسمبر 1979ء

اکتوبر 1979ء میں بھائی جان کو جب فزکس کا نوبل انعام دیا گیا تو اس وقت شیخ مبارک احمد جماعت احمدیہ کی بیت فضل لندن کے امام تھے۔ شیخ صاحب نے بتایا کہ "جہاں تک میری یادداشت کام دے رہی ہے سب سے پہلے محترمہ اندرا گاندھی وزیراعظم ہندوستان نے نہایت عزت و احترام کے ساتھ آپ کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ جوں ہی پاکستان کے سفیر مقیم لندن کو علم ہوا کہ ہندوستان کی وزیراعظم نے محترم ڈاکٹر صاحب کو ہندوستان آنے کی دعوت دی ہے تو انہوں نے جنرل محمد ضیاء الحق سے فوری طور پر فون کے ذریعے بات کی کہ پاکستان کے لئے عزت و احترام کا خاص موقع پیدا ہوا ہے۔ ڈاکٹر سلام کو نوبل انعام ملنے پر اندرا گاندھی نے انہیں ہندوستان آنے کی دعوت بھی دے دی ہے۔ اس پر جنرل محمد ضیاء الحق نے لندن ڈاکٹر صاحب سے فون پر رابطہ کی کوشش کی۔ ڈاکٹر صاحب غالباً اس دن لندن نہ تھے۔ محترم ڈاکٹر صاحب کی بیگم امتہ الحفیظ نے فون پر جنرل صاحب سے بات کی اور انہیں اٹلی کا فون نمبر دیا۔ جس پر جنرل صاحب نے خاص اشتیاق اور جذبہ سے جیسا کہ سننے میں آیا' محترم ڈاکٹر صاحب کو پہلے پاکستان آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ بعد کے حالات بتاتے ہیں کہ محترم ڈاکٹر صاحب پہلے پاکستان گئے اور جنرل صاحب نے آپ کے اعزاز و احترام میں پاکستان کا سب سے اعلیٰ سول ایوارڈ "نشان امتیاز" دیتے ہوئے ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کا اعتراف کیا اور کہا: "آپ نے پاکستان کی عظمت کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔"

حکومت پاکستان نے بھائی جان اور ہماری بھاوجہ صاحبہ کو دسمبر کے وسط میں پاکستان کے مختلف شہروں کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ علاوہ ازیں حکومت نے ہم سب بھائیوں کو بھی اپنے بھائی کے ہمراہ دورہ کرنے کی دعوت دی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں دفتر خارجہ اسلام آباد کی طرف سے مجھے اور میرے دوسرے بھائیوں کو مندرجہ ذیل ایکسپرس تار موصول ہوئی:

"X 1820 CA 46 Islamabad 13 Ste 83/81 Ch Abdual Hamid C/O 9 Sasi Town House Victoria Road Karachi

13 Dec 1979

Prof Dr Abdus Salam Nobel laureate is visiting Pakistan from Dec. 15 to 23 1979 (.) The President of Pakistan has been pleased to direct that you should be invited to all functions being held at Islamabad Lahore, Peshawar, Multan and Jhang in honour of Prof Dr Abdus Salam (.) you are Requested to Kindly contact Mr Aslam Razvi Deputy Chief Protocol Camp Office Karachi For Further instructions = Foreign."

ترجمہ: "پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام نوبل لاریٹ 15۔23 دسمبر 1979ء تک پاکستان کا دورہ کریں گے۔ صدر پاکستان نے بخوشی ہدایت جاری فرمائی ہے کہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کے اعزاز میں اسلام آباد' لاہور' پشاور' ملتان اور جھنگ میں منعقد ہونے والی تمام تقریبات میں شمولیت کے لئے آپ کو مدعو کیا جائے۔ آپ سے التماس ہے کہ آپ دفتر خارجہ کے کیمپ آفس کراچی میں متعین مسٹر اسلم رضوی' ڈپٹی چیف پروٹوکول سے اس سلسلہ میں مزید ہدایات حاصل کریں۔"

اس کے علاوہ ڈاکٹر ایم-اے قاضی' صدر پاکستان اکیڈمی آف سائنسز کی جانب سے مجھے مندرجہ ذیل ایکسپرس تار موصول ہوا:

12 Dec 1979

X 1530 CA -23 Islamabad 17 Ste 49/48

CH Abdual Hamid

C/o 9- Sasi Town House

Victoria Road Karachi - 4

President of Pakistan invites you and Begum Sahiba for Special investiture ceremony for Professor Abdus Salam on thursday 20th December at 1445 Hours (.) Invitation cards sent yesterday (.) please confirm participation.

Kazi Scientech Islamabad.

ترجمہ: صدر پاکستان آپ اور آپ کی بیگم صاحبہ کو 20 دسمبر بروز جمعرات دو بج کر پینتالیس منٹ پر منعقد ہونے والی خصوصی تقریب میں شمولیت کی دعوت دیتے ہیں۔ دعوتی کارڈ آپ کو کل بھجوا دیا گیا تھا۔ مہربانی فرما کر اپنی شمولیت کی تصدیق فرمائیں۔

قاضی سائٹیک اسلام آباد

چنانچہ وزارت خارجہ کے کیمپ آفس میں اسلم رضوی صاحب سے بھائی جان کے پروگرام کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں۔
بھائی جان 15 دسمبر کی صبح کو اپنی بیگم صاحبہ اور بھائی چوہدری محمد عبدالرشید کے ہمراہ لندن سے کراچی تشریف لائے۔ آپ نے اپنے دورہ کا آغاز 16 دسمبر کو ملتان سے کیا۔ ربوہ' اسلام آباد' پشاور' لاہور' جھنگ' حیدر آباد اور کراچی کا دورہ کرنے کے بعد آپ 2 جنوری 1980ء کی صبح کو لندن واپس چلے گئے۔ اس اٹھارہ روزہ دورہ میں بھائی جان کے بیانات' تقاریر اور انٹرویو کی مختصر تفصیل درج ذیل ہیں جو قومی اخبارات سے لی گئی ہے' اس لئے اکثر جگہ میں نے بھائی جان کا لفظ استعمال نہیں کیا۔

15 دسمبر بروز ہفتہ

بھائی جان 15 دسمبر کی صبح کو جب لندن سے کراچی پہنچے تو رشتہ داروں کے علاوہ کراچی یونیورسٹی اور این-ای-ڈی انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی یونیورسٹی کے وائس چانسلروں' گورنر سندھ کے ملٹری سیکرٹری' پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن اور وزارت خارجہ کے نمائندوں اور دیگر سول و اعلیٰ حکام نے کراچی کے ہوائی اڈہ پر ان کا استقبال کیا۔
ہوائی اڈہ سے آپ گورنمنٹ آف سندھ کے سٹیٹ گیسٹ ہاؤس "قصرناز" وکٹوریہ روڈ تشریف لے گئے۔ وہاں چند گھنٹے آرام کرنے کے بعد آپ اپنے بھائی چوہدری محمد عبدالماجد کی کوٹھی وکٹوریہ روڈ پر گئے اور وہاں انہوں نے کراچی میں مقیم اپنے عزیزوں سے ملاقات کی۔ کچھ دیر وہاں ٹھہرنے کے بعد آپ گیسٹ ہاؤس واپس چلے گئے۔

16 دسمبر بروز اتوار

16 دسمبر کی صبح کو بھائی جان نے کراچی سے ملتان کے لئے سفر کرتے ہوئے اپنے دورے کا آغاز کیا۔ اس سفر میں ہماری بھابھی صاحبہ کے علاوہ ہم تین بھائی اور اعجاز اکبر نقوی نمائندہ وزارت خارجہ شامل تھے۔ نقوی صاحب کا تعلق جھنگ سے تھا۔ اس لئے حکومت نے انہیں بطور خاص انتظامی امور کی نگرانی کے لئے مقرر کیا تھا۔ کراچی کے ہوائی اڈے پر ان تمام حضرات نے جو ایک دن قبل آپ کے استقبال کے لئے آئے تھے نے بھائی جان کو الوداع کیا۔
پی-آئی-اے کا ہوائی جہاز جیسے ہی محو پرواز ہوا تو جہاز کے لاؤڈ سپیکر سسٹم پر جہاز کے کپتان نے اعلان کرتے ہوئے کہا: "خواتین و حضرات متوجہ ہوں! آپ کے جہاز کا کپتان آپ سے مخاطب ہے۔ آپ کو یہ بتاتے ہوئے مجھے اس بات پر انتہائی خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ پاکستان بلکہ دنیا کے مشہور اور عظیم سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام جنہیں حال ہی میں فزکس کا نوبل انعام دیا گیا ہے ہمارے ساتھ ملتان تک سفر کر رہے ہیں۔ میں پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائنز' جہاز کے عملہ اور اپنی جانب سے اس اعزاز کے ملنے پر مبارک

باد دیتے ہوئے انہیں اپنی پرواز پر خوش آمدید کہتا ہوں۔ امید ہے آپ کا یہ سفر آرام دہ گزرے گا۔" جیسے ہی یہ اعلان ختم ہوا تو تمام مسافروں نے تالیاں بجا کر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ چند مسافروں نے بھائی جان سے آٹو گراف لئے۔ ایک مسافر کے پاس کاغذ نہیں تھا' اس لئے اس نے ایک سو روپے کے نوٹ پر ان سے آٹو گراف لئے۔

ملتان کے ہوائی اڈہ پر بہاؤ الدین ذکریا یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر الطاف علی' کرنل (ر) نثار احمد خان کمیشنر ملتان' دیگر سول حکام کے علاوہ ہمارے بہنوئی چوہدری عبدالشکور بھائیوں میں سے چوہدری محمد عبدالسمیع و ڈاکٹر محمد عبدالقادر' چوہدری رشید احمد خان امیر جماعت احمدیہ ملتان اور کثیر تعداد میں رشتہ داروں اور دوستوں نے بھائی جان کا شاندار استقبال کیا۔

ملتان کے ہوائی اڈہ سے بھائی جان اپنی بڑی ہمشیرہ مسعودہ بیگم جن کا اس سال جون میں انتقال ہوا تھا کے مکان نواں شہر تشریف لے گئے۔ وہاں انہوں نے تمام عزیزوں سے ملاقات کی اور دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد وہ بہاؤ الدین ذکریا یونیورسٹی گئے۔ وہاں اساتذہ اور طلباء نے ان کا استقبال کیا۔ یونیورسٹی میں کچھ دیر انہوں نے طلباء اور اساتذہ سے باتیں کیں' جس کے بعد آپ ملتان کے ہوائی اڈہ پر سرگودھا جانے کے لئے تشریف لے گئے۔

ملتان سے سرگودھا کا سفر ایک فوجی ہیلی کاپٹر سے کیا گیا۔ سرگودھا کا سفر ربوہ جانے کے لئے اختیار کیا گیا تھا۔ ملتان سے روانگی سے پہلے بھائی جان نے صحافیوں سے بات کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن' قومی تیل و گیس کی کارپوریشن ایندھن کے بڑھتے ہوئے بحران کو حل کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ان اداروں سے منگل کو اسلام آباد میں بات ہو گی۔

("حریت" کراچی' 1979-12-17)

ملتان سے ہمارے بھائی چوہدری محمد عبدالسمیع اور ڈاکٹر محمد عبدالقادر بھائی جان کے قافلہ میں شامل ہو گئے۔

ملتان کے ہوائی اڈہ پر ان تمام حضرات نے بھائی جان کو الوداع کیا' جنہوں نے اسی صبح ان کا استقبال کیا تھا۔

سرگودھا آمد

مغرب سے کچھ پہلے ہمارا ہیلی کاپٹر سرگودھا میں پاک فضائیہ کے اڈہ پر اترا تو حضرت مرزا طاہر احمد صاحب (موجودہ امام جماعت احمدیہ) اور مرزا خورشید احمد صاحب نے ہیلی کاپٹر تک جا کر بھائی جان کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا۔ ان کے علاوہ کمیشنر سرگودھا و دیگر سول حکام بھی استقبال کرنے کے لئے وہاں موجود تھے۔

ربوہ میں آمد

ہمارا قافلہ جب شام پانچ بج کر پینتس منٹ پر ربوہ کے نزدیک پہنچا تو سرگودھا' فیصل آباد روڈ پر سڑک کے دونوں طرف کھڑے اہل ربوہ نے فلک شگاف نعرے لگا کر فرزند احمدیا کا والہانہ استقبال کیا جن میں بچے' نوجوان' بوڑھے اور خواتین شامل تھیں۔ ایک محتاط اندازہ کے مطابق استقبال کرنے والوں کی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ جیسے ہی بھائی جان کی کار بیت مبارک کے قریب پہنچی تو سینکڑوں افراد نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا جو رینگ رینگ کر تحریک جدید کے گیسٹ ہاؤس (جہاں ٹھہرنے کا بندوبست کیا گیا تھا) پہنچی۔ وہاں جماعت احمدیہ کے ناظر صاحبان' تحریک جدید کے وکلاء عمائدین اور بزرگوں نے بھائی جان کا استقبال کیا اور انہیں پھولوں کے ہار پہنائے۔ گیسٹ ہاؤس جانے والی سڑک پر استقبالیہ بینر بھی نمایاں تھے' جن پر اہلاً و سہلاً و مرحبا اور حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کا یہ ارشاد تحریر تھا کہ "میرے فرقہ کے لوگ علم اور معرفت میں کمال حاصل کریں گے۔"

گیسٹ ہاؤس میں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد بھائی جان نے جماعت احمدیہ کے تیسرے امام حضرت مرزا ناصر احمد صاحب سے ملاقات کی اور کچھ دیر ان کی خدمت میں حاضر رہے۔

اسی رات حضرت مرزا ناصر صاحب نے تحریک جدید کے گیسٹ ہاؤس میں ایک ضیافت کا اہتمام فرمایا' جس میں ناظر صاحبان و تحریک جدید کے وکلاء و دیگر احباب نے شمولیت کی۔

17 دسمبر بروز سوموار

ناشتہ کے بعد بھائی جان بہشتی مقبرہ اپنے والدین اور دوسرے بزرگوں کے مزاروں پر دعا کرنے کے لئے تشریف لے گئے۔ بہشتی مقبرہ اس قبرستان کا نام ہے جس میں جماعت احمدیہ کے ان افراد کو دفن کیا جاتا ہے جو دینی کاموں اور ان کی اشاعت کے لئے اپنی سالانہ آمدنی کے علاوہ منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کے کم سے کم دسویں حصہ کی وصیت کرتے ہیں۔ خواتین جن کی کوئی باقاعدہ آمدنی اور جائیداد نہ ہو وہ اپنے حق مہر اور زیورات کی قیمت کے دسویں حصہ کی وصیت کر کے اس نظام میں شامل ہوتی ہیں۔ اس نظام وصیت میں شمولیت کے لئے اولین شرط تقویٰ شعاری اور شریعت کے احکامات پر پابند ہونا ضروری ہے۔ بہشتی مقبرہ سے فارغ ہونے کے بعد بھائی جان گیسٹ ہاؤس میں تشریف لانے والے احباب سے ملاقات کرتے رہے اور مصروف دن گزرا رہ۔

18 دسمبر بروز منگل وار

اسلام آباد جانے کے لئے بھائی جان صبح 9 بجے ربوہ سے جب روانہ ہوئے تو انہیں بڑی گرمجوشی سے رخصت کیا گیا۔ پاک فضائیہ کے اڈہ سے ہمارا ہیلی کاپٹر دس بجے اسلام آباد کے لئے روانہ ہوا۔ ہوائی اڈہ پر کمشنر سرگودھا و دیگر سول حکام بھائی جان کو الوداع کہنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔

اسلام آباد میں آمد

اسلام آباد کے ہوائی اڈہ پر بھائی جان کا نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ وہاں انہیں خوش آمدید کہنے کے لئے مندرجہ ذیل حکام بالا تشریف لائے ہوئے تھے:

وفاقی وزیر تعلیم حکومت پاکستان' صدر پاکستان کے مشیر برائے تعلیم

چیئرمین یونیورسٹی گرانٹس کمیشن' چیئرمین پاکستان اٹیمی توانائی کمیشن

وائس چانسلر قائداعظم یونیورسٹی' وائس چانسلر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

وزارت خارجہ کا نمائندہ' کابینہ ڈویژن کا نمائندہ

ان کے علاوہ اسلام آباد میں مقیم رشتہ دار' دوست' اعلیٰ سول و فوجی حکام بھی ہوائی اڈہ پر استقبال کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ ہوائی اڈہ سے ہم سندھ ہاؤس گئے جہاں ہمارے قیام کے لئے انتظام کیا گیا تھا۔ اسلام آباد میں ہمارے سب سے چھوٹے بھائی محمد عبدالوہاب بھائی جان کے قافلہ میں شامل ہو گئے تھے۔

سائنسدان اور ماہرین تعلیم پیدا کرنے کے لئے نظام تعلیم کو نئی شکل دی جائے

اسلام آباد میں اپنی آمد کے کچھ دیر بعد بھائی جان نے اے پی پی کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا: "پاکستان میں تعلیم کے نظام کو نئی شکل دی جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ سائنسدان' ٹیکنیشن اور ماہرین پیدا ہو سکیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ ہمارے طلباء کا صرف دس فیصد سائنس اور ٹیکنالوجی کی تربیت حاصل کرتا ہے جب کہ باقی نوے فیصد آرٹس کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس صورت کو تبدیل ہونا چاہیے۔ سائنس و ٹیکنالوجی اور یونیورسٹی کی تعلیم میں افرادی قوت کا تناسب 60 اور 40 کا ہونا چاہیے۔ انہوں نے چار قومی ترجیحات کی نشاندہی کی۔ اول تکنیکی اور یونیورسٹی کی تعلیم میں عدم توازن کا خاتمہ' دوم زراعت کی ترقی' سوم ملک کے تیل اور معدنی وسائل کا استعمال اور چہارم صنعت میں ٹیکنالوجی کا فروغ۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں ملکی ترقی کے لئے ترقی یافتہ افرادی قوت چاہیے۔ حکومت غریب اور امیر سب کو سائنسی اور تکنیکی تربیت اور تحقیق کے لئے انتھک کوشش کرنی چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ تعلیم کو قومیانے کی سابق حکومت کی پالیسی غلط تھی۔)

("جسارت و ڈان" 1979-12-21)

18 دسمبر کی سہ پہر صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق جو قائداعظم یونیورسٹی کے چانسلر بھی ہیں' نے بھائی جان کو قائداعظم یونیورسٹی کی طرف سے "ڈاکٹر آف سائنس" کی اعزازی ڈگری دی۔ یہ ڈگری یونیورسٹی کے ایک رنگا رنگ موثر خصوصی کانووکیشن میں دی گئی۔ اس بارے میں پریس رپورٹ:

قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے خصوصی کانووکیشن میں پروفیسر عبدالسلام کو اعزازی ڈگری دی گئی

18دسمبر

صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے جو قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے چانسلر بھی ہیں' فزکس میں نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام کو ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ یہ ڈگری یونیورسٹی کے ایک رنگا رنگ اور موثر خصوصی کانووکیشن میں دی گئی' جو آج تیسرے پہر قومی اسمبلی ہال میں منعقد ہوا تھا۔ صدر نے جو تعلیمی قبا میں ملبوس تھے' چاندی کے کیسکٹ میں پروفیسر عبدالسلام کو جنہوں نے سرخ رنگ کی دیدہ زیب تعلیمی قبا (گاؤن) پہن رکھی تھی' ڈگری پیش کی۔ جب پروفیسر عبدالسلام کو ڈگری دی گئی تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ڈگری پیش کرنے کے بعد چانسلر اور وائس چانسلر بھی تالیوں کے طویل سلسلہ میں شامل ہو گئے۔

قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے وائس چانسلر ڈاکٹر احمد محی الدین نے اپنے خطاب میں طبیعات میں پروفیسر عبدالسلام کے کارناموں کی تعریف کی اور کہا کہ ''پروفیسر سلام نے طبعیات میں جو بنیادی اور رہنمائی کا کام کیا ہے اور سائنس دان کی حیثیت سے جو کارنامے انجام دیئے ہیں اور تیسری دنیا خصوصاً پاکستان کی ترقی کے لئے جو انتھک کوششیں کی ہیں ان کا اعتراف کرتے ہوئے قائداعظم یونیورسٹی نے انہیں سائنس کی اعزازی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا ہے اور اسے اس پر فخر ہے کہ یہ ڈگری حاصل کرنے والوں میں ان کا شمار کیا جائے گا۔ پاکستانی قوم کو پروفیسر سلام پر فخر ہے جو اپنی قدرتی تخلیقی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کر کے سائنس کے میدان میں اعلیٰ ترین مقام پر پہنچے ہیں۔ پروفیسر سلام کے کارناموں نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ وہ تخلیقی صلاحیت جو انسان کو عظمت کی بلندی تک لے جاتی ہے اُن لوگوں میں پائی جاتی ہے جنہوں نے کسی زمانے میں کافی کارنامے انجام دیئے تھے لیکن اب پیچھے رہ گئے ہیں۔ پروفیسر سلام نے جن قوتوں پر فتح حاصل کی ہے ان میں بالاخر وہ رموز بھی افشا ہو جائیں گے جو کثرت میں وحدت پر محیط ہیں۔

وہ قوتیں جنہیں پروفیسر سلام نے زیر کر لیا ہے' بالاخر وہ ان رموز کو بے نقاب کر دیں گی جو کثرت میں وحدت پر محیط ہیں۔ سپاسنامہ میں ڈاکٹر سلام کے کارنامہ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا کہ پروفیسر سلام نے اپنے لئے ایک ایسا مقام پیدا کر لیا ہے جنہیں سائنس کے مؤرخ ان ممتاز لوگوں میں شمار کریں گے جنہوں نے تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ سپاسنامہ میں کہا گیا کہ پروفیسر سلام کی قوت متخیلہ اور مادہ کی فطرت کو سمجھنے کی انتھک کوشش ان کے لئے متعدد بین الاقوامی تنظیموں کے اعزازات کا باعث بنی ہیں' جن کی تفصیل کچھ یوں ہے:

- ہاپکنز پرائز کیمبرج یونیورسٹی — 1957ء
- ایڈمسز پرائز کیمبرج یونیورسٹی — 1958ء

- پہلا میکسویل میڈل اور ایوارڈ فزیکل سوسائٹی لندن 1964ء
- ہیوز میڈل، رائل سوسائٹی لندن 1964ء
- ایٹم برائے امن کا میڈل اور ایوارڈ 1968ء
- جے۔ رابرٹ اوپن ہائیمر میموریل میڈل اور پرائز میامی یونیورسٹی 1971ء
- گوتھرائی میڈل اور پرائز انسٹیوٹ آف فزکس لندن 1976ء
- سردیو پرشاد سرو ادھیکاری گولڈ میڈل کلکتہ یونیورسٹی 1977ء
- متیوسی میڈل اکیڈمی نیشنل روم 1978ء
- جان ٹورنس ٹیٹ، میڈل امریکن انسٹی ٹیوٹ آف فزکس 1978ء
- رائل میڈل، رائل سوسائٹی لندن 1978ء
- آئن سٹائن، میڈل یونیسکو پیرس 1979ء
- شری آر-ڈی برلا ایوارڈ انڈین فزکس ایسوسی ایشن 1979ء
- نوبل انعام برائے فزکس 1979ء

یہ وہ چند اعترافات ہیں جو پروفیسر سلام کی ذہنی صلاحیتوں، تخلیقی اور فکری بالادستی کے مظہر ہیں۔ سپاسنامہ میں مزید کہا گیا کہ پاکستان میں سائنس کی ترقی سے پروفیسر سلام کو جو دلی لگاؤ رہا ہے۔ پاکستان سائنٹیفک کمیشن کے 1959ء سے ایک ممبر اور 1961-1974ء صدر پاکستان کے سائنس کے خصوصی مشیر کی حیثیت میں انہوں نے پاکستان میں سائنس کو فروغ دینے کی کوششوں کو مستحکم کرنے اور اس مقصد کے لئے ادارہ قائم کرنے میں مدد دی ہے۔ پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن 1958-1974ء کے ایک ممبر کی حیثیت میں اس کی پالیسیاں بنانے اور اسے ترقی دینے میں انہوں نے مرکز کا کردار ادا کیا۔ 1973ء میں پروفیسر سلام نے اسلامی سائنس فاؤنڈیشن قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ 1974ء میں اسلامی سربراہ کانفرنس لاہور میں اس کے لئے مسودہ پیش کیا گیا۔ یہ خیال اب ثمر آور ہوتا نظر آ رہا ہے اور ایسی فاؤنڈیشن اب قائم ہونے والی ہے۔

(''حریت'' کراچی، ''ڈان'' کراچی، ''جنگ'' 1979-12-19)

صدر جنرل محمد ضیاء الحق سے ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری وصول کرنے کے بعد پروفیسر عبدالسلام نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''قوم کو سائنس و ٹیکنالوجی پر مکمل دسترس کے حصول کا تہیہ کر لینا چاہیے۔ پاکستان کو اپنی افرادی قوت میں سے نصف سے زائد کو سائنس و ٹیکنالوجی کی تربیت سے آراستہ کر دینا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کی قومی پیداوار دس بلین ڈالر ہے۔ جس میں سے سائنس و ٹیکنالوجی کی تحقیقات پر دس ملین ڈالر خرچ کیا جانا چاہیے۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ پاکستان کے منصوبہ بندی کمیشن کو ایک سائنس و ٹیکنالوجی سیل قائم کرنا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ سائنس و ٹیکنالوجی سے فائدہ حاصل

کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سائنس و ٹیکنالوجی کے ماہرین کو اپنے اپنے علوم سے متعلقہ ذمہ داریاں سنبھالنے کا موقع فراہم کیا جائے کیونکہ یہ کام کوئی اور منتظم کار نہیں کر سکتا اور نہ ہی اسے ایسا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ بعض دوسرے ممالک کی طرح پاکستان میں بھی ماہرین سائنس و ٹیکنالوجی اور ملک کی ترقیاتی مشینری چلانے والے افراد کے درمیان مکمل مفاہمت ہونی چاہیے۔ پروفیسر عبدالاسلام نے کہا کہ سائنس و ٹیکنالوجی کے لئے ایک پنجسالہ منصوبہ پر عملدرآمد میں سائنسدانوں اور منتظم کاروں کے درمیان مکمل باہمی احترام' اتحاد اور تعاون ہونا چاہیے' انہوں نے کہا کہ کوئی بھی حکومت تن تنہا سائنس اور سائنسدانوں کی اسی طرح سرپرستی نہیں کر سکتی کہ صلاحیتیں قطعی طور پر رائیگاں نہ جائیں۔ لہٰذا قوم سے اپیل کی کہ فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فنڈ قائم کیا جائے تاکہ صلاحیتوں سے پورا پورا استفادہ کیا جاسکے۔

(''حریت' ڈان' جنگ'' 1979-12-19)

پروفیسر عبدالسلام کے خطاب کے بعد چانسلر نے کانووکیشن کے اختتام کا اعلان کیا' قبل ازیں پروچانسلر' وائس چانسلر' پروفیسر عبدالسلام کے ہمراہ تعلیمی قبا پہنے جلوس کی صورت میں کانووکیشن ہال میں داخل ہوئے۔ اس جلوس کے پیچھے سینٹ سنڈیکیٹ اور اکیڈیمک کونسل کے ممبروں کا جلوس ہال میں داخل ہوا۔

خصوصی کانووکیشن کے بعد ایک استقبالیہ ہوا جس میں وفاقی وزراء' سفیروں' ممتاز سائنسدانوں' تعلیمی ماہرین اور اعلیٰ سول و فوجی حکام نے شرکت کی۔

چونکہ خصوصی کانووکیشن کی کارروائی کے دوران عصر کا وقت ہو گیا تھا' اس لئے استقبالیہ کی تقریب سے پہلے وقفہ کر دیا گیا۔ عبادت کی ادائیگی کے بعد استقبالیہ کی تقریب منعقد ہوئی' جس کے دوران پروفیسر عبدالسلام مہمانوں میں گھل مل گئے۔" عصر کی نماز ادا کرنے کے لئے جا رہے تھے تو جنرل ضیاء الحق نے بھائی جان سے پوچھا کہ آپ ہمارے ساتھ نماز پڑھیں گے یا الگ اپنی نماز پڑھیں گے۔ بھائی جان نے جواب دیا کہ میں الگ پڑھوں گا۔

18 دسمبر کی شام

ڈاکٹر شامی چیئرمین یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے کمیشن کے ممبران اور اپنی طرف سے بھائی جان کے اعزاز میں اسلام آباد ہوٹل میں عشائیہ دیا۔ جس میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی قائداعظم یونیورسٹی کے وائس چانسلروں' ماہرین تعلیم اور سائنسدانوں نے شرکت کی۔

19 دسمبر بروز بدھ

آج بھائی جان نے پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف نیوکلیر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (PINSTECH) نیلور کا

دورہ کیا۔ نیلور اسلام آباد سے دس پندرہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے دورہ کے بعد منیر احمد خان چیئرمین پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن نے انسٹی ٹیوٹ کے خوبصورت ہال میں بھائی جان کے اعزاز میں ظہرانہ دیا' جس میں پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن اور PINSTECH کے سائنسدانوں اور ماہرین نے شرکت کی۔

ظہرانے کے بعد بھائی جان نے ایک سائنٹیفک لیکچر دیا جس میں انہوں نے سلائیڈز کی مدد سے اپنی تھیوری کی چیدہ چیدہ باتیں بتائیں۔ قبل ازیں انہوں نے PINSTECH کی انتہائی دیدہ زیب عمارت کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اسے بہت اچھی حالت میں رکھا گیا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کی سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے انہوں نے حاضرین کو بتایا کہ PINSTECH کی عمارت بنانے کے لیے تین جگہوں ٹیکسلا' ہزارہ اور اسلام آباد کے نام تجویز کیے گئے تھے لیکن کافی سوچ و بچار کے بعد انہوں نے انسٹی ٹیوٹ کے لیے موجودہ جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ اس وقت وہ صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان کے سائنسی مشیر اعلیٰ تھے۔

اپنے لیکچر کے بعد انہوں نے سوالات کے جواب دیئے۔ ایک سوال کہ "ان کی تھیوری سے ایک عام آدمی کو کیا فائدہ پہنچے گا؟" کا جواب دیتے ہوئے بھائی جان نے کہا "میری تھیوری سے ایک آدمی کی زندگی میں فوری طور پر بہتری ہونے کا امکان نہیں ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے نیوٹن سے یہ پوچھا جاتا کہ اس کے نظریات اور کلیوں سے ایک عام آدمی کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ لیکن نیوٹن کی وفات کے ڈیڑھ دو سو سال بعد اس کے نظریات اور کلیات کی روشنی میں میکسوئل نے اپنے نظریات پیش کیے جو موجودہ دور میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ایجاد میں کام آئے" ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ "پروٹون کے بارے میں ان کی تھیوری پر کام کے لیے امریکہ میں بیس لاکھ ڈالر مختص کر دیئے گئے ہیں۔ یہ انتظام بروک ہاون گروپ نے کیا ہے۔" انہوں نے بتایا کہ "اس تجربہ کے لیے بارہ ہزار ٹن پانی کا زمین کے اندر ایک میل کی گہرائی پر ذخیرہ کیا جائے گا اور اس کے چاروں طرف کیمرے لگائے جائیں گے اور اس پانی میں ہونے والی تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا جائے گا۔ یہ تمام مشقت اور خرچ اس ایک لمحہ کے لیے ہوگا جو پروٹون کے زائل ہونے کا ثبوت فراہم کرے گا۔ اس کا ثبوت ایک ہلکی سی شعاع ہوگی جو اس پانی سے پھوٹے گی۔"

(ڈان کراچی 1979-12-20)

19 دسمبر

آج شام ساڑھے چھ بجے پاکستان اکیڈمی آف سائنسز کے صدر ڈاکٹر ایم۔ اے قاضی اور چیئرمین پاکستان سائنس فاؤنڈیشن میجر جنرل شفیق احمد نے مشترکہ طور پر بھائی جان کے اعزاز میں اسلام آباد ہوٹل میں عشائیہ دیا۔

ڈاکٹر ایم۔ اے قاضی نے خطبہ استقبالیہ دیا۔ انہوں نے پروفیسر عبدالسلام کو خوش آمدید کہتے ہوئے ان کی خدمات پر خراج تحسین پیش کیا اور کہا کہ پروفیسر عبدالسلام ترقی پذیر ممالک کے کاز (CAUSE) اور ان کی قومی، اخلاقی، علاقائی اور بین الاقوامی سطحوں پر سائنسی و فنی ضروریات کی وکالت کرنے میں پیش پیش ہیں۔ ڈاکٹر قاضی نے اکیڈمی کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا۔ پروفیسر عبدالسلام پاکستان اکیڈمی آف سائنسز کے 1954ء سے ممبر ہیں۔ بعد میں ڈاکٹر قاضی نے پروفیسر عبدالسلام کو پاکستان اکیڈیمی آف سائنسز کا نشان پیش کیا۔

ڈاکٹر ایم۔اے قاضی کے خطبہ استقبالیہ کے بعد پروفیسر عبدالسلام نے ایک مختصر سی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ملک کو توانائی کے بحران سمیت مختلف دوسرے مسائل حل کرنے کے لیے سائنسدانوں اور حکام کے درمیان تبادلہ خیال ہونا چاہیے تاکہ عوام کی بہبود کے لیے تجاویز سامنے آسکیں۔ انہوں نے کہا کہ پاکستانی سائنسدانوں کو غیر ممالک کے دورے کے مواقع فراہم کیے جائیں تاکہ وہ ترقی یافتہ ممالک کے محققین کے ساتھ روابط کے ذریعے اپنی معلومات کو وسعت اور فروغ دے سکیں۔ انہوں نے کہا کہ شمسی توانائی میں تحقیقات کی بڑی گنجائش ہے اور شمسی توانائی پر فوری طور پر تحقیق ہونی چاہیے تاکہ اس سے پہلے کہ پاکستان میں توانائی کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کرے، توانائی کا متبادل وسیلہ ہاتھ آجائے۔"

پاکستان سائنس فاؤنڈیشن کے چیرمین میجر جنرل شفیق احمد نے اپنے خطاب میں کہا کہ علامہ اقبال شاعر مشرق تھے اور پروفیسر عبدالسلام مشرق کے بلند مرتبت سائنسدان ہیں جنھوں نے دنیا میں پاکستان کو ایک ممتاز مقام دلایا ہے۔

اس عشائیہ میں وفاقی وزیر تعلیم جناب محمد علی ہوتی، پاکستان اٹیمی توانائی کمیشن کے چیرمین منیر احمد خان، متعدد وفاقی سیکرٹریوں، اعلی سول و فوجی حکام نے شرکت کی۔

ڈان کراچی (20-12-1979)

20 دسمبر بروز جمعرات

ایوان صدر راولپنڈی میں سوا تین بجے ایک خصوصی تقریب منعقد کی گئی جس میں صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے بھائی جان کو "نشان امتیاز" کا ایوارڈ دیا۔ تقریب میں وفاقی وزرا، غیر ملکی سفیر، ممتاز سائنسدان، اعلی سول و فوجی حکام شریک ہوئے۔ انہیں "نشان امتیاز" طبیعات کے میدان میں ان کی شاندار کامیابی اور پاکستان اور بیرون ملک سائنس کے لیے ان کی اعلیٰ خدمات کے اعتراف میں دیا گیا۔ "نشان امتیاز" سائنس اور آرٹ کے شعبوں میں غیر معمولی کام انجام دینے پر دیا جانے والا اعلی ترین اعزاز ہے۔

سرکاری توصیف نامہ میں بھائی جان کی خدمات کو سراہا گیا اور کہا گیا کہ وہ پاکستانی سرزمین کی پیداوار ہیں اور ان کے ہم وطنوں کے لیے یہ اعزاز، فخر و انبساط کا موجب ہے۔ توصیف نامہ کابینہ کے سیکرٹری جناب ظہور آذر نے پڑھ کر سنایا۔ اس میں مزید کہا گیا کہ پروفیسر عبدالسلام اس ملک میں سائنس کی ترقی سے

وابستہ رہے ہیں۔ انہوں نے پاکستان میں سائنسی کوششوں کو مستحکم کرنے اور اس مقصد کے لیے ایک ادارتی ڈھانچہ قائم کرنے میں فعال مدد کی۔

انہوں نے توصیف نامہ میں بھائی جان کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم سے لے کر ایک سائنس دان کی معراج یعنی نوبل پرائز ملنے تک حالات اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہوئے انہیں زبردست خراج تحسین پیش کیا۔

توصیف نامہ پڑھے جانے کے بعد صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے بھائی جان کے گلے میں ''نشان امتیاز'' کا میڈل پہنایا۔ اس کے بعد حاضرین کی چائے سے تواضع کی گئی۔ جنرل محمد ضیاء الحق اور بھائی جان حاضرین میں گھل مل گئے۔ ہم سب بھائی بھی اس تقریب میں شامل ہوئے تھے۔ بھائی جان نے صدر پاکستان سے ہمارا تعارف کرایا۔

اسی شام بھائی جان نے ایوان صدر راولپنڈی میں جنرل محمد ضیاء الحق سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے دوران پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کے چیرمین بھائی جان کے ساتھ تھے۔

(ڈان کراچی 1979-12-21)

صدر پاکستان کی طرف سے عشائیہ

20 دسمبر کو جنرل محمد ضیاء الحق نے سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں بھائی جان کے اعزاز میں عشائیہ دیا جس میں انہوں نے کہا کہ ان کی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ سائنس کی ترقی کے لیے قومی بجٹ کا ایک فیصد خرچ کیا جائے گا۔ انہوں نے سائنسدانوں کو بیرون ملک جانے پر پابندی اٹھانے کا بھی اعلان کیا۔ (زیڈ۔ اے بھٹو نے سائنسدانوں کے بیرون ملک جانے پر اس وقت پابندی عائد کی تھی جب بھائی جان نے سائنسی مشیر اعلیٰ کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ (جماعت احمدیہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے فورا بعد بھائی جان نے استعفیٰ دیا تھا) انہوں نے کہا کہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ پروفیسر عبدالسلام نے جو نوبل انعام حاصل کیا ہے اس کا نمونہ ملک کی پندرہ یونیورسٹیوں، ضلع جھنگ کے سکولوں اور گورنمنٹ کالج جھنگ و لاہور میں رکھوایا جائے گا جہاں انہوں نے تعلیم پائی تھی۔ انہوں نے اس بات کا بھی اعلان کیا کہ وہ اپنی کابینہ سے منظوری لینے کے بعد پروفیسر عبدالسلام کا آبائی گھر جو جھنگ صوبہ پنجاب میں واقع ہے کو قومی یادگار بنایا جائے گا جس کے لیے پروفیسر عبدالسلام پہلے ہی اپنی رضامندی کا اظہار کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنے مختصر سے خطاب میں کہا کہ حکومت پاکستان کی طرف سے صدر پاکستان ضیاء الحق نے جن فیصلوں کا اعلان کیا ہے وہ ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ سائنس کے میدان میں اس وقت ترقی ناممکن ہے جب تک کہ پوری قوم اور صدر پاکستان اس کام میں دلچسپی نہ لیں۔

(ڈان کراچی 1979-12-21)

صدر پاکستان کے اس عشائیہ میں مسٹر انوار الحق چیف جسٹس آف پاکستان' وفاقی وزراء' سائنسدانوں' اعلیٰ سول و فوجی افسران کے علاوہ ہم سب بھائیوں نے شمولیت کی۔

21 دسمبر بروز جمعہ

آج دوپہر تک کوئی سرکاری مصروفیات نہیں تھیں۔

اسلام آباد سے روانگی اور پشاور آمد

21 دسمبر کی سہ پہر کو بھائی جان اپنے اہل قافلہ کے ہمراہ پاکستان ایئر فورس کے فوکر طیارے سے اسلام آباد سے پشاور کے لیے روانہ ہوئے تو اسلام آباد کے ہوائی اڈا پر اعلیٰ سرکاری افسران نے انہیں رخصت کیا۔

پشاور کے ہوائی اڈا پر گورنر سرحد کے ملٹری سکریٹری' پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر و اعلیٰ سول حکام نے بھائی جان کا استقبال کیا۔ ہوائی اڈا سے ہم انٹر کانٹیننٹل ہوٹل گئے جہاں حکومت سرحد نے ہمارے قیام کا انتظام کیا ہوا تھا۔

21 دسمبر کو لیفٹیننٹ جنرل فضل حق گورنر صوبہ سرحد نے گورنر ہاؤس پشاور میں بھائی جان کے اعزاز میں عشائیہ دیا جس میں پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر' میونسپل کارپوریشن کے چیرمین اور وائس چیرمین' ڈسٹرکٹ کونسل پشاور کے چیرمین' بعض صوبائی وزیروں' پشاور میں سائنسدانوں' اعلیٰ سول و فوجی حکام کے علاوہ ہم بھائیوں نے بھی شمولیت کی۔

(حریت کراچی 1979-12-22)

22 دسمبر بروز ہفتہ

ہفتہ کی صبح بھائی جان نے پشاور کے قریب ترناب میں واقع زرعی تحقیقاتی ادارہ کا دورہ کیا۔ اس دورہ سے قبل لاہور سے ہمیں اطلاع موصول ہوئی کہ بھائی جان کی لاہور آمد پر ایک سیاسی مذہبی پارٹی کے طلباء کی تنظیم نے ان کے خلاف مظاہرہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ طلباء کی تنظیم نے اس بات کا بھی فیصلہ کیا کہ 23 دسمبر کو پنجاب یونیورسٹی ہال میں بھائی جان کی ہونے والی تقریر کے دوران وہ ہلڑ بازی اور غنڈہ گردی کا مظاہرہ کریں گے۔ مزید یہ بھی معلوم ہوا کہ بھائی جان کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس اطلاع کے ملتے ہی میں نے لاہور میں اپنے بھتیجے چوہدری منیر مسعود سرکل رجسٹرار کواپریٹو ڈیپارٹمنٹ حکومت پنجاب سے صحیح صورت حال معلوم کرنے کے لیے رابطہ کیا۔ چند گھنٹے بعد انہوں نے ٹیلی فون پر اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ اعلیٰ حکام کو اس بات کا علم ہو چکا ہے اور انہوں نے سخت حفاظتی اقدام کر لیے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے بھائی جان کی تقریر یونیورسٹی ہال کی بجائے

سینٹ ہال میں کروانے کا فیصلہ کیا ہے۔ چوہدری منیر مسعود نے بتایا کہ اس سلسلہ میں پولیس کے چند اعلیٰ افسر بہت ہی جذباتی ہوئے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ "فرزند پنجاب لاہور آئے تو اسے تقریر کرنے سے روکا جائے ہم ایسا ہرگز نہیں ہونے دیں گے۔" (بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ 22 دسمبر کو چند شرپسند طلباء نے مال روڈ پر ایک جلوس نکالا تھا جس پر پولیس نے لاٹھی چارج کیا اور اسے منتشر کرنے کے لیے آنسو گیس بھی استعمال کی تھی۔ پولیس کی اس کاروائی کے بعد ان کا جوش ختم ہو گیا تھا۔)

22 دسمبر کو پشاور کے شہریوں کی طرف سے بھائی جان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا گیا۔ جس میں انہوں نے ملک میں سائنسی علوم کے فروغ کے لیے ایک ذہانت فنڈ تشکیل دینے کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے کہا کہ سائنسی تعلیم کے حصول میں ذہین افراد اور ملک کی بہبود کی غرض سے سائنسی ترقی کے لیے مذکورہ فنڈ استعمال کیا جائے۔ بھائی جان نے کہا کہ یہ انتہائی افسوس ناک بات ہے کہ پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک میں لوگ اقتصادی دباؤ کے نتیجے میں حادثہ یا معجزہ کے طور پر سائنسدان بن جاتے ہیں۔ لہٰذا اس صورت سے نمٹنے کے لیے ضروری ہے کہ مذکورہ نوعیت کا فنڈ قائم کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ سائنسی فروغ کا کام محض وفاقی یا صوبائی حکومتوں پر چھوڑ دینا کسی طرح مناسب نہیں بلکہ اس کے لیے بلدیاتی اداروں' اس قسم کے دوسرے اداروں اور مخیر حضرات کو بھی آگے آنا چاہیے اور سائنسی تعلیم اور تحقیقات کے بوجھ میں ہاتھ بٹانا چاہیے۔ انہوں نے ترناب میں واقع تحقیقاتی ادارے کے اپنے دورے کا ذکر کیا اور اس کی کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کیا۔ انہوں نے اس بات پر خاص خوشی کا اظہار کیا کہ ان مراکز میں تحقیقات کا کام سائنسدانوں کے درمیان مکمل اشتراک سے ہو رہا ہے۔ تاہم انہوں نے کہا کہ اس قسم کے مراکز کو فنڈ کی فراہمی کا کام صرف حکومت پر چھوڑ دینا مناسب نہیں بلکہ گندم اور پھل پیدا کرنے والوں کو بھی جن کے لیے تحقیقات کا کام ہو رہا ہے فنڈ مہیا کرنا چاہیے۔ انہوں نے فزکس پر مبنی صنعتوں کے قیام کو عوام کی بہبود کے لیے ضروری قرار دیا ہے اور کہا کہ دوسری صنعتوں کے مقابلہ میں مذکورہ صنعتوں سے زیادہ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس قسم کی صنعتوں کے قیام کے لیے سائنسی تعلیم کو فروغ دینا ضروری ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے بعض دوسرے ممالک خاص طور پر جاپان کا حوالہ دیا جو اس صنعت میں مغربی ممالک پر بھی سبقت لے گیا ہے۔ انہوں نے صدر جنرل محمد ضیاء الحق کے اس اعلان پر خوشی کا اظہار کیا کہ پندرہویں صدی ہجری کا آغاز ملک میں سائنس کے فروغ سے ہو گا۔ انہوں نے نوجوانوں کو تلقین کی کہ محنت اور مشقت کے بغیر کامیابی حاصل کرنے کے رجحان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں کیونکہ اس قسم کی کوششوں سے محض وقت تو ضائع ہو سکتا ہے لیکن کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے نوجوانوں کو اساتذہ کے ادب و احترام کی تلقین کی تاکہ وہ اساتذہ کی محبت اور شفقت سے بہرہ ور ہو سکیں۔

قبل ازیں پشاور میونسپل کارپوریشن کے چیرمین جناب ارباب نیاز محمد خان نے ڈاکٹر عبدالسلام کو سپاسنامہ پیش کیا اور ان کی خدمات پر خراج تحسین پیش کیا۔ جبکہ پشاور یونیورسٹی کے شعبہ طبیعات کے سربراہ ڈاکٹر نذیر احمد نے استقبالیہ کے شرکاء سے ڈاکٹر عبدالسلام کا تعارف کرایا۔

(حریت کراچی 1979-12-23)

استقبالیہ کے بعد صوبہ سرحد کی ایک معمر شخصیت نے بھائی جان سے مصافحہ کرتے ہوئے قرآن حکیم کی مندرجہ ذیل آیت پڑھی۔

ترجمہ: "وہ جسے چاہتا ہے، حکمت عطا کرتا ہے اور جسے حکمت عطا کی گئی تو (سمجھ کہ) اسے (ایک) بہت ہی نفع رساں چیز مل گئی۔"

(البقرہ آیت 270)

پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے بھائی جان کے اعزاز میں انٹرکانٹیننٹل میں ظہرانہ دیا جس میں یونیورسٹی کے پروفیسروں، اعلی سول حکام اور ہم بھائیوں نے بھی شرکت کی۔

پشاور سے روانگی برائے لاہور

ہمارا قافلہ 22 دسمبر کی سہ پہر کو پاکستان ائیر فورس کے فوکر طیارے سے لاہور کے لیے روانہ ہوا تو گورنر صوبہ سرحد کے ملٹری سیکرٹری، وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی، سائنسدانوں کے علاوہ اعلیٰ سول حکام نے انہیں پشاور کے ہوائی اڈہ پر الوادع کیا۔

لاہور آمد

تقریبا" سوا چار بجے ہمارا طیارہ جب لاہور کے ہوائی اڈہ پر اترا تو گورنر پنجاب کے ملٹری سیکرٹری، پنجاب یونیورسٹی اور یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کے وائس چانسلروں، اعلیٰ سول حکام کے علاوہ دوستوں اور رشتہ داروں نے بھائی جان کا پرجوش استقبال کیا۔

ہوائی اڈا سے ہمارا قافلہ سٹیٹ گیسٹ ہاؤس مال روڈ کے لیے روانہ ہوا۔ وہاں ہمارے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔

22 دسمبر کو لیفٹننٹ جنرل سوار خان گورنر پنجاب نے بھائی جان کے اعزاز میں گورنر ہاؤس میں عشائیہ دیا جس میں ماہرین تعلیم، اعلیٰ سول حکام اور ہم بھائیوں نے بھی شرکت کی۔ بعد میں گورنر پنجاب نے بھائی جان سے علیحدگی میں بات چیت کی۔

(حریت کراچی 1979-12-24)

23 دسمبر بروز اتوار

23 دسمبر کو بھائی جان نے پنجاب یونیورسٹی ہال میں لیکچر دینا تھا جسے اوپر بیان کردہ وجوہات کی وجہ سے منسوخ کر دیا گیا۔ تاہم پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے 23 دسمبر کی صبح کو ان کے لیکچر کا ہنگامی طور پر یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں انتظام کیا۔

اپنے لیکچر میں بھائی جان نے سائنسدانوں، فنی ماہرین اور انجنیروں کو تلقین کی کہ وہ پاکستان کے مستقبل کی ترقی کا ذریعہ بن جائیں۔ انہوں نے سائنسدانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں اور ملک کو ترقی دینے کی ذمہ داری اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ انہوں نے کہا کہ موجودہ فضا پاکستان میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے بہت ساز گار ہے اور سائنسدان اپنی صفوں میں اتحاد اور ملک کی ترقیاتی سرگرمیوں سے خود کو عملی طور پر وابستہ کر کے اپنی ذمہ داریاں پوری کر سکتے ہیں۔

بھائی جان نے کہا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ سائنسدان اور فنی ماہرین پنج سالہ ترقیاتی منصوبہ کی ایک نقل اپنے ساتھ رکھیں تاکہ وہ حکومت کے مستقبل کے پروگراموں سے ہمیشہ باخبر رہیں۔ انہوں نے کہا کہ متعدد سائنسدان جن سے میں نے پاکستان کی مجموعی قومی پیداوار کے بارے میں دریافت کیا تو وہ اس کا صحیح جواب نہیں دے سکے۔ جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ وہ قومی ترقی کی ضروریات سے خود کو باخبر نہیں رکھتے۔ انہوں نے کہا کہ لاہور سے میری بڑی جذباتی وابستگی ہے اور لاہور آنا میرے لیے بے پناہ مسرت اور خوشی کا باعث ہے۔ انہوں نے کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ میں اس گہرے جذباتی لگاؤ پر کبھی قابو نہیں پا سکا جو جھنگ سے آنے والے ایک نووارد کی حیثیت میں گورنمنٹ کالج لاہور میں شمولیت کے ساتھ پروان چڑھا تھا۔ انہوں نے کہا کہ جب میں نے کیمرج میں ملازمت کے لیے بیرونی ملک کا سفر کیا تو یہ ایسا فیصلہ تھا کہ جو اس شہر سے گہرے لگاؤ کے باعث میں بڑی مشکل سے کر سکا۔ انہوں نے کہا کہ ٹریسٹ میں نظریاتی طبیعات کا ایک بین الاقوامی مرکز قائم کرنے سے میری گہری دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں ایک ایسا مستقل ادارہ قائم کرنا چاہتا تھا جہاں ترقی پذیر ممالک کے سائنسدانوں کو تربیت دی جا سکے۔ انہوں نے اپنی تحقیق پر بھی روشنی ڈالی اور بتایا کہ کمزور ایٹمی قوت کے بارے میں میرا نظریہ حتمی طور پر قبول کرنے سے مختلف قوتوں کی ہیت ترکیبی مکمل نہیں ہوتی اور یہ امر حتمی طور پر ثابت کرنے میں کہ وہ ایک ہی قوت ہے جو دنیا کی گردش کا باعث ہے شاید ابھی کچھ وقت لگے گا۔

انہوں نے اپنے پرجوش اور والہانہ استقبال کرنے کے لیے حکومت اور عوام کا شکریہ ادا کیا اور کہا میں حکومت کا اس لیے مشکور ہوں کہ میرا جو استقبال کیا گیا ہے اس سے سائنس کی اہمیت اور حیثیت اجاگر ہوتی ہے اور ممکن ہے کہ مستقبل کی نسلوں کی سائنس کے سلسلہ میں اس سے حوصلہ افزائی ہو۔

گورنر پنجاب کے مشیر تعلیم ڈاکٹر زیڈ۔ اے ہاشمی اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر خیرات ابن رسا نے بھی اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے پاکستان کے پہلے نوبل انعام یافتہ سائنس دان کے کارناموں کی تعریف کی۔

(حریت کراچی 1979-12-24)

پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر خیرات ابن رسا نے بھائی جان کے اعزاز میں ہوٹل انٹر کانٹینٹل میں ظہرانہ دیا جس میں ماہرین تعلیم' دانشوروں اور ہم بھائیوں نے شمولیت کی۔

ظہرانہ کے بعد بھائی جان حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر دعا کرنے کے لیے تشریف لے گئے۔ آپ کی ہدایت پر میں نے وہاں کچھ لوگوں میں رقم تقسیم کی۔ چونکہ حضرت داتا صاحب کے مزار پر جانا ان کے طے شدہ پروگرام کا حصہ نہیں تھا اس لیے پولیس نے اس علاقہ کا سیکورٹی CLEARANCE نہیں کروایا تھا۔ اس لیے ہمارے ہمراہ انسپکٹر پولیس نے وہاں سے فوراً واپس جانے کا مشورہ دیا۔

حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر حاضری دینے کے بعد بھائی جان مال روڈ پر کتابوں کی مشہور دکان فیروز سنز پر تشریف لے گئے اور وہاں سے مختلف موضوعات پر ہزاروں روپے کی کتب کی خریداری کی۔

کتب کی خریداری سے فارغ ہونے کے بعد ہم اپنے بھتیجے چوہدری منیر مسعود کے مکان فرید کوٹ ہاؤس گئے۔ وہاں کثیر تعداد میں ہمارے عزیز و رشتہ دار لاہور' ساہیوال' بصیر پور وغیرہ سے بھائی جان سے ملاقات کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ وقت کی قلت کی وجہ سے اس اجتماعی ملاقات کا انتظام کرنا پڑا تھا۔ چوہدری منیر مسعود نے گھر میں تیار کردہ گاجر کے حلوے سے مہمانوں کی تواضع کی جبکہ بھائی جان کے لیے ان کی من پسند تلی ہوئی مچھلی کا انتظام کیا گیا تھا۔ وہاں تقریباً" دو گھنٹے گذارنے کے بعد ہم واپس سٹیٹ گیسٹ ہاؤس چلے گئے۔

23 دسمبر کو سردار اللہ بخش چیف انجنیر محکمہ انہار نے ایک نجی عشائیہ دیا جس میں ہم سب نے شمولیت کی۔ سردار اللہ بخش جھنگ کے رہنے والے تھے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں بھائی جان کے کلاس فیلو تھے۔

24 دسمبر بروز سوموار روانگی برائے جھنگ

24 دسمبر کی صبح ہم بذریعہ ہیلی کاپٹر جھنگ کے لیے روانہ ہوئے تو لاہور ائیرپورٹ پر گورنر پنجاب کے ملٹری سیکرٹری' وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی' ماہرین تعلیم' دانشوروں' اعلیٰ سول حکام کے علاوہ عزیز و رشتہ داروں نے بھائی جان کو رخصت کیا۔ ائیرپورٹ پر جانے سے قبل بھائی جان نے سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں بزرگ صحافیوں جناب "م ش" اور ثاقب زیروی سے ملاقات کی۔

آمد جھنگ

مگھیانہ میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر کے قریب تیار کردہ ہیلی پیڈ پر جب ہمارا ہیلی کاپٹر اترا تو چیف سیکرٹری حکومت پنجاب' چیرمین یونیورسٹی گرانٹس کمیشن' وائس چانسلر زرعی یونیورسٹی فیصل آباد' کمشنر فیصل آباد' ڈپٹی کمشنر جھنگ' پرنسپل گورنمنٹ کالج جھنگ' جناب شیر افضل جعفری' دوستوں اور رشتہ داروں نے بھائی جان کا فقید المثال استقبال کیا۔ ہیلی پیڈ کے قریب سرکاری ریسٹ ہاؤس میں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد آپ اپنے آبائی شہر جھنگ تشریف لے گئے۔

جھنگ شہر میں آمد پر کثیر تعداد میں اہالیان جھنگ نے اپنے "ہیرو" کا استقبال کیا جو ہمارے سوتیلے ماموں چوہدری بشیر احمد کے مکان کے قریب بھائی جان کی آمد کے منتظر تھے۔ ان لوگوں میں ہمارے ابا جان کے دوست ساتھی بھی تھے جن سے بھائی جان گلے ملتے رہے۔ بھائی جان کے اپنے دوست بھی تھے۔ وہاں تھوڑی دیر ٹھہرنے کے بعد بھائی جان اپنے آبائی مکان دیکھنے کے لیے پیدل روانہ ہوئے۔ جھنگ شہر میں ہمارے دو مکان ہیں ایک آبائی اور دوسرا مکان ابا جان نے تعمیر کروایا تھا۔ رستہ میں جو کوئی بھی بھائی جان سے ملتا آپ اس سے مصافحہ کرتے اور مخصوص جھنگوی لہجے میں "خیر اے ول ہو" کہتے جاتے۔ ہمارے آبائی مکان کے قریب ہماری دایہ کا مکان ہے۔ وہ اگرچہ فوت ہو چکی ہیں لیکن ان کی بیٹی نے اپنی ماں کا کام سنبھالا ہوا ہے۔ بھائی جان وہاں رک گئے۔ ہماری دایہ کی بیٹی جو بھائی جان سے عمر میں بڑی تھیں' نے انہیں پیار کیا اور ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ان کا ماتھا چوما اور بار بار کہتی جاتیں۔ ساڈا "سلام آیا اے۔ شالا خیر ہوسی۔"

وہ بڑا رقت آمیز منظر تھا۔ دونوں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اپنے مکانات کی "یاترا" کرنے کے بعد ہم واپس اپنے ماموں کے مکان پر گئے اور وہاں دوپہر کا کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم ایم۔ بی ہائی سکول گئے۔ یہ بھائی جان کی اولین درسگاہ تھی جس میں تقریباً چھ سال کی عمر میں انہیں چوتھی جماعت میں داخل کیا گیا تھا۔ اس وقت یہ مڈل سکول تھا۔ بھائی جان نے اسی سکول سے مڈل کا امتحان پاس کیا تھا اور وہ ضلع جھنگ میں اول آئے تھے۔ بعد میں اسے ہائی سکول کا درجہ دے دیا گیا۔ بھائی جان نے اس سکول میں سائنس بلاک کی تعمیر کا خرچ اٹھایا تھا۔ سائنس بلاک کو ابا جان کے نام سے موسوم کرتے ہوئے اسے "محمد حسین بلاک" کا نام دیا گیا تھا۔ یہ سکول ہمارے گھر سے قریباً ایک میل دور ہے۔

اپنی پرانی درسگاہ کا دورہ کرنے کے بعد ہم گورنمنٹ ڈگری کالج جھنگ گئے۔ بھائی جان نے اسی کالج سے 1940ء میں میٹرک اور 1942ء میں ایف۔اے کے امتحان پاس کیے تھے۔ آپ ان دونوں امتحانوں میں متحدہ پنجاب کی واحد یونیورسٹی میں اول آئے تھے۔ اس وقت ان کے مقابلے پر مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور سکھ طلباء تھے۔ اس زمانے میں یونیورسٹی میں اول آنا ایک بہت بڑی بات تھی کیونکہ اس پوزیشن

پر ہندوؤں کی اجارہ داری ہوتی تھی۔ بھائی جان نے جب اس کالج سے امتحان پاس کیے تھے تو اس وقت وہ انٹر میڈیٹ کالج کا درجہ رکھتا تھا جسے بعد میں ڈگری کالج کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ یہ کالج جھنگ شہر اور مگھیانہ کے وسط میں ہے اور اس جگہ کو آدھی وال کہتے ہیں۔

بھائی جان جب اپنے پرانے کالج پہنچے تو ڈاکٹر شامی چیرمین یونیورسٹی گرانٹس کیمشن' کالج کے پرنسپل' اساتذہ اور طلباء کے علاوہ اعلیٰ ضلعی حکام نے ان کا پرجوش استقبال کیا۔ بعد میں وہاں ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں کالج کے پرنسپل نے خطبہ استقبالیہ دیتے ہوئے کہا کہ گورنمنٹ کالج کو اس بات پر فخر رہے گا کہ اس کا ہونہار طالب علم دنیائے سائنس کی افق پر ایک چمکتے ہوئے ستارہ کی مانند ابھرا اور وہ ایک سائنس دان کی معراج نوبل انعام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جس کی وجہ سے ان کے کالج' شہر بلکہ پورے ملک کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم ڈاکٹر عبدالسلام پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔

جناب پرنسپل کے خطاب کے بعد بھائی جان نے اپنے خطاب میں کہا کہ آج انہیں اپنی پرانی درسگاہ میں آکر بے حد خوشی ہو رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ وہی درسگاہ ہے جہاں سے انہوں نے 1940ء میں فزکس کا پہلا سبق پڑھا تھا۔ پھر ایک دلچسپ بات بتاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ جب ان کے فزکس کے استاد نے برقی رو پڑھاتے ہوئے یہ بتایا کہ اسے بجلی بھی کہتے ہیں اور اس میں بڑی طاقت ہوتی ہے اور یہ لاہور جیسے بڑے شہروں میں ہوتی ہے تو ہم سب طالب علم یہ بات سن کر بے حد حیران ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ایف اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد جب انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔اے میں داخلہ لیا تو وہاں پہلی مرتبہ انہیں بجلی دیکھنے بلکہ بجلی کے لیمپ کی روشنی میں پڑھائی کرنے کا موقع ملا۔ انہوں نے کہا میٹرک اور ایف۔ اے کے امتحان انہوں نے مٹی کے تیل کے لیمپ کی روشنی میں پڑھ کر پاس کیے تھے۔ لیکن آج طلباء کو جتنی سہولتیں میسر ہیں۔ انہوں نے طلباء کو تلقین کی کہ وہ محنت اور لگن سے کام کریں کیونکہ محنت کے بغیر وہ کامیابیوں کی بلندیوں کو نہیں چھو سکتے۔ انہوں نے کہا کہ ملک کو سائنسدانوں اور انجنیروں کی ضرورت ہے جن کے بغیر ملک خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکتا۔ انہوں نے کہا کہ طلباء اپنے سامنے زندگی کا ایک نصب العین رکھیں اور اسے حاصل کرنے کے لیے دل و جان سے کام کریں۔ انہوں نے طلباء کو یہ بھی نصیحت کی کہ وہ اپنے اساتذہ کا کہا مانیں اور ان کی عزت کریں۔

بھائی جان کے خطاب سے پہلے جھنگ کے مشہور شاعر جناب شیر افضل جعفری نے بھائی جان کو نوبل انعام ملنے پر اپنا کلام "چنہاں دا چن" سنایا۔

تقاریر کے بعد بھائی جان کے اعزاز میں عصرانہ دیا گیا جس کے دوران آپ حاضرین میں گھل مل گئے۔

اس تقریب کے اختتام کے بعد آپ سرکاری ریسٹ ہاؤس مگھیانہ تشریف لے گئے۔ وہاں آپ نے اپنے مداحوں اور دوستوں سے ملاقات کی جس کے بعد ہم سب تریموں ہیڈ گئے وہاں محکمہ انہار کے

ریسٹ ہاؤس میں ہمارے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ رات کا کھانا کینال ریسٹ ہاؤس میں تناول کیا گیا جس میں دریا چناب سے پکڑی ہوئی تازہ مچھلی تل کر بھائی جان کو پیش کی گئی۔

25 دسمبر بروز منگل جھنگ سے سرگودھا کے لیے روانگی

جھنگ کا دورہ ختم کرنے کے بعد ہم ربوہ جانے کے لیے ہیلی کاپٹر سے سرگودھا کے لیے روانہ ہوئے۔ ہیلی پیڈ پر ڈاکٹر شامی چیرمین یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، پرنسپل گورنمنٹ کالج جھنگ، ڈپٹی کمشنر، اعلیٰ سرکاری حکام دوستوں اور رشتہ داروں نے بھائی جان کو رخصت کیا۔

آمد ربوہ

سرگودھا سے بذریعہ کار ہم ربوہ پہنچے تو ایک مرتبہ پھر بھائی جان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ ربوہ کا یہ نجی دورہ تھا جو وہاں جماعت احمدیہ کے 87 ویں جلسہ سالانہ میں شمولیت کے لیے اختیار کیا گیا تھا۔

26 دسمبر بروز بدھ

آج صبح حضرت مرزا ناصر احمد صاحب جماعت احمدیہ کے تیسرے امام نے جماعت احمدیہ کے جلسہ سالانہ کا افتتاح فرمایا جس کے بعد جلسہ کی باقاعدہ کاروائی شروع ہوئی جو شام تک جاری رہی۔ درمیان میں کھانے اور عبادات بجالانے کے لیے وقفہ ہوا۔ جلسہ کی کاروائی کے دوران بھائی جان جلسہ گاہ میں سٹیج پر تشریف فرما رہے۔

شام کو گیسٹ ہاؤس میں آپ سے ملاقات کرنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔

27 دسمبر بروز جمعرات

آج ظہر و عصر کی عبادت کے بعد جب جلسہ سالانہ کی کاروائی شروع ہوئی تو بھائی جان نے ڈیڑھ لاکھ سے زائد احباب سے مختصر خطاب فرمایا۔ انہیں یہ اعزاز حاصل ہوا کہ امام جماعت احمدیہ حضرت مرزا ناصر احمد صاحب نے اپنے خطاب کے دوران بھائی جان کو سٹیج پر بلا کر انہیں احباب جماعت سے خطاب کرنے کا موقع دیا۔ تفصیلات اخبار الفضل مورخہ 31 دسمبر 1979ء سے:

"حضور (اللہ ان کی مدد فرمائے) نے اپنی تقریر کے دوران بتایا کہ آئن سٹائن بہت بڑا سائنسدان تھا۔ اس نے ایک مسئلہ پر کام کیا مگر ناکام رہا۔ اسی تھیوری پر ڈاکٹر عبدالسلام نے کام کیا وہ کامیاب ہوئے اور نوبل انعام حاصل کر کے دنیا کے چوٹی کے سائنسدانوں میں پہنچ گئے اس کے بعد حضور نے فرمایا۔

"ڈاکٹر عبدالسلام آ جائیں"

اس اعلان کے ساتھ جلسہ گاہ میں بیٹھے ہوئے ہزاروں احباب ڈاکٹر عبدالسلام کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے دیوانہ وار نعرہ ہائے تکبیر بلند کرنے شروع کر دیئے اور رومانی کیف و مستی کا ایک عجیب روح پرور سماں پیدا ہو گیا۔

محترم ڈاکٹر عبدالسلام جنہوں نے شیروانی' پگڑی اور شلوار پہن رکھی تھی' سٹیج کے پچھلے حصے سے اٹھ کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور سے مصافحہ کی سعادت حاصل کی اور حضور کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ اس کے بعد حضور کرسی پر تشریف فرما ہو گئے اور ڈاکٹر سلام صاحب نے مختصراً احباب سے خطاب کرنا شروع کیا۔ ڈاکٹر صاحب مائیک پر آئے تو اس وقت بھی احباب جماعت کھڑے دیوانہ وار نعرے بلند کر رہے تھے چنانچہ ڈاکٹر صاحب کو کافی دیر خاموش رہنا پڑا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم پڑھا اور سیدنا حضرت امام الثالث اور احباب جماعت کو مخاطب کر کے اسلام علیکم کہا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے مختصر سے خطاب میں کہا۔

"آج سے تقریباً پندرہ سال پیشتر حضرت والد صاحب. مرحوم جن کی مغفرت کے لیے دعا کی' درخواست کرتا ہوں۔ انہوں نے اپنی ڈائری میں مندرجہ ذیل سطور رقم فرمائی تھیں۔

"حضرت مرزا بشیر احمد صاحب ایم۔ اے مرحوم نے بندہ کو بمقام لندن ایک خط لکھا جس میں درج تھا کہ "میں آپ کے عزیز فرزند کے متعلق دور افق میں حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کی پیشگوئی کو پورا ہوتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ الفاظ پیشگوئی ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

> میرے فرقے کے لوگ اس قدر علم و معرفت میں کمال حاصل کریں گے کہ اپنی سچائی کے نور اور اپنے دلائل اور نشانوں کی رو سے سب کا منہ بند کر دیں گے۔ سو اے سننے والو! ان باتوں کو یاد رکھو اور ان پیش خبریوں کو اپنے صندوقوں میں محفوظ رکھ لو کہ یہ خدا کا کلام ہے جو ایک دن پورا ہو گا۔"

(تجلیات الہیہ ص 17۔ 18)

میں اس پاک ذات کی حمد و ستائش سے لبریز ہوں کہ اس نے امام وقت کی میرے والدین کی اور جماعت کے دوستوں کی مسلسل اور متواتر دعاؤں کو شرف قبولیت سے نوازا اور عالم اسلام اور پاکستان کے لیے خوشی کا سامان پیدا کیا (یہ کہنے کے ساتھ ہی محترم ڈاکٹر صاحب موصوف نے بڑے پرجوش انداز میں پاکستان زندہ باد کا نعرہ بلند کیا جس پر وسیع و عریض جلسہ گاہ اور اس کا پورا ماحول پاکستان زندہ باد کے پرجوش نعروں سے گونج اٹھا جب نعروں کا سلسلہ تھما تو ڈاکٹر صاحب موصوف نے خطاب جاری رکھتے ہوئے مزید فرمایا۔

قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے جسمانی اور روحانی اولاد کے لیے دعا فرمائی تھی "اے خدا تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کردے۔" پچھلے چند ہفتوں میں اس قسم کی محبت کا اظہار جناب صدر پاکستان اور ساری قوم کی جانب سے ہوا ہے۔ جس کے لیے میں ان کا تہ دل سے شکر گزار ہوں اور آپ کی مزید دعاؤں کا بھوکا ہوں۔ سب کی سب عزت اللہ کے لیے ہے۔ واسلام علیکم۔

اس پر ڈاکٹر صاحب موصوف اپنی نشست پر واپس تشریف لے گئے۔ بعدازاں حضور دوبارہ مائیک پر تشریف لائے اور فرمایا کہ اللہ تعالی ڈاکٹر سلام کو ان کا اعزاز مبارک کرے۔ نیز فرمایا کہ اس خوشی کے موقعہ پر مندرجہ ذیل نعرے لگائے جانے چاہیے۔ حضور ایک ایک نعرہ بلند کرتے جاتے تھے اور احباب بھی اس نعرہ کو پورے جذبہ و جوش سے دہراتے جاتے تھے۔ نعروں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے حضور نے فرمایا۔

سب سے پہلا گھر خدا کا ہے اس لیے سب سے پہلا نعرہ خانہ کعبہ زندہ باد۔ اس کے بعد چونکہ خانہ کعبہ کے پیار میں مست رہنے والے ایک پاکستانی نے یہ انعام حاصل کیا ہے اس لیے دوسرا نعرہ یہ ہو کہ پاکستان زندہ باد اس کے بعد چونکہ حضرت محمد ﷺ کے فیضان کے نتیجہ میں آپ کی طرف منسوب ہونے کی برکت سے یہ اعزاز ملا اس لیے تیسرا نعرہ حضرت محمد ﷺ زندہ باد اور حضرت محمد ﷺ سے انتہائی عشق کرنے والے اس زمانہ میں اور اس دنیا میں آپ کے فیوض کو تقسیم کرنے والے حضرت بانی سلسلہ احمدیہ میں اس لیے چوتھا نعرہ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ زندہ باد اور اس پہلو کے لحاظ سے کہ ہم کو ایک ایسی تعلیم دی گئی کہ جس پر عمل کرنے سے انسانی دماغ ظلمات کو مٹا کر نور حاصل کرنے والا بن سکتا ہے۔ اس لیے پانچواں نعرہ اسلام زندہ باد اور سب سے بڑھ کر بنیادی نعرہ اس اللہ کے لیے جو حاکم مطلق ہے جو خالق و مالک کل ہے۔ اسلیے زور دار نعرہ لگاؤ اللہ اکبر۔ اس کے ساتھ ہی جلسہ گاہ میں اللہ اکبر کا ایسا زبردست نعرہ گونجا کہ میلوں تک زمین اس کی دھمک سے گونج اٹھی۔ حضور نے اس کے بعد عجیب جوش و مستی کے عالم میں پوری آواز سے مائیک پر دوبارہ نعرہ لگایا اللہ اکبر اس کے ساتھ احباب کرام نے دیوانہ وار جواب دیا۔ اللہ اکبر۔ حضور کے مقدس چہرہ پر اس وقت ایک آسمانی نور چمک رہا تھا۔ حضور وارفتگی اور محبت الہی کے زبردست جوش کے ساتھ بار بار اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے رہے۔ حضور نے پانچ دفعہ یہ نعرہ بلند کیا اور پانچوں دفعہ احباب جماعت نے زبردست جوش اور دیوانگی کے ساتھ حضور کے اللہ اکبر کے نعرے کا جواب اللہ اکبر کے نعرہ سے دیا اور روحانی جذب و مستی اور کیف و سرور کی یہ فضا تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لیے جگمگانے کے لیے نقش ہو گئی۔

الھلم صل علی محمد و علی ال محمد

شام پانچ بجے کے قریب جلسہ کی کاروائی اختتام پذیر ہوئی جس کے بعد بھائی جان گیسٹ ہاؤس تشریف لے گئے۔ وہاں گذشتہ روز کی طرح جماعت احمدیہ کے بزرگوں' طلباء اور دوسری سرکردہ شخصیات نے رات گئے تک ان سے ملاقات کی۔

28 دسمبر بروز جمعہ

آج جلسہ کا آخری روز تھا۔ حسب معمول آج بھی بھائی جان نے تمام دن جلسہ کی کاروائی سنی۔ مغرب سے کچھ دیر پہلے جب جلسہ کی کاروائی ختم ہوئی تو آپ گیسٹ ہاؤس واپس تشریف لے گئے۔

لاہور کے لیے روانگی

پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہمیں 29 دسمبر کی صبح کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے سرگودھا سے لاہور کے لیے سفر کرنا تھا لیکن اس روز ہیلی کاپٹر دستیاب نہ ہونے کے باعث ہم جلسہ کی اختتامی کاروائی کے کچھ دیر بعد ہی بذریعہ کار لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ کاروں کا انتظام ڈپٹی کمشنر سرگودھا نے کیا تھا چونکہ یہ رات کا سفر تھا اس لیے حفاظت کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت امام احمدیہ نے جماعت احمدیہ کے نوجوانوں کی تنظیم مجلس خدام الاحمدیہ کے صدر صاحب کو ارشاد فرمایا کہ چند نوجوانوں کو ہمارے قافلہ کے ہمراہ لاہور بھیجا جائے۔ بھائی جان کو ربوہ سے نہایت گرم جوشی سے رخصت کیا گیا۔ ہمارا قافلہ رات 9 بجے کے قریب لاہور پہنچا۔ لاہور میں سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد ہم پی آئی اے کے جہاز سے کراچی کے لیے روانہ ہو گئے۔

29 دسمبر بروز ہفتہ

ہمارا ہوائی جہاز نصف شب (28 اور 29 دسمبر کی درمیانی رات) کو جب کراچی کے ہوائی اڈے پر پہنچا تو پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن' وزارت خارجہ کے نمائندوں اور کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے بھائی جان کا استقبال کیا۔

کراچی آمد کے بعد روزنامہ ڈان کے نمائندہ کو انٹرویو

اگر ٹریسٹ کے اڑھائی لاکھ شہری سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی و فروغ کے لیے بیس لاکھ ڈالر دے سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ کراچی جس کی آبادی ساٹھ لاکھ سے زیادہ ہے باآسانی اڑتالیس لاکھ روپے اس مقصد کے لیے دے سکیں۔ اس سال فزکس میں نوبل انعام حاصل کرنے والے ڈاکٹر عبدالسلام نے جو آج نصف شب کے بعد اپنے افراد خاندان کے ہمراہ لاہور سے کراچی پہنچے تو انہوں نے یہ بات روزنامہ ڈان سے ایک خصوصی انٹرویو دیتے ہوئے کہی۔ انہوں نے کہا کہ کراچی ایک امیر ترین شہر ہے۔ اس کے لیے

اس کے باشندوں کے لیے یہ سب سے بڑی ذمہ داری ہے کہ علاوہ ازیں دوسری باتوں کے لیے جدوجہد کرنے کے لیے انہیں سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے فنڈ جمع کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر سلام نے کہا کہ ہر بات کے لیے حکومت کو پریشان نہیں کرنا چاہیے۔ سوائے اس بات کے کہ وہ اس کام کے لیے صحیح سمت متعین کرے۔ جیسا کہ صدر ضیاء الحق نے ملک میں پہلی بار ایسا کرنے کا اعادہ کیا ہے تاہم تعلیم کے فروغ کے لیے عوام پر بھی اتنی ہی ذمہ داری ہے جتنی کہ حکومت پر ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے کہا کہ نوبل انعام میں ملنے والی رقم جو ساٹھ ہزار ڈالر ہے انہوں نے اپنے وطن جھنگ شہر کے نویں جماعت سے بی۔ ایس۔ سی کے ذہین طلباء کو وظائف دینے کے لیے وقف کر دی ہے۔ اس رقم سے قائم کردہ ٹرسٹ سے ساٹھ ہزار روپے سالانہ طلباء کو دیئے جائیں گے۔ (یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ایٹم برائے امن کے سلسلے میں اعلیٰ کارکردگی پر انہیں جو اسی ہزار ڈالر بطور انعام ملے تھے انہوں نے اس رقم سے بھی ایک ٹرسٹ پہلے ہی قائم کر رکھا ہے جس سے ریسرچ کرنے اور پی۔ ایچ۔ ڈی حاصل کرنے والوں کو وظائف دیئے جاتے ہیں) ڈاکٹر سلام نے کہا کہ کراچی کے عوام کے پاس بے پناہ دولت ہے۔ انہیں سماجی اور اقتصادی بہبود کے لیے کچھ نہ کچھ رقم ضرور خرچ کرنا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ ”ملک کے دوسرے حصوں کی نسبت کراچی میں جو دولت ہے اسے دیکھ کر مجھے انتہائی حیرت ہوتی ہے۔“

ڈاکٹر عبدالسلام جو ٹریسٹ میں اقوام متحدہ کی طرف سے قائم کردہ انٹرنیشنل سنٹر برائے تھیوریٹکل فزکس کے بانی ڈائریکٹر ہیں اور امپریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی لندن میں تھیوریٹکل فزکس کے پروفیسر بھی ہیں نے بتایا کہ وظائف حاصل کرنے اور ان سے فائدہ حاصل کرنے میں پاکستانی ترقی پذیر ممالک سے بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ (ڈاکٹر عبدالسلام حکومت پاکستان کے سائنسی مشیر اعلیٰ تھے 1974ء میں جب وزیراعظم بھٹو کی حکومت نے جماعت احمدیہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا تھا تو انہوں نے اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا تھا جس کے فوراً بعد بھٹو صاحب نے سائنسدانوں اور سائنس کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بیرون ملک جانے والوں پر پابندی عائد کر دی تھی) ڈاکٹر سلام نے کہا کہ صدر پاکستان نے مجھے یقین دہانی کرائی ہے کہ اب ایسا نہیں ہو گا۔ انہوں نے کہا کہ صدر پاکستان نے مجھ سے کہا ہے کہ میں پاکستانی طلباء کے لیے وظائف کی کوشش کر کے ان کی تعداد زیادہ کراؤں۔ انہوں نے کہا کہ ان کے خیال میں صدر صاحب اس معاملہ میں کافی سنجیدہ ہیں اور میں اس بات پر ان کی تعریف کرتا ہوں۔ انہوں نے بتایا کہ پچھلی حکومت کی غلط پالیسی سے بہت سے وظائف ضائع ہو گئے۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے بتایا کہ صدر پاکستان نے ان کی اس تجویز جو انہوں نے بہت پہلے دی تھی کہ قومی ترقیاتی کاموں میں سائنسدانوں کو بھی شامل کرنا چاہیے کو منظور کر لیا ہے۔ اب صدر صاحب کی ہدایت پر ان تمام امور میں سائنسدانوں سے مشورہ لینا ضروری قرار دیا گیا ہے۔

سائنسی پالیسی

ڈاکٹر عبدالسلام نے کہا کہ صدر صاحب کی نئی سائنس پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے قوم کو اس میں شرکت کرنا چاہیے۔ للذا مالیاتی اور دوسرے اداروں کے ساتھ محاذ آرائی کرنے کی بجائے ہمیں مل جل کر ملکی بہبود کے لیے کام کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر سلام نے صدر ضیاء الحق کے ان چار نکات کی تعریف کی۔ خاص طور پر اس بات کی کہ آئندہ ملکی ترقیاتی امور پر سائنسدانوں سے مشورے لازمی لیے جائیں گے اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے ملک کے بجٹ سے ایک فیصد خرچ کیا جائے گا۔ جب ڈاکٹر سلام کی توجہ اس طرف مبذول کرائی گئی کہ وہ تو ہمیشہ سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے قومی بجٹ کا دو فیصد خرچ کرنے کے لیے کہتے رہے ہیں اب انہوں نے اس مد میں صرف ایک فیصد خرچ کرنے کے لیے حکومت کی تجویز سے کیوں اتفاق کر لیا ہے۔ اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر سلام نے کہا "اس کام کو کرنے کے لیے ہمیں کہیں نہ کہیں سے ابتداء تو کرنی ہے۔ ملک کی تاریخ میں ایسا پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ سائنس کے فروغ کے لیے بجٹ کا ایک فیصد خرچ کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ بعد میں ہم اس میں مزید ایک فیصد اضافہ کرنے کے لیے تقاضا کریں گے۔"

(ڈان کراچی 1980-1-2)

انٹرویو کے بعد بھائی جان سٹیٹ گیسٹ ہاؤس "قصرناز" تشریف لے گئے جہاں ان کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔

29 دسمبر بروز ہفتہ

چونکہ آج دوسری کوئی مصروفیات نہیں تھیں اس لیے آپ نے دوپہر کے کھانے تک گیسٹ ہاؤس میں آرام فرمایا۔

بعد از دوپہر آپ اپنے چھوٹے بھائی چوہدری محمد عبدالماجد کے گھر تشریف لے گئے اور وہاں اپنے قریبی رشتہ داروں سے ملاقات کی اور ان کے ہمراہ چائے پی۔ وہاں چند گھنٹے گذارنے کے بعد آپ گیسٹ ہاؤس میں واپس چلے گئے۔

شام کے وقت آپ نے کچھ دانشوروں سے ملاقات کی۔

30 دسمبر بروز اتوار

آج صبح 9 بجے بھائی جان حیدر آباد جانے کے لیے بذریعہ کار روانہ ہوئے۔ حیدر آباد میں سندھ یونیورسٹی، مہران انجنیرنگ یونیورسٹی اور سندھ زرعی یونیورسٹی کے وائس چانسلروں کے علاوہ کمشنر حیدر آباد و دیگر سول اعلیٰ حکام نے ان کا استقبال کیا۔

حیدر آباد میں اپنی آمد کے تھوڑی دیر بعد بھائی جان نے سندھ یونیورسٹی سینٹ ہال اولڈ کیمپس میں سندھ کی تینوں یونیورسٹیوں کے ماہرین تعلیم' دانشوروں اور طلباء کے مشترکہ اجلاس کو خطاب کیا۔ انہوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ آج پاکستان کو درپیش مسائل کو سائنٹیفک طریقوں سے حل کرنا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ آج کے دور میں سب سے بڑا مسئلہ سیم و تھور کے علاوہ وسائل کی قلت ہے تاہم ان مسائل کو ہم سائنٹیفک طریقوں سے حل کر سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ سب ہمارے مقامی مسائل ہیں جنہیں حل کرنے کے لیے ہمیں بین الاقوامی سطح پر مدد کی ضرورت نہیں ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے کہا کہ مسلمان سائنسدان گیارہوں ہجری تک اپنے سائنسی انکشافات اور ریسرچ سے دنیا کی راہنمائی کرتے رہے لیکن ان کے بعد آنے والوں نے اس کام میں دلچسپی نہ لی۔ اس عدم توجہی کی وجہ سے مسلمان اس میدان میں اپنا وقار کھو بیٹھے حالانکہ قرآن حکیم میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے کہ ہم انہیں ہی انعامات سے نوازتے ہیں جو ان کے لیے جستجو کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ قرآن حکیم بنی نوع انسان کے لیے بہترین ہدایت پیش کرتا ہے اور اس کی تعلیم سائنسی ایجادات اور ریسرچ کے لیے راہنمائی کرتی ہے۔ اس لیے یہ ہمارے لیے از حد ضروری ہے کہ ہم اپنی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے ریسرچ اور سائنس کی ترقی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے دوسری اقوام عالم کے شانہ بشانہ چلنے کی کوشش کریں۔ انہوں نے واشگاف الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ پاکستان کی ترقی کا راز سائنس کی ارتقاء اور نشوونما میں مضمر ہے۔ انہوں نے کہا کہ ماضی میں مساجد نے کاروان زندگی میں ہمیشہ ایک اہم کردار ادا کیا ہے اور آئندہ بھی کرتی رہیں گی۔ اس لیے ان کی رائے میں جہاں مساجد میں مدرسے قائم کیے جائیں وہاں ان کے ساتھ ساتھ ٹیکنیکل علوم کی تدریس کے لیے بھی انتظام کرنا چاہیے اور اس کے علاوہ ہر مسجد سے ملحقہ ایک ہسپتال بھی بنانا چاہیے۔

ڈاکٹر عبدالسلام کے خطاب سے پہلے پروفیسر شیخ ایاز وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی نے خطبہ استقبالیہ دیا۔ بعد میں سندھ سائنس سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر محمد شریف میمن نے ڈاکٹر عبدالسلام کی خدمت میں کتابوں کا تحفہ پیش کیا۔

(ڈان کراچی 1980-1-2)

30 دسمبر کو گورنر سندھ لفٹیننٹ جنرل ایس۔ ایم عباسی نے بھائی جان کے اعزاز میں گورنر ہاؤس میں عشائیہ دیا جس میں چیف سیکرٹری سندھ' کراچی یونیورسٹی و این۔ای۔ڈی انجینئرنگ یونیورسٹی کے وائس چانسلروں' ماہرین تعلیم' دانشوروں' اعلیٰ سرکاری افسران اور ہم بھائیوں نے بھی شرکت کی۔

(ڈان کراچی 1979-12-31)

31 دسمبر بروز سوموار

آج صبح بھائی جان نے کراچی یونیورسٹی کا دورہ کیا۔ جب آپ یونیورسٹی پہنچے تو ڈاکٹر معصوم علی ترمذی وائس چانسلر، پروفیسروں اور طلباء نے ان کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔
اس شاندار استقبال کے بعد بھائی جان نے شعبہ فزکس کے آڈیٹوریم میں طلباء اور اساتذہ کے ایک بہت بڑے اجتماع سے خطاب کیا۔ انہوں نے اپنے خطاب میں پاکستانی طلباء سے کہا کہ وہ تجربات پر زیادہ توجہ دیں کیونکہ یہ تجربات ہی سائنس کا سب سے اہم حصہ میں، انہوں نے ترقی پذیر ممالک میں سائنسی تجربات کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کراچی کے مخیر حضرات سے اپیل کی کہ وہ ملکی ترقی اور سائنسی میدان میں نئی منزلوں کے حصول کے لیے کراچی یونیورسٹی جیسے ادارے کی دل کھول کر امداد کریں۔
انہوں نے کہا کہ ہرچند انہوں نے فزکس کی تھیوری ہی میں نوبل انعام حاصل کیا ہے لیکن وہ سائنس میں تجرباتی پہلو کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ انہوں نے "نظریہ واحدانیت" کے تاریخی پس منظر کے ساتھ اپنے اس تحقیقی کام کی انتہائی سادہ الفاظ میں وضاحت کی جس پر انہیں نوبل انعام دیا گیا۔ انہوں نے ممتاز سائنسدانوں مثلاً البیرونی اور ابن الہیثم کے شاندار کاموں کا حوالہ دیا جنہوں نے کرہ ارض کے قوانین کے بارے میں سوچا اور ان کا اللہ کی واحدانیت سے رابطہ قائم کیا۔ انہوں نے کہا کہ تیرھویں صدی میں جب مسلمانوں میں تحقیقی کاموں کی رفتار سست پڑنے لگی تو اس میدان میں یورپی سبقت حاصل کرنے لگے۔
انہوں نے ممتاز یورپی سائنسدانوں گلیلیو، نیوٹن اور آئن سٹائن کے کارناموں کا حوالہ دیا جو انہوں نے طبیعات کو آگے بڑھانے کے لیے سرانجام دیئے۔ انہوں نے یقین ظاہر کیا کہ آخر کار سائنسدان "فورسز آف نیچر" کو واحدانیت میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ اب تک وہ یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ کمزور نیوکلیر فورسز وہی ہیں جو الیکٹرو منگنیٹزم ہے اور اب ہم یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ قومی ذراتی قوت کا اصل سرچشمہ بھی وہی ہے جب یہ ثابت ہو جائے گا تو صرف بڑی قوتیں ایسی رہ جائیں گی جن کو ایک کرنا ہو گا۔ اور یہ ہو گیا تو البرٹ آئن سٹائن کے تصور کے مطابق نظریہ واحدانیت آخری طور پر ثابت ہو جائے گا۔ انہوں نے یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے تحقیقی مراکز میں کیے جانے والے تحقیقی کام کی تفصیلات بتائیں اور بتایا کہ بعض مراکز کا بجٹ دو ارب ڈالر سالانہ تک ہوتا ہے جو درحقیقت پاکستان کے سالانہ بجٹ سے بھی کئی گناہ زیادہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ کراچی کے مخیر لوگ کراچی یونیورسٹی جیسے ادارہ کو دل کھول کر عطیات دیں۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت مجھے اپنی سماعت پر شبہ ہونے لگا جب مجھے بتایا گیا کہ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ طبیعات کا بجٹ دس ہزار روپے ہے۔ انہوں نے کہا کہ اتنے کم فنڈ سے کوئی بھی قابل ذکر کام نہیں کیا جا سکتا۔ کراچی ایک بڑا شہر ہے جس کی آبادی ساٹھ لاکھ سے زیادہ ہے۔ (یہ اندازہ 1979 کا ہے) یہ شہر ایک ایسی یونیورسٹی کا یقیناً" متحمل ہو

سکتا ہے جس میں بہترین آلات ہوں اور اچھا تحقیقی کام کرنے کے مواقع ہوں۔ اللہ نے ہمیں اچھے ذہن' دماغ اور صلاحیتیں دی ہیں۔ اگر ان کو کام کرنے کا موقع ملے تو یہ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ سائنسدان جتنی تحقیق کرتا ہے۔ اتنا ہی اس کا نہ صرف کارخانہ قدرت کی قوتوں پر ایمان بڑھتا ہے بلکہ خدا پر اس کا عقیدہ مزید پختہ ہوتا ہے۔"

بھائی جان کے خطاب سے پہلے ڈاکٹر ترمذی وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی نے سپاسنامہ پیش کیا اور انہیں فزکس سوسائٹی کا نشان پیش کیا۔ بعد ازاں بھائی جان نے شعبہ طبیعات کی تجربہ گاہ کا معائنہ کیا۔

ظہرانہ

بعد میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے بھائی جان کے اعزاز میں یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں لنچ دیا جس میں پروفیسروں اور چند طلباء نے شرکت کی۔

کھانے کے بعد بھائی جان نے اخبار نویسوں سے غیر رسمی گفتگو کرتے ہوئے اپنے اس تحقیقی کام کے بارے میں بتایا جس پر انہیں نوبل انعام دیا گیا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ ان کے نظریئے کے مطابق قدرت کی تمام موثر قوتیں نظریہ واحدانیت کے تحت متحد ہو جائیں تو اس سے عالم انسانیت کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ بھائی جان نے جواب دیا کہ "جب 1937ء میں ایٹمی قوت دریافت ہوئی تھی تو اس کے موجد نے بھی یہی کہا تھا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا لیکن پانچ سال بعد دنیا نے اس کا فائدہ دیکھ لیا۔ آج اس تھیوری کے بارے میں یہی جواب ہے کہ کوئی فائدہ نہیں ہو گا لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اس کی افادیت عالم انسانیت محسوس کرے گی۔ انہوں نے اشارتاً کہا کہ آج زندگی کے وجود میں آنے کے اصول میں قدرت کی تمام قوتوں کے یکجا ہونے کے بعد ان اصولوں کی روشنی میں کرہ ارض پر حیات کے اصولوں کا نئے سروں سے جائزہ لیا جائے گا۔

(جنگ کراچی 1980-1-1)

31 دسمبر پریس رپورٹ

آج سہ پہر پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ڈاکٹر عبدالسلام کو ایسوسی ایشن کی تاحیات اعزازی رکنیت دینے کے سلسلہ میں ایک تقریب منعقد کی گئی۔ ایسوی ایشن کے صدر ڈاکٹر بدر صدیقی نے مہمان خصوصی کو سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر عبدالسلام کو نوبل انعام ملنے کے بعد ہمارے ملک کی شہرت دوبالا ہوئی ہے اور اس سے ہماری مروجہ منصوبہ بندی کی سوچ کے لیے نئی راہیں کھولی ہیں۔ ڈاکٹر بدر صدیقی نے سپانامہ پیش کرنے کے بعد ڈاکٹر عبدالسلام کو پاکستان میڈیکل ایسوی ایشن کی تاحیات اعزازی رکنیت کے کاغذات اور پی۔ ایم۔ اے کا نشان دیا۔

سپاسنامہ کے بعد ڈاکٹر عبدالسلام نے ڈاکٹروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ علم طبیعات کی تخلیق تمام انسانیت کا مشترکہ ورثہ ہے۔ مشرق و مغرب' شمال و جنوب یکساں طور پر اس ورثہ کے حق دار ہیں۔ انہوں نے کہا کہ قرآن حکیم میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے۔

"تو رحمن (خدا) کی پیدائش میں کوئی رخنہ نہیں دیکھتا اور تو اپنی آنکھ کو (ادھر ادھر) پھیر کر اچھی طرح سے دیکھ لے کیا تجھے (خدا کی) مخلوق میں کسی جگہ بھی کوئی رخنہ نظر آتا ہے پھر بار بار اپنی نظر کو چکر دے وہ آخر تیری طرف ناکام ہو کر لوٹ آئے گی اور وہ تھکی ہوئی ہو گی (اور کوئی رخنہ نظر نہیں آئے گا)

(سورہ الملک)

یہی تمام ماہرین طبیعات کا ایمان ہے ہم جتنی گہری جستجو کرتے ہیں اتنا ہی ہمارا تحیر بڑھتا ہے۔ اتنی ہی ہماری نگاہیں خیرہ ہوتی جاتی ہیں۔ یہ میں ان سے کہہ رہا ہوں جو تیسری دنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ مواقع اور وسائل کے فقدان کے سبب سائنسی ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے کہا کہ تاریخ انسانیت کی طرح سائنس کے ارتقاء نے بھی گردش ایام دیکھے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ الجابر' الخوارزمی' الرازی' الوف' البرونی' ابن سنیا' ابن الہشم' عمر خیام' ابن رشد موسی بن المامون' طوسی اور علی ابن النفیس' عرب' ترک' افغان اور فارسی تھے اور یہ سب مسلمان تھے۔ انہوں نے طب' جراحت' ریاضیات' فلسفہ' علم' فلکیات' جغرافیہ وغیرہ علوم میں تحقیقی و تخلیقی کام کیے جنہیں شائع کر کے انہوں نے دنیا کو ان علوم سے روشناس کرایا۔ علی ابن النفیس نے خون کے پلمونری گردش (PULMONARY CIRCULATION) کا ایک صاف اور واضح نظریہ پیش کیا۔ گیارہویں صدی کے آخر میں کریمونا کے جیراڈ اور راجر بیکن نے ان مسلمان سائنسدانوں کی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کر کے ان علوم کو پہلی مرتبہ مغرب میں پھیلایا۔

1350ء کے بعد سائنس کی ترقی میں کمی آنا شروع ہو گئی تاہم کبھی کبھی اس کی جھلک نظر آتی رہی۔ مثال کے طور پر 1437ء میں امیر تیمور کے پوتے الوغ بیگ کے دربار میں (سمرقند میں) اور پھر محمد شاہ کے دربار سے منسلک جے سنگھ مہاراجہ جے پور نے سورج اور چاند گرہن کی قوسین کے بارے میں مغربی دنیا کے تیار کردہ چارٹوں میں چھ منٹ کی غلطی نکال کر اپنی تحقیق شائع کی۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے سائنس کی ترقی اور تنزل کا مختصر طور پر پس منظر بیان کرنے کے بعد کہا کہ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے یہ کچھ کیوں اور کیسے کھو دیا۔ انہوں نے کہا کہ اس بات کا کوئی بھی صحیح جواب نہیں دیا جا سکتا۔ ممکن ہے منگولوں کے حملوں کی وجہ سے سائنس کی ترقی رک گئی ہو لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض بہت ہی گہری داخلی اور اندرونی سازشوں سے ایسا ہوا ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے پاکستان میڈیکل ایسوی ایشن پر زور دیتے ہوئے کہا کہ وہ ایک ٹیلنٹ فنڈ (TALENT FUND) قائم کرے جس سے نوجوان ڈاکٹروں اور سرجنوں کی تحقیقی کاموں کے سلسلے میں مدد کی جاسکے۔ انہوں نے کہا کہ یہ فنڈ ایک کروڑ روپے سے قائم کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ سائنس کے میدان میں باصلاحیت لوگوں کی ہمت افزائی اور ان کو آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کرنے کی تمام تر ذمہ داری صرف حکومت پر نہیں چھوڑی جاسکتی۔ بلکہ پی۔ایم۔اے کے اراکین جو پیشہ ور ڈاکٹر ہیں' فنڈ اکٹھا کر سکتے ہیں۔ اس فنڈ کے قیام کو وہ اپنے لیے اعزازی تاحیات رکنیت سے زیادہ بڑا اعزاز سمجھیں گے۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے بتایا کہ انہوں نے اپنے ایٹم برائے امن انعام اور نوبل انعام کے ایک لاکھ چالیس ہزار ڈالر تعلیم کی فروغ کے لیے وقف کر دیئے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے کہا کہ بنیادی طور پر یہ ترقی پذیر ممالک کے لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ اپنے باصلاحیت ہم وطنوں کو سائنس کے مختلف میدانوں میں امداد فراہم کریں۔ انہوں نے سوال کیا کہ ترقی یافتہ ممالک سے ترقی پذیر ممالک کی امداد کے لیے کیوں کہا جائے اور وہ مدد کیوں کریں؟ انہوں نے کہا پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک میں اصل افلاس جذبے کا ہے اگر ہم اس افلاس پر قابو پانے میں کامیاب ہو جائیں جس کے لیے معاشرے کے نسبتاً" خوش حال طبقے کو قربایاں دینی پڑیں گی تو ہم بھی اپنے باصلاحیت افراد کے لیے سائنس کے مختلف شعبوں میں تحقیق کی سہولتیں فراہم کر سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کراچی جیسے شہر میں فنڈ قائم کر کے پورے ملک کے لیے ایک مثال قائم کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنے خطاب میں کہا اسلام میں سائنس کا علم حاصل کرنا تقریباً" ایک مذہبی فریضہ ہے۔ انہوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ ترقی پذیر ممالک اب سائنس کے میدانوں میں تحقیقی کاموں پر خاطر خواہ توجہ دے رہے ہیں اور ان کے متعدد سائنس دانوں نے نوبل انعام حاصل کیے ہیں۔ انہوں نے توقع ظاہر کی کہ میڈیسن میں اگلا نوبل انعام پاکستان حاصل کرے گا۔

ڈاکٹر عبدالسلام کے خطاب کے بعد مہمانوں کی چائے سے تواضع کی گئی۔ اس دوران وہ مہمانوں میں گھل مل گئے۔

(جنگ' حریت' ڈان 1980-1-1)

حاضرین کو نوبل انعام میڈل دکھایا گیا جس کی حفاظت میری ذمہ داری تھی۔

31 دسمبر کو این۔ای۔ڈی انجینیرنگ یونیورسٹی کے طالب علموں نے بھائی جان کے اعزاز میں ہوٹل میٹروپول میں عشائیہ دیا۔ جس میں طلباء کے علاوہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر' ماہرین' اساتذہ اور کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ہم بھائیوں نے شرکت کی۔

اس موقع پر طالب علموں سے خطاب کرتے ہوئے بھائی جان نے کہا انجنیروں' سائنس دانوں اور ٹیکنالوجسٹوں کو ملک میں سائنسی انقلاب برپا کرنے میں اپنا کردار موثر طور پر ادا کرنا چاہیے۔ انہوں نے

صدر محمد ضیاء الحق کی طرف سے پیش کیے گئے چار نکات کا خیر مقدم کیا جن کا مقصد سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کا فروغ ہے انہوں نے کہا کہ ان چار نکات کے تحت تمام ترقیاتی پروگراموں پر عمل درآمد سے قبل تمام سائنسدانوں سے لازمی طور پر مشاورت کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ انہوں نے نئی سائنس پالیسی کے اعلان کے سلسلے میں موجودہ حکومت کی کوششوں کو سراہا اور کہا کہ اس پالیسی کے تحت ہر سائنسدان اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر جا سکتا ہے۔

اس سے قبل یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اے۔ ایم اخوند نے بھائی جان کو یونیورسٹی کا نشان پیش کیا۔ سٹوڈنٹس یونین کے صدر فرحت عادل نے بھائی جان کو مجوزہ صلاحیت فنڈ میں یونین کی طرف سے پانچ ہزار روپے کا عطیہ دینے کا اعلان کیا۔

(جنگ' حریت' ڈان 1980-1-1)

یکم جنوری 1980 بروز منگل وار

آج صبح بھائی جان بالائی خلا کی تحقیق کے ادارہ سپارکو (SUPARCO) کے دفتر گئے۔ خلائی تحقیق کا یہ ادارہ حکومت پاکستان نے بھائی جان کی تجویز پر 1961ء میں قائم کیا تھا اور انہیں اس ادارہ کا پہلا صدر مقرر کیا۔ وہ 1961-1964 تک اس ادارہ کے چیرمین رہے۔ سپارکو کے ماہرین اور سائنسدانوں سے ملاقات کرنے کے بعد آپ گیسٹ ہاؤس واپس تشریف لے گئے۔

کراچی پریس کلب میں صحافیوں سے خطاب

بھائی جان بعد از دوپہر کراچی پریس کلب تشریف لے گئے۔ وہاں انہیں کلب کی تاحیات رکنیت پیش کی گئی۔ اس بارے میں پریس رپورٹ پریس کلب میں صحافیوں سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالسلام نے کراچی میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں تحقیقاتی کام کے فروغ کے لیے نجی سطح پر مالی امداد بہم پہنچانے کی ذمہ داری قبول کرنے والے افراد اور اداروں پر مشتمل کنسورشیم قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ انہوں نے کہا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور ملک کی ترقی لازم ملزوم ہیں۔ انہوں نے حاضرین کو یاد دلایا کہ قرآن حکیم میں "علم" کی اہمیت پر سات سو پچاس آیات ہیں اور "علم" میں سائنس اور ٹیکنالوجی شامل ہیں۔ انہوں نے کہا کہ "علم" کا حصول دینی اعتبار سے ایک افضل اور مستحسن قدم ہے۔

ڈاکٹر سلام نے سائنس اور ریاضی کو ملک کے تمام تعلیمی اداروں کے نصاب کا لازمی مضمون قرار دینے کے سلسلے میں اپنے مطالبات کا اعادہ کرتے ہوئے اٹلی اور جاپان جیسے ترقی یافتہ ممالک کی مثال پیش کی جہاں سائنٹیفک مضامین تمام سکولوں اور کالجوں میں لازمی طور پر پڑھائے جاتے ہیں۔ کراچی میں ایک کروڑ روپے کے فنڈ کے قیام کے سلسلے میں اپنی اپیل کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ساٹھ لاکھ آبادی کا یہ شہر باآسانی یہ رقم جمع کر سکتا ہے اور اس رقم سے باصلاحیت طلباء اور سائنسدانوں کی تعلیم و تربیت کے

اخراجات پورے کیے جاسکتے ہیں۔ انہوں نے شہریوں کو مقامی سطح پر مسائل حل کرنے کا رجحان اختیار کرنے کی تلقین کی اور کہا کہ جب وہ اپنے ملک' شہر اور محلے کو اپنے ہی خاندان کی توسیع شدہ شکل تصور کریں گے تو وہ از خود اسی طرح اپنے معاشرے کی اجتماعی بہبود کے لیے وقت اور آمدنی کا ایک حصہ نکال سکیں گے۔ جس طرح وہ اپنے خاندان کے لیے نکالتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے اخبارات اور ابلاغ عامہ کے ذریعوں سے کہا کہ وہ عام لوگوں میں یہ سماجی جذبہ پیدا کریں۔ انہوں نے کہا کہ بے غرض ہوئے بغیر ہم اپنے ملک کو ترقی نہیں دے سکیں گے۔ انہوں نے اخباری نمائندوں سے اپیل کی کہ وہ لوگوں پر زور دیں کہ مجوزہ صلاحیت فنڈ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ انہوں نے کہا کہ لوگوں کو حکومت پر اپنا انحصار کم کرنا چاہیے۔ اپنی مدد آپ کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے اور قومی و بین الاقوامی معاملات حکومت پر چھوڑ دینے چاہئیں۔ ڈاکٹر سلام نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے بجٹ کا ایک فی صد حصہ مختص کرنے کے سرکاری فیصلے کا خیر مقدم کیا اور توقع ظاہر کی کہ سائنس دان قوم کی توقعات پر پورے اتریں گے اور مختص کی جانے والی رقوم کو منصفانہ طور پر استعمال کریں گے۔ انہوں نے صدر ضیاء الحق کے اس فیصلہ کا بھی خیر مقدم کیا کہ پاکستانی سائنسدانوں پر بیرون ملک سفر کی پابندیاں ختم کر دی جائیں گی۔"

اپنے خطاب کے بعد ڈاکٹر عبدالسلام نے حاضرین کے سوالوں کے جواب بھی دیئے۔ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے صدر ایوب خان کے دور حکومت کا ایک قصہ سنایا اور کہا کہ میں اور ڈاکٹر آئی۔ ایچ عثمانی عارضی قیام کی غرض سے پاکستان آنے والے سائنسدانوں کے لیے ایک مستقل نوعیت کا انتظام چاہتے تھے۔ چنانچہ اس مقصد کے تحت ہم نے اعلیٰ ترین سطح پر رابطہ قائم کیا۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت کے صدر نے ہماری گذارش غور سے سنی اور اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ میں اس ضمن میں اپنے وزیر سے بات کرتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ صدر صاحب نے اپنے وزیر سے بات کی اور مسکراتے ہوئے ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ ہم نے وجہ دریافت کی تو انہوں نے بتایا کہ میرا وزیر کہتا ہے کہ آپ کے خیالات نیک ہیں۔ لیکن آپ لوگوں کو علیحدہ عمارت کی نہیں بلکہ ایک ہوٹل کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ مجھے طالب علموں سے گہری دلچسپی ہے کیونکہ یہی آئندہ ملک کے معمار ہوں گے۔ انہوں نے کہا کہ میں آپ لوگوں کو یہ بتاتے ہوئے بھی خوشی محسوس کرتا ہوں کہ اپنے موجودہ دورہ پاکستان میں کراچی واحد شہر ہے جہاں مجھے طالب علموں سے ملنے اور ان سے بات کرنے کا موقع ملا۔ انہوں نے کہا کہ یہ میری دلی خواہش ہے اور میں چاہتا ہوں کہ طالب علموں سے ملنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع میسر آئیں۔ انہوں نے کہا کہ میں یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہوں کہ جب بھی طالب علموں کی یونین مجھے طلب کریں گی' میں حاضر ہونے کی کوشش کروں گا۔ جب ان سے یہ سوال پوچھا گیا کہ کیا پاکستان کے پاس ایٹم بم ہے؟ اس سوال کے جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر سلام نے کہا جو قومیں ایسا کام کرتی ہیں ان کے افراد کو ایسا سوال نہیں کرنا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ کیا کبھی کسی نے یہ

پوچھا ہے کہ اسرائیل یا جنوبی افریقہ کے پاس ایٹم بم ہے' لہٰذا مجھ سے ایسا سوال نہ پوچھیں۔
ڈاکٹر عبدالسلام کے خطاب سے قبل کراچی پریس کلب کے صدر جناب اشفاق بخاری نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں ڈاکٹر عبدالسلام کی کامیابیوں کو سراہتے ہوئے انہیں کلب کی تاحیات رکنیت دی۔
(جنگ' مشرق' حریت' ڈان 1980-1-2)

اولڈ راوینز (OLD RAVIANS) کا استقبالیہ

یکم جنوری 1980 کو گورنمنٹ کالج لاہور کے فارغ التحصیل طالب علموں کی تنظیم اولڈ راوینز نے بھائی جان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا۔
استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے بھائی جان نے اولڈ راوینز پر زور دیا کہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے لیے فنڈ قائم کریں تاکہ یہ تاریخی ادارہ مستقبل میں زیادہ سے زیادہ بلند پایہ دانشور اور سائنس دان پیدا کر سکے۔

بھائی جان جو خود بھی اس ادارہ کے طالب علم رہے ہیں' نے کہا کہ گورنمنٹ کالج کے طلباء خواہ وہ پاکستانی ہوں یا بھارتی از خود ایک ہزار روپے کا چندہ دے کر پانچ لاکھ روپے تک جمع کر سکتے ہیں بعد میں یہ رقم پچیس لاکھ روپے تک بڑھائی جا سکتی ہے جسے گورنمنٹ کالج کے ضرورت مند طلباء کے مصرف میں لایا جا سکتا ہے۔ اس موقع پر بھائی جان کی اپیل کے جواب میں اولڈ راوین ایسوی ایشن کی طرف سے مذکورہ فنڈ میں پچاس ہزار روپے کا اعلان کیا گیا۔ بھائی جان نے کہا کہ اخبار ٹریبون نئی دہلی کے مطابق وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے دوسرے طالب علم ہیں جنہیں نوبل انعام ملا (1968ء میں ڈاکٹر ہرگوبند کھورانا کو دو امریکن سائنسدانوں رابرٹ ڈبلیو ہولی اور مارشل ڈبلیو نائیرنبرگ کے ساتھ مشترکہ طور پر میڈیسن کے شعبہ میں نوبل انعام دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر ہرگوبند کھورانا خانیوال کے نزدیک ایک گاؤں رائے پور میں 1922ء میں پیدا ہوئے۔ وہیں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے میٹرک ڈی۔ اے۔ وی ہائی سکول ملتان سے پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ وہاں سے 1943ء میں کیمسٹری میں ایم۔ایس۔سی کا امتحان پاس کرنے کے بعد انہوں نے لیورپول یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ دہلی یونیورسٹی نے انہیں ملازمت دینے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے وہ دل برداشتہ ہو کر نقل مکانی کر کے امریکہ چلے گئے وہاں انہوں نے امریکہ شہریت اختیار کرلی۔ (جب انہیں نوبل انعام ملا تو اس وقت وہ امریکی شہری تھے۔ مرتب) اس لحاظ سے یہ کالج (گورنمنٹ کالج لاہور) دنیا کا واحد کالج ہے جس کے دو سابق طالب علموں نے یہ بین الاقوامی اعزاز حاصل کیا۔ اس موقع پر بھائی جان نے گورنمنٹ کالج لاہور سے اپنی وابستگی کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ اس کالج میں' میں نے ایک متوسط طالب علم کی حیثیت سے داخلہ لیا تھا اور میرے والدین کو میرے اخراجات پورے کرنے میں دشواری درپیش تھی۔

انہوں نے کہا کہ میں گورنمنٹ کالج کے فنڈ کی ضرورت ایسے ہی ضرورت مند طلباء کے لیے مخصوص کرتا ہوں۔ اس سے قبل اولڈ راوین ایسوی ایشن کے صدر مسعود الرحمان جو سندھ کے چیف سیکرٹری بھی ہیں' نے بھائی جان کو ان کی سائنسی خدمات پر زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ اس موقع پر تقریب کے صدر کنور ادریس نے اعلان کیا کہ ایسوی ایشن ہر سال ایک بہترین طالب علم کو ڈاکٹر عبدالسلام سکالر شپ برائے سائنس دے گی۔ سابق ٹسٹ کرکٹر وقار حسن نے بھی تقریب سے خطاب کیا۔
(جنگ' مشرق' حریت' ڈان 1980-1-2)

سائنسدانوں کی انجمن کا استقبالیہ

پریس رپورٹ: پاکستان ایسوی ایشن آف سائنسٹسٹز اینڈ سائنٹیفک پروفیشنز۔ سائنٹیفک سوسائٹی آف پاکستان۔ ایسوسی ایشن فار پروموشن آف سائنس ان پاکستان اور انسٹی ٹیوٹ آف کیمیکل انجنیرز کے اشتراک سے یکم جنوری 1980ء کی شام لیاقت نیشنل لائبریری آڈیٹوریم میں اپنے اعزاز میں دیئے گئے ایک استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالسلام نے کہا کہ چند روز قبل انہوں نے صدر پاکستان کو بتایا کہ سائنس دان بہت دل گیر ہیں تو اس پر صدر صاحب نے کہا کہ سائنسدان ہمیشہ آپس میں جھگڑتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر سلام نے کہا کہ اس پر میں نے صدر صاحب سے کہا کہ انگریز بھی ہمیشہ یہی کہتے رہتے تھے کہ مسلمان اور ہندو آپس میں جھگڑتے رہتے ہیں۔ انہوں نے صدر صاحب سے کہا کہ سائنسدانوں کے آپس میں جھگڑے اور آزردگی دور کرنے کے لیے حکومت کو ان کے مسائل حل کرنا چاہیں۔ انہوں نے کہا کہ میری اس گفتگو سے صدر صاحب کے رویہ میں ایک مثبت تبدیلی آئی اور انہوں نے کہا کہ نئی سائنسی پالیسی میں ان تمام باتوں کا خیال رکھا جائے گا۔ جو ضروری ہیں۔ ڈاکٹر سلام نے بتایا کہ وزیر خزانہ غلام اسحق خان نے بھی اس بات پر زور دیا کہ آپس میں گفت و شنید ہونا چاہیے نہ کہ محاذ آرائی۔ ڈاکٹر سلام نے کہا کہ انہیں اچھی طرح سے یاد ہے کہ لارڈ مونٹ بیٹن نے ایک مرتبہ رائل سوسائٹی میں تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ 1939ء میں دوسری جنگ عظیم کے دوران انہوں نے (لارڈ مونٹ بیٹن) نے چند سائنسدانوں جن میں سولی ذوکرمین (SOULLI ZUCKERMAN) اے وی ہل (A.V. HILL) اور 1948ء میں فزکس کا نوبل انعام حاصل کرنے والے پی۔ایم۔ایس بلیکٹ (P.M.S BLACKET) جنہیں بعد میں لارڈ کے خطاب سے نوازا گیا تھا' کو ان مسائل کی ایک فہرست دی جسے اعلیٰ فوجی افسران نے تیار کیا تھا۔ جن کا وہ حل چاہتے تھے۔ لارڈ مونٹ بیٹن نے کہا کہ وہ اس فہرست کو دیکھ کر ہنس دیئے۔ پھر ان کے لیڈر سولی ذوکرمین نے کہا کہ "آپ ہمیں یہ نہ بتائیں کہ آپ کے مسائل کیا ہیں۔ بلکہ آپ ہمیں اپنے اعتماد میں لیتے ہوئے یہ بتائیں کہ آپ کا ہدف کیا ہے؟ جسے دیکھنے کے بعد ہم آپ کو بتائیں گے کہ اسے پورا کرنے کے لیے ہمیں کیا مشکلات پیش آئیں گی۔ پھر ہم باہم مل

جل کر ان کا حل تلاش کرتے ہوئے منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔" ڈاکٹر عبدالسلام نے کہا کہ اس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سائنسدان اور منصوبہ بندی کے ماہرین کو یہ جان لینا چاہیے کہ مسائل کی نشاندہی حکومت کرے گی اور انہیں مسائل کا حل تلاش کرنا ہو گا۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے سائنسدانوں' انجنیروں اور ٹیکنالوجسٹوں سے کہا کہ وہ قومی حقائق سے آگہی حاصل کریں۔ پنج سالہ منصوبوں اور دیگر ترقیاتی پروگراموں کا بغور مطالعہ کریں جس طرح منصوبہ بندی کمیشن کرتا ہے۔ اس صورت میں انہیں صحیح معنوں میں قومی تعمیر کے کاموں میں شمولیت کا احساس بھی ہو گا اور ان کے موقف میں وزن بھی ہو گا۔ انہوں نے کہا کہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں مختلف طبقوں کو مختلف خانوں میں باٹنے کا رحجان ختم ہو رہا ہے اور زندگی کے تمام شعبے مل جل کر قومی تعمیر کے کاموں میں حصہ لیتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں اگر ترقی کرنا ہے تو ہمیں بھی یہی روش اپنانی ہو گی۔

اپنے اس مختصر خطاب کے بعد ڈاکٹر عبدالسلام نے حاضرین کے سوالات کے جواب دینے کی پیشکش کی تو تین حضرات نے بجائے سوال پوچھنے کے اپنی اپنی تقاریر کرنا شروع کر دیں جنہیں ڈاکٹر عبدالسلام خاموشی اور حیرت سے سنتے رہے۔

اس موقع پر ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "سائنسدانوں کا صبرو تحمل جواب دے چکا ہے کیونکہ منصوبہ بندی کے افسران کے علاوہ دیگر حکام ان کے کام کو مالی منفعت کی نظر سے دیکھنا چاہتے ہیں لیکن ریسرچ اور سائنس کے میدان میں ایسا سوچنا مناسب نہیں۔ انہوں نے کہا کہ ایک مرتبہ فضائیہ کے اعلیٰ حکام نے ان سے دریافت کیا کہ آیا فضا سے فضا میں مار کرنے والے میزائیل جن کی قوت عمل کی کارکردگی کا عرصہ بہت کم ہوتا ہے کو دوبارہ قابل استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات اس لیے دریافت کی گئی تھی کیونکہ امریکہ نے ایسے مزائیل دینا بند کر دیئے تھے۔ انہوں نے کہا پاکستان کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ نے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے ایسے مزائیلوں کو دوبارہ قابل استعمال بنا دیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک کار آمد میزائیل سے دشمن کا جنگی ہوائی جہاز مار گرانے کی صلاحیت پھر سے پیدا کر دی گئی تھی۔ اب اگر حکومت سائنسدانوں کی کارکردگی کو مالی منفعت میں دیکھنا چاہتی ہے تو اسے پی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ آر کو ایک جنگی ہوائی جہاز کی قیمت کے برابر رقم دینا چاہیے تھی مگر ایسا نہ ہوا۔"

ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی کے خطاب کے بعد عبدالحمید چھوٹانی جو پی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ آر کے سیکرٹری ہیں نے بھی خطاب کیا۔ بعد میں ڈاکٹر عبدالسلام کو پاکستان سائنٹسٹس ایسوسی ایشن کا لائف ممبر بنایا گیا اور انہیں مختلف سائنسی اداروں کے نشانات دیئے گئے۔

(ڈان' جنگ' حریت' مشرق 1980-1-2)

ڈاکٹر ظفر حسن کا عشائیہ

ڈاکٹر ظفر حسن جو ایک صنعت کار اور بھائی جان کے مداحوں میں سے ہیں نے کراچی کے صنعت کاروں اور تاجر برادری کی طرف سے کلفٹن میں اپنی رہائش گاہ پر بھائی جان کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔

عشائیہ میں بھائی جان نے تاجر برادری کو "ٹیلنٹ فنڈ" میں دل کھول کر عطیات دینے کی اپیل کی۔ انہوں نے سائنسدانوں کو درپیش مالی مسائل کا ذکر کیا اور کہا کہ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ طبیعات کے لیے اتنے کم فنڈ مختص ہیں کہ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ یہ شعبہ کس طرح چل رہا ہے۔ انہوں نے تاجر برادری سے مقامی سطح پر تعلیمی اداروں میں سائنسی تعلیم دینے کے انتظامات کے لیے مالی تعاون کرنے کی اپیل کی تاکہ ملک نونہال سائنس کی تعلیم کے حصول کی جانب راغب ہوں۔

قبل ازیں میزبان نے بھائی جان کو نوبل انعام ملنے پر مبارک باد پیش کی اور ان کی علمی خدمات کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔

اس عشائیہ میں کراچی کے صنعت کاروں، تاجر برادری کے علاوہ جمیل الدین عالی اور ہم بھائیوں نے بھی شرکت کی۔

(جنگ کراچی 1980-1-2)

روزنامہ جنگ کراچی کے ایڈیٹر انچیف میر خلیل الرحمان کا بھائی جان سے انٹرویو

ڈاکٹر ظفر حسن کے عشائیہ سے یکم جنوری کی رات گیارہ بجے بھائی جان جب سٹیٹ گیسٹ ہاؤس واپس تشریف لائے تو وہاں روزنامہ جنگ کراچی کے مالک و ایڈیٹر انچیف میر خلیل الرحمان اخبار کے وقائع نگاروں رضی الدین، مرزا سلیم بیگ اور فوٹو گرافر کے ہمراہ ان کے منتظر تھے۔ اس انٹرویو کے لیے پہلے سے ہی وقت مقرر کر لیا گیا تھا۔ خیر و عافیت اور رسمی گفتگو کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ انٹرویو روزنامہ جنگ 11 جنوری 1980 میں شائع ہوا تھا۔

سوال ڈاکٹر صاحب آپ ابتداء ہی سے تعلیمی میدان میں غیر معمولی کامیابیاں حاصل کرتے رہے ہیں۔ وہ کیا خاص واقعہ یا سبب تھا جس کے نتیجے میں آپ نے ایک سائنس دان بننے کا فیصلہ کیا۔

جواب : مجھے شروع سے والدین اور دوستوں نے یہی توجہ دلائی تھی کہ ایک ذہین طالب علم کے لیے سب سے اچھا کیریئر یہ ہے کہ وہ آئی۔ سی۔ ایس (انڈین سول سروس) کا امتحان پاس کرے۔ چنانچہ بچپن سے والد صاحب نے آئی سی ایس کے پرانے پرچے اور اس سے متعلق دوسری چیزیں مجھے تیاری کے لیے فراہم کر دی تھیں حالانکہ میں ابھی دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ خیال تھا کہ بیس سال کی عمر میں آئی سی ایس کا امتحان دے کر پاس کر سکتے ہیں۔ اس وقت ایک صاحب حافظ مجید ہوا کرتے تھے۔ ان کا کیریر بھی میری طرح ہی تھا۔ وہ بھی پنجاب میں اول آئے تھے اور آئی سی

ایس میں چلے گئے تھے۔ مجھے معلوم نہیں وہ اس وقت حیات ہیں یا نہیں۔ مسلمانوں کے لیے وہ بڑی منفرد شخصیت تھی۔ وہ مجھ پر بڑے مہربان تھے اور حوصلہ بڑھاتے رہتے تھے۔ انہیں جب میری نمایاں کامیابی کا علم ہوا تو مجھے لکھا کہ آپ آئی سی ایس کا امتحان دیں گے تو ضرور کامیاب ہوں گے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کی تقسیم کا معاملہ زوروں پر تھا اور کچھ معلوم نہ تھا کہ امتحان بھی ہو گا یا نہیں۔ اسی زمانے میں پنجاب کے خضر حیات نے 1945ء میں بہت سا روپیہ "وار فنڈ" کے لیے جمع کیا تھا۔ جب جنگ ختم ہو گئی تو انہوں نے جنگ کے بعد وسیع تعمیر نو کے سلسلے میں ایک ویلفیئر فنڈ قائم کیا۔ اس میں سے پانچ وظیفے بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کے لیے رکھے گئے۔ یہ وظیفے نوعیت کے لحاظ سے یوں منفرد تھے کہ کسی بھی اعلیٰ تربیت کے لیے استعمال کیے جا سکتے تھے۔ میری خوش قسمتی سے ان میں سے ایک وظیفہ مجھے مل گیا۔ 3 ستمبر 1946ء کو مجھے وظیفہ اور کیمرج میں داخلہ ایک ہی ساتھ ملا تھا۔ یہ داخلہ میرے لیے غیر متوقع تھا۔ مجھے کہا گیا کہ اگر اس وظیفہ کو استعمال کرنا چاہتا ہوں تو اکتوبر تک وہاں پہنچ جاؤں۔ یہ داخلے عام طور پر ستمبر میں نہیں ہوتے بلکہ فروری میں ہوتے ہیں۔ اس لیے فوراً چلا گیا۔ کیمرج جانے کے بعد ملک تقسیم ہو گیا اور باقی چار وظائف جن طلباء کو ملے تھے وہ نہ جا سکے۔ اور اس طرح ان کے وظیفے ختم کر دیئے گئے۔ جب میں کیمرج پہنچا تو میں نے ریاضی میں داخلہ لے لیا چنانچہ میں نے ریاضی پڑھنا شروع کر دیا۔ ان ہی دنوں مجھے طبیعات (فزکس) پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ مجھے تین سال کا وظیفہ ملا تھا اس میں دو سال تو ریاضی کی تعلیم میں لگا دیئے۔ تیسرے سال میرا ارادہ تھا کہ میں اپنے آپ کو طبیعات کے لیے تیار کروں لہٰذا میں اپنے استاد کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ "میرے پاس ایک سال کا وظیفہ باقی ہے چنانچہ میں یہ کر سکتا ہوں کہ تیسرا سال بھی ریاضی پر لگا دوں یا پھر طبیعات کا امتحان دے دوں لیکن اس کے لیے مجھے طبیعات کا تین سال کا کورس ایک سال میں کرنا پڑے گا۔ اس طرح یقیناً میری تعلیمی پوزیشن متاثر ہو گی۔ آپ کا کیا مشورہ ہے؟" انہوں نے کہا کہ "چونکہ طبیعات دان بننا چاہتے ہو اس لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ تم طبیعات کا امتحان دو تاکہ تم دوسرے طبیعات دانوں کو قریب سے دیکھ سکو۔ اس طرح تمہارے اندر یہ احساس کمتری پیدا نہ ہو کہ طبیعات دان بننا چاہتے تھے لیکن اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور ریاضی کے گروپ میں رہ گئے۔" خیر استادوں کے مشورہ سے طبیعات کے لیے بہت محنت کرنا پڑی اور مجھے تین سال کا کورس ایک سال میں مکمل کرنا پڑا۔ خیر اللہ کا احسان تھا کہ میں اس میں کامیاب ہوا۔ جب 1949ء میں واپس آیا تو اس وقت میاں افضل حسین پبلک سروس کمیشن کے چیرمین تھے۔ میاں صاحب نے مجھے 1946ء میں اس وظیفے کے لیے منتخب کیا تھا وہ مجھ پر بڑے مہربان تھے۔ مجھے یاد ہے وہ اس زمانہ میں کراچی میں رہتے تھے اور کمیشن کا دفتر بھی یہیں تھا جب میں ان سے ملنے گیا تو پہلا

سوال انہوں نے مجھ سے یہ کیا کہ کیا سی ایس پی بننے کا ارادہ ہے۔ اس لیے کہ تم جو آئی سی ایس کرنا چاہتے تھے وہ اب سی ایس پی ہو گیا ہے۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ میں نے کہا۔ سوال یہ نہیں ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اس پر وہ کہنے لگے۔ اچھا یہ ہے کہ تم واپس چلے جاؤ اور وہاں کیمرج سے پی۔ایچ۔ڈی کرو چنانچہ میں کیمرج گیا اور وہاں سے پی۔ایچ۔ڈی کر کے واپس آیا۔ میں نے اپنا مقالہ 1951ء میں جمع کیا تھا۔ مجھے 1952ء میں ڈگری مل گئی۔ اس لحاظ سے میرا سائنس دان بننا ایک حادثہ ہی تھا لیکن میں کہتا ہوں کہ ہماری آئندہ پود کے مستقبل کو میری طرح حادثے (ایکسیڈنٹ) کے حوالے نہ کیا جائے بلکہ ان کے لیے باقاعدہ منصوبے (پلاننگ) کے ساتھ مضامین کا انتخاب کیا جائے۔ میں نے 31 دسمبر کو کراچی یونیورسٹی کے شعبہ طبیعات میں اساتذہ و طلباء سے خطاب کیا تھا۔ مجھے یہ معلوم کر کے بڑا تعجب ہوا کہ طبیعات جیسے اہم شعبے میں تحقیقاتی سرگرمیوں کا سالانہ بجٹ اس دور میں صرف دس ہزار روپے ہے۔

سوال : جس لمحے آپ کو نوبل انعام ملنے کی اطلاع موصول ہوئی۔ ایک پاکستانی کی حیثیت سے آپ کے فوری جذبات کیا تھے؟

جواب : مجھے یہ خبر بارہ بجے ملی۔ انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی کے جو ڈائریکٹر جنرل ہیں۔ وہ مجھے جانتے ہیں۔ انہوں نے وہاں اپنے آدمی بیٹھا رکھے تھے جنہوں نے انہیں (ڈائریکٹر جنرل) کو اطلاع دی تو انہوں نے فورا" مجھے فون کیا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور نوافل (احمدیہ عقیدے کے مطابق) ادا کئے (بھائی جان نے یہ نوافل لندن میں جماعت احمدیہ کی عبادت گاہ میں ادا کیے تھے۔ مرتب)

اس کے بعد امپیریل کالج سے فون آ گیا چنانچہ میں وہاں پریس کانفرنس کے لیے چلا گیا۔ ایک پاکستانی کی حیثیت سے میرے لیے سب سے خوشی کا وقت وہ تھا جب 10 دسمبر کو مجھے انعام مل رہا تھا۔ اس وقت میری زبردست خواہش تھی کہ اپنی قوم کے نمائندے کی حیثیت سے میں اتنا ضرور کروں کہ قومیت کا جو احساس ہے وہ ان لوگوں تک پہنچا سکوں۔ مجھے شدت سے اس بات کا احساس تھا۔ انعام ملنے کی تقریب چار بجے سہ پہر شروع ہوتی ہے اور رات کے بارہ بجے تک ہوتی ہے۔ صبح کے وقت لوگ ریہرسل کرواتے ہیں۔ پگڑی باندھنے کا الگ قصہ تھا۔ مجھے پگڑی باندھنے کی عادت نہیں تھی۔ میں نے باندھنے کی کوشش کی لیکن مجھ سے نہ بندھ سکی۔ میں نے سوچا۔ پاکستانی سفارت خانے میں کوئی پگڑی باندھنے والا ہو گا۔ وہاں فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہاں جتنے افسران ہیں ان میں سے کسی کو بھی نہیں آتی۔ ہمارے سفیر جناب عزت بخش اعوان صاحب کے باورچی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں تو پگڑی باندھنے کا چیمپئن ہوں۔ چنانچہ اس کے پاس پگڑی بھیج دی۔ دوسرے دن ایک بجے پگڑی آئی تو وہ ایک عجیب طرح سے توڑ مروڑ کے بندھی ہوئی تھی۔ بات یہ ہے کہ ہر ایک کا پگڑی باندھنے کا ایک اندازہ ہوتا ہے۔ میں جھنگ والے

سٹائل کا عادی رہا۔ چنانچہ میں نے اسے دوبارہ کھولا اور استری کر کے اپنے انداز سے باندھا۔ اس موقع پر بعض لوگوں نے کہا کہ ٹوپی پہن لوں لیکن میں روایتی لباس پہننا چاہتا تھا۔ آپ نے غور کیا ہو گا کہ اسی لیے تقریب کے موقع پر بڑی احتیاط سے چل رہا تھا (کہیں پگڑی گر نہ جائے۔ مرتب)

سوال : حصول علم کے دوران پھر ایک پروفیسر کی حیثیت سے اور بعد ازاں بیرونی ملک ایک عظیم سائنسدان کے طور پر آپ کی ملاقات دنیا کے کن کن مشہور سائنسدانوں سے ہوئی؟

جواب : سب سے پہلے تو میں جس ممتاز سائنسدان کا ذکر کروں گا وہ پروفیسر ڈیراک ہیں جو کیمبرج یونیورسٹی میں نیوٹن کی کرسی (چیر) پر بیٹھتے تھے' اب ریٹائر ہو چکے ہیں اور میامی یونیورسٹی میں رہتے ہیں۔ مجھے پروفیسر نیلس بوہر سے بھی ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے۔ لیکن ان کی اور ہماری عمروں کے درمیان بہت فرق تھا۔ نیلس بوہر دراصل آئن سٹائن' ارنسٹ رتھر فورڈ اور ڈیراک کے بھی پیش رو تھے۔ ان کے علاوہ پروفیسر فائی مین ہیں جو کیلیفورنیا یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔ ایک اور پروفیسر ہیں جو پہلے ہارورڈ میں تھے اب کیلیفورنیا میں ہیں۔ یہ سب حضرات بہت قابل اور لائق ہیں۔ یہ تمام کے تمام سائنسدان نوبل انعام یافتہ ہیں۔

سوال : آپ کو یہ اعزاز حاصل رہا ہے کہ آپ 1961ء سے 1974ء تک پاکستان کے تین سربراہان حکومت کے اعلیٰ سائنسی مشیر رہے ہیں اور موجودہ نظام تعلیم کی تشکیل میں آپ کا کلیدی کردار رہا ہے۔ آپ کے خیال میں ہمارا موجودہ نظام تعلیم دنیا کے جدید تقاضوں کو کس حد تک پورا کر سکتا ہے۔

جواب : ہمارا موجودہ نظام تعلیم اتنا ناقص ہے کہ دنیا کے جدید تقاضوں کو قطعی طور پر پورا نہیں کر سکتا۔ یہ تو جانے دیجئے کہ ہم کتنے فی صدی لوگوں کو پڑھا رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم انہیں پڑھا کیا رہے ہیں۔ میرے خیال سے ہر بچے کو سائنس و ٹیکنالوجی کی تعلیم نہ دینا اتنا بڑا جرم ہے کہ جس کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اپنے بچوں کو اپاہج اور مفلوج بنا رہے ہیں جو ہرگز اس ماڈرن دنیا کے قابل نہیں۔ ہم نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ آرٹس اور سائنس میں شروع سے تفریق رکھی جائے۔ حالانکہ یہ ایسی بے ہودگی ہے کہ دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہوتی۔ آپ چین' جاپان یا کوریا کو لے لیجئے وہاں ہر بچہ کو سائنس پڑھنی پڑتی ہے۔ وہاں کا جو نصاب ہے اس میں ریاضی' طبیعات اور کیمیا لازمی طور پر شامل ہوتے ہیں۔ خاص طور پر چین میں ایک سترہ (17) سال کی عمر کے طالب علم کے لیے نصاب میں بارہ مضامین ہوتے ہیں۔ ان میں طبیعات' کیمیا' حیاتیات (بیالوجی)' ریاضی' ٹیکنالوجی کا ایک مضمون' چینی زبان اور دو غیر ملکی زبانیں شامل ہوتی ہیں۔ ہمارے یہاں تو بس تین چار مضامین لے لیے جاتے ہیں اور وہ بھی بالکل آسان مضمون ہوتے ہیں اور اس پر یہ سمجھتے ہیں کہ بچے پر بڑا ظلم کر دیا ہے۔ یہ بالکل غلط بات ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں جب اٹلی گیا

تو میں نے سوچا یہاں بچوں کی تعلیم کا کیا ہو گا۔ اٹلی میں تو نئی زبان سیکھنی پڑے گی۔ وہاں سرن میں ایک پروفیسر صاحب میرے دوست ہیں وہ کہنے لگے کہ کیا تمہارے بچے کوئی خاص بچے ہیں۔ یہاں ہمارے بچے تو چار چار زبانیں پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ سائنس میں پڑھتے ہیں اور دیگر علوم بھی سیکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بچوں کو چار چار زبانیں سیکھنی چاہیں۔ ان پر بوجھ نہ ڈالنا بڑا جرم ہے۔ خود یورپ میں طالب علموں کو کئی زبانیں پڑھنا پڑتی ہیں۔ ٹیکنالوجی کے لحاظ سے میں نے اٹلی میں دیکھا کہ ایک معمولی آدمی بھی چاہے وہ ڈرائیور یا مزدور ہی کیوں نہ ہو روزمرہ زندگی کے بہت سے کام جانتا ہے اور خود کر لیتا ہے۔ وہ لوگ دھات سازی' پلمبنگ اور چھوٹی موٹی مرمت کے کام خود کر لیتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اس قابل ہوتا ہے کہ گھریلو استعمال کی۔ بجلی کی اشیاء مرمت کر سکے۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ وہاں ہر بچے کے لیے سائنس و ٹیکنالوجی کی تعلیم لازمی ہے۔ انہیں کبھی بھی یہ خیال نہیں آتا کہ فلاں کام خود نہیں کر سکیں گے۔ اس لحاظ سے ہماری تعلیم بہت ہی ناکارہ ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کے نتیجے میں ہم اپنے بچوں کو اپاہج بنا رہے ہیں۔ جب تک آرٹس والے کو سائنس اور سائنس والے کو آرٹس نہیں پڑھائیں گے یہی حال رہے گا۔ سائنس والوں پہ سب سے بڑا الزام یہی ہے کہ انہیں لکھنا نہیں آتا اور یہ اس لیے ہے کہ ہماری تعلیم یک طرفہ ہوتی ہے۔

سوال : پاکستان میں عمومی سائنس (پاپولر سائنس) کے فروغ اور ترقی کے لیے کون کون سے انقلابی اقدامات ناگزیر ہیں؟

جواب : میرے خیال میں آپ لوگوں نے خصوصاً" میر صاحب (جناب میر خلیل الرحمن صاحب کی طرف اشارہ کر کے) نے جو سائنس کا ضمیمہ (صفحہ) شروع کیا ہے۔ یہ بڑا اچھا قدم ہے اور میں کبھی کبھی اس کا مطالعہ کرتا ہوں۔ اب سائنس کا اثر ٹیلی ویژن پر بھی محسوس ہو رہا ہے لیکن اس کے اثرات ملتان' جھنگ اور اندرون ملک دوسرے شہروں میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب تک عام تعلیم میں سائنس کا بہت بڑا عنصر نہیں ڈالا جائے گا۔ اس وقت تک بات بننے والی نہیں ہے۔ یورپ والوں کو یہ سہولت حاصل ہے کہ ان کے گرد و پیش سائنس کا ماحول رہتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہاں کراچی میں بھی اس قسم کا ماحول ہے یا نہیں۔ یہاں چھوٹے چھوٹے تجربات کرنے کے لیے سائنس سنٹر اور سائنس کلب ہونے چاہیں۔ (اس موق پر جناب پروفیسر صاحب کو بتایا گیا کہ پی۔ اے۔ ایس۔ ایس پی نے بڑی جدوجہد سے جو ایک سائنس کلب بنایا تھا وہ بھی آج کل ویران پڑا ہوا ہے۔) ٹیلی ویژن میں اس قسم کے سائنسی کھیل اور مشغلے دیکھنے میں نہیں آتے۔ بچوں میں سائنس کا شوق کھلونوں اور چھوٹے تجربات سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مغرب میں چار چار' پانچ پانچ سال کے بچے کھیل ہی کھیل میں طرح طرح کے سائنسی تجربات کرتے ہیں۔

میرا خیال تھا کہ کم از کم کراچی میں ایسا ماحول ضرور ہو گا وہ جو سائنسی میوزیم اور قدرتی ماحول کے سنٹر بننے تھے۔ کیا ان پر کچھ عمل ہوا ہے؟ لندن میں جو سائنسی میوزیم ہے وہ دیکھنے کی چیز ہے۔

سوال : سائنسی ترقی کے لیے ترجیحات (PRIORITIES) کا جو مسئلہ ہے۔ آپ کے خیال سے ہمارے ملک میں ان کی ترتیب کیا ہونا چاہیے۔

جواب : سائنسی ترقی کے لیے ترجیحات کے تعین میں آپ کا سائنسی صفحہ زور دے سکتا ہے۔ اس معاملہ کو قومی مسائل کے طور پر سائنٹیفک انداز سے دیکھنا چاہیے۔ جس طرح ہمارا منصوبہ بندی کمیشن (پلاننگ کمیشن) غور کرتا ہے۔ سب سے پہلا مسئلہ اور ترجیح طلب کام زراعت اور پانی ہے۔ جیسا کہ حال ہی میں صدر صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا ہے۔ اس لیے کہ اگر کھانے کے لیے کچھ نہیں ہو گا تو پھر دوسری سائنسی ترقیوں کی بات کیسے کی جا سکتی ہے۔ دوسرے نمبر پر توانائی اور معدنیاتی وسائل کا استعمال آتا ہے۔ اور اس مقصد کے لیے ملک میں تربیت یافتہ ماہرین کی بڑی تعداد ہونا ضروری ہے۔ آپ چین کی مثال ہی لے لیجیے' اکتوبر 1949ء کے انقلاب سے قبل وہاں معدنی شعبے سے تعلق رکھنے والے ماہرین چند ہزار سے زیادہ نہیں تھے اور آج کل ان کی تعداد تقریباً" ایک ملین (دس لاکھ) ہے۔ یہ تمام ماہرین انہوں نے باہر سے درآمد نہیں کیے بلکہ خود سخت محنت کی ہے۔ کتابیں پڑھی اور ترقی کی ہے۔ آج چینی' ریشمی فینات (فائبر ٹیکنالوجی) میں بہت آگے ہیں۔ وہ تمام جدید اور اچھی چیزیں خود بناتے ہیں لیکن یہ سب کچھ خواہش اور ارادے سے ہوتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ منصوبہ ہو' ارادہ ہو اور یہ خواہش ہو کہ ہم ہر چیز اپنے ملک میں خود بنائیں۔

سوال : نظری طبیعات (THEORETICAL PHYSICS) کا جو مرکز ٹرییسٹ اٹلی میں واقع ہے اور جس کے آپ سربراہ ہیں۔ کیا اس قسم کا مرکز پاکستان میں قائم ہونے کے امکانات ہیں۔

جواب : اس قسم کا سنٹر یہاں بھی بن سکتا تھا اور اس کے لیے کوشش کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس قسم کے منصوبوں کے لیے رقم خرچ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب میں نے سنا ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن والے اس قسم کا سنٹر بنانا چاہتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ابتدا میں سنٹر کے لیے بڑی تگ و دو کرنا ہو گی۔ ٹرییسٹ میں جو مرکز قائم کیا گیا اس کے قیام کے لیے تین سو ہزار ڈالر (تین لاکھ ڈالر) خرچ ہوئے ہیں۔ یہاں پاکستان میں ایسے کم از کم چھ سو ہزار ڈالر (چھ لاکھ ڈالر تقریباً" ساٹھ لاکھ روپے یہ تخمینہ 1979ء میں لگایا گیا تھا۔ موجودہ شرح کے مطابق یہ تقریباً" دو کروڑ چالیس لاکھ روپے بنتے ہیں۔ مرتب) کی ضرورت ہو گی۔ اگر قوم یہ رقم فراہم کر سکتی ہے تو ایسا سنٹر یہاں بھی بن سکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ قوم سائنس پر کتنا کچھ خرچ کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

سوال : گورنمنٹ کالج لاہور میں اعلیٰ تناؤ (HIGH TENSION) کی تجربہ گاہ ہے کیا اسے مزید ترقی دے کر نظری طبعیات کے تجربات کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔
جواب : اس تجربہ گاہ کی صلاحیت اور کارکردگی سردست اتنی نہیں ہے کہ نظری طبیعات کے تجربات وہاں کیے جا سکیں۔ دراصل اس قسم کے تحقیق کے لیے بہت اعلیٰ درجے کے آلات اور انتہائی جدید ترین سہولتیں درکار ہوتی ہیں جو اس وقت اس تجربہ گاہ میں نہیں ہیں۔
سوال : ٹریسٹ کے مرکز میں ترقی پذیر ممالک سے کتنے سائنس دان کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے مسلمان ممالک کتنے ہیں نیز پاکستان سے کتنے مسلمان سائنس دان ہیں۔
جواب : اس مرکز میں ہر سال ترقی پذیر (DAVE LOPING) ممالک سے پانچ سو کے قریب سائنس دان آتے ہیں اور تقریباً" اتنے ہی سائنس دان ترقی یافتہ ممالک سے آتے ہیں لیکن یہ لوگ بہت تھوڑے عرصے یعنی دو یا تین ماہ کے لیے آتے ہیں۔ پاکستان سے پہلے ہر سال بیس کے قریب سائنس دان آتے تھے لیکن پچھلے دو' تین سالوں سے یہ تعداد کچھ کم ہو گئی ہے۔ اب ہم سے یہ کہا گیا ہے کہ پاکستان سے صرف ان سائنسدانوں کو لیا جائے جنہیں حکومت پاکستان بھیجے ہم از خود اپنی مرضی سے پاکستان سے سائنسدان نہ لیں۔ ابھی پچھلے دنوں صدر صاحب نے اعلان کیا ہے کہ سائنسدانوں پر سے باہر جانے کی پابندیاں اٹھالی گئی ہیں۔ خدا کرے کہ تعداد پھر بیس کے قریب پہنچ جائے۔ پاکستان کے علاوہ عرب ممالک سے ساٹھ کے قریب سائنس دان آتے ہیں۔ ہندوستان سے ہر سال چالیس پچاس کے قریب ہندو آتے ہیں لیکن وہ بڑے اچھے لوگ بھیجتے ہیں۔ وہ ایسی صلاحیت اور قابلیت کے مالک ہوتے ہیں کہ چاہے انتخاب کوئی کرے انہیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے منیر احمد خان بتا رہے تھے کہ ستمبر کے شروع میں کسی غیر ملکی اخبار میں کوئی اداریہ شائع ہوا ہے جس میں پاکستان' ہندوستان اور دوسرے ممالک کی سائنسی ترقیوں کا موازنہ کیا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے اگر پاکستان ایٹم بم بنا بھی لے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لیے کہ وہاں کا سائنسی معیار اتنا پست ہے کہ اسے مقابلے کے لیے ایک زمانہ چاہیے۔ سارے پاکستان میں جتنے سائنسدان ہیں ان کے ہاں صرف دہلی میں کام کرتے ہیں۔
سوال : آج کل ہمارے یہاں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ وزارت سائنس و ٹیکنالوجی کو مضبوط اور فعال بنایا جائے یا اسے ختم کر کے تمام سائنسی اداروں کو ان کی متعلقہ وزارتوں میں ضم کر دیا جائے۔ آپ کے خیال میں پاکستان کے لیے کون سی صورت زیادہ فائدہ مند ہے۔
جواب : اصل میں وزارت تو ضرور بنی چاہیے جب وزارت ہو تو ٹھیک طرح سے ہو۔ ایک کمزور اور دوسرے درجہ کی نہ ہو۔ اب سوال یہ کہ کس ادارہ کو کہاں رکھا جائے اور ریسرچ کونسلوں کی وابستگی کی کیا صورت ہو۔ اس کا فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا جانا چاہیے۔ بہرحال جو بھی فیصلہ کیا جائے اس میں قومی مفاد کا پہلے خیال رکھا جائے۔

سوال : اطلاقی (APPLIED) اور نظری (PURE) علوم کے درمیان کتنا تناسب ہونا چاہیے اور کس کو کس پر فوقیت دینی چاہیے۔

جواب : میں سمجھتا ہوں کہ جب تک نظری تحقیق نہ ہو اطلاقی تحقیق نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اطلاقی علوم نظری علوم سے ہی وجود میں آتے ہیں۔ کئی علوم ہیں جو سارے کے سارے نظری ہیں۔ اور اپنی جگہ بہت اہم ہیں مثلاً علم ریاضی سارے کا سارا نظری ہے۔ ساری دنیا میں ان دونوں کے درمیان دس فیصد (نظری) اور نوے فیصد (اطلاقی) کا تناسب رکھا جاتا ہے۔

میر خلیل الرحمن: ایڈیٹر انچیف روزنامہ جنگ نے پروفیسر صاحب سے کہا کہ آپ کی یہاں آمد سے ایک بہت بڑی تبدیلی یہ آئی ہے کہ پچھلے چند ہفتوں سے سائنس اور ٹیکنالوجی کا برابر چرچا ہو رہا ہے اور نوجوان بھی اس شعبے میں بڑی دلچسپی لے رہے ہیں۔ بالکل اس طرح جب ہماری کرکٹ یا ہاکی کی ٹیمیں کوئی میچ جیت جاتی ہیں تو گھر گھر' گلی گلی کرکٹ اور ہاکی نظر آتی ہے۔ کیا کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ آپ یہاں جلد جلد آتے رہیں اور کیا آپ کو وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کوئی پیشکش کی گئی ہے؟

جواب : آج تک کوئی ایسی پیشکش نہیں ہوئی ہے لیکن میں ذاتی طور پر چاہتا ہوں کہ کوئی ایسی صورت جو ملک کے لیے فائدہ مند ہو ضرور کی جائے۔ اصل میں میرا اپنا تحقیقی کام چل رہا ہے اور میری موجودگی وہاں ضروری ہے۔

سوال : آپ اور ڈاکٹر آئی ایچ عثمانی نے پاکستان میں جوہری (ایٹمی) توانائی کے فروغ اور استعمال کے لیے بنیادی کام کیا ہے لیکن ادھر چند سالوں سے ڈاکٹر عثمانی جوہری توانائی کے خطرات اور دوسری وجوہات کی بنا پر شمسی توانائی کے فروغ میں مصروف ہو گئے ہیں۔ آپ کی رائے میں پاکستان کو مستقبل میں توانائی کی ضروریات کے لیے کون سی راہ اختیار کرنی چاہیے۔

جواب : پاکستان کو شمسی توانائی کے فروغ کے لیے کام کرنا پڑے گا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے وسیع استعمال کا وقت ابھی نہیں آیا۔ اس لیے کہ ابھی اتنا کم کام ہو رہا ہے کہ جس وقت اس ٹیکنالوجی کی ہمیں ضرورت ہو گی ہمیں مہنگے ترین داموں اسے خریدنا پڑے گا۔ ہم بہرحال جوہری توانائی سے حرف نظر نہیں کر سکتے۔ شمسی سیل (SOLAR CELL) خاصے مہنگے ہوتے ہیں۔ انہیں سستا اور قابل عمل بنانے کے لیے اچھی خاصی معیاری تحقیق درکار ہے یعنی محض شمسی توانائی کی خواہش کافی نہیں ہے۔

سوال : پاکستان میں چار بار سائنس پالیسی کے مسودے مرتب ہو چکے ہیں لیکن ان کی نفاذ کی نوبت نہیں آئی۔ کیا آپ اس سلسلے میں ذاتی طور پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

جواب : میں قطعی اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ اس معاملے میں اثر انداز ہو سکوں۔ آپ نے بھی سنا ہو گا کہ یہ معاملہ خاصا متنازعہ ہے۔ اس کے لیے ہمیں سائنسدانوں' صنعت کاروں اور

انتظامیہ کے لوگوں کے ساتھ مل کر کوئی صورت نکالنی ہو گی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان تینوں حلقوں کے درمیان ڈائیلاگ کی تجویز مناسب نہیں ہے۔ میں اس کے متعلق کبھی تفصیل سے عرض کروں گا۔

چونکہ رات کافی گذر چکی تھی اور ڈاکٹر عبدالسلام نے صبح چھ بجے کے ہوائی جہاز سے لندن واپس جانا تھا۔ اس لیے یہاں پر اس انٹرویو کو ختم کر دیا گیا۔

(جنگ کراچی 1980-1-11)

2 جنوری 1980 بروز بدھ

صدر پاکستان کی دعوت پر پاکستان کا اٹھارہ روزہ سرکاری دورہ مکمل کرنے کے بعد بھائی جان 2 جنوری کی صبح ساڑھے چھ بجے پی۔ آئی۔ اے کی پرواز پی کے 781 سے لندن کے لیے روانہ ہوئے۔ لندن روانگی سے پہلے انہوں نے ریڈیو پاکستان کے نمائندہ کو کراچی کے ہوائی اڈے پر انٹرویو دیتے ہوئے' پاکستان کے لوگوں میں سائنس کے متعلق بیداری کو بہت سراہا اور کہا کہ انہوں نے اس بار پاکستان کا دورہ کرتے ہوئے اس بیداری کو محسوس کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہر جگہ میرا جس انتہائی گرم جوشی سے استقبال کیا گیا اس کے لیے میں بہت مشکور ہوں اور خاص طور پر وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے بارے میں پاکستان کے لوگوں کی گرم جوشی سے بہت متاثر ہوئے ہیں اور یہی جذبات ملک کی آئندہ ترقی اور خوشحالی کے ضامن ہیں۔ انہوں نے ایک بار پھر زور دے کر یہ بات کہی کہ جب تک قوم بحیثیت مجموعی سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی میں حصہ نہیں لے گی' قومی ترقی ایک نامکمل خواب رہے گی۔ انہوں نے اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری نشان امتیاز دیئے جانے اور ملک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے نئے اقدامات کرنے پر صدر محمد ضیاء الحق کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے کہا کہ حکومت کا یہ فیصلہ کہ قومی بجٹ کا ایک فیصد سائنس اور ٹیکنالوجی پر خرچ کیا جائے گا ایک قابل قدر اقدام ہے۔ اب یہ سائنسدانوں اور انجنیروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ آگے آئیں اور قوم کی ذمہ داریوں پر پورے اتریں۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ ٹریسٹ اٹلی اور امپریل کالج میں اپنی دوہری ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے کیسے وقت نکالتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ وہ ہر مہینے کے بیس دن عام طور پر ٹریسٹ اٹلی میں اقوام متحدہ کے انسٹی ٹیوٹ آف تھیورٹیکل فزکس میں گذارتے ہیں اور بقیہ دس دن لندن کے امپریل کالج میں کام کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں لندن سے اپنا کھانا پکوا کر ٹریسٹ لے جاتا ہوں اور اسے فرج میں رکھتا ہوں۔ میں الگ تھلگ زندگی گذارتا ہوں اور اپنا بیشتر وقت ریسرچ اور تعلیمی سرگرمیوں میں گذارتا ہوں۔ انہوں نے پاکستان کے لوگوں کو عام طور پر اور سائنسدانوں کو خاص طور پر نصیحت کی کہ وہ ہر کام کے لیے حکومت پر انحصار کرنا کم کر دیں۔ وہ خود فنڈ

اکٹھے کریں اور اپنے منصوبے چلائیں۔ جب تک یہ جذبہ پیدا نہیں ہو گا' زیادہ ترقی ممکن نہیں ہو گی۔ اپنے اس نظریہ کے بارے میں جس پر ان کو نوبل انعام ملا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ابھی کچھ کہنا بہت قبل از وقت ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستانی سائنسدانوں اور ماہرین میں بہت صلاحیتیں ہیں اور اگر ان کو مواقع ملیں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

(حریت' نوائے وقت کراچی 1980-1-3/1980-1-18)

کراچی کے ہوائی اڈے پر کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر' این۔ای۔ڈی انجنیرنگ اور ٹیکنالوجی کے وائس چانسلر' گورنر سندھ کے ملٹری سیکرٹری' وزارت امور خارجہ کے نمائندہ' اعلیٰ سرکاری حکام' ماہرین تعلیم' دوستوں اور رشتہ داروں نے بھائی جان کو خدا حافظ کہا۔ اس طرح ان کا یہ سرکاری دورہ بخیر و خوبی اپنے اختتام کو پہنچا۔

(ایوننگ سٹار و لیڈر 1980-1-2)

13

نوبیل انعام ملنے کے بعد جمیل الدین عالی کے جنگ اخبار کے "نقار خانے" میں تبصرے

پاکستان کے مشہور شاعر' دانشور اور کالم نگار جمیل الدین عالی ایک عرصہ سے روزنامہ جنگ کراچی میں "نقار خانے میں" کے عنوان سے لکھ رہے ہیں۔ بھائی جان کو نوبل انعام ملنے کے اعلان کے تین دن بعد انہوں نے "نقار خانے میں" جو کچھ لکھا اسے روزنامہ جنگ کراچی کے شکریہ کے ساتھ نقل کیا جا رہا ہے۔ یہ تبصرہ اخبار کی اشاعت مورخہ 19 اکتوبر 1979ء میں شائع ہوا تھا۔

دو ناکام ہیرو--- محترمہ تھریسا اور ڈاکٹر عبدالسلام

پاکستانی دانش بھی عظیم امکانات رکھتی ہے

بالآخر "دو ناکام" شخصیات کو ایک عالمی سطح پر ہیرو تسلیم کر لیا گیا۔

پہلا نام مدر تھریسا۔ مدر ان کا مذہبی لقب ہے کیونکہ وہ نن ہیں۔ دراصل وہ سیدھی سادی محترمہ تھریسا ہیں جو کوئی چالیس برس سے ہمارے نظام اقدار کے مطابق ایک ناکام زندگی گزار رہی ہیں۔

آخر ہمارے نظام اقدار کے مطابق ناکام زندگی اور کیا ہوتی ہے۔ کیا محترمہ کسی بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ کیا انہوں نے ورثے میں کوئی جاگیر پائی یا از خود دولت بنائی۔ وہ تو امریکی چاند گاڑی میں بیٹھ کر چاند پر بھی نہیں پہنچیں۔ اس نوبل انعام برائے امن کے اعلان تک وہ تقریباً گم نام تھیں۔ کام کیا کرتی تھیں۔ چھی چھی چھی کوڑھیوں اور جذامیوں کی خدمت۔ اگر کوئی صاحب یا صاحبہ ہمارے معاشرے سے اٹھ کر ایسی خدمات شروع کر دیں تو عامطور پر ان کا کوئی نوٹس نہیں لیا جاتا۔ کسی طرح نوٹس لینے کے قابل ہو جائیں تو عام طور پر دو قسم کی رائے ظاہر کی جاتی ہے۔ فوری طور پر تو یہ کہ جی یہ بھی کوئی پیسے بنانے کا چکر ہو گا۔ کچھ بقراطی کی گئی تو یہ کہ انہیں کوئی نفسیاتی مرض ہے۔ ان کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہو گا جو انہیں ادھر لے آیا۔ بہرطور "خیر برائے خیر" کی داد تقریباً ناپید ہو گئی ہے۔ کوئی اللہ کا بندہ ان سے "خیر برائے خیر" کی تھیوری منسوب کرے تو اس کا بھی مذاق اڑایا جائے گا۔

پھر بھی میں نے دیکھا کہ ہمارے معاشرے میں بھی کچھ خاموش کارکن ہیں جو خلق اللہ کی خدمت محض راہ خدا میں کرتے رہے ہیں۔ اکثر انہیں کوئی نہیں پوچھتا۔ ان کے محلے والے جانتے ہیں یا اس ادارے کے لوگ جہاں وہ کام کرتے ہیں اور ان میں بیشتر انہیں "خیر برائے خیر" کا کریڈٹ نہیں دیتے بلکہ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوا ہے کہ ایسے خاموش کارکن "بڑی خدمت" کے خیال سے سیاسی عمل میں شامل ہو گئے ہیں مگر

پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار

ان کا حشر فوراً ہی اور بہت دن کے لیے خراب ہوتا ہے۔

لیکن اس سب کے باوجود ایک نہ ایک تعداد خلق اللہ کی خدمت کیے جاتی ہے جو بھی ان کی بساط ہو جتنا مقدور ہو جو بھی دائرہ کار ہو۔ وہ لوگ اپنے طور پر زیادہ سے زیادہ انسانوں کے لیے کچھ نہ کچھ کیے جاتے ہیں۔ آفرین ہے ایسے لوگوں پر' وہ بہت کم ہیں مگر جتنے بھی ہیں جہاں بھی ہیں' گم نام ہوں یا مشہور یا بدنام اللہ ان کے دلوں' ان کی نیتوں کا حال جانتے ہوئے ان پر مہربان رہے۔ وہ نہ ہوں تو انسانیت کا نام محض عہدہ اور دولت ہو کر رہ جائے۔

کاش میں محترمہ تھریسا عرف ناکام البانوی کا انٹرویو لے سکتا۔ میں ان سے پوچھتا اور وہ بتاتیں کہ ان کا کیا کیا مذاق اڑایا گیا۔ وہ زندگی کی کن کن نعمتوں اور "امکانات" سے محروم رہیں اور ان کے اتنے نیک اور بے ضرر کام میں بھی کیا کیا مشکلات پیش آئیں۔ ان کے گھر والے کتنے دکھ کے ساتھ ان سے خفا رہے۔ ان کے احباب نے' اساتذہ نے' ناقدین نے ان کو کن کن الفاظ میں کمزور' بے عمل' ایب نارمل (ABNORMAL--- ناقل) اور "مریض" قرار دیا۔ کتنوں نے انہیں خود غرض' مہم جو' شہرت پسند اور نمائشی سمجھا۔ غرض یہ کہ ان کے ساتھ کیا کیا گذری یہاں تک کہ اللہ نے انہیں اتنی زندگی اور نوبل کمیٹی کو اتنی عقل دی کہ وہ انہیں نوبل انعام کا مستحق قرار دیں۔

اس فیصلے سے نوبل انعام کمیٹی نے کسی حد تک اپنی وہ بدنامی کم کر دی جو اس نے پچھلے سال کمائی تھی۔ یہ وہی جانے۔ پچھلے سال امن کے انعام میں بیگن وزیراعظم اسرائیل کو شریک کیا گیا تھا۔ جبکہ بیگن انسان دشمنی اور دہشت پسندی کے معاملہ میں ہمیشہ سے ایک نہایت رسوائے زمانہ شخصیت رہا ہے۔ بیگن نے شروع سے مظلوم فلسطینیوں کے خلاف طرح طرح کی مہمات چلائیں۔ پہلے خفیہ حملے کراتا تھا۔ اسرائیل بننے کے بعد برابر جنگجویانہ پالیسوں کا حامل رہا۔ سرزمین فلسطین پر غاصبانہ قبضے کے لیے تمام شرمناک طریقے اختیار کیے' کھلی جنگ کی' جنگ کے بعد مقبوضہ علاقوں میں مسلسل جارحیت کا مرتکب ہوتا ہے۔ لبنان کی آزاد ریاست میں پی ایل او کے ٹھکانوں پر حملے کراتا ہے۔ جہاں پی ایل او والے نہیں

ہوتے۔ وہاں بھی بمباری کراتا ہے۔ ایسے آدمی کو نوبل انعام اور وہ بھی انعام برائے امن میں شریک کرنے سے نوبل فاؤنڈیشن پر بڑا دھبہ آ گیا ہے۔ پچھلے سال چند امریکی اخبارات کو چھوڑ کر باقی تمام دنیا نے اس فیصلے پر سخت اعتراض کیے تھے۔

نوبل انعام برائے امن ناروے کے صدر مقام اوسلو (OSLO) میں دیا جاتا ہے جبکہ باقی دوسرے شعبوں کے انعامات اسٹاک ہوم میں پیش ہوتے ہیں جب آنجہانی الفریڈ نوبل نے یہ انعام قائم کیا تھا۔ سویڈن اور ناروے علیحدہ علیحدہ ملک ہوتے ہوئے بھی ایک انتظامی ریاست بنے ہوئے تھے۔ نوبل سویڈیش تھے انہوں نے احتراماً اپنی وصیت میں لکھ دیا کہ امن کا انعام ہمیشہ اوسلو میں پیش کیا جائے۔ بعد میں ناروے اور سویڈن الگ الگ ہو گئے مگر دونوں حکومتوں کی باہمی رضامندی سے وصیت پر اسی طرح عمل کیا جاتا ہے۔ بہرحال اوسلو کی تقریب اکثر عالمی تنازعات کا شکار رہتی ہے جب ڈاکٹر ہنری کیسنجر کو امن کے لیے شریک انعام کیا گیا تھا۔ اس وقت بھی ہنگامہ ہوا تھا۔ مگر بیگن کو امن کا ہیرو قرار دینا سخت فاحش غلطی تھی۔ نوبل کمیٹی کا شعبہ برائے امن اب تک عالمی رائے عامہ کے زیر عتاب رہا ہے۔ بہرحال اس بار محترمہ تھریسا کو یہ انعام پیش کر کے نوبل کمیٹی نے ایک مرتبہ پھر اپنی ساکھ بحال کرنے کی کوشش کی ہے۔

پاکستانی برطانیہ والے

دوسرے ایک وقت کے ناکام صاحب ڈاکٹر عبدالسلام ہیں جنہیں شعبہ طبیعات میں نوبل انعام دیا گیا ہے۔ ویسے طب اور سائنس میں پہلے بھی کئی بار دو دو، تین تین افراد شریک انعام کیے گئے ہیں۔ ابھی پچھلے سال ہی طب کے شعبے میں تین انعام یافتگان تھے۔ "شرکت" سے ان کی فضیلت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ ایک طرح اس کی اہمیت زیادہ ہو جاتی ہے کیونکہ اس طرح کسی سیاسی یا علمی جانبداری کا الزام نہیں لگ سکتا۔ انعامی رقم پوری ہوتی ہے۔ اعزاز بھی سب کا برابر ہوتا ہے۔

اب ڈاکٹر عبدالسلام کو پاکستان کی طرف سے تہنیتی پیغامات ضرور گئے اور یہ انعام ملنا پاکستان کی مختصر سی تاریخ میں ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔ لیکن جب یہ اعلان اور تہنیتی پیغامات اور اداریئے دیکھے تو میری ایک آنکھ ہنسی اور ایک آنکھ روئی۔ یہ ہی ڈاکٹر عبدالسلام تھے، یہ وہی ڈاکٹر عبدالسلام ہیں۔

اب جناب واضح رہے کہ یہ عاجز ایک سنی حنفی مسلمان ہے کبھی آپ قادیانی کہہ دیں۔ چاہیں تو ڈاکٹر صاحب کے بارے میں معاصر "ڈان" کا تعریفی اداریہ بھی ملاحظہ ہو۔ ان معاملات میں کسی کے مذہبی اعتقادات سے کوئی سروکار نہیں رکھا جاتا۔ وہ ایک الگ معاملہ ہے۔ ہم انہیں ایک پاکستانی شہری کے طور پر لے رہے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ یہی ڈاکٹر عبدالسلام برسوں وفاقی وزارت تعلیمات کے چکر لگاتے تھے۔

ایوان صدر جاتے تھے (جب صدارتی نظام تھا) کہ ایک وزارت سائنس قائم ہو جائے۔ اور پاکستان میں بڑے پیمانے پر سائنس کی ترویج شروع ہو۔ میں تو شاید ان کو یاد بھی نہ ہوں۔ کیونکہ ہماری ملاقات ایسی نہیں رہی۔ جو وہ مجھ عاجز کو یاد رکھیں لیکن مجھے ان کی کوششیں ان کی دردمندیاں' ان کی مایوسیاں خاصی اچھی طرح یاد ہیں کیونکہ میں ان حلقوں کو خوب جانتا تھا جن سے معاملہ کرنے پر وہ مجبور تھے۔

ڈاکٹر عبدالسلام کا موقف یہ تھا کہ پاکستان میں سائنس کا مزاج رکھنے والے طلباء و طالبات کی کمی نہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی پاکستان کی ناگزیر ضرورت ہے۔ پاکستان سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعہ' زرعی' تجارتی اور صنعتی ترقی بھی کر سکتا ہے اور اقوام عالم میں اپنا ایک مقام بھی بنا سکتا ہے۔ اس لیے وزارت تعلیم سے الگ ایک وزارت سائنس قائم ہونی چاہیے۔ مجھے یہ بھی یاد پڑتا ہے (گو یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا) کہ وہ پاکستان آکر کام کرنا چاہتے تھے (یہ ان کی شدید خواہش تھی۔ مرتب)

اس زمانے میں ان کے ہمنوا صرف ڈاکٹر عشرت حسین عثمانی ہوا کرتے تھے۔ باقی سب متعلقہ وزراء اور سیکرٹری صاحبان ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ ان کی دل شکنی کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ عثمانی عبدالسلام گٹھ جوڑ ہے ایک الگ وزارت بنا کر پیسے کھانا اور اقتدار میں آنا چاہتے ہیں۔ پاکستان کو ایک الگ تھلگ وزارت سائنس کی ضرورت بھی نہیں اور یہ دونوں فراڈیئے ہیں انہیں کچھ آتا جاتا نہیں۔ سائنس میں ڈگریاں لے رکھی ہیں جو ہر کوئی لے سکتا ہے مگر قابلیت ان میں سے کسی میں نہیں۔

میں ان حضرات کا نام نہیں لینا چاہتا کیونکہ مقصد تحریر ان کا نام لینا نہیں' آج کے نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر عبدالسلام کے ساتھ اس حسن سلوک کا تذکرہ کرنا ہے جو برسوں ہم نے ان کے ساتھ روا رکھا۔ لیکن اگر ڈاکٹر عثمانی اور ڈاکٹر عبدالسلام سے پوچھا جائے تو وہ ضرور تصدیق کریں گے کہ انہیں ایک زمانے میں کیسی کیسی مشکلات کا سامنا تھا۔ مجھے ڈاکٹر عثمانی صاحب سے بھی کوئی خاص عقیدت نہیں بلکہ اردو کے معاملے میں ان کے موقف پر میرے انتہائی سخت تبصرے' ان کے زمانہ اقتدار میں اسی کالم میں چھپ چکے ہیں۔ اب کوئی دس برس سے انہیں دیکھا بھی نہیں مگر یہ ان کا حق ہے کہ موقع آئے تو پاکستان میں سائنس کے فروغ پر ان کی آرزوؤں اور کوششوں کا ذکر کیا جائے۔

وقت نے کیا دکھایا ڈاکٹر عثمانی عالمی ادارہ برائے جوہری توانائی میں ایک بہت اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوئے۔ کسی ایشیائی کوٹے کے چکر میں نہیں بلکہ اپنی فضیلت کی بناء پر اور ڈاکٹر عبدالسلام کو بھی کسی سیاسی مصلحت کی بناء پر نہیں بلکہ خالص تحقیقی فضیلت ثابت ہونے پر دنیا کا سب سے مشہور اور موقر انعام پیش کیا گیا۔ وقت نے یہ بھی دکھایا کہ پاکستان میں ایک علیحدہ وزارت سائنس قائم ہوئی۔ ابھی کمزور سہی' گم نام سہی مگر وقت نے منوا کر چھوڑا کہ پاکستان میں سائنس کو اولین ترجیحات میں شامل ہونے کا حق تھا۔

سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر عبدالسلام پاکستانی کو پاکستان نے کام کے لیے کیا سہولتیں دیں۔ ایک زمانے میں

شاید سفر کی آسانیاں مگر انہیں اپنے کام کرنے کے لیے تو باہر زیادہ آسانیاں میسر تھیں ان کی اصل کشمکش یہ تھی کہ پاکستان میں ایسے مرکز بنیں جو سائنسی تحقیقات اور معلومات کی دولت پاکستانی کام کرنے والوں کو مہیا کریں۔ اس میں ان کی اپنی کوئی تنخواہ نہیں بڑھتی تھی۔

یہاں سے دل برداشتہ ہو کر وہ یونہی نہیں بیٹھ گئے تھے۔ وہ لندن کے امپریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی میں پروفیسر کی حیثیت سے پڑھاتے اور اپنی روٹی کماتے ہیں۔ انہیں 1968ء میں ایٹم برائے امن کا ایک بڑا انعام بھی مل چکا ہے اور وہ کئی بین الاقوامی کمیٹیوں کے رکن بھی ہیں مگر سائنس کے لیے ان کی لگن ختم نہیں ہو سکی۔ انہوں نے ٹریسٹ (TRIESTE) کے مقام پر 1964ء میں ایک مرکز قائم کیا "مرکز برائے نظری طبیعات" جو تیسری دنیا کے سائنسدانوں کے لیے مخصوص ہے۔ اس مرکز میں تیسری دنیا کے سائنس دان جمع ہو کر تبادلہ علم کرتے ہیں۔ خیال فرمایا آپ نے جس شخص کو ایک زمانے میں پاکستان کے برسر اقتدار حلقے خود پاکستان میں ادارہ قائم نہ کرنے دیں۔ تیسری دنیا کے اتنا اہم ادارہ قائم کرتے ہوئے اپنی انتظامی صلاحیت اور اعتبار کا ثبوت دیتا ہے۔ بڑے بڑے بین الاقوامی اعزازات لیتا ہے یہاں تک کہ دنیا کی سب سے بڑی سند نوبل انعام برائے طبیعات لے کر دکھا دیتا ہے۔

وہ 1961ء سے 1973ء تک اعلیٰ ترین سرکاری سطح پر پاکستان کے مشیر سائنس ضرور رہے اور انہیں یہ سرکاری اعزازی عہدہ دینے کا کریڈٹ صدر ایوب مرحوم کو جاتا ہے مگر یہ بھی اس وقت ہوا تھا جب ان کی صلاحیتوں کو بڑے پیمانے پر بین الاقوامی حلقوں میں تسلیم کیا جا چکا تھا۔ اور اصل بات تو یہ تھی کہ ان کی سنی جاتی' انہیں اختیارات کامل نہ دیتے' وزارت سائنس تو قائم کر دیتے۔ آج وہ وزارت ابتدائی مشکلات سے گزر کر فعال ہو چکی ہوتی۔ کام اس سے زیادہ ہو چکا ہوتا جتنا اب تک ہوا ہے (کتنا ہوا مجھے معلوم نہیں)

کیا ان واقعات سے کوئی سبق لیا جا سکتا ہے؟ بہت کچھ اور کچھ بھی نہیں۔ کیا پاکستان میں کوئی فرد مدر تھریسا کی طرح خدمت خلق نہیں کر رہا۔ میرے خیال میں بہت ہیں مگر ہم خود انہیں دباتے ہیں جب ہم انہیں خود ہی دبائیں گے تو باہر والے انہیں کیسے جانیں گے۔

اور کیا یہ ثابت نہیں ہوا کہ پاکستانی ہونا کسی معاملے میں کوئی بنیادی نااہلی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں ایک عام تاثر یہ قائم ہے کہ کوئی پاکستانی کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا جبکہ یہ تاثر اصولاً" ہی غلط ہے۔ ہاں ہمارے ہاں بڑے تحقیقی کاموں کے لیے ماحول ہمیشہ سے ناسازگار چلا آ رہا ہے لیکن بنیادی طور پر ہمارے ذہن دوسری قوموں کے ذہنوں سے کسی طرح کم نہیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام پاکستان ہی کی پیداوار ہیں۔ ان کی ابتدائی اور زیادہ تعلیم پاکستان ہی میں ہوئی تھی۔ نہ جانے آج کتنے ڈاکٹر عبدالسلام کن کن اداروں میں کیا عزائم لیے سازگار ماحول کے منتظر ہیں۔

دوستو! پاکستان "دانش" کے لحاظ سے بھی عظمتوں کے بڑے بڑے امکانات رکھتا ہے۔ کوئی عظمت ایسی نہیں جو ہمیں نہ مل سکے مگر مگراب دوسری کہانی شروع ہو جائے گی۔ چھوڑیئے۔

یکم جنوری 1980ء کو ڈاکٹر ظفر حسن نے کلفٹن کراچی میں اپنے گھر پر بھائی جان کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا تھا۔ جس میں کراچی کی صعنتی اور کاروباری برادری مدعو تھی۔ اس عشائیہ کے بارے میں جمیل الدین عالی نے روزنامہ جنگ کراچی میں اپنے کالم "نقار خانے میں" لکھا:

"پچھلے ہفتے کراچی میں ایک شاندار ڈنر ہوا۔ کاروباری حضرات کی طرف سے ڈاکٹر عبدالسلام کے اعزاز میں نہ جانے کیوں مگر میزبان خصوصی نے مجھ عاجز کو بھی مہمان عمومی بنانا پسند کیا۔ اللہ انہیں خوش رکھے بعد طعام ڈاکٹر صاحب سے تقریر کے لیے کہا گیا۔ وہ بیچارے دس بارہ دن سے تقریریں ہی کر رہے تھے۔ یہاں بھی کھڑے ہو گئے۔ کوئی بقراطی نہیں دکھائی بس ایک ہی تان لگائی "حضرات سائنس کو فروغ دیجئے۔ کراچی میں بڑے بڑے صعنت کار' تاجر' جاگیردار رہتے ہیں اور جامعہ کراچی کے شعبہ طبیعات کا بجٹ صرف دس ہزار روپے سالانہ ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا مگر شیخ الجامعہ ڈاکٹر ترمذی با اصرار بتا رہے ہیں کہ یہی ہے"

جب وہ اس مقام پر پہنچے مجھے بڑی ہنسی آئی۔ ان کی ذہانت اور قابلیت کا اعتراف تو دنیا کا سب سے بڑا اعزاز کر چکا ہے مگر مجھے ان کی پاکستان سے لاعلمی پر بڑا رحم آیا۔ ارے میاں اتنے دن باہر رہنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ باہر رہ کر نوبل انعام تو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ حقائق پاکستان سے واقف نہیں ہوا جا سکتا۔

خیر ڈاکٹر صاحب بے چارے بولتے رہے' مجھے چندہ نہ دیجئے حکومت کو نہ دیجئے۔ اپنے آپ کو دیجئے۔ اپنے سائنسی اداروں کو دیجئے۔ حکومت سب کام نہیں کر سکتی۔ زندہ قوموں میں ایسے کام خود قوموں کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ دیکھئے ٹریسٹ کے سائنسی مرکز کا خرچ مقامی آبادی چندے سے جمع کرتی ہے۔ ہم تیسری دنیا والوں کے لیے اور میں نے اپنی انعامی رقم اس مرکز کی معرفت جھنگ میں تعلیمی مقاصد کے لیے دے دی ہے۔" خطباتی کلیات و محاورات کی پوری ایک قطار انہوں نے اپنی تقریر میں لگا دی۔ ویسے بڑی سادگی سے بول رہے تھے مگر ان کے انداز تقریر سے بڑی دلسوزی ٹپکتی تھی۔ درد مند وغیرہ بھی لگ رہے تھے۔

جب وہ بیٹھ گئے تو کوئی بھی کھڑا نہیں ہوا۔ سب اسی طرح بیٹھے رہے جیسے بیٹھے تھے۔ ان کے پاس صاحب خانہ تشریف رکھتے تھے اور اتفاق سے میں اس وقت صاحب خانہ کے پاس والی کرسی پر براجمان تھا (اس وقت نہیں جب تصویریں کھنچ رہی تھیں بلکہ کھانے کے بعد جب کچھ لوگ چلے بھی گئے تھے) ڈاکٹر صاحب نے چند لمحے توقف کرنے کے بعد میری طرف سوالیہ انداز سے دیکھا۔ میں نے بلا توقف ان کی آنکھوں سے سوال شروع کر دیئے۔

"کیا آپ کسی کو پرمٹ، لائنس، ٹھیکہ وغیرہ دے سکتے ہیں۔"

"نہیں! ان کی آنکھوں نے کہا۔"

"کیا آپ کوئی صاحب اقتدار یا اہل اختیار ہیں۔"

"نہیں! ان کی آنکھوں نے کہا۔"

"کیا آپ کوئی زبردست مذہبی رہنما ہیں یعنی کیا آپ کی ذات سے کوئی تقدس اور وعدہ جنت وغیرہ وابستہ ہے۔"

"نہیں! ان کی آنکھوں نے کہا۔"

"پھر آپ ہمارے معاشرے سے کیا توقع رکھتے تھے۔"

"بہت کچھ! ان کی آنکھوں نے کہا۔"

"بھولے بادشاہ یہی بہت ہے کہ سرکاری اور تعلیمی اداروں نے نوبل انعام کے بعد تمہیں اتنا اعزاز دے دیا۔ بس اب واپس جاؤ اور اپنے کام سے لگو۔"

"ابن الحسن نے میر خلیل الرحمٰن سے کہا۔ میر صاحب یہاں تو کچھ لوگ الٹا یہ پوچھ رہے ہیں کہ یعنی ڈاکٹر صاحب کتنی ایڈ لائے تھے۔ مزید کیا دلوائیں گے۔

میں نے کہا حضرت! اصولا" تو درست ہے کہ ایسے کام پرائیوٹ افراد اور اداروں کا فرض بھی ہیں مگر حقائق پاکستان یہ ہیں کہ آخر یہ ذمہ داریاں بھی حکومت ہی کو ادا کرنی پڑتی ہیں اور حکومت کی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں آمدنی کم۔ خرچ زیادہ وہ تو اپنے حساب سے ہی چلے گی۔

پھر بے چارے چپ چپ سے بیٹھے رہے۔ بہرحال اس پر خوش تھے کہ حکومت نے آئندہ بجٹ کا ایک فیصد سائنس پر خرچ کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ہم بھی خوش تھے-----"

14

نوبل انعام ملنے کے بعد جنوبی امریکہ کے چند ممالک کی ڈاکٹر عبدالسلام کی عزت افزائی

لندن سے روزنامہ ڈان کراچی کے نمائندہ یحییٰ سید کی رپورٹ کا ترجمہ۔ یہ رپورٹ اخبار کی 3 فروری 1980ء کی اشاعت میں شائع ہوئی۔

(لندن 2 فروری 1980)

پاکستانی نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام جنوبی امریکہ کے چار ممالک کا کامیاب دورہ کرنے کے بعد پچھلی جمعرات کو لندن واپس آئے۔ اس دورہ میں ان پر کئی اعزازت نچھاور کیے گئے جن میں پیرو کے ریڈ انڈین کے ایک قدیم شہر کزکو (CUZCO) کی اعزازی شہریت بھی شامل ہے۔

برازیل، پیرو، کولمبیا اور وینزویلا کی دعوت پر پروفیسر سلام 14 جنوری کو لندن سے روانہ ہوئے۔ ان ممالک میں اعزازی ڈگریاں وصول کرنے کے علاوہ انہوں نے مختلف یونیورسٹیوں میں اس موضوع پر لیکچر دیئے جس میں انہیں فزکس کا نوبل انعام دیا گیا تھا۔

برازیل کے نائب صدر چینز (CHENSE) کولمبیا کے صدر ٹربی (TURBEY)، وینزویلا کے صدر ہارویرو (HARRERO) اور پیرو کے وزیر خارجہ جو کان کنی کے بھی وزیر ہیں نے اپنے اپنے ملک میں پروفیسر سلام کا استقبال کیا۔

وینزویلا کے صدر ہارویرو نے انہیں اپنے ملک کا سب سے بڑا ایوارڈ "نشان اندرس بیلو" دیا۔ اس کے علاوہ وہاں کی سائمن بولیوار یونیورسٹی کراکس (CARACUS) نے انہیں ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی ڈگری دی۔

پیرو میں کزکو یونیورسٹی جس کا نام ایک بہت ہی پرانے ریڈ ایڈین شہر کے نام پر ہے، نے ڈاکٹر سلام کو ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی ڈگری دی۔ اس کے علاوہ وہاں کی حکومت نے انہیں اس قدیم ریڈ انڈین شہر کا اعزازی شہری بنایا۔

برازیل کے نائب صدر چینز سے ملاقات کے وقت وہاں متعین پاکستانی سفیر اے ایچ احسانی بھی پروفیسر سلام کے ہمراہ تھے۔

لاطینی امریکہ کے چاروں ممالک کے اخبارات نے ان کے اعزاز میں خصوصی نمبراور ضمیمے نکالے جبکہ ان ممالک کے ذرائع ابلاغ نے ان کے انٹرویو نشر کیے۔

وہ جس ملک میں بھی گئے انہوں نے وہاں کی حکومت کو یہ رائے دی کہ وہ اپنے ہاں تحقیق کے لیے ادارے قائم کریں جن میں ترقی پذیر ممالک سے طالب علم مختلف مضامین میں ریسرچ کرنے کے لیے آ سکیں ونزویلا کی حکومت کو پروفیسر سلام نے مشورہ دیا کہ وہ اپنے ہاں پیٹرولیم انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی قائم کرے۔ ان کی اس تجویز کا خیر مقدم کیا گیا۔ کولمبیا کی حکومت کو انہوں نے مشورہ دیا کہ وہ اپنے ملک میں شمسی توانائی کے لیے انسٹی ٹیوٹ قائم کریں جبکہ پیرو کی حکومت کو انہوں نے مشورہ دیا کہ وہ کان کنی اور معدنیات کے لیے سنٹر بنائیں۔ ان کی تجویز کو فوری طور پر منظور کر لیا گیا۔

برازیل کے نائب صدر نے پروفیسر سلام کے اس مشورہ کو منظور کر لیا جس میں انہوں نے برازیل کی حکومت سے کہا تھا کہ وہ الکحول (ALCOHOL) کو توانائی کے حصول کے لیے متبادل کے طور پر استعمال کریں۔

پروفیسر سلام نے بتایا کہ ”لاطینی امریکہ کے ممالک نے میری جو عزت افزائی کی تھی اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ میں پاکستانی ہوں اور ان جیسے ترقی پذیر ملک کا سائنسدان ہوں۔“

15

گورونانک دیو یونیورسٹی امرتسر میں بھائی جان کی پنجابی تقریر کا اردو میں ترجمہ

گورونانک دیو یونیورسٹی۔ امرتسر (پنجاب انڈیا) نے اپنی دسویں سالانہ کینووکیشن کے موقع پر 25 جنوری 1981ء کو بھائی جان کو "ڈاکٹر آف سائنس" کی اعزازی ڈگری دی تھی جسے وصول کرنے کے بعد انہوں نے پنجابی میں تقریر کی تھی۔ اس کا اُردو میں ترجمہ درجہ ذیل میں پیش ہے:

(مرتب)

بھائی جان کی پنجابی تقریر کا اردو ترجمہ

جناب چانسلر صاحب، وائس چانسلر صاحب، حضرات---- میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے خوبصورت الفاظ میں (تالیاں) اپنی محبت اور شفقت کا اظہار کیا ہے اور مجھے ڈگری دی ہے۔ اس کے لئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس اعزاز سے پاکستان میں بھی خوشی کی ایک لہر آئے گی۔ اس موقع پر میں ہندوستان کی حکومت، انڈین فزکس ایسوی ایشن، سی ایس آئی آر، کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے موقعہ دیا ہے اور ہندوستان میں مختلف جگہوں پر مجھے ڈگریاں دی ہیں۔ دوسری بات جس کے لئے میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ نے میری درخواست قبول کرتے ہوئے میرے استاد لالہ ہنس راج بھاٹلا جو آخر میں بیٹھے ہوئے ہیں، کو یہاں مدعو کیا۔ (تالیاں) لالہ ہنس راج بھاٹلا نے مجھے جھنگ کالج میں فزکس پڑھائی تھی۔ ان سے فزکس کے بارے میں جو کچھ میں نے سیکھا تھا اس کے بعد مجھے کچھ مشکل درپیش نہیں آئی۔ اسی طرح سامعین میں لالہ ایش کمار جی جو میرے انگلش کے استاد تھے، بھی تشریف رکھتے ہیں۔ اگرچہ ابھی تک میں ان سے ملاقات نہیں کر سکا۔ (تالیاں) ان سب کو مدعو کرنے پر میں آپ کا بہت مشکور ہوں۔ ہمارے مذہب اور ہماری تہذیب میں والدین کے بعد استاد کی عزت سب سے زیادہ کی جاتی ہے۔ ماں باپ کے بعد استاد ہی ہمیں سب سے زیادہ محبت دیتے ہیں۔ اس لئے یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم بھی ان کی اسی طرح عزت کریں جس طرح ہم اپنے والدین کی عزت کرتے ہیں۔ اور جس طرح یہ یقینی بات ہے کہ میں طلبا کو خطاب کر رہا ہوں۔ جہاں تک میری زندگی کا تعلق ہے یہ بھی یقینی بات ہے کہ میرے کیریر (Career) کو بنانے میں، میرے اساتذہ کا دخل رہا ہے۔

مجھے وہ وقت یاد آ رہا ہے جب میں جھنگ میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ مولوی محمد لطیف صاحب نے ہمیں سمجھایا کہ کسی عبارت کا خلاصہ (Precis) کیسے لکھا جاتا ہے پھرانہوں نے ایک عبارت پڑھی اور کلاس سے کہا کہ اس عبارت کی (Precis) (خلاصہ) لکھیں چنانچہ ہر طالب علم نے (Precis) لکھی۔ میں کلاس میں ہمیشہ اول آیا کرتا تھا۔ جب مولوی صاحب نے میری (Precis) دیکھی تو انہوں نے مجھے کہا کہ میں کلاس کے آخر میں جا کر کھڑا ہو جاؤں (بطور سزا کے۔ ناقل--- مترجم) مجھے اس بات پر بہت شرمندگی ہوئی۔ وہ ساری کلاس کا معائنہ کرنے کے بعد میرے پاس آئے اور انہوں نے فرمایا کہ "خدا نے تجھے بہت اچھا دماغ دیا ہے۔ تم نے میرا ایک ایک لفظ سن کر اسی طرح لکھ دیا ہے اسے (Precis) (خلاصہ) نہیں کہتے۔ تمہیں ساری عمراپنے آپ کو (Discipline) کرنا پڑے گا۔ چنانچہ ان کا وہ سبق میں اب تک نہیں بھولا۔ انہوں نے مجھے سزا دی اور میرے ساتھ شفقت سے بھی پیش آئے۔

جناب وائس چانسلر صاحب نے میرے اس کام کا ذکر فرمایا ہے جس پر مجھے انعام (مراد نوبل انعام مترجم) دیا گیا۔ انہوں نے میری تھیوری اتنے خوبصورت الفاظ میں بیان فرمائی ہے کہ اس بارے میں میرا کچھ کہنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اس تھیوری کی بنیاد وحدت پر ہے۔ ہمارے اور ان لوگوں کے دلوں میں جن کی شروع سے اس قسم کی ٹرینگ ہوئی ہو۔ ان کے ذہنوں میں یہی خیال ڈالا گیا ہو کہ وحدانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس قسم کے اصول تلاش کریں گے لیکن میں اسے صحیح نہیں سمجھتا کہ ہم اس طرح سے اللہ کی ذات کو تلاش کریں۔ تو ہماری تلاش ضرور صحیح ہو۔ اس بارے میں موجودہ اور پرانی سائنس میں فرق یہ ہے کہ ہمیں ہر ایک بات کو ٹسٹ کرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ ٹسٹ کامیاب نہ ہو تو ہمیں اس نظریہ کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ سو اس لحاظ سے یہ اللہ کی دین ہے کہ آپ جن خیالات سے شروع کرتے ہیں' وہ آگے چل کر صحیح ثابت ہوں۔ اس کی مثال میں ایسے دیتا ہوں کہ آج کل کائنات کے وجود میں آنے کے بارے میں دو تھیوریاں (نظریے) ہیں۔ ایک نظریہ تو یہ ہے کہ اللہ کی ذات نے کائنات کو شروع سے بڑا متناسب (Symetrical) بنایا ہے۔ اس کے بعد ہمیں سمٹری میں کمی (Lack of Symetry) نظر آتی ہے جو بعض (Dynamical Circumstances) کا نتیجہ ہے جن کی شروع سے ہی بنیاد متناسب (Symetrical) تھی۔ دوسری تھیوری (نظریہ) بالکل اس کے برعکس ہے۔ وہ تھیوری یہ ہے کہ جب کائنات وجود میں ائی تو اس وقت ابتری (Chaos) کی حالت تھی جس کے بعد اس میں آہستہ آہستہ انجذاب ہوا جس کے نتیجہ میں اس میں سمٹری کے اصول نظر آنے لگے۔ کائنات کی بنیاد کے متعلق ایسے تجربات نہیں کیے گئے جن سے ان دونوں نظریوں میں فرق پایا جا سکے- جو لوگ پرانے پس منظر کی وجہ سے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اللہ کی ذات نے ہر ایک چیز کو متناسب بنایا ہے۔ میں انہی لوگوں میں سے ہوں اور اسی قسم کے نظریہ پر کام کروں گا اور دوسری تھیوری (نظریہ) کو

موقوف کر دوں گا۔ لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ دوسرا نظریہ زیادہ درست ہو۔ بطور سائنسدان میں کہہ سکتا ہوں کہ اب تک تو پہلی تھیوری (نظریہ) زیادہ صحیح ثابت ہوئی ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ میں بطور سائنس دان اور بطور (Rationalist) (عقلی دلائل کا حامی) جیسے وائس چانسلر صاحب نے فرمایا میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اگلے تجربات کیسے ہوں گے۔ لیکن جس طرح آپ کی مذہبی (Environmental) ٹریننگ کی گئی ہے۔ یہ بات آپ کی سائنس پر اثر انداز ہو گی۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ یہ تمام باتیں وحدت کی طرف لے گئیں۔ پہلے نیوٹن نے اس بات کا اعلان کیا کہ سیب کو زمین پر گرانے والی کشش اور سیاروں کو سورج کے گرد گھمانے والی کشش دونوں دراصل ایک ہی ہیں۔ یہ ایک وحدت ہی تھی جو اس شخص نے بتائی۔ اس کے بعد وحدت کا دوسرا کرشمہ فیراڈے اور میکسوئل نے دکھایا۔ انہوں نے بتایا کہ بجلی اور مقناطیسی قوت کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ وہ دونوں دراصل ایک ہی ہیں۔ آپ اگر بجلی کا ایک ذرہ (Particle) لے کر اسے حرکت دیتے ہیں تو مقناطیسی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر ایک الیکٹریکل پارٹیکل کی رفتار کو تیز کیا جائے تو حرارت (Heat) روشنی (Light) اور شعاع افشانی (Radiation) پیدا ہوں گی۔ یہ دوسری وحدت ہے۔ تیسری (وحدت۔ مرتب) جس کے پیچھے ہم پڑے ہوئے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ نیوکلیر قوتیں اور بجلی کی قوتیں دراصل دونوں ایک ہیں۔ اس نظریے کو سب سے پہلے 1957ء میں پیش کیا گیا تھا۔ اور اس کے بارے میں سب سے پہلے یورپ میں 1973ء میں تجربات کیے گئے اور 1978ء میں اس پر آخری تجربات (STANFORD LINEAR ACCELERATOR CENTRE) (امریکہ کی مشہور زمانہ لیبارٹری۔ مرتب) میں کیے گئے تھے۔ وہ تجربات کامیاب ہوئے تھے اور انہوں نے ہمارے نظریہ (تھیوری) کو درست ثابت کر دیا تھا۔ ان کامیاب تجربوں کی مجھے خبر کیسے ملی' اس کے بارے میں' میں آپ کو بتاتا ہوں۔

مجھے پتا چلا کہ 12 جون 1978ء کو سٹنفورڈ لینئزا ایکسل ریٹر سنٹر میں تجربات مکمل کر لئے گئے ہیں۔ لیکن اس بات کا پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ تجربات ہمارے نظریہ کی تصدیق کرتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ میں نے ٹریسٹ سے سٹینفورڈ لینئزا ایکسل لیبارٹری میں تجربات کرنے والی ٹیم کے لیڈر ڈاکٹر ٹیلر (Dr Taylor) کو فون کیا اور ان سے تجربات کے نتائج کے بارے میں پوچھا۔ ٹریسٹ میں اس وقت رات کے دس بجے تھے جبکہ کیلیفورنیا میں اس وقت دن کے بارہ بجے تھے۔ ڈاکٹر ٹیلر نے مجھے بتایا کہ "تجربات کرنے والے ہم چالیس افراد ہیں۔ ہمیں یہ تجربات کرتے ہوئے تین سال ہو گئے ہیں اور ان پر ہمارے ایک ملین (دس لاکھ۔ مرتب) ڈالر خرچ ہو چکے ہیں۔ اس وقت تمام دنیا سے آئے ہوئے رپورٹرز نے ہماری لیبارٹری کو گھیرے میں لے رکھا ہے اور وہ دریافت کر رہے ہیں کہ (تجربات کے) نتائج کیسے ہیں؟ لیکن ہم سب نے یہ قسم اٹھائی ہے کہ کل تک ان نتائج کے بارے میں کسی کو بھی نہیں بتائیں گے۔ کل ہم نے پبلک میں

لیکچر دینا ہے جسے وہ رپورٹرز آکر سن سکتے ہیں۔ میں اب قسم کھائے بیٹھا ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ تمہاری تھیوری (نظریہ) ہے اور تمہاری اس میں سب سے زیادہ دلچسپی ہے لیکن تم مجھے بتاؤ کہ میں اب کیا کروں؟" اس پر میں نے ان سے کہا کہ وہ اپنی قسم پر قائم رہیں لیکن اگر کسی طرح ہو سکے تو وہ میرے لئے اپنی قسم توڑیں۔ میری یہ بات سننے کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ "ابھی ٹریسٹ میں کیا وقت ہوا ہے؟" میں نے جب انہیں بتایا کہ "یہاں دس بجے ہیں" تو انہوں نے کہا "میں آپ سے اتنا کہہ سکتا ہوں کہ "آپ جا کر اطمینان سے سو جائیں سو اس طرح مجھے پہلی دفعہ پتہ چلا کہ میری تھیوری کامیاب ہوئی ہے۔" اس نظریہ (تھیوری) کا ایک حصہ اور بھی ہے جس کے لئے تجربات نہیں کیے گئے۔ اور وہ یہ ہے کہ نیوکلیر قوتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ کمزور اور ایک مضبوط (Weak and Strong) ہمارا کام کمزور قوت کے بارے میں رہا--- یہ بات نہیں کہ ہمارا کام کمزور تھا۔ (قہقہہ) لیکن اس قوت کا نام کمزور قوت رکھا گیا تھا--- دوسری قوت جسے مضبوط قوت کہتے ہیں اس کے متعلق ابھی تجربات ہو رہے ہیں۔ سب سے اہم تجربہ اس وقت کولار گولڈ مائیز (Kolar Gold Mines) میں ہو رہا ہے۔ سطح زمین سے سات ہزار فٹ نیچے۔ میں ان مائینرز (کانوں) میں گیا ہوں۔ وہ خوبصورت کانیں ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ کانوں میں پسینہ سے برا حال ہو گا۔ خدا جانے وہاں کیا ہو لیکن اسے بہت اچھی طرح رکھا ہوا ہے اور وہ ائیر کنڈیشنڈ (Air Conditrioned) ہے اور بہت خوبصورت ہے۔ ہم سات ہزار فٹ نیچے گئے۔ وہاں لوہے کی ایک پچاس ٹن وزنی پلیٹ (Slab) کو Proportional Counters سے ڈھانپا ہوا ہے اور وہاں پروٹون پر ہر طرف decay کر رہے ہیں۔ میرے جسم میں بھی Decay کر رہے ہیں۔ لیکن جو اس لوہے کی پلیٹ پر Decay ہوں گے تو وہ ایک سگنل (Signal) چھوڑیں گے جس سے وہ Proportional Counters جگمگا اٹھیں گے۔ سال میں دس یا پندرہ یا بیس مرتبہ ایسا ہوا تو یہ ثابت ہو جائے گا کہ مضبوط نیوکلیر قوت بھی وحدت رکھتی ہے۔ کمزور اور بجلی کی طاقت کے ساتھ ساتھ۔ اس کا آخری مرحلہ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے یہ ہے جس پر آئن سٹائن نے اپنی زندگی کے پینتس (35) سال لگا دیئے تھے۔ اس شخص نے چاہا کہ قوت سطح (Gravitational Force) (نیوٹن کی قوت) اور بجلی کی قوت ملا کر ان میں وحدت ثابت کرے۔ اس بارے میں ہمارے اور بھی خیالات ہیں جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں وہ بڑے عجیب خیالات ہیں جو یہ ہیں کہ کائنات میں چار (Dimension) (جہات) نہیں بلکہ زیادہ جہات ہیں لیکن باقی (Dimensions) کا ہمیں پتہ نہیں چل رہا۔ ان کے سگنل (Signal) ہمیں نیوکلیر طاقت یا بجلی کے ذریعے ملتے ہیں۔ براہ راست نہیں ملتے۔ ہمارے خیال میں جہات (Dimensions) کی کل تعداد گیارہ ہے۔ گیارہ کے ہندسہ سے مجھے خوشی ہے کہ اس ہندسے کے ساتھ کوئی صوفیانہ مفہوم (Mystical Significance) نہیں ہے کیونکہ مجھے ہمیشہ اس بات کا خطرہ

رہتا ہے کہ صوفیانہ خیالات (Mystical Significance) والے لوگ سائنس پر حاوی نہ ہو جائیں۔
میں نے یہ بات بار بار دہرائی ہے' کہ سائنس تجربات سے چلتی ہے اگر تجربہ ایک چیز کو غلط ثابت کر دے تو پھر ہمارے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ نئے سرے سے پھر تجربات کریں۔ یہ ہے فرق پرانی اور نئی سائنس کے درمیان۔ اس معاملہ میں ہمیں اپنے ذہن کو کھلا رکھنا چاہیے۔

میں پھر یہ کہنا چاہوں گا کہ کولار مائینز میں جو تجربات ہو رہے ہیں۔ ان کے بارے میں میں نے جس کام کا ذکر کیا ہے اس میں میرے ایک ساتھی جو گیش پتی جو بھونیشر (غالباً" صوبہ اڑیسہ انڈیا۔ مرتب) میں پیدا ہوئے اور آج کل امریکہ میں پروفیسر ہیں' برابر کے شریک ہیں۔ (ڈاکٹر پتی نے امپریل کالج لندن میں بھائی جان کے ساتھ ایک لمبے عرصہ تک تحقیقی کام کیا ہے۔ مرتب)

میں نے اپنی تقاریر میں ہمیشہ اس بات کو دہرایا ہے کہ سائنس ایک ایسا کھیل ہے جو کبھی ایک کے پاس زیادہ تو کبھی دوسرے کے پاس زیادہ۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ آج کی سائنس ہمیں چونکا دیتی ہے اور اس سے ہماری آنکھیں چندھیا جاتی ہیں لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہم میں بھی بڑے زبردست لوگ پیدا ہوئے ہیں۔ میں نے سارٹن کی کتاب کا بہت مرتبہ ذکر کیا ہے۔ اس نے پانچ جلدوں میں سائنس کی تاریخ لکھی ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کا اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ آپ اس کا ترجمہ پنجابی میں کرائیں۔ اس کتاب میں اس نے سائنس کے پچاس سالہ دور مقرر کیے ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ پچاس سال بعد میں اس دور کا نام کسی بڑے شخص کے نام پر رکھوں گا۔ مثلاً سن چار سو پچاس سے چار سو قبل مسیح کے دور کا نام اس نے افلاطون کا دور۔ اس کے بعد ارسطو کا دور۔ اس کے بعد یوکلیڈ (Euclid) کا دور' اس کے بعد ارشمیدس کا دور غرض یہ کہ اس طرح اس نے دور بنائے ہیں۔

سن پانچ سو سے پانچ سو پچاس بعد مسیح اس کے ذہن میں آریا بھٹ کا دور ہے۔ جو اس ملک (انڈیا ۔ مرتب) میں ہوئے تھے۔ وہ بڑے زبردست ریاضی دان تھے۔ آپ نے ان کا نام ضرور سنا ہو گا۔ اس کے بعد سن چھ سو سے سات سو تک کا دور چینیوں اور ہندوستانیوں کا دور ہے۔ چینی سوان سنگ (Husan Tsang) آئی چنگ اور ہندوستان میں وان بھٹ اور برہم گپتا کا دور۔ برہم گپتا پنجاب کے تھے اور ملتان کے نزدیک پیدا ہوئے تھے۔ اس کے بعد سن سات سو پچاس سے گیارہ سو پچاس تک جابر' خوارزمی' رازی' مسعودی' وفا' البیرونی' عمر خیام اور بھاسکر آچاریہ' یہ ان کا دور تھا۔ غرض یہ کہ پچاس پچاس سالہ ادوار میں ہمارے بہت نام آتے ہیں لیکن اس کے بعد سائنس میں برتری (Supermacy) ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتی ہے۔ آخری واقع شاید مہاراجہ جے سنگھ کا ہے جس نے 1720ء میں (Westren Astronomical Table) کو صحیح کیا تھا۔ (دہلی کے بادشاہ محمد شاہ کے عہد میں) یہ اپنے وقت میں بڑی زبردست تصحیح تھی۔ اس کے بعد یہ ہماری بڑی بدقسمتی تھی۔ خیر اسے بدقسمتی تو نہیں کہنا چاہیے کہ یورپ میں دوربین (ٹیلی سکوپ) ایجاد کی گئی جس سے انہوں نے بہت ترقی کی لیکن ہمیں اس

ایجاد کا پتہ ہی نہ چلا اور ہم اس میدان میں بہت پیچھے رہ گئے لیکن اب پھر وہ دور آگیا ہے کہ اگر ہم یورپ پر برتری حاصل نہیں کر سکتے تو کم از کم برابری تو حاصل کر لیں۔ یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں بھی بہت اعلیٰ دماغ کے لوگ موجود ہیں جو بچے اس وقت میری تقریر سن رہے ہیں میں ان سے یہی کہوں گا کہ وہ یہ سوچیں کہ جب ہم ایک ہسپتال یا دوا خانے سے پنسلین، سٹرپٹومائی سین یا اس قسم کی دوسری دوائیں لے کر اپنی جان بچا لیتے ہیں لیکن کیا کبھی ہم نے یہ بھی سوچا کہ ایسی دوائیں ایجاد کرنے میں ہمارا یا ہمارے والدین کا کتنا حصہ ہے۔ ہماری عزت نفس بھی یہی چاہتی ہے۔ میں گورنر صاحب سے یہ درخواست کروں گا کہ وہ اس قسم کا کام کرنے والوں کو موقع دیں اور ان کی حوصلہ افزائی کریں۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس پنجاب میں حالات کیسے ہیں۔ لیکن دوسری جگہوں پر ہم ابھی تک حادثاتی طور پر سائنسدان بنتے ہیں۔ میں آپ کو اپنی زندگی کے حالات سنا دیتا ہوں اگر میری زندگی میں دو چار حادثات رونما نہ ہوئے ہوتے تو میں شاید سائنس دان ہی نہ ہوتا۔ پہلا حادثہ یہ ہوا کہ ایف اے کے بعد میں ریلوے میں ملازمت کے لئے چنا گیا۔ میرے والد نے قادیان حضرت امام الثانی کی خدمت میں خط لکھا کہ "میرا بچہ پنجاب میں اپنے امتحان میں اول آیا ہے اسے ریلوے میں ملازمت کے لئے چن لیا گیا ہے۔ یہ ملازمت اچھی ہے تاہم آپ اپنے مشورہ سے مستفیض فرمائیں" اس خط کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ "اگر بچہ ریلوے کی نوکری کرے گا تو میں اسے کم ہمتی سمجھتا ہوں۔" سو یہ ایسی خوبصورت بات تھی کہ میں اس کے بعد اپنی پڑھائی میں لگا رہا لیکن پھر وہی خیال آتا کہ ایم۔اے کرنے کے بعد میں آئی سی ایس (انڈین سول سروس) میں چلا جاؤں۔ خدا کی قدرت یہ ہوئی کہ آئی سی ایس (کا امتحان) بند ہو گیا۔ 1946ء میں جب میں نے ایم۔اے کا امتحان دینا تھا' آئی سی ایس نہیں تھا۔ سن 1945ء میں جنگ کے آخری دنوں میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ ملک خضر حیات ٹوانہ نے بہت سا فنڈ (میں آپ کا بہت وقت تو نہیں لے رہا---- مجھے تو مزہ آ رہا ہے (قہقہوں اور تالیوں کی گونج) آپ کی ڈگریاں ہی نہ رہ جائیں۔) ملک خضر حیات ٹوانہ نے وار فنڈ کے لئے پیسے جمع کیے تو جنگ ختم ہو گئی اور یہ پیسے بچ گئے چنانچہ انہوں نے اس وار فنڈ کی رقم سے پیزنٹ ویلفیر فنڈ (Peasant Welfare Fund) قائم کیا اور اس میں سے پانچ وظائف (بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کے لیے۔ مرتب) رکھے۔ یہ وظائف اس اعتبار سے بہت اچھے تھے کیونکہ ان کے ساتھ کسی قسم کی شرائط مثلاً" تعلیم کے بعد گورنمنٹ کی ملازمت کرنا پڑے گی' نہ ہی مضامین کے بارے میں پابندی تھی کہ فلاں فلاں مضمون پڑھنا پڑے گا۔ یہ طالب علم کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ جو دل کرے پڑھے۔ 1946ء میں' میں نے ایم۔اے کا امتحان پاس کر لیا اور میں اس بات کا خواہش مند تھا کہ آئی سی ایس کے امتحان شروع ہونے سے پہلے مجھے کوئی ایسا کام مل جائے جس کی وجہ سے میں آئی سی ایس کے امتحان کا انتظار کر سکوں۔ چنانچہ اسی انتظار کا وقت گذارنے کے لئے میں نے اس وظیفہ کے لئے درخواست دے دی۔ ایس ایم شریف صاحب جو آج کل لاہور میں رہتے ہیں۔اور میاں افضل حسین

صاحب جن کا نام آپ نے سنا ہو گا' وظائف دینے والوں میں سے تھے۔ ان دونوں نے مجھ پر بہت عنایت کی اور مجھے وظیفہ کے لئے منتخب کر لیا۔ میرے علاوہ چار اور لڑکوں کا بھی چناؤ ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ مجھے ابھی وظیفہ کی منظوری کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا کہ میں نے کیمرج میں داخلے کے لئے اپنی درخواست بھجوا دی۔ وہاں داخلے کے لئے لوگ کئی کئی سال پہلے درخواستیں دیتے ہیں۔ میری یہ خوش قسمتی تھی کہ مجھے 2 ستمبر 1946ء کو وہاں سے تار ملی کہ غیر متوقع طور پر ایک جگہ خالی ہوئی تھی اور تمہیں داخلہ دے دیا گیا ہے۔ چنانچہ 2 ستمبر کو ہی میں ریل گاڑی کے ذریعے لاہور چلا گیا۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ میرے لئے وظیفہ منظور ہوا ہے یا نہیں۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ دفاتر شملہ میں ہی ہیں۔ چنانچہ میں اگلی رات شملہ چلا گیا۔ وہاں میری ملاقات وظیفوں کے انچارج خالق صاحب سے ہوئی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ میرے لئے وظیفہ منظور ہو گیا ہے۔ پھر انہوں نے مجھے کہا کہ میں فوراً" دلی چلا جاؤں اور وہاں بحری جہاز سے اپنی سیٹ بک کراؤں۔ چنانچہ میں پھر ریل گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس طرح میں تیسری رات دلی پہنچ گیا۔ میں جب جہاز راں کمپنی کے دفتر گیا تو وہاں ایک شخص نے مجھے کہا کہ دوڑ باؤ یہاں سے۔ منہ اٹھا کر چلے آتے ہیں۔ جہاز میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ (الفاظ تھے کوئی پیسج ویسج نہیں۔ مرتب) یہ سن کر میں گھبرا کر اس دفتر سے باہر جا رہا تھا کہ وہاں سے ایک کلرک نکلا۔ مبارک علی اس کا نام تھا معلوم نہیں وہ بیچارہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ اس نے کہا کہ "میں آپ کو passage تو نہیں دے سکتا (مطلب یہ ہے کہ وہ سیٹ نہیں دے سکتا۔ مرتب) لیکن میں آپ کو عارضی (Provisional) فارم بنا دیتا ہوں۔ پھر اس نے کہا کہ "یہ افسر تو بیوقوف ہوتے ہیں (اس بات پر قہقہہ بلند ہوا) پھر اس نے کہا کہ آپ چلے جائیں Take a risk and go to Bombay (خطرہ مول لیں اور بمبئی چلے جائیں) وہاں سے فرنکونیا نامی جہاز 18 ستمبر کو جا رہا ہے۔ آج پانچ تاریخ ہے آپ سیدھے چلے جائیں اگر آپ کی قسمت میں ہوا تو پھر چلتے جائیں گے۔

میں یہ کہانی اس لئے سنا رہا ہوں کہ آپ آخر میں یہی دیکھیں گے کہ یہ کیسے "حادثے" تھے۔ جناب میں ملتان گھر واپس پہنچا اور اپنے والدین کو بتایا کہ میں نے ابھی بمبئی جانا ہے کیونکہ وہاں سے 18 تاریخ کو ایک جہاز جا رہا ہے اس لئے بکس میں میرا سامان ڈال دیں تا کہ میں فوراً (بمبئی کے لیے) روانہ ہو جاؤں۔ میں بمبئی پہنچ گیا وہاں واقعی مجھے جہاز پر جگہ مل گئی۔ (اسی جہاز پر) انگریز اپنے بچوں کے ساتھ واپس جا رہے تھے۔ اطالوی جنگی قیدی بھی اسی جہاز سے جا رہے تھے۔ واقعی جہاز میں جگہ نہیں تھی لیکن یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے جگہ مل گئی اور میں کیمرج پہنچ گیا۔ اس کے بعد ملک کی تقسیم ہو گئی اور سارے وظیفے سوائے میرے غائب ہو گئے۔ سو وہ سارا کارنامہ جسے ملک خضر حیات ٹوانہ نے انجام دیا یعنی وار فنڈ بنایا' اس میں سے وظیفہ بنائے۔ وظیفے دینے کے لئے کیمشن بٹھائے اور ان کمشنوں نے فیصلے کیے۔ ان سب باتوں کا ایک ہی نتیجہ برآمد ہوا کہ مجھے کیمرج میں جگہ مل گئی۔ چنانچہ کیمرج کی فضاؤں اور سائنس کے

میدان میں میں آئی سی ایس کو بھول گیا اور میں سائنس کے ساتھ ساتھ ہی رہا۔ میں نے یہ کہانی اس لئے سنائی ہے کہ آئندہ نوبل پرائز کا انحصار حادثات پر رکھنا غلط ہو گا اگر آپ سائنس میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو کوئی ایسا کام کرنا پڑے گا جیسے امریکہ میں بچوں کا شروع سے خیال رکھا جاتا ہے اور ہمارے جو بچے اس کام کے اہل ہوں اور اس کے لئے محنت کرنے کے لیے تیار ہوں اور جو اس چیز کے لئے اپنے آپ کو "ڈسپلن" کر رہے ہوں انہیں اس کا صحیح اجر ملے گا۔ خدا کرے یہ چیز یہاں بھی ہو سکے۔ میں یہ پھر یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یہ بہت ضروری ہے۔ آخر میں ان کو جو آج ڈگری لیں گے اور پھر تدریس یا دوسرے پیشے اختیار کریں گے' کو وارننگ (انتباہ) دیتا ہوں کہ زندگی مایوسیوں سے بھری ہو گی کیونکہ ہمارے ملک میں وسائل کی کمی ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑی مشکلات میں پڑ گئے ہیں۔ میں انہیں آن سٹائن کی کہانی سنا دیتا ہوں جس سے انہیں اس بات کا اندازہ ہو جائے گا کہ آئن سٹائن جیسا شخص بھی اپنی زندگی میں کتنی مایوسیوں کا شکار ہوا تھا چونکہ میں نے یہ کہانی انگریزی میں لکھی ہے اس لئے اسے انگریزی میں ہی سناؤں گا۔ (ترجمہ از مرتب)

"اس صدی میں آئن سٹائن جیسا کوئی پیدا نہیں ہوا بلکہ تمام تاریخ عالم میں نظریاتی طبیعات میں اس جیسا غور و فکر کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ یقیناً وہ واحد فرد تھا جو طبیعات میں انقلابی سوچ لایا تھا۔

آئن سٹائن اگر کسی ترقی پذیر ملک میں پیدا ہوا ہوتا تو یقیناً وہ ضائع ہو جاتا۔ اس کی عمر جب پندرہ سال تھی تو میونخ کے لیوپولڈ جیمنازیم (Lutipold Gymnasium) میں اس کے استاد نے اسے سکول چھوڑنے کے لئے کہا تھا۔ اس پر آئن سٹائن نے اپنے استاد سے کہا کہ "میں نے کوئی بیجا بات یا ایسی کوئی حرکت تو نہیں کی۔" تو اس کے استاد نے کہا کہ "تمہاری موجودگی سے میرے دل میں اس کلاس کی عزت نہیں رہتی۔" دراصل یہ آئن سٹائن کی طبیعت میں خود مختاری کی طرف اشارہ تھا۔

ساڑھے سولہ برس کی عمر میں آئن سٹائن نے زیورچ کے پالی ٹیکنک میں داخلہ لینے کے لئے کوشش کی۔ اس نے انجینئرنگ میں داخلہ کا امتحان بھی دیا لیکن طبیعات کی خوش بختی کہ وہ اس امتحان میں فیل ہو گیا اگرچہ ایک سال بعد وہ اس امتحان میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن اس نے انجینئر بننے کا خیال ہی چھوڑ دیا تھا۔ سن 1900 میں اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے لئے کوشش کی لیکن اپنی اس کوشش میں بھی ناکام ہوا۔ بقول اس کے اس کی وجہ یہ تھی کہ "میں اپنے سابقہ اساتذہ کا منظور نظر نہ تھا۔"

اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے آئن سٹائن کبھی کبھی عارضی ملازمت کر لیا کرتا تھا۔ کبھی کسی کے حساب کتاب کی دیکھ بھال کرتا اور کبھی سکول میں بطور استاد کام کرتا اور بعض اوقات 3 فرینک فی گھنٹہ ٹیوشن فیس لے کر بچوں کو پڑھاتا۔ وہ یونیورسٹی میں پڑھا نہیں سکتا تھا کیونکہ اس کے لئے پی ایچ ڈی کی ڈگری کا ہونا ضروری تھا۔

پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول کے لئے اس نے سن 1901ء میں اپنے تحقیقی مقالے جمع کرائے اگرچہ اس کے مقالے ایک مشہور اور شہرت یافتہ رسالے انالن ڈر فزیک (Annalen dar Physik) نے شائع کرنے کے لئے قبول کر لیے تھے لیکن یونیورسٹی آف زیوریچ نے یہ کہہ کرانہیں مسترد کر دیا کہ وہ پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے ناکافی ہیں۔

بینش ہاف مین (Banesh Hoffmann) کے مطابق اس صورت حال سے آئن سٹائن نے اپنے آپ کو ایک دلدل میں پھنستے پایا۔ اور اسے اس بات کا احساس ہونے لگا کہ دنیا میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اسی دوران 1901ء میں ایک ایسی سخت بات ہوئی جو ہاف مین کے مطابق اس کے خیالات کی توضیح کرتی ہے۔ ہوا یوں کہ انالن ڈر فزیک (Annalen dar Physik) نے 1901ء میں آئن سٹائن کا پہلا تحقیقی مقالہ شائع کیا تھا۔ آئن سٹائن نے اس رسالہ کی ایک کاپی پروفیسر ولیم اوسٹ والڈ (Wilhelm Ostwald) (جنہیں بعد میں نوبل انعام دیا گیا تھا) کو بھجوا دی جس کے ساتھ اس نے مندرجہ ذیل خط بھی منسلک کر دیا

”چونکہ آپ کی جنرل کیمسٹری پر کتاب نے میرے اندر ایک نئی روح پھونک دی ہے اس لئے میں اپنے تحقیقی مقالہ کی ایک کاپی آپ کی خدمت میں بھجوانے کی جسارت کر رہا ہوں۔ میں آپ سے یہ بھی پوچھنے کی جرات کر رہا ہوں کہ کیا آپ کو کسی ایسے عالم طبیعات جو ریاضی دان بھی ہو کی ضرورت تو نہیں ہے؟ میں ایسا دریافت کرنے کی جسارت اس لئے کر رہا ہوں کیونکہ آج کل میں بے روزگار ہوں۔“

دوبارہ یاد دہانی کرانے کے باوجود اوسٹ والڈ کی طرف سے اسے کوئی جواب موصول نہ ہوا اور نہ پروفیسر کیمرلنگ اونس جو لیڈن میں رہتے تھے۔ (Profesor Kamerlingh in Leiden) کی طرف سے کوئی جواب ملا جنہیں آئن سٹائن نے ایسی ہی درخواست بھجوائی تھی۔

بینش ہاف مین (Banesh Hoffmann) نے لکھا کہ اس مرحلہ پر آئن سٹائن کی زندگی میں ایک خوبصورت واقعہ پیش آیا جس کا اسے بھی علم نہیں تھا۔ آئن سٹائن کا والد ایک ناکام تاجر تھا۔ اس کی صحت اکثر خراب رہتی تھی اور اسے پڑھے لکھے لوگوں سے ملنے جلنے کے آداب سے بھی کوئی خاص واقفیت نہیں تھی۔ اس نے اسے اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے پروفیسر اوسٹ والڈ کو مندرجہ ذیل خط لکھا:

”پیارے پروفیسر اپنے بیٹے کی بھلائی کی خاطر یہ خط لکھنے پر اس کے باپ کو معاف کر دیں۔ میرا بیٹا البرٹ آئن سٹائن جس کی عمر 22 سال ہے۔ جس کی لیاقت اور قابلیت کا ہر ایک معترف ہے اپنی بے روزگاری کے ہاتھوں بہت ناخوش ہے۔ اس کے دماغ میں یہ خیال میخ کی طرح گڑ گیا ہے کہ وہ ایک ناکام آدمی ہے اور یہ کہ وہ کامیابی کا منہ کبھی بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ پیارے پروفیسر چونکہ میرا بیٹا آپ کی بے حد تعظیم کرتا ہے اس لئے میں اس خط کے ذریعے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس کا مقالہ ضرور پڑھیں۔ مجھے امید ہے کہ اس بارے میں آپ اسے ضرور خط لکھیں گے۔ چاہے آپ کا خط دو

سطروں کا ہی کیوں نہ ہو۔ شاید اسی وجہ سے اس کی خوشیاں لوٹ آئیں۔ میرے بیٹے کو میری اس غیر معمولی کاروائی کا کوئی علم نہیں۔"

اس کے باوجود کوئی جواب نہ ملا جیسا کہ ہر ایک کو اس بات کا بخوبی علم ہے۔ آئن سٹائن کو آخر کار سوئٹزرلینڈ میں ایجادات کے رجسٹری دفتر (Patent Office) میں ایک عارضی ملازمت مل گئی۔ اسے ٹیکنیکل افسر تھرڈ کلاس مقرر کیا گیا اور پھر اسے انجنیئر سکینڈ کلاس کے عہدہ پر ترقی دے دی گئی۔ یہ جگہ سائنٹیفک لائبریریوں اور یونیورسٹی کے شعبہ فزکس سے دور تھی۔ وہاں تحقیقی کام کے لئے ماحول بھی میسر نہیں تھا۔ پھر بھی اپنے وقت سے کچھ لمحات نکال کر وہ چوری چھپے حساب کتاب کرتا رہتا تھا۔ اس دوران وہ جیسے ہی قدموں کی آواز سنتا تو اپنے کاغذات کو اپنی میز کی دراز میں چھپا دیتا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے احساس ندامت رہتا۔ یہیں پر 1905ء میں آئن سٹائن نے روشنی کی کوانٹم تھیوری' خلا اور وقت کی وحدت کے بارے میں انقلابی تھیوری پر تحقیقی کام کیا تھا۔ اس سارے عرصہ میں اس کے پاس پی ایچ ڈی کی قیمتی ڈگری نہیں تھی۔ 1905ء میں اپنی دوسری کوشش میں بھی وہ پی ایچ ڈی کی ڈگری لینے میں ناکام رہا تو آئن سٹائن نے لکھا کہ "میں کبھی پی ایچ ڈی حاصل نہیں کر سکوں گا میں اس "ناٹک" سے بیزار ہو گیا ہوں۔ تیسری کوشش میں اسے کامیابی حاصل ہوئی لیکن اس وقت اسے پی ایچ ڈی کی ڈگری کی ضرورت نہیں رہی تھی کیونکہ تب وہ شہرت پا چکا تھا۔

میں نے تفصیل سے یہ کہانی اس لئے سنائی ہے تاکہ آپ کو بتاؤں کہ اسے (آئن سٹائن۔ ناقل) جتنی مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا' ترقی پذیر ممالک کے سائنسدانوں کو ویسے ہی حالات سے پالا پڑتا ہے۔ آج کے ترقی پذیر ممالک میں کیا وہ "آئن سٹائن" جس کو سائنس کے ساتھ لگاؤ ہے اس سے بہتر کاروائی دکھا سکے گا۔ اس بات کے جواب میں پہلے خود آئن سٹائن اور بعد میں پروفیسر ریمارلسٹ میکس پلانک سوسائٹی کے پریذیڈنٹ (Professor Reimar Lust President of Max Plank Society) کے تبصرے پیش کروں گا۔

(آئن سٹائن نے کہا) "میرے سائنٹیفک کام کی وجہ تحریک قدرت کے سربستہ رازوں کو سمجھنے کا ناقابل مزاحمت اشتیاق کے علاوہ اور کوئی جذبہ نہیں۔ عدل و انصاف کے لئے میری محبت اور انسانیت کی ترقی کے لئے میری کوشش میرے سائنسی شوق سے خود مختار ہے۔"

برن (سوئٹزرلینڈ۔ ناقل) میں آئن سٹائن کی یاد میں جو تقریب منعقد ہوئی تھی اس میں پروفیسر لسٹ نے مندرجہ ذیل الفاظ کہے تھے "آج تمام دنیا میں سائنسی پالیسی بنانے والوں کے لئے جو سائنٹیفک ریسرچ کی حمایت میں سماجی و معاشرتی مسئلہ کی موزونیت کی افادیت پر نظر رکھتے ہوں میرے یہ الفاظ عجیب لگیں گے۔ مجھے اس بات پر خوشی ہے کہ یونیسکو جو تمام دنیا کی تہذیب اور علمیت کی نمائندگی کرتی ہے۔ آئن سٹائن کی صد سالہ برسی بڑے شایان شان طریقہ سے منا رہی ہے۔ وہ نہ صرف ہمارے وقت بلکہ تمام

ادوار کا ایک بہت بڑا انسان تھا۔ مجھے یقین ہے کہ یونیسکو علم کی جستجو میں آئن سٹائن کے نصیب العین کو نہیں بھلائے گی اور نہ ہی پروفیسر لسٹ کے تبصرہ کو اس وقت بھلائے گی جب ترقی پذیر ممالک سائنس پالیسی کے لئے اس سے مشورہ کریں۔"

وائس چانسلر صاحب نے پنجاب کا ذکر کیا ہے۔ پنجاب بہت زبردست سرزمین ہے۔ یہاں بڑے بڑے سائنسدان پیدا ہوئے ہیں۔ میں نے برہم گپتا کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بارے میں سارٹن کہتا ہے "وہ اپنے زمانہ اور وقت کا سب سے بڑا انسان تھا۔ وہ واقعی بہت عظیم تھا" "سندھ' ہند اور قند" قسم کی چیزیں جن کے بعد میں ترجمے شائع ہوئے' یہ سب اس کا کام تھا۔ اس کے بعد قرون وسطیٰ میں استاد احمد معمار لاہوری جس نے تاج محل بنایا تھا' کے دو لڑکے لطف اللہ اور عطا اللہ تھے اور آج کل ڈاکٹر ہرگوبند کھورانا جو ملتان کے قریب پیدا ہوئے تھے۔ یہ سب بڑے لوگ تھے اور مجھے یقین ہے کہ سامعین میں اچھے دماغ والے لڑکے موجود ہوں گے جو خدا کی مدد سے آگے بڑھیں گے۔

گرو گرنتھ صاحب میں ان باتوں کا ذکر آیا ہے جنہیں ہم نے پڑھا اور جن کی ہمیں آرزو ہے (گرو گرنتھ میں لکھا ہے۔ ناقل) "لکھ پتالاں پتال لکھ آگاساں آگاس" ترجمہ۔ "قدرت انتہائی بلندیوں اور انتہائی گہرائیوں میں موجود ہے۔" (یہ ترجمہ اپنے ایک دوست کی معرفت ننکانہ صاحب کے ایک گرنتھی صاحب سے کرایا تھا۔ مرتب)

سو اس قسم کی بلندیوں جو ہمارے سامنے موجود ہیں' کو ہمیں بھولنا نہ چاہیے اور نہ ہی ان تکالیف اور مشکلات کو جو روزمرہ زندگی میں ہمیں درپیش ہیں۔ ہمیں فراموش کرنا چاہیے۔"

بہت شکریہ

16

تیسری دنیا کی اکیڈمی آف سائنسز

(THIRD WORLD ACADEMY OF SCIENCES)

ٹریسٹ میں بین الاقوامی مرکز برائے نظریاتی طبیعات کے قیام کے باوجود بھائی جان کو اس بات کا شدت سے احساس رہنے لگا کہ یہ مرکز اپنے کارکنوں کی بے مثال جانفشانی اور خلوص کے باوجود تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک میں وسیع پیمانے پر سائنسی علوم کی ہر شاخ کو فروغ دینے کے لئے ناکافی ہے چنانچہ وہ اس مسئلہ کا کوئی مناسب حل تلاش کرنے کی جستجو میں رہے۔

6 اکتوبر 1981ء کو روم میں وٹیکن کی پاپائے اعظم سائنس اکیڈمی (Pontifical Academy of Siences of the Vitican) کی جنرل میٹنگ میں بھائی جان نے اکیڈمی آف سائنسز برائے تیسری دنیا کے قیام کا تصور پیش کیا۔ پاپائے اعظم سائنس اکیڈمی کے تیسری دنیا سے تعلق رکھنے والے ممبران نے اس خیال کو سراہا اور ابتدائی بات چیت کے بعد اس اکیڈمی کے قیام کی بھرپور حمایت کی۔ مندرجہ ذیل سائنسدانوں نے اس بات چیت میں حصہ لیا۔

سی چاگاس (C.Chagas) برازیل سے' ایچ کراکس اٹو (H.Croxatto) چلی سے' جے ڈوبری ایز (J.Doberieinir) برازیل سے' ایم جے کے مینن انڈیا سے' ٹی آر اوڈی ایمبو (T.R.Odhiambo) کینا سے' سی پاون (C.Pavan) برازیل سے' ایم روش (M.Roche) ونزوویلا سے' عبدالسلام اور ایس صدیقی پاکستان سے۔

1981ء کی اس میٹنگ میں اس بات کا فیصلہ کیا گیا کہ تیسری دنیا کے ان مشہور سائنسدانوں کو جو اپنے اعلیٰ سائنسی کارناموں کی بدولت دنیا کی مشہور اکیڈیموں یا تنظیموں کے منتخب فیلو اور ممبروں کو دعوت دی جائے کہ وہ مجوزہ اکیڈمی کا بانی رکن بننا قبول کریں۔ تیسری دنیا کے اٹھائیس ممتاز سائنسدانوں نے جو دنیا کی نو مشہور نامور سائنسی تنظیموں اور اکیڈیمیوں کے ممبر تھے' نے مجوزہ اکیڈمی کا فاؤنڈنگ فیلو بننا قبول کر لیا۔ ان لوگوں نے مشورہ دیا کہ طے شدہ معیار پر پورا اترنے والے ان سائنسدانوں کو بھی اس مجوزہ اکیڈمی کا ایسوی ایٹ (Associate) فاؤنڈنگ فیلو بنانا چاہیے جو یا تو کسی ترقی پذیر ملک کے شہری رہے ہوں یا انہوں نے تیسری دنیا میں سائنس کے فروغ کے لئے کوئی نمایاں کارنامہ انجام دیا ہو۔ بھائی جان سے کہا گیا

کہ وہ ایسے سائنسدانوں کو دعوت دیں اور اکیڈمی کی میٹنگ بلانے کا بھی اہتمام کریں چنانچہ مجوزہ اکیڈمی کا پہلا اجلاس ٹریسٹ انٹرنیشنل فاؤنڈیشن کے زیر سرپرستی ٹریسٹ یونیورسٹی میں 10۔11 نومبر 1983ء کو منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں اکیڈمی آف سائنسز برائے تیسری دنیا کی باضابطہ تشکیل ہوئی اور متفقہ طور پر مندرجہ ذیل عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر	عبدالسلام	پاکستان
نائب صدر	کارلو چاگاس	برازیل
	ایم۔ جی کے مینن	انڈیا
	تھامس اوڈی ایمبو	کنیا
سیکرٹری	مارسیل روش	وینزویلا
ایگزیکٹو سیکرٹری	محمد ایچ اے حسن	سوڈان

تیسری دنیا کی اکیڈمی آف سائنسز (TWAS) کا باقاعدہ افتتاح اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل جیویر پیرز ڈی کویار (Javer Perez de Cuellar) نے 5 جولائی 1985ء کو کیا تھا۔ اس افتتاحی تقریب میں 250 مندوبین نے شرکت کی تھی۔ پاکستان' بنگلہ دیش' فلپائن' پرتگال' سعودی عرب' چین' غانا اور گوئٹے مالا کے سربراہوں نے اس موقع پر اپنی نیک خواہشات بھیجیں تھیں۔

اس مختصر تعارف کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ تقریر جو بھائی جان نے

(Fiera di Milana Convegno Internazional La Cooperazione Italiana Vistadai Paesi in La di Sviluppo

اٹلی اور ترقی پذیر ممالک کے درمیان باہمی تعاون پر بین الاقوامی جلسہ میں 16 اپریل 1986ء کو کی تھی' کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

تیسری دنیا کی سائنسز اکیڈمی کی تاسیس

"نو سو برس پہلے اسلام کے ایک عظیم طبیب' الاصولی (Al-Asuli) جو بخارا میں رہتے تھے' نے ایک طبی کتاب الادویہ (Pharmacopeia) لکھی جسے اس نے دو حصوں میں تقسیم کیا۔ امیروں کی بیماریاں اور غریبوں کی بیماریاں۔ اگر الاصولی اب زندہ ہوتا اور ان مصائب کے بارے میں لکھتا جو انسانیت نے خود اپنے اوپر طاری کیے ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی کتاب الادویہ کو انہی دو حصوں میں تقسیم کرتا۔ کتاب کے ایک حصہ میں وہ اسی خطرے کے بارے میں لکھتا ہے جو امیر نصف نے پوری انسانیت کے معدومیت کے امکان کی شکل میں طاری کر دیا ہے۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ غریب' فاقہ زدہ اور قحط کی ماری انسانیت کے بارے میں ہوتا۔ جس کا تعلق پس ماندہ دنیا سے ہے۔ وہ ان مصائب کا ذکر کرتا جس میں

دنیا کی غریب آبادی گھری ہوئی ہے اور وہ یہ کہتا کہ دونوں بیماریوں کی ایک مشترکہ وجہ ہے۔ امیروں کے سلسلے میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا زیادہ ہونا اور غریبوں کے معاملے میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا فقدان۔ ممکن ہے وہ یہ بھی اضافہ کرتا کہ دوسری مصیبت کا دیر تک قائم رہنا---- پس ماندگی کی وجہ ہے اس میں سائنسی اور مادی وسائل شامل ہیں۔ ایسے وسائل یقیناً" موجود تھے کہ مفلسی اور بیماری کا خاتمہ کیا جا سکتا۔ اور یہ بھی کہ سائنسی علم اور سائنسی معجزات کے عہد میں ساری انسانیت کے لئے جلد موت کا سدباب کیا جا سکتا۔

آخر انسانیت کے راستے میں ایسی کون سی رکاوٹ حائل ہے کہ وہ اپنے سائنسی ذرائع کو استعمال کر کے قلت کو ختم نہیں کرتی؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ عام طور پر اس سلسلے میں سیاسی عزم کا فقدان ہے کہ سائنس و ٹیکنالوجی کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سائنسی وسائل کی تقسیم غیر متوازن ہے اور غریب اور امیر ممالک تحقیق اور صلاحیت تحقیق میں ایک جیسے نہیں ہیں۔ ان قیمتی وسائل میں سائنسی سطح پر تیسری دنیا میں سائنس سے تعلق رکھنے والے ممتاز لوگوں کی فراہمی کا مسئلہ بھی ہے اور اس کا تعلق خاص طور پر تیسری دنیا سے ہے۔

ایسے خواتین و حضرات یقیناً" تیسری دنیا میں موجود ہیں۔ مگر انہوں نے عالمی جدوجہد میں ایک دوسرے سے اشتراک نہیں کیا اور نہ انہوں نے اپنا کوئی فورم بنایا ہے۔ تیسری دنیا کی سائنسز اکیڈمی کے 92 اراکین اور تیسری دنیا کے 33 ممالک کے پاس اس کی فیلوشپ ہے۔ یہ اس کی مشترکہ قوت کا اظہار ہے۔ ان اراکین میں سے دس ایسے ہیں جو سائنس اور اقتصادیات میں نوبل انعام یافتہ ہیں اور پچاس اراکین ایسے ہیں جن کے پاس اکیڈمی کے رکن ہونے کا استحقاق ہے ان کا تعلق دنیا کے 9 (بھائی جان ان تمام اکیڈمیوں کے فیلو تھے) قابل احترام سائنس اکیڈمیوں سے ہے جو اٹلی کی نیشنل اکیڈمی آف ڈی لنس (Academia Nazionale dei Lincui) پاپائے اعظم کی اکیڈمی آف سائنسز (Pontifical Academy of Seiences of the Vatican) برطانیہ کی رائل سوسائٹی' فرانس کی اکیڈمی ڈی سائنسز (Academic de Sciences)' سویٹ اکیڈمی آف سائنسز (Soviet Academy of Sciences)' دی رائل سویڈش اکیڈمی آف سائنسز (The Royal Swedish Academy of Sciences) امریکن اکیڈمی آف آرٹس اینڈ سائنسز (The American Academy of Arts and Sciences) نیشنل اکیڈمی آف سائنس اٹلی (Accademia Nazionale delle Scienze detta dexl of Italy) اور امریکہ کی نیشنل اکیڈمی آف سائنسز (National Academy of Seiences of US) پر مشتمل ہیں۔

جہاں تک سائنس کی مہمات کا تعلق ہے ہر اعتبار سے ہماری یہ بیسویں صدی جو تمدن کی تاریخ میں سب سے زیادہ عظیم صدی ہے۔ مقداری لحاظ سے دریافتوں کا ایک سیلاب آیا ہوا ہے۔ جبکہ خدا کے بنائے ہوئے

ڈیزائن کی عمیق تقسیم میں عظیم تالیف کے متعدد قوانین دریافت کر لئے گئے ہیں مثال کے طور پر جنیٹکس (Genetics) پھر حلزونی (Helise) اصول ہیں۔ خلائی طبیعات میں بگ بینگ ماڈل' ارضیات میں پلیٹ ٹیکٹو نیکس (Plate Tectonics) طبیعات میں اصول اضافت (Relativity)' کوانٹم نظریہ (Quantum Theory) اور اب میرے اپنے مضمون میں بنیادی قوتوں کی یکتائی (The unification of fundamental forces)۔ ساری انسانیت نے اس بین اقوامی سائنسی عزم میں شرکت کی ہے اور سائنسی حقائق میں حصہ لیا ہے لیکن زمانہ حال میں سرحدی دریافت کی مہمات کو سر کرنے کے معاملے میں ماضی کی کارکردگی کے برعکس جنوب اصولی طور پر اپنا کردار بخوبی ادا نہیں کر سکا۔ اس کی وجہ مواقع کا فقدان ہے۔ بہر صورت یہ ایسی صورت حال نہیں ہے جسے تیسری دنیا کے نوجوان خواتین و حضرات قبول کریں گے۔ وہ رشک اور شوق کے ساتھ سائنس کی اس پرجوش مہم جوئی میں مساوی بنیادوں پر حصہ لینے کے لئے بے قرار ہیں مگر اس امر کو ان کے معاشرتی وسائل میں کس طرح ممکن بنایا جائے اور سائنسی برادری کس طرح تیسری دنیا کی مدد کر سکتی ہے کہ وہ سائنس کو منظم طریقے سے مضبوط بنائیں۔ تعلیمات میں بھی اور تحقیق میں بھی۔ یہ اب ہماری اکیڈمی کا کام ہو گا۔ ہماری اکیڈمی کا دوسرا موضوع ہے سائنس جو عالمی سطح پر اور ہمارے ممالک میں وسائل کو کام میں لانے کا ذریعہ ہے۔ ہماری موجودہ دنیا سائنس کے اطلاق کا نتیجہ ہے۔

ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ طبیعات کی سائنس ہی تھی جو جدید مواصلاتی انقلاب کا سبب بنی ہے۔ جس نے ایک دنیا کے تصور کو عملی معانی دیئے ہیں اور اس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں۔ ہم اس بات کو بھی بھول جاتے ہیں کہ یہ علم الادویہ ہی تھا جو پنسلین سے انقلاب لایا ہے اور اسی کی وجہ سے آبادی کی موجودہ سطح قائم ہوئی ہے۔ ہم شاید یہ بھی بھول رہے ہیں کہ وہ علم کیمیا اور جینٹکس تھے جن کی اطلاق کی وجہ سے کیمیائی کھاد وجود میں آئی ہے اور سبز انقلاب کے باعث دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات پوری ہوئی ہیں۔ ہم یہ بھی بھول رہے ہیں کہ انہی علوم کی وجہ سے دولت پیدا کرنے والے علوم طبیعات اور ارضی طبیعات (Geophysics) اور جان بچانے والے علم الادویہ (Medicines)' سالماتی حیاتیات (Molecular Biology) تہذیب خلیہ (Cell Culture) اور علم الکیمیا ہی وہ علوم ہیں جن کی طرف تیسری دنیا کو رجوع کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنے کچھ موجودہ مسائل کا حل تلاش کر سکے۔"

ان خیالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے تھرڈ ورلڈ اکیڈمی کا افتتاحی اجلاس ٹریسٹ میں 5 جولائی 1985ء کو منعقد ہوا تھا۔ اس کا افتتاحی خطاب اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل مسٹر جیویر پیریز ڈی کویار نے کیا تھا۔ تیسری دنیا کی اکیڈمی کے فیلوز کے علاوہ 250 نمائندوں نے 50 ملکوں کی اکیڈمیوں اور کونسلوں کی طرف سے حصہ لیا تھا ان کا تعلق شمال اور جنوب سے تھا۔ ان کے علاوہ بین الاقوامی تنظیموں کے نمائندے بھی وہاں موجود تھے۔ اس اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ایک مشاورتی کمیٹی تشکیل دی جائے جو جنوب کی اکیڈمیوں اور کونسلوں کے صدور پر مشتمل ہو۔ اس کے ساتھ ہی ایک افریقن اکیڈمی آف سائنسز (African Academy of Sciences)

قائم کی گئی تھی۔ یہ ایک نیا بین الاقوامی پراجیکٹ ہے جو افریقہ میں خشک سالی' صحرا بننے کے عمل اور خوراک کی کمی کا مطالعہ' امریکہ کی نیشنل اکیڈمی آف سائنسز' عالمی بنک میکار تھر فاؤنڈیشن اور حکومت اٹلی کے اشتراک سے کرے گا۔ اس کے علاوہ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ افریقن انسٹی ٹیوٹ آف سائنٹیفک ریسرچ بھی قائم کی جائے جو قرار داد میں نشان زد کردہ مسائل کے سلسلے میں معاونت کرے۔

جولائی 1985ء میں ہونے والی اکیڈمی کی تاسیس سے اب تک ہم نے کیا حاصل کیا ہے؟ اولین مسئلہ تو یہی تھا کہ اپنے گھر کو ٹھیک ٹھاک کیا جائے۔ ہم نے اکیڈمی کے تین دفاتر ایشیا' افریقہ اور لاطینی امریکہ میں کھولے۔ یہ اکیڈمی کی خوش قسمتی تھی کہ اسے بڑے ترقی پذیر ممالک کی اشیرباد حاصل تھی اور ان میں سے دس ممالک کے سربراہوں نے پیغام بھی بھجوائے تھے۔ ایک شاندار گرانٹ جس کی مالیت 1.5 ملین امریکن ڈالر تھی گلیو اندرولی (Gulio Andreolli) نے اٹلی کی حکومت اور Cooperazione allo svilluppo) (Dipartimento per la کی طرف سے ہمیں فراہم کی تھی۔ جس سے ہم نے اپنے کام کا آغاز کیا۔ چار لاکھ پچاس ہزار کینیڈین ڈالر رقم کی کینیڈین انٹرنیشنل ڈیویلپمنٹ ایجنسی (CIDA) نے دی تھی۔ پچاس ہزار امریکن ڈالر کی مدد کویت فاؤنڈیشن فار ایڈوانسمنٹ آف سائنسز کی طرف سے ہمیں مطبوعات کے لئے ملی تھی۔ اردن کی حکومت نے چار ہزار امریکن ڈالر اور سری لنکا نے ایک ہزار امریکی ڈالر سالانہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اقوام متحدہ یونیورسٹی (UNU) نے خصوصی مدد دی تھی۔ دنیا کے موسمیاتی ادارے (WMO) اور یونائیٹڈ نیشنز ایجوکیشن سائنٹیفک اینڈ کلچرل آرگنائزیشن (UNESCO) نے ہمیں خصوصی گرانٹ فراہم کی تھی۔ اس کے علاوہ حکومت ہندوستان' چین اور برازیل سے درخواست کی تھی کہ وہ پچاس پچاس فیلو شپ فراہم کریں تاکہ دوسرے ترقی پذیر ممالک کے سائنسدان ہندوستان' چین اور برازیل کے اداروں میں کام کر سکیں۔ ان کے سفر کے اخراجات تھرڈ ورلڈ اکیڈمی ادا کرے گی۔

وہ نفاذی پروگرام جن سے ہم نے اب تک تعاون کیا ہے۔ تین بڑے زمرات میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔ وہ پروگرام اس لئے بنائے گئے کہ انفرادی طور پر سائنس دانوں کی مدد کی جا سکے۔ وہ پروگرام جن کا تعلق ترقی پذیر ممالک میں کسی سائنسی ادارے کا زیریں ڈھانچہ (Infra Structure) تشکیل دینا تھا۔ اور وہ پروگرام جو اس لئے بنائے گئے کہ تیسری دنیا میں سائنس اور سائنسی خواندگی کو نمایاں کیا جاسکے جہاں تک پروگرام کی پہلی قسم کا تعلق ہے جو انفرادی سطح پر سائنس دانوں کی مدد کے لئے بنائے گئے تھے ان کی صورت حال کچھ یوں ہے۔

(i) ترقی پذیر ممالک کے نوجوان سائنس دانوں کے لئے تحقیقی گرانٹ

یہ گرانٹ دس ہزار امریکی ڈالر ہے اور تین سالوں کے لئے ہے۔ اس میں آلات کی قیمت' صرف ہوجانے والی سپلائیاں (Expendable Supplies) سائنسی لٹریچر' اطلاقی اور خالص ریاضی کی فلیڈ کے مطالعات' مولی کیولر حیاتیات اور حیاتی کیمیا شامل ہیں۔ ایسی کوئی 30 گرانٹس اب تک مہیا کی جاچکی ہے۔

(ii) جنوب سے جنوب کی فیلوشپ

اب تک دوسرے ترقی پذیر ممالک سے سائنسدانوں نے مندرجہ ذیل ممالک کے دورے کیے ہیں۔
چین، میکسیکو، کوسٹاریکا (Costa Rica) ملائیشا، زمبابوے (Zimbabwe)۔

(iii) مزید امکانات

ترقی پذیر ممالک میں رہائش رکھنے اور وہاں کام کرنے والے تحقیقی افراد کو ان ترقی یافتہ ممالک میں ایک سال کے مطالعہ کے لئے بھجوانا جنہوں نے ایسے افراد کو گرانٹس دینے کے لئے فنڈ مہیا کیے ان ممالک میں چین اور اٹلی شامل ہیں۔ اس پروگرام کا تعلق حیاتیاتی، طبی اور کیمیائی علوم سے ہے جہاں تک اٹلی کا تعلق ہے۔ 14 اطالوی تجربہ گاہیں تیسری دنیا کے سائنس دانوں کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو چکی ہیں اور ہم ان میں 30 سائنسدانوں کو بھیجوانا چاہتے ہیں۔ پروفیسر اٹینو زی چیچی (Antonino Zichichi) کی ورلڈ لیبارٹری کے اشتراک سے یہ توقع ہے کہ فیلو شپ کی تعداد تقریباً 500 ہو جائے گی۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پروفیسر زی چیچی کو تیسری دنیا کے کئی سائنسی مقاصد کے ساتھ اس قدر تعاون کرنے کے باعث تھرڈ ورلڈ اکیڈمی کا واحد یورپین ایسو سی ایٹ فیلو چن لیا گیا ہے۔ ان کا یہ اعزاز ریاستہائے متحدہ امریکہ کے پروفیسر نورمن بورلاگ (Norma Borlag) کے ساتھ مشترک ہے جن کو گندم کی پیداوار کے بنیادی مطالعے پر نوبل انعام دیا گیا تھا۔ ان کے مطالعے ہی نے سبز انقلاب کی راہ ہموار کی تھی۔

ابھی تک ہم نے وہ پروگرام بیان کیے ہیں جو انفرادی سائنس دانوں کے کام کو آگے بڑھانے کے لئے بنائے گئے تھے۔ جنوب، جنوب رابطہ اور ترقی پذیر ممالک کے سائنسی اداروں میں اضافہ کے لئے بھی ہم نے پروگرام بنائے۔ اسی سلسلے میں ہم نے ترقی پذیر دنیا کی 250 لائبریریوں کو بین الاقوامی سائنسی رسالے اور کتابیں فراہم کیں۔ ہم نے شمال، جنوب گول میز کانفرنس کا اہتمام کیا جس میں شمال اور جنوب دونوں کے سربر آوردہ محقق جمع ہوئے۔ اس مقصد کے لئے کہ انفرادی تجربہ گاہوں میں تحقیقی اداروں کے مابین خواہ ان کا تعلق شمال سے ہو یا جنوب سے مستقبل کے رابطے قائم کرنے پر غور کیا جائے۔ ایسی دو گول میز کانفرنسیں اب تک منعقد کی جا چکی ہیں۔ پہلی خرطوم میں نومبر 1985ء میں ہوئی تھی۔ اس کا موضوع تھا "زمین کا کٹاؤ اور ریت کی گردش پر قابو پانے میں تجربہ گاہ کا کردار" (The Role of a laboratory in the control of Soil erosion and sand movement) دوسری کانفرنس ٹریسٹ میں ہوئی تھی۔ سینکروٹون ریڈی ایشن (Synchroton Radiation) اور ترقی پذیر ممالک میں ان کے استعمال کے بارے میں۔ ایسی ہی گول میز کانفرنس موس بایور سپکڑوسکوپی (Mossabuer Spectroscopy) ہومیوگلوبینو پارٹرکس (Haemoglobinopatrics) پودوں کی افزائش اور ٹھوس دھاتوں کی کیمیا پر 87-1986ء کے لئے تجویز کی گئی ہے۔

اس حوالے سے کہ تیسری دنیا میں سائنسی حصول اور سائنسی خواندگی کے سلسلے میں بیداری بڑھ رہی ہے۔ اکیڈمی نے تیسری دنیا کے سائنس دانوں کے لیے قابل قدر انعامات مقرر کیے ہیں۔ ہر برس دس دس ہزار امریکن ڈالر کے چار انعام حیاتیات' کیمیا' ریاضی اور طبیعات کے شعبوں کے لئے رکھے ہیں۔ تیسری دنیا میں انفرادی اداروں کی ہم مدد کر رہے ہیں کہ وہ اپنے طور پر ہماری مدد سے نوجوان سائنسدانوں کی حوصلہ افزائی کے لئے انعام مقرر کریں تاکہ ترقی پذیر ممالک میں سائنس کو تقویت ملے۔ اس مد پر کوئی تیس ہزار امریکن ڈالر صرف کیے جائیں گے۔ اسی طرح ہم مقامی زبانوں میں شائع ہونے والے ان رسالوں کی بھی مدد کر رہے ہیں جو سائنسی تعلیم اور سائنسی خواندگی کے لئے ترقی پذیر ممالک میں کام کر رہے ہیں ایسے رسالوں کے لئے ہم نے ایک گرانٹ مقرر کی ہے۔

اس کے علاوہ ہم نے تیسری دنیا میں لیکچرز کے لئے بھی ایک سکیم بنائی ہے۔ اس سلسلے میں سائنس کی قابل احترام شخصیتیں تیسری دنیا کے ممالک میں جائیں گی اور لیکچر دیں گے۔ پندرہ خطاب کرنے والوں نے پندرہ ممالک میں جا کر 1986ء میں لیکچر دینے کی ہماری دعوت قبول کی ہے۔

مگر یہ تمام کوششیں جو ترقی پذیر ممالک میں سائنسی برادری کو مدد دینے کے لئے کی جا رہی ہیں۔ ان میں مجموعی طور پر ایک رکاوٹ یہ ہے کہ یہ ممالک اپنے طور پر ان کوششوں میں دلچسپی نہیں لیتے۔ اس کے بہت سے پہلو ہیں۔ پہلا تو یہ کہ وہ تعمیر نو کے مختلف کاموں میں سائنس دانوں کو شامل نہیں کرتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نئے لوگ ان موضعات میں دلچسپی نہیں لیتے۔ حقیقت میں بدقسمتی یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک کے بہت سے نوجوان ان پیشہ ورانہ کاموں میں نہیں آتے۔ اس کی بھی بہت سے وجوہات ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ سائنس کی تعلیم پر بے توجہی کی جاتی ہے۔ دوسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ سائنس دانوں کے لئے ذریعہ معاش کے مواقع اچھے نہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ کم از کم ان ممالک کو ترقی کی کوششوں میں سائنس کو ایک صحیح پیشہ نہیں سمجھا جاتا۔

اس بات کو کسی طرح یقینی بنایا جائے کہ ہمارے ممالک کے منصوبہ بندی کرنے والے سائنسدانوں کو بھی مناسب طور پر استعمال کریں۔ ہمارے معاشرے اور حکومتوں کے لئے یہ خاصہ دشوار کام ہے اور اس کے لئے ہم نے ابھی کام کرنا بھی شروع نہیں کیا۔ یہ کام اگلے عشرے کے لئے سب سے زیادہ ہمارے پیش نظر ہونا چاہیے۔ شاید ہم بھی منصوبہ بندی کرنے والوں کو دعوت دیں کہ وہ ٹریسٹ کے نظریاتی طبیعات کے مرکز میں آئیں اور وہ سائنسدانوں سے طویل ملاقاتیں کریں۔ مگر یہ کچھ مختلف قسم کی ذمہ داری ہے جس پر ابھی تک ہم نے کچھ کام نہیں کیا۔

فیراڈی میلانو (Fiera de Milano) (جہاں بھائی جان نے یہ تقریر کی تھی۔ مرتب) تیسری دنیا کی اکیڈمی آف سائنسز کے حوالے سے ہماری مدد کیسے کر سکتی ہے؟ میرے ذہن میں وہ سکیم ہے جو برطانیہ میں 1851ء کی نمائش کے بعد ترتیب دی گئی تھی جس میں اس زمانے کی برطانوی کالونیوں کے لئے

سائنسی تحقیق کے لئے وظائف کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ ان وظائف کی وجہ سے کالونیوں کے سائنسدانوں کو برطانیہ کی یونیورسٹیوں میں جانے کے مواقع ملے۔ اس فنڈ کو توسیع دے دی گئی تھی اور اب تک اسی مقصد کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ فیراڈی میلانو ہر برس منعقد کیا جاتا ہے۔ میری آپ سے تجویز یہ ہے کہ آپ اسی مقصد کے فیراڈی میلانو وظائف جاری کریں اور ان میں ہر سال آمدنی کے بڑھنے پر اضافہ ہوتا رہے۔" (Ideals and Realities Second Edition p170-175)

1996ء میں تھرڈ اکیڈمی آف سائنسز کے ممبروں کی تعداد 411 تھی (جنوب کے 59 ممالک سے 330 فیلوز اور شمال کے 9 ممالک سے 81 ایسوسی ایٹ فیلوز) اکیڈمی کے ممبر ہر چار سال بعد اکیڈمی کی کونسل کے ممبروں کا انتخاب کرتے ہیں جو اکیڈمی کا نظم و نسق سنبھالتی ہے۔ اکیڈمی کا اپنا ایک چھوٹا سا سیکرٹری ایٹ ہے جس کا سربراہ ڈائریکٹر ہوتا ہے۔ (بھائی جان اس اکیڈمی کے بانی ڈائریکٹر تھے۔ خرابی صحت کی وجہ سے 1994ء میں اس عہدہ سے مستعفی ہو گئے تھے۔ اس کے بعد انہیں اعزازی پریذیڈنٹ مقرر کیا گیا جس عہدہ پر وہ 1996ء (اپنی وفات تک) تک فائز رہے) جو اکیڈمی اس کی کونسل اور انتظامیہ کی مختلف امور میں رہنمائی اور معاونت کرتے ہیں۔ کونسل کے دفاتر آئی سی ٹی پی کی عمارت میں واقع ہیں (ٹریسٹ اٹلی میں)

1991ء میں اقوام متحدہ کے ادارہ یونیسکو نے تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنسز کی مالی ذمہ داریوں کی دیکھ بھال سنبھال لی تھی۔ اس اکیڈمی کو زیادہ تر فنڈ اٹلی کی حکومت فراہم کرتی ہے۔ مندرجہ ذیل ادارے اور حکومتیں بھی اکیڈمی کو مالی امداد دیتے ہیں۔

ترقی پذیر ممالک کے لئے تحقیق اور معاونت کی سویڈش ایجنسی

(The Swedish Agency for Research Cooperation With Developing Countries) (SAREC) یونیسکو (The United Nations Educational Scientfic and Cultrual Organisation)

اوپیک فنڈ برائے عالمی ترقی (The OPEC Fund for International Develompment)

کویت فاؤنڈیشن برائے سائنسی ترقی (KFAS)

برازیل، چین، مصر، انڈیا، نائیجیریا، شام اور پاکستان کی حکومتیں۔

1986ء سے لے کر اب تک اکیڈمی نے جنوب کے 90 ممالک میں سائنسی اہمیت کے تحقیقی کاموں کی مدد کی۔ علاوہ ازیں دنیا کے 2000 ممتاز سائنس دان (بشمول اکیڈمی کے ممبران) ترقی پذیر ممالک کے سائنسدانوں کی طرف سے تحقیق کے لئے گرانٹس کے لئے پیش ہونے والی تجاویز کا بنظر غور مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ کام بلا معاوضہ کیا جاتا ہے۔

1996ء میں اکیڈمی کے اراکین اور کونسل ممبران کی تفصیل

اعزازی پریذیڈنٹ	پروفیسر عبدالسلام	پاکستان
پریذیڈنٹ	پروفیسر جے ورگاس	برازیل
وائس پریذیڈنٹس	پروفیسر اے۔اے الشاملان	کویت
	پروفیسر اے جے آروی آ	ارجنٹائن
	پروفیسر ٹی۔ آر۔ اوڈی ایمبو	کینیا
	پروفیسر سی این آر راؤ	انڈیا
	پروفیسر زوہو جی۔ زیڈ	چین
اگزیکیٹو ڈائریکٹر	پروفیسر ایم۔ایچ۔اے حسن	سوڈان
سیکرٹری جنرل	پروفیسر اے بدران	اردن
خزانچی	پروفیسر ایم اختر	برطانیہ
ممبران کونسل	پروفیسر آئی ڈی اوپ	سینیگال
	پروفیسر ای کیو جاویر	فلپائن
	پروفیسر ایس ایس لی	جنوبی کوریا
	پروفیسر ایم روش	وینزوویلا

17

کائنات اور سائنس

فیض میموریل لیکچر

فیض فاؤنڈیشن کی دعوت پر بھائی جان نے یہ لیکچر 27 فروری 1988ء کو انٹر کانٹینٹل ہوٹل لاہور میں دیا تھا۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ کی حفاظت چاہتا ہوں راندے ہوئے شیطان سے۔ شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے۔"

یہ میری عزت افزائی ہے کہ مجھے فیض میموریل لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا گیا ہے۔ میں اس نوازش کے لئے بیگم ہاشمی کا شکر گذار ہوں۔ ایسے کوئی موزوں الفاظ میرے ذہن میں نہیں آ رہے جن میں اظہار ممنونیت کروں۔ یہ سب فضل ہے اس رب العزت کا جس کا سایہ کرم ہمیشہ سے مجھ پر رہا ہے اور اظہار ہے اس اٹوٹ رشتہ کا جو میرے اور آپ کے درمیان ہے۔

جب یورپ میں میرے حلقہ احباب میں یہ خبر پھیلی کہ میں لاہور فیض میموریل لیکچر دینے جا رہا ہوں تو زیادہ تر دوستوں نے اپنے تعجب کا اظہار کیا شاید ان وجوہ کی بنا پر کہ:

فیض ایک عظیم شاعر اور میں ایک حقیر سائنس دان۔ وہ حسن و عشق کی دنیا میں رہنے والے میں ایٹم کی دنیا کا باشندہ۔ وہ زندگی میں رنگینی کے دلدادہ یہ عاجز زاہد و خشک وہ قید وہ بند سے آشنا اور ارباب اقتدار کی نگاہ میں معتوب اور میں حکومتوں سے کام لینے کا خوگر۔

اس سلسلے میں پہلی عاجزانہ عرض تو یہ ہے کہ سائنس دان حسن و جمال سے غیر متعلق نہیں ہوتا۔ لاہور میں پیدا ہونے والا نوبل انعام یافتہ پروفیسر چندر شیکھر نے اپنی کتاب Truth and Beauty میں John Keats کی اس بات کو دہرایا ہے کہ Truth is beauty Beauty is Truth ' صداقت اور حسن میں کوئی امتیاز نہیں۔

ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ جمالیاتی ذوق سے متصف سائنسدانوں کے پیش کردہ نظریئے بالاخر صحیح ثابت ہوئے گو شروع میں وہ ضعیف نظر آتے تھے۔ نظریاتی اختلاف کے باوجود فیض مرحوم اور اس عاجز میں کئی قدریں اشتراک رکھتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بار بار فرمایا ہے کہ اے امت رسول! میری خلق پر تفکر اور تسخیر کائنات تمہارے ذمے کئے گئے ہیں۔ اس طرح پر تم بھی انہی صفات سے متصف کیے جاؤ گے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ 45:14-/3

ترجمہ: "اللہ وہی ہے جس نے سمندر کو تمہاری خدمت پر لگایا ہوا ہے تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تاکہ تم (ان کے ذریعے سے) اس کے فضل کو تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو۔

اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، سب کا سب اس نے تمہاری خدمت پر لگایا ہوا ہے۔ اس میں فکر کرنی والی قوم کے لئے بڑے نشان ہیں۔"

کلام پاک میں سات سو پچاس آیات یعنی قرآن کریم کا آٹھواں حصہ ایسا ہے جس میں انسان کو تفکر و تسخیر کی دعوت دی گئی ہے۔ تفکر و تسخیر، رب ارنی حقائق الاشیاء کی دعا اور قدرتی وسائل پر قابو۔ یہی سائنس اور ٹیکنالوجی ہیں۔ فیض اسی جادہ تفکر و تسخیر کے راہی تھے۔ سنئے! ان کا تفکر انہیں تحیر کی کس منزل پر لے جاتا ہے۔

کئی بار اس کی خاطر ذرے ذرے کا جگر چیرا
مگر یہ چشم حیران جس کی حیرانی نہیں جاتی

یہاں فیض نے چشم حیران کی بات کی ہے۔ یہی اعلیٰ سائنس کی بنیاد ہے اور یہی سائنسی تحقیق کی معراج۔ تفکر کے سفر کی ہر منزل چشم حیران کو مزید حیرانیوں کی وادی میں گم کر دیتی ہے۔

فیض تفکر اور تحیر سے پیدا ہونے والی تسخیر یعنی ٹیکنالوجی کو انسانوں کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اسے چند کی اجارہ داری نہ سمجھ کر ساری انسانیت کا ترکہ سمجھتے تھے۔ وہ اس کے ثمرات سے سارے عالم کو مستفید ہوتے دیکھنا چاہتے تھے۔ سنئے لینن پرائز کی تقریب کے موقعہ پر وہ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔

"یہ بم اور راکٹ، توپیں، بندوقیں سمندر میں غرق کر دو اور ایک دوسرے پر قبضہ جمانے کے بجائے تسخیر کائنات کو چلو جہاں جگہ کی کوئی تنگی نہیں ہے۔"

اور پھر کہتے ہیں۔

"اب سے پہلے انسانوں کو فطرت کے ذخائر پر اتنی دسترس اور پیداوار کے ذرائع پر اتنی قدرت نہ تھی کہ ہر گروہ اور برادری کی ضرورتیں پوری طرح سے تسکین پا سکتیں۔ لیکن اب یہ صورت نہیں۔ اب انسانی عقل، سائنس اور صنعت کی بدولت اس منزل پر پہنچ چکی ہے کہ جس میں سب تن بخوبی پل سکتے ہیں اور سبھی جھولیاں بھر سکتی ہیں بشرطیکہ قدرت کے یہ بے بہا ذخائر، پیداوار کے یہ بے اندازہ خرمن،

بعض اجارہ داروں اور مخصوص طبقوں کی تسکین و ہوس کے لئے نہیں بلکہ جملہ انسانوں کی بہبود کے لئے کام میں لائے جائیں۔ لیکن یہ جبھی ممکن ہے کہ انسانی معاشرے میں ان مقاصد سے مطابقت پیدا ہو اور انسانی ڈھانچے کی بنیادیں' ہوس' استحصال اور اجارہ داری کے بجائے انصاف' برابری' آزادی اور اجتماعی خوشحالی پر اٹھائی جائیں۔"

میری برسوں سے یہی تگ و دو رہی ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی ساری دنیا میں اور خصوصاً" تیسری دنیا میں فروغ پائے اور اس کے ثمرات سے کیا امیر اور کیا غریب سبھی مستفید ہوں۔ فیض کا خیال تھا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ثمرات کو محض ایک مخصوص نظام کے تحت ہی عام کیا جا سکتا ہے۔ میں اس خیال کا حامل ہوں کہ انسانیت میں اتنی بلوغت آ چکی ہے کہ یہ مقصد افہام و تفہیم کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

رہا مذہب کا معاملہ تو فیض جن اعلیٰ انسانی قدروں کو عزیز رکھتے تھے۔ اعلیٰ مذہبی اقدار وہی ہیں۔ فیض کے بارے میں اس بات کو اشفاق احمد نے ایک دوسرے انداز سے کہا ہے۔ "اگر فیض حضورؐ سرور کائنات کے زمانے میں ہوتے تو ان کے چہیتے غلاموں سے ہوتے۔ جب بھی کسی بد زبان' تند خو' بداندیش یہودی دکاندار کی دراز دستی کی خبر پہنچتی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی کبھی ضرور فرماتے "آج فیض کو بھیجو' یہ بھی دھیما ہے۔ صابر ہے' بردبار ہے۔ ہمارے مسلک پر عمل کرتا ہے۔" اور پھر عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ڈوبی ہوئی اس نعت کو پڑھ کر ایک شقی القلب ہی ان پر اسلام سے دوری کا الزام دے سکے گا۔

نعت

اے تو کہ ہست ہر دل محزوں سرائے تو
آوردہ ام سرائے دگر از برائے تو
خواجہ بہ تخت بندہ تشویش ملک و مال
برخاک رشک خسرو دوراں گدائے تو
آنجا قصیدہ خوانی لذات سیم و زر
اینجا فقط حدیث نشاط لقائے تو
آتش فشاں زقہر و ملامت زبان شیخ
از اشک ترز درد غریباں روائے تو
باید کہ ظالمان جہاں را صدا کند
روز بسوئے عدل و عنایت صدائے تو

غبار ایام ص 36

یہ سب باتیں اپنی جگہ پر اب تو فیض اور مجھ میں ایک چیز اور مشترک ہو گئی ہے۔ دونوں ہی ملک کے مخصوص طبقوں کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہیں۔ دونوں ہی Non Persona قرار دیئے گئے ہیں

باوجود ذہن پر زور دینے کے مجھے یاد نہیں پڑتا کہ فیض سے میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی شاید ملک کے باہر لندن میں۔ 1945ء میں مجھے ان کا مجموعہ کلام "نقش فریادی" پڑھنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد یوں لگتا ہے جیسے میں ہمیشہ ہی ان سے واقف رہا ہوں۔ ان سے میری آخری ملاقات ملتان کے ہوائی اڈا پر ہوئی تھی۔ وہ لاہور جا رہے تھے۔ میں کراچی' میرا جہاز اسلام آباد سے آکر ملتان رک گیا تھا کیونکہ اس روز کہر اور غبار بہت زیادہ تھا اور جہازوں کی آمدورفت بند ہو گئی تھی۔ اس روز ائیرپورٹ پر ہم بار بار ملے۔ انہوں نے اپنی نئی غزلوں کے شعر سنائے اور ازراہ کرم ان اشعار کو میری نوٹ بک میں لکھ دیا جو بطور تبرک لندن میں میرے پاس محفوظ ہیں۔

نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے جسم و جان بچا کے چلے
ہے اہل دل کے لئے اب یہ نظم بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

شام غربت

دشت میں سوختہ سامانوں پہ رات آئی ہے
غم کے سنسان بیانوں پہ رات آئی ہے
نور عرفان کے دیوانوں پہ رات آئی ہے
بیت شبیر پہ ظلمت کی گھٹا چھائی ہے
درد سا درد ہے تنہائی سی تنہائی ہے

اس قدرے طویل تمہید کے بعد میں اس موضوع پر آتا ہوں جس کا اعلان کیا گیا ہے۔ آج کے لیکچر میں بنیادی طور پر تین موضوعات پر گفتگو کروں گا۔

(ا) وسعت کائنات اور کائنات میں کارفرما قوتیں

دوران گفتگو اگر میں انگریزی زبان استعمال کرنے لگوں تو امید ہے' درگذر کریں گے جواز میں حفیظ جالندھری کا تصرف کے ساتھ شعر پیش ہے۔

زبان انگلشہ کی ہمزبانی ہو نہیں سکتی
ابھی اردو میں پیدا وہ روانی ہو نہیں سکتی

(ب) پاکستان میں سائنسی تعلیم و تحقیق کی حالت زار اور اسے بہتر بنانے کی صورت۔
(ج) اور اسی سلسلہ میں ایک کڑی حلقہ ارباب سائنس کی تحریک کا آغاز
میں چاہتا ہوں کہ حلقہ ارباب سائنس کی تحریک چلے اور فروغ پائے۔

وسعت کائنات

چاند' سورج' ستارے اور فلک ابتداء ہی سے انسان کے غور و فکر کے محور رہے ہیں۔ اس غور و فکر کی تاریخ کم سے کم اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ قدیم مصریوں کی تاریخ۔ فلک کو سمجھنے کی ابتدائی کوششیں مائیتھالوجیکل (Mythological) نوعیت کی ہیں جن میں فلکی اجرام کو مختلف قسم کی دیوی دیوتاؤں سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان کوششوں کے بارے میں آج ہم جو چاہے کہیں اتنا ضرور ہے کہ ان میں اور کائنات میں ایک ترتیب اور ربط کی تلاش کا عنصر موجود ہے۔

ان مائیتھالوجیکل تصورات کے بعد بطلیموس (Ptolemy) کے تصور کائنات کا دور آتا ہے جس کے مطابق زمین ساری کائنات کا مرکز ہے اور اجرام فلکی جیسے چاند' سورج' ستارے اور دیگر سیارگان زمین کے گرد گردش کر رہے ہیں۔ اس تصور کو صدیوں تک مقبولیت حاصل رہی۔ اسے سب سے پہلے سنجیدہ طور پر جیارڈینو برونو (Giardano Bruno) نے چیلنج کیا۔ اس نے زمین کی مرکزی حیثیت سے انکار کیا اور ایک لامتناہی کائنات کے تصور کو اپنایا۔ اپنے خیالات کی پاداش میں غریب برونو کو کٹر کیتھولک مذہب پرستوں نے مرتد قرار دے کر نذر آتش کر دیا۔ برونو کے خیالات کی اتنی شدید مخالفت کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس سے انسان کی جائے سکونت یعنی زمین کی مرکزی حیثیت ختم ہو رہی تھی۔

یہاں یہ ذکر بھی بے محل نہ ہو گا کہ قرون وسطیٰ کے کیتھولک مذہبی طبقے کا کسی سائنسدان کو اس کے سائنسی نظریات کی بناء پر ایذا پہنچانے کا یہ تنہا واقعہ نہ تھا۔ اٹلی میں جب گیلی لیسو (Gallileo) نے فلکیات کے مسائل کو اس طرح درجہ بند کیا کہ صرف انہیں مسائل کا جواب جو واقعتاً" فزکس سے تعلق رکھتے ہوں تجربہ کے ذریعے حاصل کیا جائے تو وہ بھی زیر عتاب آیا جس کے نتیجے کے طور پر اٹلی میں سائنس کی ترقی کم سے کم اٹھارویں صدی تک رک گئی۔ لیکن اب اس واقع کے تقریباً" ساڑھے تین سو سال بعد نظریاتی اختلاف کے مسئلہ پر کیتھولک طبقے کی طرف سے رواداری کا اظہار ہو رہا ہے۔ ہنر ہولی نس پوپ پال ثانی نے ویٹیکن میں 9 مئی 1983ء کو منعقد ہونے والی ایک خصوصی تقریب میں یہ اعلان کیا۔ "گیلی لیو اور اس کے بعد کے واقعات سے چرچ نے سبق لیا ہے----- چرچ خود تجربے اور غور و فکر سے سیکھتا ہے۔ اور وہ رب تحقیق کی آزادی کے مفہوم کو بہتر طور پر سمجھنے لگا ہے---- یہ تحقیق ہی ہے جس سے صحیح آگاہی ہوتی ہے۔ اس لئے چرچ اب اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ سائنس اور ایمان میں کوئی حقیقی تضاد نہیں۔"

مخالفت کے باوجود رفتہ رفتہ زمین کی مرکزی حیثیت کا تصور ختم ہو گیا ہے شاید یہ کہنا زیادہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ آج بھی بعض مذہبی حلقوں میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ زمین ساکن ہے۔ مثال کے طور پر مدینہ یونیورسٹی کے صدر جناب عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز نے اپنی 1982ء میں شائع ہونے والی کتاب علیٰ سکون الارض لجریان والشمس والقمر میں زمین کو ساکن اور چاند اور سورج کو اس کے گرد گردش کرنے کے نظریہ کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ گو خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے اپنے نہ ماننے والوں کو کافر قرار نہیں دیا۔

اب میں کائنات کے بارے میں موجودہ تصورات کو مختصرا" پیش کروں گا۔

ہمارا نظام شمسی جس کے مرکز پر سورج ہے رات میں آسمان پر نظر آنے والی کہکشاں کا ایک حقیر جزو ہے۔ اس کہکشاں پر ہمارے سورج (جو خود ایک ستارہ ہے) جیسے تقریبا" 10^{11} (ایک ارب) ستارے ہیں۔ کائنات میں ہماری کہکشاں جیسی تقریبا" 10^{11} (ایک ارب) کہکشائیں ہیں۔ ہماری کہکشاں کی پڑوسی کہکشاں تقریبا" 11/2 ملین نوری سال دور پر ہے۔ (ایک نوری سال 10^{13} کلومیٹر ہوتا ہے)

کائنات کی ابتداء کے بارے میں زیادہ تر سائنسدان کا خیال ہے کہ اس کی ابتداء ایک عظیم دھماکے (Big Bang) سے ہوئی جو آج سے تقریبا" 20-15 ملین (10^{13}) سال پہلے ہوا تھا۔ اس عظیم دھماکے کے تحت کائنات نے پھیلنا شروع کیا۔ اس پھیلنے کا اثر یہ ہوا کہ کائنات ٹھنڈی ہونے لگی۔ ٹھنڈے ہونے سے آئن سٹائن کے بموجب انرجی (Energy) اور مادہ کی (Inter Conversion) شروع ہو گئی اور مادہ وجود میں آنا شروع ہوا۔ پہلے بنیادی ذرات جیسے کوارکس (Quarks) بنے پھران کو کوراکس سے نیوکلیانس (Nucleons) اور نیوکلیانس سے ملکے نیوکلیائی (Nuclei) ۔ یہ سارا عمل عظیم دھماکے سے چند سکینڈ کے وقفہ میں تکمیل پا جاتا ہے۔

یہاں یہ اشارہ کرنا نامناسب ہے کہ جب مادہ ایک فیز (Phase) سے دوسرے فیز میں تبدیل ہوتا ہے تو بالعموم وہ ممکنہ حد تک کم سے کم انرجی کی حالت میں جاتا ہے لیکن کاسمک اسکیل پر ہونے والی نیوکلیر بائنڈنگ میں ایسا نہیں ہوتا اگر اتفاقا" ایسا ہوتا تو عظیم دھماکے کے چند سکینڈ کے وقفے میں ہونے والی نیوکلیر سنتھیس (Nucler Synthesis) سے بیشتر لوہے (Fe) کے نیوکلیس بنتے اور یہ کائنات اس شکل میں نہ ہوتی۔

نیوکلیان اور He^4 بننے کے بعد کا عمل یہ ہے کہ الیکٹرون اور پروٹان مل کر ہائیڈروجن (H) اور الیکٹران اور الفا پارٹیکل مل کر He^4 ایٹم بناتے ہیں (بھاری ایٹم اس وجہ سے بن نہیں پاتے کہ اکیلے نیوکلیائی نہیں ہیں) اس کے بعد کہکشائیں اور اسٹارس (Stars) بنتے ہیں۔ یہ عمل عظیم دھماکے کے تقریبا" 10^8 سال بعد کا ہے۔ اس دوران کاسمک ریڈیشن ٹمپریچر برابر گرتا رہتا ہے۔ یہاں یہ بتا دینا دلچسپ ہو گا کہ گریوٹیشنل بائنڈنگ (Gravitational Binding) کی وجہ سے اورجو اجسام بنتے ہیں یا بن سکتے ہیں۔ ان میں وہائٹ ڈراف (White Dwarf) نیوٹران اسٹار اور بلیک ہول (Black Hole) قابل ذکر ہیں۔

ایک کولڈ اسٹار کا ماس (Mass) اور سائز تقریباً ہمارے سورج کے برابر ہوتا ہے۔ اور اس میں گریوٹیشنل فورس کو تھرمل پریشر گریڈینٹ (Thermal Pressure Gradient) سنبھالے رہتا ہے۔ وہائٹ ڈراف کا ماس Mo 5.9 سے کم ہوتا ہے۔ (M_0 ہمارے سورج کا ماس ہے) اور اس میں گریوٹی (Gravity) اور ڈی جنریٹ الیکٹران (Degenerate Electron) پریشر برابر ہوتے ہیں۔ اس کی پیشن گوئی چندر شیکھر نے کی تھی (چندر شیکھر 19 اکتوبر 1910 ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے کیمرج میں تعلیم حاصل کی۔ بلیک ہولز (Black Holes) کا تصور سب سے پہلے چندر شکھیر نے پیش کیا تھا۔ 1983 ء میں انہیں فزکس کا نوبل انعام دیا تھا۔ انہوں نے 21 اگست 1995 ء کو امریکہ میں وفات پائی۔ 1937 ء میں انہوں نے امریکن شہریت حاصل کی تھی۔ ناقل) نیوٹران اسٹار کا ماس $2.5\ M_0$ سے کم ہوتا ہے اور اس میں گریوٹی نیوٹران پریشر کے برابر ہوتی ہے۔ آخر میں بلیک گریوٹی یوبیرے (Gravity Uberable) ہے۔ یہ مادے کی کثیف ترین حالت ہے اور یہ ہر شے حتیٰ کہ روشنی کو بھی نگل جاتا ہے۔

کہکشاں اور اسٹار بننے کے بعد کائنات کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اسٹار سے گریوٹیشنل انرجی نکلنے سے اسٹار ٹمپریچر بڑھ جاتا ہے۔ اس عمل میں پہلے الیکٹرو مگیٹک (Electro Magnetic) اور بعد میں نیوکلیر فورسز کارفرما ہونے شروع ہوتے ہیں۔ نیوکلیر فورس کے تحت تھرمو نیوکلیر ایکشن سے یورنیم اور تھوریم تک کے سارے نیوکلیائی بنتے ہیں۔

بگ بینگ سے کائنات کی موجودہ صورت کیسے پیدا ہوئی۔ اسے سمجھنے کے لئے کائنات میں کارفرما قوتوں کا سمجھنا ضروری ہے۔

ابتداء ہی سے انسان اس کوشش میں سرگرداں رہا ہے کہ وہ طبیعاتی عوامل کی توجیہ چند سادہ تصورات اور اصولوں سے کرے۔ اس کوشش میں سلطان محمود غزنوی کے دور کے مسلمان سائنس دان البیرونی کا نام واضح طور پر پہلے سامنے آتا ہے۔ البیرونی اور اس کے بعد گیلیلو نے یہ اصول پیش کیا کہ طبیعات کے جو قوانین کرہ ارض پر کارفرما ہیں وہی کائنات کے ہر گوشے میں ہیں۔ آج یہی اصول ساری سائنس کی بنیاد ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو سائنس کا وجود ہی نہ ہوتا فلَن تجد لنسه اللّٰہ تبدیلا البیرونی اور گیلیلو کے کام کو آگے بڑھاتے ہوئے نیوٹن نے ریاضی کی مدد سے یہ دکھایا کہ جس قوت کے تحت مادی اجسام زمین کی طرف گرتے ہیں وہ بعینہ وہی ہے جس کے تحت سیارے سورج کے گرد گردش کرتے ہیں یہی قوت کشش (Force of Gravity) ہے۔

کشش ثقل کے بعد دوسری قوت کا انکشاف ہوا۔ یہ الیکٹرو میگنیٹک (Electro magnetic) قوت ہے۔ یہ قوت دو الگ الگ شکلوں میں سامنے آئی۔ ایک مقناطیسی قوت اور دوسری برقی قوت۔ 1830 ء میں فیراڈے (Faraday) اور امپیر (Ampere) کے تجربات اور بعد میں 1870 ء میں میکسوئل (Maxwell) کی نظریاتی تحقیقات سے یہ ثابت ہوا کہ مقناطیسی اور برقی قوتیں دراصل ایک

ہی قوت کے دو مختلف پہلو ہیں۔ نیوٹن کے بعد دو بظاہر مختلف نظر آنے والی قوتوں کی وحدت کے نمایاں کرنے کا یہ دوسرا کارنامہ ہے۔ یہ الیکٹرو میگنیٹک (برق مقناطیسی) فورس ہی ہے جس کی بدولت ایٹم میں منفی چارج کا الیکٹران مثبت چارج کے نیو کلیس سے بندھا ہے۔ ہماری روزمرہ زندگی میں استعمال ہونے والی بیشتر اشیاء جیسے بجلی' ریڈیو' ٹیلی ویژن وغیرہ وغیرہ الیکٹرو مینگنیٹک فورس کا ہی کرشمہ ہے۔ اس صدی کے شروع میں کوانٹیم میکنکس کی مدد سے یہ بھی منکشف ہوا کہ کیمکل فورس جس کا تعلق کرہ ارض پر زندگی سے ہے الیکٹرو میگنیٹک فورس کی ایک مخصوص شکل کا نام ہے۔

گریوٹی اور الیکٹرومیگنیٹک قوتوں کے علاوہ دو قوتیں اور ہیں جن کا تعلق ایٹم کے نیو کلیس سے ہے۔ جیسا کہ آپ کو علم ہے ہر ایٹم میں ایک نیو کلیس ہوتا ہے جس میں ایٹم کا تقریباً" سارے کا سارا ماس (Mass) مرکوز ہوتا ہے۔ نیو کلیس میں دو قسم کے ذرات پائے جاتے ہیں۔ ایک نیوٹرون اور دوسرا پروٹان۔ جس قوت کے زیر اثر یہ بندھے رہتے ہیں اسے اسٹرانگ نیوکلیر فورس (Strong Nuclear Force) کہتے ہیں۔ یہ کائنات میں کارفرما بنیادی قوتوں کی تیسری قسم ہے اور ہمارے روزمرہ کے مشاہدات سے پرے نیوکلیر فورس کی ایک قسم اور ہوتی ہے چونکہ یہ کافی کمزور ہوتی ہے اس لیے اسے ویک نیوکلیر فورس (Weak Nuclear Force) کہتے ہیں۔

اس صدی کے شروع میں آئن سٹائن نے چار ڈائمنشنل (Dimensional) زمان و مکان کا انقلابی تصور پیش کیا اور یہ دکھایا کہ ٹائم (Time) اور مکان (Space) الگ الگ حیثیت نہیں رکھتے بلکہ وہ ایک سلسلہ میں مربوط ہیں۔ اس تصور کو مزید وسعت دیتے ہوئے انہوں نے یہ واضح کیا کہ گریوٹی دراصل مادی اجسام کے گرد اسپیس ٹائم کے Curvature (خمیدگی) کا مظہر ہے۔ کچھ ایسی ہی Geometrical توجیہہ وہ الیکٹرو میگنیٹک فورس کی بھی کرنا چاہتے تھے اور اس کو بڑھاتے ہوئے وہ یہ دکھانا چاہتے تھے کہ کائنات میں پائی جانے والی قوتوں میں ایک قسم کی وحدت ہے مگر اپنی عمر کا بیشتر حصہ (35 سال) اس فکر میں غلطاں رہنے کے باوجود وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اس پس منظر میں ہماری تحقیق کا لب لباب یہ ہے کہ الیکٹرو میگنیٹک اور ویک نیوکلیر قوتیں دراصل ایک ہی قوت کے دو مختلف پہلو ہیں۔ اس قوت کو میں نے الیکٹرو ویک فورس کا نام دیا ہے۔ اس انکشاف کی نوعیت وہی ہے جو فیراڈے اور میکسوئل کے ذریعے الیکٹرک اور میگنیٹک قوتوں کے وحدت کی انکشاف میں تھی۔ اس مہم میں شریک دو اور سائنس دانوں وائنبرگ (Weinberg) اور گلیشیاؤ (Glashow) نے یہی انکشاف اپنے طور پر کیا۔

ہماری تحقیق کی چند پیشن گوئیاں تھیں جو بعد میں کئے گئے تجربات پر پوری اتریں۔ مثلاً" ہم نے پیشن گوئی کی تھی۔ تین ایسے ذرات دریافت ہونے چاہیں جن کی وجہ سے الیکٹرو ویک فورس وقوع پذیر ہوتا ہے۔ سرن (CERN) میں کیے گئے تجربات سے اس پیشن گوئی کی تصدیق ہوئی اور ان ذروں کی دریافت

پر تجرباتی ٹیم کے سربراہوں وان ڈر میر(Van der Meer) اور کارلو روبیا(Carlo Rubia) کو 1984ء میں اس پر نوبل انعام سے نوازا گیا۔ ہم تینوں وانبرگ (Weinberg) گلیشاؤ (Glashow) اور مجھے خصوصی دعوت دی گئی کہ ہم اس تقریب میں شامل ہوں۔

الیکٹرو ویک نظریے کی کامیاب کوشش کے بعد ہمارے سامنے دوسرا مرحلہ گرانڈیو نیفیکشین (Grand Unification) یعنی الیکٹرو ویک فورس اور اسٹرانگ نیو کلیر فورس کی وحدت کا تھا۔ اس وحدت کی بدولت میں نے اپنی ڈاکٹر پتی (Pati) (یہ ہندو ہیں۔ بھونشر کے رہنے والے ہیں لیکن اب امریکن شہری ہیں۔ امپریل کالج میں بھائی جان کی نگرانی میں تحقیقی کام کرتے رہے ہیں۔ مرتب۔) کی شمولیت میں ایک نظریہ پیش کیا ہے۔ اس نظریہ کی ایک اہم پیشن گوئی یہ ہے کہ پروٹان جسے غیر زوال پذیر مانا جاتا ہے اور جس کی زندگی لامتناہی تصور کی جاتی ہے۔ حقیقتاً" زوال پذیر ہے اور اس کا عرصہ حیات باجود یہ کہ کافی لمبا(10^{32} years) ہے پھر بھی محدود ہے۔ اس پیشن گوئی کی تصدیق کے سلسلہ میں اب تک کئی تجربات ہو چکے ہیں لیکن ابھی یہ پیشن گوئی تجربات کی کسوٹی پر پوری نہیں اتری۔

مختلف قوتوں میں وحدت کی تلاش کے سلسلہ کا آخری مرحلہ الیکٹرو ویک اسٹرانگ نیوکلیر اور گریوٹی کی قوتوں میں وحدت نمایاں کرنے کا تھا۔ یہ مرحلہ نظریاتی طور پر سٹرنگ تھیوری (String Theory) کے ڈھانچے میں ہونا معلوم ہوتا ہے۔ سٹرنگ تھیوری کی بنیادی بات یہ ہے کہ اگر بنیادی ذرات جنہیں ایک نقطہ متصور کیا جاتا رہا ہے ایک محدود سٹرنگ ہیں جن کی لمبائی نہایت ہی مختصر یعنی ایک سنٹی میٹر کے کئی کروڑویں حصہ (10^{33} cm) سے بھی کم ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات کی قوتوں کو ایک لڑی میں پرو دینے کا وہ خواب جسے آئن سٹائن نے دیکھا تھا اور جس کے لئے وہ مدتوں سرگرداں رہے تھے وہ پورا ہوتا نظر آ رہا ہے۔

انتھروپک پرنسپل (Anthropic Principal)

کائنات اور کائنات میں کارفرما قوتوں کے بارے میں اب تک جو علم انسان حاصل کر سکا ہے اس سے ذہن میں یہ سوال اٹھنا فطری ہے کہ آخر یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے؟ یہ عظیم دھماکہ' یہ وسعت کائنات اور کائنات کا وسیع تر ہوتے جانا یہ چار قسم کی قوتوں کا ہونا اور پھر ان کا ایک ہی قوت کا مختلف پہلو ہونا' یہ

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
دل ہر ذرہ میں غوغائے رستا خیز ہے ساقی

کیوں؟ آخر ان سب عوامل کے پس پشت کون سا مقصد کارفرما ہے۔ اس سوال کا جواب پالینے کی ایک کوشش ڈکے (Dicke) کا انتھروپک اصول ہے۔

سادہ الفاظ میں اس کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

"ایک کائنات کی عمر چند بلین سالوں سے زیادہ ہونی چاہیے تاکہ اس میں ذہین مخلوق آباد ہو سکے۔"
دوسرے الفاظ میں ہماری کائنات کا ایک عظیم دھماکہ سے شروع ہونا' پھیلتے جانا' قوتوں کا مختلف شکل اختیار کرنا' مادے کا بننا' کہکشاؤں اور ستاروں کا وجود میں آنا' ستاروں کا پھٹنا اور پھر ایک ستارے کے گرد باقیات سے ایک سیارے کا وجود میں آنا جس پر مناسب فضا اور سمندر ہو چونکہ ان کے لئے چند بلین سالوں سے زیادہ کا عرصہ درکار ہے اس لئے یہ سب کچھ ہمارے لئے تھا۔

اب میں ان باتوں کی وضاحت میں چند اتفاقات کو بیان کروں گا جو اس کائنات میں ایک ذہین مخلوق کے موجب بنے۔

اگر نیوکلیر اور الیکٹرو میگنیٹک قوتوں کی strengths کی ratio کی جو اس قیمت اس کائنات میں ہے اس میں ذرہ سا فرق آ جاتا تو اس کائنات کی ہسٹری پر بڑا ڈرامائی اثر پڑتا۔ مثلاً اگر یہ Ratio ذرا سا بڑھ جاتا تو دو پروٹان آپس میں مل کر ڈائی پروٹان بنتے اور دو Nuclei الفا نیوکلیائی مل کر Be^8 کا پائیدار بناتے جو اس ratio کی موجودہ قیمت کے تحت نہیں ہوتا۔ اس کا اثر یہ ہوتا کہ عظیم دھماکے کے بعد والی نیوکلیو سنتھیسس (Big bang Nucleo Synthesis) کا عمل کافی تیز ہو جاتا اور سارے نیوکلیان He دوسرے نیوکلیائی کے بنانے میں صرف ہو جاتے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہائیڈروجن نہ بن پاتی۔ ہائیڈروجن نہ ہونے کا مطب پانی کا نہ ہونا' جس کا مطلب پرائیمیول سمندر (Primeaval Ocean) کا نہ ہونا جس کے بغیر Cellular life کا وجود ممکن نہیں۔ اس طرح ساری بائیو کیمسٹری اور بائیولوجی جو زندگی کی ذمہ دار ہیں نہ ہوتیں۔

دوسرا اتفاق یہ ہے کہ سٹار اسی صورت میں بن سکتے ہیں جو خلا ہو تاکہ اسٹار کے بنتے' وقت نکلنے والی زائد گرمی اور روشنی اس میں Dump ہو۔ اگر کائنات نہ پھیلتی رہتی تو اسٹار بننے کے لئے یہ خلا نہ میسر ہوتا۔

درج بالا اتفاقات کاسمک اتفاقات ہیں۔ لوکل اتفاقات کا ذکر پہلے آ چکا ہے کہ کس طرح گریویٹشنل انرجی کے اخراج سے الیکٹرو میگنیٹک اور نیوکلیر قوتیں پھر کار فرما ہونا شروع ہو جاتی ہیں جس سے سارے نیوکلیائی بنتے ہیں اور اسٹار اس بوجھ کو سپر نووا دھماکے کے ذریعے خلاء میں پھینک دیتا ہے جن سے ایٹم مالیکیول اور سیارے بنتے ہیں اور پھر بعض سیاروں میں لائف وجود میں آتی ہے۔ ہیں نا یہ سب انسان کو وادی تحیر میں گم کر دینے والی باتیں کہ کس طرح اس کا وجود اس عظیم دھماکے سے جڑا ہوا ہے۔ جو آج سے تقریباً" پندرہ ملین سالوں پہلے ہوا تھا۔

پاکستان میں سائنس کی حالت

بہ حیثیت مجموعی تیسری دنیا رفتہ رفتہ اس حقیقت کو سمجھنے لگی ہے کہ یہ سائنس اینڈ ٹیکنالوجی ہی ہے جو شمال یعنی ترقی یافتہ ممالک اور جنوب یعنی ترقی پذیر ممالک میں وجہ امتیاز ہے اور یہ کہ آج سائنس اور

ٹیکنالوجی پر ہی قوموں کے معیار زندگی کا انحصار ہے۔ وہ یہ بھی سمجھنے لگی کہ اقتصادی اور سیاسی اثر و رسوخ کے میدان میں شمال و جنوب میں یہ روز افزوں فاصلہ بنیادی طور پر سائنس کی وجہ سے ہے۔ یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ کرہ ارض پر آج سے دو طرح کے انسان بس رہے ہیں۔ ایک وہ ہیں جن میں یہ صلاحیت ہے کہ جو کچھ سائنس اور ٹیکنالوجی دے سکتی ہے' حاصل کر لیں۔ اس کی ایک وجہ سے وہ اقتصادی طور پر بالادست ہیں اور ان میں یہ طاقت ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق حالات کا رخ موڑ سکیں۔ دوسرے وہ ہیں جنھوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو اپنے روزمرہ زندگی کا جزو نہیں بنایا جس کی وجہ سے وہ بے وقعت اور بالعموم غریب ہیں۔

جہاں تک اپنے ملک پاکستان کا سوال ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہے کہ یہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کی حالت کچھ زیادہ ہی خراب و خستہ ہے۔ جسے چند لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

یہاں بنیادی سائنس میں حقیقی معنوں میں ریسرچ نام کی شے کا وجود ہی نہیں ہے اور اعلیٰ ٹیکنالوجی کے لفظ سے ہمارے کان ابھی آشنا تک نہیں۔ دکھ کی بات اس وجہ سے اور بھی ہے کہ پاکستانی قوم کوئی چھوٹی قوم نہیں اس ملک کی آبادی ساڑھے نو کروڑ سے بھی زیادہ ہے جو فرانس اور برطانیہ سے دوگنی ہے۔ (یہ اعداد و شمار 1988ء کے ہیں۔ مرتب)

ماضی میں امت مسلمہ نے سائنس کی ترویج و ترقی میں شاندار کارنامے انجام دیئے ہیں۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بعض لوگ جن میں کچھ مسلمان بھی شامل ہیں اسلامی سائنس کے سنہرے دور کو محض یونانی روایات کا تسلسل کہہ کر اس کی عظمت گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ مسلمان سائنسدانوں ہی نے دنیا کو پہلی بار اس خیال سے روشناس کرایا تھا کہ سائنس اپنی ابتدا اور انتہا میں ایک عملی اور تجربی علم ہے۔ دیکھئے بریفالٹ (Briffault) نے اس بابت کیا کہا ہے۔

"اہل یونان نے ضابطہ بندی کی۔ عام اصول وضع کیے اور نظریئے بنائے۔ مفصل اور طویل مشاہدے اور عملی و تجرباتی تحقیق کے صبر آزما مراحل کو طے کرنا یونانی مزاج کے یکسر خلاف تھا۔ جس چیز کو ہم سائنس کہتے ہیں وہ مشاہدے' تجربے اور پیمائش کے ان طریقوں سے پیدا ہوئی جو یورپ میں مسلمانوں نے متعارف کرائے تھے۔ جدید سائنس اسلامی تہذیب کا انتہائی اہم اور شاندار کارنامہ ہے۔"

بریفالٹ کی اس رائے کی تصدیق سائنس کے عظیم مورخ جارج سارٹن نے بھی کی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"ازمنہ وسطیٰ کا اہم ترین کارنامہ تجرباتی اسپرٹ کی تخلیق تھا اور یہ بنیادی طور پر مسلمانوں نے پیدا کیا تھا جو بارہویں صدی تک جاری رہا۔"

یہ تجرباتی علم و مہارت پر اصرار تھا جو دنیا بھر کے مسلمانوں بالخصوص پاکستان' انڈیا' بنگلہ دیش کے مسلمانوں کو روایتی کاریگری اور ہنرمندی میں ہمیشہ درجہ کمال حاصل تھا۔

بدقسمتی سے برصغیر کے مسلم حکمرانوں کو علمی ادارے یا سائنس اکیڈیمی اور یونیورسٹیاں قائم کرنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ انہیں اگر کوئی دلچسپی تھی تو صرف اپنے مقبرے تعمیر کرانے سے دلچسپی تھی جو ان کی عظیم الشان سلطنتوں کی یادگار کہلائیں۔ افسوس کہ ان کی چھوڑی ہوئی یہ روایت کسی نہ کسی شکل میں آج بھی جاری ہے۔

پاکستانی سائنس پسماندہ کیوں؟

چار چیزیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے پاکستان میں سائنس اور ٹیکنالوجی پسماندہ ہے۔

(ا) جدید تعلیم میں افرادی قوت کی کمی

سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کی بنیاد جدید تعلیم ہے۔ پاکستان میں پرائمری سطح پر یعنی 4 تا 11 سال کے بچے اور بچیاں علم کی الف' ب سے بھی محروم رہتے ہیں۔ سیکنڈری سطح پر یعنی 13 سے 17 سال کی عمر کے نوجوانوں میں سے صرف 13 فیصد تعلیم حاصل کرتے ہیں جبکہ ترقی پذیر ممالک کا اوسط 39 فیصد ہے اور ترقی یافتہ ممالک کا 86 فیصد ہے۔ اس سے اوپر یونیورسٹی کی تعلیم آتی ہے یعنی 18 سے 23 سال کی عمر کے نوجوانوں کی تعلیم۔ پاکستان میں اس عمر کے نوجوانوں میں صرف 3 فیصد یونیورسٹی کی تعلیم ہے جبکہ ترقی پذیر ممالک کا اوسط 9 فیصد ہے اور ترقی یافتہ ممالک کا 30 فیصد ہے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں ترقی یافتہ ممالک میں یونیورسٹی تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں کی تعداد پاکستان کے مقابلہ میں دس گنا زیادہ ہے۔ اس پر ستم یہ ہے کہ پاکستان میں سائنس کی تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کی تعداد آرٹس کی تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کے مقابلے میں کم ہے۔

(ب) قومی پہچان کا فقدان

پاکستان میں سائنسی علم کے حصول و ترقی کے لئے کوئی قومی پہچان نہیں ہے۔ کوئی اجتماعی احساس نہیں ہے کہ قوم کے اقتصادی اور دیگر مسائل حل کرنے کے لئے سائنس کے علمی اطلاق سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جیسا کہ جاپان میں شہنشاہ میجی کے دور میں ہوا تھا۔ شہنشاہ نے جاپان کے نئے آئینی جزو کی حیثیت سے پانچ حلف اٹھائے تھے جن میں سے ایک یہ تھا۔

"جاپان کی عظمت اور جلالت کی خاطر پوری صلاحیت و استطاعت سے علم حاصل کیا جائے گا خواہ وہ کہیں سے بھی حاصل ہو۔"

اس قومی فقدان کا ایک پہلو یہ ہے کہ سائنس دانوں کے لئے افسران بالا کے دل میں ایک قسم کی حقارت کا جذبہ ہے جس کا چشم دید گواہ میں خود ہوں۔

مجھے پلاننگ کمیشن کا ایک سابق چیرمین یاد آتا ہے۔ میں نے ان سے سائنسدانوں کے رہائشی مسئلے کو

حل کرنے کی درخواست کی تھی۔ انہوں نے اس درخواست پر فرمایا۔
"آدھا کراچی فٹ پاتھ پر سوتا ہے۔ سائنسدان فٹ پاتھ پر کیوں نہیں سو سکتے؟"
اور جب میں نے ان سے گزارش کی کہ سائنس پر مبنی صنعتوں کی منصوبہ بندی کرتے وقت سائنس دانوں سے مشورہ کر لیجئے گا تو انہوں نے تنگ مزاجی سے کہا۔
"مجھے سائنس دانوں سے مشورہ لینے کی کیا ضرورت ہے میں اپنا گھر چلانے کے لئے اپنے باورچی سے مشورہ نہیں لیا کرتا۔"
لیکن انہوں نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ وہ اپنے کون سے قدرتی حق کی بنا پر پلاننگ کمیشن کے سربراہ بنے بیٹھے ہیں۔

(ج) کارگر سائنس کے نظام کی خرابی

پاکستان میں کار گیہ سائنس کا نظام نوجوان' پرجوش' فعال اور عملی سائنس دانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے جیسا کہ دوسرے بڑے ملکوں میں یہ عام روایت ہے چند مثتینات سے قطع نظر ہماری یونیورسٹیوں میں سائنس کا تخلیقی سرچشمہ خشک پڑا ہے۔ یونیورسٹیوں سے باہر پاکستان کاغذی قسم کی تحقیقی تنظیموں کی جنت ہے۔ جن میں زندہ رہنے کی سکت نہیں اور اگر ہو بھی تو ان کے درمیان رابطے کا کوئی موثر نظام نہیں۔ سائنس اپنی ترقی کے لئے بلند پرواز اونچی شخصیتوں کی محتاج ہے۔ ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ ایسے لوگ ملک سے باہر نہ جانے پائیں بلکہ ملک کے اندر ہی رہ کر اس کی خدمت کرتے رہیں۔ کار گیہ سائنس کا انتظام خود سائنس دانوں کے ہاتھ میں رہنا چاہیے۔ اسرائیل کے سائنس دان (de Shalit) نے اسرائیل کی سائنسی پالیسی کے بارے میں ایک موقع پر یہ کہا۔
"ہماری سائنسی پالیسی بہت سادہ ہے۔ اس کے صرف دو اصول ہیں۔ اول یہ کہ ایک عملی سائنسدان کبھی غلط نہیں ہوتا وہ ہمیشہ صحیح ہوتا ہے اور جتنا کم عمر اور نوجوان ہو گا اور اتنا ہی زیادہ صحیح ہو گا۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ ہم اپنی یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں سے وابستہ سائنسدانوں کو ترغیب دیتے ہیں کہ وہ اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں جب چاہیں' جہاں چاہیں' چلے جائیں ان کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ اسی طرح وہ اپنی تحقیق کی خاطر ملک سے باہر بھی عارضی طور پر جا سکتے ہیں۔ باہر جانے کی صورت میں صرف ایک شرط عائد کی جاتی ہے کہ وہ اسرائیلی لڑکی سے شادی کر کے جائے تاکہ واپسی کا راستہ کھلا رہے۔"
اہل پاکستان کے لئے اس میں درس عبرت پنہاں ہے۔

(د) ٹیکنالوجی میں خود اعتمادی کی کمی

پاکستان میں یکے بعد دیگرے آنے والی حکومتوں میں سے ایک نے بھی ٹیکنالوجی حتیٰ کہ دفاعی ٹیکنالوجی میں بھی خود اعتمادی پیدا کرنے کو قومی مقصد قرار نہیں دیا۔ ہمارے سامنے ٹیکنالوجی کی کوئی واضح پالیسی

نہیں ہے اور نہ ہی ہم نے ٹیکنالوجی کی سائنسی بنیاد پر توجہ دی۔ ہم میں اس امر کا احساس ہی نہیں ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی منتقلی ساتھ ساتھ ہونی چاہیے۔

پاکستانی سائنس کیسے توانا ہو گی؟

اب میں ان اقدامات کا ذکر کروں گا جن سے ملک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی حالت کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔

ملک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے جو اقدامات تجویز کیے گئے ہیں ان پر عمل درآمد اور ان کی کامیابی کا دارومدار کافی حد تک اس بات پر منحصر ہے کہ ہمارے معاشرے کی صحت کیسی ہے اور قوم کا رجحان کیا ہے۔ اور وہ جدید تقاضوں سے کتنی آگاہ ہے۔ ہم کامیابی سے اس صورت میں ہمکنار ہو سکتے ہیں جب ملک میں دانشوری کی عزت و توقیر ہو۔ آزادی فکر و رائے ہو۔ تعصب و تنگ نظری کے بجائے اخوت و رواداری کا ماحول ہو اور ہم میں زبان' طرز بود و باش' عقائد اور نظریات میں اختلاف کے باوجود بہ حیثیت ایک قوم کے رہنے اور آگے بڑھنے کا جذبہ ہو۔ اس زاویہ نگاہ سے جب ہم ملک کا جائزہ لیتے ہیں تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ یہاں دانشوری پامال ہے۔ اخوت و رواداری عنقا ہو رہی ہے اور آزادی فکر و رائے نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ یک قومیت کے رجحان کا فروغ تو درکنار مختلف طبقے ایک دوسرے سے دور ہو رہے ہیں۔ فرقہ وارانہ کشیدگیاں بڑھ رہی ہیں۔ تنگ نظری اور تعصب کے سائے تاریک تر ہوتے جا رہے ہیں اور طرح طرح کی قومیتوں کا نام لیا جا رہا ہے۔ قطع نظر مذہبی اختلافات کے جن کا ذکر بھی منع ہے قوم کے افراد میں خود کو پہلے پنجابی' سندھی' پٹھان' بلوچی اور مہاجر اور بعد میں پاکستانی سمجھنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ اخباروں میں قتل و غارت گری اور فسادات کی خبریں بڑھتی جا رہی ہیں۔ کیا یہ سب پنپنے اور آگے بڑھنے کی باتیں ہیں۔

ان حالات کو دیکھ کر ذہن میں اس سوال کا اٹھنا فطری ہے کہ کیا یہ وہی پاکستان ہے جس کا خواب قائداعظم نے دیکھا تھا اور جس کے لئے لاکھوں افراد تباہ و برباد ہوئے اور اپنی جانیں دیں۔

افسوس کہ نہیں! قائد اعظم کے خوابوں کے پاکستان میں اور ہمارے آج کے پاکستان میں شمال و جنوب کا فرق ہے۔ انہوں نے اور دوسرے اکابر نے اس پاکستان کا خواب دیکھا تھا جس میں برصغیر کے مسلمانوں کے تہذیبی اقدار کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اخوت و رواداری ہو' آزادی فکر و رائے ہو' دانشورانہ قدروں کا فروغ ہو۔ فرقہ ورانہ ہم آہنگی ہو اور ہر ایک کو مجموعی طور پر اپنی زندگی اپنے طور پر گزارنے کی آزادی ہو۔ قائد اعظم کی دستور ساز اسمبلی منعقدہ 11 اگست 1947ء میں کی گئی ایک تقریر کے اقتباس کے آئینے میں دیکھئے کہ ان کے ذہن میں پاکستان کی کیا تصویر تھی اور انہوں نے ملک کی ترقی کے لئے کیا نسخہ بتایا تھا۔

"اگر آپ ماضی کو بھول کر باہمی کدورتوں کو دفن کر کے مل جل کر کام کریں گے تو آپ کی کامیابی یقینی ہے۔ اگر آپ ماضی (قریب) سے منہ موڑ کر بھائی چارگی کے ماحول میں اس طرح کام کریں گے کہ آپ میں سے ہر ایک چاہے وہ جس کسی فرقے سے بھی تعلق رکھتا ہو' ماضی میں اس کا آپ سے کیسا ہی تعلق رہا ہو اور چاہے وہ جس کسی بھی رنگ' ذات یا عقیدے کا ہو' اول' ثانی اور آخر اس ملک کا شہری ہو جس کے حقوق مراعات اور فرائض برابر ہیں تو آپ بے مثال ترقی کریں گے-----"

"آپ آزاد ہیں۔ آپ آزاد ہیں مندروں میں جانے کے لیے' آپ آزاد ہیں اپنی مساجد یا کسی اور عبادت گاہ میں جانے کے لیے۔ آپ کا تعلق کسی بھی مذہب' ذات یا عقیدے سے ہو سکتا ہے۔ اس سے ریاست کو کوئی سروکار نہیں۔ ہم آغاز کر رہے ہیں۔ اس طرح کہ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں۔ ایک فرقے کو کسی دوسرے فرقے پر فوقیت نہیں۔ ایک ذات یا عقیدے کو کسی اور ذات یا عقیدے پر فوقیت نہیں----- آج سے یہ آئیڈیل ہمیشہ ہمارے سامنے رہے گا۔"

بدقسمتی سے ہم قائداعظم کے قوم کو توانا کرنے کے اس نسخے کو بہت جلد بھول گئے۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں یہ ہے کہ جس وقت قیام پاکستان عمل میں آیا۔ پاکستانی قوم تعلیمی لحاظ سے کافی پسماندہ تھی۔ اس پسماندگی کا ایک بڑا سبب روایتی مذہب پرست طبقے کی طرف سے مغربی علوم اور انگریزی تعلیم کی پرزور مخالفت تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جہاں ایک طرف 1824ء میں راجہ رام موہن رائے نے بنگال میں سنسکرت کالج کے بجائے انگلش کالج قائم کرنے کی پرزور سفارش کی تھی وہیں دوسری طرف 1835ء میں علماء کے آٹھ ہزار دستخطوں سے یہ عرضداشت پیش کی گئی تھی کہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم نہیں چاہیے۔ دلیل یہ دی گئی تھی کہ "انگریز بندوق' توپ اچھی بنا لیتا ہے مگر علم سے بے بہرہ ہے۔ نوٹ: (تہذیب الاخلاق ج 7' ش 8 ص 30 مسلم علی گڑھ یونیورسٹی علی گڑھ محمد یسین) اسی طرح جب سر سید نے تعلیمی اور اصلاحی تحریک (جو بعد میں علی گڑھ تحریک کے نام سے مشہور ہوئی) شروع کی تو کس کس طرح سے سر سید کی مخالفت نہ کی گئی۔ اس دور کا وہ کون سا مذہبی فرقہ تھا جو ان کے خلاف صف آرا نہ ہوا۔ مذہبی علماء کی ایک بڑی بھاری اکثریت نے انہیں دین سے خارج سمجھا۔ اور ان کے خلاف کفر و ارتداد کے فتاوے دے دیئے یہاں تک کہ ایک موقع پر سر سید کو یہ کہنا پڑا کہ آپ لوگ چاہے مجھے کافر سمجھیں یا کچھ اور میرا مقصد قوم کے بچوں کے مستقبل کی تعمیر ہے۔ خدارا آپ مجھ سے یہ کام لیں ویسے ہی جیسے کسی غیر مسلم راج گیر سے مسجد کی تعمیر کا کام لیتے ہیں۔ سر سید کا قصور کیا تھا جو ان کی اتنی زبردست مخالفت ہوئی محض یہ کہ

"ہمارے دائیں ہاتھ میں قرآن' بائیں ہاتھ میں سائنس اور پیشانی پر کلمہ لا الہ الا اللہ ہو"

(سر سید)

اور یہ کہ

"اے صاحبو! اب زمانہ ایسا نہیں کہ ہم صرف اپنے ہونہار پودوں کی پرورش کرنے پر بس کریں۔ بلکہ

زمانہ مقابلہ کے میدان میں بہت قوی اور زبردست پہلوان لایا ہے۔ پس جب تک ہم بھی اپنی قوم کے جوانوں کو میدان میں نہ لائیں۔ ہماری کامیابی ممکن نہیں ہے۔ اس وقت ہم کو ضرورت ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے ایک تعداد کثیر اگر اکثر نہیں تو ایک تعداد معقول اپنی قوم کے نوجوانوں کی پیدا کریں جو علم اور قابلیت میں اور ان علوم میں جو اس زمانہ کی حاجتوں کے لئے ضروری ہیں' سربر آوردہ ہوں۔" (سرسید)

مذہبی طبقے کی شدید مخالفت کی وجہ سے سرسید تحریک کے اثرات ایک خاص حد تک ہی پھیل پائے اور قوم میں جدید تعلیم عام نہ ہو پائی۔

قوم میں جدید تعلیم کی کمی کی وجہ سے تعصب اور تنگ نظری کو پھل پھولنے کا موقع مل گیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستانی قوم نسلی' مذہبی اعتقادات اور لسانی اعتبار سے کئی خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس نوع کے اختلافات بیشتر ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے ہونے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ برائی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ان اختلافات میں تعصب اور تنگ نظری کا عمل داخل ہو جاتا ہے۔ اس تنگ نظری کے نقصانات کی بابت علامہ اقبال کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

"کیا وقت نہیں آگیا ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں جدید سائنس کے غیر متنازعہ حصوں کو شامل کر لیا جائے؟ مثلاً" نیوٹن کے قوانین' ستاروں اور کہکشاؤں کی فلکی طبیعات' قدرت کی بنیادی قوتوں کا علم' جینیٹک کوڈ اور زمین کی ساخت وغیرہ۔"

آخری بات کے طور پر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ہماری قوم اپنی صلاحیت و امکان کے اعتبار سے ایک عظیم قوم ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ اپنی عظمت کا احساس نہیں ہے اور ہم ایک چھوٹی قوم کے سے انداز میں عمل کرتے ہیں۔

ہمارے لوگ سائنسی علوم میں اعلیٰ درجے کی قدرتی صلاحیت رکھتے ہیں۔ صرف اس کو ترقی دینے کی ضرورت ہے۔ میں یہ بات پورے وثوق سے زندگی بھر کے طویل تجربے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں جو مجھے مختلف اقوام کے سائنس دانوں کی تربیت اور راہنمائی کرنے کے بعد حاصل ہوا ہے۔

اسی طرح اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ٹیکنالوجی کے باب میں بھی ہم زبردست صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ جاپان کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ انہوں نے اپنی مہارت کا اطلاق جو انہیں فن کتابت سے ورثے میں ملی تھی آج کی ٹیکنالوجی پر کیا ہے۔ کیا ایک ایسی قوم جو قرآن مجید کی پوری آیت چاول کے دانے پر لکھ سکتی ہے جب وہ مائکرو الیکٹرونکس کے میدان میں اترے گی تو وہ جاپان جیسی ترقی حاصل نہیں کر سکتی؟

جب میں بچہ تھا تو یہ بات عام طور پر سننے میں آتی تھی کہ ہندوستان کے مسلمان حساب میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ آج صورت حال بدل چکی ہے۔ آج مشرق وسطیٰ کا بنک کاری کا تمام انتظام پاکستانی چلا رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ہمارے پاکستانی بھائی فرانسیسیوں کی طرح انفرادیت پسند ہوتے ہیں۔ اور ہمیشہ سے اپنی ذات کی تشہیر اور بڑائی ان کے لئے مہمیز کا کام دیتی رہی ہے لیکن ایک دانا حکومت اپنی

پالیسی اس ترکیب سے بنا سکتی ہے کہ اس قدرتی انفرادیت پسندی کو کچلنے کی بجائے اس کی حوصلہ افزائی کرے۔ یاد رہے جب پاکستانی ملک سے باہر ہوتے ہیں تو انفرادیت پسندی کا لبادہ اتار پھینکتے ہیں اور مل جل کر اور ایک دوسرے کے تعاون سے کام کرنے کی شہرت پاتے ہیں۔

قوم کے کردار میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت و افادیت جتانے کی کیا ضرورت ہے جب کہ سب جانتے ہیں کہ سائنس آدمی میں کیا کیا اوصاف حمیدہ پیدا کرتی ہے۔ تدبیر' تحمل' باریک بینی' روشن خیالی اور سب سے زیادہ رواداری اور دوسرے کی رائے کے احترام کی خاصیت۔

اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ کوشش کرنے والوں کی محنت ضائع نہیں کرتا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم ایک دفعہ اپنی نوجوان نسل کو آتش شوق کا فتیلہ دکھانے میں کامیاب ہو گئے تو سائنسی تخلیق کا سلسلہ پھر کبھی نہیں رکے گا۔

جمال عبدالناصر کی طرح میں بھی اپنے نوجوانوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں۔ اپنا سر بلند کرو۔ میرے بھائی فخر و افتخار سے' عزت نفس سے (ارفع راسك يا اخی) آخر میں وطن عزیز سے مخاطب ہوتے ہوئے فیض کے یہ اشعار پیش کروں گا۔

سبھی کچھ ہے تیرا دیا ہوا سبھی راحتیں سبھی کلفتیں
کبھی صحبتیں کبھی فرقتیں کبھی دوریاں کبھی قربتیں
یہ سخن جو ہم نے رقم کیے یہ ہیں سب ورق تیری یاد کے
کوئی لمحہ صبح وصال کا کئی شام ہجر کی مدتیں

روزنامہ مشرق لاہور میں فیض میموریل لیکچر پر انتظار حسین کا مضمون

27 فروری 1988ء کو دن کے پچھلے پہر بھائی جان نے ہوٹل انٹر کانٹیننٹل لاہور میں فیض فاؤنڈیشن کی دعوت پر ایک لیکچر دیا تھا۔ جسے سننے کے لیے ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا تھا حتیٰ کہ بے شمار لوگوں نے ہال کے باہر کھڑے ہو کر پورے انہماک سے وہ لیکچر سنا۔

روزنامہ مشرق لاہور نے اپنی اشاعت مورخہ 3 مارچ 1988ء میں اپنے مشہور کالم نگار انتظار حسین جو پاکستان کے مشہور ادیب' ناول و ڈرامہ نگار ہیں۔ جن کی کہانیاں ایف اے اور بی اے کی کورس کی کتابوں میں دی جاتی ہیں اور ان کے لکھے ہوئے ڈرامے پاکستان ٹیلی ویژن سے دکھائے جاتے ہیں نے فیض میموریل لیکچر کے بارے میں مندرجہ ذیل کالم لکھا:

لاہور نامہ

ایک خاتون نے کس تعجب سے کہا کہ ہم نے کرکٹ کا ورلڈ کپ ہارا مگر عمران خان کے ساتھ شامیں

تابڑ توڑ منائی جارہی ہیں۔ ہم نے سائنس کا ورلڈ کپ جیتا مگر ڈاکٹر عبدالسلام کو کوئی نہیں پوچھتا اور ہم نے تعجب اس پر کیا کہ ایسی فضا میں کہ جب

کس نہی پر سدکہ بھیا کیستی

فیض فاؤنڈیشن نے اس نامور سائنس دان کے اعزاز میں ایک شاندار تقریب کا اہتمام کر ڈالا۔

اس تقریب میں ایک تعجب کی بات بیگم ایلس فیض نے بتائی کہ تیسری دنیا میں جن جن سائنس دانوں کو نوبل پرائز ملا انہوں نے ایک ایک کر کے اپنی قومیت بدل لی۔ صرف دو بچ گئے جنہوں نے اپنی قومیت کو برقرار رکھا۔ ان میں سے ایک انتقال کر چکا ہے۔ دوسرے عبدالسلام ہیں کہ پہلے بھی پاکستانی تھے اور اب بھی پاکستانی ہیں مگر صاحب کیسے پاکستانی ہیں۔ خود ڈاکٹر عبدالسلام ہی کا کیا ہم سناتے ہیں۔ کسی معزز وزیر نے فرمایا کہ ڈاکٹر عبدالسلام پاکستان آنے سے گھبراتے ہیں اور ڈاکٹر عبدالسلام نے کہا کہ میں پاکستان آنے سے نہیں گھبراتا۔ پاکستان میں لوگ مجھے بلانے سے گھبراتے ہیں۔ پاکستان ٹی وی کو ہی دیکھ لو۔ کبھی اس نے ہمیں جھوٹوں نہیں پوچھا۔ صاحب عجب ثم العجب پاکستان ٹی وی کرکٹ کے ہارنے جیتنے والے ہیروز کے انٹرویو کس ذوق شوق سے کرتا ہے۔ مگر جس نے سائنس میں کمال دکھایا اور نوبل پرائز حاصل کیا اسے خاطر میں نہیں لاتا۔ اس سے ہم نے جانا کہ ہمارے اصلی سٹار کرکٹ کے سپر سٹار ہیں۔ سائنس کے اس سپر سٹار کا حال تو اس ستارے کا سا ہے جس کے متعلق علامہ اقبال نے کہا کہ۔

غربت میں جا کے چمکا گمنام تھا وطن میں

تو اس اعتبار سے یہ تقریب ایک غیر معمولی تقریب تھی۔ اس شہر میں ڈاکٹر عبدالسلام کی یہ شاید پہلی منہ دکھائی تھی۔ یہ تقریب جشن فیض کی آخری تقریب تھی جو ڈاکٹر عبدالسلام کے ایک توسیع لیکچر کے لیے وقف کی گئی تھی اور اسے جشن فیض کا حاصل سمجھئے۔ ویسے جب ہم نے جشن فیض کی اگلی پچھلی تقریبات پر غور کیا تو ہمیں کچھ محسوس ہوا کہ ان تقریبات میں اب تک توسیعی خطبات کا سلسلہ سب سے زیادہ کامیاب رہا ہے۔ ویسے تو ہر سال اس موقعہ پر ایک سیمینار بھی ہوتا ہے مگر اس کی حیثیت زیادہ تر نمائشی ہوتی ہے۔

ہر برس سوویت روس سے کوئی سکالر آکر مہمان ہوتا ہے۔ کچھ بین الاقوامی شخصیتوں کے پیغامات سنائے جاتے ہیں مگر وہاں ابھی تک کوئی فکر انگیز مقالہ سننے میں نہیں آیا۔ توسیعی خطابات تب سے اب تک تین ہوئے ہیں۔ ایک لیکچر پروفیسر کرار حسین کا ایک مقالہ علی سردار جعفری کا اور اب ایک لیکچر ڈاکٹر عبدالسلام کا اور یہ تینوں ہی خطبے اپنی اپنی جگہ فکر انگیز تھے۔ اچھا ہو کہ فیض فاؤنڈیشن والے اس سلسلہ میں وقفہ نہ آنے دیں اور اسے اپنی سالانہ تقریبات کا لازمی حصہ بنا لیں۔

ویسے ڈاکٹر صاحب نے جو لیکچر دیا وہ اگر چھپی ہوئی شکل میں ہمارے ہاتھوں میں ہوتا تو اچھا ہوتا۔ ایک قباحت وہاں یہ پیدا ہوئی کہ سامعین کی تعداد زیادہ تھی اور مائیک ڈاکٹر صاحب کی آواز کا پورا ساتھ نہیں دے رہا تھا اور یہ لیکچر ایسا تھا کہ پوری یکسوئی سے کان لگا کر پورا بیان سنا جاتا تب ہی بات سمجھ میں آسکتی تھی۔

موضوع زیر بحث سے قطع نظر کر کے ڈاکٹر صاحب نے جو باتیں کیں وہ مائیک کی بے وفائی کے باوجود یاروں تک پہنچ گئیں۔ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ اس بات پر افسوس کرتے ہیں۔ یہاں بھی افسوس کر رہے تھے کہ قرآن میں تو غور و فکر کرنے پر اتنا زور دیا گیا ہے مگر پاکستان میں غور و فکر کو درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا جاتا۔ سائنس سے کتنی بے اعتنائی برتی جاتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ ہر ملک کی ایک سائنس پالیسی بھی ہوتی ہے۔ پاکستان کا یہ حال ہے کہ دوسرے معاملات میں تو اس کی پالیسی ہوتی ہے شاید کوئی خارجہ پالیسی بھی ہوتی ہے مگر سائنس پالیسی نام کی کوئی چیز یہاں نہیں ہوتی۔ ویسے ڈاکٹر عبدالسلام اب کے ایک منصوبہ لے کر آئے ہیں۔ یہ حلقہ ارباب سائنس کے قیام کا منصوبہ ہے۔

ایک چیز اسی شہر میں حلقہ ارباب ذوق ہوا کرتی تھی۔ جوں جوں ذوق زوال کرتا گیا حلقہ ارباب ذوق کا حال پتلا ہوتا چلا گیا۔ اب حلقہ ارباب سائنس کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔ اس کی کیا شکل نکلے گی اور کیا اس کے واسطے سے سائنسی علوم کا ذوق و شوق ہمارے یہاں پیدا ہو سکے گا۔ ہاں یہی تو دیکھنا ہے۔"

ڈاکٹر عبدالسلام دنیائے سائنس کا روشن ستارہ

روزنامہ پاکستان لاہور نے اپنی اشاعت مارچ 1996ء میں ذیشان مرتضیٰ کا ایک مضمون شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا "ڈاکٹر عبدالسلام دنیائے سائنس کا ایک روشن ستارہ" چونکہ اس مضمون میں فیض میموریل لیکچر کے بارے میں بھی تذکرہ ہے اس لیے اس مضمون سے کچھ حصے یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

"ڈاکٹر صاحب کی صحت گزشتہ دنوں بہتر نہیں رہی۔ اگرچہ وہ قدرے ٹھیک محسوس کرتے ہیں تاہم یہ حقیقت ہے کہ اپنے اس ہیرو کے ساتھ کوئی زیادہ مہربان نہیں رہے ہیں۔ پاکستان میں آخری بار غالباً آٹھ برس قبل لاہور میں ایک کھچا کھچ ہال میں گرمجوش مداحین کو انہوں نے فیض میموریل لیکچر سے نوازا تھا۔ پاکستان کی بزرگ نسل تو اس سے خوب واقف ہے لیکن نئی نسل اپنے اس جینیئس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔ شاید جس طرح ہم نئے خیالات سے خائف رہتے ہیں اسی طرح اپنے اس عظیم سائنسدان کی خدامات کا اعتراف کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔"

"ڈاکٹر عبدالسلام بین الاقوامی طور پر پاکستان کے سب سے مانے ہوئے اور اعزاز یافتہ ماہر طبعیات ہیں۔ ان کی کامیابیوں کا کوئی شمار نہیں۔ وہ صرف اس صدی کے ایک عظیم سائنس دان ہی نہیں بلکہ مختلف خوبیوں کی حامل ایک گہری شخصیت بھی ہیں۔ سائنس ٹیکنالوجی تعلیم تاریخ' مذہب' معاشیات' سیاسیات' ثقافت اور تیسری دنیا کی پسماندگی کے مسائل پر ان کے خیالات انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔"

"ڈاکٹر عبدالسلام دنیائے حکمت و دانائی کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جس کے انگریز نیوٹن نے 1687ء میں کشش کا قانون حرکت دریافت کیا۔ فرانسیسی کولمبو نے 1770ء میں بجلی کے چارجز کے درمیان قوت دریافت کی۔ جاپانی یوکاوا نے 1935ء میں جوہری توانائی پر حاوی قانون کو ڈھونڈا اور اطالوی

فرمی نے کمزور جوہری قوت تلاش کی۔ ان بنیادی قوتوں کی جستجو میں جن نے ہماری کائنات کو باندھ رکھا ہے۔ ایسے صاحب بصیرت افراد بھی آئے جنہوں نے پیچیدگیوں کو سلجھانے کے لیے جتنے کم سے کم اور چھوٹے سے چھوٹے عناصر ممکن ہو' تلاش کیے ان میں سب سے پہلے پھروہی نیوٹن تھا جس نے کشش ثقل اور حرکت کے قوانین دریافت کرتے ہوئے قوانین کی دو رخی اور ارضی و سماوی علیحدہ علیحدہ قوانین کے نظریے پاش پاش کر دیئے جو چھٹی صدی قبل از مسیح میں ارسطو کے زمانے میں چلے آ رہے تھے۔ اس کے بعد عظیم سکاٹ مین البرٹ میکسویل اور البرٹ آئن سٹائن آئے جنہوں نے ان قوانین کی تشریح میں اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔"

"ڈاکٹر عبدالسلام ان چند لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے آئن سٹان کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کامیاب کوششیں کیں یعنی کائنات کی عام قوتوں کو ایک قوت میں یکجا کر دیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب ان چار بنیادی قوتوں میں سے دو کو ایک قوت میں یکجا کرنے میں کامیاب رہے۔ انہوں نے یہ ثابت کیا کہ کمزور جوہری اور الیکٹرومیگناٹک قوت دراصل ایک ہی قوت کی دو شکلیں ہیں یعنی الیکٹروویک فورس۔ دو امریکی سیٹوین وائبرگ اور سڈنی گلاشو بھی آزادانہ طور پر اسی نتیجے پر پہنچے چنانچہ ان تینوں نے 1979ء میں طبیعات کا نوبل انعام مشترکہ طور پر حاصل کیا۔"

"......ڈاکٹر سلام کو دنیا کی تقریباً" ہر سائنس اکیڈمی کی اعزازی رکنیت حاصل ہے۔ ان میں امریکہ' روس' برطانیہ' فرانس' اٹلی' سویڈن' پولینڈ' چیکو سلواکیہ' بھارت کے علاوہ پانچوں براعظموں کی بے شمار اکیڈمیاں شامل ہیں تاہم جو چیز ڈاکٹر عبدالسلام کو ان کے دیگر ہمعصروں سے ممتاز کرتی ہے وہ انسانیت کی فلاح کی لیے ان کے گہرے جذبات ہیں۔ وہ آج تک اپنی تحقیق کے دوران بھی ایک بہتر دنیا کی جستجو سے غافل نہیں ہوئے۔ انہوں نے بہت پہلے یہ ادراک حاصل کر لیا تھا کہ غربت' بیماری' صفائی صحت اور پاکستان سمیت ترقی پذیر ممالک کے عمومی مسائل اس وقت تک حل نہیں ہو سکتے جب تک یہ ممالک تعلیم یافتہ نہیں ہو جاتے اور سائنسی علم حاصل نہیں کرتے اور اسے اپنی معاشرتی ترقی کے لیے استعمال نہیں کرتے۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کو اپنی شہرت' اپنا مقام استعمال کرتے ہوئے ان ممالک کے عوام اور حکومتوں کو سائنس کی اہمیت سے آگاہ کرنا چاہیے چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور ترقی پذیر ممالک میں فروغ اور سائنسی بیداری کے لیے اپنے اثر و نفوذ کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔

1955ء میں انہیں جینوا میں ہونے والی جوہری توانائی کے پرامن استعمال کی پہلی عالمی کانفرنس کا سائنٹیفک سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ اس میں کانفرنس کے ذریعے انہیں ترقی پذیر ممالک میں کام کرنے والے معاشی اور سائنسی شعبے میں بے شمار ایسے افراد سے واسطہ پڑا جو ان کی طرح سوچتے تھے۔ تین سال بعد جنیوا میں اسی فورم کی دوسری عالمی کانفرنس کے بھی وہ سیکرٹری تھے۔ ان کانفرنسوں سے حاصل کردہ تجربات سے ان کا یہ یقین پختہ ہو گیا کہ تیسری دنیا کے ممالک کی نجات سائنسی تعلیم پر مضمر ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام

دنیا میں موجود بے پناہ انسانی وسائل کے غیر ترقیاتی استعمال پر ہمیشہ ناخوش رہے۔ وہ ان وسائل کو افواج اور روایتی ہتھیاروں پر خرچ کرنے کے خلاف تھے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قومیں امن کی حالت میں رہ سکتی ہیں۔ انہوں نے اپنے ہمعصر رفقاء کے ساتھ مل کر پگواش تحریک کے ذریعے جوہری ہتھیاروں اور عام اسلحہ کی روک تھام کے لیے زبردست مہم چلائی۔ پگواش کے نتیجے میں دنیا میں ایٹمی اسلحہ اور دیگر ہتھیاروں پر پابندی اور روک تھام کے کئی بین الاقوامی معاہدے عمل میں آئے۔ 1995ء میں پگوائش تحریک کو پروفیسر روٹ بلاٹ کے ساتھ مشترکہ طور پر نوبل کا امن انعام دیا گیا۔

اسی (80) کی دہائی کے اوائل میں جب امریکی حکومت نے اینٹی بلاسٹک میزائل تیار کرنے کے ایک بڑے منصوبے کا اعلان کیا تو ڈاکٹر صاحب نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اس کے خلاف بھی رائے عامہ ہموار کی۔ امریکہ کا یہ پروگرام جسے (ایس۔ ڈی۔ آئی) یا سٹار وارز بھی کہا جاتا تھا ابھی حال ہی میں اسی دباؤ کے نتیجے میں کافی حد تک ختم کر دیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے اس عرصہ میں دنیا بھر میں بے شمار مقالات اور مختلف فوروں پر لیکچرز سے اپنے اس نقطہ کی خوب تشہیر کی کہ انسانی وسائل انسانیت کی فلاح کے لیے استعمال ہونے چاہئیں۔ نہ کہ جنگی مہمات۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس رقم کا ایک معمولی حصہ جو ہتھیاروں کی تیاری پر خرچ ہوتا ہے انسانی بہتری کے کاموں میں لگا دیا جائے تو دنیا میں بے روزگاری اور غربت کا کافی حد تک خاتمہ ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام کی امن اور بین الاقوامی تخفیف اسلحہ کی کوششوں کو دنیا بھر میں سراہا گیا۔ 1968ء میں ایٹم فار پیس میڈل اور انعام دیا گیا 1981ء میں چارلس یونیورسٹی پراگ نے انہیں امن انعام دیا۔

1988ء میں جب وہ لاہور میں فیض میموریل لیکچر دے رہے تھے تو کائنات طبیعات اور سائنس کے ارتقاء پر ان کے خیالات نے لوگوں کو مسحور کر دیا۔ ان کے نزدیک ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے درمیان اصل تفاوت دولت کا نہیں سائنس اور ٹیکنالوجی کا ہے۔ ان کے خیال میں سائنس و ٹیکنالوجی دولت پیدا کرتی ہے جو بعد میں اسے ہی خرچ کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر سلام کی مثال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تیسری دنیا میں ان کے خیالات پر عمل واقعی ممکن ہے۔ ڈاکٹر صاحب خود اس کا سب سے بڑا ثبوت ہیں۔ وہ اتنی بڑی شخصیت ہیں کہ ہماری نسل کو ان سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔ وہ انسانیت' شفقت' سچائی اور ذاتی استحکام کا بہترین نمونہ ہیں۔ ہم سب کو ان کو شاندار خراج تحسین پیش کرنا چاہیے۔

بھائی جان کے مختلف انٹرویوز میں سے

میرے پاس بھائی جان کے جن انٹرویوز کا ریکارڈ ہے ان میں سے چند پورے اور بعض کے کچھ حصے یہاں درج کر رہا ہوں۔

1962ء میں بھائی جان کا دورہ پشاور اور وہاں کی مجلس خدام الاحمدیہ سے خطاب

مارچ 1962ء کے آخری ہفتہ میں بھائی جان آل پاکستان سائنس کانفرنس میں شرکت کی غرض سے پشاور تشریف لے گئے تھے۔ وہاں سائنس کانفرنس کی کاروائی میں شمولیت کے علاوہ انہوں نے مجلس خدام الاحمدیہ (احمدی نوجوانوں کی تنظیم) کو 30 مارچ بروز جمعہ خطاب فرمایا۔ اس دورہ اور خطاب کے بارے میں محمد سعید احمد صاحب انجنیر ایم۔ ای۔ ایس (ملٹری انجنیرنگ سروس) سابق قائد مجلس خدام الاحمدیہ پشاور نے بیان کیا کہ "1962ء میں پشاور میں آل پاکستان سائنس کانفرنس ہوئی۔ اس وقت پاکستان اقوام عالم میں اپنی شناخت کے مراحل طے کر رہا تھا اور سائنس کی دنیا میں تو ابھی اس کا تعارف بھی نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی شدید خواہش تھی کہ پاکستان کا نام سائنس کے نقطہ نگاہ سے تمام دنیامیں روشن ہو۔ انہوں نے کوشش کر کے اس وقت کے نامور سائنس دانوں کو اپنے ہمراہ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے آمادہ کیا۔ خاکسار کی قیادت میں جماعت احمدیہ پشاور کا ایک وفد ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے استقبال کے لیے پشاور ایئرپورٹ گیا۔ مکرم ڈاکٹر صاحب جہاز سے اترے اور ان کے ساتھ عمر رسیدہ' جہاں دیدہ' نامور' نوبل انعام یافتہ سائنس دان تھے۔ ہم نے آگے بڑھ کر ڈاکٹر صاحب کا استقبال کیا اور پھولوں کے ہار پہنانے چاہے مگر ڈاکٹر صاحب نے سختی سے انکار کر دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ "میں نے کیا کیا ہے۔ مجھے ہار کیوں پہنا رہے ہو۔ اُن بزرگ معمر اور شہرت یافتہ سائنس دانوں کی طرف اشارہ کیا" کہ جاؤ انہیں ہار پہناؤ۔ یہ انسانیت کے خادم ہیں۔ یہ سائنس کی دنیا کے بادشاہ ہیں" چنانچہ ڈاکٹر صاحب کے لئے لائے ہوئے ہار ان سائنس دانوں کو پہنا دیئے گئے۔ ڈاکٹر صاحب ایک طرف کھڑے اس منظر کو دیکھ کر محظوظ ہوتے رہے۔

اس کے بعد خاکسار نے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب سے درخواست کی کہ وہ مجلس خدام الاحمدیہ پشاور کے اراکین سے خطاب فرمائیں۔ پہلے تو ڈاکٹر صاحب نے انکار کر دیا۔ وجہ کانفرنس میں مصروفیت نہ تھی بلکہ فرمایا کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں۔ یہ کسی بزرگ اور اور عالم دین کا مقام ہے کہ وہ نوجوانوں سے خطاب فرمائیں۔ میرے اصرار پر ڈاکٹر صاحب رضامند ہو گئے مگر اس شرط پر کہ اگر ان کی تقریر میں کوئی بات "غیر مولویانہ" ہوئی تو ذمہ وار نہ ہوں گے۔"

مکرم ڈاکٹر صاحب نے خطاب میں احمدی نوجوانوں کو اپنی مخصوص انداز میں بہت محنت کرنے' تعلیم میں خصوصاً" سائنس کے میدان میں دوسروں پر سبقت لے جانے اور حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے کئے گئے وعدوں کو شاندار طور پر پورا کرنے کے لیے اپنے آپ کو ہر طرح اہل بنانے کی طرف بڑے موثر رنگ میں توجہ دلائی۔ آپ نے فرمایا کہ سائنس کے شعبہ طبیعات میں 95 فیصد ماہرین اور نامور شخصیات یہودی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ جب کسی یہودی ماں کے ہاں بچہ پیدا ہوتا

ہے تو وہ اسے کہتی ہے کہ تم اس دنیا میں کیوں آ گئے ہو۔ یہاں پر پہلے ہی کروڑوں انسان بستے ہیں اور زمین پر تل رکھنے کو جگہ نہیں۔ تمہارے لیے ان عوام کالانعام میں کوئی جگہ نہیں۔ مزید برآں یہودی نام بطور گالی کے استعمال ہوتا ہے۔ تم تو نفرتوں کا شکار ہو جاؤ گے اور تمہیں تمہارے جائز حقوق سے بھی محروم کر دیا جائے گا۔ اگر اس دنیا میں زندہ رہنا اور کامیاب ہونا چاہتے ہو تو پھر تمہارے لیے ایک ہی جگہ ہے۔ ان کروڑوں انسانوں کے سر پر بہت جگہ خالی ہے۔ جس میدان میں آؤ تو دوسروں سے بہت بلند ہو جاؤ۔ اس قسم کی صورت حال احمدی نوجوانوں کو درپیش ہے۔ احمدیت کے مخالفین نے ان کی ترقی کا ہر دروازہ بند کرنے کی کوشش کی ہے مگر اللہ تعالیٰ کے وعدے ہمارے ساتھ ہیں' وہ اگر اللہ نے چاہا تو ضرور پورے ہوں گے' بشرطیکہ ہم اپنے آپ کو ان کا اہل بنائیں۔"

(روزنامہ الفضل مورخہ 8 اپریل 1962ء میں بھی اس کے بارے میں خبر شائع ہوئی تھی۔)

روزنامہ نوائے وقت لاہور کے وارث میر کا بھائی جان سے انٹرویو

نوبل انعام ملنے کے فوراً بعد وارث میر نے بھائی جان کا انٹرویو لیا تھا جسے اخبار نوائے وقت نے اپنے 3 دسمبر 1979ء کے شمارہ میں شائع کیا۔ یہ انٹرویو بھائی جان کے مکان (پٹنی۔ لندن) پر لیا گیا تھا۔ اس انٹرویو سے بعض حصے یہاں دیئے جا رہے ہیں۔

"پاکستان کے ڈاکٹر عبدالسلام نے نوبل انعام حاصل کیا ہے اور ہماری خواہش تھی کہ بہت سی دوسری باتوں کے علاوہ نوبل انعام کے "سیاسی پہلو" پر بھی ان سے تبادلہ خیالات کریں۔ ڈاکٹر صاحب انتہائی مصروف انسان ہیں۔ ایک طرف تو امپریل کالج کا نظریاتی طبیعات کی "چیئر" کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں تو دوسری طرف وہ ٹرائسٹ (اٹلی) میں انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس کے ڈائریکٹر بھی ہیں اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں بین الاقوامی مصروفیات ویسے بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ ایک ہفتہ لندن میں اور دوسرا ہفتہ کسی دوسرے یورپی ملک میں ہوتے ہیں۔ برطانوی صحافیوں کے لئے انہیں پکڑنا مشکل ہو رہا تھا۔ بہرحال ہمیں اس میں کامیابی حاصل ہو گئی (19 اکتوبر 1979ء کو لاہور کے ایک انگریزی اخبار میں شائع ہونے والا ڈاکٹر صاحب کا انٹرویو کم از کم دس سال پرانا ہے۔) اور ہم نے ان کے سامنے نوبل پرائز کی سیاست پر بات کر دی۔ ہماری بات ان کے لیے یقیناً" غیر متوقع اور اخبار نویسی کے "مہذب" اصولوں کے منافی تھی لیکن انہوں نے بڑے تحمل اور بردباری سے جواب دیا "سائنسی تحقیق میری زندگی بن چکی ہے اور میرے لیے رموز فطرت کی تلاش دراصل خدا کی حکمتوں کی تلاش ہے۔ میں اس انعام کو بھی اللہ کا کرم سمجھتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ اس کی حکمتوں کی تلاش کرنے والا ذہن ہر قسم کی سیاست بازی سے آزاد ہوتا ہے۔ انعام دینے والوں کی پالیسی پر بحث کرنا میرا کام نہیں ہے لیکن دنیا کا ہر قابل ذکر سائنس دان آپ کو بتائے گا کہ میں ان دنوں پاکستان میں ہوتا یا پاکستان سے باہر' برقی

مقناطیست اور کمزور نیوکلیر طاقت کے بارے میں تھیوری دنیائے سائنس سے اپنا لوہا خود منوا رہی ہے۔ کاروبار فطرت چلانے والی چار قوتوں کا تین قوتوں میں تبدیل ہو جانا کوئی ایسی معمولی بات تو ہے نہیں کہ دنیا اسے نظرانداز کر سکتی۔ آخری تجربات کے بعد یہ تھیوری سو فیصد Establish ہو جائے گی۔ پھر سوال اٹھے گا کہ تین قوتیں دو میں تبدیل ہو جائیں اور وہ بھی ایک ہوجائے اور تب یہ ثابت ہو جائے گا کہ کائنات کا نظام دراصل ایک ہی قوت کا کرشمہ ہے۔"

یہ نظریہ کہ کائنات کا نظام چار قوتوں' کشش ثقل' برقی مقناطیست' کمزور ایٹمی قوت اور طاقت ور ایٹمی قوت کے سہارے چل رہا ہے۔ واحد قوت پر ایمان رکھنے والوں کے لیے ایک چیلنج تھا۔ ڈاکٹر سلام اس جستجو میں رہے کہ یہ چار قوتیں نہیں۔ ایک ہی قوت کی مختلف صورتیں ہیں۔ آئن سٹائن بھی انہی خطوط پر سوچتا رہا کہ کائنات میں کارفرما بظاہر غیر متعلق اور الگ الگ قوتوں کا سرچشمہ ایک ہی قوت ہے۔ فزکس کی تاریخ بھی اس حقیقت کی شاہد ہے۔ جو چیزیں مختلف سمجھی جاتی تھیں بعد میں ان کا اتحاد ثابت ہو گیا۔ نیوٹن نے اس سلسلے میں اپنا خیال کشش ثقل پیش کیا اور اس کے بعد اور سائنسدانوں نے بھی پیش قدمی کی اور بجلی اور مقناطیسی قوت کو متحد کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب 1959ء ہی میں اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ برقی مقناطیست اور کمزور ایٹمی قوت اصل میں ایک چیز ہیں۔ 1964ء اور 1967ء کے درمیانی عرصے میں سیٹون وائنبرگ اور ڈاکٹر صاحب نے اس تھیوری کو آخری شکل دی اور 1973ء میں پہلی بار یہ تھیوری درست ثابت ہوئی اور گذشتہ سال 1978ء میں ایک دوسری Prediction جو خاصی اہم تھی' وہ درست ثابت ہوئی۔

ڈاکٹر عبدالسلام انتہائی منکسر المزاج اور بے تکلف شخص ہیں اور سائنسی نکات پر بھی مذہبی نقطہ نظر سے گفتگو کرتے ہیں۔ ہم نے بھی ان سے کھل کر باتیں کیں اور ایسے موضوعات بھی زیر بحث آئے جو ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے حوالے سے ممکن ہے پاکستان میں "ناگفتی" سمجھے جائیں۔ ہم نے بلا جھجھک سوال کیے اور انہوں نے بلا جھجھک جواب دیئے اور ہماری خواہش ہے کہ اس انٹرویو کی تفصیلات بھی "بلا جھجھک" پاکستانی قوم تک پہنچیں۔

سوال: برطانوی پریس میں یہ بات عام کی گئی ہے کہ سائنس کی مکمل تصدیق سے پہلے ہی آپ یہ مذہبی عقیدہ رکھتے ہیں اور اس عقیدے کا ہر ایک سے ذکر کرتے ہیں کہ کائنات پر محیط تمام قوانین میں وحدت ہے۔ اور رفتہ رفتہ یہ ثابت ہو جائے گا کہ باقی تین قوتیں بھی ایک ہی قوت کا کرشمہ ہے یعنی یہ ساری کائنات ایک ہی ذات کا ظہور ہے تو پھر آپ نے اس پہلو پر غور فرمایا ہو گا کہ فلسفہ وحدت کے نشے سے سرشار بعض صوفیائے کرام شعور اور ایمان کی اس منزل پر نسبتاً" کم دنیاوی علم کے سہارے اور کم عرصے میں کیونکر پہنچ جاتے ہیں؟ خدا سے تعلق رکھنے والوں کی سائنس دانوں پر یہ برتری کیسی؟

جواب: میں آپ سے متفق ہوں کہ خدا رسیدہ ہستیوں کو سائنس دانوں پر برتری حاصل ہے لیکن ایک فرق ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے۔ صوفیائے کرام منتخب لوگ ہوتے ہیں اور سائنس دان ایک عام انسان کی تمام بے بصاعتیوں کے ساتھ کائنات کے اسرار پر غور کرتا ہے لہٰذا دونوں کی اپروچ اور کیفیت میں فرق ہے۔ صوفی کو بھی مقام حیرت سے منزل یقین تک پہنچنے میں جدوجہد کرنی پڑتی ہے لیکن سائنس دان عمر بھر مقام حیرت کے اردگرد بھٹکتا رہتا ہے اور اسی بھٹکنے میں اس کی جدوجہد کی مسرتوں کا راز پوشیدہ ہے۔ فیض نے کہا ہے۔

کئی بار اس کی خاطر' ذرے ذرے کا جگر چیرا
مگر یہ چشم حیران' جس کی حیرانی نہیں جاتی

میں بھی سائنس کے ایک طالب علم کے طور پر اسرار کائنات پر غور کرتے ہوئے مقام حیرت پر ہوں لیکن ساتھ ہی اس کوشش میں ہوں کہ پوری انسانیت پر اس مذہبی عقیدے کی حقانیت واضح ہو جائے کہ کائنات کی تمام قوتوں میں وحدت کا اصول کارفرما ہے اور ہم سب اس منزل مقصود تک پہنچ جائیں یہ کیفیت خدا رسیدہ لوگوں سے پھر بھی مختلف ہی ہو گی۔ مذہب کے کئی دانشور مجھے سوال کرتے ہیں کہ سائنس کے اصولوں میں خدا کہاں سے آ ٹپکتا ہے تو میں انہیں ہمیشہ یہی جواب دیتا ہوں "خدا ہی انسانی ذہن کو ایک خاص نکتہ کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس کی مرضی ہو تو وہ اپنا کوئی راز انسان پر منکشف کرتا ہے" میں دنیا کے بیسوں سائنسدانوں اور سینکڑوں دانشوروں سے ملا ہوں اور میرا یہ مشاہدہ ہے کہ خدا پر ایمان رکھنے والا انسان بہرصورت خدا کو نہ ماننے والے انسان سے بہتر ہوتا ہے۔

سوال: برطانیہ میں ذرائع ابلاغ نے ہی تاثر دیا ہے کہ ڈاکٹر عبدالسلام کا اعزاز برطانوی سائنس کا اعزاز ہے۔ میرے خیال میں ایسے انتظامات بھی کیے جائیں گے کہ اب آپ پاکستان کبھی نہ لوٹ سکیں۔ آپ کا ارادہ کیا ہے؟ مغرب کو اپنی سائنسی تحقیقات کا مرکز بنائیں گے یا وطن لوٹنے کی خواہش بھی دل میں رکھتے ہیں۔

جواب: یورپ ہی میں رہ جانے کے سامان تو بہت پیدا ہو رہے ہیں مثلاً ٹرائسٹ کے سنٹر کو میرے نام سے توسیع دینے کا فیصلہ کیا جا رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے 100 ملین ڈالر کا ایک فنڈ شروع کیا گیا ہے جس کی مدد سے اس قسم کے مزید سنٹر قائم کیے جائیں گے۔ اٹلی کے صوبہ ٹرائسٹ نے مجھے ایک گولڈ میڈل دیا ہے۔ اعزازی ڈاکٹریٹ بھی دی جا رہی ہے اور مزید ایک نئے میڈل اور ایک نئے مکان کا انتظام بھی کیا جا رہا ہے لیکن یہ جان کر آپ کو حیرانی ہو گی کہ میں نے اپنی تحقیقی زندگی کا بیشتر حصہ انگلینڈ اور یورپ میں گذرا اور برطانوی شہریت اختیار کرنے کا خیال تک کبھی دل میں نہیں آیا۔ برطانوی اخبارات میں کچھ بھی کہیں میں اب بھی اپنے پاکستانی ہونے پر اصرار کرتا ہوں اور مجھے اپنے پاکستانی ہونے پر فخر ہے۔ برطانوی شہریت لینے سے محتراز رہنے کی ایک وجہ یہ بھی رہی

کہ میں اعزاز میں پاکستان کو شریک کرنا چاہتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ پاکستان میں ابتدائی تین سالہ قیام کے دوران میں میری تحقیقی کارکردگی صفر کے برابر تھی۔ وہ سارا عرصہ تو میں طالب علموں کو فٹ بال کھلاتا رہا ہوں

سوال: فٹ بال کھلاتے رہے؟ آپ کی تعلیمی و تحقیقی کیریئر کا یہ حصہ دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ ذرا وضاحت ہونی چاہیے۔

جواب: میری زندگی میں تین اہم موڑ آئے ہیں اور یہیں سے میری زندگی کی نئی راہیں ہموار ہوتی رہی ہیں مثلاً" شروع ہی سے میرے والدین کی خواہش تھی کہ میں آئی سی ایس بن جاؤں۔ ممکن ہے میں خود بھی اس خواہش کی تکمیل میں رکاوٹ نہ بن سکتا لیکن اچانک جنگ شروع ہو گئی اور اس مقابلے کے امتحانات ہی نہ ہو سکے اگر امتحانات ہو جاتے اور میں ان میں شریک ہو جاتا تو اس وقت تک میرے کیریر کی معراج چیف سیکرٹری کا عہدہ ہوتا۔ دوسرا اہم واقعہ 1946ء میں پیش آیا۔ میں نے اسی سال ریاضی میں ایم۔ اے کیا تھا۔ وظیفہ ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ قدرت نے اس کی سبیل خود بخود یوں پیدا کی کہ اس وقت کے وزیراعلی پنجاب نے جنگ کے لیے جمع شدہ چندے سے کسانوں کے لیے بہبود فنڈ قائم کیا تھا۔ اسی چندے میں سے بیرونی ممالک میں تعلیم کے لیے چھ وظائف کا اعلان کیا گیا۔ ڈاکٹر افضل حسین مجھے بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ انہوں نے انٹرویو لیے بغیر مجھے وظیفہ دیا۔ بقیہ پانچ وظائف کے لیے کسی کا انتخاب نہ ہو سکا (اپنے 7 دسمبر 1987ء کے انٹرویو میں بھائی جان نے بتایا کہ پانچ اور لڑکوں کو بھی وظائف ملے تھے لیکن چونکہ انہوں نے بیرون ملک کسی یونیورسٹی میں داخلہ کے لیے درخواست نہیں بھجوائی تھی۔ اس لیے وہ اس وظیفہ سے فائدہ حاصل نہ کر سکے کیونکہ اگلے سال پاکستان معرض وجود میں آگیا تھا۔ مرتب/ناقل) اور اگلے سال پاکستان بن جانے کے بعد یہ وظائف ہی ختم ہو گئے۔ قدرت کے انتظامات دیکھیے! 4 ستمبر کو کیمبرج میں داخلہ ملا' 5 ستمبر کو وظیفہ ملا اور 7 یا 8 ستمبر (سہو ہے بھائی جان نے ملک 18 ستمبر 1946ء کو چھوڑا تھا۔ دستاویزی ثبوت پہلے ہی دیا جا چکا ہے۔ مرتب) تک میں ملک چھوڑ چکا تھا۔

تیسرا موڑ گورنمنٹ کالج لاہور کی ملازمت کے زمانے میں کاٹنا پڑا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں استاد مقرر ہوا۔ کالج کے پرنسپل سمجھتے تھے کہ اس کالج کے استادوں کا کام ریسرچ کرنا نہیں۔ گورنمنٹ کالج کے مزاج کے مطابق "معیاری کا بجٹ" پروان چڑھانا ہے۔ پرنسپل صاحب نے فرمایا "ہاسٹل کے وارڈن بن جاؤ۔ کالج اکاؤنٹس کے انچارج بن جاؤ یا فٹ بال ٹیم کے صدر بن جاؤ" میں فٹ بال ٹیم کا صدر بن گیا۔ ہر شام طالب علموں کو چوبرجی کی گراؤنڈ میں فٹ بال اور ان کے لیے دودھ وغیرہ کا انتظام کرتا۔ دو اڑھائی سال کے بعد پرنسپل نے ہماری سالانہ خفیہ رپورٹ میں لکھا کہ یہ شخص گورنمنٹ کالج کے مزاج کے مطابق نہیں ہے۔ انہیں پنجاب یونیورسٹی میں بھیج دیا جائے۔ 1953ء میں مجھے کیمبرج یونیورسٹی نے

پیش کش کی تھی اور میں نے تین ماہ یہ سوچنے میں گزار دیئے تھے کہ پیش کش قبول کروں یا نہ کروں۔ میں اپنا وطن کسی صورت چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن وطن نہ چھوڑتا تو میں سائنس کا ''معیاری'' استاد کبھی تسلیم نہ کیا جاتا۔

سوال: نوبل انعام کی روایت، علمی دنیا کو ایک نفسیاتی نقصان بھی پہنچا رہی ہے کہ انعام مل جانے کے بعد علم کے اس میدان میں اس شخصیت کے نام کی ایسی اتھارٹی قائم ہو جاتی ہے کہ مخالف یا متضاد نقطہ نظر کا آگے بڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

جواب: سائنس کی دنیا میں کسی کو سند تسلیم نہیں کیا جاتا۔ کوئی سچا سائنس دان کسی بڑے نام یا ذہنی تعصب کی بنا پر آگے بڑھنے سے رک نہیں سکتا۔ ایک پادری صاحب نے ایک کتاب لکھی تھی Relevance of Physics اس کتاب میں اس نکتے پر سب سے زیادہ زور دیا گیا تھا کہ مختلف اوقات میں فزسٹ (Physicsits) غلط ثابت ہوتے رہے ہیں۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے ایک انیس سالہ نوجوان مسٹر پاول کی مثال دی تھی کہ اس کے سپرد آئن سٹائن کے کام پر ریویو (Review) لکھنا تھا۔ اس انیس سالہ نوجوان نے آئن سٹائن کے نظریات سے اتنا زور دار اختلاف کیا اور اس پر ایسی سخت تنقید کی کہ کسی نے باید و شاید ہی کی ہو گی۔ سائنس میں اسناد نہیں ہوتیں۔ ہر سائنس دان سے غلطی ہو سکتی ہے۔ سائنس دانوں سے غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ماضی کے سائنس دانوں کی نامکمل تحقیقات کو آگے بڑھانا ہی نئے سائنس دانوں کا کام ہے۔ پاکستان میں بھی اختلاف اور تنقید کی روایت کو پروان چڑھانے کی ضرورت ہے۔ سائنس اور علم کی دنیا میں فرسودہ سوچ اور عمل کی اب کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اقوام متحدہ کی کمیٹی میں تھا تو دنیا کے اکثر ملکوں کے سائنس اور ٹیکنالوجی کے وزراء کو انٹرویو کرنے کا موقع ملتا تھا۔ اسرائیلی وزیر سے بھی تبادلہ خیالات ہوا۔ سوال کیا گیا ''اسرائیل کی سائنسی پالیسی کیا ہے؟'' جواب دیا گیا ''سائنس دان جتنا کم عمر ہوتا ہے اتنا ہی صحیح ہوتا ہے۔ ہم نوجوان سائنس دانوں کی زیادہ ہمت افزائی کرتے ہیں۔ ہماری سائنس پالیسی کا ایک اہم حصہ اپنے سائنس دانوں کو دنیا بھر کا سفر کروانا ہے۔ وہ ترقی یافتہ ممالک کی مختلف یونیورسٹیوں اور لیبارٹریوں میں اپنا وقت گزارتے ہیں اور ہماری حکومت ان کے اخراجات برداشت کرتی ہے لیکن ان ساری مہربانیوں کے باوجود ہم اسے غیر ملکی عورت سے شادی کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اس کی بیوی کا اسرائیلی ہونا ضروری ہے۔

سوال: آپ پاکستان کی سائنسی پالیسی کے بارے میں کیا فرمائیں گے؟

جواب: پاکستان کی سائنس پالیسی؟ کیسی پالیسی؟ سائنس اور ٹیکنالوجی کا نام بھی سیاسی حکمت عملی کے طور پر لیا جاتا ہے۔ پاکستان سائنسدان کے لیے قید خانہ ہے۔ اس پر مزید علم اور تجربہ حاصل کرنے کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔ پاکستان میں سائنس کا علم کہاں سے آئے گا۔ اگر سائنس کے

طالب علم کا ملک سے باہر جانا ناممکن بنا دیا جائے گا۔ بھارت کے مقابلے میں چھوٹا ملک ہونے کے باوجود ٹرائسٹ میں پاکستان کے ساتھ کبھی غیر مساویانہ سلوک نہیں کیا گیا لیکن اب کسی پاکستانی سائنس دان کو ملک سے باہر آنے کے لیے چھ مختلف ایجنسیوں اور دفتروں سے اجازت نامے حاصل کرنے پڑتے ہیں۔ اہل علم پر ملک سے باہر جانے کی پابندیاں کمیونسٹ ممالک کے بعد پاکستان میں سب سے زیادہ ہیں۔

سوال: پاکستان کو تو سائنس کے میدان میں اعلی تعلیم و تربیت کی سخت ضرورت ہے۔ سائنس دانوں کے ملک سے باہر رہ جانے پر تو مناسب پابندیاں ہونی چاہئیں۔ انہیں ملک سے باہر نہ جانے کا پابند بنانے کی پالیسی کہاں سے اور کب آئی؟

جواب: میری وجہ سے اٹلی میں تھیوریٹیکل فزکس کے سنٹر میں پاکستانی طالب علموں کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ اب الا ماشاء اللہ پاکستانی طالب علموں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ پاکستان میں اپنے عہدے سے مستعفی ہوا تو بھٹو صاحب کے لیے میری یہ جرات ناقابل برداشت تھی۔ انہوں نے مجھے بلا بھیجا۔ استعفیٰ واپس لینے پر اصرار کرتے رہے اور کہا "میں آپ کو کسی صورت میں بھی ضائع نہیں کر سکتا' میری مجبوریوں کا احساس کریں۔ مجھ پر اتنا سیاسی دباؤ ہے کہ کئی راتوں سے سو نہیں سکا' میری نیند اڑ گئی ہے۔" میں نے استعفیٰ واپس نہیں لیا اور بھٹو صاحب نے ٹرائسٹ کے سنٹر میں پاکستانیوں کا داخلہ ہی بند کر دیا۔ صرف مجھ سے انتقام لینے کے لیے انہوں نے طالب علموں کو باہر بھجوانے کے سارے اختیارات منسٹری آف اکنامک افیرز کے سپرد کر دیئے۔ موجودہ حکومت کے ایک وزیر نے مجھے بتایا تھا کہ طالب علموں کے باہر آنے کا معاملہ بھٹو صاحب نے فنی طور پر اتنا مشکل بنا دیا ہے کہ طریق کار میں فوری تبدیلی ذرا مشکل بات ہے۔ بھٹو صاحب باقاعدہ فائل پر لکھ گئے تھے کہ طالب علموں کے باہر جانے کے قواعد میں زیادہ سے زیادہ سختی پیدا کر دی جائے۔ بھٹو صاحب وینس میں ستر صحافیوں اور کارندوں کے ساتھ پہنچے تو پاکستان کے سفیر نے مجھے بلا بھیجا کہ وزیراعظم ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ میں چپکے سے لندن چلا آیا۔ ٹرائسٹ کے ادارے سے پاکستان کا تعلق ختم کرنے کے لیے ایسے ایسے حربے استعمال کیے گئے کہ ناقابل بیان ہیں۔ ایک وقت وہ بھی تھا کہ اسلامک سائنس فاؤنڈیشن کے قیام کے لیے میرے میمورنڈم کو لاہور کی اسلامی کانفرنس میں پیش کیا گیا۔ یہی کمرہ تھا (میں ڈاکٹر صاحب کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا جس میں فرنیچر کی بجائے چاروں طرف کتابیں بکھری پڑی تھیں) راجہ صاحب محمود آباد کی موجودگی میں اسلامک سائنس فاؤنڈیشن کے خیال کو میں نے ڈرافٹ کی صورت دی۔ یہ ڈرافٹ بھٹو صاحب کو بھیجا گیا۔ تجویز یہ تھی کہ اس فاؤنڈیشن کا مرکز جدہ ہونا چاہیے اور اسلامی ملکوں کو 2 بلین ڈالر کے بجٹ کا انتظام کرنا پڑے گا۔ 1976ء کے آخر میں مسلمان سائنس دانوں کے ایک اجلاس میں میرے ڈرافٹ پر بحث

کی گئی۔ لیکن اس اجلاس میں میری شرکت کو ناممکن بنا دیا گیا۔ 1978ء کے آخر میں میری پیش کردہ تجویز پر تمام اسلامی ممالک متفق ہو گئے۔ اسلامک سائنس فاؤنڈیشن کی تجویز میرے ذہن میں صرف اس لیے آئی تھی کہ میں اس فاؤنڈیشن کے ذریعے اسلامی سائنس میں انقلاب لانا چاہتا تھا۔ عرب ملکوں (خاص طور پر سعودی عرب) سے ذمہ دار حضرات میرے پاس آتے رہے کہ ہم آپ کو بلانا چاہتے ہیں لیکن بھٹو صاحب کے ناراض ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ معلوم نہیں بھٹو صاحب کے سیاسی فیصلوں کی بنیاد موجود ہوتی تھی یا وہ بعض فیصلوں کی بنیاد خود مہیا کرتے تھے۔

سوال: آپ نے سعودی عرب کے ذمہ دار حلقوں کا ذکر فرمایا لیکن جس سیاسی فیصلے کا آپ ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ سنا ہے کہ اس پر سعودی عرب بھی اثر انداز ہوا تھا؟

جواب: میں اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ سعودی حکومت اور شاہی خاندان میں رواداری اور اعتدال کے مظاہرے بھی دیکھنے میں آئے ہیں۔ نیویارک سے محمد بن فیصل بن سعود کا مبارک باد کا پیغام آیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں ''آپ کا اعزاز دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے باعث مسرت ہے۔'' الجزائر اور لیبیا کے مختلف وزراء کی طرف سے بھی تار پہنچے ہیں۔ برطانیہ میں پاکستان کے سفیر کے گھر میں مختلف مسلمان زعماء اور سائنس دانوں نے میری بہت عزت افزائی کی ہے۔ اسلامک کلچرل سنٹر کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر بدوی نے تو بیس مسلمان ملکوں کے سفیروں کو جمع کر لیا تھا اور اپنی استقبالیہ تقریر میں انہوں نے فرمایا تھا کہ ''ایک پاکستانی کو نوبل انعام ملنے کے بعد عالم اسلام پر بین الاقوامی انعامات کے دروازے کھل گئے ہیں۔ ہمارا یہ احساس کمتری بھی ختم ہو گیا ہے کہ خدا کو ماننے والا کبھی بڑا سائنسدان نہیں بن سکتا اور نئی نسل کے لیے یہ بات خاص طور پر قابل غور ہے کہ اتنا بڑا انعام ایک ایسے پاکستانی کو ملا ہے جس کے عقیدے اور عمل میں کوئی تضاد نہیں ہے۔'' ڈاکٹر عبدالسلام فرماتے ہیں ''خدا کے فیصلوں میں بھی کوئی تضاد نہیں ہوتا۔ ہر کام اپنے معینہ وقت پر ہوتا ہے۔ اس بات کا امکان تھا کہ یہ انعام مجھے کئی سال پہلے چینی سائنسدانوں کے ساتھ مل جاتا۔ سویڈن کے سب سے بڑے اخبار نے 1975ء میں پہلے صفحہ پر میری تصویر بھی شائع کر دی تھی کہ اس سال عبدالسلام کو نوبل پرائز مل رہا ہے لیکن آکسفورڈ کے پروفیسر سنڈرس صاحب کا خط آیا ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ ہماری غلطیوں کا خمیازہ آپ کو نہیں بھگتنا پڑا۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! نوبل پرائز کے سیاسی پہلو پر آپ کی گفتگو تشنہ ہی رہی تھی۔

جواب: جہاں تک میرے انعام کا تعلق ہے۔ اس سے مغربی دنیا میں پاکستان کا وقار ہی بلند ہوا ہے۔ نقصان تو کوئی نہیں ہوا البتہ یہ ضرور بتا سکتا ہوں کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد (انعامات کا سلسلہ 1901 میں شروع ہوا) امریکی نوبل پرائز لینے والوں کی تعداد ایک سو کے قریب ہے۔ کل انعام یافتگان کی تعداد (جنگ کے بعد) پانچ سو کے قریب ہے۔ ان میں سے 32 انگریز ہیں اور 12 جرمن ہیں۔ ایک

سو امریکی انعام یافتگان میں سے 54 یہودی ہیں۔ امریکہ میں تین فیصد یہودی ہیں لیکن پروفیسر شپ کا دس فیصد حصہ یہودیوں کے پاس ہے۔

سوال: یہودیوں میں زیادہ سائنس دان پیدا ہونے کی وجہ؟

جواب: حکومتی اور خاندانی سطح پر علم اور سائنس کی قدر افزائی کی پالیسی' یہودی اپنی لڑکیوں کی شادی کرتے وقت سائنس دانوں اور عالموں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے ہاں عالم اور سائنس دان کا معاشرتی مقام بلند ترین تصور کیا جاتا ہے اور ان کی ترقی کا ایک بڑا راز اس قدرتی نظام میں بھی پوشیدہ ہے۔ اس کے برعکس پاکستان میں طالب علم آسان مضامین پڑھنے کی طرف مائل ہوتا ہے اور معاشرے میں عزت و احترام کے معیار' سیاست' دولت اور سرکاری عہدوں کے حوالے سے متعین ہوتے ہیں۔ پاکستان میں سائنسی علوم کے بارے میں نہ کبھی حکومت سنجیدہ ہوتی ہے' نہ تعلیمی ادارے اور نہ ہی خاندانی اور معاشرتی سطح پر ان علوم کو کوئی عزت و توقیر حاصل ہے۔ البتہ مذہب اور خدا کا بہت نام لیا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں "پاکستان والو! خدا اور مذہب کی صحیح پہنچان کرنا چاہتے ہو تو سائنس پڑھو" ورنہ تمہاری داستان تک نہ ہوگی داستانوں میں" میں نے تو پاکستان والوں کے لیے space کمیٹی بھی بنائی تھی اور اٹامک انرجی کمیشن بھی قائم کیا تھا۔

سوال: ہم دونوں نے گفتگو سے پہلے سچ بولنے کا عہدہ کیا تھا۔ میں ایک ناخوشگوار سا سوال ضرور کروں گا۔ اس اسرائیلی مشن کے بارے میں آپ کی کیا معلومات ہیں جو ہمیشہ پاکستان میں زیر بحث رہا اور اس کو بنیاد بنا کر آپ کے ہم مسلک بھائیوں پر شدید تنقید بھی کی جاتی رہی ہے اور ممکن ہے کہ آپ لوگوں کے متعلق قومی اسمبلی سے فیصلہ لیتے ہوئے بھی اس "افواہ" کو استعمال کیا گیا ہو۔ (پاکستانی سادہ لوح عوام کو مشتعل کرنے اور احمدی احباب سے متنفر کرنے کے لیے پاکستانی "علما" اور مولوی ایک بھونڈا سا فقرہ کہا کرتے ہیں کہ جماعت احمدیہ کا اسرائیل میں تبلیغی مشن ہے جس سے وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ جماعت اسرائیل کی ایجنٹ ہے شاید وارث میر کا اشارہ اسی طرف ہے۔ مرتب)

جواب: یہ پاکستانی مسلمانوں کی بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ وہ اکثر گمراہ کن پروپیگنڈے کا شکار رہتے ہیں۔ یہ محض بہتان ہے اور میں پوری ذمہ داری سے اس کی تردید کرتا ہوں۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ اسرائیل کے قیام سے پہلے کے زمانے میں بعض عرب بھائی حیفہ میں آباد ہیں اور وہ ہمارے ہم مسلک ہیں۔ اسرائیل ان کا وطن ہے اور ہم انہیں وطن بدر نہیں کر سکتے۔ باقی محض افواہیں ہیں اور بے بنیاد پروپیگنڈہ ہے۔ رہا میری ذات کا تعلق تو مجھ سے سائنس دان کا اعزاز کوئی نہیں چھین سکتا۔ چند بے خبر اور لاعلم بھائی میرے بارے میں کچھ ہی کہیں میں ایک سائنس دان تو ہر صورت میں رہوں گا۔ بو علی سینا کو اس کی زندگی میں زندیق کیا گیا۔ وہ فوت ہو گیا تو لوگوں کو صرف

سائنسدان بو علی سینا یاد رہ گیا۔ میرے اپنے جذبات تو یہ ہیں کہ میں صرف پاکستان ہی نہیں پوری دنیائے اسلام کے لیے کام کرنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ اٹلی کی طرح ادارے میں اور ملکوں میں بھی قائم کر سکوں اور دنیائے اسلام کو بھی فائدہ پہنچا سکوں۔ آپ حیران ہوں گے کہ اٹلی کے سنٹر میں بیک وقت چودہ انعام یافتگان 25 ڈالر روزانہ کے معاوضے پر کام کرنا بھی باعث فخر سمجھتے ہیں۔ اب تو میری حیثیت اور پوزیشن میں پہلے سے کہیں اضافہ ہو چکا ہے۔ ان علماء کی خدمات سے بہتر طریقے سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مسلمانوں میں سائنس کا ایسا ذوق و شوق پیدا ہو جائے کہ ہر مسلمان سائنس دان ہر سال ایک پرائز حاصل کرے۔ میری تمنا ہے کہ اپنی زندگی میں سائنسی تحقیقات کا ایک اعلیٰ ترین ادارہ قائم کر جاؤں۔ میں اسی سلسلے میں لیبیا بھی جا رہا ہوں۔

سوال: پاکستان آپ کے ذہن میں نہیں ہے؟

جواب: انعام وصول کرنے کے بعد پاکستان جانے کا ارادہ بھی ہے لیکن میرا تجربہ یہ ہے کہ پاکستان میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے سلسلے میں کوئی بھی سنجیدہ نہیں ہے۔ میں نے ایوب خان اور بھٹو کے ساتھ کام کیا ہے۔ پاکستان کا کوئی حکمران سائنس کی اہمیت سے آگاہ نہیں رہا۔ بھارت کے جواہر لعل نہرو خود سائنس کے طالب علم تھے۔ لینن سائنس کا طالب علم تھا۔ یہ لوگ سائنسی ذوق رکھتے تھے۔ پاکستان میں آج تک سائنس کا کوئی سنجیدہ طالب علم سیاسی طور پر برسر اقتدار نہیں آیا۔ جاپان نہایت مختصر عرصے میں صنعتی دوڑ میں مغرب کو بھی پیچھے چھوڑ گیا ہے اس کی وجہ؟ اس کی بڑی وجہ جاپان کے ابتدائی نظام تعلیم میں سائنس کے مضامین کی بے پناہ اہمیت ہے۔ جاپان میں میٹرک کے امتحانی زمانے کو خود کشی کا موسم کہا جاتا ہے۔ جاپان کے 1909ء کے انقلابی آئین میں ایک شق بہت اہم تھی "علم حاصل کیا جائے گا دنیا کے کسی بھی حصے میں اور کسی بھی قیمت پر" 1935ء میں ایک جاپانی سائنس دان یوکاوا کو تھیورٹیکل فزکس میں پہلا نوبل انعام ملا تھا۔ جاپان کے فارن آفس کے ایک ذمہ دار افسر نے اس وقت کے اپنے قلبی تاثرات بیان کرتے ہوئے ایک دفعہ مجھے بتایا تھا کہ "یہ وہ دن تھا جب مجھے اپنے جاپانی ہونے پر فخر محسوس ہونے لگا اور میں نے تہیہ کر لیا کہ جاپانی سائنس دان یوکاوا کے آئیڈیل کو آگے بڑھانے کے لیے زندگی بھر کام کروں گا۔" اس شخص نے جاپان میں سائنس کو آگے بڑھانے کے لیے واقعی قابل قدر کام کیا۔ ضمناً عرض ہے کہ میرے نوبل انعام کی خبر ملنے پر الطاف گوہر صاحب نے ٹیلی فون کیا کہ "ڈاکٹر صاحب! میرا احساس یہ ہے کہ انعام آپ کو نہیں مجھے ملا ہے" میں چاہتا ہوں کہ پاکستان میں سائنس کا ہر طالب علم یہی محسوس کرے اور خود بھی یہ انعام حاصل کرنے کے لیے شب و روز مصروف ہو جائے اور سائنس کے میدان میں مغرب کی فوقیت کا تاج اس کے سر سے اتارے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! ایک بہت بڑا سوال ابھی باقی ہے۔ موجودہ تھیوری کو آپ نے 1973ء میں ثابت کر لیا تھا۔ اس سے آگے کتنا بڑھے ہیں؟

جواب: یعنی آپ تین قوتوں کو دو میں تبدیل کرنے کے لیے بے چین ہیں۔ یہ سوال آپ کو ضرور کرنا چاہیے تھے۔ پاکستان کے بعض حلقوں کو غالباً" میری ان کوششوں کا ابھی تک علم نہیں ہے۔ میں اور جے سی پتی نیوٹرینو (Neutrino) کی تھیوری پر کافی کام کر چکے ہیں۔ اب تک سائنسی عقیدہ یہ چلا آ رہا ہے کہ قدرت نے پروٹون اور الیکٹران جتنی تعداد میں بنائے ہیں وہ ہمیشہ اتنی ہی تعداد میں رہیں گے۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی۔ اب سرن (CERN) میں تجربات ہو رہے ہیں کہ ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ دیکھنے کے لیے کائنات کی زندگی سے بھی زیادہ عرصہ زندہ رہنا ہو گا یعنی پروٹون 10^{30} سال کے بعد مثبت الیکٹرون اور نیوٹرینو میں تبدیل ہو جائے گا۔ ہم نے پہلی تھیوری 1973ء میں ثابت کر دی تھی۔ اس پر اعتراضات کئے گئے لیکن 1978 میں سٹینفورڈ کے تجربات نے بتایا کہ اعتراضات غلط تھے اور ہم صحیح کہتے تھے۔ پارٹیکل فزکس میں ہماری نئی تھیوری کی رہنمائی میں امریکہ اور سرن والوں کے دو گروپ بن گئے ہیں اور ان کا باہمی مقابلہ شروع ہو گیا ہے۔ ایک میل گہرے غار میں دس ہزار ٹن پانی رکھا جائے گا۔ کل پروٹون میں سے جب کبھی ایک پروٹون Decay کرے گا تو ایک شعاع نکلے گی جس دن یہ شعاع دیکھ لی گئی۔ سمجھ لیجئے گا کہ دوسری تھیوری بھی صحیح ثابت ہو گئی۔ آج کل اس تجربے کے لیے غار کی تلاش جاری ہے۔ یہ غار بھارت میں تو یقیناً" مل جائے گی۔ پاکستان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کھیوڑہ کی پہاڑیاں بہت چھوٹی ہیں اور غار کا کافی گہرا ہونا ضروری ہے۔ 1974ء میں افریقہ کی ایک غار میں یہ تجربہ کیا گیا تھا لیکن پانی کا وزن صرف سو ٹن تھا اور ایک سو ٹن پانی میں روشنی دیکھنے کے لیے سو سال کی ضرورت تھی۔

سوال: آپ نے زندگی میں اور کون سے اعزازات حاصل کیے؟

جواب: 1957ء میں کیمبرج یونیورسٹی نے فزکس میں ہاپکنز پرائز دیا۔ اسی سال کیمسٹری (یہاں وارث میر صاحب سے سننے میں غلطی ہوئی ہے کیونکہ آپ کا مضمون تو فزکس تھا۔ ناقل۔ مرتب) میں Adams پرائز دیا گیا۔ 1959ء میں حکومت پاکستان کی طرف سے اعلیٰ کارکردگی کے اعتراف کے طور پر پرائڈ آف پرفارمنس (یہ میڈل 1958ء میں انہیں دیا گیا تھا۔ اس بارے میں دستاویزی ثبوت دیا گیا ہے۔ مرتب) اور ستارہ پاکستان کے اعزازات دیئے گئے۔ Omega Minus Particle معلوم کرنے پر رائل سوسائٹی نے Hughs Medal دیا۔ آپ نے ''ایٹم برائے امن'' کا بین الاقوامی انعام بھی حاصل کیا (یہ انعام ملنے پر والد صاحب نے خط لکھا کہ تمہارا نام بھی Servant of Peace عبدالسلام ہی رکھا تھا) گزشتہ سال امریکن انسٹی ٹیوٹ آف فزکس نے ''جان ٹورس ٹیٹ میڈل دیا تھا۔''

سوال: نوبل انعام پانے والا کتنے ہی مضبوط دل و دماغ کا انسان کیوں نہ ہو۔ یہ انعام اس کی شخصیت پر کچھ

نہ کچھ اثر ضرور ڈالتا ہے۔ ایسے بھی ہوں گے جو اپنے کام میں پہلے سے زیادہ مگن ہو جاتے ہیں اور ایسے بھی ہوں گے جو خوشی سے پھول جاتے ہوں گے۔ آپ پر کیا اثر ہوا؟

جواب: میں تو اللہ کا شکر بجا لایا۔ ویسے انعام کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے کئی پہلوؤں پر غور کرنا پڑے گا۔ علم کا شعبہ کون سا ہے؟ معاشرہ کون سا ہے اور شخصیت کا مزاج کیسا ہے؟ مثلاً" نظریاتی طبیعات میں اتنا زبردست مقابلہ ہوتا ہے کہ دو ایک سال کے لیے پاؤں پسار لینے والا سائنسدان زندہ نہیں رہ سکتا۔ انعام پانے کے بعد "چوڑا" ہونے والی بات پاکستان میں ممکن ہو سکتی ہے۔ یہ بات جنگ سے پہلے جرمنی میں بھی ممکن تھی اور کسی حد تک امریکی معاشرے میں بھی اس قسم کے خطرات محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ امریکیوں میں یہ انعام بھی تو بہت تقسیم ہوتا ہے؟ لیکن میرے دائرہ کار میں ایسا کوئی عنصر یا محرک نہیں پایا جاتا جو سائنس میں میرے انہماک کو تقسیم کر دے۔

سوال: ہر عہد کے سائنسی نظریات نے فلسفے کی دنیا کو بھی متاثر کیا ہے اور نظریاتی فزکس کی طرح اب تو بڑا اور سائنٹیفک فلسفی بننے کے لیے ریاضی دان ہونا بھی ضروری ہے۔ آپ کی تھیوری عصر حاضر کے نمایاں فلسفیانہ رجحانات پر کیونکر اثر انداز ہو گی۔

جواب: خدا بیزار اور وجود پرست فلسفے کی "ڈاچی" کی مہار بے یقینی سے یقین کی طرف موڑ دی جائے گی۔ کبھی خدا کے وجود پر ایمان رکھنے والے کو کم علم کہا جاتا تھا۔ اب خدا کے وجود سے انکار کرنے والے کو کم علم کہا جا سکے گا۔

ہم نے ڈاکٹر صاحب سے ہر اس موضوع پر بات کی جو دو گھنٹے کی اس نشست میں ہمارے ذہن میں آئی۔

(نوائے وقت 3 دسمبر 1979ء)

نمائندہ روزنامہ الفضل ربوہ سے انٹرویو

1979ء میں نوبل انعام ملنے کے بعد صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کی دعوت پر دسمبر کے وسط میں بھائی جان نے پاکستان کا دورہ کیا تھا۔ اس دوران وہ ایک نجی دورہ پر ربوہ بھی گئے تھے۔ وہاں 25 دسمبر کو یوسف سہیل شوق نمائندہ الفضل نے ان سے انٹرویو کیا تھا جسے روزنامہ الفضل نے اپنی 29 جون 1980ء کی اشاعت میں شائع کیا۔ اس انٹرویو کو یہاں درج کیا جا رہا ہے۔ (مرتب)

"بس پوری رفتار سے اڑی جا رہی تھی۔ میں ربوہ آ رہا تھا---- راستے میں کسی گاؤں سے دو دیہاتی بس میں سوار ہوئے اور آپس میں دیہاتیوں کے لب و لہجہ میں اونچی اونچی آواز میں گفتگو کرنے لگے۔ میری الجھی ہوئی سوچوں کا دامن دونوں دیہاتیوں کی گفتگو نے تھام لیا اور میں اپنی سوچوں کے سمندر سے ابھر کر دونوں کی گفتگو سننے لگا۔"

دونوں کا لہجہ خالص دیہاتی تھا۔ ایک جو کہ خود کو زیادہ سمجھ دار ثابت کر رہا تھا' دوسرے سے کہہ رہا تھا۔

"وہ----- ڈاکٹر عبدالسلام کے بارے میں بھی سنا ہے تم نے؟"

"واہ کیا بات ہے؟"

"اس نے بڑا وڈا لاکھوں روپے کا انعام لیا ہے۔"

"اچھا! وہ بھلا کس بات پر؟"

"انگریزوں نے ولایت میں اسے بڑا انعام دیا ہے۔ یہاں ہمارے ضلع جھنگ کا رہنے والا ہے۔"

"اچھا اپنا گرائیں اے (خوشی و مسرت سے) واہ کیا بات ہے اس شیر کی----- اس نے کام کیا کیا ہے۔"

"وہ سائنس کا ماہر ہے۔ اس نے بڑی چیز دریافت کی ہے۔"

اس دریافت کی وضاحت میں اس نے اپنی طرف سے زمین و آسمان کے قلابے ملا ڈالے اور افسانوی انداز میں ایسی ایسی باتیں گھڑیں کہ میں محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہا۔

"اچھا پھر تو بڑا کام کیا اس نے۔ یہ کوئی بڑا افسر ہے؟"

"نہیں بھائی افسر نہیں ہے۔ سائنس کے محکمے کا بہت بڑا آدمی ہے۔ لاکھوں روپے کمائے ہیں اس نے انعام لے کر-----"

ابھی ان دونوں کی گفتگو جاری تھی کہ بس ایک چھوٹے سے قصبے میں رکی اور وہ دونوں دیہاتی اپنی دھوتی اور پٹکے (پگڑیاں۔ مرتب) سنبھالتے ہوئے بس سے نیچے اتر گئے ورنہ ان کی دلچسپ اور "عالمانہ" گفتگو ابھی اور مزہ دیتی۔

تب مجھے احساس ہوا کہ پاکستان کا پہلا نوبل انعام یافتہ سائنس دان صرف پڑھے لکھے طبقے کا ہی آئیڈیل نہیں بن چکا۔ بلکہ ہر جاہل اور غریب شخص کا بھی ہیرو بن چکا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام ایک افسانہ بن چکا ہے۔ اس کی داستانیں سائنس کی موٹی موٹی کتابوں اور سائنسی جرنلوں سے نکل کر پاکستان کے عام دیہاتیوں کے سینے میں محفوظ ہو گئی ہیں جو اس کے انعام کو فخر سے بیان کرتے ہیں اور اس کی سائنسی دریافت کو سمجھ نہ سکنے کی وجہ سے از خود اس سے کہانیاں منسوب کر رہے ہیں تاکہ اپنے ہیرو کو عظمت کے اونچے سے اونچے مینار پر بیٹھا سکیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جبکہ ڈاکٹر عبدالسلام کو نوبل انعام ملنے کی خبر تازہ تازہ ملک میں مشہور ہوئی تھی۔ اس دن سے ہی اشتیاق تھا کہ ڈاکٹر صاحب موصوف پاکستان تشریف لائیں تو ان سے ملاقات کی جائے۔ یہ یقین تھا کہ جب بھی وہ پاکستان آئے تو سب سے پہلے ربوہ آئیں گے۔ کیونکہ ربوہ کا شہر ان کا روحانی مرکز ہے۔ اور ان کے بزرگ والد حضرت چوہدری محمد حسین صاحب کی تربیت ان کے رگ و ریشہ میں اس طرح پیوست ہو چکی ہے کہ وہ اعلیٰ ترین مرتبے پر پہنچ کر مرکز کو فراموش کرنے کا سوچ بھی

نہیں سکتے۔ دنیا بھر کے سربراہان مملکت سے فخر و ناز سے گردن اونچی کر کے ملنے والا ڈاکٹر عبدالسلام جب ربوہ کی مختصر سی بستی میں آ کر حضرت امام الثالث سے آکر ملتا ہے تو اس کا سر جھکتے جھکتے اس کے سینے سے جا لگتا ہے اور وہ عاجزی اور انکساری کا ایک ایسا مجسمہ نظر آتا ہے کہ اس وقت اس کو دیکھ کر کسی کو یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ یہ وہی شخص ہے جس کو آتے دیکھ کر دنیا کے چوٹی کے ماہرین تعلیم اور عظیم ترین سائنس دان اپنی نشستوں کو چھوڑ کر تعظیما" کھڑے ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ دسمبر 1979ء کے پہلے ہفتہ میں پتہ چلا کہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام پاکستان تشریف لا رہے ہیں۔ آخر خدا خدا کر کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور دسمبر کے پہلے ہفتہ (یوسف سہیل شوق صاحب کو یہاں غلطی لگی ہے۔ بھائی جان 15 دسمبر کی صبح کراچی پہنچے تھے۔ ناقل) میں ڈاکٹر صاحب موصوف پاکستان آئے اور کراچی اور پھر ملتان میں مختصر سے قیام کے بعد سیدھے ربوہ آئے جہاں ان کا شایان شان استقبال کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کا قیام یہاں بہت مختصر تھا۔ ان کے قریبی عزیز مکرم صلاح الدین صاحب ایوبی باوجود کوشش کے ان سے ہماری ملاقات نہ کروا سکے۔ تاہم ایوبی صاحب نے یہ ضرور کرم کیا کہ ڈاکٹر صاحب سے یہ وعدہ لے لیا کہ جب وہ جلسہ سالانہ پر تشریف لائیں گے تو الفضل کے نمائندہ کو خصوصی طور پر وقت دیں گے۔ ایوبی صاحب نے بھی ہم کو یہ یقین دہانی کروا دی اور ہم صبر کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کی دوبارہ آمد کا انتظار کرنے لگے۔

24 دسمبر کو ڈاکٹر صاحب ربوہ تشریف لے آئے۔ 25 دسمبر کو دن کے وقت ایوبی صاحب نے دفتر میں پیغام پہنچایا' کہ آج شام مغرب کے بعد صدر انجمن احمدیہ کے گیسٹ ہاؤس پہنچ جاؤ اور ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کر لو۔ میں شام کو مغرب کے قریب دفتر پہنچا تو مجھے یہ پیغام ملا مغرب تنگ ہو رہی تھی میں نے موقعہ غنیمت جانا۔ مگر وائے کہ سائیکل پنکچر نکلی۔ مجھے یہ خوف تھا کہ ایک دفعہ اج کی شام ڈاکٹر صاحب موصوف کہیں نکل گئے تو پھر جلسہ کے دنوں میں مصروفیت اتنی ہو گئی کہ دوبارہ ملاقات ممکن نہیں ہو گی اور جلسہ کے فورا" بعد ڈاکٹر صاحب کو واپس جانا تھا۔ قسمت اتنی خراب بھی نہ تھی۔ ایک کار والے صاحب مل گئے۔ جنہوں نے مجھے فورا" صدر انجمن احمدیہ کے گیسٹ ہاؤس پہنچانے کی حامی بھری۔ میں نے دل ہی دل میں ان کو سینکڑوں دعائیں دے ڈالیں اور پلک جھپکنے میں گیسٹ ہاؤس پہنچ گیا۔ وہاں پر ڈاکٹر نصیر خان صاحب ملے۔ جنہوں نے کہا کہ انتظار کریں۔ ڈاکٹر صاحب آیا ہی چاہتے ہیں چنانچہ میں نے وہیں انتظار شروع کر دیا۔ مگر یہ انتظار خاصہ طویل ثابت ہوا حتیٰ کہ سردیوں کی رات کے نو بج گئے۔ ڈاکٹر نصیر خان صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ اب میں چلا جاؤں اور صبح نماز فجر کے فورا" بعد آ کر ڈاکٹر صاحب سے ملوں۔ میں ناامید ہو کر جانے ہی والا تھا کہ گیسٹ ہاؤس کے فون کی گھنٹی بجی۔ گیسٹ ہاؤس کے ملازم نے ٹیلی فون اٹھایا۔ اس کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ دوسری طرف ایوبی صاحب بول رہے ہیں۔ میں لپک کر فون کے پاس پہنچا اور ملازم کی گفتگو ختم ہوتے ہی ریسیور ہاتھ میں لے لیا اور ایوبی صاحب سے

بات ہوئی تو انہوں نے کہا یہاں سے ہرگز نہ ہلنا۔ ڈاکٹر صاحب یہاں آنے والے ہیں اور ان سے پہلے میں گیسٹ ہاؤس پہنچ رہا ہوں۔ چند منٹوں میں ایوبی صاحب آئے اور پھر دوبارہ انتظار شروع ہو گیا۔ اب میں جم کر بیٹھ گیا تھا۔ دل میں تہیہ کر لیا کہ آج ملے بغیر نہ جاؤں گا۔ آخر ڈاکٹر صاحب آئے اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کمرہ انتظار میں ایک اور صاحب موجود تھے۔ وہ پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہو گئے۔ میں نے جانا چاہا تو ایوبی صاحب آڑے آ گئے اور مجھے پھر صبر کرنے کو کہا۔ اب میں بالکل کمرے کے دروازے کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا۔ ایوبی صاحب میرا اضطراب بھانپ گئے۔ کہنے لگے کہ ابھی یہ صاحب نکلیں گے تو میں بات کروں گا۔ پھر تم کو بلا لیں گے۔ چنانچہ خدا خدا کر کے رات دس بجے کے بعد جب وہ صاحب نکلے تو ایوبی صاحب ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے اور بتایا کہ الفضل کا نمائندہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے الفضل کا نام سنتے ہی فوراً" مجھے بلا لیا اور مصافحہ کرنے کے بعد اپنے پلنگ کی پائنتی پر بیٹھ گئے اور بولے۔

"پوچھئے آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

نوبل انعام یافتہ بین الاقوامی شہرت کے حامل سائنس کی دنیا میں منفرد مقام رکھنے والے شخص کی یہ سادگی اور بے تکلفی دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ کاغذ قلم سنبھالا اور سوال کیا۔

سوال: "نوبل انعام ملنے کی اطلاع آپ کو کب کیسے اور کہاں ملی؟"

جواب: ڈاکٹر صاحب پلنگ کی پائنتی سے اٹھ کر میرے سامنے بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ٹائی کی ناٹ پہلے ہی ڈھیلی کر رکھی تھی۔ بولے۔

"میں اس وقت لندن میں اپنے گھر میں تھا۔ 10 اکتوبر کی صبح دن کے بارہ بجے کے قریب ٹیلی فون پر مجھے اطلاع ملی۔ میں اسی وقت سیدھا مسجد چلا گیا ور وہاں جا کر شکرانے کے نوافل ادا کئے۔"

سوال: "ڈاکٹر صاحب یہ بتایئے کہ نوبل انعام کے بارے میں سب سے پہلے آپ کے دل میں کب خیال آیا کہ یہ عظیم انعام آپ کو بھی مل سکتا ہے۔"

جواب: ڈاکٹر صاحب نے بہت مدھم آواز میں جواب دینا شروع کیا۔

"1957ء میں سب سے پہلے مجھے یہ خیال آیا۔ اس وقت سائنس کے ایک شعبے میں دو چینی سائنس دانوں نے ایک کام کیا۔ میں نے بھی اسی قسم کا کام کیا تھا۔ میرے کام میں تھوڑا سا فرق تھا۔ ان لوگوں کے کام کے ایک حصے کو بڑھانے میں میرا بھی ہاتھ تھا۔ میرا خیال ہے کہ ممکن ہے کہ اس وقت پہلی دفعہ مجھے یہ خیال آیا ہو گا۔ اس کے علاوہ 1957ء میں ہی لندن ٹائمز نے نوبل انعام ملنے سے پہلے جو اطلاع دی تھی اس میں ذکر کیا گیا تھا کہ میرا نام بھی نوبل انعام دیئے جانے کے لیے تجویز کیا گیا ہے۔"

سوال: میں نے پوچھا "ڈاکٹر صاحب طالب علمی کے دور میں کبھی آپ کو یہ خیال آیا کہ آپ کبھی نوبل انعام حاصل کر سکیں گے یا آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ آپ بھی یہ انعام حاصل کریں؟"

جواب: ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "طالب علمی کے دوران کبھی خصوصی طور پر ایسا خیال نہیں آیا تاہم یہ انعام اتنا بڑا شمار کیا جاتا ہے کہ ہر سائنس دان کے دل میں اس کے بارے میں ایک آئیڈیل ہوتا ہے۔ سویڈن کے رہنے والوں نے کمال یہ کیا ہے کہ انہوں نے اس انعام کو اس طرح سے پیش کیا ہے کہ اس کو عالمی سطح کا ایک کریڈٹ تسلیم کیا جاتا ہے۔ آج تک کسی سائنس دان نے یہ نہیں کہا کہ یہ انعام کوئی معمولی چیز ہے۔ ویسے کہنے والے کی زبان کون پکڑ سکتا ہے مگر اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے پاس Back Log ہے۔ انہوں نے اس انعام کو اس طریقے سے عالمی سطح پر منوایا ہے کہ ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ یہ انعام اس کو ملے۔ بلحاظ اہمیت بھی اور بطور انعام بھی اس کی حیثیت مسلمہ ہے۔ اب تک 325 سائنس دانوں کو فزکس اور کیمسٹری میں یہ انعام مل چکا ہے۔"

میرے ذہن کے گوشے میں یہ سوال کلبلایا کہ اتنا بڑا انعام حاصل کرنے کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب کی کوئی بڑی خواہش ہو گی چنانچہ میں نے فوراً سوال کیا کہ

سوال: "ڈاکٹر صاحب آپ کی اعلیٰ ترین خواہش کیا ہے؟"

جواب: ڈاکٹر صاحب اسی نرم لہجہ میں آہستگی سے گویا ہوئے۔ اب بھی ان کی آواز اتنی مدھم تھی کہ مجھے آگے جھک کر ان کی بات سننی پڑی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"خواہشیں مختلف قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک خواہش تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ میرا علم مزید بڑھائے اور اس سے بھی زیادہ پڑھنے کی توفیق دے۔"

دوسری خواہش یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم اسلام کو یہ طاقت دے کہ مسلمانوں میں اعلیٰ پائے کے سائنس دان پیدا ہوں۔ میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے یہ توفیق دے کہ میں سائنس کے میدان میں عالم اسلام کی ایسی خدمت انجام دوں کہ ایک ایسی نسل پیدا کر جاؤں جو اس عظیم سائنسی ورثے کی اہل و امین ہو۔ اللہ تعالیٰ مجھے عالم اسلام کے لیے ایک ایسا ادارہ قائم کرنے کی توفیق دے اور ایسے افراد اکٹھے کرنے کی توفیق دے جو ساری دنیا میں عالم اسلام کا نام روشن کرنے والے ہوں اور یہ کام اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر کوئی نہیں کر سکتا۔ انسان خود نہیں کر سکتا کسی انسان میں یہ قوت نہیں ہے۔"

سوال: "ڈاکٹر صاحب! آپ نے جو تھیوری پیش کی ہے اس سے دنیا وحدت کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ آپ اس کامیابی پر بطور مسلمان کیا سوچتے ہیں؟"

جواب: ''ماہر طبیعات کے طور پر جو کسی کا کردار ہے وہ تو یہ ہے کہ اس کام میں جو میں نے کیا ہے اس میں غیر مسلم بھی شامل ہیں اور یہ خیال کہ نوع انسانی کی طاقتوں میں ایک وحدت ہونی چاہیے ' صرف میرا خیال نہیں ہے بلکہ ہر ماہر طبیعات چاہے وہ مسلمان ہے یا نہیں اس کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ بطور مسلمان میرا کیا خیال ہے تو یہ بات غیر شعوری طور پر تو میرے اندر ہو گی مگر بطور سائنس دان کے کسی شخص کو ابھی تک آخری سچائی کا پتہ نہیں چلا۔ باقی انسان کی زندگی پر غیر شعوری اثرات ہوتے ہیں جو کہ سوچ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یقیناً" یہ بات تو زندگی پر اثر ڈالتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی یونیفائڈ تھیوری (اتحاد کا نظریہ) کے منظر عام پر آنے کے بعد پاکستان میں اخبارات و رسائل نے یہ بات کئی دفعہ دہرائی کہ اس تھیوری سے خدا تعالیٰ کی ذات اور وحدانیت کا ثبوت ملے گا۔ گویا کہ سائنس سے خدا کو ثابت کیا جا سکے گا۔ اور اس بات کو سائنس کی ایک اہم کامیابی تصور کیا جا رہا تھا چنانچہ میں نے اس تھیوری کی وضاحت کے لیے براہ راست سوال کیا کہ

سوال: ''کیا سائنس خدا کو ثابت کر سکتی ہے۔''

جواب: ڈاکٹر صاحب کی آواز یک دم بلند ہو گئی اور وہ کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے جو کچھ کہا وہ میرے لیے حیران کن تھا۔ ڈاکٹر صاحب بولے۔

''سائنس خدا کو ثابت نہیں کر سکتی۔ سائنس بہت حقیر ہے۔ سائنس جس حد تک وحدت کو ثابت کرتی ہے یہ وحدت میرے وجود کا حصہ ہے لیکن اگر میں کہوں کہ سائنس خدا کو ثابت کر سکتی ہے یہ خدائی کے تصور کی توہین ہے۔ سائنس تو بہت حقیر ہے۔ یہ تو غلام ہے۔ وہ بہت اعلیٰ و ارفع ذات ہے۔ ذات باری کو سائنس کا محتاج قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ بات سن کر میرے دل میں بے ساختہ یہ خیال آیا کہ یہ نظریہ ایک مخلص احمدی کے دل سے ہی جنم لے سکتا ہے ورنہ اخبارات کا لہجہ تو یوں تھا کہ گویا اب تک خدا کو کوئی ثابت ہی نہیں کر سکا تھا اور اب سائنس یہ کارنامہ سرانجام دے رہی ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب یہ بتائیں کہ نوبل انعام حاصل کرنے پر بطور ایک احمدی کے آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

جواب: ڈاکٹر صاحب کا پورا جسم ایک بار پھر انکسار اور عاجزی کا مجسمہ بن گیا۔ وہ آہستہ سے بولے۔

''یہ میرے والد صاحب کی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔ احباب جماعت کی دعاؤں کا نتیجہ ہے اور سب بڑھ کر حضرت صاحب (مراد امام الثالث۔ ناقل) کی نظر عنایت اور دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ میرے والد صاحب مجھے کہا کرتے تھے کہ ''یہ انعام بھی مجھے مل کر رہے گا۔''

یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب اٹھے اور اپنی الماری میں سے کوئی چیز تلاش کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئے تو مجھے ایک فوٹو سٹیٹ کاغذ پکڑا دیا اور بولے یہ میرے والد صاحب کا ایک خط ہے۔ میں نے خط پڑھنا شروع کیا۔ اس خط کا متن یوں ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کراچی مورخہ 30 اکتوبر 1968ء

عزیز از جان سلمہ اللہ المنان نبعرہ والاحسان

اسلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ

ابھی ابھی آپ کا محبت نامہ نیویارک سے اور عزیز رشید سلمہ کا 1968-9-17 کا خط ملا۔ الحمداللہ کہ خوشی کی خبریں آئی ہیں۔ الحمداللہ سارے انعام کی تقسیم کی روائیداد پڑھی اور اللہ کریم کی دل و جان سے حمد پڑھی۔ دعا ہے کہ دوسرے انعام کے ملنے کی سعادت بخشے آمین (ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ اس سے نوبل انعام مراد ہے) پروفیسر مارشک نے آپ کو انعام ملنے سے پہلے جو کلمات دہرائے اور عبدالسلام Servant of Peace کہا تو یہ کلمات نصف صدی پہلے خداوند عزوجل کے تھے نہ کہ میرے۔ لڑکا پکڑا کر جب نام دریافت کیا گیا تو عبدالسلام رکھا گیا بتانے والا زندہ خدا تھا نہ کہ کوئی انسان۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آسمان کا خدا زندہ خدا ہے۔ اور اپنے بندوں سے اب بھی کلام فرماتا ہے۔ الحمدللہ رب العالمین۔ آپ نے بھی اچھا کیا کہ نبی عربی ﷺ کی بیان کردہ تحمید بیان کی اور سامعین کو عرب سائنس دانوں کی خدمات یاد دلائیں اور کہا کہ یہ ایک Sea Saw ہے جس میں انشاء اللہ ہم کامیاب ہوں گے گویا ایک طرح زندہ خدا کی برکات کا ذکر کر دیا۔

اس موقع پر جو دنیا بھر کے بڑی ہستیوں کو آپ نے زندہ خدا کے کلمات سے آگاہ کیا (یہ) ایک سب سے بڑی تبلیغ ہے۔ لطف یہ ہے کہ لڑکا اور انعام دیا گیا نام عبدالسلام رکھا اور پھر Atom for Peace Prize کی قیمت ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ ہے۔ 4 انچ مربع سونے کا میڈل دیا پھر دنیا بھر کے سائنس دانوں اور بڑے آدمیوں میں اس کا اشتہار دیا۔ کجا جھنگ کا لڑکا اور کجا اتنی بڑی سعادت الحمدللہ

والسلام

خاکسار محمد حسین عفی عنہ"

یہ خط پڑھ کر میں نے سر اٹھایا تو ڈاکٹر صاحب نے ایک اور فوٹو سٹیٹ کاغذ میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

"یہ بھی دیکھیں یہ میرے والد صاحب کی ڈائری کا ایک ورق ہے۔"

"حضرت مرزا بشیر احمد ایم۔اے (مرحوم) نے بندہ کو بمقام لنڈن ایک خط لکھا جس میں درج تھا کہ " میں عزیز پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کے متعلق دور افق میں حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی پیشین گوئی کو پورا

ہوتے دیکھتا ہوں۔ الفاظ پیشگوئی ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں "میرے فرقے کے لوگ اس قدر علم و معرفت میں کمال حاصل کریں گے کہ اپنی سچائی کے نور اور اپنے دلائل اور نشانوں کی رو سے سب کا منہ بند کر دیں گے اور ہر ایک قوم اس چشمہ سے پانی پیئے گی اور یہ سلسلہ زور سے بڑھے گا اور پھولے گا یہاں تک کہ زمین پر محیط ہو جائے گا۔"

"----- اے سننے والو! ان باتوں کو یاد رکھو اور ان پیش خبریوں کو اپنے صندوقوں میں محفوظ رکھ لو کہ یہ خدا کا کلام ہے جو ایک دن پورا ہو گا۔"

(تجالیات الہیہ)

خاکسار محمد حسین عفی عنہ

ڈاکٹر صاحب نے ایک دلچسپ بات بتائی کہ اس ڈائری میں حضرت مرزا بشیر احمد صاحب اللہ ان سے راضی ہو کا یہ ارشاد ہے کہ کہ "میں دور افق میں" دیکھ رہا ہوں۔ پچھلے سال میں حضرت صاحب (حضرت امام الثالث۔ ناقل) سے ملا تو باتوں باتوں میں نوبل انعام اور حضرت ---- کے اس ارشاد کا ذکر آیا تو حضرت صاحب نے ہنستے ہوئے کہا کہ حضرت ---- نے "دور افق" کا ذکر کر کے "بیڑی" (مراد کشتی ڈبو دی ہے۔ مرتب) ہی ڈوب دی ہے۔

سوال: ایک اور سوال میرے ذہن میں بڑی دیر سے آ رہا تھا میں نے پوچھا۔ "ڈاکٹر صاحب آپ کی کامیابی کا راز کیا ہے؟"

جواب: ڈاکٹر صاحب نے ایک لمحہ توقف کیے بغیر جواب دیا "اللہ تعالیٰ کا فضل" انسان کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو دعا کرتا ہے۔ میرے لیے بھی جماعت نے احباب نے دعائیں کیں جس کا نتیجہ برآمد ہوا۔ یہ کاملاً اللہ کا فضل ہے۔ باقی محنت ہے جستجو ایک ازلی جستجو اور پیاس ہے جو لگی ہوئی ہے۔ یہ دماغی کیفیت تو اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔"

سوال: ڈاکٹر صاحب سائنس دانوں کے متعلق عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ خشک مزاج لوگ ہیں۔ ان کو ادب شعر یا نازک خیالی سے کوئی رابطہ نہیں۔ ہر چیز ٹسٹ ٹیوب میں ڈال کر دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کو کیا کسی ایسی چیز سے لگاؤ رہا ہے۔

جواب: ڈاکٹر صاحب بولے۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ ادب اور شعر سے مجھے ہمیشہ لگاؤ رہا ہے۔ نظم لکھنا کوئی مشکل کام ہے؟ میں تے تو شاید کوئی ایک آدھ نظم لکھی ہو مگر ہمیشہ ہی سارے ہی بڑے سائنس دان بڑے اچھے ادبی ذوق کے مالک رہے ہیں۔ یہ تو آرٹس والے ہوتے ہیں جو بالکل "چرخے" ہوتے ہیں جو کہ ایسی باتیں نہیں سکتے۔ میں نے ہمیشہ ہی ادب میں دلچسپی لی ہے۔

سوال: "ڈاکٹر صاحب سائنس کے علاوہ آپ کے کیا مشاغل ہیں؟"

جواب: مشغلہ کوئی نہیں۔ ہلکا سا مطالعہ کرتا ہوں۔ اپلائیڈ اکنامکس، سوانح عمری، سفرنامے، ہلکے پھلکے ناول

پڑھ لیتا ہوں۔ ان میں سے وڈی ہاؤس (Wodehouse) مجھے پسند ہے۔"

اب مجھے ایک اہم سوال سوجھا۔ بات نازک بھی تھی اور اہم بھی۔ میں نے سوال کیا۔

سوال: "ڈاکٹر صاحب پاکستان میں سائنس کا کیا مستقبل ہے؟"

جواب: میرے سوال پر ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں پر فکر و تدبر کے سائے لہرائے انہوں نے کرسی پر پہلو بدلا اور یوں گویا ہوئے۔

"اس سلسلے میں دو رویے ہوتے ہیں۔ ایک خصوصی کاموں کے واسطے کہ جو سیکھتا ہے اس کی طرف پوری توجہ کی جائے۔ ایک عمومی رویہ ہے۔ سائنس کے بارے میں رویہ یہ ہونا چاہیے کہ گھٹی میں پڑی ہونی چاہیے جس طرح قرآن ہماری گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ جب تک یہ صورت نہ ہوگی' سائنس صحیح طریقے سے ترقی نہیں کر سکتی۔ انجنیئر زیادہ سے زیادہ بناؤ مگر اس طرح سے کہ سائنس ان کی رگ رگ میں رچی ہو۔ اور یہ ملک کے مسائل حل کریں۔ سیم کا مسئلہ لو یہ واقعی صحیح ہے کہ اس کی اتنی زیادہ تباہ کاریاں ہیں اور اس کا ملکی ترقی پر بڑا سخت دباؤ ہے۔ تو یہ کہنا کہ سائنس بہت مہنگی ہے۔ اس لیے اچھی طرح پڑھی نہیں جا سکتی۔ کتنی مہنگی ہے! لائلپور (فیصل آباد) تباہ ہو گیا۔ سیم سے کیا اس سے بھی سائنس مہنگی ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں کہ ہر بچے کو بھی اس کا علم ہے۔ اس کا تدارک سائنس ہی کر سکتی ہے۔ صرف نعرے لگانے سے بات نہیں بنے گی۔ جب تک ان باتوں کی اہمیت قوم کے شعور پر نہیں چھا جاتی۔ اس وقت تک سائنس نہیں آئے گی۔

اس ملک میں یہ اخبار نویسوں کا بھی کام ہے خود سائنس دانوں کا بھی اور حکومت اور انتظامیہ کا بھی کہ ایک عمومی بیداری سائنس کے حق میں پیدا کی جائے اس کے بغیر سائنس کو ترقی نہیں دی جا سکتی۔ پچھلے سالوں میں سنگاپور' ہانگ کانگ' جنوبی کوریا اور چین وغیرہ ممالک میں گیا۔ جنوبی کوریا میں مجھے سائنس کے وزیر نے بتایا کہ ہم نے یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ ہم چین کو ٹیکنالوجی کے میدان میں شکست دے کر رہیں گے۔ یہ اس قوم کا نصب العین ہے۔ ایسی بات کبھی ہمارے دماغ میں بھی نہیں گذری۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس ان پڑھوں کے بس میں پڑی ہوئی ہے۔ جاپان نے اسی سے ترقی کی ہے۔ اگر یہ جاپان کے لیے آسان ہے تو ہمارے لیے کیوں آسان کام نہیں ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب آپ ایک پسماندہ شہر سے تعلق رکھتے۔ میں آپ کے اعزاز حاصل کرنے کے بعد آپ کا اپنے شہر کے بارے میں کیا تاثر ہے۔

جواب: "اس پر ڈاکٹر صاحب مسکرائے اور کہنے لگے کہ جب میں ابھی جھنگ گیا تو میرے لیے جو تقاریب منعقد کی گئیں۔ ان میں ایک صاحب نے کہا کہ اب تک تو جھنگ ہیر کی وجہ سے مشہور تھا۔ اب جھنگ ڈاکٹر عبدالسلام کی وجہ سے مشہور ہو گا۔ میں نے ان کو جواباً" کہا کہ جھنگ کا صرف اتنا اعزاز کہ اب یہ ان 325 شہروں میں سے ایک شہر بن گیا ہے جہاں کے رہنے والے نے نوبل انعام

حاصل کیا ہے مگر ہیر تو اپنی جگہ پر ایک واحد اور انوکھی Unique چیز تھی۔ نوبل انعام والے شہر تو 325 ہیں مگر ہیر تو ایک ہی ہے!!

ڈاکٹر صاحب کی یہ دلچسپ منطق سن کر میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

سوال: ”اب آپ کی تھیوری کا اگلا مرحلہ کیا ہو گا؟“

جواب: ”ابھی تک کائنات کی چار بنیادی قوتیں چار سے کم ہو کر تین ہو گئی ہیں۔ اب ان کو تین کو دو بنایا جائے گا اور پھر دو سے ایک قوت ثابت کی جائے گی۔ اگلا مرحلہ الیکٹرو ویک فورس اور سٹرانگ نیوکلیر فورس کو متحد کرنے کا ہے (یاد رہے کہ الیکٹرو ویک فورس اس قوت کا نام ہے جو کہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے دریافت کی ہے اور یہ نام بھی انہی کا رکھا ہوا ہے۔ یہ قوت الیکٹرک سٹی (بجلی) اور ویک نیوکلیر فورس (کمزور جوہری قوت) کے استعمال سے بنی ہے)

سوال: ”ڈاکٹر صاحب احمدی نوجوان کے لیے آپ کا پیغام کیا ہے؟“

جواب: ”علم سیکھو! یہ سب سے بڑی بات ہے۔ یہ آپ کا اوڑھنا بچھونا ہونا چاہیے۔ اللہ کی مدد حاصل کرو۔ علم اس طرح حاصل کرو کہ تمہارے لیے سب سے بڑی چیز علم ہو۔ عربی زبان میں سائنس کے لیے لفظ ہی علم کا استعمال ہوا ہے۔ حدیث میں علماء سے مراد سائنس دان ہی لیے گئے ہیں۔ یہ حیران کن بات ہے اور یہ بات خود عربی علماء نے بتائی ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے آخر میں حکومت پاکستان کے اچھے انتظامات کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ اور صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کا خصوصی طور پر ذاتی توجہ کرنے پر شکریہ ادا کیا اور کہا کہ مجھے خاص طور پر بلا کر ملک بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کے نتائج انشاء اللہ بہت اچھے نکلیں گے۔

اب میں ڈاکٹر صاحب سے اجازت لینے کے لیے اٹھا تو کہنے لگے کہ ایک بات کسی اخبار میں نہیں آسکی کہ اب میں جب لاہور میں گیا تو 23 دسمبر کو ساڑھے بارہ بجے دن میں سینٹ ہال میں پنجاب یونیورسٹی کے طلباء و اساتذہ کو خطاب کرنے کے بعد داتا دربار حاضری دینے کی بھی سعادت حاصل کی۔ اور حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کے مزار مبارک پر دعا کی تھی۔ (پنجاب یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء کو خطاب کرنے کے لیے بھائی جان ہوٹل انٹر کانٹیننٹل تشریف لے گئے وہاں وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے عصرانہ کا اہتمام کیا تھا۔ جس سے فارغ ہونے کے بعد ہم حضرت داتا صاحب کے مزار پر گئے تھے۔ مرتب)

”خدا کے واسطے جاگو!“

ماہنامہ ”ہیرلڈ“ کراچی جنوری 1980ء میں بھائی جان کا ایک انٹرویو شائع ہوا تھا جو غنی جعفر نے لیا تھا۔

اس انٹرویو کے بعض حصے یہاں درج کئے جا رہے ہیں۔ یہ انٹرویو روزنامہ الفضل ربوہ میں 29 جون 1980ء کو بھی شائع ہوا تھا۔

غنی جعفر نے پہلے بھائی جان کی شخصیت کے بارے میں کہا۔

"ایک ایسا شخص جو نہ صرف دوسروں سے خود پر مزاح باتیں بھی کرتا ہے۔ بلکہ ان کے مزاح کو بشاشت سے قبول بھی کرتا ہے جو اپنے تیسری جماعت کے اساتذہ کو گھر کے دروازے کے باہر تک جا کر الوداع کہنے پر اصرار کرتا ہے۔ اس قسم کے شخص کے ساتھ اگر کبھی آپ کو سفر کرنے کا اتفاق ہو تو آپ کو یہ احساس بھی نہ ہو گا کہ یہ شخص ایک بین الاقوامی شخصیت ہے۔

پروفیسر سلام کی شخصیت سے بڑھ کر اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہو گا کہ حقیقی علم انسان میں انکساری پیدا کرتا ہے۔

پروفیسر عبدالسلام کے ساتھ گزارے جانے والے نوے منٹوں میں مجھے جو چیز سب سے زیادہ محسوس ہوئی۔ وہ ان کی بے جھجک فراخ دل طبیعت تھی اور یہ کہ ان کی ذات میں کسی قسم کے غرور یا احساس برتری کا شائبہ تک نہ تھا حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ وہ پہلے پاکستانی ہیں جنھوں نے نوبل انعام حاصل کیا ہے۔ فزکس میں 1979ء کا انعام (دو امریکن سائنس دانوں کے ہمراہ)

"ہمارے تعلیمی اداروں کو قومی ملکیت میں لینا ایک افسوس ناک قدم تھا۔ تمام دنیا میں آپ دیکھیں گے کہ سکولوں کو مقامی ادارے چلاتے ہیں۔" انہوں نے کہا کہ "میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ ان اداروں کے سٹاف کی سہولتوں میں کوئی کمی ہو۔ ان کی تنخواہیں اور دیگر مراعات اسی طرح ہونی چاہئیں جس طرح سرکاری تحویل میں لیے گئے ادارہ کی ہوتی ہیں لیکن یہ ایک غلطی ہے کہ مقامی اداروں کو اپنے اداروں کے انتظامات میں حصہ لینے کے اعزاز سے محروم کر دیا جائے۔"

ترقی یافتہ ممالک سے ترقی پذیر ممالک کو ٹیکنالوجی کی منتقلی کے مسئلے پر بات ہوئی تو پروفیسر سلام نے بڑی سختی سے اس نظریے کے پیچھے کار فرما اصول کی مخالفت کی "اس طرح آپ کیسے انہیں کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنی ٹیکنالوجی آپ کو منتقل کر دیں آپ کو اس بات کا حق کس طرح پہنچتا ہے کہ آپ ایسا مطالبہ کریں؟ اگر میں ایک ہسپتال میں جاتا ہوں وہاں کی دوائیوں سے میرا علاج ہوتا ہے۔ ان انجکشنوں سے میں موت کے منہ سے بچ جاتا ہوں۔ کیا آپ کی ساری تیسری دنیا نے ان میں سے ایک بھی انجکشن ایجاد کیا ہے۔ میں تو شاید ان کے پاس جا سکتا ہوں کہ اپنے تحقیقی کام میں ان کی اعانت حاصل کروں مگر آپ کے ڈاکٹروں نے آپ کے انجنیئروں نے کیا کیا ہے؟"

اتنی ہی سختی کے ساتھ انہوں نے اس الزام کو رد کیا کہ تیسری دنیا کے ممالک سے خام مال لے کر ان کا استحصال کیا گیا ہے۔ "انہوں نے کوئی استحصال نہیں کیا اگر آج آپ اپنے ہر قسم کے خام مال کی برآمد پر مکمل پابندی بھی عائد کر دیں۔ پھر بھی ان کا کام بند نہیں ہو گا۔ وہ اس کا متبادل تلاش کر لیں گے۔ ان

کے پاس مطلوبہ ٹیکنالوجی موجود ہے۔ خدا کے لیے جاگو۔ کوئی اچھی بری چیز خود بھی بناؤ۔ آپ یہ چیزیں ہمیشہ دوسروں سے بھیک میں مانگنے کی بجائے خود کیوں نہیں بنا لیتے۔"

انہوں نے جاپانیوں کے ان تجربات کا حوالہ دیا جن میں انہوں نے اس وقت چوٹی کی پوزیشنیں حاصل کرلی تھیں جبکہ جدید ٹیکنالوجی گھٹنوں کے بل چل رہی تھی۔" اب ان کے ہاں ٹیکنالوجی کی بنیادیں مستحکم ہو چکی ہیں۔ ریسرچ پر ان کے اخراجات بڑے زبردست ہیں اور اس کے نتائج آپ کے سامنے ہیں۔"

پاکستان میں موجود ریسرچ کی سہولتوں کے بارے میں جب ان سے سوال کیا گیا تو انہوں نے اس سلسلہ میں اختیار کی گئی پالیسی پر زبردست تنقید کی "آخر آپ کو مصیبت کیا آ پڑی ہے کہ یہ سب ادارے قائم کرتے پھر رہے ہیں۔ جبکہ آپ نے ان کی ریسرچ سے حاصل شدہ نتائج کو استعمال ہی کیا۔ پی سی ایس آئی آر (لیبارٹری) نے ایک پٹکولین (PETCOLEN) کے نام سے بنائی مگر کیا ہوا؟ اسے کوئی نہیں خریدتا۔ کیونکہ دلفریب نعروں اور چمک دار ناموں والی غیر ملکی درآمدات کے میدان میں یہ مقابلہ نہیں کر سکتی۔ آپ اس قسم کی حوصلہ افزائی کے لیے اس کی متبادل اشیاء کی درآمد پر کیوں پابندی عائد نہیں کرتے۔ آخر ان مصنوعات کی تیاری پر آپ سالانہ ڈھائی کروڑ روپے خرچ کرتے ہیں' آخر کس لیے۔"

جب میں نے اس قسم کی اشیاء کی کوالٹی اور معیار کے بارے میں اپنے شکوک کا اظہار کیا تو پروفیسر سلام بولے۔ "جہنم میں گئی کوالٹی جناب والا! جب لوگ اپنے ملک میں پیداوار بڑھانا چاہتے ہیں تو اس کی پرواہ نہیں کیا کرتے۔ روس کی طرف دیکھیں۔ کل میں اس کے بنائے ہوئے ہیلی کاپٹر میں سے ایک میں پرواز کر رہا تھا۔ اس کی ایک بھی کھڑکی ٹھیک طرح سے بند نہیں ہو رہی تھی (میں نے بھی اسی ہیلی کاپٹر میں سفر کیا تھا۔ کھڑکیوں کی رہی بات ایک طرف ملتان ائیرپورٹ پر تو ہیلی کاپٹر سٹارٹ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ مرتب) مگر کچھ بھی ہو وہ درآمد نہیں کریں گے۔ وہ کوالٹی کی فکر میں دبلے نہیں ہوتے کیونکہ یہی ایک ذریعہ ہے۔ واحد ذریعہ جس سے ہم اپنے وسائل کو ترقی دے سکتے ہیں۔"

قومی مقاصد کے حصول کے لیے اپنی طرف سے طے کردہ ترجیحات کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر سلام نے تعلیمی کورسوں میں طلباء کی حقیقت پسندانہ تقسیم کو سرفہرست رکھا۔ انہوں نے کہا کہ طلباء کی 60 فیصد تعداد کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم دی جائے جبکہ باقی 40 فیصد کورسز کی طرف جائیں۔

دوسرا انتہائی اہم میدان انہوں نے زراعت کو قرار دیا۔

"ہم اپنی روٹی تک کے لیے امریکہ کے محتاج ہیں اگر کل وہ ہم کو گندم دینا بند کر دیں تو ہم ان کا کیا کر لیں گے۔

میں جو دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ سائنسدانوں اور ٹیکنالوجی کے ماہروں کو سزائیں دی جائیں۔ اس وقت جب کہ وہ ایک طے شدہ معیار حاصل کرنے میں ناکام رہیں کہ ہمارا ملک عنقریب خوراک کے معاملے میں خود کفیل ہونے والا ہے لیکن انہوں نے اس کے لیے کیا کیا ہے؟"

روزنامہ دی نیشن لاہور کے نمائندہ سے گفتگو

مئی 1989ء میں بھائی جان ہندوستان گئے تھے- وہاں جانے سے پہلے انہوں نے لاہور میں میرے ہاں قیام کیا تھا۔ اس دوران روزنامہ دی نیشن لاہور کی محترمہ قدسیہ اخلاق نے ان کا انٹرویو لیا تھا جسے دی نیشن نے اپنی اشاعت مورخہ 26 مئی 1989ء کو شائع کیا تھا۔ اس انٹرویو کے دوران میں وہاں موجود تھا۔ اس انٹرویو کا ترجمہ یہاں دیا جا رہا ہے۔ ترجمہ۔ ملک مظفر احمد۔ ایم۔ ایس سی (فزکس) کراچی

”ڈاکٹر عبدالسلام پاکستان کی خاطر ٹریسٹ چھوڑنے کی خواہش رکھتے ہیں“

”ڈاکٹر عبدالسلام جیسی شخصیت کے بارے میں کیسے بیان کرنا شروع کیا جائے؟ آپ ایک امر ہیرو ہیں۔ آپ 1950ء سے کرسٹوفر کولمبس کی طرح کائنات کی بنیادی طاقتوں کا کھوج لگانے میں مصروف ہیں۔ آپ کا عظیم ترین کارنامہ Strong Interaction جو ایٹم کے مرکزے کو یکجا رکھتا ہے‘ کے انقلابی نظریے کے بارے میں ہے۔

1979ء میں ڈاکٹر عبدالسلام کو ”Grand Unified Theory“ پر طبیعات کا نوبل انعام پیش کیا گیا تھا۔ ریاضیاتی زبان میں یہ نظریہ بیان کرتا ہے کہ روشنی بشمول برقی مقناطیست کی دیگر اقسام اور کمزور طاقت (Weak Force) جو سورج میں جلنے کے عمل کو جاری کرتی ہے دونوں دراصل ایک ہی طاقت کے دو مختلف مظاہر ہیں۔

آپ آج کل عالمی مرکز برائے نظریاتی طبیعات واقع ٹریسٹ‘ اٹلی کے ڈائریکٹر ہیں یہ مرکز 1964ء میں قائم کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے 1960ء میں وی آنا میں منعقد ہونے والی انٹرنیشنل ایٹمی توانائی کانفرنس میں پاکستان کے نمائندہ کے طور پر اس مرکز کے قیام کی تجویز پیش کی تھی۔

آپ اپنے نظریاتی تحقیقی کاموں کے علاوہ بہت سا وقت انتظامی امور اور فنڈز کے حصول کے لیے کوششوں میں صرف کرتے ہیں۔ اس جدوجہد کا مقصد یہ ہے کہ غیر ترقی یافتہ ممالک اور ترقی یافتہ ممالک کے درمیان ٹیکنالوجی کا ایک پل تعمیر ہو سکے نیز غیر ترقی یافتہ ممالک سے ذہین سائنسدانوں کی ترقی یافتہ ممالک کی طرف ہجرت کو روکنا ہے۔

آپ تیسری دنیا میں سائنس کی افزائش کے لیے جہاد کرنے والے ایک پرجوش مجاہد ہیں۔ آپ نے 1983ء میں تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنسز قائم کی تھی۔ آپ مختلف محاذوں میں انتھک جدوجہد کر رہے ہیں۔ ایک مرتبہ کسی نے آپ کے بارے میں کیا خوب کہا تھا کہ ”آپ ایک کثیر القومی کارپوریشن کی طرح ہیں لیکن پھر بھی آپ ”موسم گرما“ کی جھیل کی مانند پرسکون رہتے ہیں۔“ حال ہی میں مجھے ڈاکٹر سلام سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور مجھے اس مبصر کی رائے کی موزوئیت کا اندازہ ہوا لیکن جس بات سے مجھے بہت دکھ ہوا وہ ڈاکٹر صاحب کی گرتی ہوئی صحت تھی۔ آپ کمزور اور عمر رسیدہ نظر آتے تھے۔ میں نے انہیں پہلی مرتبہ چھڑی کی مدد سے چلتے دیکھا۔

ڈاکٹر سلام ذہانت و ذکاوت سے مالامال ہونے کے ساتھ ایک بچے کا سا مخلص دل اور احساسات رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ جیسے عالی مرتبت اور پیارے وجود سے ملاقات کی سعادت حاصل کرنا ایک روح پرور تجربہ ہے۔

نوبل انعام پانے کے دس برس بعد یہ تریسٹھ سالہ عالی مقام ہستی جو بیمار ہے ابھی بھی اپنے وطن سے باہر ہے۔ وہ وطن جس کے شہری کے طور پر اس نے فخر کے ساتھ نوبل انعام حاصل کیا تھا۔ ملاقات کے دوران انہوں نے دکھ کے گہرے جذبے کے ساتھ فرمایا کہ میں ہمیشہ سے پاکستان واپس آنے کی خواہش رکھتا ہوں۔ میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میری خواہش یہ ہے کہ یہیں وفات پاؤں۔

”دی نیشن“ کے ساتھ اس تفصیلی انٹرویو میں ڈاکٹر سلام نے پاکستان میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی افسوسناک صورت حال پر روشنی ڈالی۔ آپ نے انڈیا کی ہتھیاروں کی ذخیرہ اندوزی کے نتیجے میں پاکستان پر پڑنے والے اثرات کا ذکر بھی کیا۔ پاکستان کو ہائی ٹیکنالوجی حاصل کر کے انقلابی ترقی کرنے کی ضرورت کے حوالے سے آپ نے سائنس اور ٹیکنالوجی پر زیادہ رقم خرچ کرنے پر بہت زور دیا۔

انٹرویو کے اختتام کے نزدیک ڈاکٹر سلام کے چند دوست آ گئے۔ (بھائی جان کے یہ دوست ائیر مارشل (رٹیائرڈ) ظفر چوہدری تھے۔ ناقل) کچھ دیر بعد انہوں نے دہلی روانہ ہونا تھا چنانچہ انہوں نے اپنے دوستوں سے مختصر گفتگو فرمائی اور پرانے اچھے وقتوں کی یاد تازہ کی۔ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ڈاکٹر سلام نے کہا۔ ”آئیں اب دعا کر لیں۔“(کسی بھی سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ابا جان اجتماعی دعا کرایا کرتے تھے اور یہی دستور جماعت احمدیہ میں بھی ہے اور یہ اب ہمارے اندر راسخ ہو چکی ہے۔ ناقل) ہم سب نے خاموشی سے دعا کی۔ میرے ذہن میں آیا کہ آپ نے کیا دعا کی ہو گی؟ کیا وہ کبھی پاکستان واپس آئیں گے؟ جس ولولے کے ساتھ میں انٹرویو کے لیے گئی تھی اس کے بغیر بوجھل دل کے ساتھ گھر واپس آئی۔ ان کی گرتی ہوئی صحت سامنے آتی تھی اور ان کے الفاظ ”میری ہمیشہ پاکستان واپس آنے کی تمنا رہی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہو سکے گا۔“ بار بار ذہن کے پردے پر ابھرتے رہے۔

قدسیہ اخلاق---- آپ کی ملاقات وزیراعظم (بے نظیر بھٹو۔ پہلا دور) اور اعلیٰ افسران سے ہو چکی ہے۔ کیا آپ اس نئے شروع ہونے والے جمہوری دور میں مثبت تبدیلیوں کی امید رکھتے ہیں۔

عبدالسلام---- فی الوقت میں کچھ زیادہ تو نہیں کہہ سکتا۔ اس مرحلے پر کچھ کہنا مشکل ہے کیونکہ معاملات ابھی ارتقاء پذیر ہیں البتہ اتنا ضرور ہے کہ سابقہ حکومت کے مقابلے میں رویے اور طریق کار میں نمایاں مثبت فرق ہے۔ عملاً بھی کچھ کیا جائے گا یہ دیکھنا باقی ہے۔

قدسیہ اخلاق---- پاکستان میں سائنسی ترقی کے لیے آپ نے حکومت کے سامنے کیا سفارشات رکھی ہیں؟

عبدالسلام نے چند تجاویز پیش کی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے زیادہ رقم مختص اور

خرچ کی جائے۔ ہمارے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے کہ اگلے پانچ سالوں میں اس مد میں موجودہ خرچ (جو GNP کا 0.2 فیصد ہے) کو بڑھا کر GNP کا 1 فیصد کر دیا جائے گا۔ یہ بڑی خوش کن بات ہے لیکن میں نہیں جانتا کہ یہ وعدہ پورا کیا جائے گا یا نہیں۔ میں نے پانچ سائنسی ادارے بنانے کی سفارش بھی کی ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ بات ان کے پروگرام میں شامل ہے۔ لیکن پروگرام میں صرف ایک ادارے کا ذکر پایا جاتا ہے۔ شروع میں میں بھی اس قسم کے ایک ہی ادارے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن بعد میں میں نے سوچا کہ اس طرح باقی صوبے ناراض ہوں گے۔ اور محسوس کریں گے کہ ان کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ اس لیے میں نے پانچ اداروں کے قیام کے بارے میں سوچا۔ یہ ادارے فطری ضرورت ہیں پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ اس قسم کے ادارے آل پاکستان بنیاد پر ہونے چاہئیں۔ اس کے ساتھ صوبوں میں بھی چیزیں بنی چاہیں مثلاً آپ پنجاب کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ یہ ایسی باتیں ہیں کہ ان کی تفصیلات میں جانا مناسب نہیں۔

قدسیہ اخلاق----پاکستان میں سائنسی ترقی میں رکاوٹ کی سب سے اہم وجہ کیا رہی ہے؟

عبدالسلام------ اس کی بنیادی وجہ یہاں لوگوں کا ہائی ٹیکنالوجی (یعنی آج کی سائنس پر مبنی جدید ٹیکنالوجی) کی طرف توجہ نہ کرنا ہے۔ ہماری توجہ ادنے درجے کی ٹیکنالوجی (ماضی کی ٹیکنالوجی) کی طرف جا رہی ہے۔ ہمارے کسی حکمران، سرمایہ کار، معیشت دان اور منصوبہ ساز نے جدید ترین ٹیکنالوجی کے بارے میں نہیں سوچا۔ اس قسم کی ٹیکنالوجی میں مائکرو الیکٹرانکس، مائکرو فوٹانکس، فائبر آپٹکس اور مستقبل کی بائیو ٹیکنالوجی شامل ہیں۔

قدسیہ اخلاق----- آپ نے اپنی کتاب میں معاشرے کے ان پانچ طبقات کا ذکر فرمایا ہے جو ایک ترقی پذیر ملک میں سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے میدان میں ترقی کے لیے ممدو معاون ہوئے ہیں یعنی حکمران، منصوبہ ساز، ماہرین تعلیم، مذہبی لیڈر اور سائنس دان و ماہرین ٹیکنالوجی۔ اس حوالے سے آپ کی رائے میں پاکستان میں ان میں سے کون سا طبقہ اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں سب سے زیادہ ناکام رہا ہے؟

عبدالسلام----- ان میں سب سے اہم کردار حکمران کا ہوتا ہے اور پاکستان میں سائنس کے حوالے سے حکمران سب سے زیادہ ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ بدقسمتی سے اس معاملے میں سیاسی طور پر ذمہ داری ادا کرنے کا مکمل طور پر فقدان رہا ہے۔

قدسیہ اخلاق----- اب تک کون سا پاکستانی سربراہ آپ کی سائنسی مساعی میں سب سے زیادہ حوصلہ افزائی کرنے والا ثابت ہوا ہے؟

عبدالسلام----- ایوب خان سائنس اور ٹیکنالوجی کی بجائے مجھ میں بحیثیت سائنس دان زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ یحییٰ خان کو سائنسی امور میں قطعا" کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بھٹو صاحب شروع میں خصوصی توجہ رکھتے تھے لیکن بعد میں ان کی دلچسپی ختم ہو گئی۔ پھر ضیاء الحق کا دور آیا وہ مکمل فراڈ تھے۔ جب بھی میں ان سے

ملا انہوں نے ہر مرتبہ لمبے چوڑے وعدے کیے لیکن کبھی ان کو عملی شکل نہ دی۔ اب بے نظیر آئی ہیں۔ ان کے ارادے تو نیک معلوم ہوتے ہیں کیونکہ انہوں نے وعدے بہت کیے ہیں۔ دیکھیے کہ عملاً کیا ہوتا ہے۔

قدسیہ اخلاق------ آپ کے خیال میں پاکستان میں پرائیوٹ سیکٹر سائنس کی ترقی کے لیے کیا کردار ادا کر سکتا ہے؟

عبدالسلام------ اس ضمن میں پرائیوٹ سیکٹر بہت اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ مثلاً اگر وہ چاہئیں تو Bulk Chemicals کے بجائے فائبر کیمیکلز کے میدان میں آ سکتے ہیں۔ اس مرتبہ میں اپنے ساتھ لندن سے ایک دوست ڈاکٹر افتخار صاحب کو لایا ہوں۔ وہ ہائی ٹیکنالوجی میں سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ یہاں کے سرمایہ کاروں سے ملیں۔ وہ آج کل تائیوان میں کام کر رہے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ وہ وہاں کیوں کام کرتے ہیں۔ ان کو اپنے وطن میں سرمایہ کاری کرنا چاہیے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ پاکستان میں بیوروکریسی بہت مضبوط ہے اور اس کو بدلنا بھی ایک دشوار کام ہے۔

قدسیہ اخلاق------ انڈیا نے دفاع کے میدان میں نیوکلیر سائنس کو بڑی کامیابی سے استعمال کیا ہے۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

عبدالسلام------ (اس قسم کی) نیوکلیر سائنس ایک بے کار چیز ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس سے ملک میں خوشحالی پیدا ہو جائے۔

قدسیہ اخلاق------ انڈیا کے ساتھ ہمارے غیر دوستانہ تعلقات کے مدنظر کیا ہم اپنے دفاعی بجٹ میں کمی کر سکتے ہیں۔

عبدالسلام------ نہیں۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ مشکل یہ ہے کہ انڈیا نے اس معاملے میں ہمیں نہایت غیر متوازن کر دیا ہے۔ انڈیا کی وجہ سے آج ہم اپنی GNP کا 7 فیصد دفاع پر خرچ کر رہے ہیں۔ انڈیا کے دورے میں میں یہی بات کروں گا کہ مجھے علم نہیں کہ آپ نے اپنے حق میں اچھا کیا ہے یا نہیں لیکن اپنے جارحانہ اقدامات سے آپ نے پاکستان کے لیے شدید مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ میں انڈیا جا رہا ہوں اور امید ہے کہ راجیو گاندھی سے ملاقات ہو گی اور ان سے یہ بات کہنے کا موقع ملے گا۔

قدسیہ اخلاق----- انڈیا سائنسی کامیابیوں میں اتنا آگے کیسے نکل گیا ہے؟ آپ کی رائے میں ہندوستان اور پاکستانیوں کے رویوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے معاملے میں کیا فرق ہے۔

عبدالسلام------ انڈیا کو یہ برتری ہے کہ ان کے پاس سائنس اور ٹیکنالوجی میں خصوصی دلچسپی لینے والا لیڈر نہرو تھا۔ اس نے اس معاملے میں بہت مثبت رویہ اختیار کیا اور صحیح لوگ تعینات کیے۔ اس نے فوراً تجربہ گاہیں بنوائیں۔ 1960ء سے ہی وہاں یہ طریقہ کار رہا ہے اور اب وہ لوگ اپنی GNP کا 0.9 فیصد خرچ کر رہے ہیں جو کہ یونیسکو کے دیئے ہوئے ٹارگٹ کا تقریباً 1 فیصد ہے اور یہ ایک بہت اچھی بات

ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان نے ابتداء سے ہی سائنس کے ساتھ غیر دوستانہ رویہ اپنا رکھا ہے۔ ہم سائنسی ذہنیت رکھنے والے لوگ نہیں ہیں۔ اسی لیے ہم ترقی کے میدانوں میں کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں کر سکے۔ نہ ہم ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ ایک بنیادی بات یہ ہے کہ انڈین کردار پاکستانی کردار کی نسبت غربت کے ساتھ آسانی سے سمجھوتہ کرلیتا ہے۔ ہندوستانی کم معاوضے پر کام کرلیتے ہیں لیکن ہم ایسا نہیں کرتے۔ ہمارا رویہ غلط ہے۔ ہم "صاحب" قسم کے لوگ ہیں۔

قدسیہ اخلاق------ جنوب اور اسلامی ممالک کے سائنس اور ٹیکنالوجی میں پیچھے رہ جانے کی کیا وجہ ہے؟

عبدالسلام----- تین وجوہات کے باعث اسلامی دنیا اور تیسری دنیا کے ممالک سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی نہیں کر سکے۔ وہ وجوہات یہ ہیں۔

(1) (الف) بنیادی اور اطلاقی سائنس کے لیے مضبوط ارادے کی کمی۔
(ب) ٹیکنالوجی میں خود کفالت کے لیے عظم صمیم موجود نہیں۔

(2) قواعد اور ضوابط کے ڈھانچے کا نہ ہونا۔

(3) سائنسی ادارے چلائے جانے کا انداز

سائنسی کامیابیاں بلند و بالا شخصیات کی وجہ سے ہوئی ہیں۔ کسی بھی سرگرم سائنسی ادارے کو سائنسدانوں کو ہی چلانا چاہیے نہ کہ بیوروکریٹس کو اور نہ ہی ان سائنسدانوں کو جو ماضی میں فعال تھے اور اب جن پر جمود طاری ہے۔ سائنس ترقی کرتی ہے۔ تنقید اور مخالفانہ نظریہ کو برداشت کرنے سے۔ ہماری سوسائٹیوں میں ان باتوں کی کماحقہ حفاظت نہیں کی گئی۔

قدسیہ اخلاق---- پاکستان واپس آنے کے بارے میں آپ کا کیا ارادہ ہے؟

عبدالسلام----- میں نے تو ہمیشہ سے یہی چاہا ہے۔ اب میں عمر رسیدہ ہوں۔ میری تو خواہش ہے کہ میری جان اپنے ملک میں نکلے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ کوئی اپنے وطن سے باہر کیوں رہے۔ 1979ء تک میں ملک سے باہر رہا کیونکہ نوبل انعام کا حصول ایک اہم مقصد تھا۔ اس کے لیے متعلقہ تحقیق ملک سے باہر ہی ہو سکتی تھی۔ یہاں اس کے لیے ماحول ہی نہیں ہے۔ اب تو میں واپسی کی ہی تمنا رکھتا ہوں۔

قدسیہ اخلاق---- اگر حکومت پاکستان ایک سائنسی ادارہ بنا کر آپ کی خدمات حاصل کرنا چاہے تو کیا آپ اس کی خاطر اٹلی میں اپنا باوقار ادارہ چھوڑ دیں گے؟

عبدالسلام----- میں سب کچھ چھوڑ دوں گا۔ پاکستان واپس آنا میرے لیے نہایت اہم ہے۔ میں ٹریسٹ میں موجودہ ادارے جیسے تین مزید ادارے قائم کرنے میں کوشاں ہوں۔ یہ بہت اہم کام ہے لیکن اس کے لیے انتظار کیا جا سکتا ہے یا دوسرے لوگ انہیں بنوا سکتے ہیں لیکن میں یہ بلا تکلف کہنا چاہوں گا کہ میں شاید کبھی بھی واپس نہیں آسکوں گا۔

قدسیہ اخلاق---- آپ کو اعلیٰ ترین اعزازت اور مرابت حاصل ہو چکے ہیں کیا کوئی ایسی تمنا یا خواہش ہے جو پوری نہ ہوئی ہو؟

عبدالسلام----- میری دو تمنائیں ایسی ہیں جو پوری نہیں ہو سکیں۔ ایک تو یہ کہ میں اسلام کی خدمت نہیں کر سکا اور دوسری یہ کہ اپنے پاکستان کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ افسوس کہ مجھے اس کا موقع نہیں ملا۔
(سب کچھ کرنے کے بعد بھی کچھ نہ کر سکنے کا احساس دراصل شان آنحضرت ﷺ کا ایک جزو ہے انہیں اپنے آقا ﷺ کی غلامی میں یہ کامل انکسار حاصل تھا۔ آپ عالم اسلام، غریب اور پسماندہ ممالک اور پاکستان میں سائنس کی ترقی میں دن رات مصروف رہے۔ پاکستان میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے جتنا کام انہوں نے کیا شاید ہی کسی نے کیا ہو یا آئندہ کرے-----مترجم)
قدسیہ اخلاق----- کیا آپ اپنی Theory of Unification پر تحقیق جاری رکھے ہوئے ہیں؟
عبدالسلام----- جی ہاں۔ یہ تحقیق تو میری زندگی کا جزو ہے اور یہ جاری ہے۔ یہ نظریہ دن بدن پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا جا رہا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ بہت سے نوجوان سائنس دان۔ خصوصا" امریکن اس پر کام کر رہے ہیں۔ ان میں ایک ایرانی جن کا نام وفا ہے۔ اعلیٰ مقام پر پہنچے ہیں۔ وہ ہارورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ وہ اس نظریہ پر خوب کام کر رہے ہیں لیکن اس پر کوئی پاکستانی کام نہیں کر رہا۔
قدسیہ اخلاق----- کیا آپ کسی پاکستانی سائنس دان میں اس قسم کی قابلیت دیکھتے ہیں؟
عبدالسلام----- امریکہ میں چند ایک ایسے ہیں لیکن پاکستانی عام طور انڈین، ایرانیوں اور دوسروں کی نسبت عملی قسم کے کام کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ عملیت پسندی کے مثبت پہلو بھی ہیں اور منفی بھی۔ یہ اچھی چیز ہے کہ قوم کو اس سے مدد ملے گی لیکن ساتھ ہی یہ سائنس کی ترقی کو دھیما کر دیتی ہے۔
قدسیہ اخلاق----- آپ اپنی کامیابیوں کو کس سے منسوب کرتے ہیں؟
عبدالسلام----- سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ محض اللہ تعالی کا فضل و احسان ہے۔ دوسری بات اس مقام کی خاطر مسلسل جدوجہد ہے۔ تیسری بات موروثی اثرات ہیں اور آخری بات یہ کہ میرے والد محترم کا مجھ پر بڑا اثر رہا ہے انہوں نے میری تعلیمی ترقی پر بڑی گہری نظر رکھی۔ وہ میری کامیابیوں کے لیے اللہ تعالی کے حضور عاجزانہ دعائیں کرتے رہتے تھے۔ میں بھی دعاؤں کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔
قدسیہ اخلاق----- آپ نے زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت کس چیز کو دی ہے؟
عبدالسلام------ پہلے تو صرف سائنسی تھی۔ اب دو باتیں ہیں۔ سائنس اور اس کے علاوہ پاکستانیوں اور اسلامی ممالک کو سائنس کے میدان میں داخل کرنا لیکن جلد ایسا ہوتا نظر نہیں آتا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ مستقبل میں یہ بھی ہوتا نظر نہیں آ رہا۔
قدسیہ اخلاق----- اس معاملے میں آپ کچھ مایوس نظر آتے ہیں
عبدالسلام----- جب کسی کو مستقل طور پر مسائل کا سامنا ہو تو مایوسی ایک طبعی امر ہے۔ مایوسی کے حوالے سے مجھے کسی نے یاد دلایا کہ ایک مرتبہ جب میں اسلام آباد میں لیکچر دے رہا تھا تو ایک آدمی کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا "آپ نے 1964ء میں تیسری دنیا کے بارے میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا "آپ کس طرح پر امید ہو سکتے ہیں" اتنے سالوں تک جدوجہد کرنے کے بعد آپ اب بھی کس طرح پر امید رہ سکتے

ہیں؟ آپ نے آج بھی ہمیں امید ہی کا پیغام دیا ہے۔"

پس امید قائم رکھنا بڑی اہم بات ہے۔ حال ہی میں مجھے آنحضرت ﷺ کے واقعہ طائف کی یاد دلائی گئی ہے۔ طائف میں آپ ﷺ پر پتھر برسائے گئے لیکن آپ ﷺ نے امید کا دامن نہ چھوڑا۔ ناامید ہونے کے بجائے آپ ﷺ نے دعا کی کہ اے اللہ یہ قوم میری بات نہیں سمجھتی تو ان کو ہدایت عطا کر۔ پس میں بھی اس اسوہ کی پیروی میں اس معاملہ کے بارے میں سوچتا ہوں۔

قدسیہ اخلاق----- ان نوجوانوں کے لیے آپ کا کیا پیغام ہے جو عظیم سائنس دان بننا چاہتے ہیں۔

عبدالسلام----- پیغام یہ ہے کہ انہیں حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے اور سائنس کو ہر ممکن طریقے سے حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اس میں ترقی کریں۔ انشاء اللہ ایک دن آئے گا کہ پاکستان کو ان کی ضرورت ہو گی۔ میں زور دے کر عرض کر رہا ہوں کہ "ایک دن ضرور آئے گا"

قدسیہ اخلاق------ آپ کے بچوں میں کوئی سائنس کی طرف رجحان رکھتا ہے؟

عبدالسلام------ جی ہاں! میرا چھوٹا لڑکا جو پندرہ سال کا ہے وہ ابھی کالج میں پڑھ رہا ہے۔ وہ بہت ذہین ہے۔ مجھے یاد ہے (اس موقع پر ڈاکٹر صاحب ہنسے) جب میں اس کو نوبل انعام کی تقریب میں لے گیا (وہ اس وقت پانچ سال کا تھا) تو اس نے کہا کہ اب مجھے تو ایک بڑا مسئلہ درپیش ہو گیا ہے وہ یہ کہ میں نوبل انعام فزکس میں لوں یا بیالوجی میں!

(بھائی جان کے چھوٹے بیٹے عمر سلام نے سینٹ جونز کالج کیمبرج سے ٹرائی پوز کیا ہے اور وہ بھی اپنے والد کی طرح ریلنگلر (Wranglar) ہے یعنی اس نے ریاضی کی ڈگری فرسٹ کلاس میں حاصل کی اور اب وہ ریاضی اطلاقی (Pure) میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہا ہے۔ مرتب)

قدسیہ اخلاق----- اب جیسا کہ آپ واپس جا رہے ہیں کیا آپ اپنے گذشتہ دورے کے مقابلے میں زیادہ پر امید ہیں؟

عبدالسلام----- سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس مرتبہ نسبتاً" کم پر امید ہوں۔

قدسیہ اخلاق------ اس کی کیا وجہ ہے؟

عبدالسلام------ جو وعدے کیے گئے ہیں مجھے ان کی فکر ہے مثلاً سائنس انسٹی ٹیوٹ بنانے کا وعدہ۔ اب امید ہے کہ یہ بن جائے گا کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ امید ہی رکھی جا سکتی ہے۔

قدسیہ اخلاق------ آخر میں آپ کیا کہنا پسند فرمائیں گے؟

عبدالسلام------ آخری بات کے طور پر میں قرآن پاک سے حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ مارما ڈیوک پکتال (Marma Duke Pickthall) کہتا ہے کہ یہ وہ کتاب ہے کہ جس کی تلاوت کی آواز "انسانوں کے آنسو جاری کر دیتی ہے اور ان کو عظیم روحانی لذت عطا کرتی ہے۔" ہر دوسری چیز سے زیادہ جو میرے علم میں ہے' یہ کتاب ایسے لازوال عجائب کو بیان کرتی ہے جو میں ذاتی طور پر اپنی سائنس میں مشاہدہ کر چکا ہوں۔"

"اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں ان کی قلمیں بن جائیں اور سمندر سیاہی سے بھرا ہوا ہو اس طرح کہ سات اور سیاہی کے سمندر اس میں ملا دیئے جائیں تو بھی اللہ کے کلمات (نشانات) ختم نہیں ہوں گے۔ اللہ یقیناً" غالب (اور) بڑی حکمتوں والا ہے۔" سورہ لقمن (31:27)

نوبل انعام یافتہ سائنس دان ڈاکٹر عبدالسلام سے ایک گفتگو

تحریر اسد اللہ غالب

اسد اللہ غالب کی مندرجہ ذیل تحریر نوائے وقت مورخہ 16 جون 1989ء میں شائع ہوئی تھی۔ 20 مئی 1989ء کو نیپال کے دالخلافہ کھٹمنڈو سے پی آئی اے کے جہاز سے کراچی پرواز کرتے ہوئے یہ انٹرویز لیا گیا تھا۔

"آپ نے اپنے آپ کو تباہ کیا ہے یا نہیں پاکستان کو تو تباہ کر دیا۔"

"اگنی میزائل چلانے پر ڈاکٹر عبدالسلام کی بھارتی سائنس دانوں سے گفتگو۔

پرواز پی کے 269 مئی کی 20 تاریخ تھی۔ تری بھون انٹرنیشنل ایئرپورٹ کھٹمنڈو سے اڑے ہوئے ایک گھنٹہ گزرا ہو گا کہ میں نے سٹیورڈ کال کا بلب روشن کر دیا۔ عام طور پر پی آئی اے کے فلائٹ سٹیورڈ اس کال پر بہت کم ہی دھیان دیتے ہیں تاہم کھانے کے برتن سمیٹتے ہوئے ایک نوجوان میری طرف متوجہ ہو ہی گیا۔ "فرمایئے!" اس نے پوچھا۔ اس سے قبل کہ وہ حسب عادت کال بلب آف کر کے آگے روانہ ہو جاتا۔ میں نے کہا۔ "فرسٹ کلاس میں ڈاکٹر عبدالسلام بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ ان تک میرا کارڈ پہنچا دیجیے!" وہ صاحب میرا کارڈ لے کر آگے چلے گئے اور واپس آتے ہوئے انہوں نے مجھے اشارے سے کہا۔ "جایئے ڈاکٹر صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔" فرسٹ کلاس میں بائیں ہاتھ دوسری ڈبل سیٹ پر ڈاکٹر صاحب تنہا بیٹھے تھے۔ میں نے ان کو تین سال قبل اسی طرح اتفاقیہ طور پر کوالالمپور (ملائیشا) میں دیکھا تھا جہاں وہ ایک لیکچر دینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ تین سال کے دوران ڈاکٹر صاحب بہت بدلے بدلے دکھائی دیتے تھے۔ شاید عمر اور ضعیفی اپنے اثرات مرتب کر رہی تھی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے انٹرویو کی خواہش کی اور وہ آمادہ ہو گئے۔ کہنے لگے۔ "بہتر ہو گا کہ ٹیپ کر لو۔ لکھنے میں دشواری ہو گی۔" میرے دستی سامان میں چھوٹا کارڈ سائز ٹیپ ریکارڈ تو موجود تھا لیکن پی آئی اے والے بیڑی سیل جہاز میں ساتھ نہیں رکھنے دیتے۔ کھٹمنڈو ایئرپورٹ پر سیکورٹی چیکنگ کے دوران ٹیپ ریکارڈ اور کیمرے کو خاص طور پر کھلوا کر دیکھا گیا' اس کے بعد جہاز کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کمانڈو ٹائپ کے دو قوی الجثہ اصحاب نے ہر مسافر کی دوبارہ تلاشی لی تھی۔ اس کے باوجود ایک غیر ملکی خاتون مسافر بڑے مزے سے جہاز پر سوار ہونے والے مسافروں کی تصاویر بنا رہی تھی اور جہاز کے اندر وہ میری اگلی نشست پر بیٹھی تو اس نے شیشیوں کے اندر سے ہمالیہ کی چوٹیوں کی تصویر کشی جاری رکھی۔ میں نے ڈاکٹر

صاحب سے کہا میں اس خاتون سے بیڑی سیل مانگنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں اپنی نشست کی طرف واپس آیا تو اس اثنا میں وہ خاتون سیٹ پر اونگھ رہی تھی۔ مجھے ایک قریبی نشست پر ایک اور غیر ملکی نوجوان سیٹریو کیسٹ پلیر پر گانے سنتے نظر آیا۔ میں نے اس سے اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے بیٹری سیل مانگے تو اس نے کہا! ”لیکن یہ تو میرے بیٹری سیل ہیں۔“ میں نے کہا ”مجھے اس سے انکار کب ہے لیکن کچھ دیر کے لیے عاریتاً" دے دیجئے۔“ اس نے سنی ان سنی کر دی اور سیٹ کو تھوڑا سا اور لٹاتے ہوئے گانوں کی دنیا میں مست ہو گیا۔ میں نے ادھر سے بھی مایوس ہو کر پی آئی اے کے عملے سے رجوع کیا۔ عام طور پر یہ لوگ مسافروں کے دستی سامان یعنی کیمروں وغیرہ سے سیل نکلوا کر اپنے پاس رکھ لیتے ہیں لیکن انہوں نے بھی میری درخواست کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ آخر میں خالی ٹیپ ریکارڈر لیے واپس ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچا۔ انہیں ساری بپتا سنائی اور کاغذ قلم سنبھال کر گفتگو شروع کی۔ جہاز کے عملے کے ایک رکن جو بڑی دیر سے میری بے چارگی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ میرے پاس آئے ان کے پاس مطلوبہ بیڑی سیل موجود تھے۔ ”یہ لیجئے صرف ڈاکٹر صاحب کی خاطر آپ کو دے رہا ہوں ورنہ ہمیں سخت احکامات ہیں۔“ میں بھنا کر رہ گیا۔ ان کے سخت احکامات صرف پاکستانی مسافروں کے لیے ہی ہیں' نہ انہیں کسی خاتون کے پاس کیمرہ نظر آیا ہے اور نہ گانوں کا مزہ لوٹنے والے بے فکرے نوجوان مسافر دکھائی دیتے ہیں۔ پی آئی اے کی دست درازی کی انتہا یہ ہے کہ کراچی ایئر پورٹ پر لاہور کے لیے جہاز بدلتے وقت سیکورٹی چیک کے دوران اے ایس ایف کے عملے نے زبردستی میرا دستی کیمرہ' جس میں آدھی سے زیادہ ایکسپوز فلم موجود تھی لیکن سیل بہرحال نہیں تھے' چیکنگ مشین کے اندر سے گزار دیا اور شاعوں نے میری تمام یادگاری تصویریں خراب کر کے رکھ دیں۔ اے-ایس-ایف کے ہاتھوں اخبار نویسوں کو آئے روز ایسی ہی خجالت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہرحال کھٹمنڈو سے کراچی آنے والی فلائٹ کے عملے کی عارضی ڈھیل کی وجہ سے مجھے بیٹری سیل مل چکے تھے اور سفر کا بقیہ ڈیڑھ گھنٹہ بھی میں نے فرسٹ کلاس میں گزارا۔ ڈاکٹر صاحب سے باتیں کرتے ہوئے وقت کا احساس تب ہوا جب کراچی ایئر پورٹ پر مسافروں کے اترنے کے لیے سیڑھی لگ چکی تھی۔ ڈاکٹر صاحب دوران گفتگو دھیمے لہجے میں بول رہے تھے۔ مجھے ٹیپ ریکارڈ ان کے ہونٹوں کے قریب کرنا پڑا۔ اس پر مستزاد جہاز کے جیٹ انجنوں کا شور اور اوپر سے ڈاکٹر صاحب ”کھلی“ باتیں کرنے کے لیے پنجابی میں بولنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب سے میرا پہلا سوال یہ تھا کہ مغربی ممالک کے مقابلے میں عالم اسلام کی سائنسی میدان میں پسماندگی کی وجہ کیا ہے۔ کہنے لگے ”قرآن کا بڑا حصہ کائنات کے اسرار و رموز پر تفکر کی ضرورت و اہمیت کے لیے وقف ہے لیکن علمائے دین اس بات کو اجاگر کرنے میں ناکام رہے ہیں اور ان کے پند و نصائح کا زیادہ زور فروعی اور غیر ضروری امور پر ہے اور وہ قرآنی اور اسلامی تعلیمات کی روح کا ساتھ نہیں دیتے۔ کاش! مہینے میں جمعے کے چار خطبوں میں سے ایک خطبہ ہی قرآنی اور اسلامی تعلیمات کے اس حصے کو اجاگر کرنے کے لیے وقف کر دیا جائے۔“ میں نے اگلا سوال

پوچھا۔ ”ڈاکٹر صاحب! اس کے باوجود عالم اسلام کے بعض ممالک انتہائی سنجیدگی سے سائنسی تحقیقات میں مصروف ہیں۔ کیا اس سے حوصلہ افزا صورت حال سامنے نہیں آئی اور کیا یہ آئندہ کے لیے خوش گوار توقعات کی بنیاد نہیں بن سکتی؟“ میرے سوال کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے وضاحت سے بتایا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے اصل مراد کیا ہے اعلیٰ اور کم تر ٹیکنالوجی میں کیا فرق ہے اور کون سے ملک اعلیٰ ٹیکنالوجی کے میدان میں تیزی سے ترقی کر رہے ہیں اور ان کے مقابلے میں کون سے ملک کم تر ٹیکنالوجی کو ہی اپنی ترقی کی معراج تصور کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ حالیہ دورے میں وہ پاکستان' بھارت 'بنگلہ دیش' سری لنکا اور نیپال کے رہنماؤں سے ملے ہیں اور وزیراعظم بے نظیر بھٹو' وزیراعظم راجیو گاندھی' صدر حسین محمد ارشاد' صدر پریما داسا اور شاہ بریندرا سے انہوں نے ایک ہی بات کی ہے کہ ترقی یافتہ دنیا کا مقابلہ کرنے کے لیے اعلیٰ ٹیکنالوجی کی طرف بھی توجہ دی جائے۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ تیسری دنیا کے غریب اور ترقی پذیر ممالک اپنی مجموعی قومی پیداوار کا 5.6 فیصد دفاع پر خرچ کرتے ہیں اور دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کا دفاع پر خرچ بھی تقریباً اتنا ہی لیکن ترقی پذیر ممالک کا خرچ تعلیم کے شعبے میں جی این پی کا 3.7 فیصد' صحت کے شعبے میں 1.14 فیصد اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبے 0.2 فیصد ہے جبکہ ترقی یافتہ ممالک تعلیم کے شعبے پر 5.1 فیصد' صحت کے شعبے پر 4.8 فیصد اور 2.5 فیصد ہے اور ٹیکنالوجی کے شعبے پر خرچ کر رہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو جانا چاہیے کہ تعلیم اور سائنس و ٹیکنالوجی کو مجموعی طور پر ترقی پذیر ممالک کس ترجیح پر رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک کو سائنس اور ٹیکنالوجی پر زیادہ بجٹ مختص کرنا چاہیے اور فزکس' کیمسٹری' ریاضی' بیالوجی اور میڈیکل سائنس وہ پانچ بنیادی علوم ہیں جو سائنس اور ٹیکنالوجی کے زمرے میں آسکتے ہیں اور اعلیٰ ٹیکنالوجی میں ترقی کیے بغیر کوئی ملک اپنی اقتصادیات کو بہتر نہیں بنا سکتا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک بار اعداد و شمار کی مدد لیتے ہوئے بتایا کہ مواصلاتی سائنس' مائیکرو پروسیسر اور بائیو ٹیکنالوجی کا امریکہ اور جاپان کی جی این پی میں حصہ 30 فیصد اور دیگر یورپی ممالک کی جی این پی میں حصہ ۲۰ فیصد ہے۔ فزکس میں نوبل انعام حاصل کرنے والے پاکستانی سائنس دان سے میرا اگلا سوال تھا۔ ”ڈاکٹر صاحب آپ بجا طور پر سمجھتے ہیں کہ پاکستان سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں بہت پیچھے ہے اور اس شعبے میں عمومی پیش رفت کے لیے کوئی دلچسپی اور سرگرمی بھی نظر نہیں آتی لیکن اگر میں آپ سے یہ پوچھوں کہ یہی پاکستان ایٹم بم بنانے کی تحقیقات میں مصروف ہے تو آپ کا تبصرہ کیا ہو گا۔“ ڈاکٹر پروفیسر عبدالسلام نے اس سوال کا جواب تو دیا لیکن انہوں نے ٹیپ ریکارڈر بند کرنے کی ہدایت کی اور پوری بات کہہ کر اسے آف دی ریکارڈ قرار دے دیے۔ مجھے اپنے قاری کی ذہانت پر اعتماد ہے کہ وہ اصل مطلب آسانی سے سمجھ جائے گا۔ قدرتی طور پر میرا اگلا سوال بھارت کے متعلق تھا جہاں ایٹمی تحقیقات کے درجنوں ادارے ہیں۔ ایٹم بم کا تجربہ کیا جا چکا ہے اور اس گفتگو کے روز یعنی 20 مئی کو

بھارت اگنی میزائل چلانے کی تیسری کوشش کر رہا تھا۔ پہلے تو ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ کر میری معلومات میں اضافہ کیا اور مجھے یہ خبر دی کہ اگنی میزائل فائر کیا جا چکا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ان کی معلومات کی بنیاد وہ بھارتی سائنس دان ہیں جو کٹھمنڈو میں سمر کالج کی افتتاحی تقریب میں شریک تھے اور انہوں نے بھی پوچھا کہ میرا اس پر تبصرہ کیا ہے جس پر ڈاکٹر صاحب نے ان بھارتی سائنس دانوں کو جواب دیا کہ ”اب آپ مجھ سے مبارک باد وصول کرنا چاہتے ہیں جبکہ آپ نے اپنے آپ کو تباہ کیا ہے یا نہیں پاکستان کو تو تباہ کر دیا ہے۔ قدرتی طور پر اس خطے میں اب ایک نئی دوڑ شروع ہو جائے گی اور میزائلوں پر بے اندازہ اخراجات ہونے لگیں گے۔ پاکستان کے لیے ان کا متحمل ہونا مشکل ہے اور یہ اخراجات قوم یا ملک کی اصل قوت میں اضافہ بھی نہیں کرتے۔“ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ بھارتی سائنس دانوں نے تسلیم کیا کہ وہ جی این پی کا سات فیصد دفاع پر خرچ کرتے ہیں جس پر ڈاکٹر صاحب نے تبصرہ کیا کہ ”آپ لوگ اس طرح ہمیں تباہ کر رہے ہیں۔ اس کے جواب میں ہمیں بھی دفاع جیسے غیر پیداواری شعبے پر اخراجات بڑھانے ہوں گے۔“ بھارتی سائنس دانوں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔ ”دفاع پر اخراجات کی دوڑ شروع کرنے کی ذمہ داری بھارت کی ہے یا پاکستان پر عائد ہوتی ہے؟“ ڈاکٹر صاحب کے بقول ان کا جواب تھا۔ ”ہم پاکستانیوں کے نزدیک اس کے ذمہ دار آپ لوگ ہیں۔ بھارت نے مشرقی پاکستان میں جو کردار ادا کیا‘ اسے ہم فراموش نہیں کر سکتے۔“ اس پر بھارتی سائنس دان خاموش ہو کر رہ گئے۔ ڈاکٹر صاحب یہ بیان کر چکے تو میں نے اپنے سوال کی طرف متوجہ کرتے ہوئے پوچھا کہ ”آخر بھارت چاہتا کیا ہے؟ وہ اپنا اسلحہ خانہ کیوں بھر رہا ہے؟“ ڈاکٹر صاحب نے کسی توقف کے بغیر کہا کہ ”وہ اس خطے پر بالا دستی اور تسلط قائم کرنا چاہتا ہے۔ آپ نیپال سے ہو کر آ رہے ہیں اور آپ نے دیکھ لیا ہے کہ بھارت اس ملک کے ساتھ کیا کر رہا ہے۔ اس سے پہلے سری لنکا میں اس نے جو کچھ کیا‘ وہ ساری دنیا کے سامنے ہے۔ بھارت کے ارادوں سے کون آگاہ نہیں؟“---- میرا اگلا سوال تھا۔ ”ڈاکٹر صاحب! آپ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں روس اور امریکہ کا موازنہ کیسے کریں گے۔“ انہوں نے کہا۔ ”روس اب تک تو کم تر ٹیکنالوجی پر توجہ دیتا رہا۔ آئندہ اس نے اعلیٰ ٹیکنالوجی کی طرف دھیان دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ امریکہ تو اعلیٰ ٹیکنالوجی کے میدان میں بہت آگے ہے اور جاپان تو اس کا بھی استاد نکلا اور کوریا بھی آگے جا رہا ہے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔ ”اگر آپ کو وطن واپس آنے کا موقع ملے تو پاکستان کو سائنسی افق پر ابھارنے کے لیے آپ کی ترجیحات کیا ہوں گی!“ ڈاکٹر صاحب نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔ ”مجھے کون واپس آنے دیتا ہے‘ ہر کوئی میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ بہرحال پاکستان کی خدمت کرنا میرے لیے افتخار کا باعث ہو گا اور میری کوشش ہو گی کہ ملک کو اعلیٰ ٹیکنالوجی کے راستے پر ترقی دوں۔“ میں نے پوچھا۔ ”ڈاکٹر صاحب! آپ کا ٹریسٹ اٹلی کا انسٹیٹیوٹ کیا خدمات ادا کر رہا ہے۔“ انہوں نے کہا کہ ”اس میں دنیا بھر سے سائنس میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حامل افراد آتے ہیں۔ پاکستان سے بھی آتے ہیں‘ ایرانی بہت آتے ہیں‘ بغداد سے

بھی سائنس دان آ رہے ہیں۔ افریقہ کے سائنس دان بھی اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔" میں نے ڈاکٹر صاحب سے ایک بنیادی سوال پوچھا کہ "جب سے ایک سائنس دان نے ایٹم بم ایجاد کیا ہے تو یہ بحث چل رہی ہے کہ سائنس انسانیت کی فلاح اور بقا کی بجائے اس کی تخریب اور خاتمے کا سامان کر رہی ہے۔ آپ اس بحث میں کس طرف ہیں۔" ڈاکٹر صاحب نے ایک لمبا سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ "آپ ایٹم بم والے مسئلے کو چھوڑ دیں۔ باقی ہر میدان میں سائنس اور ٹیکنالوجی نے انسان کی خدمت کی ہے اور زندگی کو آرام دہ بنا دیا ہے۔ یہ سائنس کا کمال ہے کہ میرا ایک خطرناک آپریشن ہوا' میں اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اگر سائنسی ترقی نہ ہوئی ہوتی تو میں مرچکا ہوتا لیکن خدا نے انسان کو جو عقل عطا کی ہے اس نے مجھے نئی زندگی بخشی ہے۔" میں نے پوچھا۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ یہ کیوں کہتے ہیں کہ ایٹم بم کے مسئلے کو چھوڑ دیں-----" کہنے لگے۔ "اس لیے کہ اس سے تباہی ہوتی ہے لیکن مارگریٹ تھیچر نے ایک بار کہا تھا کہ دنیا میں جنگ کا نہ ہونا ایٹم بم کی موجودگی کا کرشمہ ہے۔" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! یہ تو ایک سیاست دان کی رائے ہے۔ آپ ایک سائنس دان کی حیثیت سے کیا رائے رکھتے ہیں۔" انہوں نے کہا۔ "یہ بہرحال غلط چیز ہے۔ جینوئن سائنس دان اس کے حق میں نہیں ہیں بلکہ کم تر سطح کے سائنس دان ہی سستی شہرت کی خاطر اس میدان میں سرگرم عمل ہیں" اس گفتگو نے وقت اور فاصلے کا احساس مٹا دیا تھا تاہم جب جہاز کے پبلک ایڈریس سسٹم پر اعلان ہوا کہ جہاز کراچی ایئرپورٹ پر اترنے والا ہے تو میں نے ڈاکٹر عبدالسلام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت چاہی۔

امجد احمد جرمنی کو دیئے گئے انٹرویو سے بعض حصے

اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے بھائی جان جرمنی تشریف لے گئے تھے۔ وہاں امجد احمد ڈپلومہ انجنیئر کو انہوں نے ایک انٹرویو دیا تھا جسے الفضل انٹرنیشنل لندن نے بچوں کے حصہ "گلشن احمد" میں اپنی اشاعتوں' 3 جنوری اور 4 اکتوبر 1997ء میں شائع کیا تھا۔ اس انٹرویو سے کچھ حصے شکریہ کے ساتھ دیئے جاتے ہیں۔

سوال: ڈاکٹر صاحب تحقیق کی طرف آپ کا ذہن کس طرح گیا اور آپ اس میدان میں کیسے آگے بڑھے؟

جواب: تحقیق کی طرف میرا ذہن اس طرح گیا نہیں تھا کہ ہم ترقی کریں گے بلکہ یہ مدعا تھا کہ CSP (بھائی جان غالباً" ICS کہنا چاہتے ہوں گے۔ مرتب/ ناقل) کا امتحان شروع ہو گا جس میں ہم کامیابی حاصل کریں گے۔ لیکن کیمبرج میں جب ہر طرف تحقیق کے مشورے کھلے ہوں تو پھر آپ کی کوشش بھی یہی ہو گی۔ اسی طرح کا ری ایکشن انسان کا ذہن دیتا ہے۔ اور کیونکہ یونیورسٹی کا ماحول تحقیق کی طرف تھا اور میری توجہ بھی اس طرف ہوئی۔ میری تحقیق کی بنیاد سو فیصد کیمبرج کی مرہون منت ہے اور اگر میں کیمبرج نہ گیا ہوتا اور کسی اور یونیورسٹی میں بیٹھا ہوتا تو ممکن ہے کہ

اس طرح کی آسانی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ نہ جا سکتا۔ لیکن کیمبرج کے ہونے کی وجہ سے۔ چنانچہ کیمبرج کی وجہ سے میری تحقیق کی طرف توجہ بڑھتی رہی اور میں کامیاب ہو گیا۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! مسلم ممالک میں سائنسی ریسرچ میں عدم دلچسپی کے کیا اسباب ہیں نیز ان ملکوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو کیوں نظرانداز کیا جاتا ہے۔

جواب:اس کے متعلق آج باتیں ہو رہی تھیں۔ زابلان صاحب سے' زابلان صاحب وہ شخص ہیں جنہوں نے ایک طرح پر اپنی زندگی کو وقف کر دیا ہے۔ ان معاملات کو سوچنے کے بارے میں۔ وہ یہ کہہ رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ مسلم ممالک میں فقدان جو ہے سب کو نظر آتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کی طرح باقی سب ممالک میں کوئی خاص ذاتی دلچسپی رکھنے والا شخص نظر نہیں آتا۔ بڑے لوگ اس میں دلچسپی نہیں رکھتے اور نہ ہی چھوٹے لوگ۔ اگر کوئی دلچسپی نہ لی جائے سوسائٹی کی طرف سے تو قطعاً" اس میں کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ سو اصل وجہ یہی ہے کہ سوسائٹی جو ہے اس کو اپنے نقطہ نظر کو بدلنا پڑے گا۔ "اللہ تعالیٰ کبھی بھی کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی اندرونی حالت کو نہ بدلے۔" (الرّاعد 12) اللہ تعالیٰ نے قران کریم میں بتایا ہے اور یہ بات درست ہے کہ جب تک یہ بات پیدا نہیں ہو گی اس وقت تک کچھ بھی نہیں ہو گا۔ اقبال نے اس کے بعد یہ کہا ہے کہ

وہ نادان گر گئے سجدوں میں جب وقت قیام آیا

تو اس شعر کے بارے میں اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! آپ نے کائناتی نظام میں پائی جانے والی مادے کی قوتوں میں سے کمزور قوتوں پر ریسرچ کی تھی اور الیکٹرو ویک فورس نامی قوت دریافت کی تھی۔ غالباً" اس ایجاد کے بعد آپ کو نوبل انعام ملا تھا۔ نوبل انعام ملنے کے بعد آپ کی ریسرچ کہاں تک آگے بڑھی ہے۔

جواب:اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ چار فورسز تھیں۔ ہمارے کام سے پہلے اس کے بعد تین رہ گئیں۔ سو اب ظاہر ہے کہ تین سے دو اور دو سے ایک یہ نقشہ بنے گا۔ اور اس میں یہ پرابلم ہے کہ تین سے دو اور دو سے ایک کیسے بنتا ہے۔ سو ہم نے اس تین سے دو تک کے لیے تجویزیں کی تھیں لیکن وہ تجویزیں کامیاب نہیں ہوئی تھیں۔ ابھی تک ان کی کامیابی کے متعلق شبہ ہے۔ بجائے یہ کہنے کے وہ بالکل غلط ہے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ابھی تک دریافت نہیں ہوئی۔ اب اس کے علاوہ دوسرا یہ سوال ہے جو خاص میرے متعلق ہے میری ذات سے وابستہ ہے وہ سوال یہ ہے۔ Reality and the origin of life (زندگی کا آغاز اور اس کی حقیقت) یہ میں نے اپنے ذمہ لے لیا ہے کیوں کہ اس میں زندگی کا آغاز (Origin of life) بھی ہے۔ اس میں بیالوجی بھی آ جاتی ہے سو اس میں میں خود کام کر رہا ہوں۔ میرا کوئی اور ساتھی میرے ساتھ نہیں ہے اور

لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ بکواس کر رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ لوگ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ سو اب یہ معاملہ اس وقت ایک کسوٹی پہ تلا ہوا ہے اور تولنے سے اس کے مزاج کا پتہ چل جائے گا۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! اس میں آپ کیا ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟

جواب: میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ الیکٹروویک فورس جو ہم نے پہلے دریافت کی تھی۔ اس کا ایک حصہ خاص اپنے فزیکل مقاصد کے ساتھ چسپاں ہو کر یہ حصہ اس فورس کے لیے بھی کام دے رہا ہے۔ یہ ہم ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

سوال: اس فورس سے آپ کی مراد کون سی فورس ہے؟

جواب: الیکٹروویک فورس اور Origin of life Force۔ Origine of life کے متعلق ہمارا خیال یہ ہے کہ Face Transition کی وجہ سے ہوا ہے۔ Face Transition ایک Physicist کے لیے نہایت ضروری چیز ہے Face Transition اس وقت ہوتا ہے جب---- ہمارا خیال یہ ہے کہ اس سلسلے میں یہ چیز بہت آگے نکلے گی۔

سوال: ڈاکٹر صاحب جب آپ کو نوبل انعام ملا تو کیا آپ کو یہ امید تھی کہ یہ انعام آپ کو ملے گا؟

جواب: جی ہاں! میری توقع یہ تھی کہ یہ انعام مجھ کو ہی ملے گا۔ کیونکہ انعام کے دینے کی وجوہات میں سب پوری کر چکا تھا۔ اس وجہ سے مجھے تکلیف ہوتی اگر یہ انعام مجھے نہ ملتا لیکن کب ملے گا یہ کوئی انسان نہیں جان سکتا تو جس سال مجھے انعام ملا تو سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مسجد فضل (لندن۔ ناقل) میں جا کر میں اور میری بیوی نے دعائیں مانگیں اور خدا کا شکر ادا کیا۔

سوال: ڈاکٹر صاحب نوبل انعام ملنے کے بعد آپ کی زندگی میں کوئی انقلاب آیا؟

جواب: جی ہاں! سب سے بڑا انقلاب یہ ہے کہ مجھے جن لوگوں سے ملاقات کرنے کی خواہش تھی وہ پوری ہو گئی۔ جو لوگ مثلاً ان کاموں کو سنبھالتے تھے' ان لوگوں سے ملاقات نصیب ہو گئی اور ان کے ذریعے خدا دروازے کھولتا گیا۔ اب میں اسے استعمال کرتا ہوں بس یہی فرق میری زندگی میں آیا ہے' اس سے زیادہ نہیں۔

سوال: آپ دنیا کی کن اہم شخصیت سے متاثر ہوئے اور کیوں؟

جواب: مجھے سب سی بڑی شخصیت جو اللہ تعالیٰ کے رسول حضرت محمد ﷺ ہیں۔ ان سے محبت ہے اور ان کی باتیں سننے کا شوق ہے۔ مجھے ایک ہندو شاعر کا شعر یاد آ رہا ہے۔ انہوں نے کہا ہے "ایک آدمی کا بول بالا کر دیا ہے" تو میں یہ شعر بار بار پڑھتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اس انسان ﷺ نے انسانیت کا بول بالا کر دیا ہے اور سب سے بڑی شخصیت وہی تھے۔

سوال: آپ کی زندگی پر مذہب کی گہری چھاپ رہی۔ اس کی کیا وجوہات ہیں۔

جواب: اس کی سب سے بڑی وجہ تو والد صاحب تھے۔ ان میں ہر ایک نیکی اور پاکیزگی پائی جاتی تھی۔
سوال: ایک سوال پاکستان کے حوالے سے ہمارے ملک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے کیا ہونا چاہیے اور آپ نے اس سلسلہ میں کیا کردار ادا کیا ہے۔
جواب: میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ قوم بحیثیت قوم اپنے فرض کو سمجھے۔ اب سلسلے میں ایک بات یاد آ گئی۔ فن مین (Funman) صاحب نے بیان کیا۔ فن مین صاحب اس وقت ہمارے شعبہ میں سب سے زیادہ مشہور شخص ہیں' فوت ہو چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب انہیں نوبل انعام ملا تو ان کی جاپانی سفیر سے ملاقات ہوئی۔ جاپانی سفیر کو انہوں نے کہا کہ بتاؤ کہ جاپانی قوم کی ترقی کا کیا راز ہے تو اس نے کہا کہ ہم میں سے غریب یا امیر ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس کا بچہ اس سے زیادہ تعلیم حاصل کرے اور اگر ہمارے ہاں بھی ماں باپ یہ تصور باندھیں تو ہمارا ملک ترقی کی راہ پر چلے گا۔
سوال: ڈاکٹر صاحب ٹریسٹ میں قائم ادارہ آپ نے جن مقاصد کے تحت قائم کیا تھا۔ وہ کہاں تک پورے ہوئے ہیں؟
جواب: زیادہ تر تو مقاصد پورے ہو چکے ہیں لیکن نئے مقاصد کے بارے میں یہ کہنا پورے ہو چکے ہیں' غلط ہو گا کیونکہ وہ مقاصد تو چلتے رہتے ہیں اور اگر آپ یہ سوال پوچھیں کہ ان مقاصد کے حل ہونے میں آپ کا ادارہ کس حد تک کامیاب ہو رہا ہے تو اس کا جواب میں دے سکتا ہوں۔
سوال: جی ہاں! اگر آپ یہ بتا سکیں؟
جواب: میرا اندازہ یہ ہے کہ وہ مقاصد یہ تھے کہ سائنس کی تعلیم کے بارے میں جہاں تک ہو سکے طلباء کو اکٹھا کیا جائے اور بغیر ان کے ملکوں کو خبر ہونے کے یہ جاننے کے کہ ان کے لیے یہ رقم کہاں سے لی گئی' طلباء کو اگر ہو سکے تو UN کے ذریعے وظیفے مل جائیں اور وظائف کے ملنے کے بعد وہ خود اپنے ہاتھوں سے' اپنے ذہنوں سے کام لے کر کوشش کریں غرض یہ کہ ان کی حالت بہتر ہو جائے اور ان کی تعلیم خاصی اچھی ہو جائے۔
سوال: ڈاکٹر صاحب! پاکستان کو اس ادارے سے کس حد تک فائدہ پہنچا ہے۔
جواب: پاکستان کے لیے یہ ادارہ بہت مفید نظر آتا ہے کیوں کہ پاکستان میں اس قسم کی تعلیم دینے والا کوئی بھی نہیں اور پاکستان کے لوگ آتے ہیں' زیادہ تعداد میں آتے ہیں۔ میں نے وہاں یہ رکھا ہے کہ پاکستان نے چونکہ آپ کو یہ ادارہ بنا کر دیا ہے اور شروع میں چونکہ پاکستان ڈیلیگیشن (Delegation) ہی نے پروپوز (Propose) کیا تھا اور پھر اس کے بعد اس کے لیے (قیام کے لیے۔ ناقل) لڑتی بھی رہی تو اس لحاظ سے آپ کو پاکستان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ دلچسپی رکھنی چاہیے۔ اس بات کو انہوں نے مان لیا ہے اور اٹالین ہونے کے باوجود انہوں نے پاکستان کے

ساتھ خاص طور مراعات کا سلوک کیا ہے۔ ویسے پاکستان سے لڑکے بھی بہت زیادہ تعداد میں آتے ہیں اور ان سب چیزوں کو ملا کے گویا پچاس کے قریب ہر سال لڑکے وظائف لے کے پاکستان سے آ جاتے ہیں۔ یہ پچاس بہت بڑا فائدہ ہے۔

سوال: اس وقت آپ کا جو ادارہ ہے اس کی خاص خاص سرگرمیاں کیا ہیں؟

جواب: خاص سرگرمیاں اس وقت یہ ہیں کہ ہم اس ادارے کو نہ صرف نظریاتی (Theorcticle) بلکہ ایک Ferventry (سرگرم) ادارہ بنانے کی کوشش میں ہیں اور Ferventry (سرگرم) بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں لبارٹریز ہوں۔ سو اس سلسلے میں ٹیکنالوجی کے لیے کوشش کر رہے ہیں کہ ہائی ٹیکنالوجی کی چیزیں یہاں پر پیدا ہو سکیں۔ سو اس سلسلے میں میرا تین نئے انسٹی ٹیوٹ بنانے کا خیال ہے۔ وہ تین انسٹی ٹیوٹس یہ ہوں گے۔

1. High Technology and New Materials
2. Chemistry Pure and Applied
3. Enviromental Earth Resourses

اگر یہ تینوں چیزیں بن گئیں تو ایک مکمل یونیورسٹی کی صورت اختیار کر جائے گا اور میں چاہتا ہوں کہ میری زندگی ختم ہونے سے پہلے یہ چیزیں طے ہو جائیں۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! کیا ان سے پاکستان جیسے تیسری دنیا کے ممالک کو بھی فائدہ پہنچ سکے گا؟

جواب: اس سے فائدہ ان کو یہ پہنچے گا کہ وہ اگر اس قسم کے انسٹیٹیوٹس اپنے ہاں قائم کریں تو اس کا فائدہ کئی گناہ بڑھ سکتا ہے۔ اب وہ ایسا کریں یا نہ کریں یہ ان پر مدار رکھتا ہے لیکن اس کے لیے ہم راہ پیش کر رہے ہیں۔ بیس سنٹرز بنانے کا ارادہ ہے۔ نئی دنیا میں اور پرانی دنیا میں۔ تین کی شمولیت کے ساتھ تئیس (23) ہوں گے اور چوبیسواں (24) جو یہاں کا سنٹر ہے۔ یہ چوبیس سنٹر مل کر کام کریں گے (اگر اللہ نے چاہا)

18

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور بھائی جان

علی گڑھ مسلم یونورسٹی علی گڑھ۔ ہندوستان نے بھائی جان کی زندگی میں ان کی بہت عزت کی اور ان کی وفات کے بعد انہیں بے حد خراج تحسین پیش کیا۔

نوبل انعام ملنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے بھائی جان کو 1981ء میں ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی ڈگری دی۔ اس کے بعد ان کی وفات تک یونیورسٹی کے جریدہ ماہنامہ ''تہذیب الاخلاق'' جس کے بانی سرسید احمد خان تھے' نے کئی مرتبہ ''عبدالسلام نمبر'' شائع کیے جبکہ جنوری 1986ء میں ان کی ساٹھویں سالگرہ کے موقع پر ایک خصوصی پیش کش کی' اشاعت کا اہتمام کیا۔

ان کی وفات کے بعد مارچ 1997ء میں ''تہذیب الاخلاق'' نے عبدالسلام نمبر شائع کیا جس میں ان کے کارناموں کو اجاگر کرتے ہوئے انہیں زندہ و جاوید کر دیا۔

''تہذیب الاخلاق'' میں شائع ہونے والے چیدہ چیدہ مضامین اس باب میں قارئین کے پیش نظر کیے جا رہے ہیں جن سے اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس یونیورسٹی کو بھائی جان سے کتنا پیار تھا اور وہاں ان کی کس قدر عزت کی جاتی تھی۔

نوبل انعام ملنے کے بعد بھائی جان نے مختلف ممالک کے سرکاری دورے کیے۔ ایک مرتبہ کسی نے ان سے پوچھا تھا کہ ان دوروں میں انہیں سب سے زیادہ عزت کہاں ملی تھی تو انہوں نے بلا توقف بتایا کہ ''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں'' انہوں نے مزید بتایا کہ ''صرف یہی بات رہ گئی تھی کہ طلباء میری کار کو اپنے کندھوں پر نہ اٹھا سکے۔ اگر ایسا کرنا ممکن ہوتا تو شاید وہ یہ بھی کر گزرتے۔''

پروفیسر عبدالسلام کا دورہ ہند

بھائی جان جنوری 1981ء میں بیس روز کے دورے پر ہندوستان تشریف لے گئے تھے وہاں سے واپسی پر کراچی یونیورسٹی کے شعبہ طبیعات کے صدر پروفیسر محمد رفیع نے آپ سے اس دورے کے متعلق ایک انٹرویو لیا جو ایک انگریزی جریدہ میں شائع ہوا تھا۔ اس انٹرویو کا ترجمہ ڈاکٹر صابرہ خاتون' ریڈر ڈیپارٹمنٹ آف فزکس' ویمنس کالج' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے کیا جو تہذیب الاخلاق جولائی 1984ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔ (مرتب)

سوال: پروفیسر عبدالسلام! میں آپ کا بے حد مشکور ہوں کہ آپ نے اپنا قیمتی وقت مجھے مرحمت فرمایا تاکہ میں آپ کے حالیہ دورہ ہندوستان کے متعلق کچھ گفتگو کر سکوں۔ اس دورے کے کئی اہم پہلو ہیں جن کے متعلق میں آپ سے چند سوالات کرنے کا خواہاں ہوں لیکن ان سوالات سے پیشتر میں ہندوستان میں اپ کے خیر مقدم کے بارے میں جاننا چاہوں گا۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستانی اخبارات و رسائل----- ٹائمز آف انڈیا' السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا وغیرہ نے آپ کی آمد پر خصوصی ضمیمے شائع کیے تھے۔ ایک کونے سے دوسرے کونے تک آپ کا جو استقبال ہوا' اسے ٹائمز آف انڈیا نے ''رستم وقت کا خیر مقدم'' بتایا' کیوں کہ آپ کے علمی کارنامے سے ہندوستانی بے حد متاثر ہوئے ہیں' جس کو سراہنے کے لیے لوگ جوق در جوق آپ کے استقبال کے لیے چلے آ رہے تھے۔

ہم یہ جاننے کے متمنی ہیں کہ اس دورے کے درمیان وہ کون سا ناقابل فراموش واقعہ تھا جس کی یاد آپ کے ذہن میں اب بھی تازہ ہے۔

جواب: بیشک! یہ ایک یادگار دورہ تھا۔ میں اس دعوت نامے کے لیے انڈین فزکس ایسوی ایشن (چیئرمین۔ لیش پال) اور کاؤنسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (چیئرمین۔ ڈاکٹر نور الحسن) کا شکر گزار ہوں جن کے باعث یہ دورہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔ کم و بیش ہر جگہ ہی میرا بڑے پرجوش اور پرتپاک طریقے سے خیر مقدم ہوا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ سائنس میں برصغیر کا یہ ایک باعث فخر کارنامہ ہے۔ میں بمبئی' مدارس' بنگلور' کلکتہ' بھونیشور' دہلی' علی گڑھ' امرتسر' قادیان اور حیدر آباد گیا۔ ہر جگہ ہی طلباء' اساتذہ اور عوام خوشی میں پھولے نہ سماتے تھے۔ سب سے زیادہ شاندار' پرجوش اور پرخلوس استقبال میرا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوا۔

جب میں دہلی سے علی گڑھ تقریباً دن کے دس بجے پہنچا تو سب سے پہلے یونیورسٹی کی جامع مسجد میں دو رکعت نماز نفل ادا کی۔ پھر مسلم طلباء کے اصرار پر وہیں منبر پر بیٹھ کر انہیں خطاب کیا اور ہدایت کی کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی اعلیٰ و معیاری تعلیم حاصل کریں اور اس میں سبقت لے جانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ بعد ازاں یونیورسٹی کی طرف سے اعزازی ڈگری دینے کی باضابطہ رسم ادا ہوئی۔ جس میں حوالہ (Citation) کا کچھ حصہ عربی میں سائنس کے ڈین نے پڑھا جو ایک ہندو پروفیسر تھے۔ یہ سلسلہ دوپہر تک چلتا رہا۔ طلباء کی یونین اس باضابطہ تقریب سے کچھ دل برداشتہ تھی۔ اس نے از خود اپنا ایک جلسہ منعقد کیا اور مجھے یونین کی تاعمر رکنیت سے نوازا گیا جس کی میرے دل میں بہت وقعت ہے۔ میں اس عزت و تکریم کے لیے اپنے خدائے رب العزت کا کسی طرح شکر ادا نہیں کر سکتا۔ ان العزت لله جمیعا میری بس یہی تمنا اور نئی نسل کے لیے پیغام ہے کہ وہ سائنسی علوم پر دسترس حاصل کرے اور دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔

سوال: کیا آپ نے دوسرے مسلم اداروں کا بھی دورہ کیا؟
جواب: جی ہاں! اور ہر جگہ میرا استقبال مشفقانہ اور بڑی گرم جوشی سے ہوا۔ مثلاً یہ جامعہ ملیہ میں جس کے بانی مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین تھے' مجھے لگاتار دو مرتبہ تقاریر کرنا پڑیں۔ کیوں کہ اوکھلا میں (دہلی کا وہ علاقہ جہاں جامعہ قائم ہے) بسنے والے مسلم عوام میری تقریر سننے کو بے قرار تھے۔ لہٰذا ایک گھنٹہ بعد ہم کو ہال خالی کروانا پڑا تاکہ جو لوگ باہر منتظر کھڑے تھے' اندر آ سکیں۔

اسی طرح حیدر آباد اور بنگلور میں مسلم ایسوی ایشن مثلاً الامین فاؤنڈیشن اور اوقاف بورڈ وغیرہ نے باہم میری آمد کی خوشی میں ایک جلسہ کا اہتمام کیا۔ بمبئی میں جب میں سیدنا برہان الدین صاحب سے ملنے گیا تو بوہرہ فرقے کے لوگوں نے نہایت جوش و خروش سے میرا خیر مقدم کیا۔

اسی قسم کی شفقت اور محبت کا اظہار ڈھاکہ اور چٹاگانگ کے طلباء کی جانب سے ہوا۔ چٹاگانگ یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلا یادگار کونووکیشن مجھے اعزازی ڈگری دینے کے لیے منعقد ہوا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ میں اور بنگلہ دیشی طلباء کس طریقے سے باہم ایک دوسرے سے گھل مل گئے تھے۔
علاوہ ان مسلم اداروں کے جن کا میں نے خصوصاً" تذکرہ کیا' بمبئی' کلکتہ' امرتسر' موراس' بھونیشور اور بنگلور میں ہر ذات اور طبقے کے لوگوں نے میری آمد کی خوشی میں اس طرح جشن منایا گویا یہ پورے برصغیر کا جشن ہو!

سوال: ان باتوں کے پیش نظر' میں سمجھتا ہوں کہ ہر لحاظ سے آپ اسے ایک ناقابل فراموش خیر مقدم کہیں گے۔ اب میں یہ جاننے کا متمنی ہوں کہ جب آپ علی گڑھ یونیورسٹی تشریف لے گئے تو یونیورسٹی کے چانسلر نواب چھتاری کا پیغام وہاں کے وائس چانسلر نے پڑھ کر سنایا جسے آپ سن کر بے حد متاثر ہوئے۔ تو کیا آپ یہ بتانے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے کہ وہ پیغام کیا تھا؟
جواب: وہ پیغام یہ تھا۔

"پروفیسر عبدالسلام کی آمد پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر نواب چھتاری کا پیغام۔"

24 جنوری 1981ء

آج کا دن ہمارے لیے بہت ہی مخصوص دن ہے کیوں کہ دنیائے سائنس کی دانش مندی اور لیاقت کا درخشندہ ستارہ علی گڑھ تشریف لا رہا ہے۔ میں بہت افسردہ اور ملول ہوں کہ اپنے بڑھاپے اور علالت کے باعث اس کا استقبال کرنے خود حاضر نہ ہو سکا۔

خواتین و حضرات! آج ہمارے درمیان وہ عظیم شخصیت جلوہ گر ہے جو صرف ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ سارے عالم اسلام کے لیے باعث فخر و انبساط ہے۔
نوبل انعام کی تاریخ میں اس شخصیت کا نام وہ واحد نام ہے جسے مسلم ہونے کا شرف حاصل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مصر کے صدر عزت ماب جناب انور السادات نے بھی نوبل انعام حاصل کیا مگر ان کا میدان سیاسی تھا جب کہ پروفیسر عبدالسلام کو ان کی عالمانہ قابلیت و لیاقت کے صلے میں نوبل انعام سے نوازا گیا ہے۔

میرے پیارے بھائیو! پروفیسر سلام نے جو مثال قائم کی ہے۔ اب اس کی تقلید آپ لوگوں کو کرنی ہے۔ اسی پر ملک اور قوم کے پایاں ترقی اور خوشحالی کا دارومدار ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پروفیسر سلام کو طویل عمر' کامرانی اور صحت عطا فرمائے اور میں دعا کرتا ہوں کہ ہندوستان' پاکستان اور سارا عالم اسلام علم اور دانشوری میں ان کی تقلید کرے۔ آمین"

احمد سعید' نواب آف چھتاری

سوال: حالاں کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بتانا مشکل ہے پھر بھی علی گڑھ کے بعد کس جگہ کے خیر مقدم کو آپ دوسرے نمبر پر رکھیں گے؟

جواب: میری یادداشت کے مطابق دوسرے نمبر پر امرتسر کی گرو نانک دیو یونیورسٹی آتی ہے۔ یہاں کانووکیشن میں میں نے اپنی افتتاحیہ تقریر پنجابی میں کی جسے چندی گڑھ کے اخبار ٹریبیون نے "خالص مگر دیہاتی پنجابی" کہا۔ میں نے اس تقریر کے دوران بتایا کہ ہرگوبند کھورانہ جنھیں علم وراثت (Genetics) میں 1976ء میں نوبل انعام ملا تھا وہ ملتان کے قریب پیدا ہوئے تھے۔ اس طرح پنجاب اور بالخصوص ضلع ملتان کے علاقہ جھنگ کو پورے برصغیر کے مقابلے میں سب سے زیادہ اعزازت و انعامات حاصل کرنے کا شرف حاصل ہے۔

جہاں کہیں بھی میں گیا میری بس یہی کوشش رہی کہ تینوں ممالک ہندوپاک اور بنگلہ دیش کے عوام میں باہم یک جہتی اور ربط ضبط پیدا ہو۔ اور اس کے لیے میں نے پاکستانی عوام کی جانب سے ہر جگہ اپنے سامعین کو مبارک باد کا پیغام دیا۔ کلکتہ یونیورسٹی کے کانووکیشن میں خطاب کرتے ہوئے آخر میں میں نے کہا۔ "جناب چانسلر صاحب! آپ لوگوں نے میری جو عزت افزائی کی ہے اور جس خلوص سے مجھے نوازا ہے۔ وہ محض اس لیے ہے کہ آپ سب کو برصغیر کے کارنامے پر فخر ہے۔ تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم اپنے سارے مسائل اسی طرح مل جل کر حل کریں اور ہر قسم کے کارناموں کی اسی طرح باہم خوشی منائیں۔" میرے اس جملے پر چانسلر نے (جو صوبے کے گورنر ہیں اور ایک زبردست سیاسی شخصیت بھی) کہا کہ وہ میری اس بات سے اتنے متاثر ہوئے ہیں کہ اب وہ اپنی لکھی ہوئی تقریر نہ پڑھ کر اسی بات پر سے اپنے خطبے کا آغاز کریں گے اور انھوں نے ایسا ہی کیا۔

سوال: ہند کے اس دورے کے دوران ذاتی اعتبار سے کون کون سے یادگار واقعات آپ کے ذہن میں محفوظ ہیں؟

جواب: پرانے ہم جماعت اور دوستوں سے ملاقات کے علاوہ جو چیز میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی۔ وہ میری اساتذہ کرام سے ملاقات ہے۔ میں اپنے ان سب اساتذہ کا جنھوں نے مجھے کسی بھی جماعت میں پڑھایا ہے' بے حد عزت کرتا ہوں۔ والدین کے بعد یہی لوگ عزت و احترام کے مستحق ہیں۔ اس دورے کے دوران مجھے ہند میں مقیم اپنے چار استادوں کو تلاش کرنے میں کامیابی ہوئی۔ جناب ایشار کمار صاحب (چنڈی گڑھ) لالہ ہنس راج بھاٹلہ صاحب (دہلی)' پروفیسر اے این گنگولی صاحب (کلکتہ) اور جناب پی ٹی چندی صاحب (بنگلور)۔ جب میں نے یہ خواہش ظاہر کی میرے اساتذہ صاحبان کی بھی عزت افزائی کی جائے تو میری خواہش کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسا ہی کیا گیا۔ اسی طرح جب میں دسمبر 1979ء میں پاکستان آیا تو صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے میرے استاد علامہ شیر افضل جعفری صاحب کو جو جھنگ میں رہتے ہیں۔ اسلام آباد میں منعقدہ سرکاری تقریب میں مدعو کیا۔

اب یہاں میں پروفیسر گنگولی کا خاص طور پر ذکر کروں گا جنھوں نے مجھے لاہور میں 1945ء سے 1946ء تک علم الحساب پڑھایا تھا۔ جب مجھے کلکتہ یونیورسٹی نے تمغہ دینا چاہا تو میں نے اسے اس شرط پر قبول کرنے کا وعدہ کیا کہ کلکتہ میں مقیم میرے استاد گنگولی صاحب کی بھی عزت افزائی کی جائے۔ کلکتہ یونیورسٹی نے اسے بخوشی منظور کر لیا۔ اٹھاسی سال کے عمر رسیدہ پروفیسر گنگولی جو ناسور جیسے موذی مرض میں مبتلا ہیں۔ اس قابل نہ تھے کہ تقریب میں شرکت کے لیے حاضر ہو سکتے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر آر۔ کے۔ پڈار میرے ہمراہ ان کے گھر تشریف لے گئے اور انہیں تین ہزار روپے کا چیک اور ایک سند پیش کی جو ان کی درس و تدریس کی خدمات کے اعزاز میں تھی۔ میری رائے ہے کہ اسی قسم کے انعامات پاکستان میں بھی تقسیم کیے جائیں۔

سوال: میرا خیال ہے کہ آپ نوبل انعام ملنے کے فوراً بعد پاکستان تشریف لائے تھے۔ تو کیا آپ دورہ ہند کی روشنی میں پاکستان کے دورے کے بارے میں کچھ تذکرہ کرنا پسند کریں گے؟

جواب: پاکستان میں عوام اور طلباء کی جانب سے سوائے تین جلسوں کے اور کوئی تقریب یا جشن نہیں منایا گیا۔ ان تینوں جلسوں میں سے دو کراچی میں منعقد ہوئے تھے۔ پہلا کراچی یونیورسٹی اور انجنیئرنگ کالج کی جانب سے اور دوسرا پاکستانی ڈاکٹروں کی طرف سے تیسرے جلسے کا اہتمام میری جائے پیدائش جھنگ میں کیا گیا۔

سوال: لیکن ایسا کیوں ہوا؟ جب کہ آپ فخر پاکستان ہیں اور دنیا کے سب سے بڑے انعام سے بھی نوازے گئے ہیں۔

جواب: اس کی وجہ آپ خود جانتے ہیں۔ انعام کے بعد صدر پاکستان نے مجھے سب سے بڑا قومی اعزاز "نشان امتیاز" عطا کیا۔ علاوہ ازیں اسلام آباد یونیورسٹی میں دو شاندار تقاریب منعقد کی گئیں جن

میں مجھے اعزازی ڈگری دی گئی۔ یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ بدقسمتی سے میری وہاں سائنس کے طلباء سے ملاقات نہ ہو سکی جس کا مجھے از حد افسوس ہوا۔

سوال: پاکستان میں آپ کی آمد ہند تشریف لے جانے سے پیشتر جنوری میں ہوئی تھی۔ اس سے قبل آپ دسمبر 1979ء میں نوبل انعام کا جشن منانے پاکستان تشریف لائے تھے تو میں چاہتا ہوں کہ پاکستان میں سائنس کے متعلق آپ اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔

جواب: دسمبر کے دورے کے بعد میں سمجھتا تھا کہ ملک کی بیداری میں سائنس کا بہت بڑا ہاتھ ہے اور ملک میں اس کی جڑیں مضبوط ہو رہی ہیں۔ مجھے امید تھی کہ سائنسی علوم کی ترقی کے لیے مالی ذرائع کا انتظام ہو گا اور ملک کی نئی نسل کو سائنس پڑھنے کی ترغیب دی جائے گی۔ مگر یہ سب کچھ نہ ہوا اور میں محض خوش فہمی کا شکار رہا۔ بہرحال اس سال ایک صنعت کار ڈاکٹر ظفر حسن نے پاکستان کے صنعتی حلقے کی ایما پر بنیادی سائنس کا ایک مرکز کھولنے کا تہیہ کیا ہے۔ اس سال جنوری میں اس کی ایک میٹنگ میں میں نے بھی شرکت کی اور اس پیش قدمی کو سراہا جسے ترقی کی منازل سر کرنے کے لیے فی الحال کافی وقت چاہیے۔

سوال: ہندوستان میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے متعلق ایک مرتبہ سینٹر موئی ہن (Senator Monihan) نے کہا تھا کہ 2000ء تک ہندوستان ایک زبردست طاقت کا مالک بن جائے گا۔ آپ کو ان کی رائے سے کہاں تک اتفاق ہے؟

جواب: اس دورے کے دوران مجھے ہر چیز بڑے ناز اور فخر سے دکھائی گئی جس میں خاص طور سے بھابھا تحقیق کا مرکز، حیدر آباد کا نیوکلیائی ایندھن تیار کرنے کا پلانٹ، بنگلور کا مصنوعی سیارہ تیار کرنے کا اسٹیشن اور 140 MEV کا تبدیل پذیر توانائی سائیکلوٹران (Variable Energy Cyclotron) شامل ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ خصوصیت کا حامل مصنوعی سیارہ کا مرکز ہے۔ جہاں مجھے بتلایا کہ بیس سالہ جاپانی تجربے کو صرف چھ سال میں اپنا کر چار مصنوعی سیارے تیز تر برق رسانی اور مواصلاتی نظام کو کنٹرول کرنے اور موسم کی پیش گوئی کرنے کے لیے از خود تیار کیے ہیں۔ اس مرکز میں 600 سائنس داں کام کر رہے ہیں جس کا سالانہ بجٹ چودہ کروڑ روپیہ ہے جو کچھ مجھے دکھلایا وہ بے شک ایک اونچے معیار اور اعلیٰ درجے کا تکنیکی کارنامہ ہے۔ جس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جو چیز بھی اس میں استعمال ہوئی ہے، اندرون ملک تیار کی گئی ہے۔

یہ دیکھ کر مجھے بے حد مسرت ہوئی کہ مسلم سائنس دان ملک کے چیندہ اداروں میں سے کئی اداروں کے ڈائریکٹر، صدر اور اعلیٰ درجے کے محقق ہیں جنھوں نے تحقیق کا نمایاں کام کیا ہے۔ لیکن مسلم سائنس دان کی مجموعی تعداد 1/4 سے 1/5 تک ہے جو مسلم آبادی کے لحاظ سے کھانے

میں نمک کے برابر ہے۔ ان کے کام کا معیار تو اچھا ہے مگر تعداد بہت کم ہے۔ اس کی شاید وجہ یہ ہو کہ مسلمان سائنسی علوم کو پڑھنا نسبتاً" کم پسند کرتے ہیں۔

بہرحال جہاں تک ہندوستان میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا تعلق ہے۔ یہ کلمات وہاں میں نے بڑے فخر کے ساتھ کہتے سنے کہ اب ہندوستان کا شمار سائنسی نقطہ نگاہ سے دنیا کی تین بڑی طاقتوں میں ہونے لگا ہے۔ اس چیز کو مد نظر رکھتے ہوئے بلا تامل میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ موئی ہن نے جو پیش گوئی کی تھی وہ بالکل درست ثابت ہو رہی ہے۔

سوال: سلام صاحب! آپ کے خیال میں وہ کون سے اسباب ہیں جن کے باعث ہندوستان سائنس اور ٹیکنالوجی میں بام عروج کو پہنچ سکا۔

جواب: اس کی سب سے بڑی وجہ ہندوستانی حکومت کا خود پر کفالت کرنا ہے۔ ملک کی تیار کردہ اشیاء کے مقابلے میں حکومت نے برآمدات کو حتی الامکان نظر انداز کیا اور اس کا یہ رویہ پنڈت نہرو کے زمانے سے اب تک چلا آ رہا ہے۔

پاکستان کی طرح ہندوستان میں بھی تجارتی حلقے کا جتنا دباؤ ہے کم و بیش اتنا ہی دباؤ غیر ملکی در آمد کرنے والے تاجروں کا ہے مگر حکومت ہند نے ان تمام اشیاء کی در آمد پر جو اپنے ملک میں تیار کی جاتیں ہیں، سخت پابندی عائد کر رکھی ہے تاکہ مقامی تکنیکی معیار بلند ہو اور حکومت مقامی اشیاء کی برآمد میں نہ صرف یہ کہ خود کفیل ہو بلکہ ان پر فخر بھی کر سکے۔ مثلاً ہندوستان میں مقامی طور پر تیار کردہ ایمبسڈر کاریں ہی استعمال کی جاتی ہیں۔ چین کی طرح ہندوستان نے بھی یہ مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ یا تو وہ خود اشیاء تیار کرے گا یا ان کے بغیر ہی رہے گا اور اس بات کی تصدیق اس طرح ہو جاتی ہے کہ کمپیوٹر سے لے کر کوکا کولا تک اپنے ملک میں تیار کیے جاتے ہیں۔

دوسری وجہ جس کا خود مجھے تجربہ ہوا وہ حکومت ہند کا وہ رویہ ہے جو سائنس دانوں کو ملک میں ٹھہرانے کا لیے بڑا کارگر ثابت ہوا ہے۔ میں صرف ایک مثال آپ کے سامنے ڈاکٹر سوامی ناتھن کی پیش کروں گا جو رائل سوسائٹی کے رکن ہیں اور اعلیٰ درجے کے زراعتی محقق بھی۔ حکومت ہند نے ان کو پلاننگ کمیشن کا ممبر بھی منتخب کر لیا ہے۔

ہندوستان کے پلاننگ کمیشن میں شروع ہی سے ایک سائنس داں ممبر ہوتا آیا ہے۔ وہاں سائنس کے لیے بے پناہ روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی کل آمدنی 3/4 حصہ صرف سائنسی تحقیق پر خرچ ہوتا ہے۔ ملک میں بہت سی قومی تجربہ گاہیں ہیں جن میں یہ روپیہ کسی نہ کسی مقصد کے تحت خرچ کیا جاتا ہے۔

سوال: اب میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ہند کے مقابلے میں پاکستان کی کیا حیثیت ہے؟

جواب: میرے الفاظ ترش ضرور لگیں گے مگر ہمیں صداقت دیکھنا ہے۔ آپ دونوں ملکوں کے موازنے کی بات کر رہے ہیں تو ہندوستان کے دورے کے بعد اور وہاں کی ترقی دیکھنے کے بعد میرا خیال ہے کہ سائنسی نقشہ پر ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان کا وجود نہیں کے برابر ہے اور پھر بھی پاکستانی حضرات اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہیں اور یہ بات بڑی پریشان کن ہے کہ پاکستانی نوجوان سائنسی پیشہ اپنانے سے گریز کر رہے ہیں۔

پاکستان میں طبیعات میں پی ایچ ڈی کرنے والوں کی مجموعی تعداد سو سے کم ہی ہے جب کہ ہندوستان کے اعداو اشمار کے مطابق ان کی تعداد تقریباً سات ہزار ہے۔ ہندوستان نے عالمی سائنسی کلب میں شرکت کرلی ہے جب کہ پاکستان کا اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ پاکستان سے سائنس داں اور سائنسی انتظامیہ کے کچھ عہدہ دران کا ایک وفد ہندوستان جائے اور وہاں دیکھے کہ وہ کیسے اور کیا کر رہے ہیں۔ اس طرح انہیں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔ اس کے علاوہ میں یہ بات واضح کر دوں کہ تعلیم اور خصوصاً" سائنسی تعلیم کی ترغیب دینا محض حکومت کی ہی ذمہ داری نہیں بلکہ یہ تو ملک کے عوام کی ہے۔ اس کے دانش وروں کی ہے اور اتنی ہی کچھ والدین کی بھی ہے۔ تو ہم سب کو اپنا اپنا فرض پورا کرنا ہے اور جتنا ممکن ہو سکے۔ مقامی اسکولوں اور کالجوں کی امداد کرنی چاہیے اور انہیں ہر ممکن تعاون دینا چاہیے۔

سوال: ہمارے سامنے اس وقت سب سے سنگین مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے طلباء اور سائنس دان اعلیٰ تعلیم و تربیت کے لیے غیر ممالک کا رخ کرتے ہیں اور واپس آنے کا نام نہیں لیتے۔ اس کے علاوہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ ہر وقت اس فکر میں سرگرداں رہتا ہے کہ کب اسے مشرق وسطیٰ جانے کا موقع ملے۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہیں ملک کی تعمیر میں حصہ لینا چاہیے۔ کوئی بھی شخص دوسرے ملک سے آ کر ہمارے ملک میں کیوں کام کرے گا؟ لہٰذا میری گذارش ہے کہ آپ اس مسئلے کا کچھ حل تجویز فرمائیں؟

جواب: فرض کیا کہ ہمارے ملک میں 12 سے 17 سال کی عمر کے طلباء کی تعداد 13 فیصد سے بڑھ کر 38 فیصد ہو جاتی ہے جو ترقی پذیر ممالک کا اوسط ہے تو ہم اپنے تربیت یافتہ لوگوں میں سے 25 فیصد کو باآسانی غیر ممالک میں بھیج سکتے ہیں اور اس وقت ہمیں اس کی کمی کا قطعی احساس نہیں ہو گا جس سے ہم آج کل دو چار ہیں اور گر ہم 84 فیصد لوگوں کو تربیت دیتے ہیں جو ترقی یافتہ ممالک کا اوسط ہے تو پھر یہ مسئلہ مکمل طور پر حل ہو جائے گا۔

ہم فی الحال کافی کم لوگوں کو تربیت دے رہے ہیں جو ہماری آبادی کا بہت کم فیصد (کل 13 فیصد) ہے اور سب سے افسوس ناک بات یہ ہے کہ اگر وہ تربیت یافتہ لوگ ملک میں ٹھہر بھی جاتے ہیں تو سائنس اور ٹیکنالوجی میں خود کفیل ہونے کی بات بالکل نہیں سوچتے۔

سوال: میں ایک بار پھر آپ سے درخواست کروں گا کہ ہندوستان کے دورے کے متعلق مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالیں۔

جواب: اول یہ کہ ہندوستانی سائنس دان، طلبا اور دوسرے تمام طبقے کے لوگوں نے تعلیم کی عزت و تکریم کا بے پناہ مظاہرہ کیا۔ ہندوستانیوں میں سائنس پڑھنے کی لگن بدرجہ اتم موجود ہے اور برصغیر کے کارنامے پر سب کو ناز ہے۔ ہر جگہ سیاست دانوں سے میں نے سوال کیا کہ کیا یہ فخر اور والہانہ محبت و شفقت ہمارے مسئلوں کو حل کرنے میں معاون ثابت نہیں ہو سکتے؟ تو لطف کی بات یہ ہے کہ کئی سیاست دانوں نے جواباً" غیرذمہ دار صحافت کو نفرت کی آگ پھیلانے کا موجب قرار دیا۔

دوئم یہ کہ میں نے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش کی اور انہیں اس بات سے آگاہ کیا کہ سائنس ان کا ورثہ ہے جسے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے انہیں جدوجہد کرنی چاہیے۔ اس طرف پیش قدمی ہمدرد کے بانی حکیم عبدالحمید صاحب کی ہے جو ہمارے حکیم سعید صاحب کے بڑے بھائی ہیں۔ ان کی زیر صدارت ایک میٹنگ میری موجودگی میں منعقد کی گئی جس میں سرسید سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام دوبارہ عمل میں آیا اور یہ طے پایا کہ شمالی علاقے کے سائنس پڑھنے والے مسلم طلباء کی امداد کے لیے ایک کروڑ روپیہ سالانہ دیا جائے گا۔ میری دعا ہے کہ انہیں اس کارخیر میں کامیابی ملے اور پاکستان میں بھی اسی قسم کا کام سرانجام ہو۔

میں آخر میں یہ کہوں گا کہ ہندوستان کی سائنس کی ترقی سے ہمارے ملک کو سبق لینا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی سائنس میں ابھی کمزوریاں موجود ہیں۔ مثلاً یونیورسٹیوں میں سائنسی تحقیق نسبتاً" کمزور ہے۔ حالاں کہ آپ جانتے ہیں تری است (اٹلی) کے مرکز نے ہندوستان کے اس طبقے کی اس طرح امداد کی ہے جس طرح پاکستان اور بنگلہ دیش کی۔

سوال: کیا آپ اپنے سائنس دانوں اور ماہرین تعلیم کے لیے کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

جواب: میرا پیغام یہ ہے کہ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے کام کا آغاز کریں جس کے لیے سائنس فاؤنڈیشن قائم کرنے ہوں گے اور ہمارے شہری کو اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے قربانی دینا ہو گی۔

میری ناچیز رائے میں اسلام کی تعلیم کی اس وقت نہ صرف پاکستان بلکہ سارے عالم اسلام میں زور دینے کی ضرورت ہے اگر حکومت اور ملک دونوں مل کر ہمت اور اولوالعزمی کے ساتھ کام کا آغاز کریں تو آج ہی سے کام شروع ہو سکتا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ ہماری محنتوں کو رائیگاں نہیں جانے دے گا۔

پروفیسر عبدالسلام کی ساٹھویں سالگرہ پر تہذیب الاخلاق کے عبدالسلام نمبر سے

تہذیب الاخلاق نے جنوری 1986ء میں بھائی جان کی ساٹھویں سالگرہ پر ایک خصوصی پیشکش شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ جنوری 1986ء میں ہی بھائی جان نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا دورہ کیا جس کی تفصیل ہفت روزہ "بدر قادیان" انڈیا نے اپنی 6 فروری 1986ء کی اشاعت میں یوں شائع کی۔ (اسے ڈاکٹر وسیم احمد فریدی پی ایچ ڈی' ریڈر جینیٹنگ ڈویژن ڈیپارٹمنٹ ذوآلوجی مسلم علم گڑھ یونیورسٹی نے مرتب کیا۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تشریف آوری

پروفیسر سلام صاحب کی ساٹھویں سالگر پر رسالہ تہذیب الاخلق کے عبدالسلام نمبر کا اجراء

ڈیپارٹمنٹ آف بائیو ٹیکنالوجی اور سنٹر فار پرموشن آف سائنس کا افتتاح

دوران تقریب پروفیسر سلام صاحب کے نام پر کئی ایوارڈز کے جاری کرنے کا اعلان

علی گڑھ 14 جنوری 1986ء۔ آج شام پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب بذریعہ کار دہلی سے علی گڑھ وارد ہوئے۔ یونیورسٹی کی طرف سے نہایت پرجوش خیر مقدم کیا گیا اور روایتی شان و شوکت اور شہسوار دستے کی طرف سے گارڈ آف آنر میں اور ریڈ کارپٹ ویلکم (Red Carpet Welcome) سے تقریبات کا سلسلہ شروع ہوا۔

14 جنوری شام سات بجے انجینئرنگ کالج کمپلکس کے اسمبلی ہال میں ایک باوقار فنکشن میں تہذیب اخلاق رسالے کا (جس کے بانی سر سید احمد خان تھے) عبدالسلام نمبر کا اجراء پروفیسر عبدالسلام کے ہاتھوں نہایت خوبصورت اور جوش و خروش کے ساتھ ہوا۔ پوری تقریب بہت احسن رنگ سے منعقد ہوئی۔

بعد ازاں اسی رات آٹھ بجے ڈیپارٹمنٹ آف فزکس میں محترمی ڈاکٹر صاحب کو نہایت شاندار استقبالیہ دیا گیا۔ اس سلسلہ میں پورے ڈیپارٹمنٹ میں چراغاں کیا گیا 15 تاریخ کو ہندوستان کے پہلے بایو ٹیکنالوجی انسٹی ٹیوٹ آف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا سنگ بنیاد محترم پروفیسر عبدالسلام صاحب نے رکھا۔ اس سلسلے میں بہت سے پریس کے نمائندے خاص طور پر مدعو تھے۔ تیس (30) ملین روپے سے بننے والے اس انسٹی ٹیوٹ پر عبدالسلام صاحب نے خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ آپ نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی کوششوں پر یونیورسٹی کے رول (Role) کو بہت سراہا۔ بعد ازاں سابق گورنر بہار اور یونیورسٹی کے موجودہ چانسلر آف بہار یونیورسٹیز نے بھی اسے بہت سراہا۔

15 تاریخ کو دن کے بارہ بجے کینیڈی ہال آڈیٹوریم میں ایک نہایت شاندار اور پروقار تقریب میں سنٹر فار پروموشن آف سائنس کا افتتاح بھی ہوا۔ جس میں یونیورسٹی اور باہر کی بہت سی اہم شخصیتیں بھی شامل ہوئیں۔ اس تقریب کا آغاز تلاوت قرآن پاک کی سحرانگیز آیات اور اس کے انگریزی ترجمے سے

ہوا۔ بعد ازاں جناب وائس چانسلر کا استقبالیہ خطبہ ہوا جس میں پروفیسر صاحب کا مکمل تعارف ہوا۔ آپ نے نہایت پرجوش الفاظ میں تیسری دنیا کے واحد مسلم سائنس دان کو بہترین خراج عقیدت پیش کیا۔
اس کے بعد پروفیسر سلام صاحب کا تفصیلی خطاب تشہد و تعوذ سے شروع ہوا جو ایک گھنٹہ کا تھا۔ اس درمیان کینیڈی ہال کھچا کھچ بھرا تھا اور آپ کا خطاب مکمل خاموشی اور وقار کے ساتھ تمام احباب نے سنا اور اسے بہت سراہا۔ آغاز میں آپ نے تہذیب اخلاق رسالے کا شکریہ ادا کیا اور مزید فرمایا کہ دنیا کی کم و بیش 24 یونیورسٹیوں نے D.Sc کی اعزازی ڈگری دی ہے (1993ء تک ملنے والی اعزازی ڈگریوں کی تعداد 47 تھی) لیکن اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ مجھے کون سی ڈگری سب سے عزیز ہے تو میں بلا تکلیف کہوں گا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ڈگری سب سے پیاری ہے۔
آپ نے اپنی طویل تقریر میں نہایت مدلل طریق پر بتایا کہ قرآن کریم میں کم و بیش 750 آیات یعنی 1/8 قرآن صرف علم اور سائنس کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اور ان میں سے کم از کم 220 آیات صرف سائنس پر مبنی ہیں۔ آپ نے کہا کہ قرآن وہ کتاب ہے کہ جس کے بارے میں خود خدا نے فرمایا لا ریب فیہ اس میں کوئی شک نہیں۔

نذر عبدالسلام

سرسید اپنے ملک و قوم کی محبت میں ایسے سرشار تھے کہ ان کی زندگی کا کوئی لمحہ اس کی فکر سے خالی نہ تھا۔ سفر انگلستان کے دوران انہیں ایک نئی دنیا کی سیر کا موقع ملا جو ان کے اپنے ملک کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوش حال اور ترقی یافتہ تھی۔ جب وہ بہترین درسگاہیں دیکھتے تو ملال ہوتا کہ ہم ایسی درسگاہوں سے محروم کیوں ہیں' جدید طرز کی شاندار عمارتیں دیکھتے تو جی چاہتا ہماری عمارتیں ان سے بڑھ کر ہوتیں' انگلستان کے خوش رنگ پھولوں پر نظر پڑتی تو خواہش ہوتی تو کہ ایسے ہی پھول ہمارے چمنوں میں بھی لہلہائیں۔ مغربی اقوام کے صحت مند اور شاداب چہروں پر رشک آتا اور افسوس ہوتا کہ ہم ان کے مدمقابل کیوں نہ ہوئے۔ کچھ ایسی ہی تڑپ پروفیسر عبدالسلام کے دل میں بھی رہی ہے۔ سائنس کی دنیا پر یورپ کی حکمرانی دیکھ کر انہیں تاسف ہوا کہ ہمارے ملک ترقی کی اس دوڑ میں دوسروں سے پیچھے کیوں ہے۔ ٹیکنالوجی کے ہر میدان میں جاپان کو آگے بڑھتے دیکھ کر انہیں تیسری دنیا کا خیال آیا جو ابھی تک پوری طرح خواب سے بیدار بھی نہیں ہوئی۔ مسلم ممالک کی پسماندگی نے انہیں اور بھی زیادہ مغموم کیا کہ کبھی انہیں کے دم سے علم کا چراغ روشن تھا۔
سرسید نے اپنی تعلیمی اور اصلاحی سرگرمیوں کو ہندوستان اور پھر حالات سے مجبور ہو کر ہندوستانی مسلمانوں تک محدود رکھا۔ سرسید کے ایک صدی بعد پروفیسر عبدالسلام نے سائنس کے فروغ کا بیڑا اٹھایا تو ساری کوششیں اس پر صرف کر دیں کہ بلا امتیاز مذہب و ملت پوری دنیا کی پسماندہ اقوام کو کس طرح

ترقی یافتہ قوموں کے برابر کھڑا کریں لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں مسلمانوں کی حالت آج بھی کم و بیش وہی ہے جو سر سید کے زمانے میں تھی۔ اس لیے مسلمانوں کی طرف ان کی توجہ نسبتاً" زیادہ ہے۔

پروفیسر عبدالسلام کی صلاحیتوں کا اعتراف بہت پہلے کیا جانے لگا تھا اور کم عمری ہی میں انہیں رائل سوسائٹی کا فیلو منتخب کر لیا گیا۔ اب سے بائیس سال قبل وہ نظریاتی طبیعات کے عالمی مرکز (I.C.T.P) کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ 1979ء میں نوبل پرائز حاصل کرنے کے بعد اس کے قوی امکانات موجود ہیں کہ انہیں اس رشک اعزاز سے ایک بار پھر نوازا جائے۔ اتنے اعزازت و اعترافات کے بعد عجب نہ تھا کہ دوسرے عظیم سائنس دانوں کی طرح وہ بھی سائنسی تحقیق کی دنیا میں گم ہو کے رہ جاتے مگر انہوں نے تیسری دنیا کے لیے ایک سائنس اکیڈمی (TWAS) قائم کی ہے جس کی سرگرمیوں کا آغاز ہو چکا ہے۔ کچھ دنوں پہلے تہذیب الاخلاق کے صفحات پر اس خیال کا اظہار کیا گیا تھا کہ ہندوستان میں بھی ایک ایسے ہی ادارے کی ضرورت ہے جو خاص طور پر مسلمانوں کو سائنس کی طرف متوجہ کر سکے۔ الحمدللہ کہ سینٹر فار پرموشن آف سائنس کے نام سے علی گڑھ میں یہ ادارہ پروفیسر اسرار احمد کی کوششوں سے وجود میں آ چکا ہے جسے حکومت ہند کے علاوہ پروفیسر عبدالسلام اور ان کے مرکز کی مکمل سرپرستی حاصل ہے۔

تہذیب الاخلاق اس سائنسی مرکز کا ترجمان ہے اور اس کے ذریعے سائنس کو فروغ دینے کی کوششیں جاری ہیں۔ اور تہذیب الاخلاق کے ساتھ پندرہ روزہ ہندی ''نشانت'' میں بھی سائنس پر مضامین شائع کیے جا رہے ہیں۔ پروفیسر عبدالسلام تہذیب الاخلاق کے لائف ممبر ہیں۔ یقین ہے کہ ان بامقصد رسالوں کو ان کی اور ان کے مرکز کی سرپرستی ہمیشہ حاصل رہے گی۔

تہذیب الاخلاق کا یہ خصوصی شمارہ پروفیسر عبدالسلام کی ساٹھویں سالگرہ پر ان دعاؤں کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے کہ تیسری دنیا بالخصوص عالم اسلام میں سائنس کے فروغ کے لیے پروفیسر صاحب جو مساعی فرما رہے ہیں خدا انہیں کامیاب کرے اور اپنی قوم کی ترقی کے لیے ان کے دل میں جو امنگیں اور آرزوئیں ہیں وہ اس قوم کے نونہالوں کو بھی عطا ہوں۔

نور الحسن نقوی

☆ اداریہ تہذیب الاخلاق' عبدالسلام نمبر جنوری 1986ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یقین محکم، عمل پیہم

پروفیسر عبدالسلام

میں جھنگ کالج میں 1938ء میں 12 سال کی عمر میں داخل ہوا۔ چار سال یہاں گزارے۔ اس زمانے میں یہ کالج انٹرمیڈیٹ کالج تھا۔ نویں، دسویں فرسٹ ائیر اور سیکنڈ ائیر کی کلاسیں تھیں۔ کثرت ہندو طلباء کی تھی۔ میری خوش قسمتی تھی کہ کالج میں مجھے نہایت قابل اور شفیق استاد ملے۔ پرنسپل گجرات کے حکیم محمد حسین محروم تھے۔ انگریزی کے استاد شیخ اعجاز احمد، عربی کے شفیق استاد صوفی ضیاء الحق، فارسی کے استاد خواجہ معراج الدین، حساب اور سائنس کے مضمون اس زمانے میں ہندوؤں اور سکھوں کی ملکیت سمجھے جاتے تھے۔ حساب میں لالہ بدری ناتھ اور لالہ رام لال۔ فزکس کے استاد لالہ ہنس راج اور کیمسٹری کے استاد لالہ نوبت رائے تھے۔

میرے تعلیمی کیریر کی بنیاد اسی کالج میں پڑی۔ میں سمجھتا تھا کہ میری بعد کی حقیر کامیابیاں اس کالج کی تعلیم اور میرے جھنگ کے استادوں کی شفقت کی مرہون منت ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ استاد کی شفقت اور توجہ کی نگاہ شاگرد کو آسمان تک پہنچا سکتی ہے۔ اس توجہ کی ایک مثال عرض کروں، فرسٹ ائیر کے دوران میں نے انگریزی کے بہت سے نئے اور خوبصورت لفظ سیکھے۔ پسند آئے اور میں اپنی تحریر میں ان مشکل اور بعض اوقات متروک لفظوں کو بے تکلف اور بے محل استعمال کرنے لگا۔ استاد گرامی جناب شیخ اعجاز صاحب نے کئی بار ٹوکا۔ تنبیہہ فرمائی۔ میری طرف سے تعاون نہ ہوا۔ سہ ماہی کا امتحان آیا جناب شیخ صاحب نے پرچہ مارک فرمایا۔ ہر متروک اور بے محل لفظ کے استعمال پر فی لفظ پانچ نمبر کے حساب سے نمبر کاٹ لیے۔ ظاہر ہے میرا ٹوٹل صفر کے قریب جا پہنچا پھر اسی پر اکتفا نہ کی، کلاس میں میرا پرچہ لائے اور ہر ہر غلط لفظ کا تذکرہ کلاس کو سنایا۔ اس کے بعد پرچہ میرے حوالے کیا اس پر تحریر تھا۔

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی
کیں راہ کہ میروی تبرکستان است

اس وقت مجھے یہ خصوصی سلوک بہت ناگوار گزرا، لیکن اب میں غور کرتا ہوں تو یہ سراسر شفقت تھی، نوازش تھی، کرم تھا۔ اس Shock Therapy کا اثر یہ ہوا کہ کم از کم انگریزی میں خوبصورت لیکن بے محل لفظ استعمال کرنے کی عادت چھوٹ گئی۔

میری تعلیم جہاں استادوں کی مرہون منت تھی۔ اس سے زیادہ قبلہ والد صاحب کی نگہ اور ان کی دعاؤں کی مرہون منت تھی۔ اس زمانے میں میٹرک کا امتحان صوبہ پنجاب کے لیے ایک قسم کا اکھاڑا ہوا

کرتا تھا۔ جس میں مختلف اسکولوں کے پہلوان دنگل کیا کرتے تھے۔ خاص طور پر سناتن دھرم اور آریہ سکولوں کے طلباء اس دنگل کے نامی پہلوان تصور کیے جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے جس دن میٹرک کا نتیجہ نکلا میں گھیانہ کچری میں قبلہ والد صاحب کے دفتر میں بیٹھا تھا' رزلٹ کی کاپی دوپہر کے وقت لاہور سے گھیانہ اسٹیشن پہنچی۔ والد صاحب نے آدمی بٹھا رکھا تھا۔ کاپی ان کے دفتر میں لائی گئی۔ ساتھ ہی لاہور سے مبارک بادوں کے تار آنے لگ گئے۔ جس طرح میں نے عرض کی ہے اس زمانے میں میٹرک کا رزلٹ ایک نیشنل Event کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی وجہ ہندو Community کی علم دوستی تھی۔ مجھے یاد ہے دو بجے دوپہر سائیکل پر سوار ہو کر میں گھیانہ سے جھنگ شہر واپس لوٹا۔ رزلٹ کی خبر جھنگ شہر میں میرے آنے سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ چوکی پولیس والے گیٹ سے مجھے بلند دروازہ (اس نام کا جھنگ میں کوئی دروازہ نہیں۔ سہوا لکھا گیا ہے۔ ہمارا گھر (آبائی) کھیوہ دروازہ اور نور شاہ دروازہ کے درمیان تھا جبکہ ہمارے والد کا بنایا ہوا گھر بیرون دروازہ مُمنے والا تھا۔ اس وقت ہم وہاں مقیم تھے۔ مرتب) کی طرف جانا تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے۔ وہ ہندو دوکان دار جو عموماً" مئی کی اس تیز گرم دوپہر کے وقت اپنے کھاٹوں پر دوکانوں کے چھپروں کے سائے تلے سوئے ہوئے تھے۔ جس وقت میں سائیکل سے گزرا۔ اس روز وہ سب تعظماً" اپنی دوکانوں میں میرے آنے کے انتظار میں قطاروں میں کھڑے تھے۔ ان کی اس علم نوازی کا نقشہ ہمیشہ میرے دل پر رہا ہے۔

میں جھنگ سے گورنمنٹ کالج لاہور اور وہاں سے کیمبرج پہنچا۔ کیمبرج میں انگریز طلباء کی علم نوازی کا ایک نیا مشاہدہ ہوا۔ کیمبرج کے کلاس روم میں طالب علم اس انداز سے بیٹھتے ہیں جس طرح نماز سے پہلے نمازی مسجد میں آکر بیٹھتے ہوں۔ لیکچرار کے آنے سے پیشتر ایک سناٹا ہوتا ہے۔ لیکچر کے درمیان میں انگریز طالب علم چار چار قسم کی سیاہیوں والا قلم صحیح لکیریں ڈالنے کے لئے رولر استعمال کر رہا ہوگا' اس کی نوٹ لینے والی کاپیاں ایسی احتیاط سے لکھی گئی ہوں گی جیسے پروفیشنل خوش نویس لکھ رہا ہو۔ میرے ساتھ والے طالب علم براہ راست اسکولوں سے آئے تھے' عمر میں مجھ سے سب کم تھے لیکن ان کی خود اعتمادیوں اور ان کی امنگوں کا وہ عالم تھا جسے تحصیل کرنے کے لئے مجھے کم از کم دو سال درکار ہوئے۔ وہ ایسے ماحول سے آئے تھے' جس میں ان کے اسکولوں کا استاد اچھے پڑھنے والے بچوں کو یہ سمجھا کر کیمبرج روانہ کرتا کہ عزیزو تم اس قوم کے فرزند ہو جس میں نیوٹن پیدا ہوا تھا۔ سائنس اور ریاضی کا علم تمہاری میراث ہے اگر تم چاہو تو تم بھی نیوٹن ہو سکتے ہو۔

کیمبرج میں ڈسپلن کا انداز بھی میرے لئے نیا تھا۔ کیمبرج میں بی اے کا امتحان آپ زندگی میں صرف ایک بار دے سکتے ہیں۔ خدانخواستہ فیل ہو جائیں تو پھر دوسری بار امتحان دینا ممکن نہیں۔ ہوسٹل کے ڈسپلن کا یہ عالم تھا کہ دس بجے رات تک آپ بلا اجازت کالج سے باہر رہ سکتے ہیں' دس سے بارہ بجے تک ایک پنی جرمانہ لیکن اگر آپ 12 بجے کے بعد آئے تو سات دن کی Gating ہو گی اور اگر سال کے دوران 3 بار ایسا ہوا تو آپ کو کیمبرج سے نکال دیا جائے گا۔ کیمبرج میں ہر طالب علم Adult تصور کیا جاتا ہے۔ اپنے سب کاموں میں مکمل ذمہ دار گنا جاتا ہے۔ اس سے بے جا تعرض نہیں ہوتا لیکن اس کے ساتھ سزائیں بھی وحشیانہ ہیں' جنہیں وہ طالب علم مردانہ وار قبول کرتے ہیں۔

کیمبرج کا طالب علم ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہوتا ہے' مجھے یاد ہے پہلے دن جب میں St.Johns College پہنچا۔ میرا 30 سیر کا بکس ریلوے اسٹیشن سے تو Taxi پر چلا آیا لیکن جب کالج پہنچ کر میں نے پورٹر کو بلایا اور کہا یہ میرا بکس ہے' اس نے کہا ٹھیک ہے وہ Wheel Barrow ہے۔ آپ اسے اٹھایئے اور باقیوں کے ساتھ اپنے کمرے میں لے جایئے۔ ان پرانے قصوں کی باز خوانی محض ذاتی خط لینے کے لئے نہیں کر رہا۔ میں تعلیم اور علم نوازی کے موضوع پر چند گزارشات کرنا چاہتا ہوں اور اس سلسلہ میں یہ داستانیں میرے مضمون کا حصہ ہیں۔

آپ نے یقیناً غور فرمایا ہوگا کہ ہماری تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ تعلیمی پسماندگی اور خصوصیت سے غلط اور ناقص تعلیم ساری قوم کا مسئلہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قوم اس وقت جس بحران سے گزر رہی ہے' اس کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ قوم نے اپنے تعلیمی نظام کی طرف توجہ نہیں دی۔

تعلیمی نظام کا اولین کام شخصی کردار کو ڈھالنا تصور کیا جاتا ہے۔ کردار کی جو بنیاد کالج میں بنتی ہے' وہ زندگی بھر شاید ہی بدلتی ہے۔ لیکن میں شخصی کردار کے بارے میں عرض نہیں کروں گا۔ میرا رخ ہمارے تعلیمی نظام کے قومی پہلوؤں کی طرف ہے۔ دو سو سال کی غلامی کے بعد پاک پروردگار نے ہمیں آزادی عطا فرمائی تھی۔ اس بات کو اب تقریباً چالیس سال گزر چکے ہیں' لیکن اس طویل عرصہ میں ہم اپنے اندر احساس یگانگت' احساس اخوت اور احساس قومیت پیدا نہ کر سکے۔

آزادی کے بعد ہمارے تعلیمی نظام کا اولین فرض یہ ہونا چاہیے تھا کہ ہماری یگانگت اور قومیت کے احساس کو پختگی دیتا۔ یگانگت اور قومیت کا تصور مختلف زبانوں میں بدلتا چلا آیا ہے' آج کے تصور کے لحاظ سے دنیا کے کئی ملکوں اور قوموں کی مثالیں ملتی ہیں جن کا استحکام محض ان کے تعلیمی نظام کا مرہون منت ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ کا حال لیجئے۔ امریکہ کے یونائیٹڈ سٹیٹس میں انگریز' جرمن' اٹالین' سویڈش' فرانسیسی سب قبیلوں کے لوگ بستے ہیں۔ میں ان لوگوں کو قبیلوں کا نام دے رہا ہوں' یہی وہ لوگ ہیں جو یورپ میں اپنی علیحدہ قومیت کے لئے دو عظیم جنگوں میں جانیں دے چکے ہیں۔ ان کی زبانیں امریکہ آنے سے پہلے مختلف تھیں۔ مذہب مختلف تھے اور اب بھی مختلف ہیں' لیکن امریکہ کے تعلیمی نظام نے جسے ایک Crucible میں پگھلا کر ان قبیلوں کو ایک واحد قومیت میں منسلک کر دیا ہے۔ اسکولوں میں ہر بچے کو امریکن کانسٹی ٹیوشن حفظ کرائی جاتی ہے۔ امریکن ہیرو اس کے زبان زد ہوتے ہیں۔ دن رات وہ امریکن ترانے سنتا ہے۔ ادیب' لکھنے والے' شاعر' افسانہ نویس اس طرز سے لکھتے ہیں کہ امریکہ کے ہر ہر خطے سے محبت اس کے شہری کے خمیر میں رچ جائے۔ امریکہ کے شہری کو نہ صرف اپنے شہر سے محبت کا درس دیا جاتا ہے' وہ اپنے آپ کو امریکہ کے ہزاروں شہروں کا شہری سمجھتا ہے۔ دور افتادہ یورپ کی گلیوں سے جہاں سے وہ یا اس کے آباؤ اجداد آئے تھے اسے مناسبت نہیں رہتی۔ اسے اپنے اس خطے سے

مناسبت ہوتی ہے جس سے اس کا کھانا اس کا پینا اس کا روزگار اور اس کا ہر وسیلہ متعلق ہے' اس خطے کو بڑھانے اور چمکانے کے لئے کوشاں رہتا ہے اور یہ سب کچھ اسکولوں' کالجوں' اخبارات' رسائل اور T.V کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارا نظام تعلیم یگانگت کے احساس کو Consciously اجاگر کرے۔

میری دوسری گزارش ٹیکنالوجی اور سائنس کی تعلیم کے بارے میں ہے۔ ہندوستان اور پاکستان اقتصادی طور پر پس ماندہ ہیں۔ یہاں ایک فرد کی اوسط آمدنی ستر ڈالر کے قریب بنتی ہے۔ ایک امریکن ہماری نسبت پچاس گنا زیادہ کماتا ہے۔ انگلستان کے ایک فرد کی اوسط آمدنی ہم سے بیس گنا زیادہ ہے۔ جاپان کی پندرہ گنا زیادہ ، ایران کی آٹھ گنا زیادہ ، ترکی کی آٹھ گنا زیادہ ، عراق ، الجیریا، شام' مصر کی فی کس آمدنی ہم سے چھ گنا زیادہ ہے۔ افریقہ میں گھانا کی فی کس آمدنی ہماری نسبت سے چھ گنا زیادہ ہے۔ ہم قومی طور پر اس قدر غریب کیوں ہیں۔مان لیا کہ ہماری بہت سی قومی دولت انگلستان والوں نے دہلی' پنجاب اور سندھ پر سو سالہ حکومت کے زمانے میں لوٹ لی۔ مان لیا کہ امریکہ خوش قسمت ہے۔ امریکہ والوں کو قدرتی اور معدنی وسائل سے بھرپور ایک خالی خطہ زمین مل گیا لیکن پوچھنے والا ہم سے سوال کر سکتا ہے کہ ہم انگریز کے غلام کیسے بنے۔ اگر انگریز فن جہاز رانی سے واقف تھا اور ہم نہیں تھے تو یہ فن اسے کس نے سکھایا۔ اگر کلایو کی Flint Lock رائفلوں' بندوقوں اور توپوں کی ساخت اتنی اعلیٰ تھی کہ سراج الدولہ کی فتیلہ سوز Match Locks ان کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھیں' تو بندوق سازی کا یہ فن کس نے انگریز کو ودیعت کیا۔ کیا یہ فن اس قوم نے ایجاد نہیں کیا تھا۔ کیا یہ فن ایجاد کرنے کے بعد تعلیم کے ذریعے سے انگریز نے خود ہی اسے اپنی قوم میں فروغ نہیں دیا۔

پانی پت کے میدان میں بابر کی فتح بابر کے رومی توپ خانے کی مرہون منت تھی۔ رومی ترک تو اس فن میں 1526ء کے بعد مزید تحقیق کرتے رہے' لیکن بدقسمتی سے بابر کی اولاد کو توفیق نہ ہوئی کہ وہ توپ سازی کے فن میں ترقی کے لئے باقاعدہ تجربہ گاہ بناتے۔ آپ قسطنطنیہ میں تشریف لے جائیں' رومی ترک کا مسجد کا تصور اپنے زمانے میں یہ تھا کہ ہر شاہی جامعہ کے ایک طرف اسپتال بنے گا' دوسری طرف مدرسہ' یہ مدرسہ صرف دینی درس گاہ ہی نہیں ہوگا' اس میں توپ سازی کے تجربے بھی ہوں گے۔ بدقسمتی سے جو ترک پاکستان اور ہندوستان آئے' علم سے ان کی رغبت نسبتاً کم تھی۔ وہ اپنی یادگاریں مزار اور مقبرے تو چھوڑ گئے' مدرسے اور تجربہ گاہیں نہیں۔

اگر خدا کی ذات نے امریکن پر رزق کھولا اور اسے ایک نئے Continent سے نوازا تو کیا یہ اس کے اس عزم کا بدلہ نہ تھا' جس نے اسے بے کنار سمندروں میں نئے Continents کی دریافت میں طوفانوں سے اڑا دیا۔ اگر آج جاپان نے اپنی Industry کی دھاک ساری دنیا میں بٹھادی ہے تو اس میں جاپانی نظام تعلیم کا کتنا حصہ ہے۔ خدا کے فرشتے جاپانیوں کو Technology کی تعلیم دینے کیلئے نازل

نہیں ہوتے۔ ایک زمانہ تھا کہ جاپان کا مال دنیا کی منڈیوں میں ناکارہ شمار کیا جاتا تھا۔ اب ٹیکنیکل لحاظ سے سب سے زیادہ اسی کی ساکھ ہے۔ British Leyland نے Mini morris کار تیار کی۔ جاپان والوں نے وہی کاریں بنائی ہیں۔ بجائے 1000 c.c. کے جاپانی 600 c.c. کے آدھے سائز کے انجن سے وہی پاورDevelop کرتا ہے۔ یہ کس طرح ہوتا ہے؟ بیس سال ہوئے امریکہ کے پروفیسرTownes نے ٹرانسسٹر ایجاد کیا۔ انہیں اس دریافت پر نوبل پرائز ملا۔ ان کا Patent توڑنے کے لئے ٹوکیو کی یونیورسٹیوں میں کوشش شروع ہوئیں اور اس قدر کامیاب ہوئیں کہ اس وقت سے الیکٹرونکس میں جاپانی بادشاہ ہیں۔ نہ صرف انہوں نے وہ ایجاد دباورہ دریافت کی بلکہ انہوں نے اس کا نسخہ رسالہ عام میں شائع کردیا' تاکہ جو چاہے ہندوستانی ہو' پاکستانی ہو' عرب ہو' ایرانی ہو' ٹرانسسٹر ٹیکنالوجی کو Develop کر سکتا ہے۔

یہ علم کے رستم جاپانی کون ہیں۔ آپ یقین نہ کریں گے' یہ وہی لوگ ہیں جو انیسویں صدی کے اوائل میں گھوڑوں کی نعل بندی کے فن سے ناآشنا تھے۔ ایڈمرل Perry امریکن ایڈمرل جب پچھلی صدی میں اپنے جنگی جہاز جاپان لے کر آئے اور جاپانیوں نے انہیں روکنا چاہا تو جہاز کی توپوں کی چند باڑوں نے جاپان والوں کو اپنی بندرگاہیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ امریکن ایڈمرل کے جہاز سے ایک چوری ہوئی' وہ ایک گھوڑے کی چوری تھی۔ رات کے وقت گھوڑا غائب ہوگیا اور دوسرے دن اسے واپس کر دیا گیا۔ جاپانی اس کے نعل غور سے دیکھنے اور نعل بندی سیکھنے کے مشتاق تھے۔ اس وقت ان کی Metallurgy اس حد تک نہ پہنچی تھی کہ وہ لوہے کے نعل بناتے۔

آج کیفیت یہ ہے کہ جاپان کے میٹرک کے امتحان کا موسم خودکشی کا موسم کہلاتا ہے۔ اس امتحان کے نتائج پر آئندہ داخلے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا معیار اس قدر بلند ہوتا ہے کہ اس عمر کے بچے دنیا کے کسی اور ملک میں ریاضیات' فزکس اور کیمسٹری اس سے اعلیٰ سطح پر امتحان نہیں دیتے۔ ان امتحانوں کے دوران میں پرچوں کے راز افشاء نہیں ہوتے۔ اسٹرا ئیکیں نہیں ہوتیں' امتحان کے سینٹروں کے دروازے اور شیشے توڑے نہیں جاتے۔ ساری قوم' سب والدین طالب علم Examination Fever کا شکار ہوتے ہیں اور پھر یہ لوگ ان امتحانوں کے نتائج کو اپنی مخصوص طرز پر قبول کرتے ہیں۔

ستمبر کے مہینے میں مجھے خوش قسمتی سے چین جانے کا موقع ملا۔ چین کے مڈل اسکول میں طالب علم بارہ برس کی عمر میں آتا ہے اور سترہ برس کی عمر میں ان کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ ان مڈل اسکولوں کو میرے طالب علمی کے زمانے کے انٹرمیڈیٹ کالج سمجھ لیجئے۔ ان 5 سالوں میں لازمی تعلیم کی وجہ سے ہر چینی کو 12 مضامین پڑھنا پڑھتے ہیں۔ جن میں کوئی مضمون اختیاری نہیں ہوتا۔ وہ بارہ مضامین مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ وطنیات　　　　2۔ چینی زبان

3۔4 دو غیر ملکی زبانیں　　　　انگریزی روسی یا جاپانی

5۔ ریاضی　　6۔ فزکس
7۔ کیمسٹری　　8۔ بیالوجی اور زراعت
9۔ تاریخ　　10۔ جغرافیہ
11۔ آرٹس' ڈراما' میوزک　　12۔ ورک شاپ

ہر طالب علم پورے بارہ مضمون پڑھتا ہے۔ چینیوں نے فیصلہ یہ کیا ہے کہ سو فیصدی طالب علم سائنس اور آرٹس دونوں پڑھیں گے۔

آپ شاید یہ گمان فرمائیں کہ سائنس کی اس لازمی تعلیم کالازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ ان مضمونوں کا معیار 16/17 برس کے طالب علم کے لئے ہمارے انٹرمیڈیٹ کے معیار سے کم ہوگا۔ اس کا تجربہ کرنے کے لئے میں نے فزکس اور Mathematics دونوں کے ایک ایک گھنٹے کے درس Attend کئے' Mathematics میں میرے تعجب کی انتہا نہ رہی' جب میں نے دیکھا کہ چودہ سالہ طالب علم Orders of Infinity پڑھ رہے ہیں۔ یہ مضمون ہے جو ہم لوگ بی اے میں پڑھاتے ہیں۔

چین نے تہیہ کیا ہے کہ وہ ہر Industrical Technique کو چین میں رائج کریں گے۔ ان کی نئی قومی زندگی ہمارے دو سال بعد 1949ء میں شروع ہوئی۔ لیکن ان کے اس عزم کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان 40 سالوں میں انہوں نے قومی سطح پر Electronics کا فن اس کے آخری مرحلوں تک حاصل کیا ہے۔ فولاد سازی 40 ہزار ٹن سالانہ سے شروع کر کے آج انگلستان کے برابر دو کروڑ ٹن تک جا پہنچی ہے۔ وہ اب Sophisticated Machine Tools بناتے ہیں۔ مگ 21 ہوائی جہاز بناتے ہیں۔ ہر چینی طالب علم اپنے اسکول اور اپنی یونیورسٹی کے زمانے میں ہفتے میں ایک دن Workshop Practice میں صرف کرتا ہے' جس اسکول کا معائنہ میں کرنے گیا تھا' اس میں یہ کیفیت تھی کہ 14 سال سے 16 سالہ طلبا کا ایک گروپ Transister Components بنا رہا تھا۔ دوسرا گروپ Potasium Carbonate معدنی صورت سے لے کر Grinding Titration وغیرہ کرنے کے بعد بوتلوں میں بند مارکیٹ کے لئے تیار کر رہا تھا۔ 12 سالہ 4 طالب علموں کا ایک گروپ اپنے ہم جماعتوں کے باقی طلبا کے جوتوں کی مرمت کرنے میں مصروف تھا۔ ان میں سے ایک بچی بول اٹھی۔ آپ اس کمرے کی کھڑکیوں پر نگاہ ڈالیں' ان پر پردے ڈالے ہوئے ہیں۔ ہم نے جب پہلے جوتوں کی مرمت شروع کی تھی تو ہم بدبودار جوتوں کو ہاتھ لگانے سے شرماتے تھے۔ کھڑکیوں پر پردہ ڈالے رہتے تھے۔ آہستہ آہستہ ہمیں اس محنت سے اب شرم نہیں آتی۔ ضروری ہے کہ ہم اپنی طالب علمی کے زمانے میں Productive ہوں Parasite نہ ہوں۔ سارے چین میں یونیورسٹی کالج اور اسکول کے طلبا اور استاد اپنی تعطیلات گرما فیکٹریوں اور فارموں پر گزارتے ہیں۔

آپ میری باتوں میں مبالغہ سمجھیں گے۔ یقین مانیئے مجھے بھی کوئی آکر یہ کہانی سناتا کہ اتنا بڑا ملک اس قدر یک جہتی سے چل رہا ہے تو میں ہرگز نہ مانتا' لیکن اپنے مشاہدے کو کس طرح جھٹلاؤں۔ ایک بار

نہیں میں تین بار چین کا سفر کر چکا ہوں۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ 70 کروڑ انسان اسی طرح قومی مفاد کے لئے نہ صرف اپنے ذاتی منافع کو قربان کر سکتے بلکہ اس سے بھی زیادہ قومی خودی میں اپنی انفرادی خودی مدغم کر سکتے ہیں' اس قوم کا ہر فرد دن رات ان تھک طریقے پر کام کرتا ہے۔ ان کے شہر جو 1949ء میں مکھیوں سے بھنبھناتے تھے۔ پیکینگ جہاں شاہی محل کے عقب میں Dragon Sea کے نام سے معروف گندگی کی تیس فٹ چوڑی نہر تھی جو 300 سال سے صاف نہ ہوئی تھی۔ یہ شہراب آئینہ کی طرح صاف ہیں اور یہ صفائی خاک روبوں کی مرہون منت نہیں۔ یہ صفائی وکیلوں' استادوں' طالب علموں' سیاستدانوں' دکان داروں کی مرہون منت ہے۔ یہ کام اسٹوڈنٹس یونینوں سے لیا گیا تھا اور وہ اس معاملے میں مقدم اور پہلے کرنے والی تھیں۔

یہ صحیح ہے کہ چینی نظام شاید قائم اس لئے ہے کہ یہ Equalitarain نظام ہے۔ چینی وزیر سائیکل پر دفتر آئے گا۔ سرکاری کارتب استعمال کرے گا جب وہ آپ کو Visitor کی حیثیت سے Receive کرنے آئے گا۔ ان چیزوں کا اثر یہ ہے کہ قوم ایثار کرتی ہے۔ لیکن یہ کہنے کے باوجود میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس سسٹم کا اس قوم کے اس عزم سے کہ Technology اور فن سیکھے جائیں گے' براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ چین سے پہلے میں انگلستان اور جاپان کی مثالیں عرض کر چکا ہوں۔

چین کے بیان میں میں اپنے موضوع سے بہت دور ہٹ گیا۔ میں عرض کر رہا تھا کہ اگر انگیز نے Industrial Technique ایجاد کیے اور انہیں تعلیم کے ذریعے اپنی قوم میں پھیلایا۔ اگر جاپان تعلیمی نظام کے ذریعے بغیر معدنی یا دیگر وسائل رکھنے کے اپنی ساری قوم میں Skills پھیلا سکتا ہے' اگر چین والے اپنی قوم کو ذہنی اپاہج نہیں سمجھتے اور ہر بچے سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی قسم کی سائنس اور کوئی نہ کوئی Skill سیکھے گا' اسے بڑھائے گا۔ اگر یہ سب قومیں اپنی غربت کا علاج اس طرح کر رہی ہیں تو کیا اس میں ہمارے لئے سبق نہیں ہے۔ آپ فرمائیں گے کہ غریبی خود ایسی لعنت ہے کہ اگر انسان بھوکا ہو' ننگا ہو تو اس کی دماغی صلاحیتوں کے بڑھانے کی طرف توجہ ہی نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں مجھے جرمنی کا ایک واقعہ نہیں بھولتا۔ 1947ء کی رات ہے۔ میں کیمبرج میں طالب علم تھا۔ جرمنی شکست کھا چکا تھا۔ جرمن قوم سرنگوں تھی۔ کیمبرج اور دیگر یونیورسٹیوں کے طلبا کی ایک پارٹی کو امریکن کنٹرول کمیشن والوں نے جرمنوں کی حالت دیکھنے کے لئے دعوت دی۔ تقریباً 500 کے قریب طالب علم سارے یورپ سے میونخ پہنچے۔ اس شہر میں ایک عمارت بھی نہیں تھی جو صحیح و سالم ہو۔ اس طرح معلوم ہوتا تھا کہ جرمن مکانوں میں نہیں بلوں میں رہ رہے ہیں۔

ہمارے لئے شہر کے ایک پارک میں خیمے لگائے گئے۔ ان خیموں کے شہر میں میں نے سنا کہ ایک جرمن میری تلاش کر رہا ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ ایک ریسرچ اسکالر ہے۔ اس وقت کے لحاظ سے اسے شاید 25 روپے ماہوار ملتے تھے۔ اس مشاہرہ سے شاید وہ ایک وقت کی روٹی کھا سکتا تھا۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ جنگ کے دنوں میں وہ ایک جنگی قیدیوں کے کیمپ میں ملازم تھا۔ جہاں بعض پنجابی قیدی بھی تھے۔ ان پنجابی قیدیوں سے اس نے پنجابی زبان کی تحصیل کی 1947ء میں یہ جرمن ایک پنجابی جرمن ڈکشنری

کی تالیف کر رہا تھا۔ پنجابی زبان میں اس کا کل سرمایہ میروارث شاہ کی ایک کاپی اور ایک لاہور سے چھپی ہوئی اور انتہائی خستہ حالت میں پھٹی ہوئی دلا بھٹی کی کاپی تھی۔ یہ سن کر شہر میں ایک پنجابی وارد ہے' وہ جرمن میری تلاش کر رہا تھا کہ دلا بھٹی میں بعض مشکل مقامات میں اسے سمجھا دوں۔ اس کی بدقسمتی سے یہ مقامات میرے لئے بھی بہت مشکل تھے اور اس بے چارے کی یہ خواہش تشنہ تکمیل رہ گئی۔

اس واقعہ پر غور فرمایئے۔ مجھے معلوم نہیں وہ ڈکشنری شائع ہوئی یا نہیں۔ اگر شائع ہوئی بھی تو اسے کتنے لوگ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہ ایک علم دوست قوم کی کہانی ہے۔ ایسی قوم جس کا سارا اثاثہ علم ہے۔ سائنس کا علم' ٹیکنالوجی کا علم زبانوں کا علم اور پھر ایسی قوم جس کے افراد میں یہ عزم ہے کہ جرمن پنجابی ڈکشنری کا لکھنا بے معنی ہی سہی لیکن اپنا وقت تاش کھیلنے میں نہیں گزاریں گے۔ اسٹرائیکس نہیں کریں گے۔ فلمیں نہیں دیکھیں گے' اپنے یونیورسٹی کے وقت کو کھیل کا وقت نہیں سمجھیں گے' علم سیکھیں گے اور علم پیدا کریں گے۔ شاید اس میں ہمارے لئے بھی سبق ہو سکتا ہے۔

اسی سلسلے میں ایک کہانی دہرانا چاہتا ہوں۔ یہ داستان چیئرمین ماؤ نے بیان کی تھی اور اسے آپ ہر چینی کی زبان سے سنیں گے۔

"پرانے زمانے میں چین کے شمال میں ایک بوڑھا رہتا تھا۔ اس کا نام "پیر کم عقل" تھا۔ اس بوڑھے کے مکان کی سمت جنوب کی طرف تھی' لیکن اس کے دروازے کے سامنے ہانگ اور وانگ وو کے دو عظیم پہاڑ کھڑے تھے' جن کی وجہ سے سورج کی کرنیں اس کے گھر میں کبھی نہ پہنچتی تھیں۔ ایک دن اس بوڑھے نے اپنے جوان بیٹوں کو بلایا اور انہیں کہا کہ آؤ ہم اس پہاڑ کو کھود کر دور کر دیں۔ اس کے ہمسائے نے جن کا نام "پیر دانش ور" تھا' اس بے عقل بوڑھے سے کہا۔ میاں مجھے معلوم تھا کہ تم بیوقوف ہو لیکن اتنا گمان نہ تھا کہ اس قدر کم عقل ہو گے۔ تم کھودنے سے کس طرح ان دونوں پہاڑوں کو رفع کر سکو گے' بے عقل بوڑھا بولا: "تمہارا کہنا درست ہے' لیکن اگر میں مر گیا تو اس کے بعد میرے بیٹے ہیں' ان کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے' ان کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے۔ یہ سلسلہ ہمیشہ رہے گا۔ پہاڑ اور زیادہ طویل نہیں ہوں گے۔ ہر کھودنے کے ساتھ ان کی طوالت کم ہی ہوگی' بڑھے گی نہیں۔ ایک دن یہ لعنت ہمارے دروازے سے دور ہو ہی جائے گی۔"

پیر کم عقل کی یہ بات سن کر پاک ذات کو ترس آیا۔ دو فرشتے آئے اور انہوں نے ان دونوں پہاڑوں کی لعنت کو دور کر دیا۔

میری عرض یہی ہے سوسائٹی کی لعنتیں ان دو پہاڑوں کی مانند ہیں۔ انہیں اپنے حلقہ اثر میں Patience کے ساتھ دور کرنے میں کوشاں ہو جایئے۔ اللہ تعالیٰ کی پاک ذات کو آپ کی کوششوں پر بھی ترس آئے گا۔ آمین۔

یہ فکر نہ کیجئے کہ آپ کی کوشش کامیاب ہوگی یا نہیں۔ آپ اپنا فرض ادا کیجئے' خداوند تعالیٰ کی پاک ذات ان میں برکتیں ڈالے گی۔

پروفیسر آئی۔احمد
ڈیپارٹمنٹ آف فزکس' اے ایم یو

عبدالسلام ایک مجاہد سائنس دان

یقین محکم' عمل پیہم' محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

("تہذیب الاخلاق" جنوری ۱۹۸۶' عبدالسلام نمبر)

اقبالؒ کے اس شعر پر سبھی جھوم اٹھتے ہیں' لیکن اقبال کے مرد کی شمشیر ہاتھ میں لے کر اٹھنے کا حوصلہ بہت کم کو ہوتا ہے۔ نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام ان چند جیالوں میں سے ہیں' جس نے نہ صرف اس شمشیر کو اٹھایا بلکہ اس سے بھرپور جہاد بھی کیا۔ 29 جنوری 86ء کو ساٹھ سال پوری ہونے والی ان کی زندگی اقبال کے اس شعر کی تفسیر ہے۔

ساٹھ سال کا زمانہ -- کائناتی پیمانہ پر اس کی حقیقت ایک خفیف ترین وقفہ سے زیادہ نہیں۔ البتہ جب یہی زمانہ کسی مرد کامل کے ہاتھوں کائنات کی حقیقتوں پر پڑے ہوئے دبیز پردوں کو اٹھانے' منشائے تخلیق کی تہ تک پہنچنے اور مخلوق کائنات کے درد کو سمجھنے اور بانٹ لینے میں صرف ہو تو وہ مستقبل کو جذب کر کے ایک لامتناہی حجم اختیار کر لیتا ہے' وہ جاوداں بن جاتا ہے اور تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ کے لئے نقش ہو جاتا ہے۔ عبدالسلام ایک ایسا ہی مرد کامل ہے۔ جس نے کائنات کے راز سربستہ سے سرگوشی کی' فطرت کی بظاہر مختلف قوتوں کو وحدت کی مضبوط لڑی میں پرویا' تیسری دنیا کے دکھ درد کو سمجھا اور اس کے مداوا کے لئے شب و روز ایک کر دیا۔ اس طرح انہوں نے اپنی گزشتہ عمر کے ساٹھ سال کو زمانہ مستقبل پر محیط کر دیا۔

سطح آب پر کبھی مختلف لہروں کو باہم متصل ہوتے ہوئے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ باہم ملنے والی لہروں کے نشیب و فراز کسی خاص ترتیب و نظم یا آہنگ سے نہیں ملتے۔ میزاناً ایک لہر کا نشیب دوسرے کے فراز سے مل کر ایک دوسرے کے اثر کو کم کرتا رہتا ہے اور سطح آب پر صرف ہلکورے نظر آتے ہیں۔ البتہ بعض انتہائی مخصوص حالات میں یہ بھی ممکن ہے کہ ایک خاص مقام پر مختلف لہروں کے فراز ایک خاص ترتیب کے ساتھ ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہوئے ملیں۔ ایسی صورت میں پانی اپنی نارمل سطح سے کافی اونچا اٹھ کر ایک بڑے فراز کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ عبدالسلام کی ابتدائی زندگی حالات کی لہروں کے فرازوں کا باہم مل کر ایک بڑا فراز بن جانے کے مترادف ہے۔ انہوں نے ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جو علم دوست تھا۔ انہیں ایسے والدین ملے جنہوں نے ان کی تعلیم و تربیت میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ قدرت نے انہیں ایک غیر معمولی ذہن سے نواز۔ نتیجہ ان جیسا

شاندار تعلیمی ریکارڈ شاید ہی کسی کا ہو۔ ہر امتحان میں کامیاب ہونے والوں میں وہ سرفہرست رہے اور بیشتر میں نئے ریکارڈ قائم کیے۔ پھر قدرت نے کچھ ایسے حالات پیدا کیے کہ وہ اپنے عزیز و اقارب کی شدید خواہش کے باوجود سول سروس میں نہ جا پائے۔ اس طرح ان کی عقبریت بے موت مرتے مرتے بچی۔ اتنا ہی نہیں قدرت نے یہ بھی انتظام کر دیا کہ وہ علوم جدیدہ کے بہترین گہوارے میں زانو سے تلمذ نہ کریں۔ یعنی اعلیٰ تعلیم کے لئے اسکالر شپ کے ایک ایسے فنڈ کا قیام جس سے صرف اور صرف عبدالسلام مستفید ہو سکے۔ اس طرح حالات کی ہر لہر کا فراز انہیں ان کی موجودہ بلندی کی طرف لے گیا۔

گو قدرت نے عبدالسلام کی پشت پناہی قدم قدم پر کی۔ لیکن یہ سب کچھ اللہ کی سنت کے مطابق ہوا۔ خدا بھی انہیں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ عبدالسلام کی ہر کامیابی کے پیچھے ان کی شب و روز کی محنت' لگن اور اپنے مقصد سے جذباتی لگاؤ کا ہاتھ زیادہ ہے۔ اگر وہ قدرت سے عطا کی گئی زرخیزیوں کو اپنے عرق انفعال سے سیراب نہ کرتے تو ان بلندیوں کو جن پر وہ آج ہیں' چھو پانا ممکن نہ ہوتا۔ ایسا نہیں کہ زندگی کے سفر میں انہیں ہمیشہ ہی ہموار راستہ ملا ہو۔ ایسا ہونا خلاف فطرت ہوتا۔ ان کی راہ میں کئی ناہمواریاں بھی آئیں۔ خصوصاً اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد جب وہ اپنے وطن پاکستان واپس لوٹے اور پنجاب یونیورسٹی میں ریاضی کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا' اس زمانہ میں پاکستان میں کوئی علمی ماحول نہ تھا۔ خصوصا" سائنسی علوم کے لئے وہاں کی زمین بالکل بنجر تھی۔ (آج بھی حالات کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں) عبدالسلام نے اس بنجر کو زرخیز بنانے کی بہت کوشش کی مگر کچھ کامیابی نہ ملی۔ انہیں اپنی کوششوں کے جواب میں تمسخر' حوصلہ شکنیاں اور حاسدانہ جذبات ملے۔ یقیناً انہیں اپنی ساری اعلیٰ تربیت خاک میں ملتی نظر آئی ہوگی۔ اپنے ملک کو بین الاقوامی سائنس میں ایک خاص مقام دلانے کا ان کا خواب چور چور ہو گیا ہوگا۔ پر وہ عبدالسلام ہی کیا جو رکاوٹوں سے گھبرا جائے' نامساعد حالات کے سامنے سپر ڈال دے۔

برہم ہوائیں لاکھ مزاحم ہوئیں مگر
دیوانہ وار موج نے ساحل کو جا لیا

انہیں جب یہ یقین ہو گیا ہوگا کہ وہ اپنے وطن کی خدمت اپنے وطن سے دور رہ کر زیادہ بہتر طور پر کر سکتے ہیں تو انہوں نے پردیس کی طرف رخ کیا۔ انگلستان نے ان کا خیر مقدم کیا۔ جہاں وہ پہلے نظریاتی طبعیات کے لکچرار پھر چند ہی سال بعد پروفیسر بنائے گئے۔ ہر چشم بینا یہ دیکھ سکتی ہے کہ باہر رہ کر انہوں نے جو کمال حاصل کیا اور جس طرح انہوں نے اپنے ملک و ملت کی خدمت کی وہ پاکستان میں رہ کر ممکن نہ تھی۔

عبدالسلام کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ ان میں کئی کمال ہیں' کئی خوبیاں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان میں کوئی انسانی کمزوری نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ فرشتہ ہوتے' پھر اس دنیا کے کام کے نہ رہ جاتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کی شخصیت میں کمالات کا وہ جمگھٹا ہے اور عظمتوں کی وہ چکاچوند ہے کہ انسانی کمزوریوں کے چند خفیف دھبے جو یقیناً ہوں گے نظر نہیں آتے۔

عبدالسلام کی عظمت کی مضبوط بنیاد یہ ہے کہ وہ ایک عظیم سائنسدان ہیں۔ سائنس کے میدان میں اپنی عظمت کا سکہ انہوں نے نہایت کم عمری میں ہی جما لیا تھا۔ ان کا پہلا اہم کام یہ ہے کہ انہوں نے نظریاتی ذریاتی طبعیات میں موجود ایک ریاضیاتی بھونڈے پن کو دور کرنے کا طریقہ کار دیا۔ جس سے نظریاتی طبعیات کے حسن میں نکھار آ گیا۔ سائنسی کمیونٹی میں ان کے اس کام کی کافی پذیرائی ہوئی اور انتہائی کم عمری ہی میں ان کو فیلو آف رائل سوسائٹی چن لیا گیا۔ ان کا دوسرا اہم کام بھی نظریاتی طبعیات کو' تجربات کی روشنی میں' خوبصورت تر بنانے سے متعلق ہے۔ 1956ء تک یہ عام خیال تھا کہ کائنات میں کار فرما مختلف قوتیں کسی طبعیاتی عمل اور آئینے میں اس کے عکس میں تمیز نہیں کرتیں۔ عبدالسلام نے یہ نظریہ پیش کیا کہ یہ اصول مطلق نہیں۔ خفیف نیوکلیائی قوت اس سے انحراف کرتی ہے۔ اسی زمانہ میں دو امریکی سائنسدان لی (Lee) اور یانگ (Yang) نے بھی ایسا ہی نظریہ پیش کیا جس پر انہیں نوبل انعام سے نوازا گیا۔ یہ ایک طرح کا تعصب تھا جو عبدالسلام کو اس نوبل انعام میں شریک نہیں کیا گیا۔ نوبل کمیٹی کا یہ رویہ جس پر منصف مزاج سائنس دانوں کا حلقہ متعجب بھی ہوا' عبدالسلام کی دل شکنی کا باعث نہ بن سکا۔ وہ مستقل اپنی گرانقدر سائنسی تخلیقات سے طبعیات کو نوازتے رہے اور ذراتی طبعیات کو نئی راہوں سے روشناس کراتے رہے۔ 1964ء کے لگ بھگ انہوں نے دوسرا بنیادی اہمیت کا نظریہ پیش کیا۔ یہ برق مقناطیسی / خفیف نیوکلیائی قوتوں کی وحدت کا نظریہ ہے۔ اس نظریے کی صداقت کا تجرباتی ثبوت 1974ء میں ملا اور اسی نظریہ کو پیش کرنے پر انہیں 1979ء میں نوبل انعام ملا۔ یہ نظریہ دراصل عبدالسلام کے پیش کردہ کائنات میں کار فرما بظاہر مختلف قوتوں کے وحدت کے وسیع تر نظریہ کی پہلی کڑی ہے۔ اس کی دوسری کڑی برق مقناطیسی' خفیف نیوکلیائی و قوی نیوکلیائی قوتوں کی وحدت کا نظریہ ہے' جس کی ایک پیشین گوئی یہ ہے کہ اب تک اٹوٹ سمجھا جانے والا پروٹان بھی ایک لمبے عرصہ کے بعد ٹوٹ سکتا ہے۔ دنیا کی کئی بڑی تجربہ گاہوں میں عبدالسلام کے اس نظریہ کی پیشین گوئی کو تجربہ کی کسوٹی پر پرکھا جا رہا ہے۔ اگر ان کی یہ پیشین گوئی درست ثابت ہوئی تو عام خیال ہے کہ ان کو ایک بار پھر نوبل انعام سے نوازا جائے گا۔ آج کل وہ کائنات کی کل چار بظاہر مختلف قوتوں یعنی برق مقناطیسی' خفیف نیوکلیائی' قوی نیوکلیائی اور کشش ثقل کی وحدت کی ایک قابل قبول تھیوری دینے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ کیا عجب قدرت نے توحید کے اس پرستار کو کائنات کی بظاہر مختلف چاروں قوتوں کے وحدت کے راز آشکار کرنے کے لئے چن لیا ہو۔

عبدالسلام کی عظمت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ مشرق کی روحانی قدروں کے پرجوش علمبردار ہیں۔ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ مغرب میں گزارنے کے باوجود وہ سرتاپا مشرقی ہیں۔ مغربی تہذیب کی چکا چوند یا اس کے نت نئے رجحانات کے تیز دھاروں سے وہ چنداں مرغوب نہیں۔ وہ نیوٹن اور میکسوئل کے دیس میں رہتے ہوئے بھی بوعلی سینا اور ابن ہیشم سے قریب ہیں۔ وہ اپنے دین اسلام کی حقانیت پر کامل یقین رکھتے ہیں اور اس کی ہدایات پر سختی سے عمل بھی کرتے ہیں۔ مغرب میں ہونے والی کانفرنسوں کی پارٹیوں میں جب سب شرکاء جام کے جام لنڈھا رہے ہوتے ہیں' عبدالسلام کے ہاتھ میں دودھ یا کسی شربت کا گلاس ہوتا ہے۔ انہیں اپنے کلچر پر فخر ہے اور اس کے اعلیٰ ہونے کا وہ برملا اظہار بھی کرتے ہیں۔ اس بابت ان کے جذبات کا اندازہ نوبل انعام کے جشن کے موقع پر ان کے لباس کے انتخاب سے لگایا جا سکتا ہے۔ نوبل انعام لیتے وقت وہ جھنگ کے مخصوص علاقائی لباس میں تھے۔ شلوار و شیروانی' سر پر پگڑی اور پیروں میں لمبی نوکوں والے جوتے۔

عبدالسلام کی عظمت کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ وہ پایہ کے سائنسدان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انتہائی کامیاب ایڈمنسٹریٹر (Administrator) بھی ہیں۔ عموماً محققین میں انتظامی صلاحیت نہیں کے برابر ہوتی ہے یا اگر کسی میں ہوتی بھی ہے تو وہ انتظامی امور سنبھالنے کے بعد علمی کام یکسر چھوڑ دیتا ہے۔ اسے عبدالسلام کا کمال ہی کہئے کہ وہ اعلیٰ پیمانہ کی تحقیق بھی کرتے ہیں اور ساتھ میں ایک کافی بڑے بین الاقوامی مرکز کا انتظام بھی سنبھالتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایسا کرنا زیادہ مشکل نہیں۔ بس ذرا سی توجہ اور اپنے اوقات میں ترتیب کی ضرورت ہے۔ اکثر وہ اس بات پر اظہار تاسف بھی کرتے ہیں کہ ہمارے پسماندہ ممالک کی یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ ان کے سائنس دان اعلیٰ انتظامی عہدہ سنبھالتے ہی علمی کام چھوڑ دیتے ہیں' یعنی وہ اسی کام سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں' جس کی بدولت انہیں وہ عہدہ ملا تھا۔ اس وجہ سے علمی ترقیوں سے ان عہدہ داروں کی ناواقفیت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ جس کا ایک بڑا اثر ملک کی سائنسی پالیسی پر پڑتا ہے۔

ادھر چند سالوں سے عبدالسلام کے کاندھوں پر انتظامی امور کا کچھ زیادہ ہی بوجھ آن پڑا ہے۔ انہوں نے تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنس کو قائم کیا ہے' جس کے وہ صدر ہیں۔ اس کے باوجود وہ علمی تحقیق کے لئے وقت نکال لیتے ہیں۔

عبدالسلام کی شخصیت کا سب سے زیادہ روشن پہلو یہ ہے کہ وہ ایک دردمند دل کے مالک ہیں۔ وسیع القلب ہیں اور منکسر المزاج ہیں اور یہی وہ پہلو ہے جو انہیں دنیا کے عظیم سائنس دانوں کے درمیان قدآور بناتا ہے۔ عبدالسلام کے ہم پلہ یا ان سے بڑے اور بھی سائنسدان ہیں۔ ان جیسے کامیاب اور بھی ایڈمنسٹریٹر ہیں۔ اپنی تہذیب کے پرجوش علمبردار بھی کم نہیں۔ لیکن کسی ایک فرد میں ان کمالات کا اجتماع ہونا اور ساتھ ہی اس فرد کا منکسر المزاج اور دردمند ہونا صرف عبدالسلام کا ہی تشخص ہے۔ ان کی بلند قامتی صرف اس وجہ سے نہیں کہ انہوں نے بنیادی اہمیت کے سائنسی نظریات پیش کیے بلکہ اس سے

زیادہ ان کی اس تگ و دو کی وجہ سے ہے جو وہ پسماندہ ممالک کے سائنسدانوں کو اعلیٰ تحقیق کے وسائل فراہم کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا دکھ یہ ہے کہ پسماندنہ ممالک میں نہ جانے کتنے عبدالسلام پیدا ہونے سے پہلے ہی مرجاتے ہیں۔ پسماندہ ممالک کے سائنسدان بھائیوں کی مدد کے لئے انہوں نے اٹلی میں ایک بین الاقوامی مرکز قائم کیا ہے' جس کا نام انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹکل فزکس ہے۔ پچھلے بیس سال سے وہ اس مرکز کو خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں' جس سے پچاسوں ہزار سائنسدانوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ یہ مرکز بھی عبدالسلام کے زرخیز ذہن کی ایک اعلیٰ تخلیق ہے۔ اس کے دور رس اثرات بیان کرنے کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ مختصراً اس مرکز نے پسماندہ ممالک میں ایک سائنسی انقلاب کی بنیاد ڈال دی ہے۔

عبدالسلام ایک فرد کا نہیں ایک تحریک کا نام ہے۔ یہ تحریک ہے علم و دانش کی' عمل و جفاکشی کی اور اپنے تہذیبی ورثہ میں جائز فخر کی۔ یہ تحریک ہے دنیا سے غربت و جہالت مٹانے کی اور طاقتور ممالک کے ظلم و استحصال کے خلاف جہاد کی' وہ اپنی تحریروں و تقریروں کے ذریعے مستقل باور کراتے رہتے ہیں کہ دنیا کے ترقی یافتہ و طاقتور ممالک بڑی عیاری سے پسماندہ ممالک خصوصاً عالم اسلام کا خون چوس رہے ہیں۔ ان ترقی یافتہ ممالک کے امدادی پروگرام دان کے بظاہر فیاضانہ سلوک کے پس پردہ پسماندہ ممالک کا معاشی و سیاسی استحصال ہے۔ ترقی یافتہ ممالک نے کبھی بھی دل سے یہ نہ چاہا کہ دنیا سے غربت و افلاس و معاشی و علمی ناہمواری دور ہو' وہ اس بات کا اظہار انتہائی پر درد الفاظ میں کرتے ہیں کہ پسماندہ دنیا آج جس بحران سے دوچار ہے' اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ نو آبادیاتی دور میں بھی نہیں جب تیسری دنیا کے خام مال پر ترقی یافتہ ممالک کو کامل اختیار حاصل تھا۔ اس دور میں پسماندہ دنیا سے صرف خام مال برآمد ہوتا تھا اور آج خام مال کے ساتھ بہترین دماغ بھی اپنی ان باتوں کی صداقت کے ثبوت میں وہ مختلف ذرائع سے حاصل کئے گئے اعداد و شمار پیش کرتے ہیں۔

وہ اس بات کی مستقل تبلیغ کرتے رہتے ہیں کہ عالم اسلام کی فلاح خود اپنے پیر پر کھڑے ہونے اور اپنے گم شدہ ورثہ کے حاصل کرلینے میں ہے۔ ان کے نزدیک یہ گم شدہ ورثہ سائنس ہے۔ وہ مسلمانوں کو بار بار ان کی تاریخ یاد دلاتے ہیں کہ کس طرح ان کے آباء و اجداد بلا شرکت غیرے چار سو سال تک دنیائے علم و دانش کے امام رہے اور سائنس کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ انکے خیال میں ملت اسلامیہ کے زوال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس نے مغرب میں آنے والے سائنسی انقلاب اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والے تکنیکی انقلاب سے خود کو باخبر نہ رکھا اور اس کی طرف ے مکمل بے اعتنائی برتی۔ وہ بڑے اعتماد سے کہتے ہیں کہ ملت اسلامیہ صرف چند دہائیوں میں عالمی برادری میں اپنا کھویا ہوا وقار پھر سے بحال کر سکتی ہے' مسند امامت پر پھر سے فائز ہو سکتی ہے' بشرطیکہ وہ علم و دانش کی راہ اپنائے' سائنسی تخلیق کی عرق ریزیوں کی لذتوں سے خود کو آشنا کرلے اور ایسے نوجوان سائنس دان پیدا کرے جو اس فنائی الذات ماحول میں فنائی الملت ہونے کے لئے آمادہ ہوں۔

خصوصی اداریہ

خوش آمدید--- پروفیسر عبدالسلام خوش آمدید۔
عالم اسلام کے مایہ ناز سائنسدان اور تیسری دنیا کی سائنس کے مسیحا۔
کائنات میں کار فرما قوتوں کے نکتہ داں۔
برق مقناطیسی اور خفیف نیو کلیائی قوتوں کی وحدت کے شارح
الکندی، البیرونی اور ابن الہیثم کی عظیم روایتوں کے امین و وارث
اسلامی سائنس کی ٹوٹی کڑی کو پھر سے جوڑنے والے
عالم اسلامی کی علمی پسماندگی پر آشفتہ نوا،
حکمائے اسلام کے علمی کارناموں کے نقیب--- خوش آمدید
خوش آمدید کہ
آپ مسلم یونی ورسٹی کے طلبہ کی یونین کی لائف ممبری قبول کر کے علیگ برادری کے ایک رکن بن گئے ہیں
خوش آمدید کہ
آپ کی عنایتوں سے ہمارے فزکس اور میتھمیٹکس کے شعبے آپ کے بین الاقوامی مرکز سے وابستہ ہیں،
خوش آمدید کہ
آپ نے سنٹر فار پرموشن آف سائنس اور ماہنامہ تہذیب الاخلاق کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی
خوش آمدید کہ
آپ نے ڈیوٹی سوسائٹی کا سرپرست بننا قبول فرمایا
خوش آمدید کہ
آپ نے ہمارے اور ہمارے ملک کے سائنسی پروگراموں میں گہری دلچسپی لی
خوش آمدید کہ
آپ سرسید کے خوابوں کی تعبیر ہیں اور آپ کے شب و روز اس فکر میں گزرتے ہیں کہ

جام ہے بدلے گئے پیر مغاں بدلے گئے
ذوق سجدہ کی طلب پر آستاں بدلے گئے
ہر طرف پیمانہ سود و زیاں بدلے گئے
یہ زمیں بدلی گئی، یہ آسماں بدلے گئے

ایک ہلچل ہے بپا، ہیجان ہے طوفان ہے
ملت اسلام کی بستی مگر سنسان ہے

ہم آپ کے ممنون کرم ہیں کہ آپ نے یہاں آنے کی زحمت فرمائی۔
ہم دست بدعا ہیں کہ خدا آپ کو عرصہ دراز تک صحیح و سلامت اور صحت مند رکھے تاکہ آپ کے ہاتھوں دنیائے سائنس اور انسانیت کی خدمات انجام پاتی رہیں۔

اسرار احمد
"تہذیب الاخلاق" مئی 1989ء

تاج محل کے سو سال بعد؟

عبدالسلام

آج سے تقریباً تین سو سال قبل 1660ء میں جدید عالمی تاریخ کی دو عظیم یادگاریں قائم ہوئیں۔ ایک مغرب میں--- لندن کا سینٹ پال کیتھیڈرل--- دوسری مشرق میں--- آگرہ کا تاج محل۔ بیان کی ضرورت نہیں یہ دونوں یادگاریں بذات خود اس بات کا مجسم اظہار ہیں کہ تاریخ کے اس دور میں ان دو میں سے کون سی تہذیب فن تعمیرات' کاریگری' دستکاری' صناعی اور ثروت کی کس منزل میں تھی۔ البتہ لگ بھگ اسی زمانہ میں ایک تیسری یادگار بھی وجود میں آئی۔ جس کے بعد کے اثرات زیادہ گہرے اور دور رس ثابت ہوئے۔ یہ نیوٹن کی طبعیات کے موضوع پر شہرہ آفاق تخلیق پرنسپیا (Principia) ہے۔ مغرب کے اس شاہکار کے ہم پلہ مغل ہندوستان میں کچھ بھی نہ تھا۔ اب میں آپ کو مختصراً بتاؤں گا کہ نادر المثال تاج محل دینے والی ٹیکنالوجی پر نیوٹن کی پرنسپیا پر قائم ٹیکنالوجی سے ٹکرانے کے بعد کیا بیتی۔

اس ٹکراؤ کا پہلا دھماکہ 1757ء میں ہوا۔ شاہ جہاں کے تاج محل کی تعمیر کے تقریباً سو سال بعد رابرٹ کلائیو کے ہلکے پھلکے اسلحہ جات کی بہتر کارکردگی نے شاہ جہاں کے وارثوں کو شرمناک شکست دی اور اس کے مزید سو سال بعد ہندوستانی شہنشاہ تاج ملکہ وکٹوریہ کے قدموں پر تھا۔ آہ! یہ صرف ایک عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ نہ تھا بلکہ ایک تہذیب' ایک تمدن' ایک طرز معاشرت اور ایک ٹیکنالوجی کی موت تھی۔ 1857ء کے بعد ہندوستانی اسٹیٹ کی زبان فارسی کے بجائے انگریزی ہو گئی۔ مشرق کے شیریں نغموں کو اسکولوں کے نصاب سے نکال کر ان کی جگہ شیکسپیئر اور ملٹن کی ادبیات کو لایا گیا۔ مشرق کے علمی خزانوں کو تاریخ کے اوراق سے اڑا دیا گیا اور ڈھاکہ کے ململ کے خاکستر پر لنکا شایر کی سوتی پرنٹوں کا محل ہوا۔

ترجمہ: اسرار احمد
(بھائی جان کی تقریر سے ایک اقتباس کا ترجمہ "تہذیب الاخلاق" مئی 1989ء)

اداریہ

تہذیب الاخلاق کے پروفیسر عبدالسلام نمبر' مارچ 1997 سے

"تہذیب الاخلاق" کا یہ شمارہ پروفیسر عبدالسلام نمبر ہے۔ پروفیسر عبدالسلام' محض علم طبعیات کے محقق اور نظریہ ساز ہی نہیں تھے بلکہ برصغیر کی ان عظیم ہستیوں میں سے ایک تھے جنہوں نے مشرقی اقوام کو عقلی اور سائنسی دنیا میں اعتبار اور وقار بخشنے میں اہم رول ادا کیا ہے اور جہاں تک عالم اسلام کا تعلق ہے تو اس وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ عالم اسلام میں اس پایے کے سائنسدان کا ماضی قریب میں فقدان رہا ہے۔ پروفیسر عبدالسلام اپنے تخصص کے میدان کے علاوہ اسلام اور عالم اسلام کی سربلندی کے تمنائی اور عظمت رفتہ کی بازیافت کے خواہاں تھے۔ اس طرح سائنس کے علاوہ ان کی دلچسپی کے دو اور بڑے دائرے تھے۔ ایک تو ترقی پذیر ممالک کے سائنس دانوں کو سائنسی تحقیق اور تجربے کے ایک مخصوص سلسلے سے مربوط کرنے کا خواب اور دوسرا اسلامیان عالم کو علمی' تحقیق اور سائنسی منظرنامے میں برابر کا شریک بنانے کا منصوبہ۔ ان دونوں دائروں کا نقطہ اتصال شمال مشرقی اطالیہ میں تریستے کے مقام پر ان کا قائم کردہ سائنسی تحقیق کا مرکز تھا' جسے Third World Academy of Sciences کے نام سے جانا جاتا ہے۔

پروفیسر عبدالسلام کو 1979ء میں ان کی سائنسی خدمات کے اعتراف کے طور پر علم طبعیات کے نوبل پرائز سے سرفراز کیا گیا۔ یہ انعام تو بظاہر عبدالسلام نام کے ایک سائنسدان کو ملا تھا مگر اس انعام سے سربلندی حاصل ہوئی برصغیر کو' عالم اسلام کو اور تیسری دنیا کو--- کہتے ہیں کہ بیسیویں صدی کی چھٹی دہائی تک یہ تصور عام تھا کہ کائنات میں مختلف انواع و اقسام کی جو قوتیں کار فرمائیں وہ کسی طبعیات عمل اور اس کے عکس میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتیں--- پروفیسر عبدالسلام نے یہ نظریہ پیش کیا کہ یہ کوئی مطلق اصول نہیں ہے اور یہ کہ بعض نیوکلیائی قوتیں اس اصول سے منحرف نظر آتی ہیں۔ طبعیات کے مشہور محقق پروفیسر اسرار احمد کا خیال ہے کہ کم و بیش اس نوع کے نظریات کی پیش کش پر اس زمانے میں دو امریکی سائنس دانوں کو نوبل انعام سے نوازا گیا اور عبدالسلام کو اس ضمن میں انعام میں شریک نہ کر کے ان کے ساتھ نا انصافی کا ثبوت دیا گیا۔ مگر دیکھنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ سویڈش اکیڈمی یا نوبل انعام کے ارباب حل و عقد کے اس رویے کے رد عمل نے عبدالسلام کو دل برداشتہ نہیں کیا اور انہوں نے کسی نوع کی شکستہ خاطری کا ثبوت نہیں دیا اور اس جہت میں اپنی تحقیق جاری رکھی۔ اسی اثناء میں انہوں نے 1964ء میں برق' مقناطیس اور نیوکلیائی قوتوں کی وحدت کا غیر معمولی نظریہ پیش کیا' جس کی تجرباتی توثیق 1974ء میں جا کر ہوئی۔ یہ وہی نظریہ تھا جس کی تجرباتی توثیق کا اعتراف نہ کرنا آسان نہ تھا۔ چنانچہ پروفیسر عبدالسلام بھی سائنسی دنیا کے اس منظرنامے میں شریک ہو گئے جسے آج کے تعقل' علوم اور

تحقیق کے نقطہ عروج کا نام دیا جا سکتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر پروفیسر عبدالسلام کی زندگی نے مزید کچھ دنوں تک وفا کی ہوتی اور وہ اپنے پیش کردہ نظریے کی دوسری شق کو تجربہ گاہ میں ثابت کر دکھاتے تو شاید ان کو دوسری بار نوبل انعام سے نوازا جاتا۔

پروفیسر عبدالسلام تادم حیات علم طبعیات میں ہم آہنگی اور موزونی کی جمالیات کی تلاش و جستجو میں مصروف رہے۔ وہ چونکہ ایک موحد تھے اور خالق کائنات کی مرکزیت کا مشاہدہ کائنات کی بکھری ہوئی اور بظاہر منتشر، غیر مربوط اور مختلف الجہات قوتوں میں کرنا چاہتے تھے، اسی لئے ان کے لئے طبعیات کی تحقیق بھی کائنات کے مرکزی نکتے کی تلاش و جستجو سے عبارت تھی۔ اگر اس رویے کو ان لفظوں میں بیان کیا جائے کہ وہ طبعیات کے میدان میں قوتوں کی کثرت یا انتشار کو وحدت یا مرکزی نکتے کی طرف لانے کے لئے کوشاں تھے، تو یہ بات اپنے آپ واضح ہو جاتی ہے کہ کائنات اور خالق کائنات کے بارے میں ان کا عقیدہ کس طرح تجربہ گاہ کی صداقت بن کر نمودار ہو رہا ہے۔

سرسید احمد خان نے اپنی درسگاہ کے قیام کے ساتھ مذہب اور سائنس کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرنے کا خواب دیکھا تھا۔ عبدالسلام کی شخصیت سرسید کے اس خواب کی تعبیر تھی۔ ادارہ تہذیب الاخلاق پروفیسر عبدالسلام کی عالمانہ عظمت کے اعتراف اور ان کی روح کو خراج عقیدت پیش کرنے کی خاطر تازہ شمارے کو ان کی شخصیت اور علمی و سائنسی کاوشوں کے نام معنون کرتا ہے۔

ابوالکلام قاسمی

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ

مارچ 1997

پروفیسر عبدالسلام

سائنس ٹیکنالوجی اور تیسری دنیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمد رسول اللہ

اپنی بات کہنے سے پہلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قول پیش کروں گا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص انسان کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ خدا کا شکر گزار نہیں۔ اس ارشاد گرامی کے پیش نظر اس میز کے گرد بیٹھے ہوئے معزز اشخاص میں سے بائیں طرف سے شروع کرتے ہوئے سب سے پہلے میں جناب سید حامد کا دلی شکریہ ادا کروں گا جنھوں نے اپنے دور میں مجھے یہاں پہلی بار مدعو کر کے اس عظیم یونیورسٹی کو دیکھنے کا موقع عطا فرمایا اور اس یونیورسٹی کی اعزازی ڈگری دے کر علیگ برادری میں شامل کیا۔ میں سید حامد صاحب کا ان مخلصانہ کلمات کے لئے بھی شکر گزار ہوں جو ابھی انہوں نے میرے بارے میں کہے

ہیں۔ اسلامی سائنس کی بابت انہوں نے میرے جذبات کی صحیح ترجمانی کی ہے۔ اس کے بعد جناب پرووائس چانسلر صاحب ہیں جن کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر واجب ہے، جنہوں نے وائس چانسلر صاحب کی عدم موجودگی میں مجھے یہاں مدعو کیا تھا اور میری بڑی عزت افزائی کی تھی۔ اب یہ جواں سال، شیروانی صاحب ہیں جن کی مجھ پر بڑی کرم فرمائیاں ہیں۔ آپ نے مجھے ڈیوٹی سوسائٹی کے سرپرستوں میں شامل کیا اور ڈیوٹی سوسائٹی کی طرف سے دعوت نامے بھیجے۔ مجھے یہ دیکھ کر دلی خوشی ہے کہ شیروانی صاحب آج بھی پرجوش اور فعال ہیں اور میرے مقابلے میں کم عمر دکھائی دیتے ہیں۔

یہ آپ کے وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی صاحب ہیں، جن کی اس لحاظ سے مجھ پر دیرینہ نوازشیں رہی ہیں کہ مجھے کئی موقعوں پر یاد کیا اور یہ انہیں کے اخلاص کی کشش ہے جو میں آج آپ کے درمیان موجود ہوں۔ میرے اعزاز میں اس جلسے اور دوسرے کئی پروگراموں کا اہتمام کر کے سید ہاشم علی صاحب نے جس طرح اپنی نوازشوں کی بوچھاڑ کی ہے، اس کے لئے میں تہہ دل سے بہت بہت شکر گزار ہوں۔

اس کے بعد میں جناب حکیم عبدالحمید صاحب کا دلی شکریہ ادا کروں گا جنہوں نے سب سے پہلے مجھے ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے آگاہ کیا اور ان کی تعلیمی پسماندگی کی طرف متوجہ کیا۔ حکیم صاحب کی یہاں موجودگی سے میری ہمت افزائی ہوئی ہے اور میں آپ تمام حضرات کے ساتھ مل کر تن تنہا ایک یونیورسٹی قائم کر لینے پر انہیں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اب میں ڈاکٹر اسرار احمد کا شکریہ ادا کروں گا جو اکثر ترستے میں مجھے یہاں کے سائنسی پروگراموں کی پیش رفت سے ازراہ مہربانی آگاہ کرتے رہے ہیں اور جنہوں نے میری پذیرائی میں ماہنامہ ''تہذیب الاخلاق'' کا یہ خوب صورت یادگار شمارہ نکالا ہے جس کے پہلے صفحے پر میرے اقوال نقل کیے ہیں۔ میں ان کا اس لئے بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے سرسیدؒ کے زریں اقوال کی ایک فہرست پیش کی ہے، اور اس لیے بھی کہ وہ ''تہذیب الاخلاق'' کو ایک مفید رسالہ بنانے کی انتھک کوشش کر رہے ہیں۔

یہ رہے میرے دوست انعام یافتگان جنہوں نے اردو زبان میں معیاری عام فہم سائنسی مضامین لکھ کر انعام حاصل کیا ہے۔ ان کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر اس لئے واجب ہے کہ انہوں نے سائنس کے فروغ میں دلچسپی لی جو میرا مشن ہے۔

آخر میں تمام معزز مہمانوں، اساتذہ اور طلباء کا شکریہ ادا کروں گا کہ اس جلسے میں بھاری تعداد میں شریک ہو کر میری بڑی عزت افزائی کی اور میری باتوں کو سننے کے لئے اپنا قیمتی وقت صرف کیا۔

حضرات! اب میں خصوصیت کے ساتھ تیسری دنیا میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی حالت کے بارے میں گفتگو کروں گا۔ کل میں آپ کے وزیراعظم سے ملا تھا اور انہیں تھرڈ ورلڈ اکادمی آف سائنس کے زیر اہتمام شائع ہونے والی اپنی کتاب:

Notes on Science, Technology and Science Education in the Development of South.

کا تحفہ پیش کیا۔ اس کتاب کو ساؤتھ کمیشن کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کمیشن کو قائم کرنے میں آپ کے وزیراعظم راجیو گاندھی نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اس کمیشن کے تعلق سے میرا یہ کام رہا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو اس کے صحیح پس منظر میں دیکھا جائے۔ میری درخواست پر آپ کے وزیراعظم نے اس کتاب کے خلاصے کو دلچسپی سے پڑھا جسے میں یہاں دہرانا چاہوں گا۔

یہ کرہ ارض دو مختلف قسم کے انسانوں سے آباد ہے۔ یو-این-ڈی-پی کی 1983ء کے اعداد و شمار کے مطابق تقریباً ایک ارب انسان یعنی دنیا کی چوتھائی آبادی ترقی یافتہ ہے جو زمین کے تقریباً 2/5 رقبہ پر بستی ہے اور جس کے قبضے میں تقریباً اسی فیصد قدرتی ذخائر اور وسائل ہیں۔ اس کے مقابلے میں باقی تقریباً ساڑھے تین ارب انسان جو زمین کے 3/5 رقبہ پر بستے ہیں۔ غریب پسماندہ اور مصیبتوں کے مارے ہوئے ہیں۔ انسانوں کے ان دونوں گروہوں میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر گروہ کے پاس جوش' ولولہ' طاقت اور دولت ہے جو بنیادی طور پر اس دور کی سائنس اور ٹیکنالوجی پر اس کی مہارت کی وجہ سے ہے۔ اب یہ ان لیڈروں کو طے کرنا ہے جن کے ہاتھ میں پس ماندہ انسانیت کی قسمت ہے کہ کیا وہ ان اقدامات کو کرنے کے لئے تیار ہیں جن سے تیسری دنیا کے لوگ اس قابل ہو سکیں کہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل کر کے تخلیقی کام کریں اور اسے ترقی کے لئے استعمال کریں۔"

یہی میرا پیغام ہے جسے میں ملک ملک پہنچا رہا ہوں۔ اس پیغام کی تفسیر اس کتاب میں ہے۔ ماہرین معاشیات کو شکایت یہ ہے کہ میں نے معاشی محرکات پر خاموشی اختیار کی ہے۔ میرے نزدیک معاشی محرکات کی بات دوسرے درجے میں آتی ہے۔ اول کام ان اقدامات کا کرنا ہے جس سے دولت کی تخلیق ہو سکے۔

اس دور کی سائنس اور ٹیکنالوجی چار اقسام ہیں:

1۔ بنیادی سائنس
2۔ اطلاقی سائنس
3۔ روایتی ادنیٰ ٹیکنالوجی
4۔ اعلیٰ ٹیکنالوجی

1۔ بنیادی سائنس

بنیادی سائنس کا منبع' تجسّس' غور و فکر اور جاننے اور سمجھنے کی ہمک ہے۔ اس کی پانچ اہم شاخیں ہیں:
(الف) فزکس' (ب) کیمسٹری' (ج) ریاضی' (د) بیالوجی اور (ر) بنیادی میڈیکل سائنس۔
بنیادی سائنس کا تجسّس سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ اس کی خوبصورت تشریح وولف گانگ وائلڈ نے اس طرح کی ہے:

"قرون وسطیٰ میں جتنا کچھ گرجا گھروں کی تعمیر پر صرف کیا جاتا تھا' اس سے نسبتاً کہیں کم ہم بنیادی تحقیق پر صرف کر رہے ہیں۔ حقیقت کی تلاش اور علم میں ترقی ایک ایسا مقصد ہے جس کی عظمت کسی طرح سے بھی گرجا گھروں کی تعمیر سے کم نہیں۔ یہ سوچنا حقیقت کے خلاف نہیں کہ انسانی تاریخ کے اس دور کا سب سے اہم اور عظیم کارنامہ سائنسی علوم کی ترقی ہے اس لئے ہمیں مشہور ریاضی دان ڈیوڈ ہلبرٹ کے اس قول سے متفق ہونا چاہیے --- ہمیں ضرور جاننا چاہیے ہم ضرور جانیں گے۔"

ڈیوڈ ہلبرٹ نے کوئی نئی بات نہیں کہی تھی' اس نے جو کچھ کہا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے زیر اثر صدیوں پہلے سے مسلمانوں کی تہذیب کا ایک جزو تھا' مگر افسوس ہے کہ دوسری اقوام نے اسے اپنی تہذیب کا ایک جزو بنالیا ہے اور ہم صدیوں سے اسے بھول بیٹھے ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک میں بنیادی سائنس میں ریسرچ اور تربیت یا تو یونیورسٹیوں میں دی جاتی ہے یا مخصوص تحقیقی مراکز میں۔ اس سلسلے کے اخراجات بالعموم نیشنل سائنس فاؤنڈیشنز یا سائنسی اکادمیز برداشت کرتی ہیں۔

جہاں تک ترقی پذیر ممالک کا تعلق ہے' یہاں بنیادی سائنس پر کوئی زور نہیں ہے۔ کسی وجہ سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ یہ غیر ضروری ہے اور یہ کہ دوسروں کی سائنسی تحقیقات سے ہمارا کام چل سکتا ہے۔ اس رجحان نے سائنس کے لئے سم قاتل کا کام کیا ہے۔ ایک مثال کافی ہوگی۔ ترقی پذیر ممالک کے حکمران ٹولے کے اس رویے کے سبب تیسری دنیا اپنے ان ذہین تخلیق افراد سے محروم ہو رہی ہے جنہوں نے اپنے اپنے مخصوص علمی میدانوں میں مہارت حاصل کی تھی اور جو ملک کی ترقی میں سائنس کے استعمال کی بابت ماہرانہ صلاح و مشورہ دے سکتے تھے۔

2۔ اطلاقی سائنس

اطلاقی سائنس کے درج ذیل پانچ بڑے میدان ہیں:

(ا) زراعت (اس میں جنگلات' مچھلی کی پیداوار وغیرہ شامل ہیں۔)

(ب) صحت عامہ اور دوا سازی

(ج) توانائی یا انرجی

(د) ماحولیات اور آلودگی

(ر) ارضی سائنس (سینچائی' مٹی' معدنیاتی وغیرہ بھی)

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ بنیادی اور اطلاقی سائنس کے درمیان فرق کی حتمی لکیر نہیں کھینچی جا سکتی۔ یہی بات اطلاقی سائنس اور ٹیکنالوجی کے لئے بھی صحیح ہے۔ ان کی سرحدیں ایک دوسرے میں مدغم ہیں۔ اس دور میں جب کسی خاص میدان میں سائنس آگے بڑھ رہی ہو تو یہ کہنا مشکل ہے کہ کون سی

ریسرچ بنیادی ہے اور کون سی اطلاقی۔ سر جارج پورٹر کے بقول سائنس صرف دو طرح کی ہے۔ ایک وہ جس کا اطلاق ہو چکا ہے۔ دوسری وہ جس کا اطلاق ہونا ابھی باقی ہے۔

3۔ روایتی ادنیٰ ٹیکنالوجی

روایتی ٹیکنالوجی کی پانچ اہم شاخیں ہیں:

(ا) زیادہ مقداری کیمیاوی صنعتیں

(ب) لوہے، فولاد اور دوسری دھاتوں کی صنعتیں

(ج) کپاس، چمڑے وغیرہ سے متعلقی صنعتیں

(د) پٹرولیم کی صنعتیں

(ر) پاور کی پیداوار

کسی ملک کی صنعتی ترقی کے لئے روایتی ٹیکنالوجی میں مضبوط ہونا ضروری ہے۔ اس کے لئے سائنس کے نئے قوانین یا اصولوں میں مہارت کی ضرورت نہیں۔ یہاں ماضی کی سائنس کا استعمال ہے۔ البتہ ڈیزائن، کوالٹی، بدلتے زمانے کے ساتھ ضروری تبدیلیوں اور قیمتوں پر نگاہ ضروری ہے۔

4۔ اعلیٰ ٹیکنالوجی

یہ ٹیکنالوجی کا وہ میدان ہے جس میں دولت ہی دولت ہے۔ آج کل اس زمرے میں درج ذیل ٹیکنالوجیاں شامل ہیں:

(ا) مصنوعی خام مال

(ب) مواصلاتی سائنس (1) مائیکرو الیکٹرانکس (2) فوٹانکس۔

(ج) فضائی اور خلائی سائنس

(د) اعلیٰ درجے کی کیمیاوی اشیاء

(ر) بایو ٹیکنالوجی

آخر الذکر یعنی بایو ٹیکنالوجی سے زراعت، توانائی اور میڈیسن میں زبردست انقلاب کی توقع ہے۔

ہائی ٹیکنالوجی (اعلیٰ ٹیکنالوجی) روایتی ٹکنالوجی سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں متعلقہ بنیادی سائنس جیسے فزکس، کیمسٹری بیالوجی وغیرہ میں اعلیٰ سطح کے تربیت یافتہ سائنس دانوں کی ضرورت ہے۔ اس میں بہت کم مقدار میں خام مال کی ضرورت ہوتی ہے۔

ترقی پذیر ممالک میں چند کو چھوڑ کر تقریباً سبھی ممالک کا یہ خیال ہے کہ اعلیٰ ٹیکنالوجی ان کے بس کی چیز نہیں۔ آج اسی خیال کے بدلنے کی ضرورت ہے کیوں کہ مستقبل اسی میدان میں ہے۔ یہ ممالک اگر یہ سوچتے ہیں کہ اعلیٰ ٹیکنالوجی کو ترقی یافتہ ممالک سے منتقل کیا جا سکتا ہے تو یہ سوچنا سراسر غلطی ہے۔

کیوں کہ کوئی ترقی یافتہ ملک اپنی تحقیقات سے بھرپور فائدہ اٹھانے سے پہلے اسے ترقی پذیر ممالک کو منتقل کرنے سے رہا۔ اس لیے ترقی پذیر ممالک کے کرنے کا کام یہ ہے کہ شائع شدہ تحقیقی مقالوں کی مدد سے اعلیٰ ٹیکنالوجی کی بنیاد خود ڈالیں۔

ترقی پذیر دنیا کا سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں پیچھے رہنے کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ انہیں سائنسی علوم کی اہمیت کا کوئی احساس نہیں۔ وہ شاید یہ نہیں جانتے کہ سائنس کو ترقی کے لئے استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ اس احساس کے پیدا ہونے سے کتنا فرق پڑ سکتا ہے۔ اس کی مثال جاپان ہے۔ وہاں کے شہنشاہ نے 1870ء میں میجی انقلاب کے زمانے میں پانچ حلف اٹھائے تھے ان میں سے ایک حلف یہ تھا۔

"جاپان کی عظمت اور تحفظ کے لئے علم کو دنیا کے کونے کونے اور ہر ممکن طریقے سے حاصل کیا جائے گا۔"

ترقی پذیر ممالک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کتنی پیچھے ہے اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں سائنس دانوں کی تعداد کئی ہزار فی دس لاکھ ہے۔ جب کہ ترقی پذیر ممالک میں یہ تعداد ایک یا دو سو فی دس لاکھ ہے۔ اس پس ماندگی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ترقی پذیر ممالک سائنسی ریسرچ اور متعلقہ امور پر قومی آمدنی کا بہت کم حصہ صرف کرتے ہیں۔ یہ جان کر آپ کو حیرت ہوگی کہ جب کہ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک دونوں گروپ دفاع پر اپنی قومی آمدنی کا تقریباً 5.6% یعنی برابر خرچ کرتے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی پر ترقی پذیر ممالک کا خرچ ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں قومی آمدنی کے لحاظ سے تقریباً دس گنا کم ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی پذیر ممالک کے لوگ سائنس کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی کے میدان میں جتنی مدت میں ترقی پذیر ممالک دس قدم آگے بڑھتے ہیں، ترقی یافتہ ممالک سو قدم آگے بڑھ جاتے ہیں۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں نہ صرف یہ کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم پر کافی زور ہے بلکہ یہاں ایسے پروگرام شروع کئے گئے ہیں جن سے ملک میں سائنس کا فروغ ہو۔ یہاں کے فروغ سائنس کے پروگرام کافی غور و خوض کے بعد بنائے گئے ہیں اور ان کی کامیابی کے اشارے بھی ملنا شروع ہو گئے ہیں۔ تیسری دنیا میں شاید ہی کوئی دوسری یونیورسٹی ایسی ہو جہاں سائنس کو عوام تک پہنچانے اور مذہبی طبقے کو سائنسی تعلیم کی طرف راغب کرنے کا یہاں جیسا کوئی پروگرام چل رہا ہو۔ اگر یہ کام اسی انہماک اور لگن سے چلتا رہا تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرسید نے جس امید پر اس درسگاہ کی بنیاد ڈالی تھی اس کے پورے ہونے کا وقت زیادہ دور نہیں۔

میں ایک بار پھر تمام انعام یافتگان کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ لوگوں کی عام فہم زبان میں سائنس کی اشاعت کی کوششوں کو کامیاب کرے۔

ڈاکٹر اختر حسین آفتاب

پروفیسر عبدالسلام (خراج عقیدت)

انسان جسمانی موت مرجاتا ہے لیکن اس کی خوبیاں اُسے زندہ رکھتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم انسان کو اس کے جسم خاکی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی نیکیوں کی وجہ سے یاد رکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ علم، قلم، فکر، کردار، خلوص اور قربانی کا جذبہ موت کے بعد ہی زیادہ پر کشش، دل کش اور زندہ انسان کو جنم دیتے ہیں۔ ارسطو، بوعلی سینا، البیرونی، گیلیلیو، نیوٹن اور آئن سٹائن مرنے کے بعد صحیح معنوں میں زندہ ہیں، کیونکہ ان کے مشاہدات اور ان کی تحقیقات سے آج کا انسان زیادہ مستفید ہو رہا ہے، جو دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں وہی مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ پروفیسر عبدالسلام 21 نومبر 1996ء کو انگلینڈ میں موت کی آغوش میں ہمیشہ کے لئے سو گئے۔ مگر ہم ان کو معنوی طور پر اب اپنے درمیان زیادہ پائیں گے۔

عبدالسلام مرحوم کی پیدائش 29 جنوری 1926ء کو جھنگ میں ہوئی تھی۔ 1947ء میں پنجاب کی تقسیم کے بعد یہ علاقہ پاکستان کو ملا۔ عبدالسلام صاحب بچپن سے ہی بہت ذہین تھے۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے 1940ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پوری یونیورسٹی میں اول آئے۔ انہوں نے ایف-اے، بی-اے اور ایم-اے کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا اور سبھی امتحانات میں اول آئے۔ 1946ء سے 1949ء تک وہ سینٹ جون کالج (کیمبرج) کے فاؤنڈیشن اسکالر رہے جہاں سے انہیں حساب (Maths) میں رینگ لر (Wrangler) کا اعزاز ملا۔ 1952ء میں انہوں نے کونڈش لیبارٹیری (کیمبرج) سے تھیوریٹیکل فزکس میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

پروفیسر عبدالسلام 1951ء سے 1954ء تک پنجاب یونیورسٹی (لاہور) میں صدر شعبہ حساب کے عہدے پر فائز رہے۔ اس کے بعد وہ انگلینڈ چلے گئے، جہاں انہوں نے 1954ء سے 1956ء تک کیمبرج یونیورسٹی میں لکچرر کی حیثیت سے کام کیا۔ ان کے اندر بلا کی ذہانت تھی اس لئے 1957ء میں انہیں امپیریل کالج (لندن) میں تھیوریٹیکل فزکس کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ 31 برس کی عمر میں ایک غیر ملکی کا امپیریل کالج (لندن) میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہو جانا ایک بہت بڑی بات ہے۔ پروفیسر عبدالسلام 1955ء سے 1981ء تک اقوام متحدہ کے سائنس سے تعلق رکھنے والے کئی عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔ 1988ء میں وہ تھرڈ ورلڈنٹ ورک آف سائنٹیفک آرگنائزیشن کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔

پروفیسر عبدالسلام نے فزکس کی دنیا کو بہت کچھ دیا۔ جس کے اعزاز میں انہیں کیمبرج یونیورسٹی، فزیکل سوسائٹی (لندن) کلکتہ یونیورسٹی، امریکن انسٹی ٹیوٹ آف فزکس، رائل سوسائٹی (لندن) اور یونسکو (پیرس) سے مختلف ایوارڈز ملے۔ 1979ء میں انہیں آئن سٹائن میڈل اور دنیا کا سب سے بڑا انعام یعنی فزکس میں نوبل پرائز (Nobel Prize) ملا۔ بنارس ہندو یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹر

آف سائنس کی اعزازی ڈگری دے کر اپنا وقار بلند کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا کی کوئی بھی اہم یونیورسٹی ایسی نہیں ہے جس نے انہیں کوئی اعزازی ڈگری نہ دے کر اپنی اہمیت گھٹائی ہو۔

پروفیسر عبدالسلام ایٹم کا استعمال برائے امن چاہتے تھے۔ امن عالم کی اس خدمت کے لئے انہیں چارلس یونیورسٹی (پراگ) سے پیس میڈل (Peace Medal) ملا۔ کئی بین الاقوامی اداروں نے بھی ان کی امن کی مہم کو کافی سراہا اور انہیں مختلف تنظیموں کی رکنیت بھی عطا کی گئی۔

پروفیسر عبدالسلام نے سائنس کی دنیا کو بہت کچھ دیا۔ 1957ء میں انہوں نے امپیریل کالج (لندن) میں تھیورٹیکل فزکس کا محکمہ قائم کیا۔ تھیوریٹیکل فزکس میں انگلینڈ کے بہت سارے لوگوں نے ان کی نگرانی میں پی-ایچ-ڈی کی۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے ہندوستان' پاکستان' بنگلہ دیش' برازیل' گھانا' نائجیریا' لبنان' ایران' عراق' یونان وغیرہ تیسری دنیا (Third World) کے تقریباً پچاس لوگوں کو پی-ایچ-ڈی کرایا۔ وہ اقوام متحدہ کی سائنس اور ٹیکنالوجی کی مشاورتی کمیٹی کے 1964ء سے 1975ء تک ممبر رہے۔ وہ یو-این-او فاؤنڈنگ کمیٹی برائے یو-این-او یونیورسٹی کے ممبر بھی تھے۔

پروفیسر عبدالسلام انٹرنیشنل سینٹر فار تھیوریٹیکل فزکس کے فاؤنڈر ڈائریکٹر تھے۔ یو-این-او کا یہ ادارہ تیسری دنیا کے سائنس دانوں کی ٹریننگ کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اس ادارے سے اب تک 36000 فزکس کے پروفیسروں کو ریسرچ کی ٹریننگ ملی ہے۔ اس ادارہ سے فزکس کی تازہ ترین ریسرچ کا علم حاصل ہوتا ہے۔

پروفیسر عبدالسلام نے تھرڈ ورلڈ اکاڈمی آف سائنس قائم کی اور اس کے فاؤنڈر پریزیڈنٹ تھے۔ اس اکاڈمی کو چلانے کے لئے انہوں نے سالانہ تقریباً دو ملین ڈالر کا انتظام کیا۔

پروفیسر عبدالسلام کی شخصیت کے دو پہلو بہت اہم تھے۔ انہوں نے کبھی بھی ایسا محسوس نہیں کیا کہ سائنس اور مذہب میں اختلاف ہے۔ سائنس تو فطرت کے رازہائے سربستہ کو سمجھنے کا دوسرا نام ہے۔ وہ کافی مذہبی ہوتے ہوئے بھی سائنس کی دنیا کو آخری دم تک گلے لگائے رہے۔

پروفیسر عبدالسلام تیسری دنیا (Third World) سے بہتر گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مغرب' مشرق پر اس لئے غالب ہے کہ مغرب نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو اپنا لیا ہے۔ مشرق اس لئے پیچھے ہے کہ یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو اپنے دامن میں اب تک سمیٹ نہ سکا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایشیا اور افریقہ اپنے دامن کو سائنس اور ٹیکنالوجی سے بھر لے۔ پھر وہ ضرور خوش حالی کی طرف گامزن ہوگا اور اسے یورپ پر انحصار کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

پروفیسر عبدالسلام کے خطوط میرے پاس برابر آیا کرتے تھے' وہ ہمیں تاکید کیا کرتے تھے کہ میں عوام کے ذہن کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے لئے زیادہ سے زیادہ آمادہ کروں۔ 1991ء میں انہوں نے مجھے Ideals and Realities کا تیسرا ایڈیشن بھیجا تھا جو میرے پاس محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے

اپنے بہت سے لکچرز کی کاپیاں بھی مجھے بھیجیں جو وہ بین الاقوامی کانفرنسوں میں دیا کرتے تھے۔ انہوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ دسویں صدی سے لے کر گیارہویں صدی تک یورپ نے سائنس کے میدان میں مسلمانوں سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کے خطوط میں اکثر عمر خیام کی رباعی اور علامہ اقبال کے اشعار ہوا کرتے' جس سے ان کے ادبی ذوق کی نشان دہی ہوتی ہے۔ پروفیسر عبدالسلام برابر کہا کرتے تھے:

"انسانی برادری کی بربنیاد دو ستون پر قائم ہے' ایک علم اور دوسرا رواداری۔ علم کے بغیر رواداری بے اثر ہے اور رواداری کے بغیر علم بیکار ہے۔"

پروفیسر عبدالسلام ایک عظیم انسان' ایک عظیم سائنس دان اور ایک عظیم محقق تھے۔ ان کی رواداری کا یہ عالم تھا کہ نوبل پرائز ملنے کے بعد وہ کلکتہ آئے اور اپنے استاد سے ملے جنھوں نے انہیں لاہور میں پڑھایا تھا۔ ان کے استاد جو مذہبی اعتبار سے برہمن تھے بہت خوش ہوئے اور انہیں بہت دعائیں دیں۔

پروفیسر عبدالسلام کی خدمت میں سب سے بڑا خراج عقیدت ہوگا کہ ہم اپنے دل اور دماغ کو علم اور عقل کی روشنی سے پوری طرح منور کریں اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی دنیا میں ٹھوس قدم آگے بڑھائیں اور اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاق اور کردار پیدا کریں۔ انسانی زندگی کی سب سے بڑی دولت علم ہے اور علم کا صحیح مقصد بنی نوع انسان کی خدمت ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام

ڈاکٹر صابرہ خاتون

پروفیسر عبدالسلام عالم اسلام کے وہ فرد واحد تھے جنہیں فزکس میں 1979ء کا نوبل انعام ملا اور پہلے پاکستانی تھے جو یہ بین الاقوامی مایہ ناز اعزاز حاصل کر سکے۔ ان کی پیدائش 1926ء میں پنجاب کے ایک چھوٹے سے قصبہ جھنگ میں ہوئی تھی۔ بچپن سے ہی انہیں مطالعہ کا شوق تھا۔ یکے بعد دیگرے ہر امتحان میں اول آتے رہے اور ہائی اسکول میں تو پورے صوبے میں اول آئے۔ انٹر کے امتحان میں پنجاب یونیورسٹی میں اول آنے کے بعد عبدالسلام نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ 1946ء میں جب آپ نے بیس سال کی عمر میں امتیازی نمبروں سے ریاضی میں ایم-اے پاس کیا تو اعلیٰ تعلیم کے لئے حکومت سے وظیفہ ملا اور ان کا کیمبرج میں داخلہ ہو گیا۔ جہاں موصوف نے 1948ء اور 1949ء میں ریاضی اور طبعیات میں یکے بعد دیگرے درجہ اول میں آنرس کیا۔ پھر تجرباتی طبعیات میں تحقیق شروع کی لیکن کیونڈش قوانین کے مطابق وہ اپنی تھسس 1952ء سے پہلے جمع نہیں کر سکتے تھے اور ان کا وظیفہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ لہٰذا وہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کئے بغیر پاکستان لوٹ آئے۔ یہاں ان کا تقرر پنجاب یونیورسٹی میں بحیثیت صدر' شعبہ ریاضی ہو گیا۔

سلام صاحب کے لئے یہاں کا ماحول تشفی بخش نہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے کیمبرج واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ جس واقعے نے انہیں مزید پژمردہ کیا وہ 1953ء میں احمدیہ فرقہ کے خلاف ہنگامہ تھا جو پورے پنجاب میں پھیل گیا۔ لہٰذا 1954ء میں وہ ریاضی کے لکچرار کی حیثیت سے کیمبرج واپس چلے گئے' جہاں وہ تین برس تک ٹھہرے۔ 1957ء میں امپیریل کالج' لندن میں ان کا تقرر بطور پروفیسر' نظریاتی طبعیات ہوا۔ کچھ ماہ بعد ایک پاکستانی سیاست دان افتخار الدین انگلستان آئے۔ انہوں نے جب ایک پاکستانی کو لندن میں پروفیسر کا عہدہ سردست سنبھالے دیکھا تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ بعد ازاں اپنے اخبار ''پاکستان ٹائمز'' میں سلام صاحب پر ایک مضمون شائع کیا جسے پڑھ کر ان کے ہم وطنوں کو پروفیسر سلام کی لیاقت کا علم ہوا۔ سلام صاحب کی شہرت کو چار چاند اس وقت لگا جب پنجاب یونیورسٹی نے انہیں ڈی ایس سی کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ ساتھ ہی ساتھ صدر پاکستان ایواب خان نے انہیں سائنٹیفک کمیشن کا ممبر اور پاکستان کے تعلیمی کمیشن کا مشیر مقرر کیا۔ اسی زمانے میں ان کی سربراہی میں پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف نیوکلیر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (PINSTECH) کی تعمیر ہوئی اور اس میں 5MW کا تحقیقی ری ایکٹر قائم کیا گیا۔ چونکہ سلام صاحب کے دنیا کے مشہور سائنس دانوں سے تعلقات تھے' لہٰذا انہوں نے تیرہ برس کے عرصے میں خصوصی سائنسی مشیر کی حیثیت سے تقریباً چار سو پاکستانی سائنس دانوں کو ایٹمی توانائی کے پر امن مقاصد کے مختلف النوع مضامین میں مہارت حاصل کرنے کے لئے بیرونی ممالک بھیجا۔ ان کی نگرانی میں ایک تجارتی پاور ری ایکٹر کراچی میں قائم کیا گیا اور ایک موسمیاتی راکٹ 1962ء میں کراچی کے قریب چھوڑا گیا۔ لیکن 1968ء میں ایوب خاں کے بعد یحییٰ خاں اور پھر ذوالفقار علی بھٹو سے پروفیسر سلام کے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور اسی بنا پر 1974ء میں انہوں نے سائنسی مشیر کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

امپیریل کالج آ کر پروفیسر عبدالسلام نے کوانٹم الکٹروڈائنامکس پر تحقیقی کام شروع کیا اور قدرت میں پائی جانے والی چار ابتدائی قوتوں میں سے دو قوتوں کو ایک رشتے میں منسلک کر کے دنیا کی بے شمار انواع و اقسام کی اشیاء کو متحد کیا۔ بیسیوں صدی کے ماہر طبعیات کا یہ ایک زبردست خواب تھا جس کو پروفیسر سلام نے حقیقت کا جامہ پہنایا۔ پروفیسر سلام کا یہ نظریہ جس کو انہوں نے ''برقی خفیف عمل باہم'' کے نام سے موسوم کیا' موجودہ دور میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ طبعیات میں اتنی ہی زبردست پیش قدمی ہے' جتنی کہ ایک صدی قبل فیراڈے اور مکس ول نے مقناطیس اور برقیات کو یکجا کر کے کی تھی۔

دور حاضر میں یہ قیاس آرائی کی جاتی ہے کہ ساری کائنات میں پائے جانے والے بنیادی ذرات صرف بیس یا اس سے کچھ زیادہ ہیں جن کے باہمی عمل کی بدولت سارے رد عمل رونما ہوتے ہیں۔ یہ چاروں قوتیں یہ ہیں۔

1 تجاذب یا قوت ثقل:(Force of Gravity)

2 برقی مقناطیسی قوت(Electro magnetic Force)

3 خفیف عمل باہم یا خفیف نیو کلیائی قوت (Weak Nuclear Interaction)
4 قوی عمل باہم یا مضبوط نیو کلیائی قوت (Strong Nuclear Interaction)

پہلی دونوں قوتوں کی وسعت کافی ہے اور وہ دور دراز ستارے اور کہکشاں بلکہ بہت دور تک پائی جاتی ہیں' لیکن بعد کی دونوں قوتوں کی توسیع کم ہے۔ یہ دونوں قوتیں ایٹم کے اندرونی فاصلوں تک ہی موثر ہیں۔ جہاں تک ان قوتوں کی توانائی کا تعلق ہے' یہ ایک دوسرے سے ضخامت (Magnitude) میں قطعی طور پر مختلف ہیں۔

عرصہ دراز سے سائنس دانوں کے ذہنوں میں یہ بات گشت کر رہی تھی کہ قدرت بہت پیچیدہ نہیں ہے اور عین ممکن ہے کہ یہ چاروں قوتیں کسی ایک عام اصول کے تحت ایک دوسرے سے بندھی ہوئی ہے۔ مثلاً اگر یہ ثابت کیا جا سکے کہ ان چاروں قوتوں کا مرکز ایک ہے تو قدرت کی پیچیدگیوں کو سمجھنا زیادہ آسان ہو گا اور اس طرح موجودہ طبعیات کی روشنی میں متعدد پیچیدہ مسائل سلجھائے جا سکیں گے' لیکن ان چاروں قوتوں کو ایک ضابطے میں یک جا کرنا مشکل مرحلہ تھا کہ ان قوتوں کا مدار ایک ہی ہے۔ مثلاً آئن سٹائن نے اپنی زندگی کا کافی حصہ ایک ایسے نظریہ کی جستجو میں گزارا جس میں وہ قوت ثقل اور برقی مقناطیسی قوت کو یکجا کرنا چاہتے تھے' لیکن ان کو کامیابی نہ مل سکی۔ بعد ازاں کئی سائنس دانوں نے اس کا صحیح حل تلاش کیا مگر غلط تشریح کی بنا پر مسترد کر دیا گیا۔ بالاخر ایک ایسا شخص میدان میں آیا جس نے اس کا صحیح حل تلاش کیا۔ اس طرح 80 سالہ تاریخ میں پروفیسر سلام پہلے سائنسدان تھے جو کامیابی کے نقطہ عروج کو پہنچے اور انہیں وائن برگ (Steven Weinberg) اور گلاشو (Sheldon Glashow) کے ساتھ 1979ء کے نوبل انعام سے نوازا گیا۔

پروفیسر سلام اس وقت لندن میں مقیم تھے' جب انہیں معلوم ہوا کہ فزکس میں 1979ء کے نوبل انعام کے لئے انہیں منتخب کیا گیا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی فوراً مسجد تشریف لے گئے۔ نماز شکرانہ ادا کیا اور سوئیڈن کے بادشاہ سے پاکستانی پوشاک میں نوبل انعام لینا پسند کیا۔ نوبل انعام حاصل کرنے کے بعد دنیا بھر سے سائنسی تجاویز' مذاکرات و مباحثات میں شرکت کے لئے مدعو کیے جانے لگے۔ انہوں نے اسلامی ممالک کا دورہ کیا تاکہ وہاں کی سرکار کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی جانب راغب کر سکیں۔ انہوں نے سائنس' تعلیم اور غربت دور کرنے کے طریقے اور ان سے متعلق دیگر موضوعات پر بلاخوف و خطر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انہوں نے اسلامی دولت مشترکہ کو چھ جغرافیائی خطوں میں تقسیم کیا تاکہ ہر خطے میں سائنسی اور ٹیکنیکی تعلیم کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکے۔ ان کے مطابق مسلم ممالک میں سائنسی تعلیم حاصل کرنے والے 18 سے 23 برس کی عمر کے طلباء صرف 2 فیصد ہیں۔ جبکہ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ مالک میں ان کی شرح بالترتیب 12 اور 32 فیصد ہے اور یہی وجہ ہے کہ مسلم ممالک کا شمار سائنسی ترقی میں آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

کویت میں 1981ء میں پروفیسر سلام نے بین الاقوامی سیمینار میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے دنیا میں کبھی سائنس کو اتنا فروغ دیا تھا لیکن آج بدقسمتی سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ سربراہان عرب کی تھوڑی سی امداد اور مسلمانوں کی ذکاوت، فہم و ادراک، محنت، لگن، حوصلہ اور مستعدی انہیں دوبارہ انہیں بلندیوں پر واپس لے جاسکتی ہے۔ مسلم ممالک میں فی الحال تقریباً تیس ہزار ذہین دماغ موجود ہیں لیکن اُن کا رخ مغرب کی جانب ہے جہاں انہیں کام کرنے کے مواقع فراہم ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ان کی سلامتی، حفاظت اور کفالت کا خاطر خواہ انتظام ہو تاکہ وہ لوگ اپنے ہی ملک میں مقیم رہ کر ملک کا نام روشن کرسکیں۔

پروفیسر سلام جنوری 1981ء میں انڈین فزکس ایسوسی ایشن (چیئرمین لیش پال) اور کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (چیئرمین ڈاکٹر نور الحسن) کی دعوت پر بیس روزہ دورے پر ہندوستان تشریف لائے۔ موصوف بمبئی، مدارس، بنگلور، کلکتہ، بھوونیشور، دہلی، علی گڑھ، امرت سر، قادیان اور حیدر آباد گئے۔ ہر جگہ ہی طلباء، اساتذہ اور عوام خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انہیں ڈی ایس سی کی اعزازی ڈگری دی اور نہایت پرجوش، پرخلوص اور شاندار استقبال کیا۔ خیرسگالی کے اس دورے کے درمیان سلام صاحب کو بھابھا تحقیق کا مرکز، حیدر آباد کا نیوکلیائی ایندھن تیار کرنے کا پلانٹ بنگلور کا مصنوعی سیارہ تیار کرنے کا اسٹیشن اور 140MEV کا تبدیل پذیر توانائی سائیکلوٹران دکھایا گیا جسے دیکھ کر آپ کافی متاثر ہوئے اور فرمایا کہ ہندوستان کا شمار اب سائنسی نقطہ نگاہ سے دنیا کی تین بڑی طاقتوں میں ہونے لگا ہے۔ پاکستان کی طرح ہندوستان میں بھی تجارتی حلقے کا جتنا دباؤ ہے کم و بیش اتنا ہی دباؤ غیر ملکی درآمد کرنے والے تاجروں کا ہے، مگر حکومت ہند نے ان تمام اشیاء کی درآمد پر جو اپنے ملک میں تیار کی جاتی ہے، سخت پابندی عائد کر رکھی ہے۔ تاکہ مقامی ٹیکنیکی معیار بلند ہو اور حکومت مقامی اشیاء کی برآمد میں نہ صرف یہ کہ خود کفیل ہو بلکہ ان پر فخر بھی کرسکے۔

سلام صاحب یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ترقی پذیر ممالک میں اعلیٰ سائنسی تحقیق شروع تو ہوتی ہے لیکن کچھ ہی عرصے بعد ترقی یافتہ ممالک سے رابطہ نہ ہونے کے باعث ختم ہو جاتی ہے۔ اعلیٰ سائنسی تحقیق، اداروں کے مقابلے، فرد پر زیادہ منحصر ہوتی ہے۔ اگر مناسب شخص کو بین الاقوامی امداد مل جائے تو وہ تحقیق میں چار چاند لگا سکتا ہے۔ یہاں کچھ ادارے بھی ہیں مگر وہ ناکام ہیں۔ ان کے پاس مزید فنڈ نہیں ہے کہ باہر سے ماہرین کو لاسکیں اور اچھے طلباء کو باہر بھیج سکیں۔

ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک کے اس خلا کو پر کرنے کے لئے پروفیسر عبدالسلام نے 1960ء میں ایک بین الاقوامی ادارہ برائے نظریاتی طبعیات Internationl Centre for (I.C.T.P) Theoretical Physics قائم کرنے کی تجویز بین الاقوامی انرجی ایجنسی (IAEA) کی جنرل کانفرنس میں پیش کی، جس میں انہوں نے پاکستانی نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی تھی، جسے بغیر حیل و حجت

تسلیم کر لیا گیا۔ 1962ء کی کانفرنس میں مرکز کا قیام اٹلی میں طے پایا اور 1964ء میں اٹلی کے شہر تری راستے (Trieste) میں یہ مرکز قائم ہوا' جس کے ڈائریکٹر پروفیسر سلام مقرر ہوئے۔ مرکز کے سالانہ بجٹ کا 90 فیصد حصہ اطالوی حکومت نے دینے کا وعدہ کیا' بقیہ IAEA اور UNESCO کی طرف سے ملنے لگا۔ مزید امداد Ford Foundation اور Swedish International Development Agency (SIDA) سے بھی ملنے لگی۔

اس مرکز نے پروفیسر سلام کی قیادت میں دن دونی رات چوگنی ترقی کرنی شروع کی اور 32 برس کے عرصے میں چار سو سے زائد مضامین پر مذاکرے' ورکشاپ اور کانفرنسیں سال کے مختلف اوقات میں منعقد ہوئیں اور تقریباً پانچ ہزار تحقیقی پرچے بین الاقوامی رسالوں میں شائع ہوئے۔ اکیاون ہزار اس مرکز میں آئے اور فیض یاب ہو کر لوٹے۔ 36 نوبل انعام یافتہ سائنسدانوں نے بھی اس مرکز کو عزت بخشی۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کا ہر ماہر سائنسدان یا تو وہاں جا چکا ہے' جانے والا ہے یا جانے کا خواہاں ہے۔ راقم الحروف کو بھی دو مرتبہ (1987ء اور 1990ء) اس مرکز میں جانے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔

اپنی زندگی کے آخری حصہ میں پروفیسر عبدالسلام تیسری دنیا میں تین حصوں پر مبنی ایک مرکز قائم کرنا چاہتے تھے۔ پر افسوس! صد افسوس! زندگی نے وفا نہ کی اور 70 برس کی عمر میں 21 نومبر 1996ء میں اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سلام صاحب عصر حاضر کے ایک عظیم سائنسدان تھے۔ آپ کی سائنسی تصانیف' مضامین اور دنیا بھر سے ملے ہوئے عطیات' انعامات' وظائف' اعزازات اور آنریری ڈگریوں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ انہیں مختصراً بیان کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن امر ہے۔ سلام صاحب نے اپنی زندگی میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ رہتی دنیا تک سائنس دانوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوں گے۔ آپ نے سائنس دان اور ماہرین تعلیم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''میرا پیغام یہ ہے کہ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے لئے کام کا آغاز کریں' جس کے لئے سائنس فاؤنڈیشن قائم کرنے ہوں گے اور ہمارے شہری کو اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے قربانی دینا ہوگی۔ میری ناچیز رائے میں اسلامی تعلیم کی اس وقت سارے عالم اسلام میں زور دینے کی ضرورت ہے۔ اگر حکومت اور ملک دونوں مل کر ہمت اور اولوالعزمی کے ساتھ کام کا آغاز کریں تو آج ہی سے کام شروع ہو سکتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ ہماری محنتوں کو رائیگاں نہیں جانے دے گا۔''

(''تہذب الاخلاق'' مارچ 1997ء)

جماعت احمدیہ کے آئمہ کرام اور بھائی جان

بھائی جان نے جماعت احمدیہ کے تین آئمہ کرام حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب' حضرت حافظ مرزا ناصر احمد صاحب اور حضرت مرزا طاہر احمد صاحب کے مبارک دور پائے۔ ان سب کے ساتھ آپ کی وابستگی' فدائیت اور اطاعت مثالی رنگ رکھتی تھی۔ آپ کی تعلیم کے بارے میں ابا جان حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب سے راہنمائی حاصل کرتے رہے۔ 1954ء کے بعد آپ جب بھی پاکستان تشریف لاتے تو اپنے ان روحانی راہنماؤں سے ملاقات کے لئے ربوہ ضرور تشریف لے جاتے اور کبھی کبھی آپ رات بھی وہاں بسر کرتے۔

اپریل 1969ء میں ابا جان کی وفات پر ہم ربوہ گئے۔ وہاں ہم سب بھائی حضرات مرزا ناصر احمد صاحب جماعت احمدیہ کے تیسرے امام کی خدمت میں ملاقات کے لئے حاضر ہوئے تو انہوں نے ہم سب سے دلی اظہار افسوس فرمایا۔ اس پر بھائی جان نے عرض کیا: "حضور ہمارے والد بڑے دعا گو انسان تھے۔ ان کے چلے جانے کے بعد اب دعا کا منبع ختم ہو گیا ہے۔" حضور نے ازراہ شفقت بھائی جان کا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا: "آپ کا امام آپ کے والد ماجد کی جگہ آپ کے لئے دعا کرے گا اور اللہ نے چاہا تو آپ کے والد ماجد کی دعائیں پوری ہوں گئیں اور میں یہ بھی دعا کروں گا کہ اللہ آپ کو نوبل انعام سے نوازے۔" چنانچہ ان دعاؤں کے طفیل دس سال بعد اللہ تعالیٰ نے بھائی جان کو نوبل انعام سے نوازا' سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔

1974ء میں حکومت پاکستان نے جب احمدیوں کو "ناٹ مسلم" قرار دے دیا تھا تو ہر احمدی کی طرح بھائی جان کو بھی اس فیصلہ سے بے حد دکھ ہوا۔ آپ اس وقت زیڈ-اے بھٹو وزیراعظم پاکستان کے اعزازی سائنسی مشیر اعلیٰ تھے۔ 10 ستمبر 1974ء کو انہوں نے اپنا استعفیٰ وزیراعظم زیڈ اے بھٹو کے سامنے پیش کر دیا۔

آپ 1974ء کے آخر میں پاکستان تشریف لائے تو ربوہ تشریف لے گئے۔ میں اور بھائی چوہدری محمد عبدالسمیع آپ کے ہمراہ تھے۔ حضرتِ مرزا ناصر احمد صاحب سے ملاقات کرنے سے پہلے آپ صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب (موجودہ امام جماعت احمدیہ) کے دولت خانہ پر ان سے ملاقات کے لئے حاضر ہوئے۔ اس ملاقات کے دوران بھائی جان بے حد جذباتی ہو گئے۔ (میں نے انہیں پہلے کبھی ایسا نہیں دیکھا تھا) اور انہوں نے صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب سے سخت شکوہ کیا کہ جماعت احمدیہ کی مدد سے پیپلز پارٹی نے انتخاب میں کامیابی حاصل کی ہے لیکن اس کے باوجود اس نے جماعت احمدیہ کو "ناٹ مسلم" قرار دلوایا ہے۔ جماعت احمدیہ کو پیپلز پارٹی کی کوئی مدد نہیں کرنا چاہیے تھی۔ اس عرصہ میں صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب جماعت احمدیہ کی پوزیشن واضح کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن بھائی جان کی خفگی میں کوئی کمی

نہیں آ رہی تھی۔ آخر کار صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب کے سمجھانے پر بھائی جان نے ان کے استدلال کو سمجھ لیا۔ چند سال بعد جب صاحبزادہ مرزا طاہر احمد جماعت احمدیہ کی مسند امامت پر تشریف فرما ہوئے تو بھائی جان نے آپ کے ساتھ وابستگی اور کامل اطاعت کا وہ نمونہ دکھایا کہ اس کا اظہار حضرت مرزا طاہر احمد صاحب نے بھائی جان کی وفات کے اگلے روز خطبہ جمعہ میں فرمایا۔ یہ خطبہ 22 نومبر 1996ء کو بیت الفضل لندن میں ارشاد فرمایا گیا' جسے روزنامہ "الفضل ربوہ" نے اپنی ذمہ داری پر 3 مئی 1997ء کو شائع کیا۔ اس خطبہ کا متن اس باب کے آخر میں دیا جا رہا ہے۔

ستمبر 1981ء کی بات ہے کہ حضرت مرزا ناصر احمد صاحب امام الثالث جماعت احمدیہ کراچی میں تشریف فرما تھے۔ میں انہیں دنوں لندن میں کچھ عرصہ قیام کے بعد کراچی واپس پہنچا تھا کہ ایک شام مجھے حضرت صاحب نے طلب فرمایا۔ چنانچہ ان کا پیغام ملتے ہی اپنے بیٹے خالد اقبال کے ہمراہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ آپ نے فرمایا کہ "سلام کل اسلام آباد پہنچ رہا ہے۔ آپ وہاں چلے جائیں اور اسے میرا ایک پیغام پہنچا دیں۔" چنانچہ آپ نے مجھے اپنا پیغام بتایا۔ آپ سے اجازت لے کر میں پی آئی اے کے بکنگ آفس چلا گیا' وہاں سے دوسرے روز کی پہلی پرواز سے اپنی سیٹ بک کروائی۔ چونکہ مجھے علی الصبح ہوائی اڈہ پر پہنچنا تھا اس لئے میں رات جلد سو گیا۔ تقریباً گیارہ' بارہ بجے رات میرے گھر کی گھنٹی بجی۔ جب میں نے دروازہ کھولا تو وہاں مولانا سلطان محمود انور مربی کراچی کو کھڑے پایا جنہیں دیکھ کر مجھے کچھ گھبراہٹ ہوئی اور جلدی سے ان سے پوچھا کہ جناب خیریت تو ہے کہ اپ اتنی رات گئے میرے ہاں تشریف لائے ہیں۔ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ حضرت صاحب نے آپ کے لئے یہ لفافہ بھجوایا ہے' اس میں آپ کے اسلام آباد آنے جانے کا کرایہ ہے۔ یہ سن کر میں نے عرض کیا کہ ٹکٹ تو میں نے خرید لی ہے تو انہوں نے فرمایا کہ "ہم حکم کی تعمیل کرنے آئے ہیں۔" (اتفاق سے اس شام میرے پاس کرایہ کی پوری رقم نہیں تھی' اس لئے مجھے اپنی ہمشیرہ حمیدہ بشیر سے کچھ رقم ادھار لینا پڑی تھی) دوسرے روز میں اسلام آباد پہنچ گیا۔ چونکہ بھائی جان کا جہاز کچھ دیر میں وہاں آنے والا تھا' اس لئے میں ہوائی اڈے پر ہی رک گیا۔ بھائی جان مجھے ہوائی اڈہ پر دیکھ کر کچھ پریشان ہو گئے اور مجھ سے دریافت فرمایا: "میاں توں کیویں آیاں ایں؟" (میاں تم کیسے آئے ہو؟) تو میں نے انہیں بتایا کہ حضرت امام جماعت کراچی میں تشریف فرما ہیں' انہوں نے آپ کے لئے بہت ضروری پیغام بھجوایا ہے۔ تو آپ نے کہا کہ جلدی سے مجھے وہ پیغام بتاؤ' چونکہ وہاں کچھ اور لوگ موجود تھے' تو میں نے عرض کیا کہ میں وہ پیغام ریسٹ ہاؤس جا کر علیحدگی میں دوں گا۔ ریسٹ ہاؤس پہنچ کر جب میں انہیں پیغام بتانے لگا تو انہوں نے قدرے اونچے لہجے میں مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی' جس پر میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ میں اس وقت ان کے بھائی نہیں بلکہ حضرت امام جماعت کے نمائندہ کے طور پر بات کر رہا ہوں' اس لئے برائے مہربانی اپنا لہجہ دھیما رکھیں' چنانچہ انہوں نے بڑی دھیمی آواز میں کہا: "اچھا پیغام بتاؤ۔" جسے سننے کے بعد انہوں نے

فرمایا کہ جیسے حضرت امام کی خواہش ہے میں ایسا ہی کروں گا۔ بعد میں' میں ان سے اجازت لے کر سہ پہر کے جہاز سے کراچی واپس چلا گیا اور وہاں حضرت امام جماعت کی خدمت میں رپورٹ پیش کی تو آپ نے دریافت فرمایا: "سلام کچھ کہتا تو نہیں تھا۔" اس پر میں نے حضور کو تمام واقعہ سنایا تو آپ نے متبسم ہو کر فرمایا: "اچھا وہ کل کراچی آ رہا ہے' میں اس سے بات کروں گا۔" یہ واقعہ بتانے کی غرض یہ ہے کہ بھائی جان نے میری بات سنتے ہی حضرت امام جماعت کی اطاعت شعاری کا بے مثل نمونہ دکھایا۔

1979ء میں نوبل انعام ملنے کے بعد حضرت مرزا ناصر احمد صاحب امام جماعت احمدیہ نے 20 اکتوبر کو ربوہ میں احمدی خواتین کی تنظیم لجنہ اماءاللہ کے سالانہ اجتماع میں خطاب کرتے ہوئے بھائی جان کے بارے میں درج ذیل تعریفی کلمے ارشاد فرمائے:

"ڈاکٹر سلام جو کہ بہت بڑے سائنسدان ہیں کو دنیا کا سب سے بڑا انعام یعنی نوبل پرائز ملا ہے۔ خدا نے ان کو عقل' ذہانت اور فراست دی ہے۔ اپنے اعمال و کردار کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی توفیق دی ہے' بچپن ہی سے اپنا وقت ضائع نہ کرنے کی توفیق دی ہے۔ ساری استعدادیں دیں اور علم سیکھنے کی توفیق دی' ان کے دماغ کو برکت دی اور انہیں دنیا کے چوٹی کے سائنسدانوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ ڈاکٹر سلام کی عزت اور مرتبہ کا یہ مقام ہے کہ اگر کوئی کانفرنس ہو رہی ہو اور اس میں روس' امریکہ اور دیگر ممالک کے چوٹی کے سائنسدان شریک ہوں اور یہ بعد میں کانفرنس ہال میں داخل ہوں تو جونہی یہ داخل ہوتے ہیں سارے لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کی اپنی حالت یہ ہے کہ جیسے انگریزی میں Unassuming (سادہ مزاج) کسی کی پرواہ نہیں' کوئی خیال نہیں کہ میں اتنا بڑا انسان ہوں' نہ آرام کا خیال' نہ کپڑوں کا خیال' آپ لوگ ان سے ملیں تو عام انسانوں جیسا کوئی باپ بھائی یا خاوند سمجھیں۔ مثال کے طور پر اس بزرگ کا واقعہ سنا دیتا ہوں جس کی ایک بہت بڑا امیر بڑی عزت کرتا تھا' وہ قیمتی کپڑے بھی پہن لیتے تھے مگر کھدر اور عام کپڑے بھی پہنتے تھے۔ ایک دفعہ اس امیر نے ان کی دعوت کی۔ یہ عام کپڑے پہن کر چلے گئے تو دربان نے گھسنے نہ دیا۔ پھر وہ واپس آ گئے اور اپنا ایک ہزار اشرفیوں کی مالیت کا قیمتی جبہ پہن آئے تو ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی' جب کھانا آیا تو انہوں نے اپنے جبہ کی آستین سالن میں ڈال دیں۔ لوگ حیران ہوئے تو کہا: "تم نے میری دعوت نہیں کی' اس جبے کی دعوت کی ہے۔" ڈاکٹر اسلام بھی اسی قسم کے انسان ہیں' وہ بالکل نہیں جانتے کہ میں اتنا بڑا سائنسدان ہوں اور دوسروں میں اور مجھ میں کوئی فرق ہے۔ کپڑوں سے یا دولت سے کوئی بڑا نہیں بنتا۔ خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: انما انا بشر مثلکم کہ انسان ہونے کے لحاظ سے میں اور تم برابر ہیں۔"

حضرت مرزا طاہر احمد صاحب امام الرابع جماعت احمدیہ کے خطبہ جمعہ کا متن جو آپ نے بھائی جان کی وفات کے اگلے روز انہوں نے بیت الفضل لندن میں ارشاد فرمایا:

حضرت امام جماعت احمدیہ الرابع نے فرمایا:

(اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) کہ جو کچھ بھی اس پر یعنی زمین پر ہے' سب فنا ہونے والا ہے اور صرف تیرے رب کی شان جمال و جلال ہے جو باقی رہے گا' وہ صاحب جلال ہے اور صاحب اکرام ہے۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کی تکذیب کرتے ہو یا تکذیب کرو گے۔ اسی سے سوال کرتے ہیں جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ ہر وقت وہ ایک نئی شان کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ "یوم" یہاں وقت کے پیمانے کے طور پر ہے۔ اس لئے لمحہ لمحہ بھی یہاں یوم کے مفہوم میں داخل ہے۔ پس تم اپنے رب کی کن کن آیات کی تکذیب کرو گے۔ یہاں دونوں کا لفظ خطاب میں شامل ہے۔ مگر جب ہم اردو میں تم کہتے ہیں تو لازم نہیں ہوا کرتا کہ "دونوں" لفظ کو دہرایا جائے۔ (کلام الٰہی) نے یہاں جب بھی سوال اٹھایا ہے تو تم دونوں کہہ کر اٹھایا ہے۔ تو تم دونوں کن کن باتوں میں یعنی خدا تعالیٰ کی کس کس شان اور جلوہ گری کی تکذیب کرتے ہو یا کرو گے۔

یہ بہت ہی گہرے عارفانہ مضامین پر مشتمل ہیں۔ ان کی پوری (تشریح) کا تو اس وقت موقع نہیں مگر ایک دو امور ایسے ہیں جن کی طرف جماعت کو توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ ہر چیز فانی ہے اب یہ ایک ایسا اعلان ہے جو روزمرہ میں سب کو علم ہے لیکن اسے دہرایا کیوں گیا ہے' اس قدر زور کے ساتھ ایک ایسی صورت میں جو چھوٹوں اور بڑوں دونوں کے لئے ایک عظیم چیلنج کا رنگ رکھتی ہے۔ جن اور انس بڑے لوگ اور چھوٹے لوگ' دونوں کو مخاطب کرتی ہے اور بڑی شان کے ساتھ ان کو چیلنج کرتی ہے۔ اس میں اس مضمون کے بیان کا عنوان یہ رکھنا (جو کچھ بھی اس پر یعنی زمین پر ہے سب فنا ہونے والا ہے) یہ کچھ گہری حکمت رکھتا ہے۔ درحقیقت ہر فانی انسان اپنے آپ کو لافانی سمجھ رہا ہوتا ہے اور یہ عجیب متضاد زندگی ہے جو انسان گزارتا ہے اور اس کو شعور بھی نہیں کہ میرے اندر ایک سوچوں میں تضاد پایا جاتا ہے۔ سب دنیا کو مرتے اور گزرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ سب دنیا کو دیکھتا ہے کہ اس جہان میں کوئی نہیں رہا۔ آئے دن روزانہ دنیا تبدیل ہو رہی ہے' ہر موت کے ساتھ ایک تبدیلی واقع ہوتی ہے اور کچھ عرصے کے بعد وہ جہان بھی بدل جاتا ہے تو کتنے ہی بدلے ہوئے جہانوں کا' ان گنت بدلے ہوئے جہانوں کا وارث ہو کر وہ اپنی ذات کے متعلق یہ گمان نہیں کرتا کہ مجھے بھی ایک دن اس دنیا سے گزر جانا ہے اور جب وہ گزرے گا تو پھر ان لمحوں میں وہ احساس کہ میں فانی تھا اس کے کسی کام نہیں آئے گا۔

یہی مضمون (کلام الٰہی) میں فرعون کے ذکر میں کئی جگہ بیان ہوا ہے' لیکن خاص طور پر اس کی ڈوبتی ہوئی گھڑیوں کی دعا کہ اب میں ایمان لاتا ہوں' بنی اسرائیل کے خدا پر' اس وجہ سے رد کر دی گئی یعنی کلیتہ" نہیں مگر مرکزی نقطہ کے لحاظ سے دعا رد کر دی گئی کیونکہ فانی انسان جب فنا کو آنکھوں کے سامنے کھڑا دیکھتا ہے وہ لمحہ ہے اس کے یقین کا کہ اب میں اس دنیا میں نہیں رہنے والا' میں فانی تھا اور اسی لمحے اس کی ساری زندگی اس کو اکارت جاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ تمام کوششیں' تمام اموال' سب دولتیں' سب نام و نمود' سب اسی دنیا میں دھرے رہ جاتے ہیں اور وہ اکیلا اکیلا خدا کے حضور حاضر ہونے کے لئے

جب تیار کھڑا ہو پھر وہ اس قسم کے وعدے کیا کرتا ہے۔ اب میں ایمان لاتا ہوں' اب مجھے نجات دے۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب تم فنا کو دیکھ لو اور پھر نجات کی دعائیں مانگو تو تمہارے کسی کام نہیں آئیں گی۔ بدنی زندگی مل بھی جائے تو روحانی زندگی کا سوال ہی پیدا ہی ہوتا۔

پس یہ وہ مضمون ہے جو ساری دنیا میں سب کے لئے قدر مشترک رکھتا ہے۔ فی الحقیقت انسان اپنی فنا پر ویسا یقین نہیں رکھتا جیسا یقین اس کی زندگی میں تبدیلیاں پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے اور یہی وجہ ہے. کہ دنیا جانتے ہوئے کہ موت مقدر ہے پھر بھی اپنے آپ کو تبدیل نہیں کرتی تو (کلام الٰہی) کا اس شان کے ساتھ اس مضمون کا ذکر فرمانا جو بظاہر دنیا میں سب کو معلوم ہو یہ بتا رہا ہے کہ تمہیں وہم ہے کہ تم جانتے ہو' تم نہیں جانتے کہ ہر چیز فانی ہے اور جب ہر چیز کا ذکر فرمایا تو اس کے بعد یہ ہے اعلان کہ ہاں تیرے رب کا جلال و جمال کا جلوہ ہے جو باقی رہے گا اور دوسرا "وجہ" کا مطلب رضا ہے جو باقی رہے گی۔ یعنی خدا کی رضا جس کو باقی رکھنا چاہے گی اسے رکھے گی اور جو کچھ بھی رہے گا رضا کی بنا پر اس سے لٹک کر اس کے سہارے رہے گا۔ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تو اللہ اور جمال کا جلوہ باقی رہے گا اور جس پر اس کی دائمی ازلی ابدی رضا کی نگاہ پڑی ہے وہ بھی باقی رہ سکتا ہے مگر خدا تعالیٰ کی رضا میں شامل ہو کر اس سے الگ رہ کر نہیں۔

دوسری بات جو اس میں خاص طور پر توجہ کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ چیزوں کے فنا کا ان کی عظمت کے ساتھ جو تعلق ہے یہ مضمون اس بات کو خوب کھول کر بیان فرما رہا ہے کہ تمہاری عزتیں' تمہاری دنیا کی نمود کی کمائی جو کچھ بھی ہے اس کی خاطر تم دنیا سے چمٹے ہوئے تھے تو یاد رکھو کہ وہ بھی فنا ہیں اور اس کا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ ہاں ایک خدا کے جلال و جمال کا جلوہ ہے جو باقی رہنے والا ہے۔ اس لئے اگر عزتوں کی خاطر تم کچھ کرتے ہو۔ اپنی دنیا کی نام و نمود کے لئے محنتیں کرتے ہو تو وہ وقت آئے گا جب وہ چیزیں مٹ جائیں گی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض قوموں اور بعض لوگوں اور بعض بڑے بڑے بادشاہوں کی عزت اور نام و نمود تو ہمیں دنیا میں پیچھے باقی رہتی دکھائی دیتی ہے یہ کیوں باقی رہی۔ اس کے دو جواب ہیں' اول تو یہ کہ اس مضمون کا آخری فنا کے فیصلے سے تعلق ہے' اس لئے اگر اس وقت سے پہلے کہ دنیا میں انسان کی صف لپیٹ دی گئی کسی کی عزت و جاہ و جلال کا تذکرہ باقی رہ بھی جائے تو اس کی حقیقت کوئی نہیں کیونکہ خدا کے علم میں یا خدا کے فیصلوں میں وقت کی وہ حیثیت نہیں ہے جو انسان کے علم اور فیصلوں میں وقت کی حیثیت ہے۔ خدا تعالیٰ کو کوئی زمانہ تقسیم نہیں کرتا۔ نہ ماضی' نہ حال' مستقبل ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا اور یہی اس کی ازلیت اور ابدیت ہے جو اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کے سوا ہر چیز کو فنا ہے۔ کسی چیز کو بھی ازل اور ابد کا دعویٰ نہیں ہے نہ ہو سکتا ہے اور پہلے جو توہمات تھے دنیا کے مثلاً آریہ سماج کا عقیدہ کہ دنیا ازل سے ہے اور بعض یورپین فلسفیوں کا بھی یہ خیال کہ کوئی چیز عدم سے پیدا ہو ہی نہیں سکتی' اس لئے ازل سے ہے' اس خیال کو کلیتہ" غلط ثابت کرنے

میں ڈاکٹر عبدالسلام نے بھی ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا۔ پہلے جو یہ خیال تھا کہ پروٹان کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ اس سے پہلے یہ خیال تھا کہ ایٹم Destroy نہیں ہو سکتا اور ایک Law تھا یعنی نظریہ نہیں اس کو Law کہتے ہیں۔ Indestructabililty of Atom جو کچھ مرضی ہو جائے' ایٹم Destroy نہیں ہو سکتا اور ڈاکٹر عبدالسلام کے دورے سے پہلے سائنس دانوں نے ثابت کر دیا کہ ایٹم تو Destroy ہو سکتا ہے اگر نہ ہو سکتا تو ایٹم بم کیسے بن جاتا اور پھر جب کائنات پر زیادہ گہری نظر ڈالی تو Black Hole کا جو تصور ابھرا ہے اور اس کا علم اور اس کی ماہیت سے متعلق جو سائنسی اندازے لگائے گئے تو پتہ لگا کہ Black Hole تو بنتا ہی اس وقت ہے جبکہ ایٹم آپس میں کچلے جاتے ہیں اور الیکٹرانز کے فاصلے اپنے مرکز سے اس دباؤ کی طاقت سے جو Gravitational Pull ہے۔ یعنی کشش ثقل اس کے نتیجے میں یوں آپس میں اکٹھے ہو جاتے ہیں کہ بہت عظیم الشان وسیع کائنات سمٹ کر گویا ایک چھوٹے سے دائرے میں محدود ہو جاتی ہے جو پھر سمٹتا اور پھر سمٹتا ہے اور اپنی طاقت کے زور کے ساتھ ایک خودکشی کر لیتا ہے یعنی وجود اس طاقت کی عظمت کے سامنے جھک کر ایک فنا کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ جس کے متعلق انسان کچھ نہیں جانتا کہ وہاں کیا ہے' اس کی پرلی طرف اس کو کہتے ہیں۔ Event Horizon تو یہ حصہ جہاں تک ماضی کا تعلق ہے اس معاملے میں تو سائنس دانوں کی آنکھیں کہ یہ کائنات ازل سے بہرحال نہیں ہے مگر جہاں تک ابد کا تعلق ہے' اس بات پر کافی اٹکے رہے ہیں کہ پروٹان Indestructable ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے اس نظریہ میں بہت بڑا کام کیا ہے اور بیماری سے پہلے مجھ سے اس بارے میں جو گفتگو کا موقع مجھے ان سے ملا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے Mathematically یعنی حساب کی مدد سے جو ثابت کیا ہے کہ دنیا کی پروٹانز کی عمر اتنی ہے۔ نظریہ کے طور پر تو اب سائنسدان اسے قبول کر چکے ہیں لیکن دو تین نظریے ہیں۔ بعض سائنسدان کہتے ہیں اس سے ایک حصہ کم' بعض کہتے ہیں ایک حصہ زیادہ مگر جو حصہ ہو بھی بہت بڑا تصور ہے' اس لئے آپ کو میں عددی تصورات میں الجھانا نہیں چاہتا۔

تو Raise to the power of 32 ہے یا 33 یا 34 ہے۔ یہ بحث چل رہی ہے بس اور 32 اور 34 میں اتنا فرق ہے بظاہر ایک کا فرق ہے لیکن جب Powers میں باتیں کی جاتی ہیں تو اس مقام پر پہنچ کر عام انسانی ذہن اس کا تصور کر ہی نہیں سکتا کہ کتنی بڑی چیز ہے۔ مگر سائنسدان اللہ کے فضل کے ساتھ اور حساب دان بہت باریک باتوں کو اپنے استدلال کے ذریعے معلوم کر لیتے ہیں اور کائنات کے کناروں تک کی خبریں اپنے استدلال کے ذریعے حاصل کر لیتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب نے جہاں تک مجھے یاد ہے ہے Raise to the Power of 33 کا نظریہ پیش کیا تھا اور مجھے بتا رہے تھے بلکہ کئی دفعہ بتایا کہ اس وقت دنیا میں لیبارٹری بڑی بڑی عظیم بے انتہا خرچ کر کے کام کر رہی ہیں۔ ان میں ایک امریکہ میں بھی ہے' ایک اٹلی میں بھی ہے اور شائد ایک اور جگہ بھی اور اب تک جو خبریں ملی ہیں وہ امید افزا ہیں۔ اگر یہ

قطعیت سے ثابت ہو گیا تو ہرگز بعید نہیں کہ ایک اور نوبل پرائز ان کو مل جائے' یعنی بطور حق کے ان کو ایسا Nobel Laurate بننے کی توفیق ملے کہ دو دفعہ زندگی میں Nobel Laureate بنیں۔

تو یہ ایک دنیا کا انعام و اکرام ہے جو ممکن تھا کہ ہو جاتا مگر جہاں تک عقلی تعلق ہے اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ آپ کی فضیلت عقل کی روشنی کے لحاظ سے ساری دنیا میں مسلم ہے۔ کوئی دنیا کا سائنسدان نہیں ہے جو عظمت کی نگاہ سے آپ کو نہ دیکھے بلکہ اخلاقی قدروں اور عظمت کردار کے لحاظ سے یہ ایک وہ سائنس دان ہے جس کی دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ بھی عزت کرتے تھے اور حقیقت میں ان کے سامنے عظمت کے ساتھ سر جھکاتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے بے تکلف گفتگو میں مجھے انہوں نے کئی دفعہ بتایا کہ فلاں ملک کا سربراہ اس طرح مجھ سے پیش آتا ہے' فلاں ملک کا اس طرح پیش آتا ہے' دعوتیں دیتے ہیں کہ ہمارے پاس آؤ' ہم شاہی اعزاز کے ساتھ تمہاری خدمت کر کے کچھ تسلی پائیں کہ ہم نے بھی کسی بڑے انسان کی کوئی خدمت کی ہے لیکن ان باتوں کے باوجود تکبر کا نام و نشان نہیں تھا اور یہ وہ اصل عظمت کردار تھی جس کا میڈل سے تعلق نہیں ہے۔

پس اس مضمون کو اس طرف منتقل کرتے ہوئے میں چند باتیں ڈاکٹر صاحب کے متعلق بیان کروں گا۔ مگر اس سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس میں عامۃ الناس کے لئے بھی ایک عجیب پیغام ہے جو کوئی بلندی حاصل نہیں کر سکتے۔ ان کو یہ پیغام ہے کہ تم بھی تو یا بڑے لوگوں میں ہو یا چھوٹے لوگوں میں ہو' مگر بڑے بھی مٹ جاتے ہیں' چھوٹے بھی مٹ جاتے ہیں اور بڑے بھی اپنی بڑائی کی شانوں کے ساتھ مٹا دیئے جائیں گے اور چھوٹے بھی جو قدریں بھی وہ رکھتے ہیں' ان کے نسبت مٹا دیئے جائیں گے تو اس عارضی چیز کے لئے تم کیوں کسی سے حسد کرو کیوں تکلیف میں مبتلا رہ کر زندگی گزارو کہ فلاں تو اتنا بڑا ہو گیا' فلاں نے اتنا علم حاصل کیا' فلاں کو اس طرح دنیا نے عزتیں دیں۔ فرمایا دنیا' دنیا کی عزتیں یہ ساری چیزیں فنا ہونے والی ہیں اس سے کیوں نہیں تعلق جوڑتے جس کی رضا کا چہرہ کبھی فنا نہیں ہو گا۔

یہ وہ مضمون ہے جو ہر بنی نوع انسان کی محرومی کے زخموں پر ایک ایسا پھاہا رکھتا ہے کہ ہر دکھ کا علاج ہے۔ لیکن اگر انسان اپنی توجہ پھیرے' چنانچہ آج صبح ڈاکٹر صاحب کے لئے دعا کے وقت یہ مضمون میرے ذہن میں ابھر کر میری دعا کو ایک اور رخ دے گیا۔ میں نے کہا یہ دنیا کی عزتیں تو آج نہیں تو کل فنا ہونے والی ہیں کچھ بھی ان کا نہیں رہتا لیکن جو تیری رضا کی عزت ہے' جس کا ذکر آیا ہے وہ دائمی ہے۔ پس ان کے لئے (کلام الہی) کے الفاظ میں میں نے یہ دعا کی۔ اے مطمئن روح! اپنے رب کے حضور اس طرح حاضر ہو کہ راضیہ ہو۔ تو اپنے رب سے راضی ہو اور "مرضیہ" ہو پس "وجہ ربک" کی جو لازوال زندگی اور لازوال وجود کی خوشخبری ہے وہ ان دو لفظوں میں داخل ہو جاتی ہے۔

کوئی انسان جو اپنے رب سے راضی نہ ہو وہ ہیشگی نہیں پا سکتا۔ کوئی انسان جس سے خدا راضی نہ ہو وہ ہیشگی نہیں پا سکتا۔ پس اس مضمون کے ساتھ ہی میری توجہات بدل گئیں۔ یہ کہنے کی بجائے کہ آج ہم

سے ایک ایسا وجود رخصت ہوا جس کے نتیجے میں ایک خلاء پیدا ہو گیا اور جماعت کو آئندہ یہ خلاء محسوس ہوتا رہے گا۔ میں نے کہا وہ مضمون کیوں نہ میں بیان کروں جو ہمیشگی کا مضمون ہے اور لازوال مضمون ہے۔ پس نیک انجام کے ساتھ میری توجہ نیک آغاز کی طرف گئی اور مجھے یہ خیال آیا کہ درحقیقت لوگ اچھے انجام کی طرف دیکھتے دیکھتے اس سے ایسے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ بسا اوقات آغاز کا خیال ہی نہیں کرتے حالانکہ بہت سے پاک اور نیک انجام ہیں جن کی بنیادیں بعض دفعہ انسان کی پیدائش سے پہلے ڈال دی جاتی ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب بھی انہیں وجودوں میں سے ایک وجود ہیں۔

جیسے چوہدری محمد ظفراللہ خان صاحب۔ ان کو جو عظمتیں ملی ہیں وہ بارہا یاد کرایا کرتے تھے۔ دنیا کو کہ میری ماں کی دعائیں تھیں۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کی توحید کے ساتھ وابستگی اور وفا اس کا غیر متزلزل اور محکم یقین خدا کی وحدانیت پر اور غیر اللہ کو رد کرتے چلے جانا یہ وہ خوبیاں تھیں جو اللہ کے فضل کے ساتھ ان کے لئے ایک نعمت کی صورت میں ظاہر ہوئیں۔ پس میں اپنی پاک بزرگ ماں کی دعاؤں کا ایک پھل ہوں اور یہ مضمون ان کو انکساری کی طرف لے جاتا تھا کہ کھل کر باتیں کرتے تھے' مجھ سے تو بہت بے تکلفی تھی' کہا کرتے تھے کہ بس قصہ وہی ہے' سارا میں کیا میرا وجود کیا' دعاؤں کا پھل ہوں۔

اور ڈاکٹر صاحب بھی دعاؤں ہی کا پھل تھے۔ ان کے والد بزرگوار چوہدری محمد حسین صاحب اور ان کی والدہ ہاجرہ بیگم غالباً نام تھا ان کا دونوں ہی بہت مقدس وجود تھے۔ بہت پاکیزہ صاف ستھرے' خالص پاکیزہ زندگی گزارنے والے اور احمدیت کے بعد تو سونے پر سہاگے کا عالم تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی پیدائش سے پہلے رویا دیکھا کہ ان کو ایک خوبصورت پاک بیٹا عطا کیا جا رہا ہے اور اس کا نام عبدالسلام بتایا جاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت (امام جماعت الثانی) کو رویا لکھی اور چونکہ بہت منسکر المزاج تھے اپنی رویا کی بنا پر خود نام نہیں رکھا خواب لکھ کر حضرت (امام جماعت الثانی) سے پوچھا کہ میں اس بچے کا کیا نام رکھوں۔ تو آپ نے فرمایا یہ اللہ نے تمہیں بتا دیا ہے تو میں کون ہوتا ہوں دخل دینے والا یہی نام رکھ لو۔ پس عبدالسلام اس بیٹے کا نام الہی منشاء اور رضا کے مطابق رکھا گیا جو ان کی خاص دعاؤں کا پھل تھا اور ساری زندگی پھر اس نے رویا کی سچائی کو ظاہر کیا اور اپنے ماں کے خلوص کی قبولیت کو ظاہر کیا۔

تو اس میں ایک اور بھی ہمارے لئے سبق ہے۔ ایک وجود گزر گیا مگر اس کے حوالے سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے اے اللہ احمدیت کو اور نوبل لاریئٹ Nobel Laureate عطا کر مگر نوبل لاریئٹ کتنے ہیں اور کتنوں کا مقابلہ کرے گی۔ احمدیت ہزارہا نوبل لاریئٹ ہیں اور بنتے چلے جائیں گے۔ چار اور بھی لے لئے احمدیت نے مانگ مانگ کے تو کتنا فرق پڑے گا۔ لیکن وہ انعام یافتہ جو خدا کے دربار سے انعام یافتہ ہو وہ تو اگر ان پڑھ بھی ہو تو ایسا انعام یافتہ بن سکتا ہے کہ تمام کائنات کی چوٹی کے علماء اور چوٹی کے اعزاز پانے والے اس کی جوتیوں کو اٹھانے میں فخر محسوس کریں' اس کے پاؤں کی خاک چومنے میں فخر محسوس کریں۔

تو چھوٹی باتوں پہ ہم کیوں راضی ہوں' چھوٹی دعائیں کیوں مانگیں' وہ دعائیں مانگیں جیسی ڈاکٹر عبدالسلام کے باپ نے اپنے بیٹے کے لئے کی تھیں اور جن کو خدا نے اس طرح قبول فرمایا کہ اپنی رضا کا مظہر بنایا اور اس بات کا قطعی ثبوت آپ کی زندگی کے لمحہ لمحہ نے دیا ہے۔

سائنس کی دنیا میں اتنے بلند مرتبہ تک پہنچنے کے باوجود کامل طور پر خدا کی ہستی کے قائل۔ بلکہ ایک دفعہ مجھے کہہ رہے تھے کہ جب میں کسی سائنسی اجتماع میں جاتا ہوں تو بعض سرگوشیوں کی آواز آتی ہے یہ وہ ہے جو خدا کو مانتا ہے اور بھی سائنس دان اب ماننے لگے ہیں' پہلے سے بڑھ گئے ہیں لیکن جس شان کے ساتھ آپ نے خدائے واحد و یگانہ کے ایمان کا حق ادا کیا ہے اور اس جھنڈے کو بلند کیا ہے ویسا کوئی اور سائنس دان اس جیتی دنیا میں آپ کو دکھائی نہیں دے گا اور پھر خدائے واحد و یگانہ کی عظمت کے نتیجے میں جو انکسار پیدا ہوتا ہے وہ پوری طرح آپ کی ذات میں ہمیشہ رہا۔ نظام جماعت کے سامنے خادمانہ حیثیت کی حفاظت کی ہے۔

اب میں ان کی عمر کے لحاظ سے چھوٹا' علم کے لحاظ سے تو دنیا کے علم کے لحاظ سے تو حیثیت ہی کوئی نہیں مگر جب مجھ سے گفت و شنید کرتے تھے' ملتے تھے وہ عزت و احترام کے تمام تقاضے جو (امامت) سے وابستگی کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں ان کو اس طرح پورا کرتے تھے کہ میں حیران رہ جاتا تھا اور باتوں میں مشورہ کرکے وہ کہتے تھے جو میں کہتا تھا وہ کرتے تھے' جو میں بیان کرتا تھا یا مشورہ نہیں لیں گے مشورہ لیں تو قبول کریں گے اس کو۔ غرضیکہ مجھے ان کی انکساری کو دیکھ کر رشک آتا تھا کہ کتنا بڑا عالم ہے' سائنس کے مضامین میں' سوچیں میں ان سے بحث کر رہا ہوں' یہ نہیں کبھی کہا کہ آپ کو پتہ کچھ نہیں' آپ کو حساب بھی نہیں آتا تو آپ مجھ سے کیا باتیں کر رہے ہیں۔ مگر انتہائی توجہ سے بات سن کر دلیل سے قائل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

مجھے یاد ہے ایک دفعہ رفتار کے اوپر بحث چلی کہ سائنس کا یہ اور خاص طور پر حساب دانوں کا یہ قطعی نظریہ ہے کہ روشنی کی رفتار سے کوئی چیز آگے نہیں بڑھ سکتی تو میں نے ان سے کہا کہ یہ جو حد لگائی جا رہی ہے یہ میں تسلیم نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میرے نزدیک خدا تعالیٰ کے اوپر حد بندی نہیں ہو سکتی' خالق کے اوپر نہیں ہو سکتی۔ حساب کھول دیئے باقاعدہ۔ اپنا حساب دان کھول لیا اور نقشے بنائے اور دائرے بنائے اور بتایا کہ یہ دیکھیں حسابی رو سے ناممکن ہے اور فزکس کے نظریہ کے لحاظ سے بھی یہ ناممکن ہے۔ میں نے باتیں سمجھیں' میں نے کہا آپ نے جو باتیں کہیں ہیں دلیل کے ساتھ کہیں ہیں۔ میں دلیل کا انکار نہیں کر سکتا۔ مگر میں ایک اور بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ آپ یہ بتائیں کہ یہ ساری باتیں آپ کے اس کائنات کے تصور سے وابستہ ہیں اور مشروط ہیں جو اب تک آپ پر ظاہر ہوا ہے اور کیا یہ درست نہیں کہ مادہ میڈیم ہے لہروں کے لئے اور اگر مادہ نہ بھی ہو تو کوئی میڈیم ہونا چاہیے اور میڈیم کی صفات میں جو رفتار طے کرتی ہیں تو کیا ایتھر کے علاوہ کوئی اور میڈیم بھی ہو سکتا ہے۔ اگر ایتھر نہیں ہے تو پھر خود یہ

محل نظر ہے کہ چیز حرکت میں کیسے رہتی ہے اور ویو (Wave) کیسے بنتی ہے جب کہ ویو (Wave) مادے کی صفت ہے اور حرکت کی صفت نہیں ہے۔ یہ باریک باتیں تھیں' ڈاکٹر صاحب کو تو ایک لمحہ نہیں لگا ان باتوں کو سمجھنے کا۔

مجھے انہوں نے جواب میں کہا کہ آئن سٹائن تو قائل ہے کہ ایتھر ہے اور ایتھر ہی کی صفات میں جو جلوہ گر ہیں مگر باقی سائنس دان قائل نہیں ہوئے ابھی اور ابھی تک قطعی ثبوت کوئی نہیں مل سکا۔ میں نے کہا: "مل سکتا ہے کہ نہیں؟" کہا کہ ہو سکتا ہے میں نے کہا: "اگر ایتھر کے سوا کوئی اور میڈیم ہو جس کی صفات مختلف ہوں تو رفتار بڑھ سکتی ہے؟" انہوں نے کہا: "بڑھ سکتی ہے۔" میں نے کہا یہ بتائیں کہ اگر کسی چیز کو مادی میڈیم کی ضرورت نہ ہو اور وہ روحانی وجود ہو؟ آپ خدا کی ہستی کے قائل تھے' اس کا انکار کر ہی نہیں سکتے تھے تو اس کو کون سا قانون پابند کرے گا کہ اس کا پیغام روشنی کی رفتار سے ان گنت زیادہ تیزی کے ساتھ جہاں وہ پہنچانا چاہے پہنچا دے تو اس کے بعد وہ نہیں بولے پھر صرف کہا ہاں اصولاً میں مان گیا ہوں' یہ ٹھیک ہے' یہ ہو سکتا ہے مگر معلوم دنیا میں اب تک جو ہے وہ یہی ہے' اس سے میں انکار نہیں کر سکتا۔

تو اس رنگ میں ان کے اندر یہ حوصلہ تھا اور یہ انکسار تھا کہ بالکل ان پڑھ' سائنس کے ابتدائی علم سے بھی عاری انسان جس کا ماضی سے علم کا ان کے علم میں تھا کیا حیثیت رکھتا تھا کچھ بھی نہیں۔ اس سے اتنے بڑے مضامین کے اوپر بڑے حوصلے کے ساتھ گفتگو کرنا' اسے سمجھانے کی کوشش کرنا اور جب کوئی ایسی دلیل دی جائے جو ان کے اپنے عقیدے کے مطابق تسلیم ہونی چاہیے' تسلیم کر لی' کر لیتے تھے تو یہ بھی رفعت کی علامت ہے۔ یعنی انکسار اور ان دونوں میں تضاد نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ تبھی سجدے کا رفعتوں سے تعلق ہے۔ رفعت (راء کی زیر کے ساتھ) لفظ عربی میں تو ہے مگر اردو میں بعض لوگ رفعت (را کی زبر کے ساتھ) بھی کہہ دیتے ہیں' اس لئے میں رفعت بھی کہہ دیا کرتا ہوں مگر اصل لفظ رفعت ہے۔ تو رفعتیں جو انسان کو عطا ہوتی ہیں ان کا انکساری سے گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ سجدے میں "ربی الاعلیٰ" کی دعا سکھائی گئی ہے۔ رب سب سے اعلیٰ ہے اور مراد یہ ہے کہ تم نے اس کے حضور جب ماتھا ٹیک دیا ہے جتنا نیچے ہو سکتے تھے ہو گئے ہو اب رب اعلیٰ کو یاد کرو تو تم اس سے فیض پاؤ گے اور رفعتیں حاصل کرنے والا اتنا ہی زیادہ جھکتا چلا جاتا ہے۔ یہ دونوں مضمون لازم و ملزوم ہیں۔ سب سے زیادہ انکسار دنیا میں حضرتؐ نے دکھایا ہے اور سب سے زیادہ رفعتیں آپ کو عطا ہوئی ہیں۔

پس ایک بڑے آدمی کے گزرنے کے ساتھ ان مفاہیم پر گفتگو ہونی چاہیے جو لوگوں کو بڑا بنانے والے ہیں اور سب کے لئے برابر پیغام رکھتے ہوں۔ اب علم کے لئے اگر میں کہہ بھی دوں کہ دعا کرو کہ اللہ ہمیں سو نوبل لارئیٹ عطا کر دے تو کیا اس کا آخری نتیجہ نکلے گا؟ کیا وہ حضرت محمد رسول اللہؐ سے بڑھ

جائیں گے جنہیں کسی مکتب میں بیٹھنے کی توفیق نہیں ملی۔ تمام صاحب علم انسانوں سے اور ذی روح' ذی شعور وجودوں سے علم میں آپؐ کا وجود آگے بڑھ گیا تو ان رفعتوں کے لئے کیوں نہ دعا مانگی جائے جس میں ہم سب برابر کے شریک ہو جائیں گے۔ چھوٹا بڑا غریب ایک تیسری دنیا کا آدمی' ایک ترقی یافتہ مغربی ملک کا باشندہ ان سب کے لئے قدر مشترک ہے کہ اصل علم کا منبع' اصل عزتوں کا منبع جس کا علم اور جس کی عزتیں باقی رہنے والی ہیں وہ اللہ کی ذات ہے۔ اسی کی طرف جھکو' اسی کی طرف دل لگاؤ' تم میں سے ہر ایک کو پھر وہ رفعتیں عطا ہو سکتی ہیں کہ جو اس کے تصور میں بھی نہیں آسکتیں۔

تو اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب (۔) کے درجات بلند فرمائے' ان کو بہت بلند مرتبے عطا فرمائے اور ان کی رفعتوں کی جو جان ہے یعنی دعاؤں کا پھل وہ جان اللہ تعالیٰ ان کی اولادوں اور نسلوں میں آگے جاری فرمائے۔ بعض بچے ان کی اولاد میں سے بہت سعید فطرت اور ایسا وجود رکھتے ہیں جن پر توقع سے نظریں پڑتی ہیں۔ انکی بیٹی عزیزہ ہے حمید الرحمان اور عزیزہ کا چھوٹا بیٹا جب بھی میں اس کو دیکھتا ہوں میں ان کو کہتا ہوں کہ اس میں تو مجھے ڈاکٹر سلام نظر آرہا ہے۔ ایک اور ڈاکٹر سلام۔ تو یہ میری مراد ہرگز نہیں کہ وہ صرف نوبل لارئیٹ بن جائے گا کسی وقت میں جب کہا کرتا ہوں تو میں ان کو سمجھا رہا ہوں کہ میری یہ دعا ہوتی ہے کہ اللہ اس میں وہ خوبیاں پیدا کر دے جو روحانی رفعتوں کی علم بردار ہوتی ہے اور روحانی رفعتوں کے مقابل پر دنیا کی رفعتوں کی کوئی حیثیت نہیں سمجھتیں' پھر اس کے صدقے میں نوبل لارئیٹ بھی بنے تو کیا کمی' کیا بات ہے۔ (پاک ہے اللہ) نور علیٰ نور یعنی نوبل لارئیٹ کے اوپر رضا کی نظر جب پڑے گی تو نور پر نور نازل ہو جائے گا تو یہ دعا اس بچے کے لئے تو میں کرتا ہی ہوں' آپ بھی یاد رکھیں اور اپنی اولادوں کے لئے یہ دعا کریں۔ اگر دنیاوی طور پر عظمتیں اور رفعتیں مقدر میں نہیں ہیں تو صرف ایک بات ہم مانگتے ہیں کہ تیری نظر ان پر ایسی پڑی کہ ان کی پیدائش بھی سلام کی پیدائش ہو اور ان کا وصال بھی سلام کا وصال ہو۔

(سلام ہو جس دن تو پیدا ہوا اور جس دن تو مرے گا اور جس دن دوبارہ اٹھایا جائے گا) جو حضرت مسیح کی دعا بچپن کی بتلائی گئی ہے وہ یہ سلام ہے جس کے متعلق میں آپ کو توجہ دلا رہا ہوں۔ ان کے حق میں اللہ تعالیٰ نے پیدائش سے پہلے وہ سلام لکھ دیا تھا جو سلام موت کا سلام بھی بن گیا اور زندگی کا سلام بھی بن گیا۔ پس جب بھی خدا سے عظمتیں طلب کریں تو انکساری کی عظمتیں طلب کریں اور سلام کی عظمتیں طلب کریں جو آسمان سے اترتا ہے اور پھر وہ جس شکل میں بھی نازل ہو بہت ہی خوبصورت اور دلکش دکھائی دیتا ہے۔ لیکن کسی سے توقع رکھنا اور بات ہے اور اس توقع کا پورا ہونا ایک اور بات ہے۔ یہ دعا بھی ہونی چاہیے کہ اللہ ہر منزل کے خطرات سے بچا کر کسی شخص کو اپنی صلاحیتوں کے عروج تک پہنچائے۔ پس جن بچوں میں نجابت دیکھتا ہوں' اعلیٰ اقدار دیکھتا ہوں ان کی ذہانت ان کے چہرے بشرے سے ٹپکتی ہے ان کے لئے میں یہ دعا ضرور کرتا ہوں کہ خدا اس کو اس کے آسمانی نقطہ عروج تک پہنچائے۔

اب حضرت (امام جماعت الثانی کے بارے) میں یہ بہت ہی عارفانہ نکتہ ہے جو بیان ہوا ہے کہ ہر شخص کا ایک آسمانی نقطہ عروج ہے اور وہاں تک وہ بلند ہو سکتا ہے اس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتا لیکن بھاری اکثریت ہے اتنی بھاری اکثریت کہ شاہد اس کو اعداد و شمار میں شمار ہی نہ کیا جا سکے جو اس نقطہ عروج سے نیچے رہ کر مرجاتی ہے اور کئی ایسے بھی ہیں جو اس نقطہ عروج کی طرف حرکت کرنے کی بجائے مختلف سمت میں حرکت کرتے ہیں۔ اس مضمون کو (کلام الہی) نے کھولا ہے اور میں بارہا کہہ چکا ہوں ایک بدنصیب کا ذکر (کلام الہی) فرماتا ہے اگر اللہ اسے چاہتا تو جو صلاحیتیں ہم نے عطا کی تھیں' ان کے نتیجے میں اسے اس نقطہ عروج آسمانی کی طرف بلند کرلیتا جو اس کا منشی تھا۔ وہ زمین کی طرف جھک گیا۔

پس آغاز اچھا ہونا ذمہ داریاں بھی یاد دلاتا ہے اور دعاؤں کی ذمہ داریاں بھی یاد دلاتا ہے کہ ایسے وجود جن پر تمہاری محبت اور پیار اور شفقت کی نظر ہو جن سے تم توقعات رکھتے ہو کب تک تم ان کی حفاظت کر سکو گے' کب تک ساتھ دو گے۔ کب تک یہ یقین رکھو گے کہ دنیا کے اثرات اسے اپنی طرف نہیں کھینچ لیں گے' اس لئے یہ دعا بھی لازم ہے.کہ اسے نیک انجام تک اللہ پہنچائے اور اس نقطہ نگاہ سے سب سے پیاری دعا جو میری زندگی کی جان ہے' جس کے لئے میں کئی دفعہ بعض دفعہ لوگوں کو (بابرکت مہینہ) سے پہلے بھی عاجزانہ خط لکھ کر خصوصیت سے متوجہ کرتا ہوں وہ یہ دعا ہے کہ ان میں شامل کر دے جن کے لئے آسمان سے یہ آواز اٹھے' ان کا استقبال اس لازوال آواز کے ساتھ ہو (اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف لوٹ آ۔ اس طرح کہ وہ تجھ سے راضی اور تو اس سے راضی۔ اور میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنتوں میں داخل ہو جا) تو جسے یہ نیک انجام نصیب ہو جائے اس سے بہتر کیا انسان تصور کر سکتا ہے۔

پس اس جانے والی پاک روح کے لئے ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ ان کو ان لوگوں میں شمار فرمائے جن کی وفات کے وقت یہ آواز کان میں سنائی دی ہو۔ جس کی روح سے خدا اس طرح مخاطب ہوا ہو اور ان کی اولاد کو بھی وہ وجہ عظمت عطا کرے جو تعلق باللہ کی وجہ ہے۔ جہاں تعلق باللہ وجہ عظمت بنتا ہے' جہاں رفعتیں سجدے میں مضمر ہیں' جہاں ربی الاعلیٰ کی دعا اس طرح اٹھتی ہے کہ انسان پھر ادنیٰ رہ ہی نہیں سکتا' وہ اعلیٰ سے تعلق جوڑ کر ضرور اعلیٰ بنایا جاتا ہے۔ یہ دعائیں اپنے لئے بھی اپنی اولادوں کے لئے سب گزرے ہوئے اور آئندہ لوگوں کے لئے بھی کریں کیونکہ جزا کا وقت تو ابھی باقی ہے یعنی آخری فیصلے قیامت کے دن ہونے ہیں' اس لئے اللہ تعالیٰ جماعت احمدیہ کو یہ عظمتیں نصیب فرمائے اور پھر اپنے نشان کے طور پر دنیا کی برکتیں بھی بخشے کیونکہ دنیا کی آنکھ ان باتوں کو دیکھتی نہیں ہے مگر جب خدا کی عظمتیں دنیا کے نشانوں میں ظاہر ہوتی ہیں تب وہ آنکھیں کھلتی ہیں اور ان باتوں کو دیکھنے لگتے ہیں۔

اب میں مختصراً کچھ یہ مضمون جو تھا میں نے جیسا کہ عرض کیا تھا لمبا مضمون ہے اس کے جو پہلو میرے ذہن میں تھے وہ پورے تو میں بیان نہیں کر سکا مگر امید ہے مرکزی نکتہ احباب جماعت کو سمجھ آ گیا ہو گا۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے احوال کا خلاصہ یہ ہے کہ 29 جنوری 1926ء کو پیدا ہوئے تھے۔ حضرت چوہدری محمد حسین صاحب جو صاحب رویا و کشوف بزرگ تھے ان کا نکاح بھی حضرت (امام جماعت الثانی) نے پڑھایا تھا' ان کی والدہ ماجدہ کا نام ہاجرہ بیگم تھا۔ یہ حکیم فضل الرحمان صاحب کی ہمشیرہ تھیں۔ حکیم فضل الرحمان وہ (مربی) ہیں جو تیئس سال تک اپنی جوانی میں اپنی بیوی سے الگ رہے اور اف تک نہیں کی کبھی۔ افریقہ کے جنگلوں میں زندگی گزاری۔ نہایت پاک باز اور بہت ہی با اخلاق اور جاذب نظر شخصیت تھی۔ یہ ہمارے امریکہ کے ڈاکٹر حمید الرحمان صاحب کے خالو تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے ماموں اور ڈاکٹر حمید الرحمان صاحب کے خالو تھے۔ ثریا بیگم جن کا وصال ابھی ہوا ہے۔ جن کا جنازہ پڑھایا تھا ان کی ہمشیرہ ڈاکٹر حمید الرحمان کی والدہ تھیں۔ (سہواً ایسا کیا گیا ہے۔ حکیم فضل الرحمان ڈاکٹر حمید الرحمٰن کی والدہ کے ماموں تھے' ڈاکٹر حمید الرحمٰن کی والدہ ہماری خالہ زاد بہن تھیں۔ محترمہ ثریا بیگم ڈاکٹر حمید الرحمٰن کی والدہ کی ممانی تھیں' وہ ہماری بھی بڑی ممانی تھیں--- مرتب) تو یہ خاندان آپس میں اس طرح بڑے قریبی تعلق میں بندھا ہوا ہے اور بہت پاک روایتیں ہیں جو اس خون میں جاری ہیں۔ پس دعا کریں کہ یہ آئندہ بھی ہمیشہ جاری رہیں۔

وہ مجھے جو یاد تھا کہ رویا میں دیکھا تھا وہ رویا نہیں بلکہ کشفی طور پر آپ کو یہ دکھایا گیا تھا یہ نوٹس ہیں' ان میں لکھا ہے: "تین جون 1925ء کو خدا تعالیٰ نے کشفی طور پر دکھلایا کہ ایک فرشتہ ظاہر ہوا جس کے ہاتھوں میں ایک معصوم بچہ تھا' فرشتے نے وہ بچہ چوہدری محمد حسین صاحب کو پکڑا دیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بیٹا عطا فرمایا ہے۔ آپ نے اس بچے کا نام پوچھا تو آواز آئی عبدالسلام۔" یہ رویا انہوں نے جب لکھ کر حضرت امام جماعت الثانی کو بھجوائی اور نام کی درخواست کی تو آپ نے لکھا: "جب خدا تعالیٰ نے خود نام رکھ دیا ہے تو ہم کیسے دخل دیں۔" یعنی یہ بات حضرت امام جماعت الثانی کا لکھنا یہ ثابت کرتا ہے کہ حضرت چوہدری محمد حسین صاحب کی رویا اور کشوف کی سچائی پر آپ کو کامل یقین تھا اور ویسے بھی انکسار کا پھر یہی تقاضا ہے جب کہہ دے خدا نے نام رکھ دیا ہے مگر محض اس وجہ سے نہیں مجھے یقین ہے کہ چونکہ آپ جانتے تھے کہ یہ ایک صاحب کشف انسان ہیں' اس لئے یہی لکھنا اس وقت یا صرف یہی لکھنا جائز تھا کہ جب خدا نے نام رکھ دیا تو ہم کیسے دخل دیں۔

چنانچہ پھر یہ بڑھے ہیں تو اللہ کے فضل سے دعاؤں کے ساتھ۔ اب یہ اتفاقی بات نہیں ہے۔ آپ یہ دیکھیں کہ باقی بھی تو بہن بھائی ہیں ان کا تعلیمی کردار' بڑے ذہین ہیں' ہوشیار بھی ہیں' اچھے اچھے مرتبے حاصل کئے۔ کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ ایسا ہے جیسے کوئی چیز شوٹ (Shoot) کر کے ایسا اوپر نکل جاتی ہے کہ باقی سب چھوٹے چھوٹے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے مقابل پر کوئی نسبت نہیں ہے۔ ہر میدان میں ایسے ایسے انہوں نے میڈل بچپن سے حاصل کرنے شروع کئے ہیں۔ ریکارڈ پر ریکارڈ توڑے چلے گئے ہیں اور بعض ایسے ریکارڈ جو پھر اور ہو ہی نہیں سکتے۔ جو سو فی صدی نمبر لے لو گے تو ریکارڈ کیسے ٹوٹے گا اور

پھر جب پاکستان میں ناقدری کی گئی تو انگلستان میں آئے اور انگلستان کی حکومت کی فراخدلی ہے یا قدر شناسی کہنا چاہیے ' فراغ دلی کا سوال نہیں ' انہوں نے بڑی عزت کا سلوک کیا ' امپیریل کالج کی پروفیسر شپ کی سیٹ عطا کی اور مسلسل ان کے ساتھ بہت ہی عزت اور احترام کا سلوک جاری رکھا ہے۔

پھر اٹلی نے آپ کی عزت افزائی کی۔ انہوں نے جو ایک تحریک کی کہ میرے نزدیک وہاں ٹرانسٹی میں ایک سنٹر بنانا چاہیے ' سائنس کے فروغ کا تو حکومت اٹلی نے بڑا حصہ خرچ کا ادا کیا پھر دوسرے اداروں نے بھی اس میں حصہ لیا اور خاص طور پر غریب ممالک کے بچوں کو تعلیمی سہولتیں دے کر ان کی صلاحیتوں کے مطابق ان کو نقطہ عروج تک پہنچانا یہ آپ کا مقصد تھا اور اس میں قطعاً مذہبی تعصب کا اشارہ تک بھی نہیں تھا۔ غیر احمدی ' پاکستانی ' غیر پاکستانی ' پولینڈ کے لڑکے ' عیسائی دہریہ سب پر یہ فیض برابر تھا جو رحمانیت کا فیض ہے اور اللہ کے فضل سے اس کے ساتھ بنی نوع انسان کو بہت بڑا فائدہ پہنچا ہے۔ اب تعلیمی ڈگریاں اور میڈل بیان کرنے کا تو وقت نہیں ہے ' میں نے جو چیزیں اہمیت کی سمجھیں وہ بیان کر دیں۔ اب یہ ہمارا بہت ہی پیارا علموں کا خزانہ ' دنیاوی علوم میں بھی ' روحانی علوم میں بھی ترقی کرنے والا ہمارا پیارا ساتھی اور بھائی ہم سے جدا ہوا۔ اللہ کے حوالے اللہ کے پیار کی نگاہیں ان پر پڑیں اور ان کو سنبھال لیں اور اس کے علاوہ ان کی اولاد کے لئے بھی یہی دعا کریں کہ خدا ان سے ہمیشہ حسن سلوک رکھے ' شفقت اور رحمت کا سلوک رکھے اور ان دعاؤں کو آگے بھی ان کے خون میں ان کی نسلوں میں جاری کر دے جو ان کے حق میں قبول ہوئیں۔"

19

ملکہ برطانیہ کی طرف سے بھائی جان کے لئے (سر) SIR کا اعزازی خطاب

1988ء میں حکومت برطانیہ نے کیمبرج اور امپیریل کالج لندن میں بھائی جان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں Knight Commander of the order (KBE) of the British Empire سر (SIR) کا خطاب دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ چونکہ وہ برطانوی شہری نہیں تھے' اس لئے یہ خطاب اعزازی تھا' یعنی وہ اپنے نام کے ساتھ KBE تو لکھ سکتے تھے لیکن سر لکھنے کے مجاز نہ تھے۔ KBE بھی وہ اسی صورت میں لکھ سکتے تھے جب حکومت پاکستان انہیں اس خطاب کو قبول کرنے کی اجازت دیتی۔

پٹنی (PUTNEY) کے علاقہ (جس میں بھائی جان 1957ء سے رہائش پذیر تھے) کے ممبر آف پارلیمنٹ مسٹر ڈیوڈ ملیر (David Miller) بھائی جان کا دوست تھا اور اس کا ان کے پاس بہت آنا جانا تھا۔ اس کی بھی خواہش تھی کہ وہ برطانوی شہریت اختیار کر کے یہ خطاب لیں۔ اس سے اس کی اپنی ایک غرض تھی وہ یہ کہ اس کے علاقہ سے کوئی KBE ہو۔ لیکن بھائی جان نے اس کی یہ بات کبھی نہیں مانی تھی۔

آخرکار اپنے دوستوں کے مشورہ سے انہوں نے یہ اعزاز قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا اور حکومت پاکستان سے ایک خط کے ذریعے اس کے لئے اجازت چاہی۔ چونکہ وہ پاکستانی تھے' اس لئے ایسا کرنا ضروری تھا۔ جب کئی ماہ تک انہیں حکومت پاکستان کی طرف سے اس بارے میں کوئی جواب موصول نہ ہوا تو انہوں نے حکومت برطانیہ سے اس اعزاز کو قبول کرنے سے معذرت کر لی۔ اس بات کا لندن میں پاکستانی ہائی کمشنر کو جب علم ہوا تو اس نے فوراً صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کے پرنسپل سیکرٹری سے رابطہ کر کے اسے تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔

جب اس صورت حال کا علم صدر صاحب کو ہوا تو انہوں نے بھائی جان کو پیغام بھیجا کہ وہ یہ اعزاز قبول کر لیں' لیکن بھائی جان چونکہ انکار کر چکے تھے' اس لئے وہ اپنے مؤقف پر قائم رہے۔ اس پر جنرل

محمد ضیاء الحق صدر پاکستان نے بھائی جان سے خود ٹیلیفون پر بات کی اور ان سے کہا وہ یہ خطاب قبول کر لیں۔ لیکن بھائی جان نے انہیں بھی یہی جواب دیا کہ وہ ایک مرتبہ انکار کر چکے ہیں' اس لئے یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ازخود حکومت برطانیہ سے اس بارے میں رابطہ کریں۔ اس پر صدر صاحب نے فرمایا کہ وہ حکومت برطانیہ کو خط لکھ دیتے ہیں کہ یہ اعزاز ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو آئندہ سال یعنی 1989ء میں ضرور دیا جائے۔

صدر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے بھائی جان کو یہ بھی بتایا کہ ان کا خط صدر صاحب نے وزیراعظم جونیجو کو ضروری کارروائی کے لئے بھیج دیا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ "سرخ فیتے" کی نظر ہو گیا۔

1989ء میں حکومت برطانیہ نے یہ خطاب بھائی جان کو عطا کیا تھا۔ چونکہ یہ اعزازی خطاب تھا۔ اس لئے وہ اپنے نام کے ساتھ سر نہیں لکھ سکتے تھے۔

20

ہمارے والد ڈاکٹر عبدالسلام

(اپنی بیٹیوں کی نظر میں)

(ڈاکٹر عزیزہ رحمٰن (پی ایچ ڈی بایو کیمسٹری) بشریٰ سلام باجوہ (امریکہ)

ترجمہ :از مرتب

اکثر ہم سے یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ ہمارے والد کیسے تھے؟ مگر اس سوال کا جواب دینا اتنا آسان نہیں تاہم اپنے والد کی زندگی کے بارے میں اختصار سے ہم چند باتیں بیان کریں گیں۔

ہمارے والد ایک عظیم انسان تھے جن کے وجود میں حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کی ایک پیشین گوئی کے مندرجہ ذیل الفاظ بڑی شان سے پورے ہوئے:

"..... میرے فرقہ کے لوگ اس قدر علم اور معرفت میں کمال حاصل کریں گے کہ اپنی سچائی کے نور اور اپنے دلائل اور نشانوں کی رو سے سب کا منہ بند کر دیں گے....."

("تجلیات الہیہ" صفحہ 17' "روحانی خزائن" جلد 20' صفحہ 409)

ان کی کہانی اس روز سے شروع ہوئی جب ہمارے دادا نے اپنے بیٹے کی پیدائش سے پہلے ایک کشف دیکھا تھا۔ 2 جون 1925ء کے دن مسجد احمدیہ جھنگ شہر میں مغرب کی نماز ادا کرتے ہوئے وہ قرآن حکیم کی یہ دعا پڑھ رہے تھے:

"..... اے ہمارے رب العزت ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کو ہمارے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک بنا اور ہمیں متقیوں کے لئے راہنما بنا....." 25:75

تو عین عالم بیدار میں انہیں ایک لڑکا پکڑایا گیا۔ دریافت کرنے پر انہیں اس کا نام "عبدالسلام" بتایا گیا۔ چنانچہ وہ 29 جنوری 1926ء کو سنتوکھ داس ضلع منٹگمری (ساہیوال) میں اپنے ننھیال میں پیدا ہوئے۔ (ان کی والدہ کا وطن فیض اللہ چک تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور تھا۔ ان کی پیدائش کے وقت ان کے نانا حضرت حافظ نبی بخش صاحب سنتوکھ داس میں پنجاب کے محکمہ مال میں ملازم تھے) کشف میں بتائے گئے نام کے مطابق ان کا نام عبدالسلام ہی رکھا گیا۔

ہمارے والد کا بچپن اور نوجوانی اپنے آبائی وطن جھنگ شہر میں گزری۔ جھنگ پنجاب کا ایک ضلع ہے۔ وہاں کے لوگوں کی ذریعہ آمدنی زراعت تھی لیکن اب وہاں صنعتیں لگ چکی ہیں۔ وہاں بجلی 1942ء میں آئی تھی۔

دو سال کی عمر میں انہیں جھنگ کا سب سے زیادہ صحت مند بچہ ہونے کا پہلا انعام ملا تھا' پھر انعامات کا یہ سلسلہ ان کی تمام عمر چلتا رہا۔

انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے حاصل کی تھی۔ چھ سال کی عمر میں انہیں چوتھی جماعت میں داخل کرایا گیا۔ وہ بلا کے ذہین اور محنتی تھے۔ ہمارے دادا نے بھی ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی اور وہ ہر امتحان میں اول آتے رہے' حتیٰ کہ 1946ء میں 20 سال کی عمر میں انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے کا امتحان پاس کیا اور پنجاب یونیورسٹی میں اول آئے۔

1946ء میں خدا کے فضل سے انہیں ایک وظیفہ ملا اور وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ چلے گئے۔ وہاں انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے ریاضی اور فزکس میں ڈبل ٹرائی پوز (Tripos) کیا۔ (کیمبرج یونیورسٹی میں کسی مضمون کو فرسٹ کلاس میں پاس کرنے کو ٹرائی پوز کہتے ہیں) اور وہیں سے فزکس میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ جس کے لئے تحقیقی مقالہ انہوں نے پانچ ماہ کے قلیل عرصہ میں مکمل کیا تھا اور اس کی وجہ سے عالمی شہرت پائی۔ کیمبرج یونیورسٹی نے وہ مقالہ لکھنے پر انہیں سمتھ پرائز (Smith Prize) دیا تھا۔ اُن کا وہ تحقیقی کام اتنا اعلیٰ تھا کہ امریکہ کی پرنسٹن انسٹی ٹیوٹ نے انہیں ایک سال کے لئے فیلوشپ دے کر اپنے ہاں مزید تحقیق کرنے کے لئے بلا لیا۔ دنیا کے مشہور سائنسدان آئن سٹائن پرنسٹن انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر تھے۔ چنانچہ ان سے ہمارے والد کی ملاقاتیں ہوتی رہتیں۔

1951ء میں وہ اپنے ملک واپس آ گئے اور انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ اب تک وہ ایک تحقیقی سائنسدان بن چکے' لیکن لاہور میں انہیں اس کام کے لئے ماحول میسر نہ آ سکا۔ 1953ء میں سینٹ جونز کالج (St.Johns) نے انہیں اپنے ہاں لیکچرار اور فیلوشپ کی پیشکش کی جسے انہوں نے فوراً منظور کر لیا اور کیمبرج چلے گئے۔ کیمبرج یونیورسٹی کے سب سے بڑے اور پرانے ٹرینٹی کالج جس میں مشہور سائنسدان نیوٹن پڑھاتے تھے نے بھی انہیں اپنے کالج کی فیلوشپ دینے کی پیشکش کی تھی' جسے انہوں نے اس لئے مسترد کر دیا تھا کہ سینٹ جونز کالج کے پھولوں کے باغات اور اس کے لان (Lawn) زیادہ خوبصورت تھے۔

اپنے والد کے بارے میں میری (ڈاکٹر عزیزہ رحمٰن--- مرتب) یادیں اس وقت سے ہیں جب میں اور میری والدہ دسمبر 1953ء میں ان کے ساتھ کیمبرج گئی تھیں۔ اس وقت میری عمر تقریباً چار سال تھی۔

کیمبرج ایک خوبصورت شہر ہے جو دریا کیم (Cam) کے کنارے آباد ہے۔ وہاں انگلینڈ کی دوسری سب سے بڑی اور پرانی یونیورسٹی ہے اور وہاں درجن بھر سے زیادہ کالج ہیں۔ ہم سینٹ جونز کالج کے قریب دریا کیم کے کنارے ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے والد ہمیں دریائے کیم میں پنٹنگ (Punting) کے لئے لے جایا کرتے تھے۔ پنٹ (Punt) قدرے چوڑے پیندے کی کشتی کو کہتے ہیں' جسے ایک لمبے بانس سے کھیا جاتا ہے۔ میں اپنی والدہ کے ساتھ کشتی کے ایک سرے پر بیٹھ جاتی جبکہ

میرے والد دوسرے سرے پر کھڑے ہو کر اسے کھیتے (چلاتے) تھے۔ بعض اوقات بانس ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر دریا میں گر جاتا تو وہ چپو کی مدد سے کشتی کو کنارے پر لے جاتے تھے۔

1957ء میں ہم نے کیمبرج چھوڑ دیا تھا کیونکہ ہمارے والد کو امپیریل کالج لندن میں پروفیسر شپ مل گئی تھی۔ یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا جو انہیں ملا۔ وہ کالج کے کم عمر پروفیسر تھے۔ اس نئے عہدہ کی وجہ سے ان کی مصروفیات میں اضافہ ہو گیا تھا۔ سائنسی کانفرنسوں میں شرکت کے لئے وہ دوسرے ممالک میں جاتے رہتے تھے اور بعض اوقات تو وہ ایک ہفتے کے اندر چار پانچ ممالک میں لیکچر دیا کرتے تھے۔ اس مصروفیت کی وجہ سے وہ ہمیں سیر و تفریح کرانے کے لئے زیادہ وقت نہیں دے سکتے تھے۔ پھر بھی وہ کبھی کبھی ہمیں ہمارے گھر کے نزدیک واقع رچمنڈ پارک (Richmond Park) میں لے جاتے تھے۔ یہ ایک بہت بڑا اور خوبصورت پارک ہے، جس کے اندر ایک پہاڑی سی ہے۔ وہ کار اس پہاڑی کی چوٹی پر لے جاتے اور پھر اس کی ڈھلان پر کار ڈال کر اس کا انجن بند کر دیتے تھے اور گیئر (Gear) کو نیوٹرل پوزیشن میں لے آتے۔ اس سے ہمیں یہ بتانا مقصود ہوتا کہ گیئر کی "مزاحمت" کے بغیر کار ڈھلان سے کس طرح نیچے آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ہمیں گیئر اور کلچ کی میکینکس (Mechanics of Clutch and gear) بتانے میں اتنے مصروف ہوتے کہ ہمیں یہ خوف لگا رہتا کہ جوں جوں کار کی رفتار تیز ہوتی جاتی کہیں وہ وقت پر بریک لگانا نہ بھول جائیں، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔

بعض اوقات وہ اتوار کی صبح اپنا تحقیقی کام کرنے کیلئے کالج جاتے ہوئے ہمیں بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے، وہ ہمیں اپنے کالج کے نزدیک سائنس میوزیم میں چھوڑ دیتے، جہاں ہم گھنٹوں گھوم پھر کر اپنی معلومات میں اضافہ کرتے۔

ہماری تعلیم و تربیت کا انہیں بے حد خیال تھا۔ بیرونی ممالک کے دوروں سے واپسی کے بعد وہ ہماری (سکول کی) رپورٹوں کو دیکھتے اور ہماری راہنمائی کرتے رہتے۔ ان کی ہمیشہ یہ نصیحت ہوتی تھی کہ ہمارا کام بہترین ہونا چاہیے۔ انہوں نے سب سے اہم بات جو ہمیں سکھائی وہ وقت کی قدر کرنا تھی۔ ان کے نزدیک وقت انسان کا سب سے قیمتی سرمایہ تھا، جسے ضائع کرنا گناہ ہے۔ وہ ہر اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے جس سے وقت ضائع ہوتا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے ہمارے گھر میں ٹیلیویژن نہیں تھا اور ہم ہمیشہ اس بات کے شاکی رہے لیکن اب احساس ہوتا ہے کہ اس "نعمت" کی محرومی سے ہمیں فائدہ ہی رہا کیونکہ ہم سب نے اپنی تعلیم کی طرف بھرپور توجہ دی اور اچھے لکھ پڑھ گئے۔

ہمارے والد کو کتابیں خریدنے اور پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ بیرونی ممالک کے دوروں سے جب وہ واپس آتے تو ان کے سوٹ کیس کتابوں سے بھرے ہوتے جو بعض اوقات ان کے بوجھ سے پھٹ بھی جاتے تھے۔ جنہیں ہماری والدہ مرمت کرواتی رہتیں تھیں۔ ہمارے گھر کے ہر کمرے میں بک شلف

کتابوں سے بھرے رہتے تھے۔ ان کی لائبریری میں ہر موضوع پر کتب تھیں۔ مثلاً احادیث صلی اللہ علیہ وسلم، مذہبی کتب، تصوف، تاریخ، جغرافیہ، اقتصادیات، مثنوی مولانا روم، مختلف شعراء کے دیوان وغیرہ، حافظ، مرزا غالب اور فیض احمد فیض ان کے پسندیدہ شعراء تھے P.G.Wode house اور Agatha Christie کی کتابیں بھی بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ لندن کی مشہور اخبار "ٹائمز" اور دیگر بہت سے رسائل ہمارے گھر آتے تھے۔

1959ء میں 33 برس کی عمر میں رائل سوسائٹی لندن نے انہیں اپنا فیلو منتخب کیا تھا۔ دنیا کی اسی مشہور سوسائٹی کے منتخب ہونے والے وہ سب سے کم عمر فیلو تھے۔ وہ پہلے پاکستانی تھے جنہیں یہ اعزاز ملا۔ رائل سوسائٹی نے انہیں پہلا میکسویل میڈل دیا تھا، یہ میڈل مشہور سائنسدان میکسویل کے نام نامی سے معنون تھا۔

انہوں نے تقریباً 250 تحقیقی مقالے لکھے۔ ان کی اعلیٰ کارکردگی کی وجہ سے انہیں بے شمار میڈل اور انعامات دیئے گئے، حتیٰ کہ 1979ء میں انہیں سائنس کے سب سے بڑے انعام نوبل پرائز سے نوازا گیا تھا۔ یہ انعام حاصل کرنے والے وہ پہلے مسلمان سائنسدان اور پہلے پاکستانی تھے۔

انہوں نے 24 میڈل و انعامات حاصل کئے۔ 21 ممالک کی اکیڈمیوں نے انہیں اپنا ممبر منتخب کیا، جبکہ 36 یونیورسٹیوں نے انہیں اعزازی ڈگریاں دیں۔ 1989ء میں ملکہ برطانیہ نے انہیں "سر" (SIR) کا اعزازی خطاب عطا کیا تھا۔

ہمارے والد بے حد محنتی تھے۔ وہ ہمہ وقت اپنے کمرے میں تحقیقی اور دوسرے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ صرف کھانا کھانے یا دوسری ضروریات کے لئے وہ اپنے کمرے سے باہر آتے تھے۔ وہ سردی بہت محسوس کرتے تھے، اس لئے اپنے کمرے کو گرم رکھتے۔ وہ اپنے کمرے میں اگربتی جلائے رکھتے، جس کے دھوئیں کے مرغولے بہت بھلے لگتے تھے۔ ان کے کمرے کی کھڑکیوں پر ہر وقت دبیز مخملی پردے باہر کے شور کو کم کرنے کے لئے لٹکے رہتے تھے۔

بچپن سے ہی انہیں رات جلد سو جانے کی عادت تھی، چنانچہ وہ رات کو آٹھ نو بجے کے قریب سو جاتے تھے۔ چند گھنٹے آرام کرنے کے بعد وہ علی الصبح بیدار ہو کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے تھے۔ سونے سے پہلے ہم ایک تھرموس میں گرم چائے اور خورد و نوش کی چیزیں ان کی میز پر رکھ دیتے تھے۔

ہمارے والد کو تین چیزوں سے بہت پیار تھا

قرآن حکیم سے، اپنے والدین سے اور اپنے ملک پاکستان سے۔

وہ خود بھی قرآن حکیم کی تلاوت کرتے تھے، وہ قرآن حکیم کی آیات پر غور و فکر کرتے اور اپنے سائنسی تحقیق میں ان سے راہنمائی حاصل کرتے تھے۔ قرآن حکیم کے قاری عبدالباسط اور پاکستان کے

قاری عبیدالرحمٰن کی تلاوت کی کیسٹ دھیمی آواز میں ان کے کمرے میں چلتی رہتی تھی۔
وہ اپنی تقاریر کے شروع میں قرآن حکیم کی ان آیات کی تلاوت کرتے تھے:
"(اور) ہمارے رب! ہمیں وہ (کچھ) دے جس کا تو نے اپنے رسولوں (کی زبان) پر ہم سے وعدہ کیا ہے اور قیامت کے دن ہمیں ذلیل نہ کرنا' تو اپنے وعدہ کے خلاف ہرگز نہیں کرتا۔"
4:195

سویڈن میں نوبل انعام وصول کرنے کے موقع پر انہوں نے اپنی تقریر مندرجہ ذیل آیات تلاوت کرنے کے بعد ختم کی تھی انہوں نے ان آیات کا انگریزی ترجمہ بھی سنایا تھا:
"تو رحمٰن (خدا) کی پیدائش میں کوئی رخنہ نہیں دیکھتا اور تو اپنی آنکھ کو اِدھر اُدھر) پھیر کر اچھی طرح سے دیکھ لے کیا تجھے (خدا کی مخلوق میں کسی جگہ بھی) کوئی رخنہ نظر آتا ہے' پھر بار بار نظر کو چکر دے وہ آخر تیری طرف ناکام ہو کر لوٹ آئے گی اور وہ تھکی ہوئی ہوگی (اور کوئی رخنہ نظر نہ آئے گا۔"

(سورہ الملک' 4-5)

انہیں اپنے والدین سے عشق کی حد تک پیار تھا اور یہی حال ان کے والدین کا تھا' وہ بھی ان سے بہت پیار کرتے تھے۔

ہمارے دادا حضرت چوہدری محمد حسین دیندار' عبادت گزار اور صاحب کشف بزرگ تھے۔ 1914ء میں 23 سال کی عمر میں ایک خواب کی بناء پر حضرت حکیم نور الدین صاحب امام الاول جماعت احمدیہ کے ہاتھ پر بیعت کر کے وہ سلسلہ عالیہ احمدیہ میں داخل ہوئے تھے۔ وہ کئی برس تک جماعت احمدیہ ضلع ملتان کے امیر رہے تھے۔ 62-1959ء میں لندن میں بھی وہ خدمت دین میں مصروف رہے تھے۔ انہوں نے ہمارے والد کو محنت کرنے کی عادت ڈالی تھی' جس کا پھل انہوں نے ساری عمر کھایا۔

ہماری دادی کا نام ہاجرہ بیگم تھا۔ وہ حضرت حافظ نبی بخش کی صاحبزادی تھیں۔ حضرت حافظ نبی بخش صاحب حضرت مرزا غلام احمد صاحب بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کے اولین 313 رفقاء میں سے تھے۔

ہماری دادی بھی بہت عبادت گزار' رحمدل' نیک اور سادہ خاتون تھیں' وہ بھی اپنے بیٹے سے بہت پیار کرتی تھیں اور ہمیشہ ان کی کامیابی کے لئے دعائیں کرتی رہتیں تھیں۔ 1969ء میں دادا جان کی وفات کے بعد ہمارے والد انہیں اپنے پاس لندن لے آئے تھے۔ ان کی وجہ سے ہی ہمارے گھر میں ٹیلیویژن آیا تھا۔ ہماری یہ ڈیوٹی تھی کہ خبروں اور دوسرے معلوماتی پروگرام کا انگریزی سے پنجابی میں ترجمہ کر کے انہیں بتائیں۔

ہمارے والد نے نوبل انعام میں ملنے والی رقم سے "محمد اینڈ ہاجرہ حسین" نام سے ایک فاؤنڈیشن قائم کی' جو ذہین اور نادار طلباء کو اعلیٰ تعلیم کے لئے وظائف دیتی ہے۔

ہمارے والد کو اپنے ملک پاکستان سے بہت محبت تھی۔ وہ ہمیشہ پاکستان کی ترقی اور اس کی بہتری کے لئے کام کرتے رہتے تھے۔ اگرچہ 1953ء میں ناموافق حالات کی وجہ سے انہیں اپنا ملک چھوڑنے کا انتہائی تکلیف دہ فیصلہ کرنا پڑا' لیکن صدر محمد ایوب خان کی دعوت پر انہوں نے صدر پاکستان کا سائنسی مشیر اعلیٰ بننا قبول کیا۔ یہ ایک اعزازی عہدہ تھا۔ اپنی خدمات کے عوض وہ کوئی مالی فائدہ حاصل نہیں کرتے تھے۔ 1974ء میں جب پاکستان کی قومی اسمبلی نے جماعت احمدیہ کو "غیر مسلم" قرار دیا تھا تو انہوں نے اس عہدہ سے استعفیٰ دے دیا لیکن ذوالفقار علی بھٹو کی درخواست پر وہ پاکستان میں سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کی ترویج و ترقی کے لئے اپنے قیمتی مشورے دیتے رہے۔

بہت سے ممالک نے انہیں اپنی شہریت دینے کی خواہش کا اظہار کیا' لیکن انہوں نے پاکستان کی شہریت کو ترک نہ کیا۔ کیونکہ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن انہیں فزکس کا نوبل انعام ضرور ملے گا' اس لئے وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ جب کبھی ایسا موقع آئے تو وہ عزت پاکستان کے علاوہ کسی اور ملک کو ملے۔ یہ ان کی اپنے ملک سے محبت ہی تو تھی کہ نوبل انعام وصول کرتے وقت انہوں نے پاکستانی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔

ترقی پذیر ممالک کے ذہین سائنسدانوں کو ایسے حالات سے بچانے کے لئے جن سے وہ خود 1953ء میں دوچار ہوئے تھے۔ انہوں نے نظریاتی طبعیات کے لئے ایک بین الاقوامی مرکز قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ کئی سالوں کی انتھک کوششوں کے بعد وہ اقوام متحدہ کے ادارے انٹرنیشنل ایٹمی توانائی ایجنسی کو ایسا مرکز قائم کرنے پر رضامند کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ 1964ء میں یہ مرکز اٹلی کے شہر ٹریسٹ میں قائم کیا گیا۔ اب تک تقریباً ستر ہزار سائنسدان اس مرکز سے استفادہ کر چکے ہیں۔

وہ ورلڈ یونیورسٹی بھی قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ اس کی مدد سے اسلامی ممالک سائنس میں اپنی کھوئی ہوئی عظمت رفتہ کو پھر سے قائم کر سکیں' لیکن افسوس کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی اور ان کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب سے انہیں بہت عقیدت تھی اور وہ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ چوہدری صاحب سے ان کی پہلی ملاقات بھی عجیب حالات میں ہوئی تھی' جس کی مختصر تفصیل یوں ہے کہ 1946ء میں وہ جس بحری جہاز سے انگلستان کی بندرگاہ لیور پول پہنچے تھے' اسی جہاز سے چوہدری صاحب کا ایک بھانجہ (یہ سہو ہے۔ چوہدری صاحب کے چھوٹے بھائی چوہدری عبداللہ خان اسی جہاز سے لیور پول پہنچے تھے--- مرتب) بھی لیور پول پہنچا۔ جسے لینے کے لئے چوہدری صاحب وہاں موجود تھے۔ اچانک چوہدری صاحب کی نظریں ہمارے والد پر پڑھیں جو اس وقت سردی سے کانپ رہے تھے۔ چوہدری صاحب نے فوراً اپنا اوورکوٹ انہیں پہنایا اور پھر ان کے ساتھ مل کر ان کا ٹرنک اٹھا کر پاس کھڑی ریل گاڑی پر رکھا۔ اس کے بعد ان دو عظیم انسانوں کے درمیان دوستی کا رشتہ استوار ہوا جو چوہدری صاحب کی وفات تک قائم رہا۔

عالمی عدالت انصاف سے ریٹائر ہونے کے بعد چوہدری محمد ظفراللہ خان نے لندن میں سکونت اختیار کی تھی۔ ہمارے والد نے ان سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ جب بھی لندن میں ہوں گے' چوہدری صاحب اتوار کی صبح ناشتہ ان کے ساتھ کریں گے۔ چنانچہ چوہدری محمد ظفراللہ خان اتوار کو ناشتے کے لئے ہمارے گھر آتے تھے۔ ناشتہ کی میز پر ان کی گفتگو مذہب' سیاست' اقصادیات اور مختلف موضوعات پر ہوتی رہتی۔

ہمارے والد بہت مہمان نواز تھے' وہ اکثر اپنے دوستوں کو اپنے گھر مدعو کرتے تھے۔ (اپنے گھر کو وہ شہر کی بہترین ریسٹورنٹ کہا کرتے تھے) مہمانوں میں مختلف ممالک کے وزراء' سیاستدان' سفیر' پروفیسر اور ان کے اپنے طالب علم ہوا کرتے تھے۔

زندگی کے آخری چند سالوں میں انہیں ایک ایسی بیماری لاحق ہو گئی تھی جس سے ان کے جسم کے "پٹھے" آہستہ آہستہ کمزور ہوتے چلے گئے۔ لیکن ذہنی طور پر وہ بالکل چاق و چوبند تھے۔ انہیں اپنی بیماری کے انجام کا علم تھا لیکن حرف شکایت وہ کبھی بھی زبان پر نہ لاتے تھے' وہ اللہ کی رضا پر راضی تھے' بالآخر وہ 21 نومبر 1996ء کو اس دار فانی سے رحلت کر گئے۔

اس دنیا میں آنے سے پہلے اللہ نے ان کی آمد کی خبر دے دی تھی اور اس جہاں سے رخصت ہونے کی خبر بھی اللہ نے پہلے ہی دے دی تھی۔ جس رات انہوں نے وفات پائی تھی' اسی رات پونے تین بجے ہمارے چچا چوہدری محمد عبدالرشید نے لندن میں خواب دیکھا کہ ہمارے دادا ان سے ملے ہیں۔ انہوں نے بہت خوبصورت لباس پہنا ہوا ہے اور وہ بہت خوش دکھائی دیتے ہیں اور کہتے ہیں:

"عبدالسلام پہنچ گیا ہے۔"

ان کی وصیت کے مطابق ہم ان کا جسد خاکی تدفین کے لئے ربوہ' پاکستان لے گئے تھے۔ لندن سے لاہور پہنچے تو چوہدری حمید نصراللہ خان امیر جماعت احمدیہ ضلع لاہور اپنے رفقاء کے ہمراہ ہوائی اڈہ پر موجود تھے۔ دارالذکر گڑھی شاہو میں ہزاروں افراد جماعت نے ان کا آخری دیدار کیا اور جنازہ پڑھا۔ اسی دوپہر ہم ربوہ کے لئے روانہ ہوئے۔ وہاں سڑک کے دونوں اطراف ہزاروں بچے' بڑے اور خواتین غمگین آنکھوں کے ساتھ اپنے "ہیرو" کے استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ رات بھر احباب جماعت اور غیروں نے ان کا آخری دیدار کیا۔ دوسرے روز (25 نومبر) ان کے جسد خاکی کو بہشتی مقبرہ میں ان کے والد کے پہلو اور والدہ کے قدموں میں سپرد خاک کیا۔ یہی ان کی خواہش تھی' ان کی وفات کے بعد ہم ان کے کاغذات دیکھ رہے تھے تو ہمیں ان کی ایک تحریر نظر آئی' جو انہوں نے وصیت نامہ پر لکھی تھی کہ "اگر کسی وجہ سے مجھے ربوہ دفن نہ کیا جا سکے تو وہاں ایک کتبہ نصب کیا جائے جس پر مندرجہ ذیل عبارت لکھی جائے:

"ان کی یہ خواہش تھی کہ انہیں اپنی والدہ کے قدموں میں دفن کیا جائے۔"

وہ ایک عظیم انسان اور بے حد شفیق باپ تھے' ان میں تکبر و نخوت نام کو نہیں تھا۔ ہمیشہ پیار و محبت اور انکساری سے پیش آتے تھے۔

اللہ ان کے درجات بلند کرے' قبول فرمائے۔

ڈاکٹر عبدالسلام بطور بھائی

چند تاثرات

عبدالحمید -- لاہور (بھائی)

محمد عبدالرشید -- لندن (بھائی)

حمیدہ بیگم -- کراچی (بہن)

ڈاکٹر عبدالسلام بطور بھائی

ہم سات بھائیوں میں وہ سب سے بڑے تھے۔ میرا نمبر تیسرا ہے اور میں عمر میں ان سے تقریباً ساڑھے سات سال چھوٹا ہوں۔ ہم انہیں بھائی جان کہتے تھے اور ہم دل و جان سے ان کی عزت کرتے تھے کیونکہ ہمارے معاشرے میں بڑا بھائی بمنزلہ باپ کے ہوتا ہے وہ اپنے سب بھائیوں سے بہت پیار کرتے اور ہماری تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھتے تھے۔

اپنے امتحان میں جب وہ اول آتے تھے ہمیں بے انتہا خوشی ہوتی اور ہمارے سر فخر سے بلند ہو جاتے۔ مگر کبھی کبھی ہمیں ان پر غصہ بھی آیا کرتا' خصوصاً اس وقت جب امتحان میں ہماری کارگزاری اچھی نہیں ہوتی تھی اور ہمیں اباجان کی ناراضگی اور سرزنش کا سامنا ہوتا۔ اس موقعہ پر وہ ہمیشہ بھائی جان کا حوالہ دیا کرتے اور کہتے: "دیکھو وہ بھی تمہارا بھائی ہے اور وہ اپنے امتحان میں اول آتا ہے۔ اس وقت ہمیں غصہ آتا اور ہم دل میں کہتے کہ بھائی جان نے ہمیں کس مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ یقیناً وہ ہماری کم عقلی اور ناسمجھی کا زمانہ تھا۔

انہوں نے چھوٹے بھائی محمد عبدالماجد کو پہلے گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم دلوائی اور بعد میں سینٹ جونز کالج کیمبرج میں اس کی تعلیم اور رہائش وغیرہ کے تمام اخراجات برداشت کئے۔ اسی طرح انہوں نے ہمارے ایک اور چھوٹے بھائی چوہدری محمد عبدالرشید کو لندن میں کاسٹ اکوشٹنٹ (Cost Accountant) کی تعلیم دلوائی۔ 1955ء میں میرے لئے انگلینڈ کی ایک بہت بڑی انجینئرنگ کمپنی میں تین سال گریجوائیٹ اپرنٹس شپ (Graduate Apprenticeship) کا انتظام کرایا۔ غرضیکہ ہم سب پر ان کے اتنے احسانات ہیں کہ ہم انہیں بیان نہیں کر سکتے' ان سب باتوں کے باوجود تمام عمر انہوں نے نہ زبان سے اور نہ اشارے سے اس کا اظہار کیا۔ غالباً ایک یہ وجہ بھی تھی کہ ہم سب ان پر اپنی جان فدا کرنے پر کمربستہ رہتے تھے۔

ہر بھائی کے ساتھ ان کا سلوک جداگانہ تھا۔ اپنے ساتھ ان کے پیار کے چند واقعات لکھتا ہوں:

غالباً 1943ء کی بات ہے۔ میری عمر اس وقت دس برس تھی۔ ہم ملتان میں رہتے تھے۔ گرمی کا موسم تھا۔ میری ٹانگ پر گھٹنے سے کچھ اوپر ایک پھوڑا نکل آیا جو چند دنوں میں ہی کافی بڑا ہو گیا۔ اس کی وجہ سے مجھے چلنے پھرنے میں دقت ہوتی تھی۔ بھائی جان گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے' وہ گرمی کی چھٹیوں میں ملتان آئے تو انہوں نے جب میرا پھوڑا دیکھا تو فوراً ہی مجھے سائیکل پر بیٹھا کر سول ہسپتال لے گئے' جو ہمارے گھر سے تقریباً دو میل دور تھا۔ وہاں انہوں نے ہندو سول سرجن جو ابا جان کے واقف کاروں میں سے تھا' سے اپریشن کرایا۔ جب تک میرا زخم مندمل نہ ہو گیا وہ مجھے باقاعدگی سے سائیکل پر بیٹھا کر مرہم پٹی کرانے ہسپتال لے جاتے رہے۔

1950ء میں مجھے انہوں نے کیمبرج انگلینڈ سے ایک نصیحت آموز خط لکھا۔ اس وقت میں ایمرسن کالج ملتان میں فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا۔

مفصلہ بالا خط کا متن:

عزیزم حمید خان

السلام علیکم و رحمتہ اللہ

ابا جان کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ کے امتحان 18 اپریل کو شروع ہے۔ میں یہ خط اس لئے لکھ رہا ہوں کہ آپ کو شاباش کہوں اور آپ کی ہمت بڑھاؤں کہ آپ کوشش کریں کہ اس بار کم از کم آپ کا نمبر سب سے آگے ہو۔ شاید یہ خط آپ کو 12/13 کے قریب ملے گا جب امتحان 5 چار دن رہ گیا ہو گا اور آپ کی تیاری ہو چکی ہوگی۔ اگر تیاری خاطر خواہ نہ بھی ہوئی ہو تو بھی آپ گھبرائیں نہیں۔ امتحان جہاں تیاری پر منحصر ہوتے ہیں' اس کے علاوہ Keeping your wits about you پر بھی انحصار رکھتے ہیں' جو چیزیں آپ کو بہت اچھی طرح آتی ہوں' ان سے پورا فائدہ اٹھانا امتحان میں ضروری ہوتا ہے۔ میں اور سب لوگ آپ کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابی بخشے۔

آپ کو شاید اس وقت تو یہ مضمون حساب فزکس Chemistry وغیرہ بے کار معلوم ہوتے ہیں' لیکن یاد رکھیں کہ ان میں top پر رہنے میں دو point ہوتے ہیں۔

1 اگر آپ ان مضمونوں میں بہتر سے بہتر نتیجہ دکھائیں تو اگرچہ آپ کی ان میں دلچسپی نہ بھی ہو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ محنت کر سکتے ہیں اور دوسرے آپ ذہین ہیں۔ زندگی میں کامیابی محنت اور ذہانت سے ہے۔ ایک معمولی کلرک بن جانا یا معمولی دکاندار بن جانا یا معمولی Mechanic بن جانا ہمیں یا آپ کو خوش نہیں کر سکتا۔ زندگی Ambition کا نام ہے اور وہ ambition کیا ہے۔ سب سے چوٹی پر رہنا۔ جس شخص کی زندگی میں Ambition نہیں وہ مردہ ہے۔ ماں باپ بھائی کسی کے کام نہیں آسکتے۔ ہر شخص نے اپنی زندگی خود بنانی ہوتی ہے۔ آپ کی عمر میں انسان کو احساس نہیں ہوتا کہ وقت کس طرح خرچ کرنا چاہیے۔ زندگی بھر میں کونسی چیزیں کام آئیں گی۔ لیکن محنت کی عادت ایسی چیز ہے کہ ایک بار پڑ جائے تو کامیابی آپ کے قدم چومتی ہے' محنت کرنا کوئی آسان چیز نہیں۔ بہت کڑوی چیز ہے۔

جی کرتا ہے کہ یہ کیا مصیبت ہے لوگ مزے کر رہے ہیں۔ یاد رکھیں جو لوگ اس عمر میں مزے کرتے ہیں' وہ ساری عمر روتے رہتے ہیں۔ مزے کرنے کا بھی وقت ہو اور کام کرنے کا بھی وقت ہو تو زندگی حسین ہوتی ہے۔ آپ کا مطمع نظر یہ ہونا چاہیے کہ آپ رات کو جب سوئیں تو سونے سے پہلے یہ سوچیں کہ کیا آپ کا دن اچھا گزرا ہے۔ پڑھنے کے وقت آپ پڑھیں' کھیلنے کے وقت آپ کھیلتے ہیں۔ یاد رکھیں ہم بہت غریب ہیں۔ ہمارے پاس سوائے محنت اور ذہانت کے کچھ نہیں کہ ہم اونچے چڑھ سکیں۔

گھر میں نھنوں سے لڑنا یا ناراض ہونا زندگی کا نام نہیں۔ آپ کے سامنے ہزاروں میدان ہیں۔ آپ محنت کریں تو کل Prime Minister ہو سکتے ہیں' بڑے سے بڑے سیٹھ بن سکتے ہیں۔ بڑے سے بڑے Mechanic ہو سکتے ہیں۔ ایک بار عزم کریں اور پھر محنت' اس وقت آپ کے سامنے Studies کا میدان ہے۔ آپ یقیناً اس قابل ہیں کہ آپ سب کو پیچھے چھوڑ سکیں۔ اگر پہلے وقت ضائع ہو گیا ہے تو کوئی حرج نہیں۔ عزم کے ساتھ کیا ہوا دو دن کا کام لوگوں کے مہینوں کے کام سے بہتر ہوتا ہے۔

2 آپ کی تعلیم کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ریاضی' فزکس وغیرہ آج کی دنیا کی کلید ہیں۔ بجلی' موٹریں' انجینئرنگ سب کچھ ریاضی کے بغیر ناممکن ہے۔ یہ لوہا کیسے بنتا ہے' یہ کاریں کیسے چلتی ہیں' آپ کی عمر کے بچے یہاں خود Radio set اور کار بنا لیتے ہیں۔ آپ بھی سب کچھ کر سکتے ہیں۔ صرف چھوٹی چیزوں کا خیال چھوڑ دیں۔ بہت بڑی چیزیں آپ کے سامنے ہیں۔ اگر آپ کا رجحان کسی خاص طرف ہو تو مجھے لکھیں' میں آپ کو کتابوں (کتابیں---- ناقل) بھیجوں گا۔ لیکن اس وقت اللہ کا نام لے کر امتحان دیں اور اس میں اعلیٰ منزل پر پہنچیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہو' کوشش کریں کہ آپ کے والدین آپ سے خوش ہوں' آپ کی طبیعت میں کوئی چھوٹی چیز نہ ہو۔

والسلام

آپ کا بھائی عبدالسلام

ایک درد مند بھائی کی تشویش

کیمبرج میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے تحقیق مکمل کرنے کے بعد بھائی جان ستمبر 1951ء میں وطن واپس آئے۔ اس وقت ہم ملتان میں رہتے تھے۔ مجھ میں ایک ایسا احساس کمتری پیدا ہو گیا تھا کہ میں بمشکل ان کی طرف دیکھ سکتا۔ اس کی دو وجوہات تھیں' اول چونکہ وہ بڑے بھائی تھے' اس لئے میں ان کی عزت اسی طرح کرتا تھا جیسے باپ کی کی جاتی ہے اور دوسری وجہ ان کی قابلیت تھی۔ انہوں نے میری اس کمزوری کو بھانپ لیا۔ چنانچہ ایک روز انہوں نے مجھے کھانا کھانے والی میز پر اپنے سامنے بیٹھا لیا اور کہا کہ "میری آنکھوں میں دیکھو" لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ انہوں نے دوبارہ کہا کہ "میری آنکھوں میں دیکھو" لیکن پھر بھی میں ایسا نہ کر سکا۔ پھر تیسری بار انہوں نے ایک گرج دار آواز میں قدرے غصہ سے کہا: "میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو۔" تب میں نے ہمت کی اور ان کی طرف دیکھا۔ صرف چند سیکنڈ کے لئے' اس کے بعد میرے اندر جو جھجک اور احساس کمتری پیدا ہو گیا تھا وہ بالکل ختم ہو گیا اور میں حد ادب کے اندر رہتے ہوئے ان سے بے تکلفی سے باتیں کر لیتا تھا۔ بلکہ بعض اوقات تفنن طبع کے لئے انہیں ہلکے پھلکے لطائف بھی سنا دیا کرتا جن سے وہ بہت محظوظ ہوتے تھے۔

اپنے آبائی شہر سے محبت

آپ جب کبھی بھی پاکستان آتے تو ان کی خواہش ہوتی کہ وہ جھنگ اور ربوہ ضرور جائیں۔ 1981ء میں، میں جب کراچی سے لاہور منتقل ہو گیا تو اکثر انہیں ربوہ اور جھنگ لے جایا کرتا تھا۔ ربوہ میں وہ بزرگوں اور والدین کے مزاروں پر دعا کرنے کے لئے جایا کرتے اور جھنگ اپنے عزیزوں اپنے اور ابا جان کے دوستوں سے ملاقات کرنے کے لئے جایا کرتے تھے۔ جھنگ شہر میں بیرون ممنہ گیٹ ہمارا گھر تھا۔ رستہ میں اپنے ماموں کے مکان پر تھوڑی دیر قیام کرنے کے بعد وہ اپنے آبائی گھر تک پیدل جاتے جو وہاں سے قریباً آدھ میل دور تھا۔ رستہ میں لوگ ان سے بڑی عقیدت سے ملتے اور وہ بھی ہر ایک سے خواہ وہ کوئی بھی ہوتا مصافحہ ضرور کرتے۔ بعض لوگوں خصوصاً ابا جان کے دوستوں سے گلے ملتے تھے اور ہر ایک سے ٹھیٹھ جھنگی لہجے میں دریافت کرتے: "خیر اے، ول ہو، خیر سلا۔" جو گلی ہمارے آبائی مکان تک جاتی تھی اس کے درمیان میں گندے پانی کی نالی تھی، وہ اکثر ٹوٹی پھوٹی رہتی اور گندہ پانی جگہ جگہ کھڑا ہوتا۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ وہاں سے گزرتے ہوئے وہ اپنے ایک دوست سے جوان کے شانہ بشانہ چل رہا تھا کہہ رہے تھے: "مجھے ان گلیوں کی بو سے بھی پیار ہے۔"

ہم سب بھائیوں کی فلاح و بہبود کا انہیں خاص خیال رہتا تھا۔ وہ کبھی بے جا سفارش نہیں کرتے تھے۔ میں جب کراچی میں رہتا تھا تو ایک مرتبہ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ کے ڈی اے کے چیئرمین (جو ان کے کلاس فیلو تھے) سے سفارش کر کے مجھے ان کی کسی سکیم میں پلاٹ لے دیں۔ لیکن انہوں نے یہ کہہ کر کہ "میں اس شخص کا احسان نہیں لینا چاہتا۔" سفارش کرنے سے انکار کر دیا۔ جہاں مناسب سمجھتے وہاں سفارش کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔

وہ بہت ہی شفیق اور مہربان بھائی تھے۔

عبدالحمید

ڈاکٹر عبدالسلام

ذیل میں اپنے چھوٹے بھائی محمد عبدالرشید کے تاثرات دے رہا ہوں۔ محمد عبدالرشید 1957ء میں انگلستان گیا تھا۔ چنانچہ اسے بھائی جان کے ساتھ ایک طویل عرصہ گزارنے کا موقعہ ملا۔

"پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام ہمارے سب سے بڑے بھائی تھے۔ ہم اُنہیں بھائی جان کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے 38 سال سے زائد عرصہ ان کے ساتھ گزارنے کا موقع ملا۔ مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی کہ میں اُن کا ذکر خیر کہاں سے شروع کروں۔

وہ ایک غیر معمولی قابلیت کے مالک تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑا زرخیز دماغ عطا فرمایا تھا۔ اگر وہ ایک

بار کسی چیز کی طرف توجہ کرتے تو وہ ان کو بھولتی نہ تھی۔ انہیں ہر وقت کام کی لگن رہتی۔ انہیں تقریباً 15-16 گھنٹے روزانہ مطالعہ کرنے کی عادت تھی' وہ اپنے ہر امتحان میں اول آنے کی تمنا رکھتے اور پھر اول بھی آتے تھے۔ یہ ان کی مسلسل محنت شاقہ ہی تھی جس کی وجہ سے 1979ء میں انہیں فزکس میں نوبل انعام دیا گیا۔

ایک مرتبہ جب آپ کی عمر 12-13 سال تھی' ابا جان انہیں حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب امام الثانی جماعت احمدیہ کی خدمت میں لے گئے اور عرض کیا کہ "حضور یہ لڑکا مڈل کے امتحان میں اول آیا ہے اور وظیفہ سے تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اب اس نے میٹرک کا امتحان دینا ہے' آپ دعا کریں کہ اس امتحان میں بھی اول آئے اور اپنے وظیفہ پر ہی پڑھے۔" یہ سن کر حضرت جماعت احمدیہ نے بھائی جان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ "میں اس لڑکے میں نوجوان کندھوں پر ایک پختہ عمر کے آدمی کا سر دیکھتا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو یہ اول آئے گا اور ریکارڈ قائم کرے گا۔" چنانچہ اللہ کے اس برگزیدہ بندہ کے الفاظ 1940ء میں پورے ہوئے' جب بھائی جان میٹرک کے امتحان میں نہ صرف صوبہ بھر میں اول آئے بلکہ انہوں نے سابقہ ریکارڈ توڑ کر نیا ریکارڈ قائم کیا۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

آپ والدین کا خاص خیال رکھتے تھے اور ان کی اطاعت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ کلام الٰہی میں جن آیات میں والدین کی اطاعت کے بارے میں تعلیم دی گئی ہے' آپ ان پر خود بھی عمل کرتے تھے اور ہمیں بھی ان پر عمل پیرا ہونے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔

اپریل 1959ء میں والدین کو اپنے پاس لندن لے آئے تھے اور وہ دسمبر 1962ء تک وہاں رہے۔ اس دوران انہوں نے خدمت کا حق ادا کر دیا۔ جب بھی موقع ملتا انہیں لندن کی سیر کراتے۔ ایک مرتبہ 1960ء میں صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان لندن تشریف لائے تو ابا جان کو ان سے ملاقات کرانے لے گئے تھے۔ والد صاحب کی دونوں آنکھوں میں سفید موتیا آگیا تھا' چنانچہ باری باری دونوں آنکھوں کا اپریشن کرایا اور دن رات ان کی خدمت کی۔

دسمبر 1962ء کے آخری ہفتے میں والدین پاکستان واپس تشریف لے گئے۔ ان کی عمرہ کرنے کی خواہش چنانچہ بھائی جان ان کے ہمراہ ارض مقدس تشریف لے گئے اور والدین کی آرزو کو پورا کیا اور خود بھی عمرہ کرنے کی سعادت پائی۔ ہمارے چھوٹے بھائی محمد عبدالماجد بھی اس سفر میں ان کے ہمراہ تھے۔

کلام الٰہی سے انہیں عشق تھا۔ ہر وقت اپنے کوٹ کی اوپر والی جیب میں حمائل شریف کا نسخہ رکھتے اور جب بھی موقعہ ملتا تلاوت کرتے۔ اپنی تقاریر میں اکثر کلام الٰہی کی آیات اور ان کا ترجمہ پڑھ کر سناتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے عزت مآب پوپ کو کلام الٰہی (انگریزی ترجمہ کے ساتھ) پیش کیا تھا۔ اسی طرح ایک دفعہ آپ آئیوری کوسٹ (افریقہ کا ایک ملک جہاں فرانسیسی زبان بولی جاتی ہے) آپ نے وہاں کے

صدر مملکت Mouphouet Biogne سے ملاقات کے دوران انہیں کلام الٰہی (فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ) تحفہ دیا تھا۔ جماعت احمدیہ نے کلام الٰہی کے دنیا کی مختلف زبانوں میں تراجم شائع کئے ہیں۔ بھائی جان نے اطالوی زبان میں کلام الٰہی کے ترجمہ کی طباعت پر اٹھنے والے تمام اخراجات جو لاکھوں روپے تھے اٹھائے تھے۔

کلام الٰہی کی تلاوت کی بے شمار کیسٹ ان کے پاس تھیں' جنہیں اپنے کام کے دوران بھی دھیمی آواز میں سنتے رہتے تھے۔ قاری عبدالباسط عبدالصمد کی قرأت کو بہت پسند فرماتے تھے۔ پاکستان کے قاری عبیدالرحمٰن کی 1979ء میں مدد کی تھی' جس کی وجہ سے شالیمار کمپنی نے ان کی تلاوت کی ریکارڈنگ کی تھی۔ جنرل محمد ضیاء الحق سے بھی قاری صاحب کی سفارش کی تھی۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ وہ اپنی تقاریر میں اکثر کلام الٰہی کی آیات کا حوالے دیا کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

سورۃ الرعد کی آیت نمبر12 جس کا ترجمہ ہے: ''اللہ تعالیٰ کسی بھی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا' جب تک وہ اپنی اندرونی حالت کو نہ بدلے اور جب اللہ کسی قوم کے متعلق عذاب کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس عذاب کو ہٹانے والا کوئی نہیں ہوتا اور اس کے سوا ان کا اور کوئی (بھی) مددگار نہیں (ہو سکتا)

والدین کی قدر دانی کے بارے میں سورہ بنی اسرائیل کی آیات 24-25 بڑی اچھی لگتی تھیں' جن کا ترجمہ ہے: ''تیرے رب نے اس بات کا تاکیدی حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور (پر یہ کہ) اپنے ماں باپ سے اچھا سلوک کرو' اگر ان میں سے کسی ایک پر یا ان دونوں پر تیری زندگی میں بڑھاپا آ جائے تو انہیں (ان کی کسی بات پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے) اف تک نہ کہہ اور نہ انہیں جھڑک اور ان سے (ہمیشہ) نرمی سے بات کر اور رحم کے جذبہ کے ماتحت ان کے سامنے عاجزانہ رویہ اختیار کر اور (ان کے لئے دعا کرتے وقت) یہ کہا کرو' اے میرے رب! ان پر مہربانی فرما کیونکہ انہوں نے بچپن کی حالت میں میری پرورش کی تھی۔ تمہارا رب جو کچھ (بھی) تمہارے دلوں میں ہو (اسے سب) سے بہتر جانتا ہے (اور) اگر تم نیک ہو گے تو وہ بار بار رجوع کرنے والوں کو بہت ہی بخشنے والا ہے۔''

پھر سورہ یسین آیات 82-84 پڑھا کرتے تھے۔ جن کا ترجمہ ہے: ''کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے' اس بات پر قادر نہیں کہ ان کی طرح کی اور مخلوق پیدا کر دے۔ ایسا خیال (کہ وہ پیدا نہیں کر سکتا) درست نہیں بلکہ وہ بہت پیدا کرنے والا (اور) بہت جاننے والا ہے۔ اس کا معاملہ تو یوں ہے کہ جب کبھی وہ یہ ارادہ کرتا ہے کہ فلاں چیز ہو جائے۔ وہ اس کے بارے میں کہہ دیتا ہے کہ اس طرح ہو جائے اور وہ اسی طرح ہو جاتی ہے۔ پس پاک ہے وہ جس کے قبضہ قدرت میں ہر چیز کی بادشاہت ہے' جس کی طرف تم سب کو لوٹ کر لے جایا جائے گا۔

سورہ الجاثیہ کی آیت نمبر14 اکثر اپنی تقاریر میں بیان کرتے تھے' اس کا ترجمہ: ''جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے' سب کا سب اس نے تمہاری خدمت پر لگایا ہوا ہے' اس میں فکر کرنے والی قوم کے لئے بڑے نشان ہیں۔''

پھر الملک کی آیات 1۔5 اکثر پڑھا کرتے تھے' ترجمہ: ''بہت برکت والا ہے وہ اللہ جس کے قبضہ میں بادشاہت ہے اور وہ ہر ایک ارادہ کو پورا کرنے پر قادر ہے۔ اس نے موت اور زندگی کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ تم کو آزمائے کہ تم میں کون زیادہ اچھے عمل کرنے والا ہے اور وہ غالب اور بہت بخشنے والا ہے۔ وہی ہے جس نے سات آسمان درجہ بدرجہ بنائے ہیں۔ (اور) تو رحمان خدا کی پیدائش میں کوئی رخنہ نہیں دیکھتا اور تو اپنی آنکھ کو (اِدھر اُدھر) پھیر کر اچھی طرح سے دیکھ لے کیا تجھے (خدا کی مخلوق میں کسی جگہ بھی) کوئی رخنہ نظر آتا ہے' پھر بار بار نظر کو چکر دے وہ آخر تیری طرف ناکام ہو کر لوٹ آئے گی اور وہ تھکی ہوئی ہوگی۔ (اور کوئی رخنہ نظر نہیں آئے گا)

آپ رات جلد سونے کے عادی تھے۔ صبح بہت جلد اٹھ جایا کرتے' نوافل اور عبادت کے بعد اپنے کام میں مصروف ہو جاتے تھے۔

ناشتہ میں انڈہ اور ٹوسٹ اور بعد میں چائے کی ایک پیالی لیا کرتے تھے۔ کھانے میں انہیں شوربے والا سالن' تلی ہوئی مچھلی' سیخ کباب' ماش کی دال پسند تھی۔

لباس بہت سادہ پہنتے تھے۔ فضول خرچی نہ کرتے تھے اور نہ ہی اسے پسند کرتے۔ ایک دفعہ میں ان کے لئے لندن کے سب سے مشہور سٹور (جو مہنگا ترین ہے) (Harrods) سے کشمیری اون کا سویٹر خرید لایا۔ ویسے اس کی قیمت نوے پونڈ تھی لیکن سیل میں وہ مجھے پنتالیس پونڈ میں مل گیا۔ آپ نے اسے پہن تو لیا لیکن مجھ سے ناراض ہوئے اور فرمایا: ''میاں ایسی غلطی پھر نہ کرنا۔''

ہفتہ اور اتوار کے روز بھی وہ کالج جایا کرتے تھے۔ اکثر میں انہیں وہاں لے جاتا اور واپس بھی لے آتا تھا۔ اسی طرح جب وہ بیرون ممالک جاتے تو میں انہیں ایئرپورٹ پر لے جاتا' راستہ میں گاڑی میں وہ اپنے کام میں مصروف رہتے۔ جب بیرون ممالک کے دوروں سے واپس آتے تو سب سے پہلے پاکستان میں بھائیوں اور ہمشیرگان کا حال دریافت فرمایا کرتے تھے۔

تقریباً چالیس سال کی رفاقت میں چند جملوں میں نہیں سمیٹ سکتا۔ وہ بہت اچھے بھائی اور دوست تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے' قبول فرمائے۔

محمد عبدالرشید لندن

ایک بہن کی چند یادیں

ہماری بہن حمیدہ بیگم جو بھائی جان سے چھوٹی اور ہم دوسرے بھائیوں سے بڑی ہیں کی چند باتیں:
کسی نے کتنی سچی بات کہی ہے:

موت اس کی ہے زمانہ کرے جس پر افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آتے ہیں جانے کے لئے

اس عظیم انسان کے لئے جس نے دنیا میں اپنا نام اور اپنے کام بطور یادگار چھوڑے ہیں، میں تو کبھی ان کے مرتبے کے مطابق نہ لکھ پاؤں گی۔ یہ ایک وسیع مضمون ہے پھر بھی چند باتیں لکھ رہی ہوں۔

ان کا بچپن اپنے والدین کے زیر سایہ ہم سب بہن بھائیوں کے ساتھ گزرا۔ جس کی یاد اکثر دل میں چٹکیاں لیتی ہے اور یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایام پھر سے لوٹ آئیں۔ اس وقت تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہمارے بھائی جان اتنے عظیم المرتبت انسان بن کر دنیا میں اپنا نام روشن کریں گے۔

بچپن میں سب سے صحت مند بچہ ہونے کی وجہ سے انہیں چاندی کا ایک چھوٹا سا گلاس انعام میں دیا گیا تھا۔ اس کے بعد تو اللہ تعالیٰ تمام عمر انہیں انعامات سے نوازتا ہی چلا گیا۔

بھائی جان سلام ہمارے لئے مشعل راہ تھے۔ سب سے پیار و محبت، وقت پر سونا، وقت پر جاگنا، وقت پر عبادت بجا لانا۔ اباجی کی تربیت کے مطابق ہر چیز کے لئے جگہ مقرر کرنا اور پھر ہر چیز کو اس کی مقرر کردہ جگہ پر رکھنا تاکہ اندھیرے میں بھی وہ چیز مل جائے۔ مجھے یاد ہے کہ بھائی جان گورنمنٹ کالج لاہور کے ہوسٹل میں رہتے تھے۔ کبھی کبھی وہاں سے لکھا کرتے کہ "میری الماری میں فلاں جگہ اس نام کی کتاب رکھی ہوگی وہ مجھے بھجوا دیں۔" اس کتاب کو تلاش کرنے میں ہمیں کچھ بھی دقت نہ ہوتی تھی۔

ہماری یہ کوشش ہوتی تھی کہ کھانے میں اچھی سے اچھی چیزیں ان کے سامنے رکھیں۔ گرمیوں میں خاص طور پر میں خربوزہ کے بیج میں سے گریاں نکال کر انہیں دیا کرتی تھی، جنہیں وہ مٹھی بھر کر منہ میں ڈال لیتے، جس سے مجھے بہت خوشی ہوتی تھی۔

چھٹی کے دن ناشتہ کرنے کے بعد خانہ خدا کی صفائی باقاعدگی سے کرتے تھے۔ جھاڑو دینا، صفوں کو جھاڑنا، چھڑکاؤ کرنا، پانی بھرنا، غرضیکہ جب گھر واپس آتے تھے تو "بھوت" بنے ہوتے۔ اباجان کہا کرتے کہ سلام کو جو کچھ خدا نے دیا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اس کے گھر کی صفائی کرتا ہے۔

ان کی زندگی کا محور تعلیم سے شغف ہوتا تھا۔ اس لئے بے کار باتوں میں وہ وقت ضائع نہیں کرتے تھے اور اپنی تعلیم کی طرف بھرپور توجہ دیتے تھے۔ گھر میں ان کا ٹائم ٹیبل کچھ یوں ہوتا تھا۔ علی الصبح اٹھ کر کچھ دیر پڑھائی کرنا، عبادت کرنا، تلاوت کرنا، نہانا اور پھر ناشتہ کرنا۔ گرمیوں میں عموماً گھر کے دہی اور لسی سے اور سردیوں میں چائے سے پراٹھا کھانا۔ پیدل سکول / کالج آتے جاتے تھے۔ سائیکل کے لئے کبھی ضد

نہیں کی تھی۔ کھیل سے اتنا زیادہ شوق نہیں تھا۔ کبھی کبھی محلے کے دوستوں سے فٹ بال کھیل لیتے تھے۔
1946ء میں وہ کیمبرج اعلیٰ تعلیم کے لئے چلے گئے۔ 1949ء میں ان کی انگلستان سے واپسی ہوئی۔ والدین نے ان کی شادی کر دی۔ چند ہفتوں بعد پھر کیمبرج پی ایچ ڈی کرنے چلے گئے۔ 1951ء میں وہاں سے واپسی پر گورنمنٹ کالج لاہور میں ملازمت اختیار کرلی' لیکن ریسرچ کے لئے ماحول ناسازگار تھا' اس لئے 1954ء میں وہ ملازمت چھوڑ کر واپس کیمبرج چلے گئے۔ آپ جب کبھی بھی پاکستان آتے تو ہمیں (میں ہماری بڑی ہمشیرہ اور بھائی ڈاکٹر محمد عبدالقادر) ملتان ملنے کے لئے ضرور تشریف لے آتے تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہمیں ملے بغیر ہی واپس چلے گئے ہوں۔ یہ ان کی محبت کی ایک زندہ مثال تھی۔
سردی ہو یا گرمی ایک بڑا کوٹ پہنتے تھے۔ اس کی اندر کی جیب میں کلام الٰہی (باترجمہ) دعاؤں کی کتاب' پاسپورٹ' دوسرے کاغذات اوپر سامنے کی جیب میں پن (Pens) ہوتے۔ ایک بار مجھے ملنے کے لئے آئے تو اپنا کوٹ اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ جب واپس جانے لگے تو میں نے وہ کوٹ انہیں پہنایا اور بے تکلفی سے کہ آپ اتنا وزن کیوں اٹھاتے ہیں۔ یہ فالتو چیزیں بکس میں رکھ دیا کریں تو فرمایا: "یہ ضرورت کا سامان ہوتا ہے میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ بار بار بکس سے نکالوں۔"
دیسی عطر استعمال کرنے کا انہیں بہت شوق تھا۔ بندر روڈ پر ایک مخصوص دکان سے عطر خریدنے خود جاتے تھے۔
نوبل انعام پانے کے بعد بھابھی صاحبہ کے ساتھ پاکستان آئے۔ میں نے ان کے گلے میں گلاب کے پھولوں کا ہار ڈالنا چاہا تو وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگے کہ پہلے اپنی بھابھی کے گلے میں ڈالو۔ انہیں بھابھی جان کی خوشی مقدم تھی۔
وہ سفر بہت زیادہ کرتے تھے۔ مختلف علاقوں میں وقت کا فرق اور ہوائی جہاز کا سفر انہیں تھکا دیتا تھا لیکن وہ کبھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ سفر کے دوران وہ کچھ نیند پوری کرلیتے تھے۔
اپنے والدین سے انہیں بے حد پیار تھا۔ کبھی بھی ان کے سامنے اونچی آواز میں نہیں بولتے تھے۔
اسلامی ممالک میں سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی ان کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ اسلام اس میدان میں اپنی کھوئی ہوئی عزت رفتہ کو پھر سے حاصل کرے۔ تیسری دنیا کے ممالک میں بھی سائنس کی ترقی کے بہت خواہاں تھے۔
وہ بہت ہی پیار کرنے والے بھائی تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرتے۔

حمیدہ بشیر' کراچی

21

بھائی جان بحیثیت استاد

کسی استاد کے بارے میں تو اس کے شاگرد ہی بتا سکتے ہیں کہ وہ بحیثیت استاد اور انسان کیسے تھے۔ یوں تو بھائی جان کے شاگرد بہت ہیں۔ ذیل میں صرف چند کے تاثرات پیش ہیں۔

1 چوہدری حمید اللہ پنجاب یونیورسٹی میں بھائی جان کے شاگرد تھے۔ انہوں نے وہاں سے ریاضی میں ایم اے کیا تھا۔ انہوں نے خدمت دین کے لئے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔ وہ مرکز احمدیت ربوہ میں رہتے ہیں اور وہاں "تحریک جدید" کے وکیل الاعلیٰ ہیں۔ اس تحریک کا اجراء حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب امام الثانی جماعت احمدیہ نے 1934ء میں کیا تھا۔ یہ بیرون ملک کلام الٰہی کی تعلیم اور تبلیغ کا فریضہ انجام دیتی ہے اور اس سلسلہ میں تمام متعلقہ امور کی نگرانی کرتی ہے۔ جماعت احمدیہ کا ہر فرد اس تحریک کے لئے سالانہ چندہ دیتا ہے اور اس سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ اس میں ہر سال اضافہ کرے۔

2 ڈاکٹر غلام مرتضیٰ پروفیسر فزکس اور ڈین فیکلٹی آف نیچرل سائنسز' قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد نے امپیریل کالج لندن سے بھائی جان کے زیر نگرانی پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔

3 ڈاکٹر ایم جے ڈف ٹیکساس میں نظری طبعیات کے پروفیسر ہیں۔ انہوں نے 1969ء-1972ء میں امپیریل کالج لندن سے بھائی جان کے زیر نگرانی پی ایچ ڈی کی ڈگری لی تھی۔

چوہدری حمید اللہ رقم طراز ہیں:

"خاکسار نے 1953ء میں بی ایس سی کا امتحان پاس کیا تھا۔ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد امام الثانی جماعت احمدیہ کے ارشاد پر ایم-اے ریاضی میں داخلہ لیا۔ ایم-اے ریاضی کی تدریس کا انتظام اس وقت پنجاب یونیورسٹی میں تھا اور مکرم ڈاکٹر عبدالسلام صدر شعبہ ریاضی تھے۔ لاہور کے سب کالجوں سے ایم-اے کے طلباء کلاسز کے لئے پنجاب یونیورسٹی آتے تھے۔ مجھے مکرم ڈاکٹر صاحب سے چند ماہ پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے بعد وہ انگلستان تشریف لے گئے۔ یونیورسٹی میں ان کی صدارت شعبہ کے دوران جو خاص کام ہوئے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے حسب ذیل ہیں:

1 ان کے مشورہ اور تحریک پر ایم-اے ریاضی کے نصاب پر نظر ثانی ہوئی اور نصاب کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا گیا اور وہ مضامین جن کو فی زمانہ نصاب میں شامل کرنا ضروری تھا' ان کو شامل کیا گیا۔

2 شعبہ ریاضی کی لائبریری کو Up to date کیا گیا۔

3 طلباء کے اندر ریاضی کے جدید علوم کے حصول کا شوق پیدا کیا گیا اور ذہین طالب علموں کی سرپرستی کی گئی۔ اس وقت بھی پاکستان کے اچھے طبیعات دان اور سائنس دان ان کے زمانہ کے پیدا کردہ ہیں۔ مثلاً مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ (پروفیسر) ریاض الدین اور فیاض الدین دو بھائی تھے۔ بہت قابل تھے۔ مکرم ڈاکٹر صاحب کی سرپرستی کے نتیجہ میں انہوں نے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی اور غالباً پاکستان کی اب خدمت کر رہے ہیں۔ (پروفیسر ایس ریاض الدین نومبر 1930ء میں لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے فزکس میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1987ء سے وہ شاہ فہد یونیورسٹی آف پٹرولیم اینڈ مائینز دہران' سعودی عرب کے شعبہ فزکس میں بطور پروفیسر کام کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے انہوں نے قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ فزکس میں کافی عرصہ پڑھایا۔ علاوہ ازیں وہ انگلستان اور امریکہ کی بہت سی یونیورسٹیوں میں بطور Visiting Professor بھی کام کر چکے ہیں' وہ پاکستان اکیڈمی آف سائنسز کے فیلو ہیں' وہ ٹریسٹ (اٹلی) میں قائم کردہ تیسری دنیا کی اکیڈمی آف سائنسز اور نیویارک اکیڈمی آف سائنسز کے فیلو بھی ہیں۔ انہیں کئی اعلیٰ انعام اور میڈل مل چکے ہیں۔ (بھائی جان نے انہیں پاکستان اٹامک توانائی کمیشن کا ممبر ٹیکنیکل مقرر کرایا تھا۔- مرتب)

4 آپ کا طریق تھا کہ مستقلاً" رسائل میں جو حل طلب Problem آتی رہتی تھیں' ان کو حل کرتے رہتے تھے اور طلباء کو بھی اس کی تحریک کرتے تھے۔ مثلاً امریکہ کی Buffalo University سے ایک رسالہ Mathamatical Monthly کے نام سے شائع ہوتا تھا اور اب بھی شائع ہو رہا ہے' اس میں تحقیقی مقالے بھی چھپتے تھے اور حل طلب Problem کا بھی ایک مستقل سیکشن ہوتا ہے۔ اس میں سے خود بھی Problems حل کرتے تھے اور طلباء کو بھی تحریک کرتے تھے کہ حل کریں۔

5 مکرم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب سے ہماری کلاس نے تین مضامین Tunsors Advanced Analysis, Electricity and Magantism. پڑھے۔

6 آپ پڑھانے میں بہت باقاعدہ تھے۔ آپ کا طریق تھا کہ جب کلاس کا وقت ہو جاتا تھا تو اس سے ایک یا آدھ منٹ پہلے آ کر کلاس کے دروازہ کے باہر کھڑے ہو جاتے تھے' جس کی میں سمجھتا ہوں دو وجوہات تھیں۔ اول: کہ کلاس روم میں جو استاد پہلے پڑھا رہے ہیں' وہ کلاس کو وقت پر چھوڑ دیں۔ دوسرے کہ آپ کی کلاس وقت پر شروع ہو اور ایک منٹ بھی ضائع نہ ہو۔

7 آپ پہلے سے تیار کردہ نوٹس سے پڑھایا کرتے تھے۔ سوالات کے حل بھی اپنے نوٹس دیکھ کر لکھواتے تھے۔

8 عام طور پر آپ کے پڑھانے کی رفتار تیز تھی۔ طالب علم کو نوٹس لینے کے لئے ساتھ ملنے کے لئے کافی تگ و دو کرنی پڑتی تھی۔ آپ تاکید فرمایا کرتے تھے کہ طلباء کلاس میں نوٹس لیں بلکہ بتایا کرتے تھے کہ کیمبرج میں تو طالب علم کئی رنگوں کی پنسلیں لے کر آتے تھے۔ عنوان ایک رنگ سے لکھا اور ذیلی سرخی دوسرے رنگ سے، تفصیل کسی تیسرے رنگ سے۔

9 خاکسار نے ان سے 5th ایئر کے دوران تعلیم حاصل کی تھی۔ ایک دفعہ ہماری کلاس نے کہا کہ ہم نے کل چھٹی کرنی ہے۔ مکرم ڈاکٹر صاحب نہ مانے۔ لڑکوں نے کہا کہ ہم پھر کل نہیں آئیں گے۔ مکرم ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ میں آؤں گا اور دیواروں کو لیکچر دے کر چلا جاؤں گا۔ مکرم ڈاکٹر صاحب کے اس عزم نے طلباء کو اپنا پروگرام ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔

10 مکرم ڈاکٹر صاحب سردیوں میں بھی علی الصبح پڑھانا پسند فرماتے تھے اور طالب علموں کو علی الصبح آنے میں دقت ہوتی تھی اور وہ اصرار کرتے تھے کہ پریڈ ذرا لیٹ لیا کریں۔ (غالباً اس وقت ڈاکٹر صاحب کا پریڈ صبح 7 بجے ہوتا تھا) ڈاکٹر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ 7 بجے کے بعد گرمی ہو جاتی ہے۔

11 آپ کا طالب علموں کے ساتھ بہت محبت اور شفقت کا سلوک تھا۔ مجھے یاد نہیں کبھی کسی کو جھڑکا ہو۔

12 ہمیشہ طلباء کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ ایک دفعہ میں نے لائبریری سے ایک کتاب کا انتخاب کیا اور آپ سے اس کے بارے میں مشورہ کیا۔ فرمانے لگے کہ Advanced کتاب ہے، لیکن ضرور پڑھیں۔

13 آپ 1953ء کے آخر میں انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ آپ کے جانے کے بعد شعبہ ریاضی کو خاصا دھکا لگا تھا۔ آپ کے خلاء کو آپ کے شاگردوں ریاض الدین اور فیاض الدین نے ایک حد تک پورا کیا تھا۔

میرے استاد، پروفیسر عبدالسلام

پروفیسر ڈاکٹر مرتضیٰ ڈین آف نیچرل سائنسز، قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد اپنے استاد پروفیسر عبدالسلام کے بارے ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

"مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں نے امپیریل کالج لندن سے پروفیسر عبدالسلام کی سرپرستی میں تربیت حاصل کی اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند پائی۔ یہ سن باسٹھ کا زمانہ تھا۔ میں نے پنجاب یونیورسٹی کی لیکچر شپ چھوڑ کر پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کی ملازمت اختیار کی اور فوراً بعد کولمبو پلان سکالر شپ سکیم کے تحت اعلیٰ تعلیم کے لئے امپیریل کالج پہنچا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پروفیسر عبدالسلام اور ڈاکٹر آئی ایچ عثمانی (مرحوم) نے

مل کر پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کے تحت سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے لئے بہت سے پروگرام شروع کر رکھے تھے۔ ان میں ایک اہم پروگرام بیرون ملک ٹریننگ کا تھا۔ آج پاکستان میں بہت سے سینئر سائنسدان اور انجینئر اسی پروگرام کی پیداوار ہیں اور سلام اور عثمانی کی کوششوں کے مرہون منت ہیں۔

میں نے Particle Physics کا انتخاب کیوں کیا؟ میں سمجھتا ہوں یہ فیصلہ قدرتی بات تھی۔ فزکس اور میتھ کا بیک گراؤنڈ ہو اور ہر طرف پروفیسر عبدالسلام کے چرچے ہو رہے ہوں (وہ سائنس کی دنیا میں پہلے ہی سے Celebrity بن چکے تھے) اور حسن اتفاق کہ ان کو سننے کا بھی موقعہ مل گیا ہو۔ وہ پاکستان آئے ہوئے تھے اور انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں ایک ولولہ انگیز لیکچر دیا۔ سلام صاحب یقیناً نوجوان نسل کے ہیرو اور آئیڈل بن چکے تھے۔

امپیریل کالج میں پی ایچ ڈی میں داخلہ کے لئے DIC کورس کرنا ضروری ہوتا ہے۔ برٹش گریجوایٹس کے لئے یہ شرط نہیں ہوتی۔ مگر دوسروں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ نہ صرف یہ کورس پاس کریں بلکہ پی ایچ ڈی میں داخلہ کی سیٹ مقابلہ کی بنیاد پر حاصل کریں۔ خیر ہم نے DIC کورس شروع کر دیا۔ پروفیسر عبدالسلام کے گروپ میں دوسرے اساتذہ Streater, Kibble, P.T. Matthews اور Lovelace تھے۔ یہ چھوٹا سا گروپ Theoretical Particle Physics میں یورپ کا بہترین سینٹر مانا جاتا تھا۔

سلام صاحب کو بحیثیت استاد کیسا پایا؟ وہ یقیناً اُن اساتذہ میں سے نہیں جو لیکچر کی تیاری میں محنت کرتے ہیں اور کوشش کے ساتھ اس کو آسان فہم بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ سٹائل پروفیسر P.T.Matthews کا تھا۔ سلام صاحب کا نہیں اور نہ ہی سلام صاحب ان اساتذہ میں سے ہیں جو لیکچرز کے باقاعدگی سے Notes تیار کرتے ہیں اور پھر خوبصورت طریق سے بلیک بورڈ پر ہوبہو تحریر کر دیتے ہیں۔ اس طرح بلیک بورڈ پر لکھا ہوا لیکچر کتاب کی تصویر بن جاتا ہے۔ یہ پروفیسر Kibble کا سٹائل تھا۔ سلام صاحب کا نہیں۔ سلام صاحب ان سے مختلف تھے۔ ان کا انداز اپنا اور منفرد۔ ان کے نزدیک مذکورہ باتیں خاص اہمیت کی حامل نہ تھیں۔ رویہ سے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تکلفات عام انسانوں کے کرنے کے ہیں اور وہ یقیناً ان میں سے نہیں۔ یہ بات نہ تھی کہ سلام صاحب یہ کام کر نہیں سکتے تھے۔ ہم نے ان کے سیمینار سنے اور ان کو کئی انٹرنیشنل کانفرنسز میں دیکھا اور سنا۔ جہاں وہ وی آئی پی (VIP) سپیکر کی حیثیت سے مدعو ہوتے۔

ان کے لیکچر کو سننے کے لئے لوگ بے تاب ہوتے۔ ہال کھچا کھچ بھر جاتے۔ سحر انگیز لیکچر' باتیں طبعیات کی ہو رہی ہیں اور انداز بیان لٹریری ہے۔ زبان پر کیا عبور ہے کہ اہل زبان بھی عش عش کرتے ہیں۔ پھر اس پیکر علمیت و فطانت کو کس طرح سامعین کی طرف سے والہانہ دار (Standing Ovation) ملتی ہے کہ جیسے سبھی کے دل کی آواز ہے۔

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن

بات DIC کورس کی ہو رہی تھی۔ سلام صاحب نے اپنے کورس کا آغاز کیا Theory of Lie Groups سے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب Particle Physics میں گروپ تھیوری کے نظریات شامل ہونے لگے تھے۔ جس کے نتیجے میں Symmetry Group Su(3) اور Eightfold Way معرض وجود میں آئے اور Omega Minus کی دریافت ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ Quark Model کی باتیں ہونے لگیں۔ کچھ دنوں بعد سلام صاحب کے لیکچرز کا انداز بدل گیا۔ اب وہ جب کلاس روم میں داخل ہوتے ہیں تو اُن کے ہاتھ میں Research Journals کے تین چار شمارے ہوتے ہیں۔ جن میں جگہ جگہ Page Indicators رکھے ہوئے ہیں۔ اب لیکچرز کیا ہیں؟ Frontiers of Physics کی باتیں ہو رہی ہیں۔ تحقیقی مسائل کا تجزیہ ہو رہا ہے۔ لکھتے لکھتے بلیک بورڈ بھر جاتا ہے۔ خیالات و افکار کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ بورڈ پر تیروں کے نشان بکھرے ہوئے مختلف اجزاء کو ایک لڑی میں پرو رہے ہیں۔ اکثر طلباء کے لئے زیادہ تر باتیں سر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔ اس کے باوجود سبھی بے حد متاثر وجدانی کیفیت میں بیٹھے Notes لے رہے ہیں۔ سلام صاحب کے لیکچرز ایک Exciting experience ہوتا جو طلباء میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کرتا۔ سلام صاحب کی خواہش ہوتی کہ ان کے طلباء تیزی رفتاری سے آگے بڑھیں اور ایسے لگتا جیسے وہ بہت جلدی میں ہیں۔ ان کے پاس وقت کم ہے اور بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ دوسروں کے لئے پیغام ہوتا کہ اگر آپ ہمارے شانہ بشانہ نہیں چل سکتے تو کوئی اور راہ اختیار کریں۔ ہم آپ کا انتظار نہیں کر سکتے۔

If you cannot rise to us,.we cannot stoop to you

ہمارے شہر میں صرف قد آور بستے ہیں۔ بونوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یہ تھا سلام صاحب کے کام کروانے کا سٹائل۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ان کے بیشمار سٹوڈنٹس رہے مگر صرف گنے چنے لوگوں نے ان کے ساتھ کام کرنے کی جسارت کی۔

سلام صاحب کی بارعب شخصیت' ان کا دبدبہ اور جلالی مزاج اور اس پر طرہ اُن کی آنکھوں کی چمک' کس کی مجال کہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔ کسی چیز کا جواب معلوم بھی ہوتا تو کہنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ شروع شروع میں ہمیں گمان ہوا کہ یہ سب کچھ ہم مشرقی لوگوں کا مسئلہ ہے مگر جلد ہی اس راز کی بھی قلعی کھل گئی' ہم نے دیکھا گوروں کا بھی برا حال تھا۔ وہ بھی اسی کشتی میں سوار تھے۔ قصبہ جھنگ کی یہ شخصیت مغرب ہو یا مشرق دونوں پر یکساں طور پر بھاری تھی۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ سلام صاحب کی سیکٹری جو Mannerism کی مناسبت سے تھیٹر کی دنیا میں شاید زیادہ موزوں ہوتی P.T.Matthews کے پاس شکایت لے کر گئیں۔ آنکھوں میں آنسوں' کہنے لگے: "دیکھیں یہ سلام صاحب کیسے ہیں! مجھے دفتر میں بلاتے ہیں۔ میں جاتی ہوں اور جا کر سامنے کھڑی ہو

جاتی ہوں۔ نہ وہ مجھے ہیلو کرتے ہیں اور نہ ہی آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہیں اور بس Dictation شروع کر دیتے ہیں۔ P.T.Matthews نے جو بڑے شفیق انسان تھے (اور سب انہیں پاس جا کر اپنے دکھڑے سناتے تھے) دلاسا دیتے ہوئے کہا: "شکر کرو اس نے تمہاری طرف نہیں دیکھا ورنہ تم ڈر جاتیں۔"

ایک دن ایسا ہو کہ ہم اپنے ساتھی طلباء کے ہمراہ چائے کی میز پر تھے۔ اچانک وہاں P.T.Matthews تشریف لے آئے۔ باتیں سلام صاحب کے متعلق ہونے لگیں۔ موضوع یہی تھا کہ سلام صاحب کو سمجھنا آسان نہیں۔

P.T.Matthews بتانے لگے کہ میں نے ایک دفعہ سلام سے کہا' آپ دوسروں کی سہولت کے لئے دقیق موضوعات کو آسان بنا کر کیوں نہیں پیش کرتے۔ ہنس کر جواب دیا کہ اگر میں تمہارے لئے ایسا کروں تو تم کہو گے ارے یہ تو بہت آسان بات تھی۔ میں خود بھی سوچ سکتا تھا (خیر اس قصہ میں مذاق کا پہلو زیادہ تھا) میں نہیں سمجھتا کہ سلام صاحب میں خودغرضی تھی یا تکبر۔ ان کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنا وقت بچا صرف کرنے اور سر کھپانے کو تیار نہ تھے۔ And he had no patience for mediocrity
جب ہمارا D.I.C کورس ختم ہونے کو ہوا تو انہوں نے سب پاکستانیوں کو بلا کر کہا دیکھو بھئی اب تم لوگوں کا D.I.C. Exam ہونے والا ہے۔ تمہیں ابھی سے اپنے Ph.D پروگرام کا خیال کرنا ہوگا۔ یہاں پر ہم لوگ تو اپنے اپنے کام میں اس قدر مصروف ہیں کہ تمہیں وقت نہ دے سکیں گے۔ کسی دوسری یونیورسٹی چلے جاؤ وہاں Supervisor بہت خیال رکھیں گے۔ توجہ دیں گے۔ تمہارے لئے آسانی ہوگی۔ ہم تمہارا داخلہ بھی کروا دیں گے۔ ہم لوگ اس پیغام سے بہت مایوس ہوئے۔ کچھ نے پریشان ہو کر دوسری یونیورسٹیوں میں داخلہ کی کوشش شروع کر دی۔ مگر اس بات کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ سلام صاحب طلباء کی مدد کرنے کو تیار نہ تھے۔ وہ یقیناً طلباء کی مدد کرتے۔ ان کو Guide کرتے' Research Problem تجویز کرتے اور حل کرنے کی راہیں بتاتے۔ مجھے یاد ہے کہ جب ہم نے DIC کورس مکمل کرنے کے بعد تحقیقی کام شروع کیا تو سلام صاحب نے سب کو بلوایا Research Problems بتائے' میرے لئے بھی پرابلم تجویز ہوا۔ سلام صاحب بولتے جا رہے تھے اور میں لکھتا جا رہا تھا۔ پلے کچھ نہ پڑا' بعد میں' میں نے اس کاغذ کو بڑے احترام کے ساتھ دراز میں سنبھال دیا اور پھر خود ہی اپنے معیار کا پرابلم تلاش کر لیا۔ میری خوش قسمتی کہ جلد کامیابی ہوئی۔ مسودہ تیار کر کے سلام صاحب کے پاس لے گیا۔ اس کام میں انہیں کا تجویز کردہ ایک ماڈل استعمال کیا گیا تھا اور ساتھ Symmetry Group Su(3)۔ چند بنیادی ذرات کے Decay Processes کو سٹڈی کیا گیا تھا۔ سلام صاحب نے مسودے کو دیکھا۔ ورق پلٹے اور پوچھا کہ ان میں Kaon Particles کی Contributions کیوں شامل نہیں کی گئیں۔ میں نے جواب دیا کہ دوسروں نے ایسا ہی کیا ہے۔ کہنے

لگے کہ یہ کوئی جواب نہیں۔ سائنسی تحقیق میں دوسروں پر ایسے اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ پھر میز پر پڑے ہوئے Physical Review اور دوسرے رسالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

Do you think you can trust all this junk? ۔(ان تمام دوستوں (بشمول بقلم خود) کے لئے ایک لمحہ فکریہ جو اپنے Physical Review میں چھپے ہوئے مضامین پر اتراتے ہیں۔ خیر ہم نے ان کی تجویز کردہ Contributions شامل کیں اور مسودے کو اشاعت کے لئے بھجوا دیا۔ یہ ہماری پہلی Publication تھی۔ اس پر سمینار بھی دیا۔ P.T.Mathews اور دوسرے اساتذہ سیمینار میں تھے۔ مگر سلام صاحب کہیں گئے ہوئے تھے۔ وہ نہ آسکے اور ہم نے شکر ادا کیا۔ ورنہ شاید ہم سٹیج پر ہی ڈھیر ہو جاتے۔ سلام صاحب کا یہ خاصا تھا کہ ان کی بات سمجھ آئے یا نہ آئے بندہ Inspire ضرور ہوتا' وہ ہر وقت Excited State میں ہوتے' جس سے دوسرے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ جہاں بھی جاتے ہلچل مچا دیتے۔ نت نئے خیالات' ایسے لگتا کہ انقلاب آنے ہی والا ہے۔ ڈیپارٹمنٹ کی حالت یہ تھی کہ مسلسل Visiting Scientists چلے آ رہے ہیں۔ اکثر سیمینار ہو رہے ہیں۔ کیا یورپ کیا امریکہ دنیا جہان سے ماہر طبعیات South Kensington کے طواف کو پہنچ رہے ہیں۔ کسی دن Julian Schwinger کا سیمینار ہے اور کسی دن Steven Weinberg کا۔ آج Feldman آئے ہوئے ہیں اور کل J.C.Ward اسی طرح ڈیپارٹمنٹ میں لٹریچر کی بھی بھرمار رہتی۔ ہر روز ڈاک میں دنیا کے چاروں کونوں سے Preprints کے ڈھیر پہنچ رہے ہیں۔ سلام صاحب بحیثیت استاد Spon-Feeding تو نہیں کرتے تھے مگر وہ آپ کو ایک آئیڈیل ماحول ضرور مہیا کرتے' جہاں آپ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر آسمان کی بلندیوں کو چھو سکتے تھے۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں۔ سلام صاحب ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ نہ صرف ان کا شمار اس صدی کے اعلیٰ ترین سائنسدانوں میں ہوتا ہے بلکہ وہ ایک زبردست سائنس ایڈمنسٹریٹر بھی ثابت ہوئے۔ اٹلی میں انٹرنیشنل سینٹر کا قیام اور اس کے ذریعہ علوم طبعیات کی تحقیق اور فروغ اُن کا حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ ان کی ذات تیسری دنیا کے سائنسدانوں کے لئے مشعل راہ ہے۔ سلام صاحب کو اس بات کا احساس تھا کہ تیسری دنیا میں تحقیق کی کوئی روایات نہیں۔ ٹیکنالوجی بہت پسماندہ ہے اور نظام تعلیم کی حالت ناگفتہ بہ۔ چنانچہ انہوں نے سینٹر کے ذریعے بہت سے ایسے پروگرام دیئے۔ جن سے تیسری دنیا کی سائنس اور ٹیکنالوجی میں سرعت کے ساتھ پیش رفت ہو سکے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے۔ انہوں نے بحیثیت سائنسی مشیر صدر پاکستان نظام تعلیم کی منصوبہ بندی کی اور ریسرچ اور ڈویلپمنٹ کے متعدد پروگرام دیئے۔ سلام صاحب کو اس بات کا بھی شدت سے احساس تھا کہ تیسری دنیا کے ممالک کو "سائنس برائے اقتصادی ترقی" کی زیادہ ضرورت ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے سینٹر میں Applied Physics کے پروگرام شروع کروائے۔ مثلاً لیزرز' سولر انرجی' پلازما فزکس اور کنٹرولڈ فیوژن' باؤ فزکس' جیالوجی Climatology, Soil Physics وغیرہ۔ ساتھ ساتھ لیبارٹری ٹریننگ کا بھی اہتمام کیا گیا۔ اب تک سینٹر میں چار ایسی لیبارٹریاں قائم کی جا چکی ہیں۔

Microprocessor Laboratory, Superconductivity Laboratory, Lasers and Optical Fibres laboratory and Climatology Laboratory.

پروفیسر سلام نے ذاتی طور پر بھی تیسری دنیا کے سائنسدانوں کو اس بات کی ترغیب دی کہ اپنے ملک کی ضرورتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے Applied Physics کے مختلف مضامین کی طرف توجہ دیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس میں کافی حد تک کامیاب بھی رہے۔ خاص طور پر انہوں نے پاکستانیوں کو اس کام پر آمادہ کیا۔ چنانچہ چند دوسرے ساتھیوں کی طرح میں نے بھی اپنے سابقہ مضمون کو خیرباد کہا اور Plasma Physics and Controlled Fusion کو اپنایا۔ آج میں فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پچھلے پندرہ بیس سال کی کوشش کے نتیجے میں آج یہ اہم مضمون پاکستان میں مضبوط بنیادوں پر قائم ہو چکا ہے۔ درجنوں سائنسدان مختلف اداروں اور مختلف یونیورسٹیوں میں اس مضمون میں تدریس و تحقیق کا کام کر رہے ہیں۔ میرے لئے یہ اطمینان بخش بات ہے کہ میں نے اپنے عظیم اور محترم استاد پروفیسر عبدالسلام کی خواہش کے مطابق اور اُن کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے یہ کام کیا اور اس طرح پاکستان کی اہم ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی۔

سلام صاحب کے متعلق باتیں نہ ختم ہونے والی ہیں اور اُن کے حیرت انگیز کارنامے سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں' علامہ اقبال کا یہ مصرعہ اُن پر پوری صادق آتا ہے۔

صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف اس کا

ڈاکٹر غلام مرتضیٰ

پروفیسر قائداعظم یونیورسٹی' اسلام آباد"

میرے استاد پروفیسر عبدالسلام کی چند یادیں

12۔ 21 دسمبر 1996ء کو ہندوستان میں پوری کے مقام پر فیلڈ تھیوری کوانٹم گریوٹی (Quantum Gravity) اور سٹرنگ تھیوری پر ایک ورکشاپ ہوئی تھی۔ ڈاکٹر ایم جے ڈوف (M.J. Duff) جنہوں نے امپیریل کالج لندن سے 1969ء اور 1972ء کے دوران بھائی جان کے زیر نگرانی پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی نے اُس ورکشاپ میں اپنے استاد پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔ ان کی تقریر سے چند حصوں کا ترجمہ یہاں دیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر ڈوف آج کل ایم۔اے یونیورسٹی کالج سٹیشن وسنٹر برائے نظری طبعیات ٹیکساس امریکہ میں پڑھاتے ہیں۔

"پچھلے ماہ عبدالسلام کی وفات نہ صرف ان کے اہل خاندان بلکہ طبعیات برادری اور بنی نوع انسان کے لئے ایک عظیم اور ناقابل تلافی نقصان تھی۔ کیونکہ وہ نہ صرف بیسویں صدی کے ایک بہترین عالم طبعیات تھے' جنہوں نے کائنات میں پائی جانے والی چار بنیادی قوتوں میں سے دو کو یکجا کیا بلکہ انہوں نے

اپنی زندگی تیسری دنیا میں سائنس کی تعلیم و ترقی اور دنیا میں امن کے قیام کے مؤقف کر رکھی تھی۔ اگرچہ انہیں طبیعات میں نوبل انعام دیا گیا لیکن میرے خیال میں وہ نوبل انعام برائے امن کے بھی مستحق تھے۔"

بھائی جان کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم کا ذکر کرنے کے بعد ڈاکٹر ڈف نے کہا: "اس بات میں کچھ شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ سینٹ جونز کالج (کیمبرج-- مرتب) میں تعلیم کے دوران اور بعد میں وہاں تدریس کے دوران وہ (پروفیسر) پال ڈیراک سے بے حد متاثر تھے۔ اسے وہ اپنا ہیرو اور سائنسی "مرشد" سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں وہ (ڈیراک) نہ صرف ایک عظیم سائنسدان تھے بلکہ انہیں کوئی مادی اور دنیاوی لالچ نہیں تھا۔ (خود سلام نے بھی کبھی دنیاوی جاہ و جلال اور دولت کی آروز نہیں کی تھی بلکہ وہ تو اس بات کی وجہ سے مشہور تھے کہ تیسری دنیا کے اکثر نادار طلباء کی اپنی جیب سے مدد کیا کرتے تھے۔)

1957ء میں پیٹرک بلیکٹ کے کہنے پر انہوں نے امپیریل کالج میں ملازمت اختیار کی تھی' جہاں انہوں نے نظری طبیعات کا ایک گروپ بنایا۔ 1959ء میں رائل سوسائٹی نے انہیں اپنا فیلو منتخب کیا تھا۔

انہوں نے اپنی ساری زندگی امپیریل کالج میں گزار دی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے وہاں سے 1969ء اور 1972ء کے دوران ان کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ 1964ء میں انہوں نے ٹریسٹ اٹلی میں سینٹر برائے نظری طبیعات قائم کیا جس کے وہ ڈائریکٹر رہے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر ڈف نے ری نارملائزیشن (Renormalization Theory) سے لے کر چار میں دو قوتوں کی وحدت پیمائی تک کے مختصر حالات بیان کرنے کے بعد کہا کہ "میں عبدالسلام کا بے حد ممنون ہوں کہ ان کی وجہ سے مجھے کوانٹم تھیوری آف گریویٹی (Quantum Theory of Gravity) سے لگن اور اس پر کام کرنے کا انتہائی شوق پیدا ہوا۔ جبکہ اس زمانہ میں اس بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا تھا۔

(A Subject which at the time was prsued only by mad dogs and English human)

وہ ایک ایسا مضمون ہے جس کی طرف کوئی جنونی یا انگریز ہی مائل ہو سکتا ہے۔ میں نے جب اس مضمون میں پی ایچ ڈی کرنے کا اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ (میری تحقیق کا موضوع Problems in the Classical and Quantum Theories of Gravitation تھا) تو مجھے تحقیر کی نظروں سے دیکھا گیا اور میرا مذاق اڑایا گیا تھا۔"

"یہ مسلمہ بات ہے کہ جب تک چاروں قوتوں کو ایک قوت ثابت نہ کر لیتے سلام کبھی بھی آرام سے نہ بیٹھتے۔ آئن سٹائن نے بھی یہی خواب دیکھا تھا اور یہی مسئلہ آج کے علماء طبیعات کو درپیش ہے' جس میں وہ اپنی اپنی تحقیق میں مصروف ہیں۔"

”میں یہاں یہ بتانا چاہوں گا کہ سلام جیسے استاد جس کے پاس نئے نئے خیالات کی بھرمار ہوتی کا شاگرد ہونا بہت خوش قسمتی تھی۔ وہ مجھے تحقیق کے لئے ایک موضوع دیتے اور پھر سفر پر نکل کھڑے ہوتے اور ہفتوں غائب رہتے۔ (اس دوران مجھے کرس اشحام (Chris Isham) (یہ بھائی جان کے امپیریل کالج میں ساتھی تھے---- مرتب) سے مدد اور راہنمائی کے لئے رجوع کرنا پڑتا تھا) جب وہ اپنے سفر سے واپس آتے تو پوچھتے: ”بتائیں آپ نے کیا کام کیا ہے؟“ جب میں انہیں معمولی سی پیش رفت کے بارے میں بتاتا تو کہتے: ”نہیں، نہیں، نہیں۔ یہ سب فرسودہ خیالات ہیں، تمہیں تو یہ کام ایسے ایسے کرنا چاہیے تھا۔“ پھر وہ تحقیق کے لئے ایک نئی پرابلم دے دیتے۔ اس صورت حال سے ہم سب طلباء کچھ ”سیانے“ ہو گئے۔ اور ہماری یہ کوشش ہوتی کہ جب تک ہم اپنا کام مکمل نہ کرلیں ان کے سامنے نہ جائیں۔ لیکن ایک ایسی جگہ بھی تھی جہاں ہم اُن سے پہلو تہی نہیں کر سکتے تھے، وہ جگہ تھی Men's room بدقسمتی سے ہم وہاں پکڑے جاتے اور وہیں ہمیں تازہ اور نئی ہدایات ملتیں۔“

”غالباً وہ ہنس بیتھے (Hans Bathe) (یہ وہی تھے جنہوں نے پروفیسر پیٹرک بلیکٹ کو مشورہ دیا تھا کہ سلام کو امپیریل کالج میں شعبہ نظری طبعیات بنانے کے لئے پروفیسر رکھ لیں) ہی تھے جس نے کہا تھا کہ ”غیر معمولی ذہین انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم (میرے خیال میں سٹیون وائن برگ کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ بھائی جان کے ساتھ انہیں فزکس کا نوبل انعام دیا گیا تھا) کے لوگ اپنے استدلال سے زبردست نتائج سامنے لاتے ہیں، جبکہ دوسری قسم کے لوگ افسوں گر ہوتے ہیں، جن کا وجدان چکرا دیتا ہے۔ میری رائے میں سلام کا تعلق اسی منطقی طبقہ یا قسم سے تھا۔ ان کے خیالات مشرقی تصوف کے اساسی اصول تھے۔ لوگ تعجب ہی کرتے رہ جاتے تھے اور سوچتے کہ اس شخص کی غیر معمولی ذہانت کی گہرائی کو کیسے ناپا جائے۔“

انہوں نے اپنی زندگی اس بات کے لئے وقف کر رکھی تھی کہ دنیا میں امن پیدا ہو اور ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے درمیان جو خلیج ہے وہ ایک دوسرے کے تعاون سے پر ہو۔ انہیں اس بات پر پختہ یقین تھا کہ یہ فرق اس وقت تک دور نہیں ہو سکتا جب تک کہ تیسری دنیا والے اپنی سائنسی اور ٹیکنالوجی کی قسمت کا خود فیصلہ نہیں کر لیتے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں مالی امداد اور ٹیکنالوجی کی درآمد سے آگے دیکھنا ہو گا اور ایسے لوگوں کو تیار کرنا ہو گا، جو سائنسی امور میں امتیاز کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ اسی لئے وہ بنیادی ذرات اور نظری طبعیات جیسے رفیق مضمون کو پڑھانے میں ترجیح دیتے تھے۔ جبکہ بہت سے نقاد اس بات کی شکایت کرتے اور کہتے کہ اس سے بہتر ہے کہ زراعت پڑھائی جائے۔

”اب میں سلام کی زندگی کے ایک اور پہلو کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔ ان کے اپنے خیال میں وہ اپنی زندگی کے آخری سانسوں تک مسلمان تھے۔ بدقسمتی سے میں اس بارے میں کچھ تبصرہ نہیں کر سکتا، سوائے اس بات کہ کہ وہ اپنے عقیدہ کے بارے میں بہت سنجیدہ تھے۔“

”یہ ایک المناک بات ہے کہ سلام جیسا چوق و چوبند اور صحت مند انسان جس نے شاندار اور بھرپور

زندگی گزاری ہو' وہ ایک ضعیف کر دینے والی بیماری کا شکار ہو گیا۔ سمندری شیر کی دھاڑ کی طرح ان کے قہقہے امپریل کالج کی تھیوری گروپ کے برآمدے میں گونجتے تھے۔

جب بڑے لوگوں کے کارنمایاں کے بارے میں باتیں ہوتی ہیں تو اکثر یہ گھسا پٹا جملہ سننے میں آتا ہے کہ "وہ احمقانا بات یا رویہ برداشت نہیں کر سکتے۔"

لیکن مجھے اچھی طرح سے یاد پڑتا ہے کہ سلام کا رویہ اس کے برعکس تھا۔ دنیا کے کونے کونے سے لوگ امپریل کالج میں آتے تھے اور وہ سلام کا دروازہ کھٹکھٹاتے اور انہیں اپنے کام اور تحقیقات کے بارے میں بتاتے جو اکثر بے سروپا باتیں ہوتیں' لیکن سلام ان سب کی عزت کرتے' ان سے خوش خلقی اور ملنساری سے پیش آتے اور ان لوگوں کی تلون مزاجی کو تحمل و بردباری سے برداشت کرتے۔ ان میں یہ وصف تھا کہ وہ حکمت کے موتیوں کو شناخت کر لیتے جبکہ ہماری نظروں میں وہ ریت کے ذرات معلوم دیتے۔ اس بارے میں ایک مثال پیش کرتا ہوں کہ لندن میں ایک غیر ملکی سفارت خانہ کے ملٹری اتاشی نے نظری طبعیات پر کچھ کام کیا' جسے وہ سلام کے پاس لے گیا۔ اس کے کام کو دیکھتے ہوئے سلام نے اس کی ذہانت کو بھانپ کر اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے تحقیق میں ایسا کام کر دکھایا جسے سائنسی زبان میں Flavor Su(3) کہتے ہیں۔

نظری طبعیات کے علماء اکثر دیانت داری سے کام لیتے ہیں۔ ہم نے کبھی ایسا نہیں سنا کہ کسی نے جان بوجھ کر سائنسی حقائق کو غلط رنگ میں پیش کیا ہو۔ لیکن ہم بھی آخر انسان ہیں' لہٰذا ہماری یہ کوشش ہوتی ہے کہ اپنے تحقیقی نتائج کو شائع کرانے سے پہلے انہیں خوبصورت شکل میں پیش کریں۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ ایک نوجوان طالب علم ایسی ہی ناگوار صورت حال کے بارے میں رائے لینے کے لئے سلام کے پاس گیا اور کہا: "پروفیسر سلام یہ حساب کتاب جو میں نے جوڑا ہے' اس سے میرے استدلال کی تصدیق تو ہو جاتی ہے' لیکن بدقسمتی سے کچھ ایسی باتیں بھی ہیں' جو منطبق نہیں ہوتیں۔ کیا میں اپنے قارئین کی توجہ ان باتوں کی طرف مبذول کرانے کا خطرہ مول لوں' اگر میں نے ایسا کیا تو اس کام کی اہمیت ختم ہو جائے گی۔ یا میں کچھ دیر انتظار کر لوں؟ پھر اس نے کہا کہ "میں سمجھتا ہوں کہ آخر کار یہ باتیں غیر متعلق ثابت ہوں گیں۔" اس بات کے جواب میں سلام نے جو کہا وہ یقیناً اس قابل ہے کہ اسے آکسفورڈ ڈکشنری میں محاورات یا حوالہ جات کے سیکشن میں بطور یادگار درج کرنا چاہیے۔ سلام نے کہا:

"When all else fails, you can always tell the truth"

مادے کے حتمی اجزاء Ultimate building block کو کوارک (Quark) کا نام دیا گیا۔ یہ کوارک کئی قسم کے ہوتے ہیں' اس خاصیت کو Flavor کہا جاتا ہے۔ شدید نیوکلیر قوت یا کوارکس کے درمیان قوت کا گیج نظریہ Su(3) گروپ کا حامل ہے۔ کیونکہ تین قسم کے "رنگین چارج" رکھتے ہیں۔ یہ نظریہ جو تینوں "رنگوں" کو گیج نقطہ نظر سے دیکھتا ہے کوانٹم رنگین حرکیات Quantum chromodynamics کہلاتا ہے۔

22

حضرت چوہدری محمد ظفراللہ خان اور بھائی جان

بھائی جان نے پہلی مرتبہ حضرت چوہدری محمد ظفراللہ خان کو دسمبر1933ء میں دیکھا تھا۔ اس وقت بھائی جان کی عمر قریباً آٹھ برس تھی۔ دوسری مرتبہ انہوں نے چوہدری صاحب کو 7 اکتوبر 1946ء کو انگلستان کی بندرگاہ لیور پول پر دیکھا' جب وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے وہاں پہنچے تھے۔ اسی بحری جہاز سے چوہدری صاحب کے بھائی چودھری عبداللہ خان صاحب بھی سفر کر رہے تھے۔ جنہیں لینے کے لئے چودھری ظفراللہ خان وہاں تشریف لے گئے تھے۔ تیسری مرتبہ چودھری صاحب بھائی جان سے ملنے کے لئے انسٹی ٹیوٹ فار ایڈوانس سٹڈی پرنسٹن نیو جرسی' امریکہ تشریف لے گئے تھے۔ چودھری صاحب اس وقت پاکستان کے وزیر خارجہ تھے اور اقوام متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کر رہے تھے۔

اس کے بعد مزید ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

1974ء میں جب ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے جماعت احمدیہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا تو بھائی جان نے اس فیصلہ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے سائنسی مشیر اعلیٰ صدر پاکستان کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ کسی حکومت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسروں کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی کرے۔ وزیراعظم پاکستان کو اپنا استعفیٰ بھیجنے سے پہلے بھائی جان نے اس کا ڈرافٹ چوہدری سر محمد ظفراللہ خان صاحب کو دکھایا تھا۔ جسے پڑھنے کے بعد چوہدری صاحب نے اس میں کچھ رد و بدل کرنے کی تجویز بھائی جان کو دی۔ جسے قبول کرتے ہوئے بھائی جان نے عبادت میں کچھ تبدیلی کر دی' لیکن ایک فقرہ تبدیل نہ کیا۔ جب چوہدری صاحب نے اس فقرہ کو حذف کرنے کے لئے کہا تو بھائی جان نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر چوہدری صاحب نے فرمایا: "پس بطور نمائندہ امام جماعت احمدیہ آپ کو حکم دیتا ہوں کہ آپ اس فقرہ کو حذف کر دیں۔" اتنا سننا تھا کہ بھائی جان نے اسی فقرہ کو اپنے استعفیٰ کی عبارت سے نکال دیا۔ یہ تھا کامل اطاعت کا نمونہ جو انہوں نے پیش کیا۔ دراصل یہ امام جماعت احمدیہ کی ہی اطاعت تھی۔ آپ (بھائی جان) آئمہ جماعت احمدیہ کی خدمت میں جب حاضر ہوئے تو ان کے سامنے یوں مئودبانہ بیٹھتے جیسے ایک طفل مکتب ہو۔

ہمارے ابا جان 69-1962ء کے دوران وقفے وقفے سے میرے اور میرے چھوٹے بھائی چوہدری محمد عبدالماجد کے ہاں کراچی میں قیام فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ جب وہ میرے ہاں قیام پذیر تھے (یہ اوائل 1965 کی بات ہے) کہ مجھے علم ہوا کہ چوہدری محمد ظفراللہ خان صاحب کراچی تشریف لائے ہیں اور وہ

اپنے ایک دیرینہ دوست شجاعت علی حسنی صاحب گورنر سٹیٹ بنک آف پاکستان کی کوٹھی پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اباجان کو جب اس کا علم ہو تو انہوں نے چوہدری صاحب سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ میں انہیں حسنی صاحب کی کوٹھی پر لے گیا۔ دونوں بزرگ ہستیاں ایک دوسرے سے بڑے تپاک سے ملیں اور الگ بیٹھ کر ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد جب اباجان نے واپس جانے کے لئے چوہدری صاحب سے رخصت چاہی تو وہ کوٹھی کے بڑے دروازہ تک ہمیں رخصت کرنے کے لئے آئے۔ کوٹھی سے نکلنے سے پہلے اباجان نے چوہدری صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ ''وہ دعا کریں کہ سلام کو نوبل پرائز مل جائے۔'' اباجان کی بات سننے کے بعد چوہدری صاحب چند سیکنڈ خاموش کھڑے رہے پھر اپنے مخصوص لہجہ میں فرمایا: ''اے تسیں کی ہر ویلے کہندے رہندے او کہ سلام نوں نوبل پرائز ملے۔ سلام نوں نوبل پرائز ملے۔ میں سمجھدا واں کہ ایہہ نوبل پرائز دی عزت ہوئے گی' اگر اوہ سلام نوں ملیا۔'' (آپ یہ ہر وقت کیا کہتے رہتے ہیں کہ سلام کو نوبل پرائز ملے سلام کو نوبل پرائز ملے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ نوبل پرائز کی عزت ہوگی' اگر وہ سلام کو دیا گیا) چوہدری صاحب کی نظر میں بھائی جان کا یہ مقام تھا۔

چوہدری محمد ظفراللہ خان کی خدمت میں نذرانہ عقیدت

چوہدری سر محمد ظفراللہ خان کی وفات کے بعد بھائی جان نے ان کی خدمت میں ہدیہ عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک مضمون لکھا' جو 1986ء میں ٹرانس نیشنل پرسپکٹو کی بارہویں جلد کے دوسرے شمارہ میں شائع ہوا۔ بعد میں بھائی جان کے غیر سائنسی مضامین جو ''آئیڈیلز اینڈ ریالیٹز'' (Ideal and Realities) کے نام سے شائع ہونے کے تیسرے ایڈیشن میں یہ مضمون شامل کیا گیا۔ (ص 841-487) اس مضمون کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

''اپنی زندگی میں مجھے جن عظیم انسانوں سے شناسائی کا شرف حاصل ہوا' چوہدری ظفراللہ خان ان میں سے ایک تھے۔ میں نے پہلی بار چوہدری ظفراللہ خان صاحب کو دسمبر 1933ء میں دیکھا۔ اس وقت میری عمر آٹھ برس تھی۔ میرے ذہن کے دریچے میں ان کی اس وقت کی تصویر ابھی تک محفوظ ہے۔ نہایت خوبصورت اور دلنشین وجود۔ میرا خیال ہے کہ انہیں میرے بارے میں پہلی مرتبہ اس وقت علم ہوا ہوگا جب 1940ء میں میرے والد نے میرے مستقبل کے بارے میں ان سے مشورہ کے لئے خط لکھا تھا۔ آپ نے جواب میں لکھا تھا کہ وہ دعا بھی کریں گے مگر مجھے تین باتوں کو پلے باندھ لینا چاہیے۔ پہلی کہ مجھے اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہیے کیونکہ صحت ہی تمام کامیابیوں کی بنیاد ہے۔ دوسری کہ مجھے اگلے روز کے سبق کے لئے ایک دن پہلے تیاری کرلینی چاہیے اور یہ بھی کہ روزانہ میں جو کچھ پڑھوں اسے پوری طور پر اس روز دوہرا بھی لوں تاکہ وہ ہمیشہ کے لئے میرے ذہن میں محفوظ ہو جائے۔ تیسری یہ کہ مجھے

اپنے ذہن کو وسعت دینے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ علمی سفر کرنا بلکہ تفریح سفر کرنا بھی اس مقصد میں مفید ہو سکتا ہے۔ اس لئے جب بھی موقع ملے مجھے سفر اختیار کرنا چاہیے' کیونکہ نئے مقامات کا سفر انسان کے ذہن میں بڑی وسعت پیدا کرتا ہے۔

چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب سے میری پہلی ملاقات اکتوبر 1946ء میں ہوئی۔ میں اعلیٰ تعلیم کی خاطر کیمبرج یونیورسٹی داخل ہونے کے لئے بحری جہاز سے برطانیہ پہنچا تھا۔ ہمارا جہاز پی اینڈ او فرانکونیا لیورپول کی بندرگاہ میں لنگرانداز ہوا تھا۔ وہ سرد اور کہرآلود صبح تھی۔ چوہدری صاحب اپنے بھانجے (سہواً بھانجہ لکھا گیا ہے' چودھری صاحب کے چھوٹے بھائی اس جہاز سے انگلستان گئے تھے--- مرتب) کو لینے کے لئے لیورپول تشریف لائے ہوئے تھے' جو اُسی جہاز سے سفر کر کے وہاں پہنچے تھے' چوہدری صاحب اُس وقت سپریم کورٹ آف انڈیا کے جج تھے۔ جب ہم جہاز سے اترے تو میرا بھاری بھرکم صندوق جس میں میں نے اپنی ریاضی اور فزکس کی کتابیں ٹھونس رکھی تھیں' کسٹم کے برآمدے میں پڑا تھا۔ جنگ کے بعد کے حالات کی وجہ سے وہاں قلی زیادہ نہ تھے۔ چوہدری صاحب نے مجھ سے کہا: "ایک طرف سے آپ صندوق کو پکڑلیں دوسری طرف سے میں پکڑلیتا ہوں' اس طرح ہم صندوق کو ریل گاڑی تک لے جاتے ہیں۔"

ایک عام طالب علم کے لئے یہ کیسی آؤ بھگت تھی وہ کسی اعلیٰ مرتبت شخصیت کی طرف سے اتنے انکسار کے سلوک سے کبھی دوچار نہیں ہوا تھا۔

ہم نے لندن تک اکٹھے سفر کیا۔ سفر کے دوران وہ انگلستان کے دیہات کی خوب صورتی کے بارے میں بتاتے رہے کیونکہ وہ خود اس کے بے پناہ مداح تھے۔ موسم بہت سرد تھا۔ مجھے کانپتا دیکھ کر آپ نے اپنا ایک بھاری اورکوٹ مجھے دے دیا۔ چالیس برس گزر جانے کے باوجود یہ کوٹ ہمارے ہاں موجود ہے۔

پھر میری ان سے ملاقات 1951ء میں ہوئی' وہ اس وقت پاکستان کے وزیر خارجہ تھے اور وہ پرنسٹن انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ سٹڈی میں جہاں میں فیلو تھا تشریف لائے تھے۔ میں نے دو دن ان کی صحبت میں بسر کئے۔ آپ اُس وقت اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ مجھے آپ کی رفاقت اور معیت میں امریکہ کے مشرقی ساحل کے خوبصورت تاریخی مقامات کی سیاحت کا موقعہ ملا۔ آپ اقوام متحدہ کے فورم پر اپنے ذہین و فطین مخالفین سے کشمیر' لبیا' تیونس' الجیریا' مراکو اور فلسطینی عربوں کے مفادات کے تحفظ کی "جنگ" سے ابھی ابھی فارغ ہوئے تھے۔ ان کے بارے میں میں نے یہ تاثر لیا تھا کہ وہ کسی احمقانا بات یا رویہ کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

میری ان سے اصل شناسائی 1973ء میں شروع ہوئی' جب آپ بین الاقوامی عدالت انصاف کے صدر کے عہدہ سے ریٹائر ہو کر لندن مسجد میں قیام فرما ہوئے۔ میں جب کبھی لندن میں ہوتا آپ ازراہ شفقت ہماری ناشتہ کی دعوت ضرور قبول فرماتے اور ہمارے ہاں کیمپین روڈ (Campion Road) پر

تشریف لاتے جو ان کی رہائش گاہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم انہیں ناشتہ ہی کے لئے تکلیف دے سکتے تھے کیونکہ اُس زمانہ میں آپ ہر روز اتوار سمیت پورے نو بجے کام شروع کر دیتے تھے۔ اس لئے ان کے کام میں مخل ہونا مناسب نہیں تھا۔ آپ اُن دنوں قرآن پاک یا احادیث کی کتب کا ترجمہ کر رہے تھے۔ ناشتہ کی یہ صحبتیں یادگار رہیں گی کیونکہ ہم ان کی سیاسی زندگی کے کئی واقعات اُن کی زبان سے سن سن کر لطف اندواز ہوئے۔ وہی واقعات جنہیں آپ نے اپنی سوانح عمری ''سرونٹ آف گاڈ'' میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ اس کتاب میں بعض ایسی تفاصیل موجود ہیں جو آپ مزے لے لے کر بیان کیا کرتے تھے۔ مثلاً آپ نے اس کتاب کے صفحہ 67۔69 پر مسٹر چرچل کے ساتھ اپنے مجادلہ کا ذکر کیا ہے۔ مگر اُس میں سے وہ حصہ حذف کر دیا ہے جو انڈین پارٹی کے سردار بوٹا سنگھ کی جرح سے تعلق رکھتا ہے۔ اور یہ جرح بڑی دلچسپ ہے۔ بایں ہمہ میں ان کے لطف بیان کے نمونہ کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جو انہوں نے خود سنایا تھا: ''مشترکہ کمیٹی کا اجلاس 1933ء کے موسم بہار میں شروع ہوا۔ کمیٹی نے مختلف گواہوں کے خیالات کا جائزہ لیتے ہوئے ان پر جرح کی۔ گواہوں میں ہندوستانی اور برطانوی باشندے شامل تھے۔ کمیٹی کی کارروائی میں حصہ لینا میرے لئے سبق آموز تھا۔ اس کمیٹی کے روبرو جو گواہ پیش ہوئے' ان میں سب سے ممتاز آنجہانی سرونسٹن چرچل تھے' جن پر متواتر چار روز جرح کی گئی۔ انہوں نے قرطاس ابیض میں دی گئی تمام تجاویز کی مخالفت کی تھی۔ ان کے خیال میں برطانیہ نے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ ان پر کئے گئے سوالات کی بوچھاڑ انہیں ان کے موقف سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہ کر سکی۔ اُن کی آنکھوں میں ایک چمک تھی اور وہ مسکرا کر اپنا سگار لہراتے تھے۔ وہ شائستگی اور خوش خلقی کا ایک نمونہ تھے۔ لیکن وہ کسی بات کو تسلیم نہیں کرتے تھے' جس کی وجہ سے سوالات کرنے والوں کو ان سے کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ تمام ماحول ان کی گرفت میں تھا۔

تمام دن کی کارروائی دیکھتے ہوئے پنجاب کے مسلم وفد کے رکن (جو خود چوہدری صاحب تھے-- مرتب) نے محسوس کیا کہ مسٹر چرچل جیسے آزمودہ کار حریف پر جرح کرنے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ دوسرے روز کمیٹی کے اجلاس کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے وزیر ہند نے پنجاب کے مسلم وفد کے نمائندہ سے دریافت کیا: ''کیا آپ مسٹر چرچل سے کوئی سوال پوچھنا پسند کریں گے۔''

''نہیں جناب۔'' نمائندہ نے جواب دیتے ہوئے کہا: ''یہ ایک بے فائدہ بات ہوگی۔'' یہ جواب سن کر وزیر ہند نے کہا: ''وہ ہمارا سب سے زیادہ بحث مباحثہ کرنے والا ہے۔ وہ اپنی سابقہ تقریروں میں ہندوستان کو نو آبادیات کا درجہ دیئے جانے کی حمایت کر چکا ہے۔ لیکن جب انہیں ان کے سابقہ بیانات یاد دلائے جاتے تو وہ فرماتے: ''نو آبادیات کا تو میں اب بھی قائل ہوں لیکن یہ درجہ تو ہندوستان حاصل کر چکا ہے۔ ہندوستان نے پیرس امن کانفرنس میں اپنا نمائندہ بھجوایا تھا۔ اُس نے معاہدہ ورسلیز پر دستخط بھی کئے تھے اور وہ لیگ آف نیشن کا رکن بھی ہے یہ نو آبادیات کا درجہ ہی تو ہے لیکن درجہ اور بات ہے اور نو آبادی

کے اختیارات اور بات جس کے لئے ہندوستان ابھی تیار نہیں۔" وزیر ہند نے مزید کہا کہ "وہ سمجھتا ہے ہندوستان آج بھی ویسا ہے جب وہ بنگلور میں بحیثیت سب لفٹیننٹ خدمات سرانجام دے رہا تھا۔"

وزیر ہند کی مسٹر چرچل پر جرح کرنے کی تجویز پر پنجاب کے مسلم وفد کے نمائندہ نے غور کرنے کے بعد ان پر جرح کرنے کا فیصلہ کیا۔ کمیٹی کے دوپہر کے اجلاس کی کارروائی ختم ہونے سے۔ ایک گھنٹہ قبل پنجاب کے مسلم وفد کے نمائندہ کی جرح کرنے کی باری آئی۔ ان کی جرح کا لب و لہجہ مئودبانہ تھا' جس میں مسٹر چرچل کا پورا احترام ملحوظ رکھا گیا۔ وہ میرے سوالات سے قدرے محتاط ہو گئے اور ان سے پہلو تہی کرتے ہوئے "اگر" "بشرطیکہ" "لیکن" وغیرہ الفاظ کا سہارہ لینے لگے۔ انہیں جب اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ وہ "بازی" ہار رہے ہیں تو انہوں نے میرے سوالات کو ٹالتے ہوئے لیت و لعل شروع کر دی۔ اس کے نتیجے میں مجھے اپنے سوال احتیاط سے واضح کرنا پڑتے تھے۔ ایک سوال کو جب وہ دوبار ٹال چکے تو میں نے نہایت خواشگوار نرم لہجے میں کہا: "مسٹر چرچل مجھے یہ مشکل پیش ہے کہ انگریزی میری مادری زبان نہیں اور باوجود کوشش کرنے کے میں اپنا مطلب آپ پر واضح نہیں کر سکا۔ اگر آپ اجازت دیں تو پھر کوشش کروں۔" انہوں نے کمال مہربانی سے فرمایا: "ہاں ہاں کیوں نہیں۔" میں نے وہی سوال تیسری بار پوچھا لیکن اس مرتبہ اسے ایسا واضح کیا کہ ان کے پاس پہلو تہی کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے بعد میں نے اور انہوں نے بہت محتاط رویہ اختیار کیا۔ اس روز ان پر میری جرح ایک گھنٹہ جاری رہی کہ کمیٹی کا اجلاس دوسرے دن پر ملتوی ہو گیا۔ اگلے روز بھی میں نے ان پر گھنٹہ بھر جرح کی جسے ختم کرتے ہوئے میں نے معزز گواہ کا شکریہ ادا کیا۔ تو انہوں نے کمال فیاضی سے فرمایا: "لارڈ چیئر مین! میں نے تو محسوس نہیں کیا' مسٹر ظفر اللہ خان کو انگریزی ان کی مادری زبان نہ ہونے کی وجہ سے کوئی مشکل پیش آئی ہو۔"

جب چوتھے روز ان پر جرح مکمل ہو گئی تو کمیٹی کے تمام اراکین نے دیر تک تالیاں بجا کر انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ مسٹر چرچل اٹھ کر مسلم جرح کرنے والے (چوہدری ظفر اللہ خان---- مترجم) کے پاس تشریف لے گئے' اُن سے مصافحہ کیا اور مسکراتے ہوئے کہا:

"You had given me two most difficult hours before the committee."

ترجمہ: (اس کمیٹی کے روبرو تم نے دو گھنٹے میرا ناک میں دم کیئے رکھا۔)

جرح کرنے والے کے لئے یہ عزت افزائی کے کلمات تھے۔ جنہیں دوستی کی علامت سمجھا گیا اور یہ ایسا ہی ہوا کیونکہ عظیم وزیر اعظم اپنے خطوط اور تقاریر کی کاپیاں انہیں بھجواتے ہوئے ان پر اپنے ہاتھ سے لکھتے: "ظفر اللہ خاں کے لئے کبھی وہ لکھتے۔" ڈبلیو ایس چرچل کی طرف سے ظفر اللہ خان کے لئے" کبھی تحریر کرتے "میرے دوست ظفر اللہ کے لئے' ڈبلیو ایس چرچل" اور کبھی لکھتے "میرے دوست ظفر اللہ کے لئے ڈبلیو ایس چرچل" عظیم وزیر اعظم کی یہ عالی ظرفی ان کی سیرت کا نمونہ تھی۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ چوہدری محمد ظفر اللہ خان کی یادداشت بے پناہ تھی۔ نہ صرف لوگ بلکہ پچاس ساٹھ برس پہلے کے واقعات کی تاریخیں اور وقت بھی انہیں یاد تھے۔ آپ نے اقوام متحدہ کے اجلاسوں میں لیبیا، مراکش، تیونس اور الجیریا کی آزادی کے لئے بڑی طاقتوں کے نمائندوں سے جو جنگیں لڑیں ان کا بیان میرے ذہن پر ابھی تک نقش ہے۔ (یہ باتیں "سرونٹ آف گاڈ" کے صفحہ 179۔182 پر درج ہیں) اسی طرح ان کے "سفرحج" کی دل گداز داستان جب وہ شاہ فیصل کے ذاتی مہمان کی حیثیت سے تشریف لے گئے۔ (یہ داستان بھی صفحہ 279۔286 پر موجود ہے) زندگی کے ان واقعات کو بیان کرتے تو ان کی روحانی عظمت کا اور ان کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبت کا اندازہ ہوتا۔ اس کے علاوہ ان کے خدا اور خدا کی رضا پر پختہ ایمان کا بھی پتہ چلتا تھا۔ ان باتوں کے علاوہ فارسی شاعری سے ان کی رغبت عیاں ہوتی، وہ حافظ اور خاص طور سے رومی کی صوفیانہ شاعری کے بہت مداح تھے اور اس کے دیوان شمس تبریز سے اشعار زبانی سناتے چلے جاتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی محبت کے بارے میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ چوہدری محمد ظفر اللہ خان کمر درد کی وجہ سے وانڈ سورتھ (لندن میں پٹنی کے قریب--- مترجم) کے ہسپتال میں پابند بستر تھے۔ میں عیادت کے لئے حاضر ہوا۔ میں آپ کے لئے "شمائل ترمذی" لے کر گیا تھا۔ اس میں امام ترمذی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روزمرہ زندگی، ان کی شکل مبارک، ان کے لباس ان کی عائلی اور معاشرتی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ انشاء اللہ العزیز میں اس کتاب کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں نے وہ کتاب ان کے پاس چھوڑ دی اور ٹریسٹ (اٹلی) چلا گیا۔ چند مہینوں کے بعد میں ان سے ملنے کے لئے ان کے دولت خانہ پر حاضر ہوا تو آپ نے ترمذی کا مکمل ترجمہ چھپی ہوئی کتاب کی صورت میں مجھے دیا۔ آپ نے ازراہ کرم یہ کتاب میرے نام معنون کی تھی۔ میں ان کے رفتار کار سے حیران ہوا۔ میں نے ذرا سا احتجاج کیا کہ میں تو اس کتاب کو اپنی مغفرت کا وسیلہ بنانا چاہتا تھا، آپ نے جواب دیا: "مستقبل قریب میں شاید تمہیں اس کام کی فرصت نہ ملتی، میں نے سوچا کہ ہسپتال میں پابند بستر ہونے کا اس سے بہتر اور مفید مصرف کیا ہو سکتا ہے۔"

آپ کے ساتھ مجھے آخری بار سفر کرنے کا موقع 1980ء میں ملا، جب آپ سلطنت مراکش کی اکیڈمی کے مستقل سیکرٹری کی جانب سے اکیڈمی کے افتتاحی اجلاس کے لئے مدعو تھے۔ ڈاکٹر احمد طیبی بن ہیما انہیں ان کو اقوام متحدہ کے زمانے سے جانتے تھے۔ چوہدری صاحب اس وقت ستاسی برس کے تھے، مگر سیدھے، بارعب اور مشفق! میری نگاہوں میں وہ نظارہ ابھی بھی مستحفر ہے۔ جب آپ ہز میجسٹی شاہ حسن کے ساتھ سرکاری دعوت پر تشریف فرما تھے۔ میں نے فض (Fez) کی گلیوں میں طلباء اور سپاہیوں کو بھی انہیں خراج تحسین پیش کرتے دیکھا۔ ان لوگوں نے بھی انہیں خراج تحسین پیش کیا، جنہوں نے آپ کا ذکر سنا اور جنہیں مراکش کی آزادی کے لئے آپ کی مساعی جمیلہ کا علم تھا۔

آپ ضرورت مندوں کے لئے انتہا کے سخی تھے۔ اس بات کا بہتوں کو علم نہیں ہو گا کہ آپ نے ریٹائر ہونے کے بعد اپنی زندگی بھر کی بچت خیراتی مقصد کے لئے وقف کر دی تھی۔ اس کا معتدبہ حصہ لندن مسجد کے ساتھ امام کی رہائش دفتر اور محمود ہال کی تعمیر میں صرف ہوا۔ (مگر آپ نے ان عمارات پر کوئی یادگاری تختی لگوانا پسند نہ فرمایا) باقی رقم جو تقریباً پانچ لاکھ پونڈ بنتی تھی' سے آپ نے ایک خیراتی فاؤنڈیشن (ساؤتھ فیلڈ ٹرسٹ) بنائی تاکہ تعلیمی لحاظ سے ضرورت مند لوگوں کی مدد کی جا سکے۔

ایک بار آپ ناشتہ کے لئے میرے ہاں تشریف لائے تو میرے بھائی نے احتجاج کیا کہ آپ عموماً اپنی ذاتی ضروریات کو نظرانداز کر جاتے ہیں۔ چوہدری صاحب نے بتایا کہ آپ نے اپنی سالانہ پنشن (جو تقریباً بتیس ہزار ڈالر سالانہ بنتی ہے) کے بارے میں کہا ہوا ہے کہ وہ سیدھی ان کی قائم کردہ فاؤنڈیشن کے بنک اکاؤنٹ میں بھیج دی جایا کرے۔ اس لئے پنشن کا کوئی حصہ انہوں نے اپنے لئے نہیں رکھا۔ فاؤنڈیشن کے ساتھ ان کا معاہدہ ہے کہ وہ روزمرہ کی ضروریات کے لئے سات پاؤنڈ فی ہفتہ انہیں ادا کیا کریں گے اور سال میں ایک بار جلسہ سالانہ (جماعت احمدیہ کا جلسہ سالانہ ربوہ--- مترجم) پر پاکستان جانے کے لئے ہوائی جہاز کا ''اکانومی کلاس'' کا کرایہ دیا کریں گے۔'' اس کے بعد آپ نے فرمایا:

''میں اللہ کے فضل سے ایک اچھا وکیل ہوں۔ مگر ایک عدالتی کیس میں میں ہمیشہ ناکام رہا ہوں' یعنی میں جب بھی اپنے آپ سے اپنی ذات کا کیس لڑتا ہوں تو منہ کی کھاتا ہوں۔''

آپ کو اسلام سے انتہا کی شیفتگی اور غیرت تھی۔ ان کے پاس بیٹھنے والے ان سے روحانی طور پر سرشار ہو کر اٹھتے تھے۔ یہ بات تو ہر کسی کے علم میں ہے کہ آپ کی زندگی کے آخری ایام قرآن پاک کے ترجمہ اور اس کا افتتاحیہ لکھنے میں صرف ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح حیات محمد ''خاتم النبین'' جو روالیج اینڈ کیگن پال لمیٹڈ لندن نے شائع کی ہے۔ انگریزی زبان میں ایک شخص کی لکھی ہوئی ایک نظری لائبریری کا حکم رکھتی ہے۔ آپ نے بتایا کہ ''انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس'' میں مزید ایک ٹرم تک اپنی ملازمت جاری رکھ سکتے تھے مگر آپ نے ملازمت کو اللہ کی خدمت کرنے کے لئے ترک کر دیا۔

آپ نے خود ایک جگہ فرمایا ہے:

''وقت گزرنے کے ساتھ رفتہ رفتہ اللہ کا ادراک محض عقیدہ کی بات نہیں رہتا ایک پختہ تجربہ شدہ حقیقت بن جاتا ہے۔''

اپنی مرحومہ والدہ سے انہیں بے پناہ محبت تھی۔ آپ ان کی نصیحتوں اور حکمتوں کا اکثر ذکر کرتے رہتے تھے۔ اپنی کتاب کے صفحہ 297 پر آپ نے لکھا ہے کہ وہ فرمایا کرتی تھیں: ''اپنی پسند کے لوگوں سے مہربانی کا سلوک کرنا کوئی نیکی نہیں۔ نیکی تو یہ ہے کہ ہم ان سے حسن سلوک کریں جنہیں ہم ناپسند کرتے ہیں۔'' پھر ''دوستی وہ ہے جو دوامی ہو اگر دوستی میں دوام نہیں تو وہ کوئی دوستی نہیں۔'' ایسی دوستی کی ایک نشانی یہ تھی (اور کیا خوب نشانی تھی) کہ آپ کسی کو تہجد کی نماز میں اپنی دعاؤں میں شامل کر لیں۔ آپ

نے بتایا کہ وہ ہر تہجد میں تین سو آدمیوں کے لئے نام بنام دعائیں کرتے ہیں۔ آپ جس دعا کو ورد زبان رکھتے تھے وہ یہ تھی: "اپنے مولا کا کہا یاد کرو' جس نے کہا تھا کہ میں تم پر نعمتیں نچھاور کروں گا اور ان کو بڑھاتا چلا جاؤں گا' مگر تم ان سے ناجائز فائدہ اٹھاؤ گے یا ان کو نظرانداز کرو گے تو میرا عذاب بھی سخت ہوتا ہے۔" 14:8

میں اس مضون کو ان کی کتاب کے اختتامی الفاظ نقل کر کے ختم کرتا ہوں۔ (یہ کتاب شروع سے آخر تک آپ نے صیغہ غائب میں لکھی ہے' اس لئے اس کا لہجہ ذرا اجنبی لگے گا) بہرحال فرماتے ہیں:

"انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کی دوسری ٹرم ختم ہونے کے بعد اس کا عوامی خدمت کا دور اختتام کو پہنچا' وہ "بار" (Bar) میں پہلی بار بلایا گیا تو اس کی عمر اکیس برس تھی' اس نے وکیل کی حیثیت سے اکیس برس وکالت کی۔ چودہ برس تک پاکستان انڈیا میں بلند انتظامی مناصب پر فائز رہا۔ اکیس (21) برس ہی وہ انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس میں جج کے عہدہ پر رہا اور تین برس سفارت کار بھی رہا۔ اسے بہت مناصب نصیب ہوئے۔

مگر ان میں سے سب سے زیادہ معزز اور عظیم منصب وہ ہے جس پر وہ اب فائز ہے۔ یعنی وہ اب خدا کا خدمت گزار ہے اور یہی اس کے لئے بس ہے۔ الحمدللہ۔

اس کی بس ایک ہی تمنا ہے کہ اس کا مالک اس سے راضی رہے اور اپنے فضل سے اپنی اور اپنی مخلوق کی خدمت کے بیش از بیش مواقع دیتا چلا جائے اور اسے مناسب حال قوت اور قابلیت بھی عطا کرتا چلا جائے۔ تاکہ اس کی سعی مشکور ہوتی رہے۔ اس نے جو کچھ اس کی خدمت کے لئے وقف کیا ہے وہ اس کا اپنا تو نہیں تھا۔ اس کی زندگی' اس کی طاقتیں' اس کی خوبیاں' اس کے وسائل' اس کے تعلقات اور اس کی اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے دوست سب اسی کے عطا کئے ہوئے تھے۔ اس کی ایک ہی درخواست ہے کہ وہ اپنی ذہانت و قوت کی تمام تر خوبیوں کو اس کی رضا کے حصول میں وقف کرنے کے قابل ہو جائے اور اس کی مخلوق کی صحیح خدمت کرنے کے قابل ہو سکے۔ اپنے لئے اسے اپنے خالق اور مالک کل کی رضا کے کسی اور چیز کی خواہش نہیں' وہ اس سے بخشش اور رحم اور اس کے تحمل کا طلب گار رہے۔ اے کاش وہ اس کی غلطیوں' کوتاہیوں اور گناہوں اور نالائقیوں کو اپنے رحم سے معاف کرتا جائے اور یہاں اور آخرت میں اسے ذلت سے بچائے۔ اے کاش وہ اسے تمام آلودگیوں سے پاک کر دے تاکہ جب اس کے اذن سے موت وارد ہو تو وہ خیال سے حقیقت تک کا سفر ثابت ہو اور غایت تسلیم و رضا بن کر وارد ہو' آمین۔

(ترجمہ: "پرویز پروازی" ہفت روزہ لاہور' 29 مارچ 1997ء)

نوٹ: بھائی جان نے اپنے اس مضمون کے شروع میں سردار بوٹا سنگھ کی مسٹر چرچل پر جرح کا ذکر کیا ہے۔ اُسے چوہدری محمد ظفراللہ خان کی سوانح عمری "تحدیث نعمت" سے قارئین کی دلچسپی کے لئے درج ذیل کیا جاتا ہے:

"سہ پہر کے اجلاس میں مسٹر چرچل پر سوالات کرنے کے لئے سردار بوٹا سنگھ ورک کی باری آگئی' وہ شیخوپورہ کے ایک وکیل تھے جو پنجاب کونسل کے نائب صدر تھے اور مشترکہ کمیٹی میں سکھوں کے نمائندہ تھے۔ انہیں مسٹر چرچل پر جرح کرنے کا بڑا شوق تھا۔ ان کی نشست میرے دائیں ہاتھ تھی' وہ بہت خوب شخص تھا لیکن نامانوس ماحول میں تھے۔ انگریزی بالکل پنجابی لہجہ میں بولتے تھے لیکن بلند حوصلہ اور باہمت تھے۔ جب چیئرمین نے ان کا نام پکارا تو فوراً اپنے کاغذات سنبھالے' عینک چڑھائی اور بڑے مشفقانہ لہجے میں مسٹر چرچل کو مخاطب کرکے کہا: "میں آپ سے کچھ سوال پوچھنا چاہتا ہوں؟" مسٹر چرچل نے اپنا سگار ہلا کر مسکراتے ہوئے کہا: "شوق سے' شوق سے۔" سردار صاحب نے پوچھا: "مسٹر چرچل آپ نے کہا ہے (آہستہ آواز میں مجھ سے پنجابی میں دریافت کیا' بھائی کیا کہا تھا اس نے Mob؟ میں نے کہا نہیں Masses) ہاں ہاں آپ نے کہا ہے Masses یعنی عوام کو ان مسائل میں کوئی دلچسپی نہیں! کیا یہ ٹھیک ہے۔" مسٹر چرچل نے کہا ٹھیک ہے! ہندوستانی عوام کو ان مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں۔" سردار صاحب نے پوچھا: "اچھا تو پھر بھلا آپ کیا کہیں گے اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ میں Masses (عوام) ہوں۔" مسٹر چرچل نے مسکرا کر جواب دیا: "I Would Congratulate the Masses"

(میں عوام کو مبارک باد کہوں گا) اچھا ہوا کہ سردار صاحب اور مسٹر چرچل کے درمیان ایسے لطائف کا سلسلہ کوئی بیس منٹ جاری رہا۔ اس سے کمیٹی کی کارروائی کی انتہائی سنجیدگی کچھ ہلکی ہو گئی۔ جب میری باری آئی تو مسٹر چرچل نے سوچا ہو گا کہ ایک داڑھی والے نے مضحکہ خیزی کا مظاہرہ کر لیا' اب دیکھیں دوسرا داڑھی والا کیا گل کھلاتا ہے۔ اتفاق سے ہم تھے بھی دونوں پنجابی جاٹ"

("تحدیث نعمت" صفحہ 326۔ 327)

ایک مرتبہ جب چوہدری محمد ظفر اللہ خان ناشتہ کے لئے بھائی جان کے گھر تشریف لائے تو بھائی جان نے اپنے بڑے بیٹے عزیزم احمد سلام کے بارے میں شکایت کے رنگ میں چوہدری صاحب سے بات کرتے ہوئے کہا کہ "یہ دیکھیں چوہدری صاحب میں عزیزم احمد سلام کو کہتا ہوں کہ وہ فزکس اور حساب کے مضامین پڑھے لیکن یہ اکنامکس میں دلچسپی رکھتا ہے۔" مکرم چوہدری صاحب نے بھائی جان کی بات سننے کے بعد فرمایا: "ڈاکٹر صاحب اگر دنیا کے سارے طالب علم سائنس دان بن جائیں تو دنیا تو ختم ہو جائے گی۔ آپ عزیزم احمد اسلام کو اکنامکس پڑھنے دیں' اگر اللہ نے چاہا تو اسی میں چمکے گا۔ آپ اس کے لئے دعائیں کرتے رہیں۔ والدین کی دعائیں تیر کی طرح سیدھی نشانہ پر لگتی ہیں۔ (عزیز احمد سلام نے ایم اے اکنامکس میں شاندار کامیابی حاصل کی --- مرتب)

23

مراکش کے شاہ حسن ثانی کا بھائی جان کو خراج تحسین

’’مملکت مراکش کے شہنشاہ شاہ حسن ثانی نے بھائی جان کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ طبعیات اور ریاضی کے میدان میں آپ کی شاندار کامیابیوں سے آپ کے اور آپ کے اسلامی ملک کی شہرت کو چار چاند لگ گئے ہیں اور اسلامی تہذیب و فکر جگمگا اٹھے ہیں۔‘‘

شاہ مراکش نے یہ شاندار خراج تحسین اُس شاہی فرمان میں پیش کیا جو اُن کے دستخطوں سے 10 مارچ 1980ء کو جاری کیا گیا۔ جس کی رو سے بھائی جان پروفیسر عبدالسلام کو مملکت مراکش کی اکیڈمی کا ایسوسی ایٹ رکن بنایا گیا تھا۔ یہ اکیڈمی ساٹھ اراکین پر مشتمل ہے۔ جس میں سے تیس افراد مراکش کے باشندے اور بقیہ تیس افراد نمایاں شہرت کے حامل غیر ملکی ہوتے ہیں۔ اس اکیڈمی کا مقصد ملک میں سائنس اور فن کو ترقی دینے اور اس کے ذریعے سے انسانیت کے اعلیٰ ترین نظریات کا حصول ہے۔ اس اکیڈمی کے سرپرست شاہ موصوف بنفس نفیس ہیں۔

بھائی جان کو مراکش بلایا گیا تھا‘ جہاں شاہ مراکش نے ان سے ملاقات کی تھی۔ اکیڈمی کے افتتاحی اجلاس میں شمولیت کے لئے حضرت چوہدری محمد ظفراللہ خان کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ جب وہ پاکستان کے وزیر خارجہ تھے تو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی کارروائیوں میں انہوں نے شمالی افریقہ کے چار ممالک مراکش‘ تیونس‘ الجزائر اور لیبیا کی آزادی کے لئے مسلسل جدوجہد کی تھی اور حصول آزادی کے لئے ان ممالک کے نمائندوں کی رہنمائی کرتے رہے۔ اس گہری ہمدردی اور اخوت کے عملی نمونہ کا ان ممالک پر گہرا اثر تھا۔ (سوڈان اور سومالیہ کی آزادی کے لئے بھی چوہدری محمد ظفراللہ خان نے گراں قدر کام کیا تھا) اسی وجہ سے مراکش کے شاہ حسن اول سے ان کے گہرے مراسم پیدا ہو گئے تھے‘ یہی وجہ تھی کہ شاہ حسن ثانی اپنے باپ کی طرح ان کی عزت کرتے تھے۔ چوہدری محمد ظفراللہ خان اور بھائی جان نے مراکش کا سفر ایک ساتھ کیا تھا۔ چوہدری صاحب کی عمر اس وقت ستاسی برس تھی۔

بھائی جان نے چوہدری محمد ظفراللہ خان کی وفات کے بعد ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان ’’چوہدری محمد ظفراللہ خان کی خدمت میں نذرانہ عقیدت‘‘ تھا۔ یہ مضمون اس کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔ اس مضمون میں بھائی جان نے لکھا کہ ’’سرکاری دعوت میں شاہ حسن نے انہیں اپنے ساتھ بٹھایا تھا۔ میں نے فیض کی گلیوں میں طلباء اور سپاہیوں کو بھی انہیں خراج تحسین پیش کرتے دیکھا۔ ان لوگوں نے بھی انہیں

خراج تحسین پیش کیا جنہوں نے آپ کا ذکر سنا اور جنہیں مراکش کی آزادی کے لئے آپ کی مساعی جمیلہ کا علم تھا۔" مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب مراکش کو آزادی ملی تھی تو والدین نے اس سال (1951ء) پیدا ہونے والے بچوں کے نام "ظفر اللہ" رکھے تھے۔

شاہ مراکش کے شاہی فرمان کا عکس علیحدہ دیا جا رہا ہے۔ اس فرمان کا اردو ترجمہ جو روزنامہ الفضل ربوہ کی اشاعت مورخہ 29 جون 1980ء کو شائع ہوا تھا' درج ذیل ہے۔

مملکت مراکش کی اکیڈمی "اکادیمیه للملکه المعربیه" ایسوسی ایٹ رکن بنانے کے لئے جاری کئے گئے شاہ مراکش کے شاہی فرمان کا اردو ترجمہ:

الحمدلله وحده والصلوة والسلام علی رسول الله

ڈاکٹر احمد عبدالسلام!

ملحوظ رکھتے ہوئے جہد و عمل کے مختلف میدانوں میں مراکش کی حیات نو اور نشاۃ ثانیہ کو---

ملحوظ رکھتے ہوئے اس امر کو کہ مراکش کو اپنے جغرافیائی محل و وقوع کی وجہ سے ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ جس نے اقوام و محل کے لئے باہمی میل جول ایچ آر دلافی اور ایم ایچ اے حسن' جن کا تعلق ایران اور سوڈان سے ہے اور بھائی جان کے ساتھ ٹریسٹ میں کام کرتے ہیں نے ان کے مضامین کو ایک کتابی شکل دی ہے اور کتاب کا نام "محمد عبدالسلام' اسلامی ممالک میں سائنسز کا احیاء" ہے اس کتاب کے صفحات 42-341 پر لکھا ہے: "پروفیسر سلام کے والد چوہدری محمدؐ حسین نے اپنے بیٹے کی پیدائش سے پہلے ایک کشف میں ایک بچہ دیکھا انہیں اس کا نام عبدالسلام بتایا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عبدالسلام' پروفیسر سلام کے نام سے پہچاننے لگے۔ اہل عرب کے مروجہ رواج کے مطابق عبدالسلام بہت مختصر نام ہے۔ ان کی رائے میں ان کے نام سے پہلے اضافہ کیا جائے یا لاحقہ لگانا چاہیے' یعنی نام کے آخر میں اضافی نام لکھنا چاہیے۔ اسی لئے مملکت مراکش کے شاہی فرمان میں انہیں ڈاکٹر احمد عبدالسلام کے نام سے خطاب کیا گیا۔ (بھائی جان کے بڑے بیٹے کا نام احمد سلام ہے--- مرتب) 1981ء میں آپ جب کویت تشریف لے گئے تو وہاں انہیں عبدالسلام بن حسین کے نام سے یاد کیا گیا۔ بعد میں جب وہ دبئی میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے تو ان کی نشست پر "محمد عبدالسلام" کے نام کی تختی رکھی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گہری محبت' عشق اور عیقدت کے پیش نظر انہوں نے اسے پسند کیا اور پھر اسے اپنایا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ فزکس کے لٹریچر یا نوبل انعام کے ریکارڈ میں اپنا نام تبدیل نہیں کر سکتے' اسی لئے انہیں عبدالسلام' پروفیسر سلام' ابو احمد عبدالسلام' محمد عبدالسلام بن حسین کے نام سے پکارا جاتا ہے۔) یا اتصال وار تباط کی سرزمین بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور جو صدیوں سے ایک ایسے پل کا کام دے رہی ہے جسے عبور کر کے عرب مسلم تہذیب نے دور دور تک اثر و نفوذ حاصل کیا اور جس نے خود دوسری تہذیبوں اور بالخصوص مغربی تہذیب (کے اچھے پہلوؤں) کو خوش آمدید کہا اور اپنایا۔ ملحوظ رکھتے ہوئے اس امر کو کہ مراکش کی اس مخصوص حیثیت نے اسے اس قابل بنایا ہے کہ وہ ان روحانی اور اخلاقی اقدار کے دفاع کی ذمہ داری قبول کرے جو مختلف عقائد اور اظہار خیال کے مختلف طریقوں کی حامل اقوام کے درمیان مشترک ہیں۔

یقین رکھتے ہوئے اس بات پر کہ اپنی فلاحی پیش قدمی کی مساعی کے دوران اقوام عالم کی تعمیرو ترقی اور صحیح نشوونما میں ان روحانی اقدار کی اہمیت ظاہرو باہراور مسلم ہے۔

خواہش رکھتے ہوئے اس بات کی کہ تعلیم' ادب' تمدن' آرٹ اور اسی طرح سائنس' ٹیکنالوجی' اقتصادیات' حکمت عملی اور سیاسیات سے تعلق رکھنے والے جملہ میدانوں میں مطالعہ و تحقیق کی ارتقائی اور ترقی پذیر مساعی میں مراکش بھی ایک موثر کردار ادا کرے۔

احساس کرتے ہوئے اس امر کا کہ مختلف اقوام کے ثقافتی اور سائنسی شعبوں کی سربرآوردہ شخصیت کے مابین تبادلہ خیالات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

شعور رکھتے ہوئے اس بات کا کہ مراکش کے باشندوں اور ان اقوام و افراد کے درمیان' جن کے ساتھ ہم دوستی اور تعاون کے رشتوں میں منسلک ہیں۔ بہتر مفاہمت اور باہمی قدر شناسی کے لئے تخلیقی اور ثمر آور مساعی کو بروئے کار لانا ازبس ضروری ہے۔

اور محسوس کرتے ہوئے اس امر کو کہ بہت سی قومیں ان اقدار پر جو سب کے درمیان مشترک ہیں۔ اعتقاد رکھنے میں ہماری ہمنوا ہیں اور یہ کہ یہ وہ اقدار ہیں جو عالمگیر تہذیب اور انسانی ذہن کے علوء ارتقاع کا ایک عطیہ ہیں اور انسانیت کے اعلیٰ ترین نظریات کے حصول اور دنیا میں امن کے استحکام کی انتہائی شدید خواہش کی آئینہ دار ہیں-----

ہم نے مملکت مراکش کی اکیڈمی اکادیمیہ للملکہ المغربیہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ دستوری قانون مجریہ 24 شوال 1397ء ہجری (مطابق 8 اکتوبر 1977ء) کی رو سے اس اکیڈمی کو ہم نے اپنی اعلیٰ سرپرستی میں لیا ہے اور اس دستوری قانون میں اکیڈمی کے مقاصد کی وضاحت کے علاوہ اس کی تشکیل اور ڈھانچہ کو واضح کیا گیا ہے اور اس کی رکنیت کے قواعد متعین کئے گئے ہیں۔

دستوری قانون کی دفعہ 4 میں مذکور ہے کہ اکیڈمی مجموعی طور پر ساٹھ اراکین پر مشتمل ہوگی۔ ان میں سے تیس اراکین خود مملکت مراکش میں رہائش پذیر اس کے اپنے شہری ہوں گے اور تیس اراکین غیر ملکی شہریت رکھنے والے اراکین ہوں گے۔ جن کی حیثیت شریک کار اہم مرتبہ اراکین (ایسوسی ایٹ ممبر) کی ہوگی۔

چنانچہ مد نظر رکھتے ہوئے آپ کی غیر معمولی انسانی صلاحیتوں کو اور خود اپنے ملک میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں آپ کی جلیل القدر شہرت کو اور ملحوظ رکھتے ہوئے طبعیات اور ریاضی کے شعبوں میں آپ کے بے مثال کام کو جو بلند پایہ سائنسی تحقیق کے میدان میں پے درپے کامیابیوں پر منتج ہوا ہے اور جس سے آپ کی ذات اور آپ کے اسلامی ملک کی شہرت کو چار چاند لگ گئے ہیں اور جن سے اسلامی تہذیب و فکر جگمگا اٹھے ہیں--- اور مد نظر رکھتے ہوئے سائنسی ترقی اور نتیجتہ" انسانیت کے علوء ارتقاع کے ضمن میں آپ کے کارناموں کو جن کی گراں قدر افادیت کا نوبل انعام کی شکل میں عالمی سطح پر اعتراف کیا گیا ہے

اور ایک ایسی عزت آپ کو ملی ہے جو بلاشبہ آپ ایسی بلند پایہ ہستیوں ہی کے حصہ میں آسکتی ہے۔
الغرض آپ کی ان جملہ صلاحیتوں اور کارناموں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمارے مقررہ کردہ کمیشن نے دستوری قانون کی دفع 42 کی رو سے آپ کے نام نامی کو مملکت مراکش کی اکیڈمی میں ایک شریک کار ہم مرتبہ رکن (ایسوسی ایٹ ممبر) کی حیثیت سے شامل کرنے کی غرض سے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔
لہٰذا ہم آپ کی نمایاں طور پر ممتاز شخصیت اور اپنے ملک اور عالم انسانیت کے لئے آپ کے گراں قدر کام کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کمال درجہ مسرت کے ساتھ مملکت مراکش کی اکیڈمی میں آپ کی نامزدگی کی منظوری دیتے ہیں۔
آخر میں ہمیں یقین کامل ہے کہ اکیڈمی میں آپ کی شمولیت آپ کے اپنے ملک اور مملکت مراکش کے درمیان دوستی اور تعاون کے رشتوں کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں ایک طاقتور محرک ثابت ہوگی۔
مراکش کے شاہی محل سے جاری کیا گیا۔

22 ربیع الثانی 1400 ہجری بمطابق 10 مارچ 1980ء)

(دستخط)

حسن ثانی شاہ مراکش"

24

پاکستان کی ایک اور بد قسمتی

1960ء سے بھائی جان انٹرنیشنل ایٹمی توانائی ایجنسی جو اقوام متحدہ کا ایک ادارہ ہے کو اس بات کے لیے آمادہ کر رہے تھے کہ وہ نظریاتی طبیعات (Theoratical Physcis) میں تحقیق کے لیے ایک بین الاقوامی مرکز قائم کرے جس سے نہ صرف ترقی پذیر ممالک بلکہ ترقی یافتہ ممالک کے سائنس دان بھی استفادہ کر سکیں۔ چنانچہ ان کی یہ کوشش 1964ء میں کامیابی سے ہم کنار ہوئی اور آئی اے ای اے نے ایسا بین الاقوامی مرکز قائم کرنے کی منظور دے دی۔

بھائی جان کی خواہش تھی کہ یہ مرکز پاکستان میں قائم کیا جائے۔ چنانچہ فورا" پاکستان آئے اور صدر محمد ایوب خان سے اس بارے میں بات کی۔ لیکن ان کے وزیر خزانہ محمد شعیب نے اس کی مخالفت کی۔ اس طرح پاکستان ایک اعلیٰ معیار کے مرکز سے محروم کر دیا گیا۔ یہ پاکستان کے لیے بہت بڑا المیہ اور ایک بد قسمتی تھی۔

ایک اور بد قسمتی

1986ء میں ایک بار پھر پاکستان کو دنیا میں اپنا وقار بلند کرنے کا ایک نادر موقعہ ملا لیکن جماعت احمدیہ کی مخالفت اور مذہبی تنگ نظری اس وقار کو حاصل کرنے میں آڑے آئی اور وطن عزیز ایک مرتبہ پھر بد قسمتی کا شکار ہوا۔ اس واقعہ کی تفصیل کچھ یوں ہے:

اقوام متحدہ کے ادارہ یونیسکو (UNESCO) جس کا ہیڈ کوارٹر فرانس کے شہر پیرس میں ہے' کا ڈائریکٹر جنرل احمد مہاتر ایم۔ باؤ جو سینیگال کا باشندہ تھا' ستمبر 1986ء میں ریٹائرڈ ہو رہا تھا۔ اس کی جگہ نئے ڈائریکٹر جنرل کے چناؤ کے لیے اقوام متحدہ کے ممبر ممالک سے کہا گیا کہ وہ اس عہدہ کے لیے اپنا نمائندہ نامزد کریں۔ لندن کے مشہور اخبار لندن ٹائمز میں اس عہدہ کے لیے مندرجہ ذیل مطلوبہ شرائط شائع ہوئیں

"Academic of international standing preferably a Noble Laureate in his field. demonstrated ability in an international enviroment, awareness of the political dimension of education, science and culture, particularly in the Third World and someone who has exerted an influence on this area even-handedly between the East and the West, so that he is also acceptable to the Soviet Union"

(عالمی شہرت کا حامل ہو۔ نوبل انعام یافتہ ہو تو بہتر ہے۔ عالمی امور میں شہرت رکھتا ہو (تعلیمی، سائنسی اور تہذیبی معاملات میں سیاسی عمل کو سمجھتا ہو۔ خصوصا" تیسری دنیا کے ان معاملات میں وہ مشرق اور مغرب پر بلا تفریق اپنا اثر ڈال سکے اور وہ سویت یونین کو بھی قابل قبول ہو)

بھائی جان اس وقت دنیا میں وہ واحد شخص تھے جو ان شرائط کو پورا کرتے تھے لیکن پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے بھائی جان کو اس عہدہ کے لیے نامزد کرنے کی بجائے جنرل صاحبزادہ یعقوب خاں کو نامزد کر دیا۔ ان کی نامزدگی تمام ممالک کے لیے حیرت زدگی کا باعث بنی کیونکہ اکثر ممالک کا خیال تھا کہ بھائی جان اس عہدہ کے لیے موزوں ترین تھے۔ اس صورت حال کے پیش نظر برطانیہ اور اٹلی کی حکومتوں نے بھائی جان کو فراخدلانہ پیشکش کی کہ وہ انہیں اپنے اپنے ملک سے اس عہدہ کے لیے نامزد کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن بھائی جان نے ان دونوں ممالک کی اس پیشکش کو منظور نہ کیا کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں انہیں پاکستان کی شہریت سے دستبردار ہونا پڑتا جس کے لیے وہ ہرگز ہرگز تیار نہ تھے۔ یوں انہوں نے اتنی بڑی عزت کو اپنے وطن کے لیے قربان کر دیا۔

برا ہو احمدیت کے خلاف تعصب کا کہ پاکستان نے اپنے ایک عظیم سائنس دان کو اس عہدہ جلیلہ کے لیے نامزد نہ کر کے ملک کو ایک بہت بڑی عزت سے محروم کر دیا۔

اس انتخاب میں جنرل صاحبزادہ یعقوب خان بری طرح ناکام ہوئے۔ وہ بمشکل چند ووٹ حاصل کر سکے۔

حکومت پاکستان کے اس سلوک کے باوجود بھائی جان اپنے ملک اور قوم کی بے لوث خدمت کرتے رہے کیونکہ ایسا جذبہ احمدیت نے ان کے خمیر میں پیدا کیا تھا۔

احمد ندیم قاسمی اس بارے میں کیا کہتے ہیں

پاکستان کے نامور ادیب اور شاعر احمد ندیم قاسمی نے روزنامہ جنگ لاہور میں اپنے کالم "رواں دواں" میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا، اس میں سے چند اقتباسات درج ذیل ہیں (روزنامہ جنگ مورخہ 22 اکتوبر 1987ء)

"حکومت پاکستان نے اپنے وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب خان کو یونیسکو کی سربراہی کے انتخابات میں اپنا امیدوار نامزد کر کے ایک اتنی بڑی غلطی کی ہے کہ اس غلطی کی گونج اقوام متحدہ کے ایوانوں کے علاوہ عالمی سطح کے دوسرے اجتماعوں میں بھی برسوں سنی جاتی رہے گی۔ ویسے تو ہر حکومت کو حق حاصل ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے کسی ذیلی ادارے کی سربراہی کے لیے اپنا کوئی امیدوار نامزد کرے مگر اس طرح کی نامزدگیوں سے پہلے مسئلے کے دونوں پہلوؤں کو بغور دیکھنا پڑتا ہے اور ان کے مضمرات اور رد عمل کا بھی اندازہ لگانا پڑتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ہماری حکومت نے یہ سب کچھ نہیں کیا اور بس اپنا امیدوار نامزد کر دیا۔ اس کا جو نتیجہ نکلا وہ ساری دنیا کے سامنے ہے۔ صاحبزادہ صاحب یونیسکو کی سربراہی کے الیکشن سے

دستبردار ہو گئے ہیں لیکن اگر وہ کامیاب ہو بھی جاتے تو یہ کوئی اطمینان بخش واقعہ نہ ہوتا کیونکہ تیسری دنیا کے ایک رکن ملک کا امیدوار دراصل پوری تیسری دنیا کے مقابلہ میں کھڑا ہو گیا تھا۔ اور تیسری دنیا عالمی مسائل پر جب تک متحد نہیں ہو گی۔ دنیا کے بڑے ان کے مفادات کے ساتھ اسی طرح کھیلتے رہیں گے جیسے آج تک کھیل رہے ہیں۔"

سینی گال کے سابق وزیر تعلیم اماوہ مہاتر مباؤ یونیسکو کے ڈائریکٹر جنرل کے عہدہ سے ریٹائر ہو رہے تھے اور وہ غالباً" تیسری بار بھی اسی عہدہ کے لیے کھڑے ہونا چاہتے تھے۔ (شاید احمد ندیم قاسمی کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ بھائی جان بھی اس عہدہ کے لیے کھڑا ہونا چاہتے تھے)

احمد ندیم قاسمی اپنے کالم کے آخر میں لکھتے ہیں۔

یونیسکو کی ڈائریکٹر جنرل شپ کا فیصلہ جو بھی ہو ہمیں تو اسی نقصان کا رونا ہے جو اس منصب کے لیے پاکستان کے وزیر خارجہ کی امیدواری کی وجہ سے پاکستان کے وقار کو پہنچا ہے۔ ہم دن رات اسلامی اخوت اور اسلامی یگانگت اور اسلامی بھائی چارے کی رٹ لگاتے نہیں تھکتے۔ کم سے کم اسی جذبہ سے کام لیتے ہوئے ہمیں سینی گال کے ایک مسلمان بھائی کی حمایت کا اعلان کر دینا چاہیے تھا۔ یوں اس امر کا ثبوت بھی مل جاتا کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے بھی ہیں۔ مگر افسوس کہ ہم کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ نتیجہ یہ کہ بدنام ہوتے ہیں۔ اس سے بڑی بدنامی اور کیا ہو گی کہ جب حکومت فرانس یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ میں اپنی مندوب خاتون کو ہدایت دیتی ہے کہ وہ صاحبزادہ یعقوب خان کو ووٹ دے تو یہ خاتون اتنی بہادر ثابت ہوتی ہے کہ اپنی رکنیت ہی سے یہ کہہ کر مستعفی ہو جاتی ہے کہ میں ایک فوجی حکومت کے اقتدار کی وجہ سے مسند وزارت پر بیٹھے ہوئے شخص کو ووٹ دینے کی بجائے مستعفی ہو جانے کو بہتر سمجھتی ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ فرانس کی اس مندوب کو (شاید) معلوم نہیں تھا کہ صاحبزادہ یعقوب خان خود بھی فوج کے سابق لیفٹیننٹ جنرل ہیں۔"

25

بھائی جان کی ایک مداح کی سچی اور تلخ باتیں

ڈاکٹر پرویز ہود بھائی (فزکس ڈیپارٹمنٹ قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد) نے نومبر 1997ء میں ٹریسٹ اٹلی میں بھائی جان کی یاد میں منعقد ہونے والی تقریب میں جو تقریر کی تھی اس کا اردو ترجمہ از مرتب درج ذیل ہے۔ ڈاکٹر پرویز ہود بھائی نے اس ترجمہ پر 21 جولائی 1998ء کو نظر ثانی کرنے کے بعد مجھے اس کتاب میں شامل کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ جس کے لیے میں ان کا شکر گذار ہوں۔ (مرتب)

"میں 19۔ 22 نومبر (1997ء۔ ناقل) کو ٹریسٹ میں پروفیسر سلام کی یاد میں ہونے والی میٹنگ میں شامل تھا۔ پہلے دو دن سٹرنگ تھیوری اور علم کائنات پر بہترین مقالے پڑھ گئے جبکہ تیسرا دن پروفیسر سلام کی یاد کے لیے مختص تھا۔ میری تقریر کا متن حسب ذیل ہے۔ یہ دوسری تقاریر سے ذرا مختلف ہے۔ درحقیقت یہ اتنی مختلف ہے کہ اپنی تقریر سے ایک گھنٹہ پہلے میں نے اسے نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن پھر میں نے اپنا فیصلہ تبدیل کر دیا۔ جس کی وجہ سے میرے بعض ہم وطن مجھ سے بہت ناراض ہیں لیکن مجھے اس کی بالکل پرواہ نہیں کیونکہ غلط فیصلے اور نامناسب باتیں ایک نہ ایک دن ضرور سامنے آجاتی ہیں۔ میں شاید اس مضمون کو شائع نہ کراؤں لیکن آپ اگر اسے دوسروں تک پہنچانا چاہتے ہیں تو میری طرف سے اجازت ہے۔

یہ یادگار اجتماع پروفیسر عبدالسلام سے منسوب اس سنٹر کو معرض وجود میں لانے اور بطور عالم طبیعات ان کی عظیم الشان کامیابیوں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے منعقد کیا جا رہا ہے۔ آج یہ سنٹر تیسری دنیا میں سائنس کی نشوونما کے لیے ایک مرکزی ادارہ کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔

یہ ایک تاریخی لمحہ ہے کہ آج سے یہ سنٹر "عبدالسلام سنٹر برائے نظریاتی طبیعات" کہلائے گا۔ میں موجودہ صدی کے کسی ایسے عظیم عالم طبیعات کو نہیں جانتا جسے اتنے کم وقت میں اتنی زیادہ عزت سے سرفراز کیا گیا ہو۔ میں آج پروفیسر سلام کے شاندار کارناموں کے بارے میں کچھ کہنے کی بجائے بہت ہچکچاہٹ کے ساتھ ان کی ناکامیوں کے بارے میں کچھ کہوں گا۔ ناکامیوں سے میری مراد وہ سعی و جستجو ہے جو انہوں نے پاکستان اور دوسرے تمام اسلامی ممالک میں سائنس کے احیاء اور اس کے فروغ کے لیے کی تھی لیکن اس سلسلے میں ان کی کاوشیں ناکام ہوئیں۔

تین باتوں نے مجھے مجبور کیا ہے کہ میں آج اس میٹنگ میں جس میں پچھلے تین دن سے اچھی اچھی باتیں کی گئی ہیں وہاں چند "ناگوار" باتیں کہوں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ پروفیسر سلام کی یہ رائے تھی کہ کسی قوم کی تمدنی اور مادی ترقی کا انحصار اس کی سائنسی ترقی پر ہوتا ہے۔ تمام ممالک کے بارے میں وہ ایسا سوچتے تھے لیکن جہاں تک ان کے اپنے ملک کا تعلق ہے ایسی سوچ اور بھی شدت اختیار کر لیتی تھی۔ ان کی اس خواہش کو جو پوری نہیں ہوئی بلا تبصرہ یا بغیر رائے زنی چھوڑ دینا معنی خیز فرو گزاشت ہو گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں ناکامی سلام کو چھوٹا آدمی نہیں بنا سکتی بلکہ ایسی صورت حال ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ آخر خرابی کہاں اور کس جگہ پیدا ہوئی؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر مجھے سچ بولنا چاہیے خواہ وہ کتنا ہی کڑوا کیوں نہ ہو۔ شاید اس طرح سے آئندہ اس قسم کے المیہ سے بچا جا سکے۔

تیسری بات یہ ہے کہ میں تیسری دنیا میں سائنس کی نشوونما کے سلسلے میں پروفیسر سلام سے کئی بار ملا اور اس بارے میں گفت و شنید اور خط و کتابت بھی کرتا رہا اور کئی سال انہوں نے مجھ پر خصوصی توجہ فرمائی۔

میں پہلی مرتبہ ان سے 1972ء میں M.I.T (Mass. Institute of Technology) میں ملا تھا۔ اس وقت میں انڈر گرایجویٹ سٹوڈنٹ تھا اس ملاقات کا اثر ابھی تک مجھ پر طاری ہے۔ اس کے بعد میں اسی سنٹر میں ان سے 1978ء میں ملا تھا۔ لیکن وہ ملاقاتیں کوئی اتنی اہم نہ تھیں کیونکہ اس وقت نہ وہ مجھے جانتے تھے اور نہ ہی ان کے لیے مجھے جاننے کی کوئی ایسی وجہ تھی۔ 1985ء میں مجھے اسلام آباد میں جہاں میں تدریس کے شعبے سے منسلک ہوں ان کی طرف سے ایک خط ملا۔ وہ میرے لیے انتہائی خوش گوار حیرت کا موقع تھا۔ اپنے خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ ”کٹر علماء کی طرف سے اسلامی سائنس کو وجود میں لانے کی کوششوں پر آپ کی نکتہ چینی اور ذی فہم و روشن خیال مسلمانوں کے صدیوں پہلے کے کارہائے نمایاں کو مذہبی تعصب اور تنگ نظری کے باعث تباہ برباد کرنے کی کوششوں کے بارے میں اپ کا تبصرہ پڑھا ہے“ اپنے خط میں انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ ”میں اگر کبھی اس سنٹر میں آؤں تو ان سے ضرور ملوں“ چنانچہ میں کہہ سکتا ہوں کہ پروفیسر سلام سے میرا اصل تعارف 1985ء کے موسم گرما کے شروع میں ہوا تھا۔ اس سے اگلے سال انہوں نے مجھے کہا کہ ہم دونوں مشترکہ طور پر Michael Moravcisk کی کتاب

ON THE ROAD TO WORLD WIDE SCIENCE

(جو انہیں دنوں انہیں ملی تھی) کا پیش لفظ لکھیں۔ میں نے فخر سے ان کی اس تجویز کو قبول کر لیا تھا۔ دو سال بعد پروفیسر سلام نے میری کتاب

ISLAM AND SCIENCE- RELIGIOUS ORTHODOXY AND BATTLE FOR THE RATIONALITY

کا پیش لفظ لکھا۔ جس میں انہوں نے یہ صراحت کر دی کہ سائنس کو اس کے اپنے اصولوں سے جانچا

جاتا ہے نہ کہ مذہبی اور تصوراتی خیالات سے او نہ ہی حسن شناسی سے اس کی تمیز کی جاتی ہے۔ مجھے اس بات پر خوشی ہے کہ میری کتاب پروفیسر سلام کو اپنے خیالات بیان کرنے کا ایک وسیلہ بن گئی تھی کیونکہ مذہب اور سائنس کے بارے میں ان کے خیالات پر کچھ غلط فہمی پیدا ہونے لگی تھی۔

مجھ سے پہلے فاضل مقرر نے ان اقدام کا تذکرہ کیا جن سے پروفیسر سلام نے اپنی استعداد' وقت' شہرت اور اہلیت کو بروئے کار لاتے ہوئے پاکستان میں سائنس کے معیار کو بلند کیا۔ وہ ان تمام لوگوں کے لیے نمونہ تھے جو سائنس کو ذریعہ معاش بنانا چاہتے تھے۔ یہاں میں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ اس سلسلے میں وہ عظیم الشان فراخدلی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ انہوں نے پاکستان کے مختلف شہروں میں نادار طلباء کو امداد بہم پہنچانے کا کام اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ وہ سکولوں اور کالجوں کو اپنی جیب سے سائنٹیفک ساز و سامان خرید کر دیا کرتے تھے۔ اپنے نوبل انعام کی رقم سے انہوں نے سائنسی علوم میں بہترین تحقیق کرنے والے سائنس دانوں کے لیے انعام مقرر کر رکھا تھا۔ میں ذاتی طور پر اس بات کا شاہد ہوں کہ ان کی میز پر طلباء اور ان کے مداحوں کی طرف سے ملنے والے خطوط کا ڈھیر لگا رہتا تھا چونکہ ایک مصروف اور بار آور شخص کا وقت بہت قیمتی ہوتا ہے اس لیے مجھے ہمیشہ اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ وہ ان تمام خطوط کا جواب کیسے دیتے تھے۔

ان باتوں کو سننے کے بعد آپ یہ خیال کرتے ہوں گے کہ سلام تو پاکستان کا ہیرو تھا' نہیں ایسا نہیں ہے۔

یہاں دنیا کا سب سے بڑا نظریاتی طبیعات کا ادارہ ہے جسے سلام کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے اپنے ملک میں جہاں وہ پیدا ہوا کسی سائنٹیفک یا دوسرے ادارے' عمارت حتیٰ کہ کسی شہر میں کوئی سڑک اس کے نام سے منسوب نہیں ہے۔ سکولوں کی درسی کتب میں اس کا نام تک نہیں لکھا جاتا اور نہ استاد بچوں کو اس کا نام بتاتے ہیں۔ جعلی پیروں کا ہر طرف چرچا ہوتا ہے لیکن سلام کا کہیں نام نہیں لیا جاتا۔ پاکستان کے بہت سے "عالم فاضل" اسے حقارت سے دیکھتے ہیں۔ میں جس یونیورسٹی میں پڑھاتا ہوں ایک مرتبہ اس یونیورسٹی کے ایک سابق وائس چانسلر نے ذلت آمیز لہجے میں بھری محفل میں پوچھا کہ "سلام کون ہے؟" "اس نے پاکستان کے لیے کیا کام کیا ہے؟"

یہ حقیقت ہے کہ پروفیسر سلام کو دنیا کے اکثر رہنماؤں' اقوام متحدہ کے اعلیٰ ترین افسران' عزت مآب پوپ اور دوسرے بڑے لوگوں تک رسائی حاصل تھی لیکن اپنے ملک کے لیڈروں اور رہنماؤں سے ملنا ان کے لیے بہت مشکل تھا۔ 1988ء میں نہایت صبر کے ساتھ پروفیسر سلام متواتر دو روز وزیراعظم بے نظیر بھٹو سے ملاقات کرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں ان کے ہوٹل کے کمرے میں ان کے ساتھ تھا۔ اسی دوران میں نے سوچا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں ڈاکٹر صاحب کو اپنے تعلیمی پروگرام میں شامل کر لوں جو میں پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے تیار کر رہا تھا لیکن میں ایسا کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اس عظیم انسان کو جس کی صحت بھی اچھی نہیں یوں انتظار کرانا ٹھیک بات نہیں۔ میں

ابھی ان سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی جس کی آواز سن کر ڈاکٹر سلام کے چہرہ پر کچھ رونق دیکھنے میں آئی لیکن جلد ہی اس پر مایوسی چھا گئی کیونکہ بی بی (بے نظیر بھٹو) کے سیکرٹری نے انہیں بتایا تھا کہ وزیراعظم سے ان کی ملاقات منسوخ کر دی گئی ہے۔ منسوخی کی وجہ بھی نہیں بتائی گئی تھی۔

جی ہاں! میں خوش ہو کہ وزیراعظم نواز شریف نے موجودہ میٹنگ میں مبارک باد کا پیغام بھجوا کر بہت مہربانی فرمائی ہے۔ ہمیں ایسی چھوٹی چھوٹی عنایات پر خوش ہونا چاہیے ایسا کرنے سے ہمارا کیا جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ قریباً آٹھ سال پہلے گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک کانووکیشن کے موقع پر مسٹر شریف نے کالج کے لائق اور ذہین طلباء کے نام گنوائے تھے لیکن انہوں نے سلام کا نام لینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

یہ بہت ہی عجیب اور غیر معمولی بات ہے کہ آج سے قریباً دس سال پہلے پروفیسر سلام یونیسکو کے ڈائریکٹر جنرل کے عہدہ کے انتخاب میں حصہ لینا چاہتے تھے لیکن حکومت پاکستان نے انہیں اپنا امیدوار نامزد کرنے سے انکار کر دیا تھا حالانکہ بیشتر ترقی پذیر ممالک نے جن میں اردن اور کویت سرفہرست تھے انہیں پوری حمایت کا یقین دلایا تھا۔ چونکہ پروفیسر سلام نے اپنی پاکستانی شہریت کبھی نہیں چھوڑی تھی اس لیے وہ کسی اور ملک سے بطور امیدوار کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ یوں اپنے ملک نے ان کی حمایت نہ کر کے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔

علاوہ ان باتوں کے سلام کو سرکاری طور پر نظرانداز کیا جاتا رہا۔ انہیں ناگوار اذیت پہنچائی جاتی رہی اور انہیں تذلیل کا نشانہ بنایا گیا۔ دائیں بازو کے رسائل نے ان پر جاسوسی کے شرمناک الزام عائد کرتے ہوئے یہاں تک کہا کہ انہوں نے ہندوستان کو ایٹمی راز دیئے ہیں۔ طلباء کی ایک مخصوص تنظیم نے ہر پاکستانی یونیورسٹی میں پروفیسر سلام کا داخلہ بند کر رکھا تھا۔ مجھے یہ بتاتے ہوئے ندامت محسوس ہو رہی ہے کہ پروفیسر سلام اسلام آباد یونیورسٹی میں قدم بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ یہ وہی یونیورسٹی ہے جس کے شعبہ طبیعات میں انہوں نے ایک نئی روح پھونکی تھی۔ پورے پاکستان میں شاید یہ واحد یونیورسٹی ہے جہاں ان کے لیکچر سمجھے جاتے ہیں۔

اب تک تو میں نے پاکستان کی بات کی ہے کچھ مسلم ممالک کے بارے میں بھی سن لیں۔ تیس سال تک پروفیسر سلام ان ممالک میں جاتے رہے۔ ان کی خوشامدیں کیں۔ انہیں سائنس کی ترقی اور اس کی نشوونما کے لیے راغب کرتے رہے۔ اس سلسلے میں ان کے پاس خیالات اور تجاویز کا ایک ذخیرہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ سائنس کی ترقی کے لیے تمام اسلامی ممالک مل کر ایک بلین ڈالر (ایک ارب) کے سرمائے سے ایک سائنس فاؤنڈیشن بنائیں۔ لیکن سعودی عرب نے اس سکیم کی مخالفت کر کے اسے ناکام بنا دیا۔ اس کے علاوہ سعودی عرب کی حکومت نے پروفیسر سلام اور ان جیسے عقیدہ رکھنے والوں اپنے ملک میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا تھا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود سلام نے کبھی ان (سعودی عرب۔ ناقل) کے خلاف نہ تو آواز اٹھائی اور نہ ہی کبھی کوئی حرف شکایت زبان پر لائے البتہ نجی طور پر وہ اپنی مایوسی کا تذکرہ

ضرور کیا کرتے تھے اور بتایا کرتے تھے کہ صرف ایران اور کویت سائنس فاؤنڈیشن کے حق میں تھے اور ان ممالک نے اس کے لیے رقم فراہم کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا تھا۔

مجھے یقین ہے کہ حاضرین میں سے بہت سے لوگ یہ باتیں سن کر کچھ پریشان ہو رہے ہوں گے۔ آپ کی اجازت سے میں ان باتوں کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔

1974ء سے پہلے پروفیسر سلام قانونی طور پر مسلمان تھے لیکن بعد میں انہیں ایک ایسے ملک میں غیر مسلم بنا دیا گیا جس میں قانونی طور پر غیر مسلم دوسرے درجے کے شہری متصور ہوتے ہیں جب پاکستان کی نیشنل اسمبلی نے سلام اور ان کے فرقہ جماعت احمدیہ کو دین اسلام سے خارج کر دیا تو انہوں نے صدر پاکستان کے سائنسی مشیر اعلیٰ کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد اگرچہ انہوں نے حکومت اور اس کے بعض سائنٹیفک اداروں اور دوسرے لوگوں سے غیر رسمی تعلق رکھا لیکن عملی طور پر وہ کوئی کام نہیں کرتے تھے۔

پروفیسر سلام نے اپنے آپ کو کبھی بھی غیر مسلم تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ اس قانون نے انہیں مذہب کی طرف اور زیادہ مائل کر دیا تھا بعض لوگوں کی نظروں میں یہ قابل افسوس بات تھی۔ مگر میں اس بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ اس کے بعد (میرے خیال میں) انہیں اپنے ورثہ سے قلبی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اس پر انتہائی فخر کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے وہ کام کیا جو آج تک کسی نے نہیں کیا۔ نہ کسی مسلمان نے اور نہ ہی کسی اور نے۔ انہوں نے ذی فہم' روشن خیال اور غیر معمولی قابلیت کے حامل مسلمانوں کے عقلی اور سائنسی کارہائے نمایاں کو گرد و غبار سے بھری تاریخ کی کتب سے باہر نکالا اور انہیں تمدنی و تہذیبی جاہ و جلال کا نشان گردانتے ہوئے یہ بتایا کہ وہ نمایاں کامیابیاں صاحب عقل لوگوں کی میراث ہیں۔ سلام کے ایک لیکچر سے مجھے پہلی مرتبہ اس بات کا پتہ چلا تھا کہ بارھویں صدی میں ایک عرب عالم ابن الہیثم نے جسے پیشہ ور تاریخ دانوں کے علاوہ ہر ایک نے فراموش کر دیا تھا' روشنی کے اصولوں کی پیش بینی کی تھی۔ سٹاک ہوم میں نوبل انعام کی تقریب میں سلام نے اپنا لیکچر مائیکل دی سکاٹ (Micheal The Scot) کے اس سفر سے شروع کیا تھا جو اس نے مسلم سپین کے شہر ٹولیڈو (Toledo) میں علم سیکھنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ اس دور میں سارے علوم اسلامی ممالک سے حاصل کیے جاتے تھے۔ سلام کا ان سب باتوں کو بیان کرنے کا مقصد مسلمانوں کے اندر خود بینی' امید کی کرن اور شعور پیدا کرنا تھا جو وہ کھو چکے تھے۔ اپنے مقصد میں انہیں عارضی اور جزوی کامیابی حاصل ہوئی کیونکہ کوئی فانی شخص تاریخ سے جنگ نہیں لڑ سکتا۔ خاص طور پر جب اس کا رخ حال کے بجائے ماضی کی طرف ہو۔

میرے خیال میں سلام انسانی شکل میں اس داستانی سس فیس (Sisphus) کی مانند تھے جسے پلوٹو (Pluto) نے یہ سزا دی تھی کہ وہ تمام عمر ایک بہت بڑا پتھر دھکیل کر اولمپیا پہاڑ پر لے جائے گا۔ جب سس فس وہ پتھر بلندی پر لے جاتا تو وہ لڑھک کر نیچے آ جاتا جسے وہ دھکیل کر پھر اوپر لے جاتا تھا۔ ایک المناک بیماری نے جب تک سلام کو معذور نہیں کر دیا وہ سائنس کی ترقی کے لیے مسلسل منصوبے بناتے

رہے لیکن مذہبی تعصب کی وجہ سے ان کے منصوبوں کو ہمیشہ رد کیا جاتا رہا۔ یہ ایک ظالمانہ حقیقت ہے کہ انہیں ہمیشہ ان لوگوں نے مایوس کیا جن کی بھلائی کے لیے وہ اپنی بھرپور توانائی کام میں لاتے رہے۔

1974ء میں انہیں غیر مسلم قرار دیا گیا۔ میں اس بارے میں کچھ مزید کہنا چاہوں گا۔ جماعت احمدیہ اور دوسروں مسلمانوں کے درمیان جو اصولی اختلافات ہیں وہ یہاں ہمارے لیے باعث تشویش نہیں ہونے چاہئیں۔ انہیں حل کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ یا دوبارہ بلستمہ لینے والے اور Calvinists کے درمیان اختلافات کو حل کرنا۔ عام طور پر ایسا بھی ہوتا ہے جس طرح قرون وسطیٰ میں ہوا کہ مذہبی جھگڑوں کو نمٹانے کے لیے طاقت استعمال کی جاتی رہی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ کمزور کو یا تو نیست و نابود کر دیا جاتا تھا یا خوف زدہ کر کے اسے فرار ہونے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ہر مذہب نے بنی نوع انسان کے لیے یہی "ترکہ" چھوڑا ہے۔ یورپ میں سیکولرزم کی بنیاد پڑنے کی بڑی وجہ یہی تھی کہ اکثریت نے اقلیت کا قتل عام کیا لیکن بدقسمتی سے پاکستان میں حکومت نے اس کے برعکس کیا وہ خود اس معاملے میں ایک فریق بن گئی تھی جس کا لاوا ایک عرصہ سے پک رہا تھا۔ 1974ء میں یہ پہلا قدم تھا جو بالکل اسی طرح تھا جیسے ایک آدمی پھسلن والی چٹان پر قدم رکھتا ہے تو اسے اس کی تہہ کی گہرائی کا کوئی علم نہیں ہوتا۔

جیسے جیسے انتہاپسندی اور فرقہ واریت کی آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں اکثر فرقوں اور گروہوں کو ان انتہاپسندوں سے ایذا پہنچنے اور دین سے اخراج کا خطرہ بڑھ رہا ہے۔ ایمان داری کی بات یہ ہے کہ کسی بھی مخصوص فرقہ کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا' تاریخ نے اسے اصل رنگ میں دکھایا یا لہٰذا اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ پاکستان نے سلام کے ساتھ کیا سلوک کیا اور نہ ہی یہ کہ اس ملک میں کس فرقے یا گروہ کو ایذا پہنچائی گئی۔ دراصل فکری اور مذہبی آزادی تو ہر پاکستانی شہری کا بنیادی حق ہے اور اس کی خلاف ورزی ناقابل برداشت ہے۔

اپنی تقریر کو ختم کرنے سے پہلے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سلام نے نمایاں طور پر بے تعصبی اور فراخدلی سے ہر بات کو فراموش کرتے ہوئے ہمیشہ درگزر سے کام لیا حالانکہ ان حالات میں انہیں تلخیوں سے بھر جانا چاہیے تھا۔ لیکن انہوں نے وہ راستہ اختیار نہیں کیا۔ ان کے اس فعل کو ہمیں تحسین کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ سلام مذہبی' تمدنی اور شخصی آزادی کے علم بردار تھے اور اس بات پر ان کا پختہ یقین تھا کہ سائنس میں وہی قوم ترقی کر سکتی ہے جو بے تعصب اور متحمل مزاج ہو۔ چنانچہ ہم سب مل کر انہیں جو سب سے بڑا خراج تحسین پیش کر سکتے ہیں۔ وہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنی جگہ ایک ایسی عالمی سوسائٹی بنانے کی کوشش کرے جو کرہ ارض پر رہنے والے ہر شخص کو برابر موقع فراہم کرے۔ مذہبی تعصبات سے پاک ہو۔ فاصلوں کو دور کرے اور تخلیقی کاموں کی حوصلہ افزائی کرے۔

26

بھائی جان کی شخصیت کے چند پہلو اور متفرق واقعات

1۔ اساتذہ کی عزت

والدین نے بھائی جان کو بچپن سے ہی اپنی اساتذہ کی عزت اور تکریم کرنے کی تعلیم دی تھی جس پر وہ تمام عمر عمل پیرا رہے۔

ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے کچھ عرصہ بعد ابا جان نے جھنگ شہر میں رہائش اختیار کی تھی۔ غالباً 1955ء کی بات ہے کہ بھائی جان نے کیمبرج سے ابا جان کو کچھ رقم اپنے استادوں میں تقسیم کرنے کے لیے بھجوائی تھی۔ اس بارے میں ابا جان نے اپنی ڈائری میں لکھا

"عزیز عبدالسلام سلمہ نے خواہش ظاہر کی کہ ان کے پرانے استادوں کو تلاش کیا جائے اور انہیں بڑھاپے میں رقم سے امداد کی جائے چنانچہ تلاش پر مفصلہ ذیل استاد مل گئے۔

نام	رقم جو ادا کی گئی
1۔ مرزا غلام عابد صاحب۔ ہیڈ ماسٹر ایم بی مڈل سکول جھنگ شہر	250 روپے
2۔ صوفی اللہ دتہ صاحب جے۔ وی مدرس جھنگ شہر	200
3۔ ایم غلام محمد صاحب ایس۔ وی مدرس جھنگ شہر	400
4۔ ماسٹر جیون خان ڈرل ماسٹر جھنگ شہر	200
5۔ ایم محمد رشید صاحب جے۔ اے۔ وی انگلش ماسٹر	200
6۔ ایم شیر افضل جعفری۔ افسر حاضری ڈسٹرکٹ بورڈ جھنگ	200

سب نے شکریہ کے ساتھ رقم وصول کی۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ عزیز کو استادوں کی پیرانہ سالی میں مدد کرنے کا خیال خدا تعالیٰ نے بخشا۔ اللہ کریم قبول فرمائے۔

خاکسار

محمد حسین"

یہاں اس بات کی وضاحت کرنا ضروری ہے کہ جناب شیر افضل جعفری صاحب بھائی جان کے باقاعدہ

استاد نہ تھے۔ وہ ڈسٹرکٹ بورڈ (آج کل جسے ضلع کونسل کا نام دیا گیا ہے) جھنگ میں افسر حاضری تھے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کے تمام اسکولوں کے اساتذہ کی حاضری وغیرہ کا ریکارڈ ان کے پاس رہتا تھا۔ چونکہ وہ ابا جان کے رفیق کار تھے اس لیے بھائی جان کبھی کبھی ان سے اردو میں درس لے لیا کرتے تھے۔

بھائی جان جب کبھی بھی جھنگ شہر جاتے تو جناب شیر افضل جعفری صاحب کے دولت خانہ پر ان سے ملاقات کرنے کے لیے ضرور جاتے اور وہ بھی بھائی جان سے اپنے بیٹوں جیسا سلوک کرتے تھے۔ بھائی جان جب بھی ان سے ملتے تو کچھ نہ کچھ رقم ان کی جیب میں ڈال دیا کرتے تھے۔ میں ہمیشہ بھائی جان کے ہمراہ ہوتا تھا۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر سراج الدین صاحب بھائی جان کے انگلش کے استاد تھے۔ گو انہوں نے وہاں ملازمت کے زمانہ میں بھائی جان کو بہت تکلیف پہنچائی تھی (ایک غلط فہمی کی وجہ سے) لیکن بھائی جان جب کبھی لاہور آتے تو پروفیسر سراج الدین صاحب کی کوٹھی پر ان سے ملنے کے لیے ضرور جاتے تھے۔

2۔ نادار طلبا کے لیے وظائف

چھوٹے بھائی چوہدری محمد عبدالوہاب سنیئر وائس پریذیڈنٹ یونائیٹڈ بنک کے ذریعے 1981ء سے 1992ء تک ہر سال 48 طلباء کو وظائف دیا کرتے تھے۔ یہ طلبا نویں جماعت سے بی اے میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان کے علاوہ 8 افراد کو ہر ماہ ایک مخصوص رقم عزیزم عبدالوہاب کے ذریعے بھجوایا کرتے تھے۔

3۔ 1979ء میں نوبل انعام ملنے کے بعد جب آپ جھنگ شہر تشریف لے گئے تو وہاں انہوں نے نادار افراد میں ہزاروں روپے تقسیم کیے تھے۔ ان دنوں میں ان کا خزانچی تھا۔

4۔ اپنے دوست کی عزت افزائی

ایک مرتبہ بھائی جان پاکستان آئے تو وہ ہوائی جہاز سے ملتان ہماری بڑی ہمشیرہ مسعودہ (مرحومہ) سے ملنے گئے۔ ملتان کے ہوائی اڈا پر اعلیٰ سول حکام جن میں کمشنر و ڈپٹی کمشنر اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس شامل تھے' نے ان کا استقبال کیا۔ ملتان کا ہوائی اڈا چھوٹا سا ہے۔ ہوائی جہاز ہوائی اڈ کی عمارت کے قریب رکا کرتے تھے اور مسافر لاؤنج تک پیدل جاتے ہیں چنانچہ بھائی جان بھی اپنے استقبال کرنے والوں کے ہمراہ لاؤنج کی طرف جا رہے تھے کہ ان کی نگاہ رستہ سے ہٹ کر کھڑے ایک چاق و چوبند پولیس حولدار پر پڑی۔ جیسے ہی بھائی جان نے اسے دیکھا تو فورا" اس کی طرف گئے اور اس سے مصافحہ کرنے کے بعد بڑی گرم جوشی سے اسے گلے ملے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ لاؤنج میں چلنے کے لیے کہا لیکن اپنے افسران کی موجودگی سے وہ گھبرا رہا تھا۔ اس کی ہچکچاہٹ کو دیکھتے ہوئے انہوں نے وہاں موجود افسران سے

اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ "یہ ملازم حسین میرا بچپن کا دوست اور کلاس فیلو ہے" پھر کیا تھا۔ کیا کمشنر اور کیا ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس الغرض سب نے ملازم حسین سے ہاتھ ملایا۔ بھائی جان جتنی دیر لاؤنج میں رہے ملازم حسین ان کے ساتھ تھا۔

ہماری والدہ نے ملازم حسین کا نام "گھڑے بھن" یعنی گھڑا توڑنے والا رکھا ہوا تھا کیونکہ ایک مرتبہ بھائی جان سے کھیلنے کے لیے وہ ہمارے گھر آیا تو مجھے یاد ہے کہ جب کبھی وہ ہمارے گھر آتے تو ہمیں کہتے کہ "آپا جی (ہماری والدہ جنہیں ہم آپا کہا کرتے تھے) سے کہو گھڑے بھن آیا ہے۔ ہمارے ابا جان اور والدہ اسے بہت پیار سے ملتے تھے اور ہمیشہ اس کی خاطر مدارت کرتے۔ ان کا ایک بیٹا فوج میں اعلیٰ عہدہ پر متعین ہے۔ ہمارے بہنوئی چوہدری عبدالشکور جو ہمارے تایا زاد بھی تھے اور بھائی جان کے برادر نسبتی بھی نے مندرجہ بالا واقعہ سنایا کرتے تھے۔

جناب ملازم حسین ابھی بھی اللہ کے فضل سے ملتان میں بقید حیات ہیں (1998ء)

5۔ غالباً 1963ء کی بات ہے کہ بھائی جان پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کی ایک میٹنگ میں شرکت کے لیے لاہور میں آئے۔ میٹنگ کے بعد گیسٹ ہاؤس میں جاتے ہوئے انہوں نے ڈرائیور سے گورنمنٹ کالج چلنے کے لیے کہا۔ ان کی بات سن کر ڈاکٹر عثمانی (چیئرمین پاکستان ایٹمی توانائی کمشن) جو ان کے ہمراہ تھے نے کہا کہ "سلام گرمی کی چھٹیوں کی وجہ سے کالج بند ہے وہاں تو کوئی بھی نہیں ہو گا" یہ سن کر بھائی جان نے کہا کہ "میں نے جس سے ملنا ہے وہ وہاں ہو گا" چنانچہ جب وہ کالج پہنچے تو اس کے سامنے والا لان "اول" میں کچھ لوگوں کو کام کرتے دیکھ کر انہیں اشارہ کیا تو ان میں سے ایک آدمی کار کے پاس آیا انہوں نے اس آدمی سے کسی اور کے بارے میں پوچھا۔ وہ آدمی واپس چلا گیا پھر ایک نحیف سن رسیدہ آدمی کار کے پاس آیا تو بھائی جان نے اس سے مصافحہ کیا اور اسے گلے ملے اور پھر بہت دیر تک اس سے باتیں کرتے رہے۔ دونوں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دو بچھڑے دوست مل رہے ہوں--- وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں بھائی جان کے طالب علمی کے زمانہ میں نیو ہوسٹل کا ملازم سیدا تھا جو ان کے کہنے پر ان کے ہوسٹل کے کمرے کے دروزے پر باہر سے تالا لگا دیا کرتا تھا اور انہیں کھانا وغیرہ کھڑکی سے پہنچایا کرتا تھا۔ بعد میں جب بھائی جان نے وہاں کچھ عرصہ ملازمت کی تھی تو سیدا بطور "گھریلو" ملازم ان کی خدمت کرتا تھا۔

ڈاکٹر عثمانی نے جب دیکھا کہ سلام ایک غریب ناتواں جو پسینہ میں شرابور تھا' گلے مل رہے ہے تو انہوں نے بھی سیدا اسے مصافحہ کیا۔

وہاں سے جانے سے پہلے بھائی جان نے اپنے بٹوے سے کچھ نقدی نکال کر سیدا کی جیب میں ڈال دی تھی۔

ڈاکٹر عثمانی نے مجھے یہ واقعہ سنایا تھا۔

6- ایک یتیم کی مدد

جھنگ شہر سے ہمارے محلّہ کے ایک لڑکے نے بھائی جان کو خط لکھا (جب وہ امپریل کالج لندن میں تھے) کہ "اس کے والد کا انتقال ہو گیا ہے اور گھر کی تمام ذمہ داری اس کے کندھوں پر آن پڑی ہے۔ میں ایف اے پاس ہوں اگر آپ مجھے پی۔ آئی۔ آے میں کوئی ملازمت دلوا سکیں تو آپ کی بہت مہربانی ہو گی" چنانچہ اس یتیم بچے کا خط ملتے ہی انہوں نے پی آئی اے کے چیئرمین (جو انجنیئر تھے) کو ایک سفارشی خط لکھا اور اسے مجھے بھجوایا تا کہ میں اسے ذاتی طور پر اسے چیئرمین صاحب کو دوں چنانچہ بھائی جان کا وہ خط میں لے کر پی۔ آئی۔ اے ۔ کے ہیڈ آفس گیا ۔لیکن چیئرمین صاحب نے مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا اور اپنے ایک سپیشل اسٹنٹ کی معرفت کہلا بھیجا کہ وہ کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ یہ سن کر مجھے افسوس ہوا تو ان کے اسٹنٹ سے میں نے کہا کہ وہ چیئرمین صاحب سے میرے بھائی کا خط واپس لا دے اس طرح وہ خط ابھی تک میرے پاس ہے۔

طبیعت میں سادگی

صدر ایوب خان کا دور حکومت تھا۔ پاکستان کا دارالخلافہ ابھی کراچی تھا۔ شہنشاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی پاکستان کے دورہ پر آئے ہوئے تھے۔ اتفاق سے انہیں دنوں بھائی جان بھی پاکستان آئے ہوئے تھے۔ ایک روز دوپہر کے وقت وہ اچانک میرے گھر پر آئے اور فرمایا "آج صدر پاکستان شہنشاہ ایران کو عشائیہ دے رہے ہیں اور انہوں نے مجھے بھی مدعو کیا ہے۔ میرا بوٹ تھوڑا سا پھٹا ہوا ہے۔ اپنا بوٹ مجھے دے دو اگر مجھے پورا آگیا تو اسے پہن کر دعوت پر جاؤں گا۔" لیکن میرا بوٹ انہیں پورا نہ آیا تو میں نے عرض کیا کہ وہ میرے ساتھ بازار چلیں' نیا بوٹ خرید لیتے ہیں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ "میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں اپنا پھٹا ہوا بوٹ ہی پہن کر دعوت پر چلا جاؤں گا۔ مجھے کسی نے کیا کہنا ہے۔" چنانچہ اس رات وہ اپنا پھٹا ہوا بوٹ ہی پہن کر شاہی دعوت میں شامل ہوئے تھے۔

پنڈت جواہر لعل نہرو کی پیشکش کو مسترد کرنا

پنڈت جواہر لعل نہرو وزیر اعظم ہندوستان بہت مردم شناس تھے۔ ہندوستان کی آزادی کے فورا" بعد انہوں نے کیمبرج میں کام کرنے والے ڈاکٹر ہومی بھابھا (پارسی نژاد) کو ہندوستان کے ایٹمی کمیشن کا چیئرمین مقرر کیا تھا۔ پھر ان کی نظریں بھائی جان پر مرکوز ہو گئیں اور انہوں نے پوری کوشش کی کہ کسی طرح سے بھائی جان بھارتی شہری بن جائیں۔ سن ساٹھ کی دہائی کے اوائل میں پنڈت نہرو نے اپنے مسلمان وزیر تعلیم (نوٹ: ہمایوں کبیر نام تھا ان کا) کو بھائی جان کے پاس لندن اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ وہ ہندوستان آ جائیں تو ان کا بہت خیال رکھا جائے گا۔ لیکن بھائی جان نے ایسا کرنے سے نکار کر دیا لیکن پنڈت جی نے ہمت نہیں ہاری

اور ایک مرتبہ پھر انہوں نے اپنے اسی وزیر کو بھائی جان کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھجوایا (Come to India on your terms) یعنی "اپنی شرائط پر ہندوستان آ جاؤ۔" ہندوستانی وزیر نے دوسری مرتبہ بھائی جان سے ان کے مکان پر ملاقات کی۔ ابا جان ان دنوں بھائی جان کے پاس مقیم تھے۔ انہیں جب اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے کہا "سلام تمہارا روحانی باپ (مراد امام جماعت احمدیہ) والدین' بھائی بہن اور دیگر عزیز و اقارب پاکستان میں ہیں اگر تم ہندوستان چلے گئے تو پھر ان سے ساری عمر نہیں مل سکو گے۔ چنانچہ بھائی جان نے ایک مرتبہ پھر پنڈت جواہر لعل نہرو کی اس پر منفعت پیشکش کو ٹھکرا دیا۔

ابا جان نے یہ واقعہ مجھے بتایا تھا۔

حکومت ہندوستان کی عزت افزائی

نوبل انعام ملنے سے پہلے اور بعد میں حکومت ہندوستان نے بھائی جان کی ہمیشہ بے حد عزت کی۔ نوبل انعام ملنے کے بعد مسز اندرا گاندھی پہلی سربراہ حکومت تھیں جنہوں نے بھائی جان کو ہندوستان دورہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ لیکن بھائی جان نے سب سے پہلے پاکستان کا دورہ کیا تھا۔ جس کی تفصیل پہلے دی جا چکی ہے۔ بہرحال بھائی جان نے 1981ء کے شروع میں ہندوستان کا دورہ کیا۔ اس دورہ کے دوران اور بعد میں ہندوستان کی پانچ یونیورسٹیوں نے بھائی جان کو ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی ڈگری دی۔ یہاں یہ بتانا چاہوں گا کہ ان کے اپنے ملک پاکستان میں صرف دو یونیورسٹیوں نے انہیں ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری دی تھی۔ (پنجاب یونیورسٹی نے 1957ء میں جبکہ قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد نے یہ ڈگری دسمبر 1979ء میں دی تھی) یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ قائداعظم یونیورسٹی میں ڈگری دینے کی تقریب منعقد نہیں ہوئی تھی کیونکہ ایک سیاسی جماعت جس نے مذہب کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اور جس کے بانی نے حضرت قائداعظم اور پاکستان کے قیام کی بھرپور مخالفت کی تھی' کے طالب علموں نے ڈاکٹر سلام کو قتل کرنے کی دھمکی دی تھی (اس لیے کہ وہ احمدی تھے) اس کے برعکس اس ہندوؤ کا کردار دیکھیں کہ اس کے ملک کی متعدد تنظیموں نے ڈاکٹر عبدالسلام کو ایوارڈ دیئے بلکہ انہیں اپنی اپنی تنظیموں کا فیلو بنایا۔

1981ء میں جب بھائی جان نے ہندوستان کا دورہ کیا تھا تو اندرا گاندھی وزیراعظم ہندوستان نے انہیں اپنے گھر (وزیراعظم ہاؤس) میں دعوت دی تھی۔ وہ One-to-One ملاقات تھی۔ اندرا گاندھی نے بھائی جان کی اس قدر عزت کی کہ وہ صوفہ پر ان کے برابر نہیں بیٹھی بلکہ تمام وقت فرش پر قالین پر بیٹھی رہی اور اس نے خود اپنے ہاتھ سے کافی بنا کر انہیں پیش کی تھی۔ یہ ایک استاد کی عزت تھی۔

اسی طرح راجیو گاندھی نے 1989ء میں ان کی عزت کی تھی اور کافی دیر تک ان سے گفتگو کی۔ راجیو گاندھی چونکہ کیمبرج یونیورسٹی کا پڑھا ہوا تھا اس لیے اس بات کا بخوبی علم تھا کہ ایک پروفیسر کا کیا مقام ہوتا ہے۔

ہندوستان کی عزت افزائی

ہندوستان کی یونیورسٹیوں اور دیگر تنظیموں نے بھائی جان کو جو اعزازی ڈگریاں اور دوسرے اعزازات دیئے تھے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی ڈگری دینے والی ہندوستانی یونیورسٹیوں کے نام

1۔ گورونانک دیو یونیورسٹی۔ امرتسر 1981ء

2۔ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ 1981ء

3۔ ہندوٗ یونیورسٹی۔ بنارس 1981ء

4۔ پنجاب یونیورسٹی۔ چندی گڑھ 1981ء

5۔ گلبرکہ یونیورسٹی۔ انڈیا 1993ء

اعزازات

1۔ سردیو پرشاد سرواد ھیکاری گولڈ میڈل کلکتہ یونیورسٹی 1977ء

2۔ سر آر۔ڈی۔ برلا ایوارڈ انڈین فزکس ایسوی ایشن بمبئی 1979ء

اعزازی و منتخب فیلو شپ

1۔ منتخب فیلو ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ برائے بنیادی تحقیق 1979ء

2۔ منتخب غیر ملکی فیلو انڈین نیشنل سائنس اکیڈمی دہلی 1980ء

3۔ منتخب اعزازی فیلو انڈین اکیڈمی آف سائنس بنگلور 1988ء

گورونانک دیو یونیورسٹی امرتسر میں اعزازی ڈگری وصول کرنے کے بعد بھائی جان نے پنجابی میں تقریر کی تھی۔ وہ تقریر مع اردو ترجمہ الگ سے دی جا رہی ہے۔

بھائی جان کی تقریر کے بعد ایک سردار جی نے ان سے پنجابی میں پوچھا کہ "تسیں دواں قوتاں ملا کے چاراں توں تن کر دتا اے۔ ہن تاڈے کول جدید سامان وی اے۔ کمپیوٹر وی ہن تے ہن Unity ثابت ہون وچ کنے سال لگن گے" (آپ نے دو قوتوں کو ملا کر تین قوتیں ثابت کر دی ہیں اب تو آپ کے پاس جدید ذرائع میں کمپیوٹر بھی ہیں تو اب ایک قوت ثابت کرنے میں کتنی دیر لگے گی) بھائی جان نے پنجابی میں جواب دیا "سردار جی سائنسداناں کول کوئی جھرلو نہیں اے جس نال او اے کر سکن۔ دو سو سال لگ سکدے نے۔ تین سو سال وی لگ سکدے نے" (سردار جی سائنسدانوں کے پاس کوئی جادو کی چھڑی نہیں ہے جس سے وہ یہ ثابت کر سکیں۔ یہ ثابت کرنے کے لیے انہیں دو سو سال بھی لگ سکتے ہیں۔ تین سو سال بھی لگ سکتے ہیں۔ اس سوال اور "ترت" جواب سے ہال میں قہقہ بلند ہوا تھا۔

نئی دہلی میں جھنگ کے ہندوؤں کا اپنے ہم وطن کو نذرانہ عقیدت

تقسیم ملک کے بعد جھنگ شہر اور گھیانہ کے ہندوؤں کو نئی دہلی اور اس کے مضافات میں آباد کیا گیا تھا۔ نوبل انعام حاصل کرنے کے بعد بھائی جان دہلی گئے تو وہاں ابا جان کے دوستوں کے علاوہ بھائی جان کے دوستوں اور کلاس فیلوز نے ان کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ اس دعوت میں عورتوں' مردوں اور بچوں کی بھاری تعداد نے حصہ لیا تھا۔ اتفاق سے سید ذوالفقار علی بخاری سابق چیئرمین پاکستان کرکٹ بورڈ جن کا تعلق شاہ جیونہ (جھنگ) سے ہے' اس روز وہیں تھے۔ بھائی جان نے انہیں اس دعوت میں شرکت کرنے کے لیے کہا۔ بخاری صاحب نے بتایا کہ ''وہ ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر بہت خوش تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔ خواتین اپنے چھوٹے بچوں کو ڈاکٹر صاحب کے پاس لے جاتیں اور ان کے سروں پر ان کا ہاتھ پھیراتی تھیں۔'' بقول بخاری صاحب وہ بڑا ہی عجیب منظر تھا۔ وہ لوگ اتنے خوش تھے کہ ایک جھنگی نے دنیائے سائنس کا سب سے بڑا انعام لیا ہے ان لوگوں کے سر فخر سے بلند تھے۔

ہندوستان میں سلام کا شاندار استقبال

جنوری 1981ء میں انڈین کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کی دعوت پر بھائی جان نے ہندوستان کا دورہ کیا تھا۔ اندر ملہوترہ نے ٹائمز آف انڈیا (Times of India) میں اس دورہ کے بارے میں ایک آرٹیکل لکھا تھا ''سٹار'' (نوٹ: سٹار اخبار کراچی میں شام کو شائع ہوتا ہے۔ مرتب) کراچی نے 28 فروری 1981ء کو شائع کیا۔ یہاں اس رپورٹ کا اردو ترجمہ دیا جا رہا ہے۔

''پاکستان کے پروفیسر عبدالسلام کا ہندوستان کے طول و عرض میں ایک ہیرو کی طرح استقبال کیا گیا۔ بہت سے لوگوں کے لیے یہ بات باعث حیرت ہو گی کیونکہ وہ سوچتے ہوں گے کہ ہندوستان اور پاکستان کے آپس کے تعلقات کی پیچیدگیوں کی وجہ سے ایسا کیوں کر ممکن ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ ہمارے خطہ ارض میں استاد اور ایک غیر معمولی قابل شخص کو انتہائی عزت و احترام سے دیکھنے کی روایت چلی آ رہی ہے اور سلام اس تعظیم کا پوری طرح اہل ہے۔ وہ پاکستان کا پہلا نوبل انعام یافتہ ہے جس نے 1979ء میں دو امریکن سائنسدانوں کے ساتھ مشترکہ طور پر یہ انعام حاصل کیا تھا۔ یوں یہ انعام پانے والا وہ برصغیر کا چوتھا فرد ہے اس طرح وہ ٹیگور' رامن اور کھورانا جیسے جگمگاتے ستاروں کی صف میں آ کھڑا ہوا ہے اور یہ بات ہمارے لیے موجب صد افتخار ہے۔

سلام کی خوبیاں تو سب پر عیاں ہیں۔ ان سے میری سرسری ملاقات میں وہ اور زیادہ واضح ہو گئی ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس تجربہ کار مالی کی طرح جو پھولوں کی کلیاں جمع کرتا ہے۔ اعزازات کے انبار نے سلام کو مغرور نہیں بنایا۔ وہ سادہ اور منکسر المزاج انسان ہے جو دھیمے لہجے میں گفتگو کرتا ہے۔ خوش خلقی اور سادہ مزاجی کے باوجود وہ شوخی باز نہیں اور نہ ہی وہ دوسروں سے الگ تھلگ رہتا ہے بلکہ ان سے ملنا بہت آسان

ہے۔ وہ پرجوش' تیز فہم اور پیار کرنے والا ایک شخص ہے۔ اسے انسانیت سے اتنا ہی پیار ہے جتنا وہ سائنس سے پیار کرتا ہے۔

سلام جس نے داڑھی رکھی ہوئی ہے جو آدھی سیاہ اور آدھی سیاہی مائل سفید ہے کا تعلق احمدیہ فرقہ سے ہے جسے پاکستان میں اسلام سے خارج کر دیا گیا تھا۔ اپنی نجی گفتگو یا پبلک لیکچر میں وہ خلوص دل سے اکثر اللہ کے فضل اور اس کی رحمتوں کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ ایسا کرنے پر اس کی نیت پر ذرہ برابر بھی شک نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ انٹرنیشنل کانفرنسوں کے دوران اگر نماز کا وقت ہو جائے تو وہ اس کی ادائیگی کے لیے وہاں سے اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ خواہ وہ میٹنگ کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو۔ ان کے ایک دوست نے مجھے بتایا کہ انہیں قرآن حکیم کے نادر نسخے جمع کرنے کا بہت شوق ہے۔ اس کے علاوہ ان کا اور کوئی مشغلہ نہیں دراصل وہ اپنے کام میں اتنا مصروف ہوتا ہے کہ اس کے پاس اور کچھ کرنے کا وقت ہی نہیں ہوتا۔ اچھا کھانا وہ بہت رغبت سے کھاتے ہیں غالباً" اسی وجہ سے وہ کچھ فربہ ہیں۔

پنجابی ورثہ پر فخر کرنا سلام کا ایک امتیازی نشان ہے۔ سٹاک ہولم (سویڈن۔ ناقل) میں نوبل انعام کی تقسیم کی تقریب میں انہوں نے پنجابی لباس--- شلوار' قمیض اور شیروانی پہن رکھی تھی۔ کبھی کبھی وہ ٹوپی بھی پہنتے ہیں۔

پچھلے بیس برسوں سے وہ لندن اور ٹریسٹ میں رہتے ہیں جہاں وہ امپریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی میں پروفیسر ہیں اور انٹرنیشنل سنٹر برائے نظریاتی طبیعات کے ڈائریکٹر ہیں لیکن ان کی طرز زندگی ویسے ہی ہے جیسے انہوں نے جھنگ میں گذاری تھی جہاں وہ آج سے پچپن سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔

انہوں نے مجھ سے ٹھیٹھ پنجابی زبان میں بات چیت کی تھی۔ اس دوران انہوں نے انگریزی یا اردو کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کیا تھا۔

عام طور پر اس بات کا کسی کو علم نہیں ہے کہ سلام کے والد جو ڈسٹرکٹ بورڈ جھنگ میں محکمہ تعلیم میں ایک افسر تھے' نے 29 جنوری 1926ء کو (ان کے پیدائش کے دن) زائچہ تیار کرایا تھا۔ غالباً" وہ زائچہ اب بھی کہیں موجود ہے لیکن سلام نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ اس کی جان فشانی اور ذکاوت کی وجہ سے اسے دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں آئی (زائچہ کے بارے میں میں نے اپنے تایا زاد بھائی لیفٹیننٹ کرنل (ر) جی ایم اقبال جن کی پیدائش 1918ء کی ہے وہ جھنگ شہر ہی میں پیدا ہوئے' سے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ "ہمارے آبائی گھر کے بالکل نزدیک ایک ہندو پنڈت دیوی دیال رہتے تھے جن کا پیشہ زائچے وغیرہ بنانا تھا۔ انہوں نے اپنے طور پر سلام کا زائچہ بنایا ہو گا۔ چچا جان (ہمارے والد ناقل) ان باتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے یہ بات شاید ان کے علم میں نہیں تھی۔ ہمارے گھر سے کچھ فاصلہ پر ملہوترہ خاندان رہتا تھا۔ اندر ملہوترہ کا غالباً" اسی خاندان سے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جھنگ کے ہندو دہلی میں آباد ہو گئے تھے' ممکن ہے پنڈت دیوی دیال یا ان کی اولاد نے ملہوترہ یا اس کے اہل خاندان کو اسی زائچہ کے بارے میں بتایا ہو۔"

(نوٹ: اللہ بہتر جانتا ہے لیکن ہمارا اس پر اعتقاد نہیں۔ مرتب)

سلام کے استاد اسے اپنے دوسرے شاگردوں کے سامنے بطور نمونہ پیش کیا کرتے تھے۔ چودہ برس کی عمر میں اس نے اس وقت شہرت حاصل کی جب وہ میٹرک کے امتحان میں 40000 طلبا میں اول آیا تھا۔ اس کے بعد وہ جھنگ سے لاہور چلا گیا وہاں اس نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا۔ اس کالج میں داخلہ لینا ہر طالب علم کی خواہش ہوتی ہے اور وہ اس کے خواب دیکھتا ہے۔ وہاں بھی وہ بی۔اے میں یونیورسٹی میں اول آئے۔ بی۔ اے میں اس نے انگلش لٹریچر میں اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ یہ ایک ایسا کارنامہ تھا جو اس وقت خیبر سے کاکس بازار (بنگال کا آخری کنارہ۔ ناقل) تک کسی کو ہی نصیب ہوتا تھا۔ 1946ء میں اس نے ریاضی میں بھی یونیورسٹی میں اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جس کے ایک سال بعد ہمیں آزادی کی خوشی نصیب ہوئی لیکن تقسیم ملک نے ہمیں ذہنی کرب میں مبتلا کر دیا تھا۔

اب میں اپنے ملک اور بیرون ملک سلام کے شاندار تعلیمی سفر سے ہٹ کر دہلی سے ان کے تعلق کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ اکثر یہ کہا جاتا ہے اور یہ بات ہے بھی صحیح کہ دہلی کے لیے سلام کا یہ پہلا سفر نہیں جن لوگوں کو ان سے تعلق رہا ہے وہ بتلاتے ہیں کہ انڈین کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کی دعوت پر سلام 1960ء میں پہلی مرتبہ دہلی آئے تھے۔ اس وقت پروفیسر ہمایوں کبیر وزیر تعلیم و پبلسٹی تھے۔ انہوں نے (پروفیسر ہمایوں کبیر۔ ناقل) نے بار بار یہ پیش گوئی کی تھی کہ سلام کو نوبل انعام ضرور ملے گا (اس سلسلہ میں سلام ٹیگور سے کہیں بہتر رہا کیونکہ اسے برصغیر میں اس وقت شہرت ملی تھی جب نوبل کمیٹی نے اسے عزت دی تھی۔ ایسا کرنے سے دراصل نوبل کمیٹی نے خود اپنے آپ کو عزت دی تھی)

انگریز راج کے آخری دور میں پنجاب کے کسانوں کے بیٹوں کو بیرون ملک تعلیم کے لیے وظیفے دیئے گئے تھے۔ سلام کو بھی وظیفہ دیا گیا تھا اور وہ ملک سے باہر چلا گیا۔ اس کے بعد کے واقعات سے چونکہ ہر کوئی واقف ہے۔ اس لیے میں انہیں نہیں دہراؤں گا۔

ہندوستان کے موجودہ دورہ میں سلام نے تیسری دنیا میں سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے فروغ اور ایٹمی قوت کے پھیلاؤ کے خلاف باتیں کیں اور ان دونوں موضوعات پر ان کے خیالات بہت واضح ہیں۔

سلام نے جھنگ کو چھوڑا لیکن جھنگ نے سلام کو نہیں چھوڑا (میری رائے اس کے برعکس ہے۔ سلام نے کبھی بھی جھنگ کو نہیں چھوڑا آخر وہ اپنی مٹی میں لوٹ آیا اور اب اپنے وطن کی مٹی میں آسودہ خاک ہے۔ ناقل) بمبئی میں انڈین فزکس ایسوی ایشن کی ایک تقریب میں پروفیسر یش پال جنکا تعلق جھنگ سے ہے' نے انہیں گولڈ میڈل دیا۔ ہرگوبند کھورانہ ایک اور جھنگی ہے۔

چو این لائی وزیراعظم چین سے بھائی جان کی ملاقات

ایک دفعہ بھائی جان چین کے دورے پر گئے وہاں انہوں نے چینی سائنسدانوں کو بنیادی ذرات پر لیکچر دیا۔ اسی رات ان کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا گیا جس میں چین کے وزیراعظم مسٹر چو این لائی بھی مدعو

تھے۔ انہوں نے بھائی جان کو بتایا کہ چینی سائنسدانوں نے ان کے لیکچر کو بے حد سراہا ہے۔ پھر وزیر اعظم نے بھائی جان کے لیکچر کی خاص خاص باتیں دوہرائیں جنہیں سن کر بھائی جان بے حد حیران ہوئے اور حیرت زدگی میں انہوں نے کہا۔

"Mr. Prime Minister I Wonder How well informed you are."

(مسٹر پرائم منسٹر میں حیران ہوں کہ آپ کتنے باخبر انسان ہیں)

بھائی جان کی یہ بات سن کر چو این لائی نے کہا۔

"If I am not how can be Prime Minister of China for such a long time."

(اگر میں باخبر نہ ہوں تو میں اتنے سال سے چین کا وزیر اعظم کیسے رہ سکتا) بھائی جان نے یہ واقعہ خود سنایا تھا۔

ٹریسٹ اٹلی میں پیش آنے والے چند واقعات

مجلس انصار اللہ جماعت احمدیہ امریکہ نے "فال" (خزاں) 97ء میں اپنے سہ ماہی رسالہ "النحل" کا ڈاکٹر عبدالسلام نمبر شائع کیا ہے (جلد 8 شمارہ نمبر 4)۔ اس میں محترمہ ڈاکٹر طاہرہ نسرین ارشد صاحبہ کا ایک مضمون بھائی جان کی شخصیت کے چند پہلوؤں کے بارے میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کے کچھ حصوں کا اردو ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

"میں نے پروفیسر عبدالسلام کو پہلی مرتبہ پاکستان ایٹمی توانائی سنٹر۔ لاہور میں اپنی تھیوری پر لیکچر دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں اس وقت انڈر گریجویٹ سٹوڈنٹ تھی۔ اس وقت ان پر ایک ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ اس روز جس بات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا تھا وہ ان کا سامعین کے دلوں میں حصول علم کے لیے جذبہ، محبت اور لگن پیدا کرنے کی تڑپ تھی۔ یہی خصوصیات ان کی زندگی میں نمایاں ہیں۔"

"میں فزکس پڑھنے کے لیے لیور پول (انگلستان) گئی تھی لیکن ابتداء ہی سے مجھے وہاں انتہائی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ میرے کہنے پر میرے ایک بزرگ نے ڈاکٹر عبدالسلام سے درخواست کی کہ وہ مجھے لیور پول یونیورسٹی سے امپیریل کالج لندن میں منتقل کرائیں لیکن ڈاکٹر صاحب نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ میں کامن ویلتھ وظیفہ کی وجہ سے وہاں داخل ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے میں ایسا کرنے سے بعد میں آنے والے طلباء پر منفی اثرات پڑنے کے امکانات زیادہ تھے (یونیورسٹی انتظامیہ اور کامن ویلتھ وظیفہ بورڈ کی جانب سے) جو ان کے لیے بعد میں آنے والوں کے لیے مشکلات کا باعث بن سکتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنے ملک سے بہت محبت تھی اور وہ یہ اپنے ملک اور اس کے عوام کی بھلائی انہیں ہمیشہ مقدم تھی۔"

"ڈاکٹر طاہرہ لکھتی ہیں کہ میں اپنے سابقہ شوہر جو نظری طبیعات کے عالم تھے' کے ہمراہ تقریباً 20 سال تک انٹرنیشنل سنٹر ٹریسٹ جاتی رہی۔ ہم وہاں عموماً" گرمی کی چھٹیوں میں جایا کرتے تھے۔ ان دنوں وہاں بہت گھما گھمی ہوتی تھی۔ کیونکہ اکثر سائنس دان وہاں گرمی کی چھٹیوں میں ہی جایا کرتے تھے۔ وہ وہاں نہ صرف اپنے کام میں مصروف رہتے بلکہ اس علاقہ کی خوبصورتی سے بھی پوری طرح لطف اندوز ہوتے تھے- وہاں مشرق اور مغرب سے آنے والے سائنسدانوں کا ملاپ ہوتا اور سنٹر انہیں ان کے تحقیقی نتائج شائع کرانے کے مواقع بھی فراہم کرتا تھا۔"

یہ واقعات 1983ء اور 1986ء کے درمیانی عرصہ کے ہیں۔

"ڈاکٹر سلام ٹریسٹ سنٹر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں جمعہ کی عبادت کیا کرتے تھے۔ وہاں آئے ہوئے دوسرے مسلمان بھی ان کی امامت میں عبادت میں شریک ہوتے۔ اگر کبھی کوئی معمر احمدی وہاں تشریف لاتے تو ڈاکٹر سلام ہمیشہ انہیں امامت کے لیے کہتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میرے سسر اٹلی کی سیاحت کرتے ہوئے ہمارے پاس ٹریسٹ تشریف لائے تھے تو ڈاکٹر صاحب نے ان سے امامت کے لیے کہا تھا۔ وہ تمام عمر اس بات کو بھلا نہیں سکے۔ ڈاکٹر سلام اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ وہاں ان کے یا کسی اور عقیدہ کی تبلیغ نہ ہو۔"

"جب کبھی لندن سے ان کے بچے ٹریسٹ آتے تھے تو ہمیں بہت خوشی ہوتی تھی۔ میرا بیٹا بلال اور ڈاکٹر صاحب کا چھوٹا بیٹا عمر سلام تقریباً ہم عمر تھے۔ ڈاکٹر سلام روزانہ اپنے کام پر جانے سے پہلے عمر سلام کو الجبرا کے سوال حل کرنے کے لیے دیا کرتے تھے جنہیں وہ میرے بیٹے کے ساتھ مل کر حل کیا کرتا تھا۔ غالباً" اسی بات کا اثر لیتے ہوئے میرے بیٹے نے ریاضی میں تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ایک مرتبہ ڈاکٹر سلام نے مجھ سے کہا کہ میں ان کے بیٹے عمر سلام کو "کلام الٰہی" پڑھا دیا کروں۔ میرے لیے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو سکتی تھی۔ میں نے فوراً" حامی بھر لی لیکن ڈاکٹر سلام نے یہ کہہ کر مجھے حیران کر دیا کہ وہ مجھے ایسا کرنے کا معاوضہ دیں گے۔ میں نے کسی قسم کا معاوضہ لینے سے انکار کیا لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی۔"

ہماری طرح بعض دوسرے سائنسدان ٹریسٹ کچھ لمبی مدت کے لیے آیا کرتے تھے۔ اس لیے وہ اپنے چھوٹے بچوں کو بھی ساتھ لے آتے تھے۔ ہمارے بچے وہاں ایک انٹرنیشنل سکول میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ وہ انگریزی طرز تعلیم کا واحد سکول تھا۔ اس سکول کی فیس بہت زیادہ تھی جس کی وجہ سے اکثر والدین فنڈز کی کمی کی وجہ سے مشکلات سے پریشان رہتے۔ ایک مرتبہ چند سائنسدانوں نے ہمت کر کے اس بارے میں ڈاکٹر سلام سے بات کی اور ان کی مدد چاہی۔ ڈاکٹر سلام کو جیسے ہی ان کی مشکلات کا علم ہوا تو انہوں نے فوراً" اس سکول کی انتظامیہ سے "جنگ" لڑی جس کی وجہ سے سکول کی انتظامیہ نے سنٹر میں کام کرنے والے سائنسدانوں کے بچوں کی فیس میں کمی کر دی بلکہ ٹریسٹ سنٹر نے ڈاکٹر سلام کی سفارش پر ایسے بچوں کی فیس اپنے پاس سے دینے کا فیصلہ کیا تھا۔"

”ڈاکٹر سلام کو جلد اس بات کا احساس ہو گیا کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ سائنس دانوں کو نظریاتی طبیعات میں تحقیق کرنے کے بجائے Applied Field میں تحقیق کرنی چاہیے کیونکہ نظریاتی طبیعات میں تحقیق اور کام کرنے والوں کے لیے ملازمتیں حاصل کرنے کے مواقع بہت کم ہوتے جا رہے تھے چنانچہ انہوں نے سائنسدانوں کو دوسرے فیلڈز میں کام کرنے کی ترغیب دینا شروع کر دی تھی اور بہت سے سائنس دانوں نے ان کی اس ہدایت پر عمل بھی شروع کر دیا تھا۔“

”ایک موسم گرما میں زمباوے سے ایک ہندوستانی نژاد سائنس دان اپنی بیوی کے ہمراہ ٹریسٹ سنٹر میں تحقیقی کام کے لیے آیا ہوا تھا۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ کسی وجہ سے اس کی بیوی کے بچے پیدائش سے قبل ہی ضائع ہو جاتے تھے۔ اس سال بھی اس کی بیوی امید سے تھی اور وہ اٹلی کے ڈاکٹروں کے زیر علاج تھی جنہوں نے اس کے مرض کی تشخیص کرلی تھی۔ بچے کی پیدائش میں ابھی کچھ وقت تھا کہ اس سائنس دان کے وظیفے کی معیاد ختم ہو گئی۔ اب انہیں زمباوے واپس جانا تھا لیکن وہ چاہتے تھے کہ ان کے بچے کی ولادت اٹلی میں ہی ہو لیکن ان کے پاس وسائل کی کمی تھی چنانچہ اس سائنس دان نے ڈاکٹر سلام کو اپنے مسئلہ سے آگاہ کرتے ہوئے ان سے درخواست کی کہ وہ ان کے وظیفے کی معیاد میں توسیع کر دیں مگر ڈاکٹر سلام ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ کچھ سوچنے کے بعد انہوں نے اس سائنس دان کو مشورہ دیا کہ وہ فوری طور پر شمسی توانائی میں تحقیق کرنے کے لیے درخواست دے کیونکہ اس میدان میں اسے ایک سال کے لیے وظیفہ دیا جا سکتا ہے چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اگرچہ شمسی توانائی میں تحقیق کا اسے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ اسے ایک سال کے لیے وظیفہ مل گیا اور وہ اٹلی میں ہی رہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے ایک صحت مند اور خوبصورت بچہ سے نوازا۔ وہ دونوں میاں بیوی ڈاکٹر سلام کے اس احسان کو نہ بھلا سکے۔“

ٹریسٹ سنٹر میں سائنسدان کے پاس چونکہ وقت محدود ہوتا ہے اس لیے وہ شب و روز کام میں لگے رہتے ہیں۔ اس سے بعض اوقات ان کی صحت بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ کسی مغربی ملک سے آیا ہوا ایک سائنس دان بیمار پڑ گیا۔ ڈاکٹر سلام کو جب اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے فوری طور پر اس سائنس دان کے لیے ایک ہفتہ کی رخصت منظور کی اور اسے سنٹر کی طرف سے دو صد ڈالر نقد دینے اور اسے کسی پہاڑی مقام پر جا کر آرام کرنے کے اور صحت ”بنانے“ کے لیے بھیج دیا۔ ایک ہفتہ کے آرام کے بعد وہ چاق و چوبند ہو کر واپس آیا۔“

ڈاکٹر طاہرہ نے یہ واقعات لکھنے کے بعد تحریر کیا کہ:

”ڈاکٹر صاحب ایک عظیم انسان تھے۔ انہوں نے بہت حساس طبیعت پائی تھی۔ انسانیت کے لیے ان کی محبت کو ہر ایک جانتا تھا۔ وہ ہر ذہین اور قابل انسان کی چاہے وہ کہیں بھی ہوتا ضرور مدد کرتے تھے۔ ان کی یہ شدید خواہش تھی کہ جس طرح صدیوں پہلے مسلم ممالک میں سائنس پھلی پھولی تھی اسی طرح مسلم

ممالک میں اس کا دوبارہ احیاء ہو۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کے اس خواب کو پورا کریں۔ ہم ہر میدان میں محنت کر کے سائنسی دنیا میں مسلمانوں کے لیے مقام پیدا کریں۔ بالکل اسی طرح جیسے ڈاکٹر سلام نے اپنے کام سے ہمارے لیے مثال قائم کی ہے۔ خدا کرے ان کا سائنسی کام ہمیشہ زندہ رہے اور ان کی یاد ہمارے دلوں سے کبھی محو نہ ہو۔"

قصہ اس ہیٹ (Hat) کا

سالہا سال سے بھائی جان ایک ہی ہیٹ (Hat) استعمال کر رہے جو شاید انہیں بہت پیارا تھا۔ ایک مرتبہ وہ لاہور آئے تو میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ جناب یہ ہیٹ اب بہت پرانا ہو گیا اس لیے اسے پھینکیں اور نیا ہیٹ خریدیں۔ میری بات سن کر انہوں نے کہا "میاں چنگا بھلا تے اے میں اینوں کیوں سٹاں۔" (میاں اچھا بھلا تو ہے میں اسے کیوں پھینکوں)

لاہور سے کراچی روانگی سے پہلے ہم انہیں ہوائی اڈے پر الوداع کرنے گئے۔ ہم وی آئی پی لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ پھر ان سے کہا کہ یہ ہیٹ یہیں چھوڑ جائیں۔ اس مرتبہ انہوں نے میری بات مان لی۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ جب وہ ہوائی جہاز پر سوار ہونے کے لیے جائیں گے تو وہ اپنا ہیٹ وہیں صوفہ پر ہی پڑا رہنے دیں گے۔ کچھ دیر بعد ان کی پرواز کی روانگی کا اعلان ہوا تو ہم سب لاؤنج کے قریب کھڑے ہوائی جہاز کی طرف پیدل چل پڑے۔ ابھی وہ ہوائی جہاز پر سوار نہیں ہوئے تھے کہ وی آئی پی کا ایک "فرض شناس" ملازم ہاتھ میں ان کا ہیٹ لیے ہوئے وہاں پہنچا اور بڑے فخر سے اس نے بھائی جان کو ہیٹ پکڑاتے ہوئے کہا "سر (Sir) آپ کا ہیٹ لاؤنج میں رہ گیا تھا۔" بھائی جان نے اپنا ہیٹ پکڑتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور ہماری طرف (بھائی عبدالسمیع اور میری طرف) "معنی خیز" نگاہ ڈالتے ہوئے مسکراتے اور ہوائی جہاز کی سیڑھیاں چڑھ گئے۔

27

بھائی جان کے بارے میں چند مضامین

ڈاکٹر عبدالسلام کی یاد میں

جی۔ ایم۔ پراچہ

(جی۔ ایم۔ پراچہ بھائی جان کے کلاس فیلو تھے۔ وہ حکومت پنجاب میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے کے بعد بطور ممبر پنجاب پبلک سروس کمشن ریٹائر ہوئے)

دنیا میں اب تک لاتعداد انسان ہو گزرے ہیں جنہوں نے غور و فکر اور تدبر سے کام لیا اور ہم پتھر کے زمانہ سے گزر کر آج خلائی دور تک آن پہنچے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ اور انسان اپنی تحقیقی صلاحیتوں سے کام لے کر نت نئے اصول وضع کرتا رہے گا۔ مسلمانوں نے اپنے عہد زریں یعنی دوسری' تیسری' چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں اعلیٰ پیمانے پر علوم کی تلاش اور تحقیق کی۔ ایسی ہی مبارک ہستیوں میں ابن رشد' بو علی سینا' البیرونی' جابر بن حیان' محمد بن زکریا' الرازی' ابن الہیثم' خوارزمی' مسعودی' قطب الدین الشیرازی اور ابن خلدون جیسے بڑے بڑے نام ہیں۔ ہمیں یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ یہ لوگ محض طبیعات دان ہی نہ تھے بلکہ انہوں نے طب' ریاضی' ارضیات' فلسفے اور فلکیات میں بھی اتنا ہی یا اس سے زیادہ اضافہ کیا تھا جس طرح آج کل علم کی کسی صنف میں۔

تحقیق کے واسطے' انگریزی تعلیم کا جاننا لازمی ہے۔ اس طرح یورپ میں نشاۃ ثانیہ سے پہلے (یعنی 14/15 صدی عیسوی تک) اس وقت کے علوم میں ریسرچ کے واسطے ضروری تھا کہ عربی زبان آتی ہو چونکہ تب تک ان تمام علوم پر مسلمان محققین نے عربی زبان میں ہی کام کیا تھا۔ ہمارے لیے یہ باعث فخر ہے کہ ڈاکٹر عبدالسلام جیسے سائنسدان نے پاکستان میں جنم لیا۔ وہ 29 جنوری 1926ء کو جھنگ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد جناب (چودھری) محمد حسین ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز جھنگ کے دفتر میں ہیڈ کلرک تھے۔ عبدالسلام نے میٹرک سے ایم۔ اے تک ہر امتحان میں پنجاب یونیورسٹی میں ہمیشہ اول پوزیشن حاصل کی اور ریکارڈ رکھا۔ تھرڈ ائیر میں انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ میں تب وہاں تھرڈ ائیر میں پڑھتا تھا اور ہم دونوں نیو ہوسٹل میں رہتے تھے۔ یہ 1942ء کی بات ہے۔ وہاں ان سے واقفیت

ہوئی جو دوستی میں بدل گئی۔ میرے دل پر ان کی جس خصوصیت کا سب سے زیادہ اثر ہوا وہ ان کی ذہانت کے ساتھ ساتھ استقامت اور وضع داری تھی جو ان کی طبیعت کا خاص جوہر تھا۔ عبدالسلام کو لاہور کی سیر کرانے میں اور ہمارے این۔ ایم ہاشمی نوٹ: (ان کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ مرتب) (ریٹائرڈ ڈائریکٹر سٹیٹ بنک آف پاکستان) سائیکلوں پر گھومتے رہے۔ قلعہ اور شاہی مسجد دیکھنے کے بعد رنجیت سنگھ کی مڑھی بھی دیکھنے گئے۔ اس کی سیڑھیوں کے ساتھ آویزاں بورڈ پر تحریر تھا "جوتے یہیں اتار دیں" ہم نے جوتے تو اتار دیئے لیکن انہیں ہاتھوں میں لیے اوپر چلے گئے۔ ابھی مڑھی والے کمرے کے اندر ہی تھے اور کچھ گستاخیاں کر چکے تھے کہ ایک نہنگ سردار ہاتھوں میں ننگی تلوار لیے آدھمکا اور ہمارے ہاتھوں میں جوتے دیکھ کر اس قدر برا ﷺ ہوا گویا مار ہی دے گا۔ ہم یہ صورت دیکھتے ہی فورا" پلٹے اور باہر آگئے۔ رسیدہ بود بلائے وے بخیر گزشت۔ اللہ کا شکر ادا کیا اور ہوسٹل کی راہ لی۔

ہوسٹل میں کافی طلباء رہتے تھے اور اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنے کمروں میں مصروف مطالعہ رہتے لیکن عبدالسلام صاحب کا طریقہ ان سے جدا تھا جب کمرہ کے اندر مصروف مطالعہ ہوتے تو دروازہ کے باہر یہ نوٹس آویزاں ہوتا "پڑھ رہا ہوں دخل انداز نہ ہوں (Studying do not disturb) وہ چارپائی پر نہیں بلکہ فرشی بستر پر سوتے اور اسی بستر پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر پڑھتے۔ کمرہ میں ہر طرف کتابیں بکھری ہوتیں۔ ان کی یہ عادت بعد میں بھی رہی جب وہ خود پڑھاتے تھے۔

عبدالسلام کا اور میرا ایک ہی ٹیوٹوریل گروپ تھا اور پروفیسر عبداللطیف خاں ہمارے ٹیوٹر ہوا کرتے تھے۔ 1944ء کے موسم گرما میں بی۔ اے کرنے کے بعد میں اپنے بڑے بھائی شیخ محمد علاؤ الدین صاحب (جو بعد میں سرویئر جنرل آف پاکستان کے عہدہ سے ریٹائرڈ ہوئے) کے پاس سولن گیا ہوا تھا (سولن مری کی طرح ایک پہاڑی مقام تھا۔ انڈیا میں ہے۔ مرتب) وہاں سے سیر کرنے شملہ گیا۔ تب گرمیوں میں سنٹرل گورنمنٹ اور پنجاب گورنمنٹ کے سیکرٹریٹ دفاتر شملہ میں ہوتے تھے۔ پروفیسر عبداللطیف خان اس وقت سنٹرل وزارت تعلیم میں تعینات تھے۔ شملہ میں انہیں بھی ملنے گیا۔ موصوف نہایت ملنسار اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ دوران گفتگو انہوں نے بتایا کہ عبدالسلام نے ایم۔ اے میں مضمون کے انتخاب کے سلسلہ میں ان سے مشورہ مانگا ہے۔ خاں صاحب نے مجھے جب کہا جب میں ایم۔ اے کے داخلہ کے واسطے کالج جاؤں تو عبدالسلام کو ریاضی میں ایم۔ اے کرنے کا ان کی طرف سے پیغام دوں چنانچہ عبدالسلام نے ریاضی میں داخلہ لے لیا اور حسب معمول یونیورسٹی کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اس کے بعد وہ مزید تعلیم کے واسطے کیمبرج یونیورسٹی انگلینڈ چلے گئے۔ وہاں انہوں نے ریاضی اور فزکس میں ڈبل ٹرائی پاس (نوٹ: ٹرائی پوز) کرنے کا امتحان امتیازی پوزیشن لے کر پاس کیا۔ فزکس ٹرائی پاس کے بارے میں مجھے بتاتے تھے کہ فزکس انہوں نے ایف۔ اے تک پڑھی تھی اور ٹرائی پاس کا امتحان بجائے تین سال کی پڑھائی صرف ایک سال کی تیاری کے بعد دیا۔ کہنے لگے کہ وہ ایک سال انہوں نے اتنی محنت کی کہ خدا کی پناہ۔ رات دن ایک کر دیا۔ ان کے دماغ میں ایک خیال سمایا ہوا

تھا کہ تعلیم کے دوران جو امتحانات دیئے ان میں ہمیشہ نمایاں پوزیشن حاصل کی اور خدانخواستہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ فزکس کے ٹرائی پاس میں (جو اس طرح کا آخری امتحان تھا) کہیں رہ نہ جائیں۔ وہ اس امتحان میں بھی سرخرو ہوئے۔

واپسی پر گورنمنٹ کالج لاہور میں ریاضی کے پروفیسر رہے اور پھر پنجاب یونیورسٹی میں ریاضی کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ۔ اس دوران میں نے مقابلہ کے امتحان کے بعد سول سروس جوائن کرلی تھی۔ جب بھی لاہور آتا تو ان سے ملاقات رہتی۔ مجھے بتایا کہ وہ واپس انگلینڈ جائیں گے تو میں نے کہا کہ ان کی قابلیت سے پاکستانیوں کو استفادہ کرنے کا حق ہے۔ اس پر گویا ہوئے کہ یہاں پر ریسرچ کے واسطے نہ ماحول ہے نہ مواد اور نہ سہولتیں ہیں جو انگلینڈ میں میسر ہیں اور یہ کہ ان کا مطمح نظر نوبل انعام حاصل کرنا ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام کا عقیدہ کچھ بھی ہو اس سے ہمارا کیا سروکار۔ وہ جانے اور اس کا رب' جہاں تک میں جانتا ہوں کہ ڈاکٹر عبدالسلام کو پاکستان سے سچی اور گہری محبت تھی۔ 1954ء سے وفات تک ڈاکٹر صاحب کی رہائش انگلینڈ میں رہی مگر انہوں نے وہاں کی شہریت حاصل نہ کی اور پاکستان کے شہری ہونے پر انہیں فخر تھا۔ جب اعلان ہوا کہ 1979ء میں فزکس میں نوبل انعام کے مستحق ڈاکٹر عبدالسلام ٹھہرے ہیں تو حکومت برطانیہ نے بہت کوشش کی اور لالچ دیئے کہ وہ برطانیہ کی شہریت حاصل کرلیں اس لیے کہ جب وہ انعام حاصل کریں تو بطور برطانیہ کے شہری کے مگر وہ نہ مانے اور بطور پاکستانی انہوں نے نوبل انعام وصول کیا۔ لباس انہوں نے اس وقت پاکستانیوں' پنجابیوں والا پہنا' شلوار قمیص اور اچکن' سر پر کلاہ اور طرہ دار پگڑی باندھی اور پاؤں میں دیسی جوتی (کھسہ) مجھے بتاتے ہیں کہ ساری عمر انہوں نے کبھی پگڑی نہ باندھی تھی اور یہ کہ آئینے کے سامنے کلاہ پر کلف شدہ پگڑی طرہ دار باندھنے میں انہیں بہت دیر لگی۔

پچھلے سال ڈاکٹر عبدالسلام کی وفات کے بعد میں ایک معاصر کا کالم پڑھا۔ جس سے مجھے دکھ ہوا۔ دانشور نے لکھا کہ "انعام لینے کے لیے جو چوغہ اور پگ پہن کر گئے وہ مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے جانشینوں کا پسندیدہ مخصوص لباس ہے۔ اس کا پنجاب کی روایتی ثقافت سے کوئی تعلق نہیں. یہ قطعاً" درست نہیں چونکہ انہوں نے چوغہ نہیں پہنا تھا بلکہ اچکن (شیروانی) پہنی تھی جو ہمارے قومی لباس کا حصہ ہے۔ مرزا غلام احمد نے کبھی کلاہ پر طرہ دار پگڑی نہ پہنی بلکہ کلاہ کے بغیر صرف پگ ہی باندھی۔

قابلیت کے لحاظ سے سر ظفر اللہ اور ڈاکٹر عبدالسلام کا بہت اونچا مقام ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ دونوں قادیانی تھے مگر کیا کوئی اسلامی ملک اپنی اقلیت کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ ترقی کے منازل طے کرے یا یہ کہ دنیاوی زندگی میں کسی غیر منصفانہ سلوک کی مستحق ٹھہرائی جائے؟ سر ظفر اللہ پاکستان بننے سے پہلے وائسرے ہند کے وزیر تھے۔ پاکستان بننے کے بعد وزیر خارجہ رہے۔ اس کے علاوہ انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے سات سال جج اور تین سال چیف جسٹس رہے اور ادارہ اقوام متحدہ کے پریذیڈنٹ رہے۔ اس طرح ڈاکٹر عبدالسلام پہلے پاکستانی اور کسی مسلمان ملک کے پہلے باشندے ہیں جنہیں نوبل انعام ملا۔ ڈاکٹر صاحب نے ساری زندگی نہایت سادگی

میں گزاری۔ خصوصاً" غذا میں آپ بڑی احتیاط برتتے۔ سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ صاف اور حلال اشیاء استعمال کرتے۔ جب آپ لندن سے ٹریسٹ (اٹلی) جاتے جہاں آپ نے ہفتہ عشرہ گزرانا ہوتا تو ان ایام کے لیے بیگم صاحبہ کا حلال گوشت سے تیار شدہ کھانا ساتھ لے جاتے جسے وہ فریج میں رکھ دیتے اور پھر وہ گرم کر کے قیام کے دوران استعمال کرتے۔ ڈاکٹر صاحب سحر خیزی کے بہت عادی تھے۔ لندن میں یا جہاں بھی ہوتے ان کا یہی معمول رہا اور علامہ اقبال کے اس شعر کی تفسیر بنے رہے۔

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی

73-1972ء کی بات ہے جب میں ڈپٹی کمشنر جھنگ تھا تو ڈاکٹر صاحب وہاں تشریف لائے اور تین چار روز میرے ہاں ڈی سی ہاؤس میں قیام کیا۔ تب پہلی دفعہ میں نے انہیں داڑھی رکھے ہوئے دیکھا۔ ہر طرح کی نمود و نمائش سے بے نیاز تھے۔ وہ سردیوں کے دن تھے۔ اور کوٹ پہنتے تھے اور سر پر وسطی اشیاء والوں کی طرح گرم ٹوپی ہوتی تھی۔ رات کو قریباً 3/4 بجے بیدار ہوتے اور اس وقت چائے پینا ان کا معمول تھا۔ یہ کام خانساماں کی بجائے اپنی بیٹی کے سپرد کیا کہ وہ الارم لگا کر سوئے اور وقت پر ڈاکٹر صاحب کو چائے بنا کر دے۔ ڈاکٹر صاحب اسے ڈھیروں دعائیں دیتے تھے۔ اس بچی نے بعد میں ایم۔ ایس۔ سی ہوم اکنامکس میں کیا اور پنجاب یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن لی۔ اس اعزاز کے حاصل کرنے میں ڈاکٹر صاحب کی دعاؤں کا بھی یقیناً" اثر ہو گا۔

گورنمنٹ ڈگری کالج جھنگ میں (جہاں سے انہوں نے ایف۔ اے کیا تھا) ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں ایک فنکشن ہوا۔ انہوں نے کالج کے مختلف شعبہ جات کا معائنہ کیا۔ سائنس لیبارٹری بھی دیکھی۔ وہاں بہت کم سامان تھا (بعد میں انہوں نے لندن سے کالج کی سائنس لیبارٹری کے واسطے ضروری سامان ارسال کیا) کالج ہال میں اساتذہ اور طلباء سے خطاب کیا۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ جدید دور سائنس کا دور ہے اور پاکستان میں اکثر طلباء کالجوں میں آرٹس کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور سائنس بہت کم حالانکہ ترقی کے واسطے جدید ٹیکنالوجی کی ضرورت ہے جو سائنس پڑھنے سے حاصل ہو گی۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے معاشرے کا بحیثیت مجموعی اور بالخصوص ہمارے نوجوانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ علوم کی تجدید کی ذمہ داری قبول کریں اور یہ کہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ اپنی نصف سے زیادہ افرادی قوت کو سخت سائنسی تربیت دیں اور یہ کہ ہمیں اپنی مجموعی قومی آمدن کا کم از کم ایک سے دو فیصد تحقیق پر خرچ کر کے اصولی اور اطلاقی علوم حاصل کرنے چاہئیں۔ انہوں نے طلباء کو مزید مشورہ دیا کہ وہ تن آسانی چھوڑ دیں اور خوب جی لگا کر محنت کریں اور زندگی میں ذاتی ترقی کے علاوہ ملک و قوم کی ترقی میں ممد و معاون ثابت ہوں۔

ڈاکٹر عبدالسلام بلا کے ذہین تھے۔ گفتگو کرتے تو گویا پھول جھڑتے اور سننے والا ان کی باتوں کا اثر لیے بغیر نہ رہ سکتا۔ آپ پاکستان میں تعلیم کی ناقص منصوبہ بندی پر بہت کڑھتے تھے۔ وہ سائنس کی تعلیم از حد

ضروری سمجھتے اور اس پر افسوس کرتے کہ پاکستان میں اس طرف بہت کم توجہ دی جا رہی ہے۔ وہ فرمایا کرتے کہ جدید ٹیکنالوجی حاصل کیے بغیر ملکی ترقی ناممکن ہے اور اس کے لیے ماڈرن سائنسی علوم کی تحقیق میں اپنی زندگی صرف کر دی۔ اور اس طرح اس میں انہیں مقبول عام کا درجہ حاصل ہو گیا جو کسی مقدر والے کو ملتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے سائنسی علوم میں ان کا ادراک و بصیرت حیرت انگیز تھے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اس عظیم المرتبت پاکستانی میں نئی پود کے اخذ و جذب کے واسطے بہت کچھ ہے۔ وہ سائنسی علوم کے بہت بڑے عالم تھے جو اپنی محنت شاقہ سے آسمان شہرت پر تابندہ ستارہ بن کر چمکے۔ 1979ء میں نوبل عشائیہ میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ طبیعات کی تخلیق تمام انسانیت کی مشترکہ میراث ہے۔ اسلام کی مقدس کتاب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہیں "تم رحمٰن کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے پھر پلٹ کر دیکھو کہیں تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ بار بار نظر دوڑاؤ تمہاری نگاہ تھک کر واپس لوٹ آئے گی۔" انہوں نے ارباب حل و عقد سے فرمایا کہ سائنس کی اہمیت اس فہم و ادراک میں مضمر ہے جو وہ ہمیں ہمارے اطراف کی دنیا اور منشاء الٰہی کے بارے میں عطا کرتی ہے۔ سائنس اپنے مادی فوائد کے اعتبار سے اہم ہے جو اس کی دریافتوں سے ہمیں حاصل ہو سکتے ہیں۔ بحیثیت مسلمان ہم بین الاقوامی سائنس کے مقروض ہیں اور عزت نفس کا یہ تقاضا ہے کہ ہمیں یہ قرض ادا کر دینا چاہیے۔ تاہم سائنسی تحقیق مسلم امہ کی گزشتہ صدیوں کی طرح ہمارے حکمرانوں کی فراخدلانہ سرپرستی کے بغیر فروغ نہیں پا سکتی۔ ہمارے ملک میں ایسی سائنس فاؤنڈیشنوں کی ضرورت ہے جنہیں سائنس دان چلائیں۔ ہمیں اپنی یونیورسٹیوں کے اندر اور باہر اعلیٰ تعلیم کے ایسے مراکز کی ضرورت ہے جو کسی رکاوٹ کے بغیر فراخدلانہ امداد تحفظ اور تسلسل فراہم کر سکیں۔

ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب سے میری پاکستان میں تدریسی عملہ کی بے قدری پر بات ہوئی۔ وہ فرمانے لگے کہ ترقی یافتہ ممالک میں اساتذہ کی بہت قدر ہے اور وہاں کے استاد بھی اپنے مقام اور فرض کو بخوبی پہنچانتے ہیں۔ انہوں نے ایک واقعہ سنایا (نوٹ: اصل واقعہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ مرتب) "مجھے لندن کی ایک تقریب میں انعام ملنا تھا چونکہ ایسے کوٹ ریڈی میڈ میسر نہیں آتے اور انہیں سلوانا پڑتا ہے چنانچہ اس مقصد کے لیے میں نے ٹیلرز کی ایک مشہور دکان پر فون کیا اور ٹیلر ماسٹر سے فرمائش کی کہ وہ اس طرح کا کوٹ مجھے دو ایک ہفتہ میں تیار کر دیں۔ اس پر ٹیلر ماسٹر نے معذرت کی اور کہا کہ وہ ایک ماہ سے سے قبل تیار نہ کر سکیں گے' اس پر میں نے کہا کہ میں پروفیسر عبدالسلام بول رہا ہوں اور لفظ پروفیسر پر زور دیا تو ٹیلر ماسٹر نے فوراً" کہا کہ جناب ہم تیار کر دیں گے۔ یہ ایک ادنیٰ سی مثال ہے۔ اس قدر و منزلت کی جو ترقی یافتہ ممالک میں اساتذہ کی ہے۔

آپ اپنے وطن کے بارے میں بہت حساس واقع ہوئے تھے۔ انہیں پاکستان کے وقار کو بلند کرنے اور اس کی ثقافت کو چار چاند لگانے کی ہمیشہ لگن رہی۔ ایک دفعہ وہ پاکستان سے واپس لندن گئے تو ان کے بھائی عبدالرشید بھی ہمراہ تھے۔ یہ بھائی عرصہ سے لندن میں ڈاکٹر صاحب کی خواہش کے مطابق مقیم ہیں اور ان کے پاس برطانیہ

کی شہریت ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس پاکستانی پاسپورٹ کے علاوہ ڈپلومیٹک (Diplomatic) اور یونائیڈ نیشن (United Nation) کے پاسپورٹ بھی تھے۔ ان کے بھائی تو امیگریشن والوں کو برطانیہ کا پاسپورٹ دکھا کر فورا" باہر آ گئے مگر ڈاکٹر صاحب نے اپنا پاکستانی پاسپورٹ دکھایا تو امیگریشن کے متعلقہ افسر نے کافی پوچھ گچھ شروع کر دی جس پر ڈاکٹر صاحب نے تنگ آ کر اپنا UNO کا پاسپورٹ دکھایا جس پر متعلقہ افسر نے معذرت کی۔ انہیں سلوٹ کیا اور فورا" فارغ کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے پاکستانی سفیر مقیم لندن کو لکھا کہ وہ برطانیہ کے محکمہ خارجہ کے نوٹس میں یہ بات لائیں کہ پاکستانی پاسپورٹ رکھنے والے مسافروں سے لندن ایئرپورٹ پر امیگریشن والے ایسا رویہ اختیار نہ کریں۔

ڈاکٹر عبدالسلام زندگی میں بہت اہم مناصب پر فائز رہے۔ ان میں سے کچھ چیدہ چیدہ یہ ہیں۔ پروفیسر آف فزکس امپریل کالج لندن (1957۔1993)' سائنٹیفک سیکرٹری جینوا کانفرنس (55۔ 1958ء) اٹامک برائے امن کے ضمن میں منعقد ہوئیں۔ ممبر پاکستان اٹامک انرجی کمشن (1958ء۔ 1974ء) چیف سائنٹیفک ایڈوائزر ٹو پریذیڈنٹ آف پاکستان (1961۔ 1974ء) ممبر پاکستان سائنس کونسل (1963 ۔ 1975) چیئرمین سپارکو (63۔1962ء) فاؤنڈر اینڈ ڈائریکٹر انٹرنیشنل سنٹر فاتھیورٹیکل فزکس ٹریسٹ (اٹلی) (1964ء۔ 1993ء) اور 1994ء سے اس سنٹر کے پریذیڈنٹ۔ ممبر مشاورتی کیمٹی برائے سائنس و ٹیکنالوجی یونائیڈ نیشن (1964۔ 1975ء) اور اس کے چیئرمین (1971۔ 1972ء) تیسری دنیا کے ممالک کے سائنٹیفک آرگنائزیشن کے پریذیڈنٹ 1988ء' ممبر بورڈ پاکستان سائنسز فاؤنڈیشن (1973۔ 1977ء) پاکستان' سویڈن اور بنگلہ دیش کی اکیڈمی آف سائنسز کے فیلو رہے۔ امریکن فزکس سوسائٹی کے بھی فیلو رہے۔ دنیا کی قریباً 40 یونیورسٹیوں نے انہیں آنریری ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگریاں دیں اور ڈھیر سارے ملکوں نے انہیں تمغے اور انعامات سے نوازا۔ حکومت پاکستان نے 1959ء میں انہیں ستارہ پاکستان اور پرائڈ آف پرفارمنس (نوٹ: پرائڈ آف پرفارمنس 1958ء میں دیا گیا) اور 1979ء میں انہیں نشان امتیاز سے مزین کیا۔ 1978ء میں امریکن انسٹی ٹیوٹ آف فزکس نے انہیں میڈل دیا اور 30 ہزار ڈالر انعام بھی۔ ڈاکٹر صاحب نے یہاں کوئی جائیداد نہ بنائی۔ یہ ان کا ایثار ہے کہ 30 ہزار ڈالر جو انعام ملا اور اتنی رقم ٹریسٹ فزکس سنٹر سے لی اور 60 ہزار ڈالر بنک میں جمع کرائے جس کے منافع سے مستحق پاکستانی طلباء کو وظائف ملتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ انٹرنیشنل سنٹر فار تھیورٹیکل فزکس ان کی کاوش سے اس واسطے معرض وجود میں آیا کہ اس میں تیسری دنیا کے ممالک کے طلباء کو سائنس کی اعلیٰ تعلیم دی جا سکے۔ ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے کہ یہ سنٹر پاکستان میں قائم ہو مگر یہ پاکستان میں قائم نہ کیا گیا کیونکہ حکومت پاکستان نے تعاون نہیں کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کو خطیر رقم جو نوبل انعام میں ملی۔ اس سے انہوں نے اپنے والد ماجد کے نام سے ٹرسٹ قائم کیا جو بلا امتیاز مذہب مستحق طلباء کو وظائف دیتا ہے۔

گزشتہ سال 1996ء جون میں میں لندن گیا۔ جب وہاں تھا تو پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب پر فالج کا حملہ ہوا

اور وہ صاحب فراش ہیں۔ یہاں سے میں نے انہیں خط بھی لکھے۔ ان کے گھر کا پتہ میرے پاس تھا۔ ایک دوست کی کار میں ان کے گھر پہنچا۔ مجھے بتایا گیا کہ باوجود سٹروک کے ان کا ذہن بالکل صاف اور یادداشت ٹھیک ہے۔ جب ان کی بہو نے انہیں کمرہ میں جا کر بتایا کہ ان کا دوست غلام مرتضیٰ پراچہ آیا ہے تو انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ میں اندر ملنے گیا تو میرا ہاتھ بڑی مضبوطی سے انہوں نے پکڑا اور کافی دیر میں ان کے پاس بیٹھا رہا اور پرانی باتیں کرتا رہا۔ مجھے مل کر ان کا بیمار چہرہ چمک اٹھا۔ بولنے کی کوشش کرتے مگر اچھی طرح صاف بات نہ کر سکتے تھے۔ ان کی بیگم اور ان کے بیٹے احمد سلام سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان کا پوتا قاسم عبدالسلام بڑا پیارا اور ہونہار بچہ ہے۔ اللہ ان کے خاندان کو خوش و خرم رکھے۔ میں اٹھنا چاہتا تھا مگر ڈاکٹر صاحب اٹھنے نہ دیتے تھے۔ اس روز جمعہ تھا اور میں نے نماز جمعہ ادا کرنی تھی۔ لہٰذا بمشکل ان سے اجازت لے کر بوجھل دل سے رخصت ہوا۔ ڈاکٹر صاحب بیماری میں بالکل لاغر اور کمزور ہو گئے تھے حالانکہ وہ اچھے قد کاٹھ کے مالک تھے۔ جب بھی پاکستان آتے تو ضرور ملاقات ہوتی۔

امریکن عیسائی مصنف مائیکل ہارٹ نے ایک کتاب "تاریخ میں ایک سو بڑی شخصیات" لکھی ہے اور اس میں رسول پاک کا نمبر ایک پر رکھا ہے۔ سائنس دان نیوٹن کو نمبر دو اور حضرت عیسیٰ کو نمبر تین پر۔ کتاب کے دیباچہ میں وہ لکھتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کو اس دنیا کے معزز ترین اشخاص میں پہلے نمبر پر اس واسطے رکھا کہ وہ اپنی زندگی میں ہی دین و دنیا دونوں میں نہایت کامیابی سے سرخرو ہوئے اور یہ کہ اپنی مسلسل جدوجہد سے وہ کچھ اپنی حیات طیبہ میں حاصل کر لیا جو ان کا نصب العین تھا۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہو گا کہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب ایسے خوش قسمت انسان تھے جنہوں نے اپنی زندگی میں وہ کچھ حاصل کر لیا جو ان کی خواہش تھی۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ ایسے انسان کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے بتائے ہوئے راستہ پر چل کر ہم اس دنیا میں اپنا مقام پیدا کر سکتے ہیں۔ خدا ہمیں اور ہماری حکومت کو اس کی توفیق عطا کرے۔ آمین۔

ڈاکٹر عبدالسلام کو ہم سے جدا ہوئے ایک سال ہو گیا ہے۔ وہ 21 نومبر کو 1996ء کو لندن میں فوت ہوئے ان کی وصیت کے مطابق انہیں پاکستان میں دفن کیا گیا۔

کچھ ایسے بھی اٹھ جائیں گے اس بزم سے
جن کو تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

(نوائے وقت 25 نومبر 1997ء)

اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

محمد ذکریا ورک (کینیڈا) نے عنوان بالا کے تحت بھائی جان کی وفات کے بعد ایک مضمون لکھا تھا۔ یہاں اس کی تلخیص دی جا رہی ہے:

”زندگی میں کینیڈا کے کئی ایک پرائم منسٹروں جن میں ٹروڈ (Trudeau) ملرونی (Mulroney) جین کریتن (Jean Chretien) قابل ذکر ہیں کے علاوہ کئی ایک وزراء سے ملاقات کا موقع ملا۔ مجھے فیض احمد فیض اور جوش ملیح آبادی سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ مگر جس شخص نے میرے ذہن و قلب پر انمٹ نقوش چھوڑا ان میں ڈاکٹر عبدالسلام کی شخصیت سب سے نمایاں ہے۔

میرا سب سے پہلا تعارف ان کی ذات سے احمدیہ ہال کراچی میں 1967ء کے لگ بھگ ہوا' جب آپ وہاں جمعہ ادا کرنے آئے تھے۔

جب آپ کو 1979ء میں نوبل انعام ملا تو میں نے ٹورنٹو کے ایک کمیونٹی اخبار میں آپ کی اس ناقابل یقین کامرانی پر انگریزی میں مضمون لکھا اور اس کی کاپی آپ کو لندن بھجوائی' جس کو آپ نے نظر استحسان سے دیکھا اور اپنے ایک خط میں اس کی تعریف کی' اس کے بعد میری ان سے باقاعدگی سے خط و کتابت ہوتی رہی۔

ایک دن میری خوشی کی انتہاء نہ رہی جب ایک روز مجھے آپ کا خط ملا کہ میں فلاں روز میڈیسن وسکانسن پہنچ رہا ہوں۔ اگر ملنا ہو تو آ جاؤ' چنانچہ میں ملواکی میں قیام کے بعد آپ سے ملنے یونیورسٹی آف میڈیسن کے اس ہال میں پہنچ گیا' جہاں آپ فروکش تھے۔ یہ دوپہر کا وقت تھا اور آپ لیکچر دینے کے بعد ستا رہے تھے اور بستر کے سرہانے دو تین سیب رکھے ہوئے تھے۔ دل نادان میں یہ خیال گزرا کہ دنیائے اسلام کے نیوٹن کے پاس بھی سیب۔ آپ نے معانقہ کیا اور بڑی شفقت سے سیب پیش کئے۔ پنجابی میں میرا اور میری اہلیہ کا تعارف ہونے کے بعد میں نے آپ سے اجازت مانگی کہ کچھ پوچھ سکتا ہوں؟ تو مسکرا کر فرمایا: ”بڑے شوق سے۔“

ان دنوں امریکہ میں پاکستان کے اسلامک نیوکلیر بم بنانے کا بہت چرچا تھا' میں نے نیویارک ٹائمز میں چند ایک مضامین بھی پڑے تھے۔ میں نے آپ سے استفسار کیا کہ مغربی میڈیا میں یہ کہا جاتا ہے کہ آپ پاکستان کی اس نیوکلیر بم بنانے میں مدد کر رہے ہیں؟ تو آپ مسکرا دیئے اور ایک منجھے ہوئے سفارت کار کی طرح جواب دیا: ”Its a double edged Sword“ (یہ دو دھاری تلوار کی طرح ہے) (یعنی جس کے پاس ایسی تلوار ہوتی ہے وہ خود بھی خطرہ میں رہتا ہے اور دوسرے بھی خطرے میں ہوتے ہیں---- مرتب)

تاریخ ساز انسان

محترم ڈاکٹر صاحب ایک تاریخ ساز انسان تھے۔ پانچ سو سال بعد امت مسلمہ میں ایک ایسا انسان پیدا ہوا جو الرازی' بوعلی سینا' الفارابی کے ہم پلہ کا سائنسدان تھا۔ جب سے اندلس میں مسلمانوں کا خاتمہ ہوا تب سے کوئی ایسا شخص پیدا نہ ہوا جس کے نام اور کام سے مسلمان فخر سے سر اٹھا کر بات کر سکیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام کی شخصیت گوناگوں پہلو رکھتی ہے آپ:

- ایک بہت بڑے سائنسدان تھے۔
- ایک قابل ذکر استاد تھے جس نے چالیس سال میں ہزاروں لائق و فائق شاگرد پیدا کئے۔
- ایک کہنہ مشق مقرر' ادیب اور فاضل محقق تھے جس نے دو سو پچاس سے زائد تحقیقی مقالے شائع کرائے۔
- ایک کامیاب منتظم تھے۔ اپنے ذاتی اثر رسوخ سے دنیا کا اعلیٰ ترین مرکز برائے نظریاتی طبعیات قائم کیا اور تیس سال تک اس کی راہنمائی کی۔
- سائنس کے ایک عظیم سفیر تھے۔ جس نے تیسری دنیا میں سائنس کے فروغ کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔
- آپ نے دنیا میں ایٹمی تباہی کو ختم کرنے اور بین الاقوامی امن کے قیام کے لئے اعلیٰ درجہ کی کمیٹیوں کی صدارت کی اور اس ضمن میں کئی براعظموں میں ہزاروں میل سفر کیا۔
- ایک وسیع القلب اور مشفق انسان تھے' جس نے بے شمار طلباء کے لئے وظائف کا انتظام کیا اور کم سرمایہ والے سکولوں اور کالجوں کو سائنسی سامان اپنی گرہ سے بھجوایا۔
- ایک محب وطن جس نے ساری عمر ایک ملک (پاکستان --- ناقل) کے پاسپورٹ پر سفر کیا۔
- پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کے پانچ سو سائنسدانوں' انجینئروں اور ٹیکنیشنوں کی اعلیٰ تعلیم کا مغرب اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں انتظام کیا اور انہیں وظائف دلائے۔
- ایک خدا ترس انسان تھا جس نے اسلام کے عالمگیر پیغام کی ہر جگہ اور موقعہ پر تشہیر کی اور جب اس کے فرقہ کو غیر مسلم قرار دیا گیا تو اپنے چہرہ کو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق مزین کر لیا۔ پھر جب اس کو نوبل انعام ملا تو بیت میں جاکر شکرانے کے نوافل ادا کئے۔
- نوبل انعام لینے والا وہ واحد اور پہلا شخص تھا' جس نے سویڈن کے بادشاہ اور ہزاروں حاضرین کے سامنے کلام الٰہی پڑھ کر سنایا اور پھر اس کے مطالب بیان کئے' وہ پہلا شخص تھا جس نے نوبل انعام لیتے وقت اپنا قومی لباس پہن رکھا تھا۔

بحیثیت سائنسدان

آپ ایک بین الاقوامی سطح کے بلند پایہ سائنسدان تھے۔ آپ کے نام کا چرچا مشرق و مغرب میں تھا۔ جمہوریہ چین کے وزیراعظم چو این لائی سے لے کر مراکش' سپین' اردن کے بادشاہ' تنزانیہ' وینزویلا اور امریکہ کے صدر جان ایف کینیڈی تک ان کی رسائی تھی۔ مختلف ممالک کے سیاست دان' وزیر اعظم' اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل سے لے کر ویٹیکن کے عزت ماب پوپ آپ سے سائنسی امور میں مشورہ کرتے تھے۔

سوال یہ نہیں کہ کیا آپ ایک قد آور سائنسدان تھے؟ کیونکہ اس کا اعتراف تو مغرب کے بڑے بڑے سائنسدان کر چکے ہیں۔ سٹیفن ہاکنگ (برطانوی سائنسدان' ماہر فلکیات' بگ بینگ اور بلیک ہول کے بارے میں بہت کام کیا ہے۔ ٹرینی کالج کیمبرج میں نیوٹن کی چیئر اس کے پاس ہے۔ 24 سال کی عمر میں وہ ایک پراسرار اعصابی بیماری کا شکار ہو گیا جس نے آہستہ آہستہ اس کی تمام قوتیں سلب کر دیں۔ لیکن اس کا دماغ ہوشیار ہے وہ اپنے بستر کے پاس رکھے ہوئے کمپیوٹر کے بٹن سے تمام کام کر لیتا ہے--- ناقل) اپنی معروف کتاب "بریف ہسٹری آف ٹائم" جس کی 2 کروڑ کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں' میں لکھتا ہے:

"The weak nuclear force was not well understood until 1967, when Abdus Salam at Imperial College London, and Steven weinberg at Harvard both Proposed theories that unified this interaction with electromagnetic force, just as Maxwell had unified electricity and magnetism about a hundred year earlier ---- page 71

ترجمہ: (از مرتب)

"1967ء تک خفیف نیوکلیائی قوت کو اچھی طرح سے نہیں سمجھا گیا تھا' جب تک امپریل کالج لندن میں عبدالسلام اور ہارورڈ میں سٹیون وائن برگ نے اسے برق مقناطیسی قوت کے ساتھ وحدت میں پرو دیا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک سو سال پہلے میکسویل نے برقی اور مقناطیسی قوتوں کو یکجا کیا تھا۔"

فزکس میں آپ نے جو سنہرا کارنامہ سرانجام دیا وہ آئن سٹائن کے کام سے کچھ کم نہ تھا۔ اس عظیم سائنسدان نے اپنی متاع حیات کے آخری تیس سال اس مشکل کام میں صرف کیئے کہ وہ کسی طرح کائنات کی چار بنیادی قوتوں میں سے دو (کشش ثقل اور برق مقناطیس) کو متحد کر سکے مگر وہ اس میں ناکام رہا۔ یہ کام عبدالسلام نے سرانجام دیا صرف یہ ایک چیز آپ کو نیوٹن' میکسویل' فیراڈے اور آئن سٹائن کے ہم پلہ قرار دیتی ہے۔

آپ اتنے بڑے سائنسدان کیسے بن گئے؟ شاید آپ فطری طور پر پیدائشی سائنسدان تھے۔ شاید یہ آپ کے والد کی شبینہ دعاؤں کا اثر تھا۔ ممکن ہے کہ آپ کے والد نے گھر میں جو ایسا علمی ماحول پیدا کیا کہ ذہن کو جلا ملی' اس کا آپ پر اثر ہو۔ آپ لوگوں کو دلیل کی قوت سے قائل کر لیتے تھے۔ آپ کی طبیعت میں جوش و خروش تھا۔ آپ صاحب بصیرت تھے۔ آپ کا زرخیز ذہن چھری کی دھار کی طرح تیز تھا۔ آپ نظم و نسق کے سخت پابند تھے۔ آپ کا حافظہ بلا کا تھا۔ آپ کو لکھنے کی استعداد خدا نے فراخدلی سے دی تھی۔ دھیمی مگر پر کشش آواز' چہرہ پر سحر آفریں ذہانت' مطالعہ کے رسیا' علم و حکمت جذب کرنے کی بے پناہ اہلیت' شاید ان خوبیوں نے آپ کو ایسا افضل سائنسدان بنا دیا۔

پارٹیکل (ذرات) فزکس کے افق پر آپ چالیس سال تک ماہتاب بن کر چمکے اور ذراتی طبعیات کو نت

نئی راہوں سے روشناس کراتے رہے۔ اس ضمن میں آپ نے اتنی زمین شکن نظریات پیش کئے کہ ان کے بیان کے لئے ایک دفتر درکار ہو گا۔

مذہب اور سائنس

سائنسدان ہونے کے ساتھ آپ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر پختہ یقین رکھتے تھے۔ اخلاص اور منکسر المزاجی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اسلام کے پیغام پر آپ کا یقین غیر متزلزل تھا۔ سائنسی علوم آپ کو خدا کی یاد سے محو نہ کر سکے۔ دین الہی سے والہانہ وابستگی آپ کا ایسا طرہ امتیاز تھی کہ غیر بھی متاثر ہوتے۔ چنانچہ پروفیسر جان زیمان نے اس کا بیان کچھ یوں کیا ہے۔ "عبدالسلام کی زندگی اور کارہائے نمایاں دونوں میں ایک ہی تصور کارفرما ہے اور وہ ہے ارتباط اور اتحاد۔ عبدالسلام دین الہی پر یقین رکھتے ہیں اور انہوں نے پنی زندگی کو نظریہ وحدت کے لئے وقف کر دیا ہے۔"

(محمد ذکریا درک صاحب نے یہ مضمون مجھے براہ راست بھجوایا تھا---- مرتب)

عبدالعزیز خالد

بشکریہ روزنامہ "پاکستان" 5 دسمبر 1996ء

وطن میں اجنبی

پاکستان کے مایہ ناز فرزند، شہرہ آفاق سائنس دان ڈاکٹر عبدالسلام نے آخر جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ یہ ان کی سرزمین وطن سے گہری بے غبار اور اٹوٹ محبت کا ثبوت ہے کہ ان کی وصیت کے مطابق ان کے جسد خاکی کو اسی خاک پاک نے اپنی آغوش میں لیا۔ وطن کی مٹی کی پکار بھی جہاں آدمی کی آنول نال گڑی ہو، وہ ندا کی "یا اخی" کی صدا ہے کہ اسے سن کر سننے والا بے اختیار لبیک کہتا ہوا پکارنے والے کی طرف دوڑتا ہے اور پھر اس کے پراسرار وجود کے نہاں خانے میں غائب ہو جاتا ہے۔ علامہ مشرقی کے بعد یہ غالباً دوسرے نابغہ روزگار سائنس دان ہیں، جن کا قرآن سے شغف عشق کی حد تک بڑھا ہوا ہے۔ پچھلے دنوں ان کے مضامین کا مجموعہ "ارمان اور حقیقت" دیکھنے کا اتفاق ہو، جسے ممتاز شاعر و دانشور شہزاد احمد نے انگریزی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ اپنے مضامین میں بار بار یہ صاحب دل شخص عالم اسلام اور خصوصاً ارض پاکستان کی سائنس اور علوم و معارف سے بے اعتنائی و محرومی پر رنجیدہ و دل گرفتہ نظر آتا ہے۔ وہ بار بار مسلمانوں کی ذہنی پسماندگی پر آنسو بہاتا ہے۔ انہیں ان کے اسلاف کے عملی کارناموں کی یاد دلاتا ہے، جنہوں نے یورپ کو اس کی گہری نیند سے جگایا اور احیائے علوم کے دور کا آغاز کیا، مگر تاسف سے کہتا ہے کہ بیدار بخت دوسروں کو جگا کر خود خواب غفلت میں کھو گئے اور ایسے کھوئے کہ ابھی تک غنودگی کے عالم میں ہیں۔ مصنف وحدت آدم کے زندگی افروز تصور سے اس قدر جڑا ہوا ہے کہ بار بار

جان ڈن کا یہ اقتباس پیش کرتا ہے۔

"کوئی انسان بھی جزیرہ نہیں ہے اور نہ ہی اپنی ذات میں محدود ہے۔ انسان براعظم کا ایک جزو ہے' بڑے کل کا ایک حصہ ہے۔ کسی بھی شخص کی موت سے مجھ میں کمی واقع ہو جاتی ہے کیونکہ میں انسانیت میں رچا بسا ہوں اور اس لئے یہ معلوم کرنے کے لئے کسی کو نہ بھیجو کہ گھنٹیاں کس کے لئے بج رہی ہیں۔ یہ تمہارے لئے ہی بجتی ہیں۔"

اس عبارت سے مجھے اپنی تاریخ کا یہ واقعہ یاد آتا ہے۔

جنازے پر ابوالدردا نے دیکھا
ایک ایسے کو جو سب سے پوچھتا تھا
جنازہ ہے یہ کس کا' کون ہے یہ؟
ابوالدردا یہ سن کر اس سے بولے
جنازہ ہے یہ تیرا ہی' یہ تو ہے!

پاکستان کے لئے اس غریب الدریار کا دل کس قدر کلپتا اور کڑھتا ہے۔ "ہم پاکستان کے رہنے والے بہت غریب ہیں۔ ہم اس مفلس دنیا (عالم الفقراء---- خ) کی پیشتر آبادی کے حصے دار ہیں جو غربت کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے۔ ہماری غربت سے نہ صرف مادی بلکہ روحانی مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ رسول کریمؐ کا ارشاد ہے کہ مفلسی کفر کے مترادف ہے۔

مجھے اجازت دیجئے کہ میں پورے جوش و خروش کے ساتھ یہ اعلان کروں کہ میں چاہتا ہوں کہ ہر مذہبی ادارے کے دروازے پر رسول کریمؐ کی یہ حدیث آویزاں ہونی چاہیے۔ کفر کے اور بھی کئی روپ ہو سکتے ہیں' مگر میرے خیال میں کفر کا اس وقت بیسیویں صدی میں سب سے واضح اور متعلق روپ یہی ہے کہ غربت کی انفعالی طور پر برداشت کیا جائے اور قوم کے اندر یہ ارادہ ہی موجود نہ ہو کہ اسے ختم کرنا ہے۔"

وہ جاپان کی مثال دیتا ہے: "جاپان نے پچھلی صدی کے آخر میں جب میسحی منشور لاگو کیا تھا تو میسحی شہنشاہ نے پانچ حلف اٹھائے تھے۔ ایک حلف کی رو سے قومی سائینسی پالیسی کا آغاز ہوا۔ علم کی جستجو تمام ذرائع سے کی جائے گی۔ علم دنیا کے جس کونے سے بھی میسر آسکے کا حاصل کیا جائے گا اور اس کے لئے جاپان کے تمام وسائل استعمال کئے جائیں گے تاکہ جاپان کو تحفظ اور عظمت حاصل ہو۔" جیسا کہ الکندی نے 1100 برس پہلے لکھا تھا کہ ہمارے لئے یہی مناسب ہے کہ ہم سچ کو تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہ کریں اور اس کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کریں۔ خواہ وہ کہیں سے بھی میسر آئے۔ خواہ اسے لانے والے غیر ملکی لوگ ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ جسے سچ کی تلاش ہے' اس کے لئے سچ سے بڑھ کر اور کوئی

شے نہیں۔ ”سچ کبھی اس کو شرمندہ اور رسوا نہیں کرتا۔“ قرآن نے سائنس کے حصول پر زور دیا ہے۔ ان 250 آیات کے برعکس جو قرآن پاک میں قانون سازی کے لئے ہیں۔ 750 آیات میں قرآن حکیم نے جو سارے کلام پاک کا آٹھواں حصہ ہیں۔ مومنوں سے کہا ہے کہ وہ قدرت کا مطالعہ کریں اور عقل کا بہترین استعمال کریں اور سائنسی عزم کو معاشرتی زندگی کا حصہ بنائیں! قرآن مقدس ہمیں اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ ہم اللہ کے بتائے ہوئے قانون قدرت پر غور کریں۔ میں پورے انکسار کے ساتھ اسلامی ممالک سے اپیل کرنا چاہتا ہوں' آپ میں سے بعض کو اللہ نے بڑی فیاضی سے نوازا ہے۔ یہ آپ کے آباؤ اجداد تھے' جنھوں نے آٹھویں' نویں' دسویں اور گیارہویں صدی میں بین الاقوامی سائنسی تحقیق کی شمع روشن رکھی تھی۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے بیت الحکمت قائم کئے تھے۔ جو سائنس کے اعلیٰ ادارے تھے۔ ایک بار پھر فیاضانہ رویہ اختیار کیجئے۔ ایک باصلاحیت فنڈ قائم کیجئے۔ جو سب مسلمان ممالک کے لئے عرب اور ترقی پذیر دونوں طرح کے ممالک کے لئے تاکہ کوئی اعلیٰ صلاحیت والا سائنس دان ضائع نہ ہونے پائے۔“

اسلام کی مقدس کتاب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تو رحمان کی آفرینش میں کوئی اختلاف و بے ربطی نہ دیکھے گا' پھر پلٹ کر دیکھ کیا تو کوئی بگاڑ (کوئی شگاف) دیکھتا ہے؟ 3:67

پھر دوبارہ (سہ بارہ) نظر کر' نظر تیری طرف ہر طرف حیرت سے تھک کر لوٹ آئے گی۔ فی الحقیقت تمام ماہرین طبعیات کا یہی ایمان ہے' جتنی گہرائی تک ہم تلاش میں اتریں اتنی ہی ہماری حیرت بڑھ جاتی ہے اور اسی تناسب سے ہماری آنکھیں چندھیا جاتی ہیں' قرآن میں ایک بھی آیت ایسی نہیں جہاں مظاہر قدرت کو بیان کیا گیا ہو اور وہ اس سے متضاد ہو جو سائنس دانوں کی دریافت میں یقینی طور پر درست ہے۔ اسلامی تاریخ میں کوئی گلیلیو جیسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ اذیت رسائی' جماعت سے نکال دینا' جو بدقسمتی سے نظریاتی اختلافات کے سلسلے میں آج بھی جاری ہے' مگر میرے علم کے مطابق بلاواسطہ طور پر سائنسی معتقدات کے سلسلے میں کبھی ایسا نہیں ہوا۔

مغربی سائنس یونانی---- اسلامی وراثت ہے۔ عام طور پر اعتراض اٹھایا جاتا ہے کہ اسلامی سائنس مانگے تانگے کی سائنس تھی۔ یہ کہ مسلمانوں نے اندھا دھند یونانی نظریاتی روایت کا تتبع کیا تھا اور سائنسی طریق کار میں کوئی اضافہ نہیں کیا تھا۔ یہ ایک جھوٹا بیان ہے۔

بریفالٹ کی زبان میں ”مشاہدے کا طویل تفصیلی اور صبر آزما کام اور تجرباتی استفسار یونانی مزاج کے لئے اجنبی تھے' جس شے کو ہم سائنس کہتے ہیں وہ تجرباتی طریق کار' مشاہدے اور پیمائش کے نتیجے میں ابھری اور یہ سب کچھ عربوں نے یورپ میں متعارف کروایا تھا۔ جدید سائنس اسلامی تمدن کا بہت قد آور شراکتی اضافہ ہے۔“ انہی خیالات کا اظہار جارج سارٹن نے کیا ہے جو سائنس کے عظیم مورخ ہیں۔

قرون وسطیٰ میں سب سے بڑا اور سب سے بدیہی کار نمایاں تجرباتی روح کی تخلیق تھی اور یہ سب کچھ بنیادی طور پر بارہویں صدی تک مسلمانوں کی وجہ سے تھا۔"

کتاب مقدس اور رسول کریمؐ کی تعلیمات اس بات پر زور دیتی ہیں کہ علم حاصل کرنا مسلمانوں کا فریضہ ہے اور انہیں پنگھوڑے سے قبر تک ایسا کرنا چاہیے۔ البیرونی جو ایک ہزار سال پہلے غزنی میں آباد تھا' اس کی موت کی کہانی ایک ہم عصر نے بیان کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے سنا کہ البیرونی مر رہا ہے۔ میں تیزی سے اس کے گھر کی طرف گیا تاکہ آخری بار اس کی صورت دیکھ سکوں۔ جب اسے بتایا گیا کہ میں آیا ہوں تو اس نے آنکھیں کھولیں اور کہا: "تم فلاں فلاں ہو!" میں نے کہا: "ہاں۔" اس نے کہا: "مجھے بتایا گیا ہے کہ تم اسلامی وراثت کے ایک مشکل مسئلے کا حل جانتے ہو۔" اور پھر اس نے ایک معروف چیستان کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے کہا: "ابو ریحان! کیا اس وقت تم اس کا جواب چاہتے ہو؟" اس پر اس نے کہا: "تمہارے خیال میں یہ بہتر نہیں ہے کہ میں آگاہ ہو کر مروں بجائے اس کے کہ میں میری جان غفلت میں نکلے؟" میں نے دکھے ہوئے دل کے ساتھ جو کچھ مجھے معلوم تھا اسے بتا دیا۔ پھر میں نے اس سے اجازت چاہی۔ میں ابھی اس کے گھر سے باہر بھی نہیں نکلا تھا کہ مجھے اندر سے چیخوں کی آواز سنائی دی۔ البیرونی مر چکا تھا۔

آخری خیال کے طور پر میں ایک بار پھر کلام پاک کا ایک اقتباس پیش کروں گا کہ وہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی محض آواز (تلاوت) ہی مارماڈیوک پکتھال کے الفاظ میں "انسانوں کو رلانے یا وجد میں لانے کے لئے کافی ہے۔" کسی بھی اور شے سے زیادہ مجھے اس کا تجربہ ہے۔ وہ دوامی حیرتوں کا ذکر کرتی ہے۔ میں نے ذاتی طور پر اپنی سائنس میں اس کا تجربہ کیا ہے کہ اگر سمندر میرے رب کے کلمات کے لئے سیاہی بن جائے تو سمندر ختم ہو جائے گا' قبل اس کے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں' اگرچہ ہم اسی جیسا (اور اس کی) مدد کو لائیں۔ 18۔109 اور زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب قلمیں بن جائیں اور سمندر سیاہی ہوں' اس کے بعد سات سمندر اور ہوں (اور ان کی سیاہیاں) تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔ بے شک اللہ زبردست حکمت والا ہے۔ 27:31

سارے مضامین اسی جذبے اسی عقیدت' اسی دردمندی سے مملو ہیں' مگر ہم اہل پاکستان نے اپنے اس جلیل القدر فرزند کے ساتھ کس سرد مہری' بیگانگی اور لاتعلقی کا سلوک کیا؟ ہم نے اپنے پندار میں اس زریں اصول کو پس پشت ڈال رکھا ہے' ہر انسان کو عقائد کے معاملات میں مکمل آزادی ہونی چاہیے۔ عقائد میں اختلاف کی بناء پر کسی انسان کو اس کے بنیادی حقوق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اتنا ضرور ہے کہ افراد کے عقائد معاشرتی زندگی میں وجہ فساد نہ ہوں۔"

ہمارے سلام کو دنیا ہمیشہ یاد رکھے گی

ٹرسٹے سنٹر ICTP کا نام تبدیل کر کے سلام سنٹر رکھ دیا گیا

(منیر احمد خان صاحب سابق چیئرمین پاکستان اٹامک انرجی کمیشن)
شکریہ ''دی نیوز'' 21 نومبر 1997ء)

پاکستان کے واحد نوبل انعام یافتہ سائنس دان اور بیسیویں صدی کے دس عظیم ترین ماہرین طبعیات میں سے ایک ڈاکٹر عبدالسلام گزشتہ سال جلا وطنی کی حالت میں لندن میں وفات پا گئے۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنے وطن کے لئے بے شمار اعزازات حاصل کئے اور سائنس کی دنیا میں پاکستان کے تاثر کو بہت بہتر بنایا۔ وطن کے اس مایہ ناز فرزند کی نعش آخری خواہش کے مطابق تدفین کے لئے پاکستان لائی گئی مگر آپ کے تابوت کو بھی کسی اعزاز اور گارڈ آف آنر کے ساتھ وصول نہیں کیا گیا۔ جھنگ میں جہاں آپ نے پرورش پائی تھی، آپ کی تدفین بڑی خاموشی کے ساتھ ہوگئی۔ (سہواً لکھا گیا ہے ورنہ آپ کی تدفین ربوہ میں ہوئی ہے---- مترجم) ہمارے اعلیٰ حکام نے انہیں اس لئے نظرانداز کیا کہ وہ احمدی ہونے کے باعث غیر مسلم تھے۔ لیکن درحقیقت وہ ایسے پاکستانی تھے جو اپنے وطن عالم اسلام اور تیسری دنیا کے لئے باعث عزت تھے۔ مگر ہماری کم نگاہی اور سیاسی مصلحتوں نے ہمیں ایک ایسے شخص کو خراج تحسین پیش کرنے سے بھی روک دیا جس نے ہماری خاطر بہت کچھ کیا ہے۔

ہم تو ڈاکٹر عبدالسلام کو نظرانداز کر سکتے ہیں مگر دنیا انہیں ہمیشہ یاد رکھے گی۔ چھوٹے لوگوں نے آپ کے مفاد کو چھوٹا کر کے دکھانے کی جو کوشش کی ہیں وہ ناکام رہی ہیں، کیونکہ آپ تو درحقیقت اس دور کے عظیم ترین انسانوں میں سے ہیں، اس لئے آپ کی شہرت کو داغدار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہم ڈاکٹر عبدالسلام کے عظیم کارناموں کو حقیر کر کے دکھانے کی کوشش کریں گے تو ہم خود دنیا کی نظروں میں حقیر ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر عبدالسلام کی وفات کے بعد ہم ان کی کوئی یادگار تعمیر کرنے میں بھی پس و پیش کر رہے ہیں۔ حالانکہ بددیانت رہنماؤں، جاہل ماہرین تعلیم اور خود اپنی قابلیت کا ڈھونڈورا پیٹنے والوں کے نام پر ہم نے سڑکوں، پلوں اور اداروں اور شہروں کے نام خود ان کی زندگیوں میں رکھے ہیں۔ حالانکہ انسان کی حقیقی قدر و منزلت کی پہچان اس کے مرنے کے بعد ہوتی ہے۔ سٹالن کی طرح کے ظالم آمروں اور جھوٹے اور جعلی ہیروز کے نام تاریخ بڑی بے رحمی سے مٹا ڈالتی ہے۔ لیکن ہمارے سلام کو دنیا ہمیشہ یاد رکھے گی۔

اٹلی کے شہر ٹریسٹ میں آپ کی وفات کی پہلی برسی کے موقعہ پر عصر حاضر کے مشہور ترین اور اہم ترین ماہرین طبعیات کے اجتماع میں جس میں کئی نوبل انعام یافتہ بھی شامل تھے۔ عالمی شہرت رکھنے والے

نظریاتی طبعیات کے ادارہ (ICTP) کا نام تبدیل کر کے عبدالسلام سنٹر رکھ دیا گیا ہے۔ جدید تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ ایک عظیم ادارے کا نام تیسری دنیا کے ایک سائنس دان کے نام پر رکھا گیا ہے۔ یہ پاکستانی حکومت کی خواہش پر نہیں کیا گیا بلکہ ادارے کی سرپرستی کرنے والوں کا اپنا فیصلہ ہے۔ ان سرپرستی کرنے والوں میں اٹلی کی حکومت' انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی اور اقوام متحدہ کی تعلیمی سائنسی اور ثقافتی تنظیمیں شامل ہیں۔ اٹلی کی حکومت اپنے کسی نوبل انعام یافتہ کے نام پر اس کا نام رکھنے کے لئے اصرار کر سکتی تھی کیونکہ وہ اس ادارے کا 80 فیصد خرچ جو 15 ملین ڈالر سالانہ ہے دیتی ہے۔ یہ ان سب کی فراخ دلی ہے کہ انہوں نے ایک ایسے شخص کے نام پر اس کا نام رکھا جس نے ساری دنیا کے فائدے کے لئے یہ علمی درسگاہ تعمیر کی۔

دنیا کے عظیم ماہرین طبعیات ڈاکٹر عبدالسلام کا بے حد احترام کرتے تھے کیونکہ انہوں نے انسان کے علم میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے۔ آپ نے چار بنیادی قوتوں کے متعلق ثابت کیا کہ وہ درحقیقت تین ہیں۔ چار بنیادی قوتیں کشش ثقل' مضبوط نیوکلیائی طاقت' برقی مقناطیسی طاقت اور کمزور نیوکلیائی طاقت ہیں۔ آپ نے ثابت کیا کہ کمزور نیوکلیائی طاقت اور برقی مقناطیسی طاقت دراصل ایک ہی ہیں۔ چار بنیادی قوتوں کو ایک ثابت کرنے کی جانب یہ ایک بہت عظیم قدم تھا اور یہ وہ مقصد ہے جس کیلئے تمام ماہرین طبعیات کوشاں ہیں۔

دنیا کے مشہور ماہرین طبعیات محض علمی پیاس بجھانے کے لئے تحقیق کرتے ہیں مگر ڈاکٹر عبدالسلام کی جستجو کا سفر خالق کائنات کی واحدانیت پر ایمان کے ساتھ آگے بڑھا ہے۔ ان کا اعلان یہ تھا کہ چونکہ یہ تمام قوتیں خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں' اس لئے بالآخر یہ ایک ثابت ہوں گی' کیونکہ ان کا منبع و ماخذ ایک ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام اپنی زندگی کے آخری سالوں میں ریاضی اور طبعیات کی مدد سے یہ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ زندگی کا عمل اور خلیات کی تقسیم کا عمل کیسے آگے بڑھا ہے۔ انہیں اس کام کو مکمل کرنے کی مہلت نہیں ملی مگر اس میدان میں آپ کی پیش رفت سے ممکن ہے کہ بعض دوسرے لوگ مدد لے کر اس مسئلہ کو حل کر سکیں اور نوبل انعام کے حقدار ٹھہریں۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے اگرچہ 45 سال جلا وطنی میں گزارے مگر آپ پاکستان کو کبھی بھی نہیں بھولے۔ بہتوں نے آپ کو پاکستانی شہریت واپس کرنے کی ترغیب دی اور اس کے لئے کئی لالچ دیے مگر آپ نے ہمیشہ انکار کیا۔ یہاں تک کہ جب برطانیہ کی ملکہ کی طرف سے آپ کو نائٹ کا خطاب مل چکا تھا تب بھی آپ اس بات کے لئے تیار نہیں ہوئے کہ اپنے ملک کی شہریت واپس کر کے کسی اور ملک کی شہریت قبول کر لیں۔ آپ پاکستان پر ایمان رکھتے تھے اور اسے پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے تھے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کو

پاکستان کی اقتصادی اور سماجی ترقی کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ آپ چودہ سال تک پاکستان کے تین صدور کے سائنسی مشیر رہے اور اس حیثیت سے آپ نے بار بار انہیں یہ ترغیب دی کہ وہ سائنس' ٹیکنالوجی اور تعلیم میں زیادہ سرمایہ کاری کریں۔ بہت سے ایسے کمیشن جنہوں نے ان شعبوں میں ترقی کے لئے منصوبے تیار کئے آپ ان کے سربراہ رہے۔ مگر بدقسمتی سے آپ کی سفارشات سیاسی رہنماؤں اور پالیسی بنانے والوں نے ہمیشہ نظرانداز رکھیں۔ آپ نے صدر ایوب خان کو یہ مشورہ دیا کہ امریکہ سے قرضوں کی بجائے ٹیکنالوجی حاصل کی جائے۔ اسی لئے صدر کینڈی نے Revalle Mission پاکستان بھیجا جس کا مقصد سیم اور تھور کے مسائل کا جائزہ لینا تھا۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے خلائی تحقیق کے لئے سپارکو کی تعمیر و تشکیل کے منصوبے پر بھی کام کیا۔

ڈاکٹر عبدالسلام پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے 14 سال تک ممبر رہے اور اس کے کئی منصوبوں اور کاموں میں مدد دیتے رہے۔ Pinstech اور Kanupp کے قیام میں بھی آپ کا تعاون شامل تھا۔ اگر صدر ایوب آپ کی سفارشات کو قبول کر لیتے تو پاکستان ری پروسسنگ پلانٹ اور دیگر سہولتیں ساٹھ کی دہائی میں ہی حاصل کر لیتا جب کہ وہ کم قیمت پر اور عالمی پابندیوں کے بغیر مہیا ہو سکتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب مشرقی بھی تھے اور مغربی بھی۔ آپ کو ایک عالمی احترام نصیب ہوا۔ مختلف ممالک کے بادشاہ' صدور' وزرائے اعظم آپ کا استقبال کرتے تھے اور آپ کے مشورے کے متمنی رہتے تھے۔ آپ کے اعزاز میں ایک مرتبہ چین میں ایک عشائیہ دیا گیا جس میں چینی وزیر اعظم مہمان خصوصی کے طور پر شامل تھے۔ یہ بات سب کے لئے حیران کن تھی کہ چینی صدر نے سفارتی آداب و روایت کے برعکس اس تقریب میں شمولیت کا فیصلہ کیا کیونکہ وہ اس عظیم انسان سے ملنا چاہتے تھے۔

تیسری دنیا میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے لئے آپ نے بہت سے کام کئے' ترقی پذیر ممالک کے سائنس دانوں کی باقی دنیا سے علیحدگی کو ختم کرنے کے لئے آپ نے ٹریسٹ میں ICTP کا ادارہ قائم کیا۔ (آپ جو گورنمنٹ کالج لاہور کے زمانے میں ایسی ہی تنہائی اور علیحدگی کا شکار رہ چکے تھے) یہ ایک ایسا ادارہ ہے جہاں غریب ممالک کے سائنسدان امیر ممالک کے سائنس دانوں سے مل سکتے ہیں۔ یہی وہ ادارہ ہے جہاں سرد جنگ کے زمانے میں مشرق اور مغرب کے سائنس دان رابطہ کر سکتے تھے۔ اس واسطے کے ذریعے ترقی پذیر ممالک کے سائنس دانوں اور محققین کو ایک جوش اور ولولہ نصیب ہوا' جو اپنے وقت کے عظیم دماغوں سے ملے بغیر ممکن نہیں تھا۔ انہی لوگوں نے اپنے ممالک میں واپس جا کر سائنسی ترقی کے لئے کام کا آغاز کیا جو آج پھول پھل رہا ہے۔ آپ کا سائنس کے متعلق نظریہ بے حد وسیع تھا اور آپ اسے ترقی کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ آپ نے کمپیوٹرز' لیزر' جینٹک' انجینئرنگ' بائیو ٹیکنالوجی جیسے شعبوں

کے لئے تھرڈ ورلڈ اکیڈمی اور دوسرے مراکز تحقیق بنائے۔ آپ نے نہ صرف شمال اور جنوب کے مابین تعاون کی حوصلہ افزائی کی بلکہ مشرق و مغرب کے مابین بھی تعاون کی فضا قائم کی۔

ڈاکٹر عبدالسلام اپنی تمام عزت و عظمت و شہرت کے باوجود ہمیشہ ایک عاجز اور منکسرالمزاج انسان رہے۔ آپ نے کبھی اپنے مقام اور مرتبہ کو دولت جمع کرنے کی اور محلات تعمیر کرنے کے لئے استعمال نہیں کیا۔ نوبل انعام کی رقم میں سے آپ نے ضرورت مندوں کو وظائف دینے کا اعلان کیا۔ نوجوان سائنس دانوں کے لئے ڈاکٹر عبدالسلام ہمیشہ ایک نمونہ اور ماڈل کے طور پر رہیں گے۔ آپ کی شدید خواہش تھی کہ پاکستان میں فزکس کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کا ادارہ ہو۔ پاکستان میں منعقد ہونے والے ایک سالانہ سیمینار کے متعلق آپ کو امید تھی کہ یہ ایک ایسے ادارے کے قیام پر منتج ہوگا جو پھر پاکستان میں ماہرین طبعیات اور ریاضی کی ایک نئی نسل کو جنم دے گا۔ آپ خود یہاں آ کر لیکچر دینا چاہتے تھے۔ مگر بدقسمتی سے ایک ایسے مرکز کی تجویز نوکر شاہی کی دلدل میں پھنس گئی اور باہمی جھگڑوں کی نذر ہو گئی۔ پاکستان کے ماہرین طبعیات جو بہترین خراج تحسین ڈاکٹر صاحب کو پیش کر سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ اختلافات سے بالاتر ہو کر ایک ایسا ادارہ قائم کریں جہاں نوجوان سائنس دان ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے نقش قدم پر چل سکیں۔"

28

بھائی جان کے ''ہیرو'' فری مین ڈائی سن کا

انہیں خراج تحسین

فری مین ڈائی سن (Freeman Dyson) طویل عرصہ تک انسٹی ٹیوٹ فار ایڈوانس سٹڈی' پرنسٹن' نیوجرسی' امریکہ سے منسلک رہے۔ مشہور سائنس دان البرٹ آئن سٹائن اس انسٹی ٹیوٹ کے پہلے ڈائریکٹر تھے۔

ڈائی سن ایک مشہور سائنسدان ہیں۔ انہوں نے اور جاپان کے ٹوموناگا(Tomo Naga) امریکہ کے جولین شونگر (Julia Schwinger) اور رچرڈ پی فائن مین (Richard P Feynman) نے 1949ء میں کوانٹم الیکٹروڈائی نیمکس (Quantum Electrodynamics) نظریے کے تقریباً تمام مسائل حل کر لئے تھے۔ اس کام کے لئے آخر الذکر تینوں کو 1965ء میں فزکس کا نوبل انعام دیا گیا تھا۔ لیکن ڈائی سن کی یہ بدقسمتی تھی کہ وہ یہ اعزاز حاصل نہیں کر سکا۔

مارچ 1950ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے بھائی جان کو ریسرچ کرنے کے لئے جو موضوع دیا گیا تھا وہ کوانٹم فیلڈ تھیوری کے ری نارملائزیشن (Renormalization) نظریے کے متعلق تھا' دوسرے الفاظ میں اس نظریہ کا مکمل ری نارملائز ہونے کا ریاضیاتی ثبوت فراہم کرنا۔ ایسا ثبوت اس وقت تک کسی سائنسدان نے پیش نہیں کیا تھا۔

بھائی جان نے جب اس موضوع پر تحقیق شروع کی تو انہیں راہنمائی کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ انہوں نے ڈائی سن سے رابطہ کیا جو ان دنوں انگلینڈ کے شہر برمنگھم آئے ہوئے تھے۔ ان کی دعوت پر وہ برمنگھم چلے گئے اور ڈائسن کو اپنا مسئلہ بتا کر اس سے راہنمائی چاہی تو اس نے کہا کہ ''میرے پاس اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں اس بارے میں تو میری صرف رائے ہے۔'' ڈائی سن کی زبانی یہ الفاظ سنتے ہی اُن کو اپنے پاؤں تلے سے زمین سرکتی محسوس ہوئی' کیونکہ وہ ڈائی سن کو اپنا ''ہیرو'' سمجھتے تھے جو ان کے نزدیک کوانٹم الیکٹروڈائی نیمکس تھیوری کا چمپئین تھا۔ برمنگھم سے وہ واپس کیمبرج چلے گئے اور اپنی تحقیق میں مصروف ہو گئے۔ اللہ نے ان کی راہنمائی کی اور چند ماہ کے بعد (اکتوبر 1950ء) انہوں نے ری نارملائزیشن

کا مکمل ریاضیاتی ثبوت معلوم کر لیا' جس کی وجہ سے انہیں راتوں رات عالمی شہرت مل گئی اور ان کا شمار طبعیات کے صف اول کے علماء میں ہونے لگا۔

ڈائی سن ان کے کام سے بے حد متاثر ہوا اور انہیں اپنی انسٹی ٹیوٹ میں ایک سال کے لئے فیلو منتخب کرایا۔ اس طرح بھائی جان نے ڈائی سن کے زیر نگرانی ایک سال تحقیقات کی۔

چونکہ ڈائی سن بھائی جان سے بہت اچھی طرح سے واقف تھا' اس لئے امریکن فلوسوفیکل سوسائٹی (American Philosophical Society) نے اسے بھائی جان کی وفات کے بعد ان کے بارے میں ایک مختصر تعارفی مضمون لکھنے کے لئے کہا۔ ڈائی سن کے مضمون کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

"عبدالسلام 1926-1996ء"

عبدالسلام ہمارے دور کی عظیم شخصیات میں شمار ہوتا ہے۔ وہ ایک بڑا سائنسدان' ایک اعلیٰ منتظم اور عظیم ترین شعور کا مظہر جو بنی نوع انسان کی دو تہائی غریب آبادی میں سائنسی علوم کی ترقی کا خواہاں تھا۔

میں پہلی مرتبہ اسے انگلینڈ میں ملا تھا۔ اس وقت اس کی عمر چوبیس سال تھی۔ پاکستان جسے نئی نئی آزادی ملی تھی کہ پریشان کن حالات سے نکل کر وہ انگلینڈ تعلیم حاصل کرنے کے لئے آیا تھا۔ میں اس وقت کوانٹم الیکٹروڈائی نیمکس تھیوری کا ماہر تصور کیا جاتا تھا' اسے ملنے کے بعد مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس تھیوری کے بارے اس کا علم اتنا ہی گہرا ہے جتنا میں اس کے بارے میں جانتا تھا۔ اس وقت اس نے مجھ سے مشورہ کیا تھا کہ وہ کس موضوع پر ریسرچ کرے۔ میں نے اسے تراکب لامتناہیوں (Overlapping Divergence) پر ریسرچ کرنے کے لئے کہا تھا۔ پچھلے دو سال سے میں اسی موضوع پر تحقیق کر رہا تھا لیکن ناکام رہا۔ سلام نے صرف چند ماہ کے اندر یہ مسئلہ حل کر لیا تھا۔

ایک سال بعد وہ مجھے زیورچ (سوئٹزرلینڈ کا ایک شہر--- مترجم) میں ملا۔ اس نے سکالر الیکٹروڈائی نیمکس (Scalar Electrodynamics) پر ابتدائی تحقیق مکمل کی تھی' جس کے نتائج وہ ولف گینگ پاؤلی (Wolf Gang Pauli) کو دکھانا چاہتا تھا۔ پاؤلی یورپ میں الیکٹروڈائی نیمکس تھیوری پر سند مانا جاتا تھا۔ (1954ء میں اسے فزکس کا نوبل انعام دیا گیا تھا--- ناقل) میرے کہنے پر پاؤلی سلام سے ملاقات کرنے پر تیار ہو گیا۔ رسمی تعارف کے بعد سلام نے کہا: "پروفیسر پاؤلی کیا' آپ مہربانی فرما کر میرے ان کاغذات کو دیکھ کر مجھے اپنی رائے سے آگاہ فرمائیں گے؟" سلام کی بات سن کر پاؤلی نے کہا کہ "میں اپنی آنکھوں کے استعمال کے بارے میں بہت محتاط ہوں' اس لئے میں تمہارے کاغذات نہیں دیکھوں گا۔" اسی پر دونوں کی بات چیت ختم ہو گئی۔ پاؤلی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد سلام اس کے کمرے سے باہر چلا گیا۔ پاؤلی کے اس رویہ پر اس نے غصہ یا مایوسی کا قطعاً کوئی اظہار نہ کیا۔ کیونکہ اسے اپنی قابلیت کا پوری طرح علم تھا۔ البتہ میں نے پاؤلی کی بدتمیزی اور اس کے غیر مہذب رویہ پر سلام سے معافی چاہی تو اس نے صرف اتنا کہا کہ "مجھے پاؤلی پر افسوس ہے کہ اس نے ایک دلچسپ بات جاننے کا موقع کھو دیا ہے۔"

زیورچ آنے سے پہلے سلام نے انگلینڈ میں اپنی تعلیم تقریباً مکمل کرلی تھی' اب وہ اس کشمکش میں مبتلا تھا کہ کیا وہ پاکستان چلا جائے یا نہیں؟ میری رائے میں اگر وہ انگلینڈ یا امریکہ میں رہنے کا فیصلہ کرتا تو ریسرچ میں روشن مستقبل اس کا منتظر تھا۔ کیونکہ اس وقت وہ فہم و فراست کی بلندیوں کو چھو رہا تھا اور طبعیات کے ابھرتے ہوئے علماء میں وہ سب سے ممتاز تھا۔ لیکن اس کے ضمیر نے اسے ایسا کرنے کی اجازت نہ دی۔ اس کا کہنا تھا کہ پاکستان نے اپنی غربت کے باوجود انگلینڈ میں اس کی تعلیم اور رہائش وغیرہ کے تمام اخراجات برداشت کئے تھے' اس لئے پاکستان واپس جاکر اپنے ہم وطنوں کی خدمت کرنا وہ اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے۔ اس طرح وہ پاکستان کا "قرض" چکا سکے گا' پھر بھی میں نے اسے یہی مشورہ دیا کہ وہ امریکہ میں پانچ برس ریسرچ کرنے کے بعد اپنے وطن واپس جائے' لیکن اس نے میرے مشورہ کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ "میں واپس جا رہا ہوں کیونکہ فزکس میرا انتظار کر سکتی ہے' لیکن میں اپنے ہم وطنوں کو انتظار نہیں کرانا چاہتا۔"

سلام 1951ء میں لاہور واپس چلا گیا اور وہاں تین برس رہا' اس کے لئے وہ انتہائی مایوسی کے سال تھے۔ لاہور کے کچھ "دانا" لندن سے آئے ہوئے ایک پچیس سالہ غیر معمولی ذہین نوجوان سے کچھ سیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ سلام کو یہ توقع تھی کہ وہ پاکستان کے نوجوانوں میں تعلیم حاصل کرنے کی روح پھونک دے گا اور وہ اس سے سائنس پڑھ کر اپنی سوسائٹی کو جدید خطوط پر استوار کرنے کے ساتھ ساتھ سائنسی علوم بھی پھیلائیں گے' لیکن وہاں کے "داناؤں" نے اسے اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیا اور وہ وہاں کے فرسودہ نصاب تعلیم کے دائرہ کے اندر رہتے ہوئے ریاضی اور فزکس پڑھاتا رہا۔

اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ جدید سائنس اور سائنسدانوں سے عملاً اس کا رابطہ منقطع ہوتا جا رہا ہے۔ تین سال بعد اسے شدت سے احساس ہوا کہ اپنے ملک سے باہر رہ کر وہ اس کی زیادہ بہتر خدمت کر سکے گا۔ اسی لئے 1954ء میں وہ انگلینڈ واپس چلا گیا اور وہاں اس نے ریسرچ شروع کر دی۔ 1957ء میں اس نے امپیریل کالج لندن میں پروفیسر کا عہدہ قبول کرلیا جس پر وہ آخر دم تک قائم رہا۔ اس کے فوراً بعد پاکستان کے صدر نے اسے اپنا سائنسی مشیر اعلیٰ مقرر کیا' جس کی وجہ سے اس کے اثر و رسوخ کا دائرہ وسیع ہو گیا اور اس کا شمار اپنے ملک کی نمایاں شخصیات میں ہونے لگا اور وہ ان "داناؤں" سے زیادہ معزز ہو گیا۔

1950ء میں سلام سے اپنی پہلی ملاقات میں' میں اس کی قابلیت اور فہم و فراست کا قائل ہو گیا تھا' وہ نوجوان ریاضی کی مشکل مساوات اتنی ہی سرعت سے حل کرلیتا تھا جتنا جلدی میں انہیں حل کیا کرتا تھا۔ دس سال بعد وہ مجھ سے بہت آگے نکل گیا۔ میں ابھی ریاضی کی مساوات ہی حل کرنے میں مصروف ہوتا جبکہ وہ علم طبعیات کے مشکل مسائل کی اصلیت معلوم کر رہا ہوتا تھا۔ میں ریاضی کے پرانے نظریات (Theories) پر ہی تحقیق کر رہا ہوتا جبکہ وہ نئی مساوات تخلیق کر رہا ہوتا۔ برق مقناطیسی قوت اور کمزور

نیوکلیر قوت کی یکجائی اور وحدت پیمائی کے لئے وہ دس برس تک ریسرچ کی تاریک گلی کوچوں میں بھٹکتا رہا' بالآخر 1967ء میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ دوسری طرف سٹیون وائن برگ اور شیلڈن گلشو الگ الگ تحقیق کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے جس پر سلام پہلے پہنچ چکا تھا۔ چھ سال بعد ان تینوں کی پیش کردہ تھیوری کو تجربات نے صحیح ثابت کر دیا تھا۔ الیکٹرو ویک تھیوری نے جن خیالات کو پیش کیا تھا' انہیں پارٹیکل فزکس کے سٹینڈرڈ ماڈل میں سمو دیا گیا۔ سلام' وائن برگ اور گلشو کے اس کارنامہ پر انہیں 1979ء میں فزکس کا نوبل انعام دیا گیا تھا۔ سلام نے بڑی خاموشی سے اپنے انعام کی ساری رقم نادار طلباء کو وظائف دینے کے لئے وقف کر دی تھی۔ ''اسلام پر میرے ایمان نے اس فیاضی اور بلند حوصلگی کو میرے لئے آسان کر دیا تھا۔'' اس نے بعد میں بتایا۔

سلام نے غریب ممالک میں بنیادی سائنس کے معیار کو بلند کرنے کے لئے ٹریسٹ (اٹلی--- ناقل) میں انٹرنیشنل سنٹر برائے نظریاتی طبعیات قائم کیا۔ یہ سنٹر اس کے خواب کی تعبیر ہے۔ تیسری دنیا سے آنے والے سائنسدانوں کو یہ سنٹر مالی امداد کے علاوہ رہائش کی سہولت بھی مہیا کرتا ہے۔ ان سہولتوں کی وجہ سے وہاں عارضی کام کرنے والے سائنسدان اپنے ممالک میں نہ صرف اپنی ملازمت برقرار رکھتے ہیں بلکہ ریسرچ خصوصی توجہ سے کرتے ہیں اور دوسرے ممالک سے آنے والے سائنسدانوں سے ان کا میل جول رہتا ہے اور وہ سائنسی برادری کا حصہ بن جاتے ہیں۔ انہیں تحقیق کے نتائج شائع کرنے میں بھی سہولتیں دی جاتی ہیں۔ اس سنٹر کو قائم کرنے کا سلام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ تیسری دنیا کے سائنسدان سائنسی طور پر بار آور رہیں اور انہیں اپنا ملک چھوڑنے پر مجبور نہ ہونا پڑے جیسے اُسے مجبوراً ہجرت کرنا پڑی تھی۔ چنانچہ اسی سنٹر میں تحقیق کے لئے جو کوئی بھی آتا ہے' اسے نہ تو کوئی مایوسی ہوتی ہے اور نہ ہی وہ اپنے وطن کو ترک کرنے کے بارے میں سوچتا ہے۔

ابتداء ہی سے یہ سنٹر پارٹیکل فزکس کے لئے محدود نہیں کیا گیا تھا۔ یہاں دوسرے سائنسی علوم کے علاوہ پلازمہ فزکس' ماحولیات کی تجزیہ نگاری اور مولیکیولر بیالوجی (Molecular Biology) جیسے مضامین کے لئے بھی مجالس منعقد کی جاتی ہیں۔ جن میں مہمانوں کو خوش آمدید کہا جاتا ہے۔

1955ء اور 1958ء میں جنیوا میں ایٹم برائے امن کے سلسلے میں ہونے والی کانفرنسوں میں سلام نے بطور سائنٹیفک سیکرٹری خدمات سرانجام دی تھیں۔ اسے نیوکلر فشن (Nuclear Fission) اور نیوکلیر فیوژن (Nuclear Fusion) دونوں سے لگاؤ تھا کیونکہ دونوں قوت کا سرچشمہ ہونے کے علاوہ سائنسی مسائل کے لئے چیلنج ہیں۔ اس کی رائے میں ترقی پذیر ممالک کے لئے بنیادی اور اطلاقی سائنس یکساں طور پر ضروری ہے۔ اس سنٹر میں آنے والے زیادہ تر بنیادی سائنسی پر کام کرتے ہیں لیکن اطلاقی سائنس کو کم تر نہیں سمجھا جاتا۔

اس سنٹر کو قائم رکھنے کے لئے سلام نے تیس سال کامیاب جدوجہد کی تھی۔ فنڈز جمع کرنے کا اس

میں ایک اعلیٰ وصف تھا۔ اس نے اطالوی حکومت' ٹریسٹ کے شہریوں' اقوام متحدہ' انٹرنیشنل ایٹمی توانائی ایجنسی وی آنا اور بے شمار فاؤنڈیشوں اور سرپرستوں سے رقوم جمع کیں۔

بطور ڈائریکٹر اس نے انتظامی امور کو احسن طریقے سے سنبھالنے کے علاوہ اس سنٹر کو دانشمندانہ قیادت بھی بہم پہنچائی' لوگوں کو سائنس میں جستجو کرنے اور ایک دوسرے کے قریب لانے میں یہ سنٹر کامیاب ہوا۔ یہ سلام کے عزم اور بصیرت کی نشانی ہے' اس کے لئے اس نے اپنا سب کچھ وقف کر رکھا تھا۔

تیسری دنیا کے لئے سلام ہمارے کندھوں پر ایک بڑی بھاری ذمہ داری ڈال گیا ہے' جسے ہم صحیح طور پر پوری نہیں کر رہے۔ امیر ممالک غریب لوگوں کی مدد کرنے میں اتنے مائل نظر نہیں آتے جتنے آج سے تیس سال پہلے تھے۔

ان مختصر یادوں کو میں قرآن (حکیم--- ناقل) کے ان الفاظ سے ختم کرنا چاہتا ہوں۔ سلام اکثر جن کا حوالہ دیا کرتا تھا: "اللہ (تعالیٰ) کبھی بھی کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی (اندرونی) حالت کو نہ بدلے۔"

(الراعد: 12--- ناقل)

29

ارمان اور حقیقت کے لئے بھائی جان کی ایک تحریر

ورلڈ سائنٹیفک پبلشنگ کمپنی سنگاپور نے بھائی جان کی چند تقاریر اور مضامین Ideals and realities کے نام سے شائع کئے تھے۔ ان کی اکثر کتابوں اور مضامین کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا تھا لیکن اردو میں ایسا نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ان کی خواہش پر پاکستان کے نامور ادیب اور شاعر شہزاد احمد (نوٹ: حکومت پاکستان نے 1997ء میں شہزاد احمد کو ادب اور شاعری کے لئے "تمغہ حسن کارکردگی اور انعام" دیا تھا۔) نے اس کتاب میں سے چند چیدہ چیدہ مضامین کا اردو ترجمہ کیا اور بھائی جان کی منظوری کے بعد انہیں "ارمان اور حقیقت" کے نام سے شائع کیا۔ ایسا کرنے سے پہلے وہ بھائی جان سے ملتے رہے۔ مجھے یاد ہے کہ بھائی جان سے ان کی ایک ملاقات 1989ء میں میرے غریب خانہ اسد جان روڈ لاہور چھاؤنی پر بھی ہوئی تھی، جس میں برادرم راجہ غالب احمد بھی تھے۔ راجہ صاحب نے ہی شہزاد احمد کو بھائی جان سے متعارف کرایا تھا۔

"ارمان اور حقیقت" کے لئے شہزاد احمد کی خواہش پر بھائی جان نے اردو میں ایک مضمون لکھا تھا' جسے اس کتاب میں "ابتدائیہ" کے طور پر شامل کیا گیا۔ اس مضمون میں بیان کردہ باتیں آج بھی قابل توجہ ہیں۔ اس لئے شہزاد احمد کی اجازت سے وہ مضمون یہاں دیا جا رہا ہے۔

بھائی جان کی سفارش سے اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو نے ارمان اور حقیقت کی ایک ہزار جلدیں خرید کر مختلف تعلیمی اداروں میں تقسیم کی تھیں۔

شہزاد احمد نے مجھے بتایا کہ "ڈاکٹر سلام نے ان سے کوئی رائلٹی نہیں لی تھی۔" انہوں نے مزید بتایا کہ "ارمان اور حقیقت کی فروخت سے انہیں سب سے زیادہ منافع ملا۔"

ابتدائیہ

یہ میرے لئے بہت خوشی کی بات ہے کہ میرے چند مضامین کا ترجمہ ایک کتاب کی صورت میں اُردو میں شائع ہو رہا ہے۔ اردو ہماری قومی زبان ہے' اس کے ذریعے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے مخصوص موضوعات پر اردو میں بھی لکھا جائے مگر مشکل یہ ہے کہ ان باتوں سے دلچسپی رکھنے والے لوگ اکثر اوقات انگریزی لکھتے پڑھتے ہیں۔ ترقی اور تحقیق کا زیادہ تر کام اسی زبان میں ہو رہا ہے۔ اس لئے بین الاقوامی سطح پر مسائل اٹھانے اور ان پر گفتگو کرنے کے لئے ہمیں انگریزی ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے' انگریزی کو اس وقت وہی علمی حیثیت حاصل ہے جو قرون وسطیٰ میں عربی کو حاصل

تھی۔ اس وقت دنیا کا بیشتر علم عربی میں منتقل ہوا کرتا تھا۔ کسی زبان کو یہ منصب عطا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسے بولنے والے علمی اور سائنسی مسائل میں اس قدر مشغول ہوں کہ اس زبان کو سیکھے بغیر نئے علوم تک رسائی مشکل ہو جائے۔

اب تک دنیا کی کئی زبانوں میں میری کتابوں اور مضامین کا ترجمہ ہو چکا ہے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اردو میں ایسا نہیں ہوا۔ (اگرچہ بعض مضامین اردو میں منتقل کئے گئے ہیں) چند ایک تقریریں اور تحریریں اردو میں موجود ہیں' لیکن میری ذاتی خواہش تھی کہ میرے خیالات اردو پڑھنے والوں تک پہنچیں۔ میرے بہت سے مضامین کا تعلق براہ راست پاکستان کے مسائل سے ہے یا ان ملکوں کے مسائل سے جنہیں تیسری دنیا کہا جاتا ہے اور پاکستان ان میں بھی شامل ہے۔ پھر اردو زبان محض پاکستان تک محدود نہیں ہے' بھارت کے علاوہ بھی بہت سے ملک ایسے ہیں جہاں اردو دان طبقہ خاصی تعداد میں موجود ہے۔

میری یہ بھی خواہش رہی ہے کہ تیسری دنیا کے ملک اور خاص طور پر اسلامی ملک سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی اور تحقیق کی روایت قائم کریں' اس سلسلے میں لکھے ہوئے میرے چند مضمون زیر نظر کتاب "ارمان اور حقیقت" "Ideals And Realities" میں بھی شامل ہیں۔ اس لئے میں اس وقت اس موضوع پر کوئی زیادہ بات کرنا نہیں چاہتا' فی الحال صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ ہم نے بہت وقت ضائع کر دیا ہے لیکن اگر اب بھی کوشش کی جائے اور ایمانداری اور خلوص سے کوشش کی جائے تو ہم چند ہی سالوں میں اس قابل ہو سکتے ہیں کہ ترقی یافتہ قوموں کے شانہ بشانہ چل سکیں۔ ماضی میں ہم نے مشعل برداری بھی کی تھی' پورے قرون وسطیٰ کے دوران علم کی شمع ہم نے ہی روشن رکھی تھی' اگر ہم پوری طرح باعمل ہو جائیں تو آئندہ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ تبدیلی کیسے رونما ہوگی' اس کے لئے کوئی الہ دین کا چراغ تو موجود نہیں' البتہ کچھ ملکوں کے عملی تجربات ضرور موجود ہیں۔ جن کو میں کسی نہ کسی حد تک موجودہ کتاب میں زیر بحث لایا ہوں۔

میں آپ سے یہ توقع نہیں کرتا کہ تفصیلی طور پر آپ میرے ساتھ اتفاق کریں گے' میرے لئے تو یہ بھی کافی ہوگا کہ آپ مجھ سے اختلاف کریں مگر مسائل کی نوعیت کو سمجھیں اور انہیں حل کرنے کے سلسلے میں باعمل ہو جائیں' اس نیند سے بیداری ضروری ہے جو کئی صدیوں سے ہم پر طاری ہے---- بس یہی کافی ہے اور یہ پیغام میں لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہوں۔

میرے ان مضمونوں کو اردو میں ڈھالنے کے لئے شہزاد احمد نے خاصی محنت کی ہے' انہوں نے جب میرے ایک مضمون کا اردو ترجمہ مجھے بھجوایا تھا تو میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ نہ صرف میرے مؤقف کو صحت کے ساتھ اردو میں بیان کر سکتے ہیں بلکہ ان کے اندر یہ صلاحیت بھی موجود ہے کہ وہ پاکستان کی مخصوص صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے مضامین کا انتخاب بھی خود کریں۔ انہوں نے یہ کام بہت خلوص اور یکسوئی سے کیا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ وہ میرے سارے کام کو اردو میں منتقل کریں۔ میں ان کی اس خواہش کا احترام کرتا ہوں اور انہیں بخوشی اس کی اجازت دیتا ہوں اور وہ میرے لئے اس واسطے بھی بہت اہمیت رکھتے ہیں کہ میرا اور آپ کا رابطہ ان کی وساطت سے ہے۔ شہزاد صاحب سے میرا تعارف

برادرم غالب احمد نے کروایا تھا' اس کتاب کے ترجمے پر نظر ثانی بھی انہوں نے کی ہے' میں اس کے لئے ان کا بھی ممنون ہوں۔

انگریزی کا کوئی مواد اردو میں منتقل کرنے کا مسئلہ سامنے آتے ہی کئی اور سوالیہ نشان ذہن میں ابھرتے ہیں' ایک مسئلہ تو اردو میں تعلیم کا ہے' خاص طور سے جدید سائنسی علوم---- اور دوسرے اردو کے رسم الخط کا' اردو میں (جس سے' میری مراد خالص مغرب و مفرس اُردو ہے) تعلیم میرے خیال میں اب سائنسی علوم کے پھیلاؤ سے تقریباً ناممکن سی ہو گئی ہے۔ ہر سال ہزارہا کتابیں مختلف سائنسی مضامین پر انگریزی میں چھپتی ہیں' اسی طرح سینکڑوں کی تعداد میں معیاری رسالے سائنس ریسرچ اور تنقید کے میدان میں انگریزی میں چھپتے ہیں۔ صرف اردو پڑھا ہوا انسان اس گراں قدر "انگریزی میں سائنسی لٹریچر" سے محروم رہ جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ اتنا بڑا علم کا ذخیرہ ترجمہ کر کے اردو میں منتقل کیا جائے۔ پھر کیا کیا جائے؟

میں نے اس مسئلے پر بہت غور کیا اور میری سمجھ میں ایک ہی بات آتی ہے۔

انگریزی کی بنیادی تعلیم بھی بچوں کے لئے لازم کی جائے' اگرچہ اردو پر زیادہ توجہ دی جائے' اس انگریزی کی تعلیم میں پڑھائی پر زور دیا جائے اور لکھائی پر کم۔ وجہ یہ ہے کہ یہ بہتر ہو گا کہ بنیادی انگریزی سیکھنے کے بعد طالب علم لکھے اپنی زبان یعنی اُردو میں۔

اس طرح وہ دنیا کا بہترین اور اہم سائنسی لٹریچر بخوبی پڑھ سکے گا اور اس لٹریچر کو اردو میں منتقل کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ اب رہا اردو میں لکھنے کا سوال' اس کے لئے یہ کیا جا سکتا ہے کہ انگریزی تیکنیکی لفظ اردو میں لکھے جائیں' ان کے لئے اُردو میں لفظ اختراع نہ کئے جائیں۔

چین' جاپان اور روس نے کم و بیش یہی کیا ہے۔

مثلاً یہ لکھنے میں بہت سی مشکلات کا حل ہے کہ ایٹم کے اندر نیو کلیس ہوتا ہے۔ (یہ جملہ کہ جوہر کے اندر مرکزہ ہوتا ہے اور برقیے باہر چکر لگاتے رہتے ہیں۔ خالص اُردو تو ہوئی مگر طالب علم کے لئے خاصی مصیبت بنی)

وجہ یہ ہے کہ اسے ہزارہا ٹیکنیکل ٹرم انگریزی میں تو پڑھنے ہی پڑے' چونکہ بغیر ان کو جانے ہوئے وہ نہ تو سائنسی کتابیں پڑھ سکے گا اور نہ رسالے جو سب انگریزی میں ہوتے ہیں۔ پھر ان ہزارہا ٹرم کو ان کی اُردو اصطلاح میں پڑھے۔ اس حل میں بہت زیادہ قباحت نہیں ہے' اگر شروع ہی سے بچے کو انگریزی کی اصطلاحیں لکھائی جائیں۔

دوسرا مسئلہ اردو کے رسم الخط کا ہے' اگر آپ غور کریں تو ہمارا رسم الخط خاصا مشکل ہے۔

لفظ سیلیکشن لیجئے' کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ اس لفظ کو Syllables میں توڑ کر سی لیک شن لکھا جائے۔ بچے کو اردو لکھنے والوں کو اس طرح زبان بہت آسان لگے گی اور اسے لکھنا مشکل نہ رہے گا۔

پھر انگریزی لکھنے کی دوسری پیچیدگیوں کو کسی حد تک امریکیوں نے کم کر دیا ہے' مثلاً وہ Colour کو Color لکھتے ہیں جو کہ دونوں صورتوں میں Calar پڑھا جائے گا۔ کم از کم

Webster Dictionary کی رو سے اس کی آواز یہی نکلتی ہے۔ چاہے آپ اسے Colour لکھیں یا Color۔ امریکیوں کے اس تجدیدی عمل کو دنیا میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی ہے' سوائے انگلستان کے' کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تحریر میں زبان کو آسان کرنے کا یہ تجربہ خاصا کامیاب رہا ہے اور انگریزی کے علاوہ دوسروں کے لئے انگریزی لکھنا پڑھنا قدرے آسان ہو گیا ہے۔

ایک دوسرا مسئلہ اردو کے حروف کا ہے۔ کچھ عرصے پہلے مجھے کسی نے بتایا تھا کہ اردو کے ایک بڑے مشہور لکھنے والے نے ٹیلی ویژن پر ایک ڈرامہ سیریز چلائی جس کا عنوان ٹیلی ویژن پر "توتا کہانی" لکھا ہوا دکھایا جاتا رہا جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں اردو میں اس نام کے پرندے کو عام طور پر طوطا لکھا جاتا ہے۔

ذ' ز' ظ اور ض کا فرق کس طرح اور کیونکر کسی زبان کے بچے یا زبان کے نئے سیکھنے والے کو سمجھایا جائے۔ اتنے سارے حروف ایک ہی قسم کی آواز کے نکلنے کے لئے صرف مشکلات ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ کیا زبان کو آسان کرنے کے لئے ان کی تعداد کم نہیں کی جا سکتی؟

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ زبان کو آسان بنانے کے لئے امریکیوں کی طرز پر تجربات کرنے کی ضرورت ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے ان خیالات کو لوگ ضرور قبول کر لیں گے' چونکہ زبان کلچر کا حصہ ہے اور سینکڑوں سال میں یہ ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔ یہ بہت پیچیدہ مسئلہ بھی ہے' مگر وقت کے تقاضے بھی ہوتے ہیں اور ان کے بھی تابع ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ میری گزارشات لوگوں تک پہنچ جائیں اور آج کی تیز رفتار دنیا میں جو رُخ ست رفتاری اور مشکلات کی طرف لے جا رہا ہو' اس کو موڑنے کی کوشش کی جائے۔

شاید کچھ لوگ رومن رسم الخط کی طرف جانے کی بھی سوچ رکھتے ہوں' جیسا کہ اس صدی کی پہلی چند دہائیوں میں ترکی میں ہوا تھا' مگر میرے خیال میں وہ بہت انقلابی قدم تھا۔ اس سے گریز بہتر ہے۔

بڑے لفظوں کو ٹکڑوں میں توڑنے اور اُردو حروف کم کرنے کا تجربہ اگر شروع کیا جائے تو بہتر ہو گا۔

آخر میں میں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ زبان کے معاملے میں آخری کسوٹی لوگ ہیں' جو کچھ مقبول ہو جائے۔ (Acceptance) بلکہ جو بازار میں مقبول ہو جائے وہ ٹھیک ہے۔ اسی لئے شاید غلط العام فصیح کی اصطلاح مشہور ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ سوچ بچار کے بعد ایسے تجربات کچھ کتابوں سے شروع کئے جائیں؟ پھر لوگوں کا ردعمل دیکھا جائے (Monitor) اگر ممکن ہو تو ساتھ ہی ساتھ کچھ رسالوں اور اخباروں میں چند صفحات ان تجربات کے لئے مخصوص کئے جائیں۔ ٹیلی ویژن جیسے میڈیا کو بھی اس سلسلے میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ تجرباتی طور پر عنوانات (Titles) پروگرام وغیرہ جو تحریری شکل میں سکرین پر آتے ہیں' اس مہم میں شامل کئے جائیں اور لوگوں کا ردعمل دیکھا جائے' اس سے ایک بحث (Debate) چھڑے گی اور آخر میں مثبت نتیجے پر پہنچا جا سکے گا۔

ڈاکٹر عبدالسلام

30

بھائی جان کے خطوط

ہمارے نام ان کے خطوط سے ان کے دلی جذبات و احساسات سے ان کی شخصیت کی ایک مکمل تصویر سامنے آجائے گی۔

ابا جان کا میرے نام ایک خط

عزیزالقدر حمید خان سلمہ

السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ! آپ کا خط ملا تھا۔ خیال تھا کہ آپ جلد آجائیں گے' لیکن آج معلوم ہوا ہے کہ آپ چند روز اور روک دیے گئے ہیں۔ بہرحال دعا ہے کہ اللہ کریم خیر فرمائے اور اچھے نتائج نمودار ہوں۔

عبدالسلام سلمہ کا پرسوں خط آیا تھا۔ ڈاکٹری چیک اپ کا نتیجہ "بیماری کوئی نہیں" معلوم ہوتا ہے۔ صرف بے انتہا محنت کی کرخت تھی۔ ڈاکٹر وگنر جو امریکہ میں عبدالسلام کے ساتھ کام کرتے تھے اور جن کو نوبل پرائز ملا ہے۔ عید کے مبارک تار کے جواب میں لکھتے ہیں:

I also rember having read in Quran for this Ist time at your Suggestion.

Director Sebnce Uneso نے ایک ترجمہ کی کاپی اور بھیج دی ہے۔ ایک کاپی Dr. Kavda کو لندن میں پیش کی ہے۔ اللہ ان دونوں کو اسلام لانے کی توفیق بخشے اور عزیز کو رضائے الٰہی پر چلنے کی۔

عزیز نے سلام لکھا ہے۔ عزیز خالد سلمہ اپنے کمالات میں مصروف ہے۔ آپ کی والدہ کا بلڈ پریشر بلند ہوگیا ہے۔ ویسے رو بصحت ہے۔

میرے اور دوسرے عزیزوں کے نام خطوط دورہ تیونس کے بارے میں

جنوبی امریکہ کے چند ممالک کے دورے کے بعد میرے نام بھائی جان کا خط

اس خط پر تاریخ درج نہیں ہے۔ قیاس ہے کہ یہ فروری 1980ء میں لکھا گیا ہو گا۔ مرتب۔

ہندوستان کے دورے پر جانے سے پہلے ہماری ہمشیرہ کے نام بھائی جان کا خط

ہندوستان کا دورہ جنوری 1987ء میں کیا گیا۔ اس کی تفصیل پہلے دی گئی ہے۔
بہنوں اور بھائی کی امداد کے بارے میں چھوٹے بھائی کو ہدایت

1986ء میں ہندوستان کے دورہ کے بعد میرے نام بھائی جان کا خط

1986ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ انڈیا نے بھائی جان کو اپنے ہاں مدعو کیا تھا اور ان کی ساٹھویں سالگرہ منائی تھی۔ اس تقریب کی تفصیل پہلے ہی دی جا چکی ہے۔ ہندوستان سے واپسی کے بعد بھائی جان نے یہ خط مجھے لکھا تھا۔

چوہدری حفیظ الدین ایڈووکیٹ ساہیوال کے نام بھائی جان کے خطوط

چوہدری حفیظ الدین ایڈووکیٹ ساہیوال ہمارے تایا زاد چوہدری نور الدین جہانگیر جو بھائی جان کے برادر نسبتی بھی تھے کے فرزند ہیں۔ انہوں نے زری کا ایک کھسہ بنوا کر بھائی جان کو تحفہ میں بھجوایا تھا۔ جس کے لئے شکریہ ادا کرتے ہوئے بھائی جان نے اپنے خط میں لکھا کہ وہ امریکہ میں ہوسٹن کے مقام پر اسلامک کانفرنس میں شرکت کے بعد واپس لندن آئے ہیں۔ اس کانفرنس میں ان کا موضوع تھا۔ "سائنس اور ٹیکنالوجی اسلام میں" اس کانفرنس میں بن اللہ' ڈاکٹر جاوید اقبال اور شہزادہ فیصل مدعوین میں سے تھے۔

31

آخری بیماری، وفات اور تدفین

1980ء کے بعد بھائی جان کے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے میں تکلیف شروع ہوئی، جس کی وجہ سے وہ قلم نہیں پکڑ سکتے تھے اور ان کی صحت متاثر ہوئی۔ ڈاکٹر اس تکلیف کی تشخیص نہ کر سکے۔ ان کا کہنا تھا کہ انگوٹھے میں ایک قدرتی چکناہٹ ہوتی ہے جو زیادہ لکھنے کی وجہ سے ختم ہو گئی ہے، اس وجہ سے انہیں یہ تکلیف ہے۔

1987ء کے بعد جب بھی وہ پاکستان آئے تو ہم نے ان کی چال میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کی، وہ یہ تھی کہ وہ اچانک اپنے قدم گھسیٹ کر چلتے تھے۔ یہ تکلیف بڑھتی گئی اور پھر ان کا چلنا تقریباً بند ہو گیا اور انہوں نے وہیل چیئر استعمال کرنا شروع کر دی۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ وہیل چیئر پر بھی نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ اس طرح معذوری نے مکمل طور پر ان کو اپنے قبضے میں لے لیا۔

امریکہ اور برطانیہ میں چوٹی کے ماہرین سے انہوں نے اپنا معائنہ کرایا لیکن کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ تکلیف ہے کیا۔ دراصل یہ ایک قسم کی اعصابی بیماری Neuro Degenerative Disease تھی، جس کی علامات ابتدائی مراحل میں Parkinson سے مشابہت رکھتی ہیں۔ اس سے پٹھوں کی حرکت متاثر ہوتی ہے۔ تقریباً 1992ء میں اندازہ ہوا کہ بعض علامات Parkinson کی نہیں کیونکہ Parkinson کے لئے ادویات بھی اپنا اثر نہیں دکھا رہی تھیں۔ آخرکار ایک ماہر نے تشخیص کیا کہ انہیں PSP (Paisy Progressive Supranuclear) ہے۔ یہ بیماری پہلی مرتبہ 1963ء میں تشخیص ہوئی تھی۔ اس سے پہلے بھی موجود ہوگی۔ انگلستان میں تقریباً 6 ہزار مریض اس مرض میں مبتلا پائے گئے۔ اس بیماری کی نہ تو وجہ معلوم ہے اور نہ ہی اس کا علاج، بعض ادویات سے کچھ افاقہ ہوتا ہے جس سے پٹھوں کی حرکت میں کچھ آسانی پیدا ہوتی ہے۔ مگر صرف ابتدائی مراحل میں۔

اس بیماری نے انہیں بالکل معذور کر دیا البتہ ان کا ذہن بیدار تھا اور ہر بات کو سنتے اور سمجھتے تھے۔ بالآخر یہی بیماری جان لیوا ثابت ہوئی۔

وفات

بھائی جان نے 20 اور 21 نومبر 1996ء کی درمیانی رات قریباً 3 بجے وفات پائی تھی۔ اسی روز صبح سات بجے اسلام آباد سے میرے چھوٹے بھائی نے یہ روح فرسا خبر مجھے سنائی۔ بھائی جان کی غیر معمولی

طویل علالت کی وجہ سے اگرچہ ہمارے ذہن اس خبر کو سننے کے لئے تیار تھے لیکن پھر بھی اس خبر نے چند لمحوں کے لئے ہمیں مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ 29 جنوری 1926ء کو روشن ہونے والا یہ چراغ 70 برس بعد بالآخر موت کے بے رحم ہاتھوں ہمیشہ ہمش کے لئے بجھ گیا۔ ہم اللہ کے ہیں اور ہمیں اس کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

بھائی جان کی وفات کی اطلاع لاہور اور اطراف میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کو دینے کے علاوہ میں نے صدر پاکستان کو اسلام آباد میں اور لاہور میں قائم مقام گورنر کو بھی پہنچا دی تھی۔ اس کے علاوہ چوہدری حمید نصر اللہ خان امیر جماعت احمدیہ لاہور کو بھی اطلاع دی اور انہیں تابوت لاہور پہنچنے کے بارے میں تازہ صورت حال سے آگاہ کرتا رہا۔ چوہدری حمید نصر اللہ خان صاحب' گورنر پنجاب اور دیگر سول حکام سے مسلسل یہ دریافت کرتے رہے کہ کیا حکومت پاکستان ڈاکٹر عبدالسلام کے جسد خاکی جو 24 نومبر کی صبح کو لاہور پہنچے گا پروٹوکول دے گی۔ میں بھی چوہدری صاحب کی ہدایت پر حکام سے یہی پوچھتا رہا۔ جب ہمیں کوئی واضح بات نہ بتائی گئی تو چوہدری حمید نصر اللہ خان صاحب نے تمام انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لئے' یعنی لاہور ایئر پورٹ پر تابوت کو وصول کرنا۔ وہاں سے دارالذکر گڑھی شاہو لے کر جانا' ربوہ جانے کے لئے ایمبولینس' کاروں وغیرہ کا بندوبست کرنا اور تابوت کے ساتھ آنے والوں کے لئے طعام کا بندوبست کرنا وغیرہ انتظامات میں شامل تھا۔

بھائی جان کی وفات کے وقت ان کی دوسری اہلیہ ڈاکٹر لوئیس' عمر سلام (بیٹا) اور سعیدہ ہاجرہ (بیٹی) ان کے پاس تھی۔ ان کے انتقال کی خبر ملتے ہی لندن سے بھابھی امتہ الحفیظ بیگم' احمد سلام' محمد عبدالرشید اور شہاب الدین (داماد) اکسفورڈ پہنچ گئے۔ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ لینے کے بعد ان کے جسد خاکی کو لندن لایا گیا۔ وہاں مندرجہ ذیل عزیزوں نے غسل دینے کی سعادت حاصل کی۔

احمد سلام (بیٹا)' محمد عبدالرشید (بھائی)' جلال الدین اکبر (بھانجا)' عمران سعدی (نواسہ) اور میاں منور علی (ہماری خالہ زاد کا شوہر)

غسل کے بعد ان کی میت کو پٹنی (لندن) میں ان کی رہائش گاہ کے اس کمرہ میں رکھا گیا جو ان کا سٹڈی روم تھا۔ جس میں ان کا سونا بچھونا بھی ہوتا تھا۔ وہاں بے شمار افراد نے ان کا آخری دیدار کیا۔

22 نومبر کو جمعہ تھا۔ اس روز حضرت مرزا طاہر احمد صاحب امام الرابع جماعت احمدیہ نے بیت الفضل میں خطبہ جمع میں بھائی جان کی زندگی کے ہر پہلو کا بہت ہی محبت سے ذکر فرمایا۔ اس خطبہ کا متن الگ سے دیا جا چکا ہے' جمعہ کے بعد انہوں نے جنازہ پڑھایا' جس سے قبل انہوں نے اپنے دست مبارک سے کوئی خوشبو ان پر چھڑکی پھر دیر تک محبت بھری نگاہوں سے ان کا چہرہ دیکھتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے ان

کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ وہ تاریخی منظر احمدیہ ٹیلی ویژن نے تمام دنیا کو براہ راست دکھایا اور اسے آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ کر لیا۔ دعائے جنازہ بڑی طویل تھی۔ پھر آقا نے اپنے خادم اور محبوب ساتھی کو خاصی دور تک کندھا دیا۔ ایسی سعادت کسی کسی کو ہی نصیب ہوتی ہے۔ جنازہ کے بعد تابوت ان کی رہائش گاہ پر لے جایا گیا۔ جہاں ایک مرتبہ پھر ان کا آخری دیدار کرنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔

18 ستمبر 1946ء کو بھائی جان نے پہلی مرتبہ انگلستان کے لئے سفر اختیار کیا تھا۔ اب وہ پچاس سال کی طویل مدت کے بعد اپنے وطن، جس کے گلی کوچوں سے انہیں محبت تھی اور جس کی سربلندی کے لئے وہ ہمیشہ کوشاں رہے، کی طرف 23 نومبر کو اپنا آخری سفر اختیار کرنے کے لئے تیار تھے۔ لیکن اس مرتبہ ان کا جسد خاکی لکڑی کے ایک خوشنما بکس میں بند تھا۔ اس سفر میں ان کے اہل خاندان کے اٹھارہ افراد ہمراہ تھے۔

آپ کا جسد خاکی لندن سے پی آئی اے کی پرواز کے ذریعے 24 نومبر کو صبح 9 بجے کے قریب لاہور کے ہوائی اڈہ پر پہنچا تو پی آئی اے کے حکام نے اسے اہل پاکستان کے حوالے کیا۔ جسے چوہدری حمید نصر اللہ خان امیر جماعت احمدیہ لاہور، بھائی محمد عبدالوہاب ہمارے بھتیجے چوہدری منیر مسعود جماعت احمدیہ ربوہ کے نمائندگان صاحبزادہ مرزا خورشید احمد صاحب ناظر امور خارجہ، ملک خالد مسعود صاحب ناظر امور عامہ اور ہمارے ماموں زاد ملک طاہر احمد نے وصول کیا۔ میں اپنی معذوری کی وجہ سے ہوئی اڈہ پر نہ جا سکا۔ البتہ جنازہ کے ہمراہ ربوہ گیا تھا--- مرتب

ان کے علاوہ جماعت احمدیہ کے احباب کثیر تعداد میں ایئر پورٹ پر آئے ہوئے تھے۔ اس موقعہ حکومت پاکستان کا کوئی نمائندہ وطن عزیز کے اس فرزند جلیل کے جسد خاکی کا استقبال کرنے کے لئے لاہور ایئرپورٹ پر نہیں آیا تھا۔ تاہم لاہور کی مقامی انتظامیہ کی طرف سے کمشنر لاہور، ڈی آئی جی و ایس ایس پی پولیس ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ اس کے علاوہ پولیس کی ایک بڑی بھاری نفری بھی وہاں موجود تھی۔ (شاید نظم و ضبط رکھنے کے لئے)

منیر احمد خان سابق چیئر مین پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن، شہزاد احمد (جنہوں نے بھائی جان کی کتاب Ideals and Realites کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جو "ارمان اور حقیقت" کے نام سے شائع ہوئی) پنجاب یونیورسٹی کے بعض اساتذہ اور تقریباً تمام اخبارات کے رپورٹرز کے علاوہ دوست احباب بھی ایئر پورٹ پر موجود تھے۔ مقامی انتظامیہ نے لندن سے آمدہ اہل خانہ کے لئے دو کوسٹرز کا بھی انتظام کیا ہوا تھا، جنہیں شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا گیا تھا کیونکہ جماعت احمدیہ لاہور نے ٹرانسپورٹ اور ایمبولینس کا انتظام کیا ہوا تھا۔

پی۔آئی۔اے اور ایئر پورٹ کے عملہ نے بہت تعاون کیا۔ جس کی وجہ سے امیگریشن کے تمام مسائل

آسانی سے حل ہو گئے تھے۔ آپ کا تابوت لاہور ایئرپورٹ سے ایک ایمبولینس کے ذریعے دارالذکر علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو لے جایا گیا۔ وہاں ہزاروں افراد منتظر تھے۔ تابوت کو دارالذکر کے تہہ خانہ میں رکھا گیا۔ وہاں لاہور اور اس کے اطراف سے آئے ہوئے افراد نے جن میں کثیر تعداد غیراز جماعت مداحوں کی بھی تھی نے ان کا آخری دیداد کیا اور یہ سلسلہ ظہر تک جاری رہا۔

ظہر کے بعد چوہدری حمید نصراللہ خان نے جنازہ پڑھایا۔ ایک محتاط اندازہ کے مطابق دس ہزار افراد نے اس میں شرکت کی۔ اس کے بعد قریباً پونے تین بجے ایک ایمبولینس 30-35 گاڑیوں' ویگنوں اور چند کوسٹرز پر مشتمل قافلہ ربوہ کے لئے روانہ ہوا' شیخوپورہ سے یہ قافلہ زیر تعمیر موٹر وے سے ہو لیا۔ کاروں اور دوسری ٹرانسپورٹ کا انتظام امیر صاحب جماعت احمدیہ نے کیا تھا۔ یہ قافلہ پنڈی بھٹیاں کے بعد طالب وال پل کے قریب سرگودہا روڈ پر آگیا' پھر وہاں سے سیال موڑ احمد نگر سے ہوتا ہوا ربوہ پہنچا۔

لاہور سے جنازہ کے قافلہ کے ساتھ پولیس کی تین اسکارٹ (Escort) گاڑیاں تھیں۔ ایک سب سے آگے' دوسری ایمبولینس کے پیچھے اور تیسری قافلہ کے سب سے پیچھے تھی۔ یہ اسکارٹ گاڑیاں ہر ضلع کی حدود پر بدل جاتی تھیں۔ (لاہور سے ربوہ جاتے ہوئے چار اضلاع یعنی لاہور' شیخوپورہ' گوجرانوالہ اور جھنگ سے گزرنا پڑتا ہے۔)

پنڈ ی بھٹیاں سے ربوہ سے گئی ہوئی گاڑیوں نے جنازہ کو اپنی حفاظت میں لے لیا تھا۔ لاہور سے روانگی کے وقت ایک کھلی گاڑی میں ویڈیو بنانے والے فوٹوگرافر سوار تھے۔ جبکہ ربوہ سے آنے والے فوٹو گرافر جو ایک کھلی جیپ میں سوار تھے' پنڈی بھٹیاں سے قافلہ میں شریک ہوئے تھے۔

ربوہ آمد

جنازہ کا جلوس شام سات بجے ربوہ پہنچا۔ احمد نگر کی طرف سے آنے والا قافلہ بیت المبارک کی بالکل سامنے والی سڑک پر مڑا تو اہل ربوہ اور اطراف سے آئے ہوئے بھاری تعداد میں سڑک کے دونوں اطراف اپنے ہیرو کے استقبال کے لئے چشم براہ تھے۔ سرگودھا روڈ سے لے کر دارالضیافت تک سڑک کے دونوں طرف روشنی کا انتظام تھا اور خدمت خلق کے رضاکار ہاتھوں میں ہاتھ دیئے ایک انسانی دیوار بنائے کھڑے تھے۔ تاکہ نظم و ضبط قائم رکھا جا سکے۔ مقامی سرکاری انتظامیہ نے ربوہ شہر کی صفائی کرائی تھی اور بلدیہ ربوہ کے اہل کاروں اور خدام الاحمدیہ کے رضاکاروں نے شہر کی تمام سڑکوں پر چھڑکاؤ کیا۔

ربوہ پہنچنے کے بعد تابوت کو دارالضیافت میں میتوں کے لئے مخصوص کمرہ میں رکھا گیا۔ جس میں دو ایئر کنڈیشنز چل رہے تھے۔ دارالضیافت میں جماعت احمدیہ کے سرکردہ عہدیداروں نے تابوت کا خیر مقدم کیا اس کے فوراً بعد مرزا منصور احمد صاحب امیر مقامی و ناظر اعلیٰ جماعت احمدیہ ربوہ وہاں تشریف لائے اور بھائی جان کا آخری دیدار کیا۔ اس کے فوراً بعد پاکستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے احباب نے

جن میں خواتین اور بچے بھی تھے نے نہایت نظم و ضبط کے ساتھ بھائی جان کا آخری دیدار کیا۔ قائداعظم یونیورسٹی کے طلباء طالبات اسلام آباد سے ایک سپیشل بس کے ذریعہ اپنے قومی ہیرو کا دیدار کرنے کے لئے آئے تھے۔

ان طلباء نے ایک رات ربوہ میں بسر کی تھی۔ یہ سلسلہ (دیدار کا) رات گئے تک جاری رہا اور دوسری صبح فجر کے بعد دوبارہ شروع ہو گیا۔ آخر اسے 9 بج کر 55 منٹ پر روکنا پڑا۔ 10 بجے جنازہ دارالضیافت سے ایمبولینس میں دیگر پانچ گاڑیوں کے ہمراہ لجنہ اماء اللہ کے وسیع میدان میں پہنچا جو جنازہ ادا کرنے والوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ بہت سے لوگ میدان میں جگہ نہ ملنے کی وجہ سے چار دیواری کے باہر صف آراء تھے۔ دس بج کر 25 منٹ پر مرزا منصور احمد صاحب نے جنازہ پڑھا' ایک اندازہ کے مطابق 35 ہزار افراد جو جھنگ' شیخوپورہ' ملتان' ساہیوال' اوکاڑہ' فیصل آباد' سرگودہا' لاہور' کراچی' اسلام آباد' راولپنڈی وغیرہ سے آئے تھے نے جنازہ پڑھا۔ جس کی ادائیگی کے بعد ایمبولینس میں تابوت کو بہشتی مقبرہ لے جایا گیا۔ وہاں ہمارے والد کے پہلو اور والدہ صاحبہ کے قدموں میں تدفین عمل میں آئی۔ یہی بھائی جان کی خواہش تھی۔ جسے حضرت مرزا طاہر احمد صاحب نے ازراہ شفقت منظور فرمایا تھا۔

تدفین کے بعد مرزا منصور احمد صاحب نے دعا کرائی' جس میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ اب خدا کا وہ نیک بندہ' امن کا شہزادہ ربوہ کی سرزمین میں ابدی نیند سو رہا ہے۔

10

also published in Arabic, Bengali, Chinese, French, Italian, Persian, Punjabi, Romanian, Turkish and Urdu.

4. Science and Education in Pakistan by Abdus Salam (Third World Academy of Sciences, Trieste) 1987.
5. Science Education and Development. A collection of Essays by and about Abdus Salam (Research Center for Cooperation with Developing Countries, Ljubljana, Yugoslavia), 1987. Editions also published in French, Italian, Persian and Spanish.
6. Supergravity in Diverse Dimensions, Volumes I and II, by Abdus Salam and Ergin Sezgin (World Scientific Publishing Co. Ltd. Singapore), 1988.
7. From a Life of physics. Edited by Abdus Salam (World Scientific Publishing Co. Pte. Ltd.. Singapore) 1989.
8. Unification of Fundamental Forces: The First of the 1988 Dirac Memorial Lectures by Abdus Salam (Cambridge University Press), 1990. Editions also published in French, Greek, Italian, Japanese, Portuguese and Spanish.
9. Notes on Science, Technology and Science Education in the Developnment of the South (Red Book). Thirteen editions by Abdus Salam. Last editon prepared for the last meeting of the South Commission and for the meeting of the United Nations Economic and Social Council (ECOSCO), Geneva. July 1991 (Third World Academy of Sciences), May 1991.Editions also published in Arabic, Chinese, Farsi, French, Italian and Spanish.
10. Science and Technology: Challenge for the South Muhammad Abdus Salam (Third World Academy of Sciences), November 1992.
11. Selected Papers of Abdus Salam (with Commentary). Edited by A. Ali, C. Isham, T. Kibble and Riazuddin (World Scientific Publishing Co. Pte. Ltd., Singapore), 1994.
12. Renaissance of Science in Islamic Countries. Edited by H.R. Dalafi and M.H.A Hassan (World Scientific Publishing Co. Ptv. Ltd., Singapore). (1994)

Published Papers

Around 285 scientific papers on physics of elementary particles. Papers on scientific and educational policies for developing countries and Pakistan.

Scientific Contributions

Research on physics of elementary particles. Particular contributions:

1. Two-component neutrino theory and the prediction of the inevitable parity violation in weak interactions.
2. Gauge Unification of weak and electromagnetic interactions - the unified force is called the "lectroweak" force - a name given to it by Salam; predicted existence of weak neutral currents and W, Z particles before their experimental discovery.
3. Symmetry properties of elementary particles; unitary symmetry.
4. Renormalization of meson theories.
5. Gravity theory and its role in particle physics; two tensor theory of gravity and strong interaction physics.
6. Unification of Electroweak with strong nuclear forces, grand (electro-nuclear) unification.
7. Related prediction of proton-decay.
8. Supersymmetry theory, in particular formulation of superspace and formalism of superfields.

Books

1. Symmetry Concepts in Modern Physics. Iqbal Memorial Lecture by Abdus Salam (Atomic Energy Center, Lahore), 1966.
2. Aspects of Quantum Mechanics. Edited by Abdus Salam and E.P. Wigner (Cambridge University Press), 1972.
3. Ideals and Realities Selected (Essays of Abdus Salam. First Edition Edited by Z. Hassan and C.H. Lai (World Scientific Publishing Co. Pte. Ltd., Singapore), 1984; Second Edition edited by C.H. Lai, 1987. Third Edition edited by C.H. Lai and Azim Kidwai, 1989. Editions

35. University of Gent, Belgium (1988)
36. Creation International Assoc. of Scientists and Intelligintsia, USSR (1989)
37. Bendel State University, Ekpoma, Nigeria (1990)
38. Uneversity of Ghana, Ghana (1990)
39. University of Tucuman, Argentina (1991)
40. University of Warwick, UK (1991)
41. University of Dakar, Senegal (1991)
42. University of lagos, Nigeria (1992)
43. University of South Carolina (1992)
44. University of the West Indies, Jamaica (1992)
45. St Petersburg University, Russia (1992)
46. Gulbarga University, India (1993)
47. University of Dhaka. Bangladesh (1993)

Assignments in Pakistan

1. Member, Pakistan Atmoic Energy Commission (1958- 1974)
2. Elected President, Pakistan Association for advancement of Sciences (1961 - 1962)
3. Adviser, Education Commission (Pakistan) (1959)
4. Member Scientific Commission (Pakistan) (1959)
5. Chief Scientific Adviser to President of Pakistan (1961-1974)
6. Founder Chairman, Pakistan Space and Upper Atmosphere Committee (1961 - 1964)
7. Governor form Pakistan to the International Atomic Energy Agency (1962 - 1963)
8. Member National Science Council (Pakistan) (1963- 1975)
9. Member, Board of Pakistan Science Foundation (1973-1977)

Pakistani Awards

1. President's Medal and Cash award (1958)
2. Sitara-I-Pakistan (1959)
3. Nishan-I-Imtiaz (The Highest Civilian Award) (19 79)

3. University of Trieste, Trieste, Italy (1979)
4. University of Islambad, Islambad, Pakistan (1979)
5. Universidad Nacional de Bgenieria, Lima, Peru (1980)
6. University of San Marcos, Liima, Peru (1980)
7. National University of San Antonio Abad, Cusco, Peru (1980)
8. Universidad Simon Bolivar, Caracas, Venezuela (1980)
9. University of Wroclow, Wroclow, Poland (1980)
10. Yarmouk University, Yarmouk Jordan (1980)
11. University of Istanbul, Istanbul, Turkey (1980)
12. Guru Nanak Dev University, Amritsar, India (1981)
13. Muslim University, Aligarh, India (1981)
14. Hindu University, Banaras, India (1981)
15. University of Chittagong, Bangladesh (1981)
16. University of Bristol, Bristol, UK (1981)
17. University of Maiduguri, Maiduguri,;Nigeia (1981)
18. University of Philippines, Quezon City, Philippines (1982)
19. University of khartoum, Khartoum, Sudan (1983)
20. Universidad Complutense de Maduid, Spain (1983)
21. The City College, The City University of Niw York, USA (1984)
22. University of Nairobi, Nairobi, Kenya (1084)
23. Universidad Nacional de Cuyo, Cuyo, Argentina (1985)
24. Universidad Nacional de la Plata, La Plata, Argentina (1985)
25. University of Cambridge, Cambridge, UK (1985)
26. University of Goteborg, Goteborg, Swede'n (1985)
27. Kliment Ohridski University of Sofia, Sofia, Bulgaria (1986)
28. University of Glasgow, Glasgow, Scotland (1986)
29. University of Science and Technology, hefei, China (1986)
30. The City University, London, UK (1986)
31. Punjab University, Chandigarh, India (1987)
32. Medicina Alternative Colombo, Sri Lanka (1987)
33. National University of Benin, Contonou, Benin (1987)
34. University of Exeter, UK (1987)

6

35. Honorary Member, Brazilian Mathematical Society. (1989)
36. Honorary Member, Nepal Physical Society (1989)
37. Honorary Member, National Academy of Exact, Physical and Natural Sciences, Argentina (1989)
38. Member, Creation International Association of Scientists and Intelligentsia, USSR (1989)
39. Member, Academia Europea. (1989)
40. Honorary Member, Hungarian Academy of Sciences (1990)
41. Honorary Member, Societa Dante Alighieri di Tucuman, Argentina (1990)
42. Honorary Member, Centro International de Fisica (Bogota) (1991)
43. Member, Russian Academy of Creative Endeavours (1992)
44. Foreign Member, American Philosophical Society (1992)
45. Foreign Member, Russian Academy of Sciences (1992)
46. Fellow, American Physical Society (1993)
47. Honorary Member, Academia National de Cienciay Tecnologia, Peru (1993)

Orders and Other Distinctions

1. Order of Nishan-i-Imtiaz (Pakistan) (1979)
2. Honorary Citizen of Trieste, Italy (1979)
3. Order of Andres Bello (Venezuela) (1980)
4. Order of Istiqlal (Jordan) (1980)
5. Cavaliere di Gran Croce dell' Ordine al Merito della Republica Italiana (1980)
6. Honorary Knight Commander of the Order of the British Empire (1989)
7. Brazilian Order of Scientific Merit in the Grade of Great Cross (1994)

D.Sc. Honors

1. Punjab University, Lahore, Pakistan (1957)
2. University of Edinburgh, Edinburgh, UK (1971)

12. Honorary Member, Korean Physics Society (Seoul) (1979)
13. Foreign Member, Academy of the Kingdom of Morocco (Rabat) (1980)
14. Foreign Member, Accdemia Nazionale delle Scienze dei XL (Rome) (1980)
15. European Academy of Arts, Sciences and Humanities (Paris) (1980)
16. Associate Member, Josef Stefan Institute (Ljublijana) (1980)
17. Foreign Fellow, Indian National Science Academy (New Delhi) (1980)
18. Fellow, Bangladesh Academy of Sciences (Dhaka) (1980)
19. Member, Pontifical Academy of Sciences (Vatican City) (1981)
20. Honorary Fellow, National Academy of Sciences (Allahabad) (1981)
21. Corresponding Member, Portuguese Academy of Sciences (Lisbon) (1981)
22. Member, Council University for Peace, Costa Rica (1981-86)
23. Founding Member, Third World Academy of Sciences. (Trieste) (1983)
24. Corresponding Member Yugoslav Academy of Sci. and Arts (Zagreb) (1983)
25. Honorary Fellow, Ghana Academy of Arts and Sciences (1984)
26. Honorary Member, Polish Academy of Sciences (1985)
27. Corresponding Member, Academy Ciencas Medicas, Fiscasy Natunles de Guatemala (1986)
28. Honorary Life Fellow, London Physical Society (1986)
29. Elected, Fellow, World Academy of Art and Science, Stockholm (1986)
30. Fellow, Pakistan Academy of Medical Sciences (1987)
31. Corresponding Member, Academia de Ciencias Medicas, Fisicas Mathematics, Naturales de Venezuela (1987)
32. Honorary Fellow, Indian Academy of Sciences (Banglore) (1988)
33. Distinguished International Fellow of Sigma Xi (1988)
44. Foreign Fellow, African Academy of Sciences. (1988)

3. Peace Medal (Charles University, Prague) (1981)
4. Diploma of Highest Merit and Honor, Club of Turkish Intellectuals of Istanbul (1981)
5. The Medal of the City of Paris (Echelon Vermeil) (1983)
6. Premio Europeo Umberto Biancamono (Italy) (198 6)
7. Dayemi International peace Award (Bangladesh) (198 6)
8. First Edinburgh Medal and Prize (Scotland) (1988)
9. Genoa International Development of Peoples Prize (Italy) (1988)
10. Ettore Majorana – Ericee - Science for Peace Prize (Italy) (1989)
11. Catalunya International Prize (Spain) (1990)
12. Medal of the 260th Anniversary of the University of Havana (Cuba) (1991)
13. Mazhar-Ali Applied Science Medal (Pakistan League of America) (1992)
14. International Leoncinod Oro Prize (Italy) (1993)

Academies and Societies

1. Fellow, Pakistan Academy of Sciences (Islamabad) (1954)
2. Fellow, The Royal Society (London) (1954)
3. Fellow, Royal Swedish Academy of Science (Stockholm) (1970)
4. Foreign Member of the American Academy of Arts and Sciences (Boston) (1971)
5. Foreign Member of the USSR Academy of Sciences (Moscow) (1971),
6. Member, Club of Rome (1976)
7. Honorary Fellow, Tata Institute of Fundamental Research (Bombay) (1978)
8. Foreign Associate, USA National Academy of Sciences (Washington) (1979)
9. Foreign Member, Accademia Nazionale dei Lincei (Rome) (1979)
10. Foreign Member, Accademia Fiberina (Rome) (1979)
11. Foreign Member, Iraqi Academy (Banghdad) (1979)

Awards for Contribution to Physics

1. Hopkins Prize (Cambridge University) for the most outstanding contribution to physics during 1957- 1958 (1958)
2. Adams Prize (Cambridge University) (1958)
3. First recipient of Maxwell Medal and Award (Physical Society, London) (1961)
4. Hughes Medal (Royal Society, London) (1964)
5. J.Robert Oppenheimer Memorial Medal and Prize (University of Miam) (1971)
6. Guthrie Medal and Prize (Institute of Physics, London) (1976)
7. Sir Devaprasad Sarvathikary Gold Medal (Calcutta University) (1977)
8. Metteuci medal (Accedemia Nazanale di XL. Rome) (1978)
9. John Torrence Tate Medal (American Institute of Physics) (1978)
10. Royal Medal (Royal Society, London) (1978)
11. NOBEL PRIZE for Physics (Noble Foundation) (1979)
12. Einstein Medal (UNESCO, Paris) (1979)
13. Josef Stefan Medal, Josef Stean Institute, Ljublijana (1980)
14. Shri R. D. Biria Award (Indian Physics Association) (1981)
15. Gold Medal for outstanding contribution to Physics (Czechoslovak Academy of Sciences, Prague) (1981)
16. Lomonosov Gold Medal (USSR Academy of Sciences) (1983)
17. Copley Medal (Royal Society, London) (1990)
18. Gold Medal (Slovak Academy of Sciences) (1992)
19. J.C. Maxwell Prize and Medal (Academy of Creative Endeavors, Moscow) (1995)

Awards for Contribution towards Peace and Promotion of International Scientific Collaboration

1. Atoms for Peace Medal and Award (Atoms for Peace Foundation, New York) (1968)
2. International Prize for Peace and International Understanding, UNESCO Center, Florence (Italy) (1978)

United Nations Assignments

Scientific Secretary, Geneva Conferences on Peaceful Uses of Atomic Energy (1955 - 1958)

Elected Member of the Board of Governors, IAEA, Vienna (1962- 1963)

Member, United Nations Advisory Committee on Science and Technology (1964 - 1975)

Elected Chairman, United Nations Advisory Committee on Science and Technology (1971 - 1972)

Member, United Nations Panel and Foundation Committee for United Nations University (1970 - 1973)

Elected Chairman, UNESCO Advisory Panel on Science, Technologe and Society (1981)

Member, United Nations University Advisory Committee (1981-1983)

Member, Council, University for Peace (Costa Rica) (1981 - 1986)

Other Assignments

Member, Scientific Council, SIPRI (Stockholm International Peace Research Institute) (1970)

Elected Vice President, IUPAP (International Union Of Pure and Applied Physics) (1972 - 1978)

First President, TWAS (Third World Academy of Sciences) (1983 - 1994)

Member of the CERN scientific policy Committee (1983 - 1986)

Member of the Bored of Directors of the Beijir Institute of the Royal Swedish Academy of Sciences (1986 - 1989)

Member of the South Commission (1987 - 1990)

First President of TWNSO (Third World Network of Scientific Organizations) (1988 - 1994)

Honorary President for Life, TWAS (Third World Academy of Sciences) (1995)

Honorary President for Life, TWNSO (Third World Network of Scientific Organizations) (1995)

ABDUS SALAM

Educational Career, Awards and Achievements Educational Career

Government College Jhang, and Government College, Lahore Pakistan (1938 - 1946)

Punjab University, Lahore, Pakistan (M.A)

(First place in every examination at the Punjab University)

Foundation Scholar, St. John's College, Cambridge B.A. Honors(1946-1949)

Awarded Smith's Prize by the University of Cambridge for the outstanding predoctoral contribution to Physics (1950) Double First in Mathematics (Wrangler) and Physics Ph.D Physics Cambridge (1952)

Appointments

Professor, Government College (Lahore) (1951 - 1954)

Head of the Mathematics Department, Punjab University (Lahore) (1951 - 1954)

Lecturer, Cambridge University (Cambridge) (1954 - 1956)

Professor of Theoretical Physics, London University, Imperial College (London) (1957 - 1993)

Founder and Director, International Center for Theoretical Physics (Trieste) (1964 - 1993)

President, International Center for Theoretical Physics (Trieste) (1994-1996)

Elected Fellow, St. John's College (Cambridge) (1951-1956)

Member, Institute of Advanced Study (Princeton) (1951)

Elected. Honorary Life Fellow, St, John's College (Cambridge)' (1971)

Awarded Honorary Professorship, Peking University (Peking) (1987)

Emeritus Scientist of Center Brasleo le Pesquisas Fisicas-CBFP (Rio de Janeiro) (1992)

Senior Research Fellow, Department of Physics, Imperial College (London) (1994)

KUNGLIGA
SVENSKA VETENSKAPSAKADEMIEN
HAR DEN 15 OKTOBER 1979
BESLUTAT ATT MED DET
NOBELPRIS
SOM DETTA ÅR TILLERKÄNNES DEN
SOM INOM FYSIKENS OMRÅDE GJORT
DEN VIKTIGASTE UPPTÄCKTEN
ELLER UPPFINNINGEN
GEMENSAMT BELÖNA
ABDUS SALAM
SHELDON L. GLASHOW OCH STEVEN WEINBERG
FÖR DERAS INSATSER INOM TEORIN
FÖR FÖRENAD SVAG OCH ELEKTROMAGNETISK
VÄXELVERKAN MELLAN ELEMENTARPARTIKLAR
INNEFATTANDE BLAND ANNAT FÖRUTSÄGELSEN
AV DEN SVAGA NEUTRALA STRÖMMEN

نوبل انعام کے ساتھ ملنے والی سند کا عکس